مناہل العرفان

فی

علوم القرآن

اردو

جلد اول

مؤلف

شیخ محمد عبد العظیم زرقانی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۹۴۸ء

مترجمین

مولانا ڈاکٹر خالد محمود صاحب
استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور

مولانا ابو محمد عبد الوہاب صاحب
فاضل جامعہ اشرفیہ لاہور

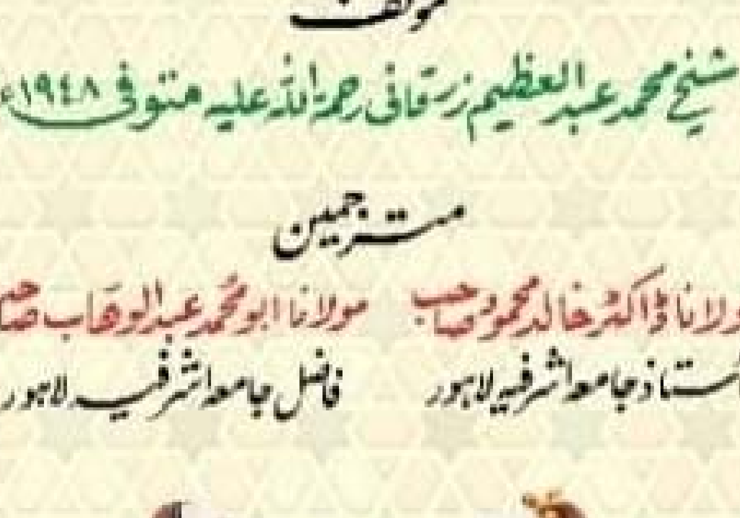

مناهل العرفان

في

علوم القرآن

اردو

مناهل العرفان

فی

علوم القرآن (اردو)

جلد اول

علوم القرآن کے حساس موضوع پر تحریر کردہ بنیادی اور حوالہ جاتی کتاب جس میں ملحدین اور مستشرقین کے شبہات
کے تشفی بخش جوابات بھی دیئے گئے ہیں، اہل علم کے لئے ایک بیش بہا کتاب پہلی بار اردو کے پیرہن میں

مؤلف

شیخ محمد عبد العظیم زرقانی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۹۴۸ء

مترجمین

مولانا ڈاکٹر خالد محمود صاحب — استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور

مولانا ابو محمد عبد الوہاب صاحب — فاضل جامعہ اشرفیہ لاہور

مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)

اقرا سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

فون: 042-37224228-37355743

MAKTABA-E-REHMANIA

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جملہ حقوق ملکیت بحق ناشر محفوظ ہیں

MAKTABA-E-REHMANIA

مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)

نام کتاب

مناہل العرفان

مؤلف

شیخ محمد عبد العظیم زرقانی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)

مطبع

خضر جاوید پرنٹرز لاہور

اقرأ سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

فون: 042-37224228-37355743

ضروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لیے پھر بھی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما دیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

ہمارے ادارے کا نام بغیر ہماری تحریری اجازت بطور ملنے کا پتہ، ڈسٹری بیوٹر، ناشر یا تقسیم کنندگان وغیرہ میں نہ لکھا جائے۔ بصورت دیگر اس کی تمام تر ذمہ داری کتاب طبع کروانے والے پر ہوگی۔ ادارہ ہذا اس کا جواب دہ نہ ہوگا اور ایسا کرنے والے کے خلاف ادارہ قانونی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
علومُ القرآن	۱۱
"علم" حکماء کے نزدیک	۱۱
"علم" متکلمین کے نزدیک	۱۱
"علم" شریعت کے نزدیک	۱۱
مادیت پرستوں کے نزدیک "علم"	۱۲
"علم" مدونین کے نزدیک	۱۲
"علم" محدثین کے نزدیک	۱۳
قرآن	۱۳
قرآن کی اصطلاح کے بارے میں	۱۴
قرآن، متکلمین کی نظر میں	۱۷
قرآن، علماءِ اصول، فقہاء اور علمائے عربیت کے نزدیک	۱۸
کیا "قرآن" اسمِ علم ہے	۲۰
کیا اسمِ علَم، تعریف کو قبول کرتا ہے؟	۲۰
"قرآن" کا کل اور بعض پر اطلاق کرنا	۲۱
"علوم القرآن" کا معنی اضافی کے اعتبار سے مفہوم	۲۲
قرآن، کتابِ ہدایت واعجاز	۲۲
قرآن کائناتی علوم سے انتفاع کی ترغیب دیتا ہے	۲۳
قرآن کا سائنسی اعجاز	۲۴
علومِ قرآن، فنِ مدوّن کے اعتبار سے اور اس کا موضوع اور فائدہ	۲۶
تاریخ علوم القرآن	۲۸
علوم القرآن کی تدوین سے پہلے کا دورہ	۲۸
علوم قرآن کی تدوین کا تمہیدی دور	۲۹
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام	۳۰
تابعین رحمہم اللہ کے نام	۳۰
علوم القرآن کا باقاعدہ تدوینی دور	۳۰
اصطلاحِ "علوم القرآن" کا معرضِ ظہور	۳۳
کتاب "البرہان فی علوم القرآن" کا مختصر تعارف	۳۳
علوم القرآن اور آخری صدی	۳۶
نزولِ قرآن	۳۹
نزولِ قرآن کا معنی ومطلب	۳۹
قرآنِ کریم کا متعدد بار نازل ہونا	۴۱
آسمانِ دنیا پر نزول کی حکمت	۴۵
حضرت جبرئیل کا قرآنِ کریم کو حاصل کرنا اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منتقل کرنا	۴۶
اَلفاظِ قرآن مُنزّل ہیں	۴۷
"کلام اللہ کی اقسام"	۴۹
قرآن کریم کے تیسرے یعنی آخری نزول کا عرصۂ مدت	۵۱
قرآنِ کریم کا تیسرا یعنی آخری نزول یکبارگی نہیں ہے	۵۲
قرآن کریم کے تدریجی نزول میں اسرار وحکم	۵۳
تدریجی نزول کی دوسری حکمت	۵۶
① حفظِ قرآن میں سہولت	۵۶
② فہمِ قرآن میں سہولت	۵۶
③ عقائدِ باطلہ سے نفرت	۵۶
④ عقائدِ حقّہ سے محبت	۵۶
⑤ مومنین کے دلوں کے لیے ثبات فراہم کرنا	۵۷
تدریجی نزول کی تیسری حکمت	۵۸

① سائلین کے جوابات دینا ۵۸
② واقعات کا مختلف اوقات میں رونما ہونا ۵۹
③ مسلمانوں کو ان کی اَغلاط کی طرف متوجہ کرنا ۶۰
④ منافقین کے حال سے آگاہی ۶۰
تدریجی نزول کی چوتھی حکمت ۶۱
وحی اپنے معتقدین اور منکرین کے درمیان ۶۳
وحی کی حقیقت اس کی انواع وکیفیات ۶۴
وحی کی شرعاً اصطلاحی تعریف ۶۴
وحی کی اقسام ۶۴
نزولِ وحی کی کیفیات ۶۴
شرعی دلائل ۶۵
وحی، جدید علوم کے اعتبار سے ۶۵
پہلی دلیل ۶۶
دوسری دلیل ۶۹
تیسری دلیل ۷۰
چوتھی دلیل ۷۰
پانچویں دلیل ۷۱
چھٹی دلیل ۷۲
وحی عقل کے ذریعے سے ۷۲
شبہات کو دُور کرنا ۷۴
ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے قرآن مجید کی پہلی اور آخری آیات ۸۶
مطلقاً سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات ۸۷
مطلقاً سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات ۹۲
بعض احکام سے متعلق نازل ہونے والی ابتدائی اور انتہائی (آخری) آیات ۹۷
شراب سے متعلق نازل ہونے والی ابتدائی اور آخری آیات ۹۷
جہاد سے متعلق نازل ہونے والی ابتدائی اور آخری آیات ۹۸
شانِ نزول کی اہمیت اور اس کے فوائد ۱۰۴
اسباب نزول جاننے کا بنیادی قاعدہ ۱۰۹
اسباب نزول بیان کرنے کی مختلف تعبیرات اور انداز ۱۱۰
ایک ہی موضوع میں مختلف تعبیرات پائے جانے کی صورتیں ۱۱۱
آیت ایک اور اسباب نزول متعدد ۱۱۲
آیات متعدد اور سبب نزول واحد ۱۱۷
آیت کے اَلفاظ اور سببِ نزول کا عموم وخصوص ۱۱۹
غیر مستقل ۱۲۰
مستقل ۱۲۰
مستقل جواب کی مزید دو صورتیں ۱۲۱
پہلی صورت یعنی سببِ عام اور جوابِ خاص ۱۲۱
دوسری صورت یعنی سببِ خاص اور جوابِ عام ۱۲۲
ثمرۂ اختلاف ۱۲۴
قیاسِ استثنائی سے جمہور کی دلیل کا ثبوت ۱۲۵
مخالفین کے شبہاتِ خمسہ اور ان کا رَدّ ۱۲۷
لفظِ عام کے ساتھ سببِ خاص کی ایک مثال ۱۳۲
قرآنِ مجید کا سات حروف پر نازِل ہونا ۱۳۶
مقدمہ ۱۳۶
قرآنِ مجید کے سات حروف پر نازِل ہونے کے دلائل ۱۳۷
احادیثِ حروفِ سبعہ سے مستنبط ہونے والے اُمور اور حکمتیں ۱۴۵
(پہلا اَمر یا پہلی حکمت) اُمت پر سہولت اور آسانی ۱۴۶
(دوسری حکمت) اُمتِ مسلمہ کو ایک لسان پر جمع کرنا ۱۴۷
(تیسری حکمت) احکام کی مزید وضاحت ۱۴۷

(چوتھی حکمت) دومختلف احکام کو ایک ہی آیت میں جمع کرنا ۱۴۸
(پانچویں حکمت) دومختلف حالتوں میں دومختلف شرعی احکام کو ایک ہی آیت میں جمع کرنا ۱۴۹
(چھٹی حکمت) غیر مقصود واحتمال کو دُور کرنا ۱۴۹
(ساتویں حکمت) ابہام دور کرنا ۱۵۰
(آٹھویں حکمت) گم راہ لوگوں کے گم راہ کُن عقائد و نظریات کا رد کرنا ۱۵۰
(دوسرا اَمر) حروف یا قراءتیں سات کے عدد میں محصور ہیں ۱۵۱
(تیسرا اَمر) ساتوں کے ساتوں حروف یا قراءتیں درست ہیں ۱۵۲
(چوتھا اَمر) قراءات میں پایا جانے والا تنوع مِن جانب اللہ ہے ۱۵۳
(پانچواں اَمر) قراءاتِ سبعہ سے روکنا جائز نہیں ۱۵۴
(چھٹا اَمر) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قرآنِ کریم کے ساتھ خلوص ۱۵۴
(ساتواں اَمر) اختلافِ قراءات کے مسئلے پر اُلجھنا جائز نہیں ۱۵۴
(آٹھواں اَمر) اختلافاتِ قراءات کا تعلق اَلفاظ کے ساتھ ہے نہ کہ معانی کے ساتھ ۱۵۵
حروفِ سبعہ پر نزولِ قرآن کی لغوی تحقیق ۱۵۵
"وجوہِ سبعہ" کا مفہوم، پسندیدہ قول کے مطابق ۱۵۷
(پہلی قسم) اَسماء میں مفرد، تثنیہ، جمع اور تذکیر وتانیث کے اعتبار سے اختلاف ۱۵۷
(دوسری قسم) اَفعال میں ماضی، مضارع یا اَمر کے صیغوں کے اعتبار سے اختلاف ۱۵۷
(تیسری قسم) اعراب کے اعتبار سے اختلاف ۱۵۷
(چوتھی قسم) الفاظ میں کمی، زیادتی کا اختلاف ۱۵۸
(پانچویں قسم) تقدیم وتاخیر کا اختلاف ۱۵۸
(چھٹی قسم) اَلفاظ کا ایسا اختلاف جس سے حروف بدل جائیں ۱۵۸
(ساتویں قسم) لہجوں کا اختلاف ۱۵۸
امام ابوالفضل الرازیؒ کے قول کو پسند کرنے کے وجوہات ۱۵۸
"وجوہِ سبعہ" کے مفہوم سے متعلق دیگر اقوال ۱۵۹
① امام ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ۱۶۰
② امام محقق ابن جزری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ۱۶۱
③ قاضی ابوبکر الطیب باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ۱۶۲
امام ابوالفضل الرازی رحمۃ اللہ علیہ کے قول اور دیگر اَقوال کا جائزہ ۱۶۲
امام ابوالفضل الرازی رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر وارِد ہونے والے اعتراضات اور ان کے جوابات ۱۶۵
حروفِ سبعہ کا مصاحفِ عثمانیہ میں موجود ہونا ۱۶۸
(وجہِ اوّل) اَسماء میں مفرد، تثنیہ، جمع کا اختلاف ۱۶۹
(وجہِ ثانی) تصریفِ افعال کا اختلاف ۱۶۹
(وجہِ ثالث) اعراب کے اعتبار سے اختلاف ۱۷۰
(وجہِ رابع) الفاظ میں کمی، زیادتی کا اختلاف ۱۷۰
(وجہِ خامس) تقدیم وتاخیر کا اختلاف ۱۷۰
(وجہِ سادِس) اَلفاظ کا ایسا اختلاف جس سے حروف بدل جائیں ۱۷۱
(وجہِ سابع) لہجوں کا اختلاف ۱۷۱
حروفِ سبعہ کی تعیین میں مزید اَقوال ۱۷۲
اَصلِ موضوع پر وارِد ہونے والے اعتراضات اور ان کے جوابات ۱۸۲

قرآنِ کریم کی مکی اور مدنی آیات یا سورتوں کے بیان میں ۱۹۱
① مکی اور مدنی کے اصطلاحی معانی ۱۹۱
② مکی اور مدنی آیات کی شناخت کے فوائد ۱۹۳
③ مکی اور مدنی آیات تک رسائی کا طریقہ ۱۹۴
④ وہ قواعد وضوابط جن کے ذریعے مکی مدنی کی شناخت کی جاسکتی ہے ۱۹۴
مکی سورتوں کو پہچاننے کے ضوابط ۱۹۵
مدنی سورتوں کو پہچاننے کے ضوابط ۱۹۶
⑤ مکی، مدنی اور مختلف فیہا سورتیں ۱۹۶
⑥ مکی اور مدنی سورتوں کی اقسام ۱۹۶
⑦ ایسی وجوہ جو مکی اور مدنی دونوں کے ساتھ متعلق ہیں ۱۹۸
⑧ مکی اور مدنی میں فروق ۱۹۹
اس موضوع پر وارِد ہونے والے شبہات اور ان کے جوابات ۲۰۱
جمع وتاریخ قرآن، شبہات ان کے جوابات، اور اس بارے وارد ہونے والی روایات کے چند نمونے ۲۳۵
جمع قرآن بمعنی حفظ فی الصدور ۲۳۵
جمع قرآن بمعنی کتابت درعہدِ رسالت ﷺ ۲۴۰
عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن یا مصاحف میں جمع کیوں نہ کیا گیا؟ ۲۴۲
جمع قرآن، عہدِ صدیقی میں ۲۴۳
صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے حکم کا عملی اجرا ۲۴۳
کتابت صُحف میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا طریق کار ۲۴۵
صحف کی خصوصیات ۲۴۶
جمع قرآن عہدِ عثمانی میں ۲۴۸
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اجتماعی فیصلہ پر عمل کروانا ۲۴۹
مصاحف کی کتابت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا طریقِ کار . ۲۴۹
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مصاحف کو جلا دینا ۲۵۲
جمعِ قرآن کے بارے میں مختلف شبہات اور ان کے جوابات ۲۵۴
قرآن کریم کے خاص عوامل ۲۹۶
تحقیق وجستجو کے مظاہر ۳۱۲
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہادت عالیہ ۳۱۵
رسول اللہ ﷺ کی اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں شہادت ۳۱۷
صحابہ رضی اللہ عنہم کے انتخاب میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ۳۱۸
قرآن پاک کی آیات اور سورتوں کی ترتیب ۳۱۹
آیت کو پہچاننے کا طریقہ ۳۲۰
ایک حصہ پر آیت کا اطلاق ۳۲۳
ایک سے زائد حصّہ پر آیت کا اطلاق ۳۲۳
قرآن پاک کی آیات کی تعداد ۳۲۳
اختلاف کا سبب ۳۲۴
آیات کو پہچاننے کے فوائد ۳۲۴
آیاتِ قرآن کی ترتیب ۳۲۶
شبہ اور اس کا ازالہ ۳۲۸
سورتوں کی ترتیب ۳۲۹
سورة کا معنی ۳۲۹
سورتیں بنانے کی حکمت ۳۳۰
سورتوں کی اقسام ۳۳۱
سورتوں کی ترتیب میں مذاہب ۳۳۱
قرآن پاک کی کتابت، رسم، مصاحف اور ان کے متعلقات کے بیان میں ۳۳۹

کتابت ۳۳۹
اسلام میں کتابت کا مقام ۳۴۰
نبی کریم ﷺ پڑھتے لکھتے تھے ۳۴۱
قرآن پاک کی کتابت ۳۴۴
رسم مصحف ۳۴۵
قواعد رسم مصحف ۳۴۵
رسم عثمانی کی خصوصیات وکمالات ۳۴۷
کیا مصحف عثمانی کا رسم توقیفی ہے ۳۵۰
رسم عثمانی کے التزام میں علماء کرام کے اقوال ۳۵۲
قرآن کی کتابت اور اس کے رسم کے بارے میں پیدا ہونے والے شبہات ۳۵۷
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا عمومی دفاع ۳۶۱
ہمارے زمانے میں میں رسم عثمانی کے التزام پر شبہ ۳۶۵
مصاحف کی تفصیل ۳۶۶
مصاحف عثمانیہ میں حروف سبعہ ۳۶۶
صحیفے اور مصاحف ۳۶۸
مصاحف کی تعداد ۳۶۹
اس وقت مصاحف عثمانیہ کہاں ہیں؟ ۳۷۰
تجوید وتحسین کے دور میں مصاحف ۳۷۱
اعجام ۳۷۱
مصاحف کی تشکیل ۳۷۲
مصحف کے نقطوں اور اعراب کا حکم ۳۷۳
قرآن پاک کے پارے ۳۷۳
مصحف کا احترام ۳۷۴
قراءات، قراء اور ان پر ہونے والے شبہات کے بیان میں ۳۷۶
علم قراءات کا ارتقاء ۳۷۶
پہلے حفاظ مقرئین کے طبقات ۳۷۸
قراءتوں کی تعداد ۳۷۹
اس ضابطے کا منطوق ومفہوم ۳۸۳
قرآن پاک کا تواتر ۳۸۸
قراءاتِ سبع میں آراء ۳۹۱
قراءات عشر کے تواتر کی تحقیق ۳۹۵
ہمزہ کی تخفیف ۳۹۷
قراء ۴۰۴
قراء سبعہ رحمہم اللہ ۴۰۵
ابن عامر ۴۰۵
ابن کثیر ۴۰۵
عاصم ۴۰۶
کسائی ۴۰۸
ابوجعفر ۴۰۹
یعقوب ۴۰۹
خلف ۴۱۰
حسن بصری رحمہ اللہ ۴۱۰
ابن محیصن ۴۱۰
یحییٰ یزیدی ۴۱۰
شنبوذی ۴۱۰
دس کے علاوہ باقی قراءتوں کا حکم ۴۱۱
اس مقام پر پیدا ہونے والے شبہات کا ازالہ ۴۱۵
تفسیر، مفسرین اور ان کے متعلقات ۴۱۹
مفسرین صحابہ رضی اللہ عنہم ۴۲۹
تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما ۴۳۱
تابعین رحمہم اللہ میں سے مفسرین کے طبقات اور ان کی روایات پر نقد وجرح ۴۳۳

① طبقہ اہل مکہ ۴۳۳
مجاہد ۴۳۳
② طبقہ اہل مدینہ ۴۳۴
③ طبقہ اہل عراق ۴۳۴
روایت بالماثور کا ضعف اور اس کے اسباب ۴۳۵
تفسیر ماثور کی تدوین اور اس میں تالیف کی گئی کتابوں کی خصوصیات ۴۳۹
تفسیر ابو اللیث سمرقندی ۴۴۰
الدر المنثور فی التفسیر بالماثور ۴۴۰
تفسیر ابن کثیر ۴۴۱
تفسیر بقی بن مخلد ۴۴۱
اسباب النزول للواحدی ۴۴۱
الناسخ والمنسوخ لابی جعفر النحاس ۴۴۱
قرنِ اوّل کے بعد مفسرین کی سندیں ۴۴۱
تفسیر محمود اور تفسیر مذموم ۴۴۳
مدح وذم کا پیمانہ ۴۴۳
رائے کی طرف داری والی غلطی ۴۴۴
اسلام کی فراخ دلی اور اس کی تعلیمات کی آسانی ۴۵۴
لفظِ ثالث ۴۵۴
توحید ۴۵۴
تفسیر بالرائے میں سے کونسی جائز اور کونسی ناجائز ہے ۴۵۸
وہ علوم جن کی مفسر کو ضرورت ہوتی ہے ۴۵۹
تفسیر بالرائے کے جواز میں اختلاف ۴۶۲
مانعین کے دلائل ۴۶۲
تفسیر بالرائے کو جائز قرار دینے والوں کے دلائل ۴۶۵
وجہ استدلال ۴۶۵
مفسرین بالرائے کا طریقہ کار ۴۶۶
احتمال کے وقت ترجیح کا قانون ۴۶۷
سنت کا قرآن کے لیے بیان ہونے کی وجوہ ۴۶۸
④ تفسیر بالرائے اور تفسیر بالماثور میں تعارض اور ان میں ترجیح کے لیے قابل اتباع طریقہ ۴۷۰
تفسیر بالرائے کی اہم کتابیں ۴۷۱
فرق مختلفہ کی تفاسیر ۴۷۳
تفاسیر معتزلہ ۴۷۳
"تنزیہ القرآن عن المطاعن" ۴۷۶
تفاسیر باطنیہ ۴۷۷
شیعہ کی تفاسیر ۴۷۸
تفسیر اشاری ۴۸۰
تفسیر اشاری کو قبول کرنے کی شرائط ۴۸۲
تفسیر اشاری کی اہم ترین کتابیں ۴۸۳
مخلصانہ نصیحت ۴۸۹
حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے کلمات ۴۹۰
اہل کلام کی تفاسیر ۴۹۵
علوم ادبیہ اور کونیہ وغیرہ کا تفسیر کے ساتھ امتزاج اور اس کا سبب واثر ۴۹۶
اس امتزاج کے آثار ۴۹۸
آخری کلمات ۵۰۲
آخری بات ۵۰۴

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بحث ①

علومُ القرآن

علومُ القرآن، مرکب اضافی ہے۔ علوم مضاف ہے اور القرآن مضاف الیہ ہے۔ ہم اس باب میں علوم اور القرآن دونوں کے الگ الگ معانی بیان کریں گے۔ علوم جمع ہے جبکہ اس کا واحد علم ہے۔ لغت میں علم ایسے مصدر کو کہتے ہیں: جو فہم اور معرفت کے مترادف ہو۔ بلکہ جزم اور یقین کے بھی مترادف ہو۔ پھر یہ لفظ (علم) درج ذیل مختلف اصطلاحات میں استعمال ہونے لگا۔

"علم" حکماء کے نزدیک

کسی چیز کی وہ صورت جو عقل میں حاصل ہوتی ہے علم کہلاتی ہے۔ یا حاصل ہونے والی صورت کو علم کہتے ہیں۔ یا انسان کا کسی چیز کے بارے میں انکشاف حاصل کر لینا علم کہلاتا ہے۔

"علم" متکلمین کے نزدیک

متکلمین علم کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ علم ایک ایسی صفت ہے کہ جس کے ساتھ وہ متصف ہو جائے اس پر معاملے کو واضح کر دیتی ہے۔ متکلمین میں سے بعض اس تعریف کی مراد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ علم ایک صفت ہے جو اپنے محل کو ایسی تمیز یا ایسا امتیاز بخشتی ہے جس میں نقیض کا کوئی احتمال نہیں ہوتا۔ خواہ وہ تمیز حواس ہی کے واسطے سے کیوں نہ ہو جیسا کہ اشعریہ کی رائے ہے۔

"علم" شریعت کے نزدیک

عام طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کی نشانیوں کی معرفت کو علم کہتے ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں کے ساتھ اور دیگر مخلوق کے ساتھ افعال کی معرفت کو بھی علم کہتے ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ابتدا میں علم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کی معرفت، اس کی قدرت کی معرفت اور اس کی مخلوق اور اس کے مابین تعلق کی معرفت کو کہتے تھے۔ پھر بعد میں علم کے اطلاق میں تصریف ہوتی گئی یہاں تک بعد میں مسائل فقہیہ اور اس کے علاوہ دیگر علوم و مسائل میں مناظروں اور مباحثوں کو علم کہا جانے لگا۔ لیکن یاد رہے کہ قرآن و حدیث میں اور علماء سے متعلق جو فضائل وارد ہوئے ہیں، وہ علم کے ابتدائی اطلاق سے متعلق ہیں۔ (احیاء العلوم)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی علم کی بیان کردہ تعریف علم شرعی کے ساتھ خاص ہے۔ حالانکہ ہم اس مقام پر علم کی مطلقاً تعریف بیان کرنا چاہتے ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء العلوم ہی میں فرماتے ہیں کہ حدیث میں یہ جو آیا ہے:

((طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ)).

"علم طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔"

تو اس حدیث میں علم سے کیا مراد ہے؟ پس امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: علماء کا اس میں بھی اختلاف ہے کہ یہاں علم سے کوئی سا علم مراد ہے۔ اس بحث میں علماء کی بیس (۲۰) جماعتیں بن جاتی ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہاں علم سے مراد وہ علم ہے جس کا تعلق ہمارے روزمرہ معاملات کے ساتھ ہوتا ہے اور ہم اس علم کے ذریعے اپنے ظاہری اعمال مثلاً عبادات اور اسلامی معاملات کو درست کرتے ہیں اور اپنے اسلامی عقائد یعنی باطنی اعمال ونظریات کو درست کرتے ہیں اور اپنے اخلاق کو سنوارتے ہیں۔

پس اس حدیث میں علم سے مراد وہ علم ہے جس کے ذریعے ہم اپنے معاملات اور لین دین اور عقائد کی اصلاح کر سکیں۔

مادیت پرستوں کے نزدیک "علم"

وہ لوگ جو مادیت پرست ہیں۔ ظاہر ہی کو سب کچھ مانتے ہیں۔ باطنیت اور روحانیت کے قائل نہیں ہیں۔ ایمان بالغیب کو خاطر میں نہیں لاتے وہ مادیت پرست کہلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک علم صرف اُن یقینی باتوں کو کہا جاتا ہے جو ہمیں محسوس ہوتی ہیں۔ یعنی جن چیزوں کو ہم ہاتھ لگا سکتے ہیں، دیکھ سکتے ہیں وغیرہ۔ بس ان کے نزدیک معلومات کو علم کہا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام تعریفات ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے سامنے لفظ "علم" کا معنی واضح ہو جائے۔ وگرنہ زیادہ تعریفات اور ان کے درمیان پایا جانے والا اختلاف انسان کو شبہات کی طرف لے جاتا ہے۔ ذیل میں ہم وہ تعریف بیان کرنے لگے ہیں جو علم کا معنی سمجھنے میں ہمارے لیے معاون ثابت ہوگی۔ اور علم کی ایک اور اصطلاحی تعریف ہمیں معلوم ہو جائے گی۔

"علم" مدونین کے نزدیک

علوم القرآن ایک مدوّن فنّ ہے۔ اس لیے اس موقع پر علمائے تدوین کی بیان کردہ تعریف ذکر کرنا مناسب ہے۔

علمائے تدوین کہتے ہیں علم کا اطلاق اُن مسائل پر ہوتا ہے جن کو کسی ایک حیثیت یا جہت کے اعتبار سے محفوظ کیا گیا ہو۔ اکثر اوقات وہ مسائل مکمل طور پر نظریاتی ہوتے ہیں اور بعض اوقات جزوی طور پر نظریاتی ہوتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ وہ مسائل بعض اوقات شخصی بھی ہوتے ہیں۔ جیسے روایت کے اعتبار سے علمِ حدیث کے مسائل۔ شخصی مسائل کی مثال میں نے علمِ حدیث سے دی ہے کیونکہ علم حدیث کے مسائل کی انتہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر ہی ہوتی ہے۔ اس لیے علم حدیث کے مسائل "مسائل شخصیہ" ہوئے۔

علامہ سعد "المقاصد" میں اور علامہ عبدالحکیم "المطول" میں لکھتے ہیں: جو علم مدون کیا گیا ہوتا ہے اُس کا اطلاق خاص قسم کے تصورات کی جماعت پر بھی ہوتا ہے۔ خاص قسم کے تصورات سے مراد وہ مفردات ہیں جن کو عقل کسی خاص اعتبار سے ایک دائرے میں تصور کرتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر علمائے تدوین کی بیان کردہ تعریفِ علم کا خلاصہ نکالا جائے تو اُس کا خلاصہ کچھ یوں ہوگا:

علمائے تدوین کی اصطلاح میں علم کا لفظ اُن معلومات پر بولا جاتا ہے جن کو کسی ایک جہت اور حیثیت کے اعتبار سے منضبط کیا ہو خواہ وہ معلومات ایک موضوع یا ایک غایت پر مبنی ہوں۔ یا وہ معلومات تصورات پر مبنی ہوں جیسا کہ "علم البدیع"۔ یا وہ معلومات تصدیقات پر مبنی ہوں۔ پھر وہ تصدیقات بھی عام ہیں، خواہ اُن کا تعلق مکمل طور پر قضایا سے ہو یا جزوی طور پر اور خواہ وہ تصدیقات کسی شخصیت سے متعلق ہوں جیسا کہ روایت کے اعتبار سے "علم الحدیث"۔

"علم" محدثین کے نزدیک

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: علم مومن کے قلب میں ایک نور ہے جو فانوسِ نبوت کے چراغ سے مستفاد ہوتا ہے۔ یہ علم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور احوال کے ادراک کا نام ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات، افعال اور اس کے احکام کی ہدایت حاصل ہوتی ہے۔

"علم" کے بارے میں مذکورہ تمام تعریفات سے علم اور علوم کا معنی اچھی طرح ذہن میں راسخ ہو گیا ہو گا۔ اس لیے اب ہم قرآن کے بارے میں بات شروع کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا موضوع "علوم القرآن" ہے۔

قرآن

لفظ قرآن عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ مصدر ہے اور قراءت کے مترادف ہے۔ قراءت کا معنی ہے "پڑھنا"۔ یعنی لفظِ قرآن کا لغوی معنی ہوا "پڑھنا"۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾﴾ (سورۃ القیامۃ: ۱۷، ۱۸)

"اس کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمے ہے۔ سو جب ہم اسے پڑھا کریں تو آپ اس کو سنا کرو اور پھر اسی طرح پڑھا کرو۔"

پھر لفظِ قرآن معنی مصدری سے منتقل ہو کر ایسے کلام کا نام بن گیا جو کہ معجز ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ ہے یعنی قرآن مجید کا نام بن گیا۔ اب قرآن کا لفظ مصدر ہونے کے باوجود مفعول کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اب قرآن کا ترجمہ "پڑھنا" نہیں کرتے بلکہ "پڑھی جانے والی کتاب" یا "پڑھی گئی کتاب" کرتے ہیں۔ اور مصدر کو مفعول کے معنی میں استعمال کرنا عربی زبان میں رائج ہے۔ اس طرح مصدر کو مفعول کے معنی میں استعمال کرنے کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

لفظِ قرآن کی جو تحقیق ہم نے بیان کی اس کے علاوہ علماء نے اور بھی بہت سی تحقیقات بیان کی ہیں مثلاً بعض محققین کا کہنا ہے کہ لفظِ قرآن کا معنی جمع کرنا ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ "قرائن" سے مشتق ہے۔ بعض کہتے ہیں "قرنت الشیئ بالشیئ" سے ہے یعنی ملنے ملانے وغیرہ کے معنی میں ہے۔ کیونکہ قرآن کی سورتیں اور آیات ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں اس لیے اس کو قرآن کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ لفظِ قرآن غیر مہموز ہے اور الف لام کے بغیر ہے۔ لیکن محققین کے یہ تمام اقوال تکلف سے خالی نہیں ہیں اور ان تمام اقوال میں کوئی نہ کوئی اشکال ضرور وارد ہوتا ہے۔

میرے نزدیک بہترین قول یا رائے یہ ہے کہ لفظِ قرآن مہموز ہے۔ اور ہمزہ تخفیف کے لیے حذف کیا گیا ہے۔ پھر جب اس کو کلام الٰہی کا نام رکھ دیا گیا تو اس پر الف لام بھی داخل کر دیا گیا۔ یاد رہے یہ الف لام تعریف کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کی اصل کی طرف اشارے کے لیے ہے۔

قرآن کا ایک نام "فرقان" بھی ہے۔ فرقان کی اصل بھی مصدر ہی ہے۔ جیسے قرآن مصدر ہے اور کلام الٰہی کا نام ہے، ایسے ہی فرقان بھی مصدر ہے اور کلام الٰہی کا نام ہے۔ فرقان فاعل کے معنی میں بھی ہے اور مفعول کے معنی میں بھی۔ اگر فرقان فاعل کے معنی ہو تو اس کا مطلب ہو گا حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا۔ اور اگر یہ مفعول کے معنی میں ہو تو اس کا مطلب ہو گا کہ اس کلام کی

ہر ہر سورت اور ہر ہر آیت جدا جدا اور واضح ہے۔ یعنی یہ کلام خلط ملط نہیں ہے بلکہ واضح اور جدا جدا آیات کا حامل ہے۔

مفعول کے معنی ہونے کی صورت میں اس کا ایک معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کلام کی آیات وسورتیں نزول کے اعتبار سے جدا جدا ہیں۔ فرقان کا لفظ خود قرآن مجید میں بھی مذکور ہے:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًاۙ۝۱﴾ (الفرقان:۱)

"وہ (خدائے عزوجل) بہت ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا تاکہ اہل عالم کو ہدایت کرے۔"

کلام الٰہی کے یہ دونوں نام (القرآن اور الفرقان) باقی تمام اسماء میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ بلکہ بعض مفسرین تو اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن مجید کے باقی تمام اسماء میں یہ دونوں نام اصل اور مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء معنی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی دو صفات یعنی جلال اور جمال کی طرف راجع ہوتے ہیں۔ قرآن کے دو ناموں کے علاوہ تین نام اور بھی ہیں جو مشہور ہیں۔ یعنی ① الکتاب ② الذکر ③ التنزیل۔

علمائے کرام نے قرآن مجید کے متعدد اسماء بتائے ہیں۔ صاحب البرہان نے قرآن مجید کے پچپن سے بھی زائد اسماء بتائے ہیں۔ اور صاحب التبیان کے مطابق بعض مفسرین نے تو نوے سے بھی زائد نام قرآن مجید کے بتائے ہیں۔ لیکن ان تمام علماء نے قرآن مجید کے جو اتنے زیادہ اسماء بتائے ہیں وہ صرف اس وجہ سے ہیں کہ انھوں نے نام اور وصف کے اندر امتیاز نہیں رکھا۔ کسی بھی چیز کا ایک ذاتی نام ہوتا ہے اور ایک اس کا وصف ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌۙ۝۷۷﴾ (الواقعہ:۷۷)

"کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن ہے۔"

اس آیت میں لفظِ کریم وصف کے طور پر مستعمل ہے جبکہ "قرآن" نام کے طور پر۔ اس کی ایک اور مثال:

﴿وَ هٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ﴾ (الانبیاء:۵۰)

"اور یہ مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے۔"

ہے۔ اس آیت میں لفظِ مبارک وصف کے طور پر جبکہ "ذکر" نام کے طور مستعمل ہے۔ پس "قرآن" اور "ذکر" کلام اللہ کے نام ہیں جبکہ کریم اور مبارک وصف ہیں۔ قرآن مجید کے کون کون سے اسماء نام ہیں اور کون کون سے وصف۔ یہ ایک آسان مسئلہ ہے لیکن اچھا خاصا طویل ہے۔ اسی لیے محققین نے اس موضوع پر بہت سی کتب لکھی ہیں۔ لیکن جو بات ہم نے سمجھا دی ہے ان شاء اللہ وہی کافی وشافی ثابت ہوگی۔

قرآن کی اصطلاح کے بارے میں

قرآن کلام اللہ ہے اور اللہ کا کلام انسان کے کلام کی طرح نہیں ہوتا۔ کیونکہ انسان حادث ہے تو اس کا کلام بھی حادث ہوا۔

اللہ تعالیٰ قدیم ہیں تو اُن کا کلام بھی قدیم ہوا۔ اللہ کے کلام سے کیا مراد ہے؟ کیا کلام کی مختلف اقسام ہیں؟ کیا زبان سے نکلنے والے الفاظ ہی کلام ہوتے ہیں یا دِل ودماغ میں جو خیالات الفاظ کی شکل میں پائے جاتے ہیں وہ بھی کلام کہلاتے ہیں؟ ان تمام سوالوں کے جواب معلوم کرنے کے لیے درج ذیل بحث کو سمجھنا ضروری ہے۔

① **المعنی المصدری** ۞ بعض اوقات انسان کے کلام سے معنی مصدری مراد لیا جاتا ہے۔ کلام کے معنی مصدری کا مطلب ہے: کسی بات کا تکلم وتلفظ کرنا۔

② **المعنی الحاصل بالمصدر** ۞ بعض اوقات انسان کے کلام سے معنی حاصل بالمصدر مراد لیا جاتا ہے۔ معنی حاصل بالمصدر کا مطلب ہے: مُتَكَلَّمٌ بِهٖ۔ یعنی وہ الفاظ جن سے گفتگو عمل میں آئی۔

مندرجہ ذیل بالا دونوں اقسام میں سے ہر ایک کی لفظی اور نفسی ہونے کے اعتبار دو دو قسمیں ہیں، جو کہ درج ذیل ہیں:

① **الکلام البشری اللفظی بالمعنی المصدری** ۞ یعنی وہ بشری کلام جو لفظی ہو اور اس سے معنی مصدری مراد لیا جائے۔ اور وہ انسان کا اپنی زبان کو ہلانا اور الفاظ کو اُن کے مخارج سے نکالنے کی کوشش کرنا ہے۔

② **اکلام البشری اللفظی بالمعنی الحاصل بالمصدر** ۞ یعنی وہ بشری کلام جو لفظی ہو اور اُس سے وہ معنی مراد لیا جائے جو مصدر سے حاصل ہوا ہے۔ اور وہ، وہ کلمات ہیں جن کو انسان تلفظ کر چکا ہو۔ اور وہ صوتِ حسی کی کیفیت میں موجود ہوں۔

③ **الکلام البشری النفسی بالمعنی المصدری** ۞ یعنی وہ بشری کلام جو نفسی ہو اور اُس سے معنی مصدری مراد لیا جائے۔ اور وہ انسان کا اپنے نفس (دل ودماغ) میں ان باتوں (کلمات) کا حاضر کرنا ہے، جن کا اثر انسان کے ظاہری جوارح یعنی زبان، کوے، حلق یا نرخرے وغیرہ کسی پر ظاہر نہیں ہوا ہوتا۔ پس کلام کی اس قسم میں متکلم اپنے ذہن میں کچھ کلمات کو تخیلاً ترتیب دیے ہوئے ہوتا ہے۔

④ **الکلام البشری النفسی بالمعنی الحاصل بالمصدر** ۞ یعنی وہ بشری کلام جو نفسی ہو اور اس سے وہ معنی مراد لیا جائے جو مصدر سے حاصل ہوا ہے۔ اور وہ، وہ کلماتِ نفسیہ اور الفاظِ ذہنیہ ہیں جو ذہن اور نفس میں ترتیب دیے گئے ہوتے ہیں اور خارج میں نکلے ہوئے الفاظ ان کلماتِ نفسیہ اور الفاظِ ذہنیہ پر پورے پورے منطبق ہو رہے ہوتے ہیں۔

بالفظِ دیگر کلام کی اس قسم سے ایسے مرتبہ کلمات مراد ہیں جو ذہن میں موجود ہوں اور خارج میں موجود مرتبہ کلمات اُن پر پورے پورے منطبق ہو رہے ہوں۔

بشری کلامِ نفسی کی مثالیں قرآن واحادیث سے بھی ملتی ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی بنیامین کے بارے میں کہا تھا کہ بنیامین نے چوری کی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں اس کا ایک بھائی اس سے پہلے بھی چوری کر چکا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ﴾ (یوسف:۷۷)

”پس (اپنے بھائیوں کی بات سُن کر) یوسف علیہ السلام نے ان پر ظاہر کیے بغیر چپکے سے (دل میں) کہا کہ: ”تم اس معاملے

میں کہیں زیادہ بُرے ہو۔"

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ کلام دل ہی دل میں کیا تھا زبان پر نہیں لائے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے کلام شمار کیا ہے۔ اور یہ کلامِ نفسی کی بہت عمدہ مثال ہے۔

دوسری حدیث میں ہے جس کو طبرانی نے روایت کیا ہے۔

((عن ام سلمة انها سمعت رسول الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وقد ساله رجل فقال: انی لا حدث نفسی بالشیء لو تکلمت به لا حبطت اجری. فقال علیه السلام لا یلقی ذلك الکلام الّا مؤمن)).

"ایک شخص نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا: (یا رسول اللہ ﷺ) میرے دل میں ایسی باتیں پیدا ہوتی ہیں کہ اگر میں اُن کو زبان پر لے آؤں تو میرا اجر ضائع ہو جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لا یلقی ذٰلك الکلام الا مؤمن)).

"مومن کو ہی ایسے کلام کا القاء کیا جاتا ہے۔"

اب آپ غور کریں کہ نبی کریم ﷺ نے دل میں آنے والے خیالات کو کلام سے موسوم کیا، حالانکہ وہ ایسے ذہنی کلمات تھے کہ اس شخص نے اجر کے ضائع ہو جانے کے خدشہ سے ان کے ساتھ کلام نہیں کیا۔ حضور ﷺ کی طرف سے اس طرح کے قلبی خیالات پر کلام کا اطلاق کرنا حقیقت پر محمول ہوگا، کیونکہ لفظ کا حقیقی معنی مراد لینا ہی اصل ہوتا ہے اور یہاں پر کوئی قرینہ صارفہ عن الحقیقۃ بھی موجود نہیں ہے۔

اسی طرح قرآن، کلام اللہ ہے، کبھی اس کے اطلاق سے کلام نفسی مراد ہوتا ہے اور کبھی اس کے اطلاق سے کلامِ لفظی مراد ہوتا ہے۔

صرف متکلمین اس پر کلام نفسی کا اطلاق کرتے ہیں، کیونکہ وہ ایک پہلو سے اللہ تعالیٰ کی صفات نفسیہ سے بحث کرتے ہیں اور دوسرے پہلو سے اس حقیقت کے معترف ہیں کہ قرآن، کلام اللہ ہے اور مخلوق نہیں ہے۔ اور جو اس پر کلام لفظی کا اطلاق کرتے ہیں وہ علمائے اصول، فقہاء اور علمائے عربیت ہیں۔ اگرچہ ان کے ساتھ متکلمین بھی ایک تیسرے اطلاق کے مطابق شریک ہیں۔ جس کی وضاحت بعد میں کی جائے گی۔

علمائے، اصول، فقہاء اور علمائے عربیت نے قرآن پر کلامِ لفظی کا اطلاق اس لیے کیا ہے کہ ان کا اصل مقصد احکام پر استدلال کرنا ہے، اور استدلال، الفاظ سے ہی ہوا کرتا ہے، علماءِ عربیت کے ہاں امرِ اعجاز کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کا مطمح نظر بھی الفاظ ہوتے ہیں۔

نیز متکلمین کے ہاں کتب منزلہ پر ایمان کے وجوب کو ثابت کرنا بھی ہوتا ہے، ان کتب میں قرآن حکیم بھی ہے، نیز قرآن کے معجزہ سے نبوت رسول ﷺ کا اثبات بھی ان کے پیشِ نظر ہوتا ہے، اور بدیہی سی بات ہے کہ ان تمام امور کا تعلق الفاظ سے ہے لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ متکلمین نے اس تیسرے اطلاق کے مطابق ان علمائے اصول کے قول کو اختیار کیا ہے۔

قرآن، متکلمین کی نظر میں

متکلمین جب قرآن پر کلام نفسی کا اطلاق کرتے ہیں تو وہ اس میں دو امور کا لحاظ کرتے ہیں۔

① قرآن، ایک علم ہے، یعنی ایسا کلام ہے جو کلام الٰہی کے ماسوا ہر طرح کے کلام سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

② قرآن، کلام اللہ ہے اور کلام اللہ قدیم اور غیر مخلوق ہے۔ لہٰذا اس کا حوادث اور عوارض سے منزہ ہونا ضروری ہے۔ آپ کے علم میں ہے کہ کلامِ نفسی بشری کا اطلاق بھی دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ ایک معنی مصدری پر دوسرا حاصل مصدر پر۔ اللہ کے کلام نفسی کا اطلاق بھی ان ہی دو معانی پر ہوتا ہے۔ ایک بشر کے لیے معنی مصدری کی نظیر پر، دوسرا بشر کے لیے حاصل مصدر کی نظیر پر۔

ہم نے "نظیر پر" اس لیے کہا کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ اللہ کے کلام نفسی کا خلق اور اشباہِ خلق سے منزہ ہونا ضروری ہے۔ اس لیے انہوں نے معنی اوّل کے اعتبار کے ساتھ اس کی تعریف کی کہ وہ بشر کے معنی مصدری کے، مشابہ ہے، چنانچہ انہوں نے اس کی تعریف یوں کی کہ:

"قرآن ایسی صفت قدیمہ ہے جس کا تعلق کلماتِ حکمیہ سے ہے، سورتِ فاتحہ سے لے کر سورت ناس کے آخر تک۔" ا

اور یہ ازلی کلمات ہیں جو لفظی، ذہنی اور روحانی حروف سے مبرا ہیں۔ اور یہ مترتب ہیں، متعاقب نہیں ہیں، جیسا کہ کوئی صورت آئینہ میں منعکس ہوئی ہے مترتب ہوتی ہے متعاقب نہیں ہوتی۔

ان حضرات نے اس کی تعریف میں جو یہ کہا کہ وہ کلمات "حکمیہ" ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کلمات، حقیقی الفاظ نہیں ہوتے جن کی صورت حروف اور اصوات کے ساتھ ہو۔ نیز انہوں نے اس کی تعریف میں "ازلیہ" کا ذکر اس لیے کیا ہے، تا کہ ان کلمات کے لیے قدیم ہونے کا معنی ثابت ہو جائے، اور اس کی تعریف میں جو یہ کہا کہ: "وہ لفظی، ذہنی اور روحانی حروف سے مبرا ہوتے ہیں۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کلمات کا مخلوق ہونا منتفی ہو سکے۔ اسی طرح تعریف میں یہ کہا کہ: "وہ متعاقب نہیں ہیں۔" اس لیے کہ تعاقب، زمانہ کو مستلزم ہوتا ہے۔ اور زمانہ، حادث ہے۔ ان کلمات کے لیے ترتیب کو اس وجہ سے ثابت کیا کہ یہ بالکل بدیہی ہے کہ قرآن، حقیقتِ مرتبہ ہے، بلکہ اپنی کمالِ ترتیب و تالیف کی بناء پر ممتاز درجہ کا حامل ہے۔

جب متکلمین کے نزدیک اس کا اطلاق اوّل معلوم ہو گیا تو قرآنِ حکیم کا ان کے ہاں اطلاقِ ثانی کا سمجھنا آسان ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن، ایسے کلماتِ حکمیہ، ازلیہ، مرتبہ کا نام ہے جن میں تعاقب نہ ہو اور حروفِ لفظیہ، ذہنیہ اور روحانیہ سے مبرا اور خالی ہو۔ یہ کلام اللہ کی ایسی تعریف ہے جو کلام بشری نفسی کے حاصل مصدر والے معنی کے بہت مشابہ ہے۔

یہ قرآن کے دو اطلاقات ہیں عند المتکلمین، جیسا کہ آپ کو معلوم ہوئے۔ اس کے علاوہ متکلمین کے نزدیک قرآن کا ایک تیسرا اطلاق بھی ہے، لیکن اس میں علماءِ اصول، فقہاء اور علماءِ عربیت بھی شریک ہیں۔ اور وہ تیسرا اطلاق یہ ہے:

"قرآن، نام ہے ان الفاظ کا جو سورۃ الفاتحہ سے سورۃ الناس کے آخر تک نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئے۔"

جو ان خصوصیات کی بناء پر امتیازی شان رکھتا ہے جن کا ذکر ہم کچھ دیر بعد کریں گے۔

یہ تیسرا اطلاق دراصل ان ہی کلماتِ حکمیہ ازلیہ کے مظاہر اور صورتوں سے عبارت ہے جن کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کا اطلاق چوتھے اطلاق کے اعتبار سے ان نقوش پر بھی ہوتا ہے جو مصحف کی دو جلدوں کے درمیان مرقوم ہیں

اس اعتبار سے کہ وہ نقوش، صفتِ قدیمہ، غیبی کلمات اور نازل شدہ الفاظ پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ اطلاق شرعی اور عام ہے۔

ہم اس کی مثال سے وضاحت کیے دیتے ہیں تا کہ بات واضح ہو جائے کیونکہ یہ ایسا موقع ہے جہاں انسان کی عقل بھٹک جاتی ہے اور قدم پھسل جاتے ہیں۔ ایک شاعر آدمی ہے، جیسے شرف الدین بوصیری رحمۃ اللہ علیہ، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے دِل میں شاعری کی صلاحیت رکھتے تھے، انہیں اس بات کی مہارت تھی کہ جیسے چاہتے عمدہ قصیدے بنا لیتے۔ لیکن جب انہوں نے حضورِ اکرم ﷺ کی شان مدح اپنے معروف قصیدہ ہمزیہ میں بیان کی تو اس وقت ان کی شاعری کی حقیقت سب کے سامنے آئی کہ بلاشبہ انہوں نے اپنے دِل و دماغ میں پہلے الفاظ، معانی اور اوزان کا چناؤ کر کے ایک نظم کو تیار کیا پھر اس سے ایک ایسا پر اثر قصیدہ سامنے آیا کہ جب حسی صوت میں اسے پڑھا تو پورا مقفّٰی اور موزون شکل میں تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اس قصیدہ کو اپنی زبان سے پڑھا۔ پھر پڑھنے کے بعد اس کو لکھا۔ چنانچہ حضور ﷺ کی شان مدح میں پڑھا جانے والا یہ قصیدہ ہمزیہ ایسا ہے کہ ہم اس پر مذکورہ قرآن کے چاروں اطلاقات کا اطلاق کر سکتے ہیں۔ ہم اس قصیدہ ہمزیہ کا اطلاق اس آدمی کی قوتِ شاعری پر کر سکتے ہیں اس خاص نظم کے اعتبار سے جس (نظم) کی اس آدمی نے اپنے ذہن میں الفاظ و نقوش سے پہلے صورت تیار کی، اور ہم اس کا اطلاق اس خاص نظم پر بھی کر سکتے ہیں جس کی اس نے اپنے ذہن میں صورت بنائی اس سے پہلے کہ وہ اس کے الفاظ و نقوش کی صورت کو ظاہر کرے۔

نیز ہم اس کا اطلاق اس نظم پر کر سکتے ہیں بعد اس کے کہ اس آدمی نے اس نظم کے اصوات، الفاظ، نقوش اور حروف موزونہ بنا لیے۔

اسی طرح ہم اس نظم پر اس کا اطلاق کر سکتے ہیں جب کہ وہ نظم اپنی مرسوم صورت اور مکتوب نقوش میں متشکل ہو چکی ہو۔

قرآن، علماءِ اصول، فقہاء اور علمائے عربیت کے نزدیک

میرے خیال میں میں نے بات طویل کر دی، لیکن کیا کریں یہ مقام ہی بڑا دقیق اور پر خطر ہے۔ لہٰذا آپ اس طویل بحث سے تنگ دل نہ ہوں۔ میں نے قرآن کے معنی و مفہوم کے بیان کا جو وعدہ کیا تھا اسے توجہ سے ملاحظہ کریں کہ قرآن کا اطلاق ان الفاظ پر ہوتا ہے جو سورۃ الفاتحہ سے لے کر سورۃ الناس کے آخر تک نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اس اطلاق کی نسبت، علماءِ اصول، فقہاء اور علماءِ عربیت کی طرف کی جاتی ہے، متکلمین حضرات بھی اس میں ان کے ہم نوا ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس کا اطلاق مذکورہ تعریف (حضور ﷺ پر نازل شدہ الفاظ) پر کیا ہے، ان کا اس کی تعریف میں باہم اختلاف ہے۔ بعضوں نے اس کی تعریف میں اطناب اور طوالت سے کام لیا ہے کہ اس میں قرآن کریم کے تمام ممتاز اوصاف و خصائص کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور بعضوں نے اس کی تعریف میں اختصار سے کام لیا ہے اور کچھ لوگوں نے اس میں اعتدال اور توسط سے کام لیا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس کی تعریف میں طوالت سے کام لیا ہے، انہوں نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

"قرآن وہ کلام معجز ہے جو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا، مصاحف میں لکھا گیا، تواتر کے ساتھ نقل کیا گیا اور جس کی تلاوت امرِ تعبدی کے طور پر کی جاتی ہے۔"

آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ یہ تعریف کتنی جامع ہے کہ اس میں قرآن کے اعجاز، حضور ﷺ پر اس کے نزول، مصاحف میں

اس کا مکتوب ہونا، تواتر کے ساتھ منقول ہونا اور تلاوت امرِ تعبدی ہونا سب کو شامل ہے۔ یہی وہ عظیم خصوصیات ہیں جن کی بناء پر قرآن کریم دیگر کتب سے ممتاز ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کے علاوہ اور خصوصیات بھی ہیں جن کی وجہ سے قرآن پاک امتیازی شان رکھتا ہے۔ آپ پر یہ بات مخفی نہیں کہ مذکورہ تعریف میں صرف بعض اوصاف کا ذکر کر دینا کافی تھا، اس طرح بھی تعریف جامع و مانع ہو جاتی، لیکن چوں کہ یہ مقام، مقامِ تعریف ہے اس لیے اس کے مناسب یہی تھا کہ تعریف میں طوالت سے کام لیا جائے، تاکہ اس کی مزید وضاحت کا مقصد حاصل ہو۔

اسی مقصد کی خاطر علماء نے اس کی تعریف میں خوب اضافہ کیا۔

جن لوگوں نے اس کی تعریف میں اختصار سے کام لیا، ان میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے صرف ایک وصف یعنی قرآن کے اعجاز کے ذکر کرنے پر اکتفاء کیا۔ اور اس اکتفاء کے بارے میں ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اعجاز، قرآن کا وصفِ ذاتی ہے۔ نیز یہ نبی کریم ﷺ کی صداقت کی بڑی نشانی ہے اور اس بات پر شاہدِ عدل ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔

اور ان میں کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے دو اوصاف پر اکتفاء کیا، یعنی قرآن کا نزول اور اعجاز۔ ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ ان دو اوصاف کے علاوہ دیگر امور، قرآن کی صفاتِ لازمہ میں سے نہیں ہیں، جس کی دلیل یہ ہے کہ قرآنِ حکیم، عہدِ نبوت میں صرف ان ہی دو صفات کے ساتھ حقیقت میں ثابت ہوا ہے۔ اور ان میں کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے مصاحف میں مکتوب ہونے اور تواتر کے ساتھ منقول ہونے کے دو اوصاف کے ذکر کرنے پر اکتفاء کیا، کیونکہ ان دونوں وصفوں سے اصل مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ اور وہ اصل مقصد، قرآن کا بیان اور ماسوا سے اس کو ممتاز کرنا ہے۔

جن لوگوں نے اس کی تعریف میں اعتدال اور توسط سے کام لیا، ان میں بھی کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے صرف نزول الفاظ، مصاحف میں اس کی کتابت اور تواتر کے ساتھ اس کا نقل ہونا ذکر کیا ہے۔ اور اس کی توجیہ وہ یہ کرتے ہیں کہ اصل مقصد یہ ہے کہ جن لوگوں نے نبوت کا زمانہ نہیں پایا ان کو قرآن سے روشناس کرایا جائے چنانچہ ایسے لوگوں کے لیے مذکورہ تین اوصاف کافی ہوں گے۔ جبکہ قرآن کا اعجاز ایسے لوگوں کی نسبت سے بیان کرنا ضروری نہیں ہے اور وصفِ لازم بھی نہیں ہے، جب کہ یہ قرآن کی سورت سے کم ہو۔

ان میں کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے تعریف میں صرف نزولِ الفاظ، نقلِ تواتر اور تلاوت کا امرِ تعبدی ہونا ذکر کیا ہے، جس کا سبب یہ ہے کہ علماءِ اصول کی غرض و مقصد کے یہی مناسب ہے۔ چنانچہ انہوں نے قرآن کی تعریف ان الفاظ کے ساتھ کی ہے:

"اللفظ المنزل على النبي ﷺ المنقول عنه بالتواتر، المتعبد بتلاوته."

"قرآن نام ہے ان الفاظ کا جو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئے۔ آپ ﷺ سے تواتر کے ساتھ نقل ہوئے اور جن کی تلاوت امرِ تعبدی کے طور پر کی جاتی ہے۔"

اس تعریف میں "اللفظ" بمنزلہ جنس کے ہے جو مفرد اور مرکب دونوں کو شامل ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ احکام پر استدلال جس طرح مرکبات سے ہوتا ہے اسی طرح مفردات سے بھی ہوتا ہے، جیسے عام، خاص، مطلق، مقید۔ اس تعریف کے الفاظ "المنزل على النبي صلى الله عليه وسلم" سے خارج ہو جاتے ہیں ایسے الفاظ جو بالکل نازل ہی نہیں ہوئے جیسے ہمارا کلام، اور

حدیثِ نبوی ﷺ، نیز اس سے وہ الفاظ بھی تعریف سے خارج ہو جاتے ہیں جو غیر نبی ﷺ پر نازل ہوئے ہوں، جیسے تورات، انجیل، اسی طرح "المنقول عنه بالتواتر" کی قید سے وہ تمام الفاظ بھی تعریف سے خارج ہو جائیں گے جو قرآن کے ماسوا ہیں، جیسے منسوخ التلاوۃ اور قراءات غیر متواترہ، خواہ وہ قراءات مشہورہ ہوں جیسے قراءتِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں ﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ﴾ (البقرۃ:۱۹۶) کے بعد "متتابعاتٍ" کے الفاظ آتے ہیں، یا وہ قراءات آحاد ہوں، جیسے ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ ہی کی قراءت میں ﴿وَ مَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ ... الخ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) کے بعد "متتابعاتٍ" کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ ان میں سے کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جسے ہم "قرآن" کے ساتھ موسوم کریں یا اس کو قرآن کا حکم قرار دیں۔ مذکورہ تعریف میں "المتعبد بتلاوته" کی قید سے احادیث قدسیہ خارج ہو جائیں گی۔

کیا "قرآن" اسمِ علم ہے

ہم پہلے یہ بات ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن کا اطلاق صفت قدیمہ پر ہوتا ہے، نیز اس کا اطلاق کلماتِ حکمیہ ازلیہ پر بھی ہوتا ہے۔

قرآن کے ان دو اطلاقات میں تعدد بالکل نہیں ہے، نہ حقیقت کے اعتبار سے اور نہ ہی مجاز کے لحاظ سے۔ بلکہ دونوں اس سے منتفی ہیں۔ اس لیے کہ تعدد، حدوث کی علامت ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ اس میں تعدد ہو، حالانکہ یہ دونوں اطلاقات قدیم ہیں۔

یہ امر یقینی ہے کہ ان دو اطلاقات کے لحاظ سے لفظِ قرآن ایک اسمِ علم ہے۔ لیکن جب قرآن سے "لفظِ منزل" مراد ہوگا تو اس صورت میں اختلاف ہوگا۔

البتہ درست رائے یہ ہے کہ یہ اسمِ علم ہے، اس کا مدلول وہ آیاتِ منزلہ ہیں جو سورۃ الفاتحہ کی ابتداء سے لے کر سورۃ الناس کے آخر تک اپنی بلند خصوصیات کے ساتھ ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ ان الفاظ معینہ کے تشخص اور اسمِ علم ہونے میں تلفظ کرنے والوں کا اختلاف یا قراءت کرنے والوں کا تعدد کوئی قدغن نہیں لگاتا ہے۔ مثلاً محمود کا مکہ یا مدینہ میں ہونا اس کے اسمِ علم ہونے میں کوئی عیب نہیں لگاتا، اور اسی طرح اگر محمود (مثال کے طور پر) زمانۂ طفولت سے زمانۂ شیخوخت میں منقلب ہوتا ہے یا صحت سے مرض کی طرف یا زندگی سے موت کی جانب پلٹتا ہے تو اس سے اس کا اسمِ علم ہونا برقرار ہی رہے گا۔

بعض اہل علم نے قرآن کو علمِ جنس قرار دیا ہے، اس کا منشاء، قارئین اور کاتبین کے تعدد کی وجہ سے اس کے الفاظ منزلہ کا تعدد ہے۔ لیکن یہ قول بدو وجہ مردود ہے:

① علمِ جنس ایک نحوی ضرورت ہے جس کا تقاضا لفظی احکام کرتے ہیں، جیسے اس کی دوسرے اسم کی طرف اضافت کا ناجائز ہونا اور الف لام کا اس پر دخول ممنوع ہونا، حالانکہ اس مقام پر کوئی لفظی ضرورت موجود نہیں ہے۔

② علمِ جنس معنی کے اعتبار سے نکرہ ہوتا ہے، اور اس کے افراد حقیقتاً متعدد ہوتے ہیں نہ کہ اعتباراً۔ حالانکہ یہاں پر قابلِ لحاظ تعدد صرف اعتباری ہوتا ہے۔ حقیقی نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ بات قطعی ہے کہ ہم میں سے جو بھی اس قرآن کو پڑھتا ہے یا لکھتا ہے تو یہ بعینہٖ قرآن ہے، اس کا کوئی فرد نہیں ہے۔

کیا اسمِ علم، تعریف کو قبول کرتا ہے؟

اب ہمارے ذمہ یہ بات بتانا باقی ہے کہ اگر "قرآن" اسمِ علم ہے تو پھر یہ تعریف (معرفہ ہونا) کو کیسے قبول کرتا ہے؟ جبکہ تعریف تو صرف کلیات

کی ہوتی ہے، جو اسمِ علم ہو وہ تو کلی نہیں ہوتا بلکہ جزئی ہوتا ہے جو ماہیت اور اس کی مشخصات سے مرکب ہوتی ہے۔ اور مشخصات کی معرفت صرف حواس سے ہی ممکن ہوتی ہے، جیسے اشارہ سے اسمِ علم کو تعبیر کیا جاتا ہے؟

ہم اس کے تین جوابات دیتے ہیں:

① ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ تعریف صرف کلیات کی ہوتی ہے۔ یہ بات کیوں کرنا جائز ہے کہ جزئیات کی ایسے امورِ کلیہ کے ساتھ تعریف کی جائے جن کا مجموعہ خارج میں صرف اسی شخص میں متحقق ہو؟ یہ جواب، تقریباً وہی ہے جو صاحب تلویح نے دیا ہے، اس لیے کہ صاحب تلویح لکھتے ہیں کہ:

"تحقیقی امر یہ ہے کہ ایک شخص کی ایسے امور کے ساتھ تعریف کرنا ممکن ہے کہ جس سے اس کا اپنے ماسوا سے وجود کے اعتبار سے امتیاز کا فائدہ حاصل ہو، نہ کہ ایسے امور سے کہ اس سے اس کا تشخص اور تعین معلوم ہوتا ہو اس طرح سے کہ عقل کے اعتبار سے اس کا کثیر افراد میں اشتراک ناممکن ہو، کیونکہ یہ امر صرف اشارہ کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتا ہے۔"

② ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تعریف صرف کلیات کی ہوتی ہے، لیکن ان حضرات نے جو چیز ذکر کی ہے وہ اس کی حقیقی تعریف نہیں ہے بلکہ صرف ایک ضابطہ ہے جس سے دیگر امور سے امتیاز ہو جاتا ہے، کوئی مُعَرِّف نہیں ہے۔

③ مذکورہ تعریف اصل میں ان علماءِ اصول کی رائے کے مطابق کی گئی ہے جو تعریف میں جنس اور فصل کی شرط نہیں لگاتے، بلکہ ان کے نزدیک تعریف کے لیے بس جامع و مانع ہونا ضروری ہے۔ بنابریں علماءِ اصول کی رائے میں ایک شخص کی تعریف کرنا درست قرار پائے گا، جبکہ مناطقہ کی رائے اس کے خلاف ہے۔

"قرآن" کا کل اور بعض پر اطلاق کرنا

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کا اطلاق کل اور بعض دونوں پر کیا جاتا ہے، کیونکہ جو شخص پورا قرآن پڑھے اس کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے قرآن پڑھا اور جو شخص قرآن کی ایک آیت تلاوت کرے اس کے بارے میں بھی یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے قرآن پڑھا۔ لیکن اہل علم کا اس بارے میں کچھ اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ لفظِ قرآن ان دونوں کے حق میں حقیقت ہے، اس صورت میں یہ مشترک لفظی ہوگا، جبکہ بعض کا خیال ہے کہ لفظِ قرآن ان دونوں کے حق میں حقیقت نہیں بلکہ مقدر ہے، اس صورت میں یہ مشترک معنوی ہوگا اور اس کا مدلول کلی ہوگا۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن کا اطلاق "کل" پر حقیقت اور "بعض" پر مجاز ہے۔ جبکہ امرِ محقق یہ ہے کہ لفظِ قرآن، مشترک لفظی ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے اطلاق سے متبادر فی الذہن کل اور بعض دونوں ہوتے ہیں۔ اور یہ چیز حقیقت کی علامت ہے۔ قرآن کے اسمِ علم ہونے کا قول، جیسا کہ ہم کچھ پہلے تحقیق کے ساتھ بیان کر چکے ہیں، یہ چیز اس کے مشترکِ معنوی مراد لینے سے مانع ہے۔ لہٰذا یہ بات متعین ہوگئی کہ یہ مشترکِ لفظی ہے۔ فقہائے کرام کے کلام سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر فقہاء نے لکھا ہے کہ:

"جُنبی شخص کے لیے قرآن کا پڑھنا حرام ہے۔"

اس سے ان کی مراد عام ہے خواہ سارا قرآن ہو یا اس کا کچھ حصہ، مطلقاً اس کے پڑھنے کی حرمت مراد ہوتی ہے۔

"علوم القرآن" کا معنی اضافی کے اعتبار سے مفہوم

یہاں تک ہم "علوم القرآن" کے الفاظ کے بارے میں علمائے کرام کی بحث وگفتگو کو ختم کر چکے۔اب ہم آپ کے سامنے یہ بات بتاتے ہیں کہ "علوم القرآن" کے الفاظ میں علوم کی القرآن کی طرف اضافت کرنا قرآن سے متعلق بہت سے معارف کی طرف اشارہ کرتا ہے، خواہ وہ تصورات ہوں یا تصدیقات، جیسا کہ آپ اس سے پہلے تدوین عام کے عرف میں لفظ علم کے مدلول کے بارے میں اس کے انتخاب کی وجہ جان چکے ہیں۔ "علوم القرآن" سے اس بات کی طرف اشارہ موجود ہے کہ کوئی ایک علم نہیں بلکہ متعدد علوم کا اس قرآن سے تعلق ہے، اس میں ہر وہ علم شامل ہوگا جو قرآن کا خادم اور اس کی طرف مستند ہو۔ چنانچہ اس میں علمِ تفسیر، علمِ قراءات، علمِ رسمِ عثمانی، علمِ اعجاز القرآن، علمِ اسبابِ نزول، علمِ ناسخ ومنسوخ، علمِ اعرابِ قرآن، علمِ غریبِ قرآن، اور اس کے علاوہ دین ولغت کے علوم شامل ہیں۔ یہ مختلف علوم ہیں امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں وسعت اختیار کرتے ہوئے علم ہیئت، ہندسہ اور طب وغیرہ کو بھی شامل کر دیا ہے، اس کے بعد انہوں نے ابوبکر بن العربی سے قانون التاویل کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ: "قرآن کے علوم ستتر ہزار چار سو پچاس (۷۷۴۵۰) ہیں، اور پھر کلمات قرآن کی تعداد کو مزید چار میں ضرب دی جائے گی، کیونکہ ہر کلمہ کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، اسی طرح ہر کلمہ کی ایک حد ہے اور ایک مطلع۔ یہ حساب صرف مفردات کے لحاظ سے ہے، اگر اس کے ساتھ مرکبات اور ان کے مابین روابط کا بھی اعتبار کر لیا جائے تو پھر ان کی تعداد شمار سے باہر ہوگی، جس کا علم، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔"

میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ بات معلوم کریں کہ سیوطی اور ابن العربی کا یہ کلام، تاویل وتوسع کے اعتبار سے ایک بہت بڑی ضرب پر محمول ہے بایں طور کہ "علوم" سے وہ تمام معارف مراد لیے جائیں جن پر قرآن دلالت کرتا ہے، خواہ وہ علوم مدوّنہ ہوں یا غیر مدوّنہ، نیز خواہ وہ دلالت صراحۃً ہو یا اشارۃً، قریبی ہو یا بعیدی، کیونکہ اگر اس سے ان کی مراد علوم مدونہ صریحہ ہوں تو یقیناً یہ امر ایسا ہے کہ اس کا حصول بغیر مشقت عظیمہ کے ممکن نہیں ہے۔

قرآن، کتابِ ہدایت واعجاز

اس موضوع پر تحقیقی قول یہ ہے کہ قرآنِ کریم، کتابِ ہدایت اور کتابِ اعجاز ہے، ان دو عظیم مقاصد کی وجہ سے اس کا نزول بھی ہوا اور ان ہی دو مقاصد کے بارے میں یہ بحث کرتا ہے اور ان پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا جو علم بھی قرآن سے اس کی قرآنیت کے پہلو سے تعلق رکھتا ہو یا اس کی ہدایت یا اعجاز کے پہلو سے قرآن سے تعلق رکھتا ہو وہ علوم قرآن کا حصہ ہے۔ یہ بات علومِ دینیہ وعربیہ کے بارے میں تو بالکل واضح ہے۔

البتہ وہ علوم کونیہ یا معارف وصنائع، اسی طرح اس عالم میں جو فنون ومعارف نت نئی سامنے آ رہے ہیں جیسے علم ہندسہ وحساب، علم ہیئت وفلکیات، علم اقتصادیات ومعاشرت، علم طبیعات، کیمیاء اور علم نباتات وحیوانات وغیرہ۔ ان کو علوم قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن کا نزول اس لیے نہیں ہوا کہ اس سے مثلاً ہندسہ وحساب کے نظریات معلوم ہوں اور نہ ہی اس لیے ہوا کہ اس کے قوانین کی تائید وتاکید کی جائے۔ اسی طرح یہ علم ہندسہ وحساب بھی اس لیے وضع نہیں ہوا کہ اس سے قرآن کی آیات کی تشریح میں مدد لی جائے یا قرآن کے اسرار ورموز کو کھولا جائے۔ یہی حال دیگر علوم کونیہ اور عالمی صنائع ومعارف کا ہے... یہ الگ بات ہے کہ

قرآن نے مسلمانوں کو ان فنون وعلوم کو سیکھنے بلکہ بوقتِ ضرورت ان میں مہارت حاصل کرنے کی دعوت دی ہے۔ ہمارا ماننا یہ ہے کہ ان کائناتی اور صنعتی علوم وفنون کا علوم قرآن سے اس طرح تعلق نہیں ہے کہ وہ ان علوم کا حصّہ ہوں، جبکہ قرآن ان کے سیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے یعنی ایک تو قرآن کا اِن فنون وصنائع کے سیکھنے کی عمومی یا خصوصی طور پر ترغیب دینا اور دوسرا یہ کہ قرآن کا کسی علم کے مسائل اور احکام پر دلالت کرنا اور اس کی طرف راہنمائی کرنا۔ یا ایسا علم جو قرآن کے احکام ومسائل یا اس کے مفردات کا خادم ومعاون ہو۔ (ان امور میں بہت فرق ہے) پہلی بات تو بالکل واضح ہے کہ اس کا علوم قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے، جبکہ دوسری بات اس کے برخلاف ہے، اور اسی بات کی طرف ہم آپ کی راہ نمائی کرنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ اس کے حصول کی طرف راغب ہوں۔

قرآن کائناتی علوم سے انتفاع کی ترغیب دیتا ہے

یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ قرآن کریم، کائناتی علوم اور عالمی صنعتوں کی معرفت کی ترغیب دیتا ہے اور اس بات پر مسلمانوں کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ کائنات میں موجود ہر چیز سے انتفاع کریں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (یونس:۱۰۱)

"آپ فرمادیں کہ تم غور کرو کہ آسمانوں اور زمین میں کیا ہے۔"

نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾ (الجاثیۃ:۱۳)

"اور اس نے تمہارے لیے آسمان وزمین کی تمام تر چیز مسخر کردیں، بلاشبہ اس میں غور وفکر کرنے والی قوم کے لیے نشانیاں ہیں۔"

ہم مسلمان ان احکامات کے مخاطب ہیں، اس لیے ان کے لیے یہ امر مناسب نہیں کہ وہ ان عمومی منافع سے کسی طرح بھی راہِ فرار اختیار کریں، اور یہ بھی نامناسب ہے کہ ان کائناتی علوم سے بے رغبتی اختیار کریں۔ اسی طرح یہ بات بھی مناسب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ عظیم قویٰ کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے آپ کو ان فوائد وثمرات سے محروم کریں جو اس کی زمین وآسمان کے خزانوں میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علماء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ ان علومِ کونیہ اور صنعتی فنون کا سیکھنا اور ان میں مہارت حاصل کرنا فرضِ کفایہ ہے۔ جب تک فرد یا جماعت کی مصلحت اس سے وابستہ رہے اور اس کی ضرورت پیش آتی رہی اس کا سیکھنا فرضِ کفایہ ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دُنیا میں اسی کو بقاء اور حیات حاصل ہے جو ہتھیار بند ہو اور ہر دور کا اسلحہ اور ہتھیار عام ہوتا ہے اور اس زمانے کا اسلحہ خاص ہے جو علوم وفنون اور مختلف صنعتوں میں سبقت اور مہارت حاصل کرنے پر مبنی ہے، جو ہم میں طاقت ور ہوگا وہی خوش بخت ہوگا اور جو کمزور ہوگا وہی بدقسمت اور باعثِ ہلاکت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾ (الانفال:۶۰)

"اور ان کے لیے حسب استطاعت ہر طرح کی قوت تیار رکھو۔"

مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

"طاقتور مومن کمزور مومن سے بہت بہتر ہے، خیر ہر ایک میں ہے، اس چیز میں حرص کرو جو تجھے نفع دے اور اللہ سے مدد چاہو اور بے بس نہ بنو، اگر کوئی بات تجھے پیش آئے تو یوں نہ کہو کہ اگر میں یوں کر لیتا تو یوں ہو جاتا، بلکہ یوں کہو کہ: اللہ نے مقدر فرما دیا تھا اور جو وہ چاہتا ہے وہی کرتا ہے، کیونکہ اگر تو شیطان کے عمل کو کھول دے گا......." ①

قرآن کا سائنسی اعجاز

میری خواہش ہے کہ میں اس موضوع کو ختم کرنے سے پہلے ایک قابلِ قدر اور لائق توجہ امر کی طرف آپ کو متوجہ کروں! وہ یہ ہے کہ قرآن کریم جب مخلوق پر اپنا اعجاز اور ہدایت پیش کرتا ہے تو ان کی عقلوں پر حکمرانی کرتا نظر آتا ہے اور لوگوں کی آنکھیں اس کائناتِ ارض وسماء کی جانب کھولتا ہے کہ وہ اس بر و بحر، حیوانات و نباتات، ظواہر و بواطن، سنن و عادات میں غور و فکر کریں، نیز قرآن اپنے اس پیش کش میں سب کو پوری طرح اسباب و وسائل فراہم کرتا ہے، بلکہ وہ اس اندازِ پیش کشی میں ایک کھلا ہوا معجزہ ہے، اس لیے کہ اس کائنات کے متعلق گفتگو وہ ذات کر رہی ہوتی ہے جو اس کائنات کے اسرار سے بخوبی واقف ہے، جو اس کے دقائق سے پوری طرح باخبر اور اس کے علوم و معارف کا احاطہ کیے ہوئے ہے، ٹھیک ایسے لمحہ میں ایک ایسا امی شخص اس قرآن کو لاتا ہے جس کی نشوونما بھی امی اور ان پڑھ قوم میں ہوئی تھی۔ ان علوم سے اور ان کی جمع و تدوین سے اس قوم کا کوئی سروکار نہیں اور نہ ہی ان علوم کے مباحث اور ان کے لکھنے لکھانے سے اس کا کوئی واسطہ اور تعلق تھا، بلکہ ان میں سے بعض علوم تو عہدِ نبوت اور نزولِ وحی کے کئی صدیوں بعد وجود میں آئے، ایسے حالات میں ایک امی شخص یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کیسے ممکن تھا کہ وہ ایسی جامع علوم و معارف کتاب لے آئیں! اگر یہ کہا جائے کہ یہ قرآن اس ذاتِ حکیم و علیم کی جانب سے نہیں ہے؟! اللہ تعالیٰ اس سائنسی اعجاز کی تصدیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾ (العنکبوت: ۴۸،۴۹)

"اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے ایسا ہوتا تو اہل باطل ضرور شک کرتے۔ بلکہ یہ روشن آیتیں ہیں جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے ان کے سینوں میں (محفوظ) ہیں۔ ہماری آیتوں سے وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو بے انصاف ہیں۔"

ممکن ہے یہ بات حکمت و دانائی کی ہو کہ ہم آپ کے سامنے قرآن کریم سے دو نمونے بطور مثال پیش کرتے ہیں:

پہلا نمونہ سورۃ النور میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاۗءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَاۗءُ ۭ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ۝﴾ (النور: ۴۳)

---

① صحیح مسلم، کتاب القدر ۳٤

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا ہی بادلوں کو چلاتا ہے پھر ان کو آپس میں ملا دیتا ہے اور ان کو تہ بہ تہ کر دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ بادل میں سے مینہ نکل (کر برس) رہا ہے اور آسمان میں جو (اولوں کے) پہاڑ ہیں ان سے اولے نازل کرتا ہے تو جس پر چاہتا ہے اس کو برسا دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ہٹا دیتا ہے اور بادل میں جو بجلی ہوتی ہے اس کی چمک آنکھوں کو (خیرہ کر کے بینائی کو) اُچکے لیے جاتی ہے۔"

مجھے سچ بتایئے کہ ان آیات کو پڑھتے ہوئے، آپ کے قلب و ذہن کو اس کی اثر انگیزی نے نہیں گھیرا؟ اس میں سحاب، مطر اور برق جیسے طبعی امور نے کیسے کیسے سائنسی نظریات کو وجود دیا ہے!

دوسرا نمونہ اللہ تعالیٰ، سورۃ القیامۃ میں انسان کے اعادے اور بعث الموت پر اپنی کمالِ قدرت کو ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿اَيَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ ؕ۝ بَلٰى قٰدِرِيۡنَ عَلٰٓى اَنۡ نُّسَوِّىَ بَنَانَهٗ ۝﴾ (القیامۃ: ۳،۴)

"کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی (بکھری ہوئی) ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے۔ ضرور کریں گے اور ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کریں۔"

مجھے امید ہے کہ آپ اس مقام پر خصوصیت سے بنان (پورے) کے ذکر پر ذرا غور کریں گے اور پھر موجودہ دور کے نو پیدا شدہ علم یعنی علم تحقیق شخصیت کو بھی ملاحظہ کریں گے تو یہ بات ثابت ہوگی کہ انسانی جسم میں سب سے دقیق اور عجیب ترین چیز پوروں کی درستی ہے، یہاں تک کہ کسی انسان کے پورے دوسرے کے پورے سے بالکل مشابہ نہیں ہو سکتے۔ اب لوگوں کا حال یہ ہے کہ اپنے بہت سے معاملات میں انسان کے اسی پورے کو فیصلہ کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ فتبارك الله احسن الخالقین.

میں چاہوں گا کہ میں اس بات کو ذرا طول دوں، قرآن کے معجزات علمیہ کو بیان کرنے کے لیے ایک الگ میدان ہے۔ یہ چند باتیں تھیں اور ایک اچٹتی ہوئی نظر تھی جس سے علوم القرآن کی مراد کو واضح کرنا مقصود تھا۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے الاتقان میں اس پر بھر پور کلام کیا ہے اور ابن العربی رحمہ اللہ نے قانون التأویل میں اس بارے میں جو کچھ ذکر کیا ہے ہم اس سے معذرت کرتے ہیں۔

اللہ کی ذات ہی اپنی کتاب کے اسرار کا احاطہ کرنے والی ہے۔ یہ کائنات اور اس میں پیدا ہونے والے تمام علوم و فنون سب برابر اس قرآن کی تشریح و تفسیر کرتے رہیں گے اور اس قرآن کے اسرار و اعجاز کے بہت سے پہلوؤں کو بے نقاب کرتے رہیں گے۔ اس بات کی تصدیق اس فرمان باری تعالیٰ سے ہوتی ہے:

﴿سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِى الۡاٰفَاقِ وَفِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَـقُّ ؕ﴾ (فصلت: ۵۳)

"ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ (قرآن) حق ہے۔"

نیز فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۱﴾ (یوسف:۲۱)

"اور خدا اپنے کام پر غالب ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

علومِ قرآن، فنِ مدوّن کے اعتبار سے اور اس کا موضوع اور فائدہ

اس سے پہلے آپ کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ "علوم القرآن" کا لفظ اپنے معنی اضافی کے اعتبار سے تمام علوم دینیہ وعربیہ کو شامل ہے، اب ہم آپ کو اس بات کا فائدہ دیتے ہیں کہ یہ لفظ اس معنی اضافی سے منقول ہو کر بعد میں ایک مدوّن فن کے لیے بطورِ علم استعمال ہونے لگا۔ اور منقول ہونے کے بعد اس کا مدلول بن گیا ہے اور اب یہ علم ہے جو کہ منقول ہونے سے پہلے اس کا مدلول نہیں تھا بلکہ ایک مرکب اضافی تھا، جس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ فن، علوم دینیہ وعربیہ کے مجموعہ کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ ہے۔ اگرچہ ان علوم سے مستفاد ضرور ہے اور اس سے اخذ کردہ ہے۔ ہم اس کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ یہ چند مباحث ہیں جو نزول وترتیب، جمع وکتابت، قراءات وتفسیر واعجاز، ناسخ ومنسوخ اور دفع شبہات وغیرہ کے اعتبار سے قرآنِ حکیم سے تعلق رکھتے ہیں۔

اور اس کا موضوع تعریف میں مذکور پہلوؤں کے پیش نظر قرآن کریم ہے۔

جبکہ معنی اضافی کے اعتبار سے علوم القرآن اس کے برخلاف ہے، کیونکہ اس کا موضوع ان علوم کے موضوعات کا مجموعہ ہے جو اس کے تحت داخل ہیں، ان میں سے ہر ایک کا موضوع قرآن کریم ہے ان پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کے اعتبار سے۔ مثال کے طور پر علم قراءات کا موضوع قرآن کریم ہے اس کے لفظ اور ادا کے پہلو سے، علم تفسیر کا موضوع بھی قرآن کریم ہے اس کی تشریح اور مفہوم کے اعتبار سے۔ اسی طرح دیگر علوم قرآن کا حال سمجھ لیجیے۔

اس علم کا فائدہ قرآن کریم کی عام اور بلند ثقافت اور اس میں موجود قیمتی علوم ومعارف سے آگاہی ہے، اس کے ذریعہ کتابِ عزیز کی بہترین دفاع کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، نیز اس علم سے قرآنی تفسیر میں غوطہ زنی کرنا آسان ہو جاتا ہے گویا یہ علم مفسرین کے لیے ایک کنجی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی مثال علوم حدیث کی بھی ہے اس کے لیے جو علم حدیث پڑھنا چاہتا ہو۔

امام سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الاتقان" کے خطبہ میں اس بات کی تصریح کی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ: "میں زمانہ طالب علمی میں متقدمین علماء سے تعجب کیا کرتا تھا کہ انہوں نے علوم قرآن کی انواع پر کوئی کتاب مدوّن نہیں کی، جیسا کہ علم حدیث کی نسبت سے کتابیں لکھی ہیں۔"

پھر میں نے "التبیان فی علوم القرآن" کے مصنف رحمہ اللہ کو بھی دیکھا کہ انہوں نے بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے، انہوں نے اپنی کتاب کے شروع ہی میں یہ الفاظ لکھے ہیں:

"وهذا هو المقدمة الصغرى من مقدمتي التفسير"

یعنی یہ تفسیر کے دو مقدموں میں سے چھوٹا مقدمہ ہے۔

اس علم کا نام جمع کے ساتھ علوم القرآن رکھا گیا ہے، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ علم، متنوع علوم کا حاصل اور خلاصہ ہے، اس اعتبار سے کہ اس کے تدوین شدہ مباحث پورے وثوق کے ساتھ علوم دینیہ اور علوم عربیہ سے تعلق رکھتے ہیں، حتیٰ کہ اس کی ہر بحث اس امر کے لائق ہے کہ اس کو ان علوم میں سے کسی علم کی لڑی میں پرو دیا جائے۔

چنانچہ اس کی ان علوم کی طرف نسبت ایسی ہے جیسے فرع کی اصول کی طرف یا دلیل کی اپنے مدلول کی طرف ہوتی ہے۔ گلاب و یاسمین کے بنے اس گلدستہ کی اس گلستان سے کس قدر مشابہت ہے جو نوع بہ نوع پھولوں اور خوشبوؤں سے لبریز ہو۔

والحمد للہ رب العالمین

بحث ②

تاریخ علوم القرآن

یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ علوم القرآن کا فن بعد میں مدون ہوا۔لیکن اس کی اساس حضور اکرم ﷺ کے مبارک دور میں بھی موجود تھی۔اس باب میں علوم القرآن کی ابتداء سے لے کر موجودہ دور تک کے تمام مراحل کو بیان کیا جائے گا۔

علوم القرآن کی تدوین سے پہلے کا دور

یہ دور حضور اکرم ﷺ اور اُن کے جانثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے۔ یہ حضرات اہل عرب تھے۔عربی زبان میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔قرآن اور علوم قرآن کو کما حقہ جانتے تھے۔حتیٰ کہ علوم قرآن سے متعلق وہ کچھ جانتے تھے جو بعد کے علماء وحکما بھی نہیں جان سکے۔لیکن ان حضرات کے دور میں اس علم کو ایک خاص انداز میں مدون نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ یہ حضرات خداداد صلاحیتوں کی بناء پر علوم قرآن کے تمام اسرار ورموز سے واقف تھے۔اس لیے اس دور میں علوم القرآن کے فن کو مدون کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

اس دور میں علوم القرآن کے مدون نہ کیے جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حضور اکرم ﷺ صاحب وحی لوگوں میں موجود تھے۔آپ ﷺ پر قرآن کا جو حصہ نازل ہوتا آپ ﷺ وہ صحابہ اکرم رضی اللہ عنہم کو پڑھ کر سنا دیتے۔ بلکہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنے عمل سے ان آیات کی تشریح بھی فرما دیتے۔آیات میں بیان کیے گئے اسرار کو اپنے فصیح وبلیغ اقوال وافعال سے واضح فرما دیتے۔ بلکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ﴾ (النحل:۴۴)

"اور ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تا کہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دو تا کہ وہ غور کریں۔"

اُس دور میں علوم القرآن کو ایک فن کی شکل میں مدون نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زبان خالص عربی تھی۔عرب کی تمام خصائص وفضائل مجمع تھے۔بہترین قوت حافظہ کے حامل تھے۔تقدیر وبیان اور خطابت کے تمام اسالیب سے واقف تھے۔ وزن شعر اور وزنِ کلام کے تمام معاییر سے باخبر تھے۔مختصر یہ کہ علوم القرآن کے تمام واجبات ولوازمات اور اسرار ورموز کے وہ فطرتاً عالم تھے۔ہم آج بھی اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علوم وفنون کا احاطہ کرسکیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور اکرم ﷺ کی صحبت میں بیٹھنے کی وجہ سے ان علوم ومعارف کے عالم بن چکے تھے کہ آج کے دور میں اگر ساری دنیا کے علماء وحکماء کو جمع کرلیا جائے اور ان کے علوم وحکم کو اکٹھا کرلیا جائے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علوم کے برابر ہرگز نہیں ہو سکتے۔اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں علوم القرآن کو مدوّن کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

اُس دور میں علوم القرآن کے مدون نہ ہونے کی وجہ ایک یہ بھی تھی اُس دور میں کتابت کے آلات اتنی کثیر مقدار میں میسر نہیں تھے کہ انھیں تمام مواقع میں استعمال کیا جائے۔

نیز وہ اسلام کا ابتدائی دور تھا۔ اس وقت یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر قرآن مجید کے علاوہ کسی اور چیز کو بھی لکھا گیا تو کہیں وہ لکھا ہوا مواد قرآن مجید کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائے۔ اسی وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے قرآن مجید کے علاوہ کچھ بھی لکھنے سے منع فرمایا تھا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَكْتُبُوا عَنِّي وَمَنْ كَتَبَ عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ فَلْيَمْحُهُ وَحَدِّثُوا عَنِّي فَلَا حَرَجَ وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)). (مسلم: ۳۰۰۴)

"میری کوئی بات مت لکھو۔ اور جس نے قرآن کے علاوہ کچھ اور لکھا ہو اُسے چاہیے کہ وہ اسے مٹا دے۔ میری احادیث کو (زبانی) بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور جس شخص نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا اُس کو چاہیے کہ وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنا لے۔

پس یہ وجوہات تھیں جن کی بناء پر علوم القرآن کے فن پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں کچھ نہیں لکھا گیا حالانکہ وہ علوم القرآن کے ماہر تھے۔ اسی حال میں کئی سال گزر گئے۔ حتیٰ کہ حضور اکرم ﷺ کا دورِ مبارک اور حضراتِ شیخین ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا دورِ مبارک بھی گزر گیا۔ لیکن علوم القرآن کو مدون نہیں کیا گیا۔

علوم قرآن کی تدوین کا تمہیدی دور

حضراتِ شیخین رضی اللہ عنہما کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور شروع ہوا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلام کو بہت فتوحات حاصل ہوئیں۔ اسلام پھیلتا ہوا عرب سے عجم میں پہنچ گیا۔ وہ اقوام و امم بھی اسلام میں داخل ہوئیں جو عربی سے ناواقف تھیں۔ ہر قوم قرآن کریم کو اپنے انداز و تلفظ میں پڑھنے لگی۔ یہ خوف دامن گیر ہوا کہ اگر اس بڑھتے ہوئے اختلاف کو روکا نہ گیا تو آنے والے وقت میں ایک بہت بڑا فتنہ اور فساد پیدا ہو جائے گا۔ ہر قوم و قبیلہ کہے گا کہ قرآن پڑھنے کا صحیح طریقہ وہ ہے جس پر میں عمل پیرا ہوں۔ لہٰذا اب ضرورت اس امر کی تھی کہ تمام اقوام و قبائل کو ایک مصحف پر جمع کیا جائے تاکہ آپس میں اختلافات کو ختم کیا جا سکے۔ لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ قرآن مجید کو ایک مصحف میں جمع کیا جائے۔ وہ مصحف "مصحفِ امام" کی حیثیت رکھتا ہو۔ اور اسی مصحفِ امام کی نقول تیار کروا کر تمام عالم اسلام میں ارسال کروائی جائیں۔ اس دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس مصحف اور اس کی نقول کے علاوہ جتنے مصاحف رائج تھے ان سب کو کالعدم کر دیا تاکہ اُمتِ مسلمہ ایک مصحف پر جمع ہو جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ کارنامہ اُمتِ محمدیہ ﷺ پر احسانِ عظیم ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس مصحفِ امام کو مصحفِ عثمانی کہا جاتا ہے۔ اس مصحف میں الفاظ کے لکھنے کے انداز کو "علم رسم القرآن" یا "علم الرسم العثمانی" کہا جاتا ہے۔

(اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ قرآنِ کریم کو رسم عثمانی کے خلاف کسی اور طریقے سے لکھنا جائز نہیں، چنانچہ اس کے بعد مصاحف اسی طریقہ کے مطابق لکھے گئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ نے مصاحفِ عثمانی کی نقول تیار کر کے قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی)۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس کارنامے سے ایک حد تک اختلافات تھم گئے۔ لیکن وقت گزرتا گیا حتیٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دور

آیا۔ اس دور میں ایک اور اندیشہ پیدا ہوا۔ اس اندیشے کا سبب یہ تھا کہ اس وقت تک کہ قرآن کریم کے نسخے چونکہ نقطوں اور زیر زبر پیش سے خالی تھے۔ اس لیے اہل عجم کو قرآن کریم کی تلاوت میں دشواری ہوتی تھی۔ اور یہ خدشہ تھا کہ کہیں قرآن کریم کو غلط اعراب کے ساتھ نہ پڑھا جانے لگے۔ اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو الاسود الدؤلی رحمۃ اللہ علیہ کو حکم دیا کہ وہ ایسے قواعد وضوابط وضع کریں جن کی بناء پر قرآن کریم کے اعراب متعین ہو جائیں اور پھر بعد میں اعراب قرآن میں کوئی اختلاف نہ کر سکے۔

اسی بناء پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ علم النحو کے واضع حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہی حضرت ابو الاسود الدولی رحمۃ اللہ علیہ کو ان قواعد وضوابط کی طرف متوجہ کیا تھا جو اب علم النحو کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ پر خلافت راشدہ کا دور اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی بنو امیہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ اور بنو امیہ کا دور وہ دور ہے جس میں بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ علوم القرآن کی نشر واشاعت کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن ان حضرات کا یہ متوجہ ہونا بالروایۃ اور بالتلقین تھا نہ کہ بالکتابۃ اور بالتدوین۔ اگر ہم اس دور کو علوم قرآن کی تدوین کے لیے تمہیدی دور کہیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

علوم قرآن کی نشر واشاعت میں بالروایۃ اور بالتلقین حصہ لینے والوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے جو نام سر فہرست ہیں وہ یہ ہیں:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو موسیٰ الاشعری، حضرت عبد اللہ بن زبیر رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے نام حضرت مجاہد، حضرت عطاء، حضرت عکرمہ، حضرت قتادہ، حضرت حسن بصری، حضرت سعید بن جبیر، حضرت زید بن اسلم (بالمدینہ) حضرت عبد الرحمٰن بن زید اور حضرت مالک بن انس رحمہم اللہ۔

آخری دو ناموں کے علاوہ یہ تمام تابعین ہیں۔ آخری دو تبع تابعین ہیں۔ اُن تمام حضرات نے علوم القرآن سے متعلق جو کچھ بیان فرمایا ہم ان میں سے بعض باتوں کو "علم التفسیر" بعض کو "علم اسباب النزول" بعض کو "الناسخ والمنسوخ" اور بعض کو "علم غریب القرآن" وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ (ان سب کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔ ان شاء اللہ)

علوم القرآن کا باقاعدہ تدوینی دور

علوم القرآن کی تدوین کے تمہیدی دور کے بعد باقاعدہ تدوین کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ پس اس میں علوم القرآن کی مختلف انواع پر بہت سی کتب لکھی گئیں۔ لیکن علوم القرآن کی انواع میں سے ایک اہم نوع "تفسیر" کی طرف سب سے پہلے توجہ کی گئی، کیونکہ اس نوع کا تعلق قرآن کریم کی آیات سے براہِ راست ہے۔

علم التفسیر پر سب سے پہلے قلم اٹھانے والے حضرات میں حضرت شعبہ بن الحجاج، حضرت سفیان بن عیینہ اور حضرت وکیع بن جراح رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان حضرات نے اپنی تفاسیر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال کو یکجا کیا تھا۔ یہ سب کے سب قرنِ ثانی

کے علماء تھے۔

ان حضرات کے بعد علامہ ابن جریر الطبری (المتوفی سنہ ۳۱۰ھ) نے اس میدان میں قدم رکھا۔ اور قرآن کریم کی ایک ایسی تفسیر لکھی جو آج بھی ان تفاسیر میں سب سے بہتر ہے جو روایات وآثار کی مدد سے لکھی گئیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کا نام "جامع البیان فی تفسیر القرآن" ہے۔ اس تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال مع اسانید تحریر کیے گئے ہیں۔ بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی گئی ہے۔ قرآنی آیات سے بہت سے احکام مستنبط کیے گئے ہیں۔ وجوہِ اعراب سے بھی بحث کی گئی ہے جس کی وجہ سے معانی کے فہم وادراک میں مدد ملتی ہے۔ اس تفسیر میں تفسیر بالمعقول اور تفسیر بالماثور کے بھی نمونے ملتے ہیں۔ الغرض یہ تفسیر ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

علم التفسیر کے علاوہ دیگر انواع علوم قرآن پر بھی بہت سے علماء نے کام کیا۔ اور ان انواع کے بیان میں مقدمے لکھے۔ پس علامہ علی بن المدینی جو کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ ہیں اپنے مقدمے میں علوم القرآن کی ایک نوع "اسباب النزول" کو شرح وبسط کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔ اسی طرح علامہ ابوعبید القاسم بن سلام "ناسخ ومنسوخ" کے بارے میں تفصیل کے ساتھ اپنی تحریر میں لکھ چکے ہیں۔ یہ دونوں حضرات قرنِ ثالث کے علماء میں سے ہیں۔

امام ابوبکر سجستانی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ قرنِ رابع کے علماء میں سے ہیں، اپنے مقدمے میں "غریب القرآن" سے متعلق وضاحت کے ساتھ تحریر کرتے ہیں۔

امام علی بن سعید الحوفی جو کہ قرنِ خامس کے علماء جس سے ہیں، اپنی تصانیف میں "اعراب القرآن" کے بارے میں اصول وضوابط بیان کرتے ہیں۔

قرنِ سادس کے ایک بہت پختہ عالم علامہ ابوالقاسم عبدالرحمٰن المعروف بالسہیلی، "مبھمات القرآن" کے علم میں سب سے پہلے قلم اٹھانے والے مصنف ہیں۔ ان کی کتاب کا نام بھی "مبھمات القرآن" ہے۔

"مجاز القرآن" کے بارے میں اوّل تصنیف کرنے والے علامہ ابن عبدالسلام ہیں۔ جبکہ "قراءات القرآن" کے بارے میں لوگوں کو اپنی تحریر کے ذریعے آگاہ کرنے والے علامہ علم الدین السخاوی ہیں۔ اور یہ دونوں حضرات قرنِ سابع کے علماء میں سے ہیں۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا علوم القرآن کی انواع پر کتب کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور نئے نئے علوم دریافت ہوتے گئے۔ نئی نئی تالیفات وجود میں آتی گئیں خواہ ان تالیفات کا تعلق اقسام القرآن سے ہو یا امثال القرآن سے، حجج القرآن سے ہو یا بدائع القرآن سے اور رسم القرآن سے ہو یا اسی طرح کی دیگر انواع سے۔

جب سے قرآن کریم نازل ہوا اس وقت سے لے کر آج تک قرآن کے علوم میں بے شمار کتب لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی۔ کیونکہ قرآن علم کا ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ اس کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہیں۔ بلکہ قرآن کے معجزات میں سے ایک یہ بھی معجزہ ہے کہ یہ دنیا ختم ہو جائے گی لیکن علوم القرآن کی مباحث مکمل نہ ہوں گی۔

جب ہم احادیث کی طرف نظر کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حدیث قرآن کے لیے "شارح" ہے، قرآن کے مبہمات کی شرح کرتی ہے۔ اس کے مجملات کی تفصیل کرتی ہے۔ اس کے عام کی تخصیص کرتی ہے۔

﴿وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ۝﴾ (النحل:۴۴)

"اور ہم نے تم پر یہ کتاب نازل کی ہے تا کہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دو تا کہ وہ غور کریں۔"

جیسے قرآن کے لیے علوم قرآن ہے ایسے ہی حدیث کے لیے علومِ حدیث ہے۔ پس اگر آپ علوم قرآن اور علوم حدیث کو دیکھیں تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ عظیم بحر ہے جس کی موجوں میں بلند تلاطم ہے۔ اور ان دو کے علاوہ تمام علوم وفنون ان کے خادم کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے قرآن وحدیث کے متعلق جو کچھ جانا، وہ بہت کم ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (آل عمران:۷)

"حالاں کہ ان آیات کا ٹھیک مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔"

علوم قرآن کی وسعت کی بابت سب سے زیادہ تعجب اُس وقت ہوتا ہے جب ہم مؤلفین کی تالیفات کے انداز کو دیکھتے ہیں۔ کیونکہ علوم قرآن کے بارے میں جن علماء نے قلم اُٹھایا وہ ایک ایک نوع کو بیان کرتے ہیں۔ اور اس ایک ہی نوع پر کئی کئی تالیفات لکھ ڈالتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی مؤلف "غریب القرآن" کو بیان کرنا چاہتا ہے تو مفردات القرآن کے ہر ہر اس مفرد کو بیان کرتا ہے جس میں غرابت وابہام پایا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی مؤلف "مجاز القرآن" کو بیان کرنا چاہتا ہے تو وہ ہر ہر اس لفظ کو بیان کرتا ہے جو مجاز کا مقتضی ہو۔ الغرض قرآن کے علوم ایک درخت کی شاخوں کی طرح ہیں اور ہر شاخ اپنے اندر کئی اسرار و رموز چھپائے ہوئے ہے۔ ان اسرار ورموز کا احاطہ کسی انسان کے لیے ناممکن ہے۔

علمائے متقدمین نے علوم قرآن سے متعلق جو علوم جداگانہ طور پر بیان کیے تھے، اگر ان کو اب ایک فہرست کی طرح ایک کتاب میں بالتفصیل یکجا کیا جائے تو عمریں صرف ہو جائیں اور ہمتیں پست ہو جائیں۔

علوم القرآن کی انواع علمائے متقدمین کے نزدیک بھی مسلم تھیں اگر چہ ان کو الفاظ وکلمات کے دھاگے میں پرویا نہیں گیا تھا۔ یعنی علوم القرآن کی انواع علمائے مبرزین کے ذہن میں تھیں اگر چہ ان کے بارے میں تحریری طور پر کوئی مواد موجود نہیں تھا۔ ہماری اس بات کی دلیل حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ ہے، جسے علامہ جلال الدین البلقینی نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔

یمن میں علوی بغاوت پر آمادہ تھے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر یہ الزام لگایا گیا کہ آپ ان علویوں کی قیادت کر رہے ہیں۔ اسی الزام میں آپ کو زنجیروں میں جکڑ کر خلیفہ ہارون الرشید کے پاس بغداد لایا گیا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: آپ کتاب اللہ کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ کتاب اللہ سے سوالات کا آغاز کیا کیونکہ کتاب اللہ تمام کتابوں میں افضل ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: امیر المومنین! آپ مجھ سے اللہ کی کتابوں میں سے کس کتاب کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟ کیونکہ اللہ کی کتابیں تو بہت سی ہیں۔

ہارون الرشید نے کہا: بہت خوب! میں نے آپ سے اس کتاب کے بارے میں پوچھا ہے کہ جو میرے چچا زاد بھائی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: قرآن میں تو بہت سے علوم ہیں۔ آیا آپ محکم ومتشابہ کے بارے میں پوچھتے ہیں یا تقدیم وتاخیر یا ناسخ ومنسوخ کے بارے میں یا کسی اور مسئلہ کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں۔ گویا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

کو یہ تمام علوم ازبر تھے۔ خلیفہ ہارون الرشید آپ سے سوال پوچھتا گیا اور امام شافعی رحمہ اللہ خلیفہ کے تمام سوالات کے جوابات دیتے گئے۔ اس معاملے کو دیکھ کر خلیفہ ہارون الرشید اور تمام حاضرین ہکا بکا رہ گئے۔

علوم القرآن کی تمام انواع کا امام شافعی رحمہ اللہ کو ازبر ہونا کوئی بعید بات نہیں ہے۔ کیونکہ امام شافعی رحمہ اللہ وہ عظیم شخصیت ہیں جنھوں نے بہت سی کتب ایسی لکھیں جن کی نظیر پہلے موجود نہیں تھی۔ وہ ان فنون کے واضع گردانے جاتے ہیں۔ جیسا کہ انھوں نے عراق میں کتاب "الحجۃ" لکھی جو کہ اُس زمانے کے باطل فرقوں کے لیے دلیل اور حجت کا درجہ رکھتی تھی۔ اور آپؒ نے مصر میں رہتے ہوئے بہت سی ایسی کتب لکھیں جو اس وقت کے باطل مذاہب کے لیے تلوار کی حیثیت رکھتی تھیں۔ آپ رحمہ اللہ نے اجتہاد اور استنباط کے لیے وہ اصول وضوابط وضع کیے جو آپ سے پہلے کسی نے بیان نہیں کیے تھے۔ نیز آپ ہی اصول الفقہ پر سب سے پہلے تصنیف کرنے والے ہیں۔ جیسا کہ علامہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"کان اوّل من کتب فیه. ای علم اصول الفقه، الشافعی رحمه الله، أصلی فیه، رسالته المشهورة، تکلم فیها علی الاوامر والنواهی، والبیان، والخبر، والنسخ، وحکم العلة المنصوصة من القیاس"

یعنی امام شافعی رحمہ اللہ وہ شخصیت ہیں جنھوں نے علم اصول فقہ پر سب سے پہلے کچھ لکھا۔ آپ نے اپنے ایک مشہور رسالے میں اوامر، نواہی، بیان، خبر، نسخ اور قیاس سے علتِ مخصوصہ کے حکم کے بارے میں وضاحت سے تحریر کیا ہے۔

علامہ الزرکشی اپنی کتاب "البحر المحیط" میں رقمطراز ہیں:

اصول الفقہ میں تصنیف کرنے والے سب سے پہلے شخص امام شافعی رحمہ اللہ ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اصول الفقہ میں متعدد کتب لکھیں مثلاً الرسالۃ، کتاب احکام القرآن، اختلاف الحدیث، ابطال الاستحسان، کتاب جماع العلم اور کتاب القیاس وغیرہ۔ کتاب القیاس میں امام شافعی رحمہ اللہ نے معتزلہ کے رَد میں شرح وبسط کے ساتھ دلائل ذکر کیے ہیں۔

اصطلاحِ "علوم القرآن" کا معرضِ ظہور

"علوم القرآن" کی اصطلاح جامع اور وسیع مفہوم کی حیثیت سے سب سے پہلے کب ظاہر ہوئی؟ اس کی بابت مؤرخین کے نزدیک مشہور یہ ہے کہ یہ اصطلاح ساتویں صدی میں معرضِ ظہور میں آئی۔ اس سے قبل کسی نے اس اصطلاح یعنی "علوم القرآن" کا استعمال اپنی تصنیفات وتالیفات میں نہیں کیا تھا۔ لیکن میری رائے اس کے خلاف ہے۔ میری رائے کے مطابق "علوم القرآن" کی اصطلاح جامع اور وسیع مفہوم کی حیثیت سے سب سے پہلے پانچویں صدی میں معرضِ ظہور میں آئی۔ اس کی دلیل میرے پاس علامہ علی بن ابراہیم بن سعید جو کہ "الحوفی" کے نام سے مشہور ہیں، کی تصنیف "البرہان فی علوم القرآن" ہے۔ علامہ علی بن ابراہیم کا انتقال ۴۳۰ ہجری میں ہوا۔ اس لیے وہ پانچویں صدی کے عالم ہوئے۔

کتاب "البرہان فی علوم القرآن" کا مختصر تعارف

یہ کتاب مجھے قاہرہ (مصر) کے دار الکتب میں ملی۔ اس کی کل تیس جلدیں ہیں۔ لیکن اس وقت

صرف پندرہ جلدیں موجود ہیں۔ اور وہ بھی غیر مرتب ہیں۔ یعنی ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخے کی شکل میں موجود ہیں۔

اس کتاب میں مصنف قرآنِ کریم کی آیات کو بالترتیب ذکر کرتے ہیں۔ پھر ہر ایک آیت پر علوم القرآن کی روشنی میں کلام فرماتے ہیں۔ ہر نوع کو بیان کرنے سے پہلے اس نوع کے ذکر کا اہتمام بھی فرماتے ہیں۔ سب سے پہلے ایک عنوان باندھتے ہیں "القول فی قولہ عزوجل۔" اس عنوان کے تحت آیت کریمہ ذکر کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد "القول فی الاعراب" کے نام سے ایک عنوان باندھتے ہیں اور اس کے تحت نحوی اور لغوی اعتبار سے بحث کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد "القول فی المعنیٰ والتفسیر" کا ایک عنوان قائم کرتے ہوئے اس آیت کریمہ کی تفسیر بالماثور اور تفسیر بالمعقول کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد "القول فی الوقف والتمام" کے نام سے ایک عنوان وضع کرتے ہیں اور اس کے تحت یہ وضاحت کرتے ہیں کہ یہاں وقف جائز ہے یا ناجائز۔ اور اگر کسی آیت کریمہ میں قراءت سے متعلق کچھ بتانا مقصود ہو تو "القول فی القراءۃ" کے نام سے ایک عنوان قائم کرتے ہیں۔

اگر کسی آیت سے شرعی احکام مستنبط ہو رہے ہو تو اس آیت کو ذکر کے اس کے تحت علیحدہ علیحدہ مباحث کو بالتفصیل بیان کرتے ہیں۔ مثلاً سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۱۱۰ ہے:

﴿وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۱۰)

"اور نماز ادا کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور جو بھلائی اپنے لیے آگے بھیج رکھو گے اس کو اللہ کے ہاں پالو گے۔"

تو اب صاحب برھان اس آیت کے ضمن میں نماز کے اوقات بیان کریں گے، راجح قول کے دلائل ذکر کریں گے۔ زکوٰۃ کی مقدار اور اس کے نصاب کو بالتفصیل بیان کریں گے۔ اس آیت کا شانِ نزول ذکر کریں گے۔ ناسخ اور منسوخ کے حوالے سے اس آیت کے بارے میں بحث کریں گے۔ الغرض اس آیت کی مناسبت سے جتنی بھی مباحث ہوں گی اُن کو قلم بند کریں گے۔

مختصر یہ کہ میں علامہ علی بن ابراہیم کی اس بے نظیر تصنیف کو پڑھ کر بہت محظوظ ہوا۔ خاص طور پر ان کے طرزِ تحریر نے مجھے بہت حیران کیا۔ کیونکہ وہ بڑی مہارت کے ساتھ ایک آیت کو علوم القرآن کی مختلف انواع کے آئینے میں دکھاتے ہوئے واضح کرتے ہیں۔ بے شک آپ کی یہ کتاب آپ کی انتھک محنت اور اخلاص کی عکاسی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ آپ نے اپنے بعد گراں قدر علمی سرمایہ اس کتاب کی شکل میں چھوڑا۔

چھٹی صدی

پانچویں صدی کے بعد چھٹی صدی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس صدی میں علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ جیسے عالم متبحر جنم لیتے ہیں۔ اور "علوم القرآن" کی اصطلاح جامع اور وسیع مفہوم کی حیثیت سے مزید نکھر کر سامنے آتی ہے۔ علامہ ابن جوزی نے ۵۹۷ ہجری میں وصال فرمایا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے "علوم القرآن" پر دو کتابیں لکھیں۔ ① "فنون الافنان فی علوم القرآن" ② "المجتبی فی علوم تتعلق بالقرآن" ان دونوں کتابوں کے بھی قلمی نسخے قاہرہ (مصر) کے دارالکتب میں محفوظ ہیں۔

ساتویں صدی

اب علوم القرآن کی اصطلاح کو معرضِ ظہور میں آئے تین صدیاں بیت چکی ہیں۔ ساتویں صدی میں علامہ علم الدین سخاوی متوفی ۶۴۱ ہجری نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "جمال القراء" ہے۔ اسی صدی میں علوم القرآن کے فن میں ایک تحریر علامہ ابو شامہ المتوفی ۶۶۵ ہجری نے لکھی جس کا نام "المرشد الوجیز فیما یتعلق بالقرآن العزیز" ہے۔ یہ دونوں کتابیں اپنے بعد میں آنے والی کتابوں سے قدرے مختصر اور آسان تھیں۔

آٹھویں صدی

آٹھویں صدی میں "البرھان فی علوم القرآن" کے نام سے علامہ بدرالدین الزرکشی متوفی ۷۹۴ ہجری نے ایک کتاب تحریر کی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ تیموریہ خزانے سے ملا تھا جو کہ اب قاہرہ (مصر) کے دارالکتب میں موجود ہے۔ یہ کتاب دوجلدوں میں تھی۔

نوٹ ❀ اب اس کتاب کو پروفیسر محمد ابوالفضل ابراہیم نے شائع کیا اور اس کی تحقیق وتدقیق میں بڑی محنت سے کام لیا ہے۔

نویں صدی

نویں صدی میں "علوم القرآن" پر بہت سی کتب لکھی گئیں۔ اس صدی میں "علوم القرآن" کا علم خوب پروان چڑھا۔ اس صدی میں علامہ محمد بن سلیمان الکافیجی متوفی ۸۷۳ ہجری نے ایک کتاب لکھی۔ علامہ سیوطی اس کتاب کے بارے میں فرماتے ہیں: "علامہ کافیجی پر کوئی ایک اس معاملے میں سبقت نہیں لے گیا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کو دو بابوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلا باب تفسیر، تاویل، قرآن، سورت اور آیت کے معنی کے بیان میں ہے جبکہ دوسرا باب قرآن کی تفسیر بالرائے کی شرائط کے بیان میں ہے۔ اور ان دونوں بابوں سے ناواقفیت عالم اور متعلم کے لیے ایک خامی ہے۔"

لیکن ان تعریفی کلمات کے بعد علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: "لیکن اس کتاب سے نہ ہی تو مجھے قلبی اطمینان حاصل ہوا اور نہ ہی مقصود کی طرف پہنچنے کا کوئی راستہ دکھائی دیا۔" (علامہ کافیجی کی اس کتاب کا نام علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "بغية الوعاة" میں "التیسیر فی قواعد التفسیر" بتایا ہے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ بغية الوعاة میں لکھتے ہیں: "میرے استاد علامہ کافیجی کہتے تھے کہ علوم القرآن کو میں نے ایجاد کیا ہے مجھ سے پہلے یہ نیک کام کسی کے نصیب میں نہیں تھا" علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں لیکن میرے استاد کا یہ خیال صواب نہ تھا۔ شاید ان کے علم میں نہ تھا کہ ان سے پہلے علامہ الزرکشی "البرھان فی علوم القرآن" اور جلال الدین بلقینی "مواقع العلوم" اس فن میں لکھ چکے ہیں)۔

نویں صدی میں ہی علامہ جلال الدین البلقینی نے ایک کتاب "مواقع العلوم فی مواقع النجوم" لکھی۔ اس کتاب کو علامہ نے کچھ فصلوں میں ترتیب دیا ہے:

پہلی فصل ❀ یہ فصل آیات قرآنیہ کے جائے نزول، اوقاتِ نزول اور واقعاتِ نزول کے بیان میں ہے۔ یہ بارہ انواع پر مشتمل ہے۔ ① مکی آیات ② مدنی آیات ③ سفری آیات ④ حضری آیات ⑤ لیلی آیات ⑥ نہاری آیات ⑦ صیفی آیات ⑧ شتائی آیات ⑨ فراشی آیات ⑩ شانِ نزول ⑪ سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات ⑫ سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات۔

دوسری فصل ❀ یہ فصل آیاتِ قرآنیہ کی اسناد کے بیان میں ہے۔ یہ فصل چھ انواع پر مشتمل ہے۔

① متواتر ② آحاد ③ شاذ ④ قراءات النبی صلی اللہ علیہ وسلم ⑤ الرواۃ ⑥ الحفاظ

تیسری فصل ❀ یہ فصل قرآن مجید کے الفاظ وحروف کی ادائیگی کے بیان میں ہے۔ یہ فصل بھی چھ انواع پر مشتمل ہے۔

① وقف ② ابتداء ③ امالہ ④ مد ⑤ تخفیف الھمز ⑥ ادغام

چوتھی فصل ❀ یہ فصل قرآن مجید کے الفاظ کی اقسام کے بیان میں ہے۔ یہ فصل سات انواع پر مشتمل ہے۔

① غریب ② معرب ③ مجاز ④ مشترک ⑤ مترادف ⑥ استعارہ ⑦ تشبیہ

پانچویں فصل ❀ یہ فصل آیات قرآنیہ کے ان معانی کے بیان میں ہے جن کا تعلق احکام کے ساتھ ہے۔ یہ فصل چودہ انواع پر مشتمل ہے۔ وہ چودہ انواع یہ ہیں: ① العام الباقی علی عمومه ② العام المخصوص ③ العام الذی أرید به الخصوص ④ ماخص فیه الکتاب السنة ⑤ ماخصت فیه السنة الکتاب ⑥ المجمل ⑦ المبین ⑧ المُأَوَّل ⑨ المفهوم ⑩ المطلق ⑪ المقید ⑫ الناسخ ⑬ المنسوخ ⑭ نوع من الناسخ والمنسوخ

چھٹی فصل ❀ یہ فصل آیاتِ قرآنیہ کے ان معانی کے بیان میں ہے جن کا تعلق الفاظ کے ساتھ ہے۔ یہ فصل پانچ انواع پر مشتمل ہے۔ وہ پانچ انواع یہ ہیں: ① الفصل ② الوصل ③ الایجاز ④ الاطناب ⑤ القصر

اگر تمام فصلوں کے تحت بیان کردہ انواع کو جمع کیا جائے تو پچاس انواع بنتی ہیں۔ اس طرح مصنف رحمہ اللہ کی یہ کتاب کل ۵۰ انواع پر مشتمل ہونے کے باوجود بھی اسماء، کنیت، القاب اور مبہمات کی انواع سے عاری ہے۔ نیز ان تمام انواع کو حصر کے انداز میں بھی بیان نہیں کیا گیا۔

نویں صدی میں ہی علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے "علوم القرآن" پر دو کتابیں لکھیں۔ جن میں سے ایک کا نام "التحبیر فی علوم التفسیر" ہے۔ اس کتاب میں علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اُن اقسام کو بھی بیان کیا ہے جنھیں علامہ جلال الدین البلقینی نے "مواقع العلوم فی مواقع النجوم" ذکر کیا تھا اور اس کے علاوہ بھی اقسام کو بیان کیا ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اس کتاب میں بہت سے فوائد بھی شامل کیے ہیں۔ الغرض اس کتاب میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ایسی ایک سو دو انواع بیان کی ہیں جن کا تعلق علوم القرآن سے ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے "التحبیر" ۸۷۲ہجری میں مکمل کی۔ اس کے بعد ایک اور کتاب لکھی جس کا نام "الاتقان فی علوم القرآن" ہے۔ یہ کتاب اس فن میں ہر اعتبار سے بہترین ہے۔ اس کتاب میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے علوم القرآن سے متعلق اجمالی طور پر اسی (۸۰) انواع ذکر کی ہیں۔ پھر ہر نوع کی ضمنی انواع تفصیلاً ذکر کی ہیں۔ اس طرح کل انواع تین سو زائد بن جاتی ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ دسویں صدی کے آغاز میں یعنی ۹۱۱ہجری کو اس دنیائے فانی سے رُخصت ہوئے۔ لیکن علوم القرآن کے فن پر وہ کام کر گئے کہ ہم نے نہ ہی تو اُن پہلے ان کے کام کے مقابل کسی تحریر یا تصنیف کو پایا اور نہ ہی ان کے بعد ان کے کام کے برابر کسی کی تحریر و تصنیف کو پائیں گے۔ اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں و برکتیں نازل فرمائے۔

علوم القرآن اور آخری صدی

ہمارے دور میں بھی اس فن پر بہت سی کتب لکھی گئیں۔ ۱۳۳۵ہجری میں علامہ مرحوم شیخ طاہر الجزائری نے ایک جلیل القدر کتاب لکھی جس کا نام ہے "التبیان فی علوم القرآن"۔ یہ کتاب کم و بیش ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

علامہ مرحوم شیخ محمود ابو دقیقہ رحمہ اللہ نے بھی اس فن میں کچھ تحریری مواد تالیف کیا جو کلیۃ اصول الدین کے شعبہ تخصص الدعوۃ والارشاد کے طلبہ کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔

علامہ الشیخ محمد علی سلامہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب "منهج الفرقان فی علوم القرآن" لکھی۔ یہ کتاب بھی الدعوۃ والارشاد کے طلبہ کے لیے بہت سود مند ثابت ہوئی۔

علوم القرآن کی مختلف مباحث میں بڑے بڑے علماء نے تالیفات اور تصنیفات کا کام کیا۔ مثلاً الشیخ محمد بخیت، الشیخ محمد حسنین العدوی اور الشیخ محمد خلف الحسینی۔ ان میں سے بعض حضرات نے قرآنِ کریم کے حروفِ سبعہ پر نازل ہونے سے متعلق تالیفات کیں اور بعض نے دیگر مباحث کو واضح کرنے کے لیے قلم اٹھایا۔

ایک مشہور ادیب مرحوم سید مصطفیٰ صادق الرافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب "اعجاز القرآن" لکھی۔ یہ کتاب بادشاہ فؤاد الاوّل نے اپنے ذاتی خرچ پر طبع کروائی اور نشر کروائی۔

اس فن کے خدمت کرنے والے بڑے بڑے علماء کا جب نام آتا ہے تو علامہ مرحوم شیخ عبد العزیز جاویش کو بھی فراموش کرنا ناممکن ہے۔ انھوں نے علوم القرآن پر اپنی بہت سی تقاریر کو ضبطِ تحریر کروایا۔ ان کی تقاریر کا موضوع تھا: "أثر القرآن فی تحریر العقل البشری وألقاها فی نادی دار العلوم۔"

اس فن جلیل کے خادمین میں ایک نام مرحوم شیخ عبد العزیز الخولی کا ہے۔ انھوں نے ایک کتاب تصنیف کی، جس کا نام "القرآن الکریم: وصفه، أثره، هدايته واعجازه" ہے۔

علامہ مرحوم شیخ طنطاوی جوہری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام ہے: "القرآن والعلوم العصرية" (آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب اور بھی لکھی جس کا نام ہے: "الجواهر فی تفسير القرآن الكريم")

الازہر یونیورسٹی کے سب بڑے اور پرانے پروفیسر الشیخ محمد مصطفیٰ المراغی نے قرآن کریم کے ترجمہ کرنے کے جواز کے حق میں ایک بہت شاندار رسالہ لکھا۔ اس رسالے کی بعد میں آنے والے بہت سے علماء نے تائید کی۔ لیکن ترکی کے شیخ الاسلام علامہ الشیخ مصطفیٰ صبری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے اس رسالے کا تعاقب کیا اور اس کے رد میں ایک بہت مدلل و مدقق کتاب لکھی جس کا نام "مسألة ترجمة القرآن" ہے۔ اس کتاب کی تائید کرنے والے بھی کچھ علماء موجود ہیں۔

ابھی حال ہی میں ایک اور کتاب نمودار ہو رہی ہے۔ اس کتاب کے اندازِ اسلوب نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ اس کتاب کا اندازِ تعبیر بہت عمدہ ہے۔ اس میں بیان کردہ مباحث وفکر بہت اعلیٰ ہیں۔ اگر یہ کتاب مکمل ہو جائے تو یہ مجھے بہت محبوب ہوگی۔ اس کتاب کا نام "النبأ العظيم عن القرآن الكريم" ہے۔ اس کے مصنف میرے عزیز دوست علامہ الشیخ محمد عبد اللہ دراز ہیں۔ اس وقت ان کو جامعہ الازہر نے فرانس بھیجا ہوا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اللہ میرے دوست کو خیر و عافیت کے ساتھ واپس لے آئے اور اسلام و مسلمین کو ان کے فیض سے فیض یاب فرمائے۔ (آمین)

خلاصہ

فن علوم القرآن کے تدوینی اَدوار کو اگر خلاصے اور مختصر انداز میں بیان کیا جائے تو کچھ یوں بیان کیا جائے گا کہ:

چوتھی صدی کے اواخر اور پانچویں صدی کے اوائل میں علامہ علی بن ابراہیم الحوفی نے ایک زرخیز زمین علوم القرآن کا ایک بیج ڈالا۔ چھٹی اور ساتویں صدی میں علامہ حجر ابن الجوزی، علامہ علم الدین السخاوی اور علامہ ابوشامہ نے اس بیج کو زمین میں سینچا اور اس کی آبیاری کی۔ پھر آٹھویں صدی میں علامہ بدر الدین الزرکشی رحمۃ اللہ علیہ کی محنت سے وہ بیج ایک نوجوان پودے کی شکل اختیار کر

گیا۔ پھر نویں صدی میں علامہ محمد بن سلیمان الکافیجی اور علامہ جلال الدین البلقینی کی مخلصانہ خدمات کی بدولت وہ پودا ایک مضبوط تنا آور درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ پھر نویں صدی ہی کے اواخر اور دسویں صدی کے اوائل میں اس میدان میں ایک شہسوار نے قدم رکھا اور دو کتابیں (① التحبیر ② الاتقان فی علوم القرآن) تصنیف کیں۔ ان کے اس پر خلوص کارنامے کی بدولت وہ تنا آور درخت ایک پھل دار درخت میں تبدیل ہو گیا اور مختلف اقسام کے پھلوں کے جوڑے فراہم کرنے لگا۔ شہسوار سے میری مراد علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اللہ ان پر ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اس فن میں نشوونمو کا سلسلہ تھم گیا اور تھما رہا یہاں تک کہ ہمارا دور آ گیا۔

اب ہمارے دور میں اُمید کی کچھ کرنیں نظر آنا شروع ہوئی ہیں۔ اب ایسا لگتا ہے کہ اب اس درخت پر دوبارہ بہار آئے گی۔ ﴿اَلَآ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ ۝﴾ (البقرۃ: ۲۱۴)

ایک شبے کا اِزالہ

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ایک شبے کا اِزالہ ضروری ہے۔ وہ یہ کہ بعض روشن خیال لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ یہ علم یعنی علوم القرآن خود ساختہ علم ہے، جدید دَور کی پیداوار ہے، دورِ قدیم میں یہ علم نہیں تھا بعد کے لوگوں نے اسے گھڑ لیا ہے۔

ان لوگوں کا یہ خیال محض باطل پر مبنی ہے۔ درحقیقت وہ اسلام اور قرآن کے درپے ہیں۔ یہ علم قرآن کے لیے حفاظت کا سبب ہے۔ جبکہ وہ لوگ قرآن کے اعدا ہیں۔ لہٰذا وہ پس پردہ اپنی دشمنی کی بنیاد پر یہ شبہ یا اشکال ظاہر کرتے ہیں۔

ہمیں اس وقت چاہیے کہ خوب دل و جان سے اس فن میں مہارت حاصل کریں۔ کسی حکیم کا قول ہے دشمن کو قتل کرنا ہو تو دشمن کے پاس موجود اسلحہ کے مانند اسلحہ تیار کرو اور اس پر حملہ کرو۔ اس وقت دشمن قرآن کے درپے ہے۔ اُسے مٹانا چاہتا ہے تو ہمیں چاہیے کہ ہم وہ علم حاصل کریں جو قرآن کی حفاظت کرنے والا ہے اور قرآن کی بقا کا سبب ہے۔

نیز یہ علم انتہائی آسان ہے۔ اس میں بے جا تفصیلات یا لمبی چوڑی ابحاث نہیں ہیں۔ بلکہ انتہائی مختصر اور پر اثر انداز میں اس علم کی تعریفات و اقسام کو بیان کیا جاتا ہے۔

بحث ③

نزولِ قرآن

یہ بحث "علوم القرآن" کی اہم بحث ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ "علوم القرآن" کی تمام مباحث میں سب سے زیادہ اہم بحث یہ ہی ہے تو کچھ بے جانہ ہوگا۔ کیونکہ یہ معلوم کرنا کہ قرآنِ کریم کب اور کیسے نازل ہوا، ایمان کی اساس ہے۔ کیونکہ قرآن کریم پر ایمان رکھنا اور اس کو کلام اللہ تسلیم کرنا ایمان کا بنیادی جزو ہے۔ نیز قرآن پر ایمان درحقیقت حضرت محمد ﷺ کی رسالت کی تصدیق کرنا ہے۔ اور یہ اقرار کرنا ہے کہ اسلام حق اور سچ مذہب ہے۔ لہٰذا نزولِ قرآن سے متعلق بحث آئندہ آنے والی تمام مباحث میں اصل اور جڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔

پس ہم نزولِ قرآن کی بحث کو بہت اہتمام سے بیان کریں گے۔ اہتمام کا تقاضا یہ ہے ہم اس بحث کو کچھ حصوں میں تقسیم کرلیں تاکہ تمام باتیں واضح اور علیحدہ علیحدہ سمجھ میں آجائیں۔ لہٰذا ان شاءاللہ سب سے پہلے ہم "معنی نزول القرآن" کو بیان کریں گے اس کے بعد قرآنِ کریم کے متعدد نزول کے بارے میں بیان کریں گے۔ پھر ہر مرتبہ کے نزول پر دلائل پیش کریں گے۔ پھر ہر مرتبہ کے نزول کی کیفیت اور حکمت واضح کریں گے۔ پھر وحی الٰہیہ اور اس کے عقلی وعلمی یا نقلی دلائل پیش کریں گے اور سب سے آخر میں اس موقع پر پیدا ہونے والے شبہات واعتراضات کے سیر حاصل جوابات بیان کریں گے۔ (اللہ سے دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت ہماری مدد فرمائے) (آمین)

① نزولِ قرآن کا معنی ومطلب

نزولِ قرآن یعنی قرآنِ کریم کا نازل ہونا۔ نازل ہونے کا لغوی معنی کیا ہے؟ اس بارے میں درج ذیل بحث کا مطالعہ ضروری ہے۔

"نزول" کا مادہ "ن، ز، ل" ہے۔ یہ مختلف ابواب سے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن وحدیث میں اس کے مختلف الاستعمال ہونے کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً قرآنِ کریم میں ہے:

﴿وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ﴾ (الاسراء:۱۰۵)

"اور ہم نے اس قرآن کو سچائی کے ساتھ نازل کیا ہے اور وہ سچائی کے ساتھ نازل ہوا۔"

ایک حدیث مشہور ہے:

((اِنَّ ھٰذَا القرآن اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَۃِ اَحْرُفٍ)).

"بے شک یہ قرآن ہے، اُسے سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔"

بعض اوقات لغت میں نزول سے ایک خاص مکان میں اترنا، حلول کرنا یا اس خاص مکان کو اپنا ٹھکانہ بنانا مراد لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: "نزل الامیر المدینه" ترجمہ: امیرِ لشکر نے شہر کو اپنا ٹھکانہ بنایا۔ یا امیرِ لشکر شہر میں اُترا۔

بعض اوقات نزول متعدی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اس وقت اس کا معنی کسی دوسرے کو اتارنے یا ٹھہرانے کا ہوتا ہے۔ جیسے:

﴿رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ﴾ (المؤمنون: ۲۹)

"اے پروردگار ہم کو مبارک جگہ پر اتاریو اور تو سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔"

بعض اوقات "نزول" کا لفظ اترنے یا اتارنے کے علاوہ کسی اور ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی بعض اوقات "نزول" کا لفظ کسی چیز کو بلند مقام سے پست یا اسفل مقام کی طرف اُترنے یا گرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے: ﴿نَزَلَ فُلَانٌ مِنَ الْجَبَلِ﴾ یعنی فلاں پہاڑ سے نیچے اُترا اور بعض اوقات اس معنی میں رہتے ہوئے متعدی معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے:

﴿وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾ (طٰہٰ: ۵۳)

"اور آسمان سے پانی برسایا۔"

اُترنا، اُتارنا، ٹھہرنا، ٹھہرانا یا کسی بلند مقام سے اسفل مقام کی طرف منتقل ہونا یا منتقل کرنا، یہ تمام معانی قرآن کریم کے نزول کے لیے پیش کرنا مناسب نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ تمام معانی مکانیت اور جسمیت کا تقاضا کرتے ہیں۔ جبکہ قرآن یعنی کلام اللہ کوئی جسم نہیں ہے کہ وہ کسی مکان کو چاہے کہ اُس میں اُترے یا کسی بلند مقام سے اسفل مقام کی طرف منتقل ہو۔ بلکہ قرآن کریم تو اللہ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ خود قدیم ہیں تو ان کی صفات بھی قدیم ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود جسم و مکان وغیرہ سے منزہ ومبرہ ہیں تو ان کا کلام بھی مکان وجسم کی قید سے آزاد اور پاک ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ پھر نزولِ قرآن کا معنی کیا لیا جائے۔ تو اس کا جواب یہ ہے اب ہمیں مجاز کی ضرورت پیش آئے گی۔ یعنی اب ہم اس کا معنی مجازی مراد لیں گے۔ اور انزال یا نزول کا مجازی معنی ہوگا "اعلام"۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بواسطۂ ملک رسول اکرم ﷺ کو الفاظِ قرآن بتلانے کا نام نزولِ قرآن ہے۔ درحقیقت اس تعبیر میں قرآنِ کریم کی عظمت وشان بتلانا مقصود ہے کہ انسان کے پاس ایک بلند مقام کی چیز آگئی ہے، یا قرآن پر نزول کا اطلاق قرآن کے لانے والے ملک یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام کے اعتبار سے ہے کہ وہ بلند مقام سے زمین پر اُترا اور اس کا یہ نزول بالواسطہ قرآن کا بھی نزول ہے۔

اور اگر قرآن سے مراد وہ الفاظ لیے جائیں جو معجز ہیں (اور ہمیں دکھائی دیتے ہیں) تو اس وقت بھی انزال سے مراد اعلام ہی ہوگا۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ اگر انزال کے واسطے سے ہو تو اس سے مراد وہ انزال ہوگا جو نبی اکرم ﷺ کے قلب اطہر پر ہوا۔ اور اگر انزال اس کے واسطے سے ہو جو ان الفاظ پر دلالت کرتا ہے تو اس صورت میں لوحِ محفوظ اور بیت العزت کی طرف انزال مراد ہوگا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مجاز یا تجوّز استعارہ تصریحیہ اصلیہ کے قبیل سے ہو بایں طور پر کہ تشبیہ دی گئی ہو آقا کی اپنے بندے کی طرف بلندی سے سفلیت کی طرف کوئی خاص چیز نازل کرنے کے ساتھ اگرچہ اعلیٰ اور اسفل میں وجہِ شبہ حسی ہو نسبت کرتے ہوئے مشبہ بہ کی طرف اور معنوی ہو مشبہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے۔

اور اے مخاطب تُو تو جانتا ہے کہ نزول تابع ہے انزال کے۔ پس جب ان میں سے کسی ایک میں جاری ہو گا تو خود بخود ہی دوسرے میں جو کہ اس کی نظیر ہے میں جاری ہو جائے گا۔ اور اس طرح کی مثال تنزیل اور تنزل میں کم پائی جاتی ہے۔ گویا کہ انزال کا مادہ استعمال کرنے سے اس عظیم کتاب یعنی قرآنِ کریم کے شرف کو واضح کرنا مطلوب تھا۔ اور اس مادہ کو استعمال کرنے سے اس طرف اشارہ کرنا بھی مقصود تھا کہ اس کتاب کا مالک یا صاحب بھی بہت اعلیٰ درجے پر فائز ہے۔ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے سورۃ الزخرف میں

﴿وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝﴾ (الزخرف:۲ تا ۴)

"قسم ہے اس واضح کتاب کی۔ ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنایا ہے کہ تم سمجھ لو۔ یقیناً یہ لوح محفوظ میں ہے اور ہمارے نزدیک بلند مرتبہ حکمت والی ہے۔"

اور انزال کو اعلام کے ساتھ تعبیر کرنا ہی اس مقام کے زیادہ مناسب، اقرب اور اوفق ہے۔ اس کی تین وجوہات ہیں:

① یہاں کلام کا تعلق دلالت و افہام والا تعلق ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کلام ہے۔ پس قرآن کے نزال کو اعلام سے تاویل کرنا درحقیقت اس کو درست و معلوم متعلق سے مربوط اور منسوب کرنا ہے۔

② یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ قرآن ثابت و محفوظ ہے لوح میں، آسمانِ دُنیا میں اور نبی کریم ﷺ کے قلب اطہر میں۔ اور دونوں عالم یعنی علوی اور سفلی عالم میں پائی جانے والی مخلوق کو بتانا مقصود ہے کہ نبی کریم ﷺ پر جو نازل ہوا وہ برحق اور سچ ہے۔

③ انزال کی تفسیر اعلام کے ذریعے کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے تاکہ قرآن کریم کے مختلف تنزلات کو بیان کیا جاسکے۔

② قرآنِ کریم کا متعدد بار نازل ہونا

قرآن کریم کے متعدد بار نزول کو اصطلاح میں تنزلات کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو تین تنزلات سے نواز کر اس کے فضل و شرف میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ یعنی قرآن کریم کا نزول تین مرتبہ ہوا۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

پہلا نزول قرآن کریم کا نزولِ اوّل بارگاہِ الٰہیہ سے لوحِ محفوظ میں ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشادِ مبارک ہے:

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝﴾ (البروج:۲۱-۲۲)

"(یہ کتاب ہزل و بطلان نہیں) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے۔ لوح محفوظ میں (لکھا ہوا)۔"

قرآنِ کریم لوحِ محفوظ میں کس طرح اور کب سے محفوظ ہے؟ اس بات کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں یا اللہ تعالیٰ جس کو غیب پر مطلع فرمادیں۔ لیکن قرآنِ کریم کی اس آیت سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ لوحِ محفوظ میں قرآنِ کریم سارے کا سارا اکٹھا اور یکجا

موجود ہے نہ کہ متفرق طور پر۔ کیونکہ آیت کے ظاہری الفاظ اسی کا تقاضا کر رہے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ پھر اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ پر تھوڑا تھوڑا کر کے قرآنِ مجید کیوں نازل کیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں بہت سی حکمتیں ہیں جن میں سے چند آئندہ آئیں گی۔ (ان شاء اللہ)

قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں موجود تھا۔ لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اسے سب سے پہلے لوح محفوظ میں نازل فرمایا۔ اس میں حکمت شاید یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم کی عظمت اور لوح محفوظ کی اہمیت لوگوں پر واضح کرنا چاہتے تھے۔ لوح محفوظ کے بارے میں آگاہ کرنا چاہتے تھے کہ لوح محفوظ وہ کتاب ہے جس میں ہر وہ امر لکھا جا چکا ہے جو ہو چکا ہے۔ اور ہر وہ امر بھی لکھا ہوا ہے جو آئندہ واقع ہونا ہے۔ تمام ایجادات و دریافات اس میں مرقوم ہیں۔ گویا کہ لوحِ محفوظ شاہد ناطق ہے، اللہ کے بارُعب مظاہر میں سے ایک مظہر ہے اور دلالت کرتی ہے اللہ تعالیٰ کی عظمت، اس کے علم، اس کے ارادے، اس کی حکمتوں اور اس کی وسیع سلطنت اور ہادی قدرت پر۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب ہم لوحِ محفوظ کا تصور ذہن میں لاتے ہیں تو ہمارے ایمان میں تقویت، قلب میں طمانیت پیدا ہوتی ہے۔ نیز دل میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے کہ جو کچھ ہوا اللہ کے ارادے اور حکم سے ہوا اور جو نہیں ہوا اس میں اللہ کا ارادہ یا حکم ہی نہیں تھا۔ اور جب یہ بات ہمارے دل و ذہن نشین ہو جاتی ہے تو بڑے سے بڑے حوادث ہمیں چھوٹے لگنے لگتے ہیں، سکون اور رضا ہمارے دل میں پیوست ہو جاتی ہے۔ اللہ کے فیصلے پر راضی رہنے کا ملکہ ہمیں نصیب ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ۝﴾ (الحدید: ۲۲-۲۳)

"کوئی مصیبت ملک پر اور خود تم پر نہیں پڑتی مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں ایک کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے (اور) یہ (کام) اللہ کو آسان ہے تاکہ جو (مطلب) تم سے فوت ہو گیا ہے اس کا غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو اس نے دیا ہو اس پر اترایا نہ کرو اور اللہ کسی اترانے والے اور شیخی بگھارنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔"

یہ دونوں آیات لوحِ محفوظ اور اس میں جو کچھ مکتوب ہے اس پر ایمان لانے پر ترغیب دینے والی ہیں۔ نیز ان آیات سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ خوشی و غمی، یسر و عسر، تنگی و فراخی الغرض ہر طرح کے حالات انسان تو کیا دنیا کو بھی وجود دینے سے قبل اس لوح میں لکھے جا چکے تھے جو ہمارے مالک حقیقی اور خالقِ کائنات کے پاس محفوظ ہے۔ لوح سے مراد لوحِ محفوظ ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝﴾ (القمر: ۵۳)

"(یعنی) ہر چھوٹا اور بڑا کام لکھ دیا گیا ہے۔"

لوحِ محفوظ کی کیفیت و ماہیت جو کچھ بھی ہے اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ہم اس کی کیفیت و ماہیت معلوم کرنے کے مکلف نہیں ہیں۔ بلکہ اس بات کو ماننے کے مکلف ہیں کہ یہ "اُمّ الکتاب" ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی حکومت و سلطنت کا مرکزی رجسٹر ہے جس میں سب کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کائنات کی ہر چیز اس میں مرقوم ہے۔ انسانوں کے لیے احکام الٰہیہ بھی اس میں لکھے ہوئے ہیں۔ جو احکام الٰہیہ منسوخ ہو چکے وہ بھی اس میں تحریر ہیں اور جو ناسخ ٹھہرے وہ بھی اس میں مکتوب ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚۖ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴾ (الرعد:۳۹)

"اللہ جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جسکو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے۔اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔"

دوسرا نزول

قرآنِ کریم کا پہلا نزول لوحِ محفوظ پر ہوا اور دوسرا نزول لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر موجود "بیت العزت" پر ہوا۔ دوسرے نزول کو سمجھنے کے لیے درج ذیل تین آیات کو پڑھیے۔

﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ (الدخان:۳)

"ہم نے ایک مبارک رات میں قرآن مجید نازل فرمایا۔"

اس آیت سے ثابت ہوا کہ قرآن مجید یکبارگی ایک بابرکت رات میں نازل ہوا۔اب رہا یہ سوال کہ وہ رات کون سے مہینے کی تھی۔تو دوسری آیت پڑھیے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

"رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔"

مہینا معلوم ہونے کے بعد اب یہ سوال باقی ہے کہ وہ رات کونسی تھی۔تو اب تیسری آیت کو پڑھیے۔

﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۚۖ﴾ (القدر:۱)

"بے شک ہم نے قرآن مجید لیلۃ القدر میں نازل فرمایا۔"

ان تینوں آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید جس ایک رات میں یکبارگی نازل ہوا، اُس رات کا وصف قرآن مجید میں "مبارکۃ" آیا ہے۔وہ رات رمضان کی لیلۃ القدر ہے۔یہ ساری معلومات ادلہ قاطعہ سے ثابت ہوئیں۔لیکن یہ حقیقت بھی ادلہ قاطعہ سے ثابت ہے کہ قرآن مجید حضورِ اکرم ﷺ پر یکبارگی ایک رات میں نازل نہیں ہوا بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے کئی برسوں میں نازل ہوا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ مذکورہ بالا تینوں آیات میں جس نزول کا ذکر ہے وہ نزول حضور اکرم ﷺ پر ہونے والے نزول کے علاوہ کوئی اور نزول ہے۔اور وہ نزول ہے بیت العزت پر نزول۔وہ بیت العزت جو آسمانِ دنیا یعنی قریبی آسمان پر واقع ہے۔اس نزول پر درج ذیل روایات دال ہیں۔

① امام حاکم رحمہ اللہ نے سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے نقل کیا۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: "قرآن کریم کو لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر واقع بیت العزت پر نازل کیا گیا۔ پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام بیت العزت سے (وقتاً فوقتاً) حضورِ اکرم ﷺ کے قلبِ اطہر پر لے کر آتے رہے۔"①

② امام نسائی، امام حاکم اور امام البیہقی نے داؤد بن ابی ہند عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کے طریق سے اپنی اپنی کتب میں روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

---

① رواہ النسائی فی الکبریٰ:۷۹۹۱

"قرآنِ مجید یکبارگی آسمانِ دنیا (بیت العزت) پر لیلۃ القدر میں نازل کیا گیا۔ پھر (بیت العزت سے حضورِ اکرم ﷺ پر تقریباً) بیس سال میں (وقتاً فوقتاً) نازل ہوتا رہا۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ نے یہ آیات پڑھیں:

﴿وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا﴾ (الفرقان:۳۳)

"اور یہ لوگ تمہارے پاس جو (اعتراض کی) بات لاتے ہیں ہم تمہارے پاس اسکا معقول اور خوب مشرح جواب بھیج دیتے ہیں۔"

﴿وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنزِيلًا﴾ (الاسراء:۱۰۶)

"اور ہم نے قرآن کو جزو جزو کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سناؤ اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا ہے۔" ①

③ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ منصور عن سعید بن جبیر عن ابی عباس رضی اللہ عنہ کے طریق سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"قرآن مجید آسمانِ دنیا پر یکبارگی نازل کیا گیا۔ آسمانِ دنیا سے وہ آسمان مراد ہے جو ستاروں کا مسکن ہے (یعنی سب سے پہلا آسمان) پھر اللہ تعالیٰ وہاں سے اپنے رسول ﷺ پر خاص مواقع میں تھوڑا تھوڑا کر نازل کرتے رہے۔" ②

④ علامہ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ عطیہ بن اسود حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آئے اور کہنے لگے: مجھے یہ (درج ذیل) دونوں آیات سمجھنے میں دقت پیش آ رہی ہے۔

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

"رمضان وہ مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔"

﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (القدر:۱)

"بے شک ہم نے قرآن مجید لیلۃ القدر میں نازل فرمایا۔"

ان دونوں آیات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم صرف رمضان المبارک کے مہینے میں نازل ہوا حالانکہ قرآنِ کریم تو شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، صفر الغرض سال کے تمام مہینوں میں نازل ہوا کرتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قرآنِ مجید یکبارگی ماہِ رمضان میں لیلۃ القدر میں نازل ہوا۔ پھر وقتاً فوقتاً تھوڑا تھوڑا کر کے سال کے بقیہ ایام و شہور میں نازل ہوتا رہا۔ ③

یعنی ان دونوں آیات میں قرآنِ کریم کے یکبارگی والے نزول کا ذکر ہے، جو کہ ماہ رمضان میں لیلۃ القدر میں ہوا۔

یہ چاروں احادیث "صحیح" ہیں جیسا کہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا ہے:

---

① رواہ النسائی فی الکبریٰ: ۷۲۱۱۳

② رواہ النسائی فی الکبریٰ: ۱۱۶۷۹

③ رواہ الطبرانی فی الکبیر: ۱۲۰۹۵

اَسَانِیْدُھَا کُلُّھَا صَحِیْحَۃٌ.

"ان کی سندیں سب کی سب صحیح ہیں۔" ①

یہ چاروں روایات اگرچہ موقوف ہیں یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہیں مگر حکماً مرفوع ہیں۔ کیوں کہ آسمانِ دنیا پر قرآن کریم کا نازل ہونا عقل وفکر یا قیاس واجتہاد سے معلوم نہیں ہوسکتا اور نہ ہی آسمانِ دنیا پر قرآن کریم کا نازل ہونا اسرائیلیات سے ماخوذ ہوسکتا ہے، کیونکہ اسرائیلیات والے یعنی اہل کتاب تو قرآن کریم کو مانتے ہی نہیں تو اُن سے اس کا آسمانِ دُنیا پر نزول کیونکر اور کس طرح ماخوذ قرار دیا جاسکتا ہے۔ لٰہذا یہ چاروں روایات موقوف ہونے کے باوجود مرفوع کے حکم میں ہوں گی۔ نیز ان سے استدلال اور احتجاج یعنی حجت پکڑنا بھی درست ہوگا۔

دوسرا قول یہ ہے قرآن کریم کا نزول آسمانِ دنیا پر بیس اور تیئس یا پچیس قدر کی راتوں میں اس طرح پر ہوا کہ ہر ایک لیلۃ القدر میں جس قدر حصہ ایک سال کے عرصہ میں اللہ تعالیٰ کو نازل کرنا مقصود ہوتا اتنا ایک دفعہ آسمانِ دنیا پر اُتار دیا جاتا اور پھر وہاں سے وہی حصہ تھوڑا تھوڑا کر کے تمام سال کے اندر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا کرتا۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ قرآن کریم کے نزول کی ابتداء لیلۃ القدر میں ہوئی پھر اس کے بعد وہ تمام مختلف اوقات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مُنَجَّمًا نازل ہوتا رہا۔

یاد رہے تیسرے قول کا قائل یا حاصل گویا کہ لیلۃ القدر میں بیت العزت پر یکبارگی نزولِ قرآن کی نفی کرنے والا قرار پائے گا۔ (امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ بھی تیسرے قول کے قائل ہیں)

اس موقع پر چوتھا قول بھی ذکر کیا گیا ہے وہ یہ کہ قرآنِ کریم لوحِ محفوظ سے مکمل طور پر ایک ہی مرتبہ نازل ہوا مگر محافظ فرشتوں نے اُسے بتفریق بیس راتوں میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے حوالے کیا اور حضرت جبریل علیہ السلام نے اُس کو بیس سال کے عرصے میں تھوڑا تھوڑا کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا۔

لیکن یہ آخری تینوں اقوال دلائل سے عاری ہیں۔ ان تینوں اقوال کو دلائل وبراہین سے اس طرح مزین نہیں کیا جاسکتا جس طرح قولِ اوّل کو کیا گیا ہے۔

آسمانِ دنیا پر نزول کی حکمت

علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ علامہ ابوشامہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں۔ اللہ نے لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر قرآن کریم کو اس لیے نازل فرمایا تا کہ قرآن اور صاحب قرآن یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعتِ شان اور بلند مرتبے کو اہل آسمان یعنی فرشتوں پر عایاں و واضح کرسکیں۔ نیز ساتوں آسمانوں پر بسنے والے فرشتوں کو یہ بات بتانا مقصود تھی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو کہ بہترین امت کے لیے بہترین نبی یعنی خاتم الرسل حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی جارہی ہے۔ اور یہ کتاب سابقہ کتب سماویہ سے منفرد حیثیت کی حامل ہے کیونکہ وہ کتابیں صرف ایک مرتبہ نازل ہوئیں جبکہ یہ کتاب دو مرتبہ نازل ہوئی ایک مرتبہ یکبارگی اور دوسری مرتبہ متفرقاً۔

---

① الاتقان: ص ۱۳۰، ج ۱

بعض اہل علم کے نزدیک آسمانِ دنیا پر نازل کرنے میں ایک حکمت یہ تھی کہ اس سے حضور اکرم ﷺ کا شوق بڑھے کیونکہ جب کوئی چیز دور سے قریب آ جائے لیکن ابھی تک حاصل نہ ہوئی ہو تو اس کو پانے اور حاصل کرنے کا شوق مزید بڑھ جاتا ہے جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے:

واعظم ما یکون الشوق یومًا　　اذا دنتِ الخیام من الخیام

"اور اس دن سے بڑھ کر شوق کی انتہا کس دن ہوگی جب خیمے خیموں کے قریب ہو جائیں گے۔"

میں تو کہتا ہوں کہ قرآن کریم تین مقامات پر نازل ہوا ایک مرتبہ لوحِ محفوظ پر، دوسری مرتبہ بیت العزت پر اور تیسری مرتبہ قلب محمد ﷺ پر۔ تو اس تعددِ نزول میں قرآن کریم سے شک وشبہے کی نفی کی تاکید ہے اور یہ اس پر یقین واعتماد میں قوت واضافے کا باعث ہے۔ اس لیے کہ جب کوئی بات متعدد رجسٹروں میں لکھی گئی ہو اور اس کا کئی جگہ وجود ثابت ہو چکا ہو تو یہ اس سے شک وشبہے کی نفی کا زیادہ مؤثر ذریعہ ہوتا ہے، اس کے وجود کو تسلیم کرنے کا زیادہ قوی باعث ہوتا ہے اور اس پر ایمان ویقین کی قوت کے زیادہ قریب ہوتا ہے نسبتاً اس کے کہ وہ بات ایک ہی رجسٹر میں لکھی گئی ہو۔

تیسرا نزول: یہ نزول تنزلاتِ قرآن کی لڑی کا آخری موتی ہے۔ دراصل یہ قرآنِ کریم کے نزول کے مراحل کا آخری مرحلہ ہے۔ قرآنِ کریم کا تیسرا نزول وہ نزول ہے جس سے نور وہدایت کی شعاعیں پورے عالم میں پھیل گئیں اسی نزول کی برکت سے خلقِ خدا کو ہدایت کا راستہ دکھائی دیا۔ اس نزول سے وہ نزول مراد ہے جس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام قرآنِ کریم کو لے کر خاتم الرسل ﷺ کے قلبِ اطہر پر نازل ہوئے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩٣﴾ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿١٩٤﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ﴿١٩٥﴾ ﴾ (الشعراء، ١٩٣-١٩٤-١٩٥)

"اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے۔ (یعنی اس نے) تمہارے دل پر (القا) کیا ہے تاکہ (لوگوں کو) نصیحت کرتے رہو۔ (اور القا بھی) فصیح عربی زبان میں (کیا ہے)۔"

حضرت جبرئیلؑ کا قرآنِ کریم کو حاصل کرنا اور حضورِ اکرم ﷺ کی طرف منتقل کرنا

حضرت جبریل علیہ السلام نے قرآنِ کریم کو کیسے حاصل کیا اور پھر حضورِ اکرم ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے قرآن کو کیسے حاصل کیا؟ اس سوال کا تعلق علم غیب سے ہے۔ کسی انسان کی یہ مجال نہیں کہ اس بارے میں اپنی کوئی رائے پیش کرے مگر یہ کہ حضور اکرم ﷺ کی طرف سے کوئی صحیح دلیل ہمیں اس باب میں مل جائے۔

اس کی بابت ہمیں جتنے اقوال ملے ان کو جمع کر کے ہم تین نکات میں بیان کر رہے ہیں:

① امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"شاید حضرت جبرئیل رحمہ اللہ اللہ تعالیٰ سے قرآنِ کریم کو بطورِ تلقفِ روحانی حاصل کرتے تھے یا پھر لوح محفوظ میں لکھے ہوئے قرآن کو زبانی یاد کر لیا کرتے تھے اور حضورِ اکرم ﷺ پر لے کر اُترا کرتے تھے پھر حضور اکرم ﷺ اس کو یاد کر لیا

کرتے تھے۔"

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے "لعل" یعنی شاید کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ عربی میں "لعلّ" یعنی شاید کا لفظ یقین کا فائدہ نہیں دیتا۔ لہٰذا ہم علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے دلیل نہیں پکڑ سکتے کیونکہ یہ قول مقصود تک ہماری راہ نمائی کر رہا۔

② علامہ ماوردی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: "قرآنِ کریم کو محافظ فرشتوں نے بتفریق بیس راتوں میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے حوالے کیا اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بیس سال کے عرصے میں تھوڑا تھوڑا کر کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا۔"

علامہ ماوردی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے محافظ فرشتوں سے قرآن کریم حاصل کیا لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ علامہ ماوردی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اس رائے یا قول پر کوئی دلیل بھی موجود ہے یا نہیں۔

③ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝﴾ (القدر: ۱) کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"(اللہ ہی بہتر جانتا ہے) ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝﴾ سے مراد ہے: (اِنَّا اَسْمَعْنَا الملك وافهمناه اياه وانزلنا بما سَمِعَ) یعنی ہم نے قرآن فرشتے کو سنایا اور اس کو بخوبی سمجھا دیا تو پھر فرشتے نے جو کچھ سنا تھا سب کو لے کر اُسے نازل کیا۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ فرشتے یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام نے الفاظ قرآن کریم کو اللہ جل شانہ سے سن کر حاصل کیا۔ اس مفہوم کی موید طبرانی کی حدیث ہے جو کہ حضرتِ نواس بن سمعان سے مرفوعاً منقول ہے۔

((إِذَا تَكَلَّمَ اللّٰهُ بِالْوَحْيِ اَخَذَتِ السَّمَآءَ رَجْفَةٌ شَدِيْدَةٌ مِّنْ خَوْفِ اللّٰهِ فَإِذَا سَمِعَ اَهْلُ السَّمَآءِ صَعِقُوْا وَخَرُّوْا سُجَّدًا فَيَكُوْنُ اَوَّلُهُمْ يَرْفَعُ رَأْسَهُ جِبْرَئِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَيُكَلِّمُهُ اللّٰهُ لِوَحْيِهِ بِمَا أَرَادَ فَيَنْتَهِي بِهِ حَيْثُ أُمِرَ)).

یعنی جب اللہ تعالیٰ وحی کے ساتھ کلام کرتا ہے تو آسمان خوف الٰہی سے کانپ جاتا ہے اور جب آسمان کے فرشتے سنتے ہیں تو بے ہوش ہو کر سجدے میں گر جاتے ہیں۔ سب سے پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام سر اٹھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ وحی کے ساتھ اُن سے کلام فرماتے ہیں پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام کو جہاں وحی پہنچانے کا حکم ہوتا ہے وہیں وحی پہنچا دیتے ہیں۔

(تیسرا قول راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کی تائید میں حدیث موجود ہے) تینوں اقوال میں ایک بات تو قدرِ مشترک ہے وہ یہ کہ نزول کی کیفیت خواہ کچھ بھی ہو لیکن تنزیل کا مرجع تنِ تنہا اللہ وحدہ لاشریک لہ کی ذاتِ اقدس ہے۔

اَلفاظِ قرآن مُنزّل ہیں

حضرت جبرئیل علیہ السلام حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کے الفاظ لے کر اُترتے تھے۔ (یعنی ایسا نہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام مفہوم و معانی اللہ تعالیٰ کے استعمال کرتے ہوں اور الفاظ اپنے استعمال کرتے ہوں بلکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام الفاظ بھی اللہ تعالیٰ ہی لے کر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کرتے تھے) لہٰذا حضرت جبرئیل علیہ السلام سورۃ الفاتحہ سے لے کر سورۃ الناس تک کے تمام الفاظ بعینہٖ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر اُترے۔ یہ تنِ تنہا اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں۔ ان میں نہ ہی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کا کوئی عمل دخل ہے اور نہ ہی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی آمیزش ہے۔ اور نہ ہی قیامت تک اس کلام میں کوئی ملاوٹ کر سکے گا۔

اس کلام کو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پڑھا پھر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا پھر بہت سی مخلوق نے پڑھا لیکن یہ کلام اصل کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا کلام ہی رہے گا۔ جیسا کہ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ اگر کسی آدمی نے کوئی کلام لکھا پھر بعد میں اُس کو بہت سے

لوگوں نے پڑھا تو وہ کلام بعد والے لوگوں کا نہیں کہلائے گا بلکہ اس کلام کی نسبت اوّلاً لکھنے والے ہی کی طرف کی جائے گی۔
بالکل اسی طرح اوّلاً اور ابتداء قرآنِ کریم کے متکلم اللہ تعالیٰ ہیں بعد اس کلام کو حضرت جبریل علیہ السلام پڑھیں یا حضور اکرم ﷺ تلاوت فرمائیں یا باقی ساری مخلوق کسی بھی مکان یا زمان میں پڑھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کلام کے موجد اور خالق اللہ تعالیٰ ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی رہیں گے۔

الفاظِ قرآن، کلام کی وہ قسم ہے جس کو ہم کلامِ لفظی کہہ سکتے ہیں۔ ایک ہوتا ہے کلام نفسی اور ایک ہوتا ہے کلامِ لفظی۔ کلامِ نفسی اس کلام کو کہتے ہیں جو انسان اپنے ذہن میں مرتب کیے ہوئے ہوتا ہے۔ اور اگر انسان اس کلام نفسی کو الفاظِ مرتّبہ کی شکل میں زبان سے ادا کردے تو وہ کلامِ لفظی کہلاتا ہے۔ کلامِ لفظی، کلامِ نفسی کو سمجھنے وسمجھانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ قرآن کریم کا معنی اور مفہوم تو اللہ تعالیٰ کا ہے لیکن الفاظ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ہیں جو وہ آکر حضور اکرم ﷺ پر پڑھتے تھے۔ یا حضرت جبریل علیہ السلام اُن معانی کو اللہ تعالیٰ سے لے کر حضور اکرم ﷺ پر القاء کرتے تھے پھر حضور اکرم ﷺ ان معانی کو اہل عرب کی لغت کے مطابق الفاظ میں ڈھال دیتے تھے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے سامنے بیان کر دیتے تھے۔ مندرجہ بالا دونوں قول باطل اور غلط ہیں۔ نیز قرآن وسنت اور اجماع سے متصادم ہیں۔ یہ دونوں اقوال عقل کے بھی خلاف ہیں کیونکہ اگر معانی ومضمون اللہ تعالیٰ کا ہو اور مرتّبہ الفاظ حضرت جبرئیل علیہ السلام یا آنحضرت ﷺ کے ہوں تو وہ کلام اللہ تعالیٰ کا نہیں کہلائے گا بلکہ وہ جبرئیل علیہ السلام یا محمد ﷺ کا کلام کہلائے گا۔ حالانکہ قرآن وحدیث میں ہمیشہ قرآن کی نسبت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف کی گئی ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (التوبہ:٦)

"یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔"

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے دلائل ہیں جن کو طوالت کے خوف سے ترک کیا جارہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا کردار قرآن مجید سے متعلق اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ نے پوری امانت داری کے ساتھ قرآنِ کریم کے الفاظ حضور اکرم ﷺ تک پہنچائے، بلکہ اس کے پہنچانے کا حق ادا کر دیا۔ جب کہ قرآن مجید سے متعلق حضور اکرم ﷺ کا کردار یہ ہے کہ آپ ﷺ نے قرآن مجید کو اپنے سینے میں لفظ بہ لفظ محفوظ کیا، اس کو آگے اُمت تک پہنچایا، اس کی تفسیر بیان فرمائی، اس کی تطبیق اور تنفیذ کے لیے حتی الامکان کوشش کی۔ خلاصہ یہ کہ قرآنِ مجید میں نہ ہی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنے پاس سے کوئی کمی وزیادتی کی اور نہ ہی حضور اکرم ﷺ نے۔ ان دونوں شخصیات نے تو صرف قرآنِ کریم کو نقل کیا ہے بس۔

قرآن کریم میں ہے:

(۱) ﴿وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝﴾ (النمل:٦)
"اور تم کو قرآن (خدائے) حکیم وعلیم کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے۔"

(۲) ﴿وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْ لَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ﴾ (الاعراف:۲۰۳)

"اور جب تم ان کے پاس (کچھ دنوں تک) کوئی آیت نہیں لاتے تو کہتے ہیں کہ تم نے (اپنی طرف سے) کیوں نہیں بنا لی؟ کہہ دو کہ میں تو اسی حکم کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پروردگار کی طرف سے میرے پاس آتا ہے۔"

③ ﴿وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝﴾ (یونس:۱۵)

"اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی امید نہیں وہ کہتے ہیں کہ (یا تو) اس کے سوا کوئی اور قرآن (بنا) لاؤ یا اسکو بدل دو۔ کہہ دو کہ مجھ کو اختیار نہیں ہے کہ اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو اسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف آتا ہے۔ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے (سخت) دن کے عذاب سے خوف آتا ہے۔"

④ ﴿وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝﴾ (الحاقۃ:۴۴-۴۵-۴۶-۴۷)

"اگر یہ پیغمبر ہماری نسبت کوئی بات جھوٹ بنا لاتے۔ تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے۔ پھر ان کی رگ گردن کاٹ ڈالتے۔ پھر تم میں سے کوئی ہمیں اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔"

"کلام اللہ کی اقسام"

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے امام جوینی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے:

" كَلَامُ اللّٰهِ الْمُنَزَّلُ قِسْمَانِ: قِسْمٌ: قَالَ اللّٰهُ لِجِبْرِيْلَ: قُلْ لِلنَّبِيِّ اَنْتَ...."

"اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ کلام کی دو قسمیں ہیں۔"

① پہلی قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ اے جبرئیل! جس ہستی کی طرف تم میرا پیغام لے کر جاتے ہو اُن سے جا کر کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ یہ فرمایا ہے اور اس اس بات کا حکم دیا ہے۔ پس جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی بات کو سمجھ گئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے ایسے فرمایا ہے۔ اس وقت یہ لازمی نہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام وہی عبارت استعمال کرتے ہوں جو اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک بادشاہ اپنے کسی معتمد بندے سے یوں کہتا ہے کہ فلاں سردار کو جا کر کہہ دو کہ بادشاہ تمہیں یوں کہہ رہا ہے کہ دِل جمعی سے کام کرو اور قتال کے لیے لشکر تیار رکھو۔ پس وہ معتمد آدمی اُس فلاں سردار کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ بادشاہ سلامت نے کہا ہے کہ میری خدمت اور کام میں سستی مت کرو اور جنگی لشکر کو اس کے حال پر مت چھوڑو بلکہ انھیں قتال و جنگ کے لیے ترغیب دیتے رہو اور لشکر کو لڑائی کے لیے تیار کرلو۔ پس اب اس معتمد آدمی کو جھوٹا نہیں کہا جائے گا اور نہ ہی یہ کہا جائے گا کہ اُس کے تقصیر سے کام لیا۔

② دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ اے جبرئیل! یہ کتاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جا کر پڑھ کر سنا دو۔ پس

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بغیر کسی تغیر و تبدیلی کے وہ کتاب (تحریر) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو آ کر پڑھ کر سنا دی۔ اس وقت یہ لازم ہے کہ الفاظ بعینہٖ وہی ہوں جو اللہ تعالیٰ نے استعمال کیے تھے۔ اس کی مثال یوں ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے کسی معتمد آدمی سے کہے کہ یہ خط (تحریر) لو اور فلاں شخص کے پاس جا کر پڑھ کر سنا دو۔ پس اب وہ معتمد آدمی اس فلاں شخص کے پاس جا کر وہ خط (تحریر) پڑھ کر سنا دیتا ہے۔ تو اس صورت میں وہ ایک کلمہ یا حرف کی بھی تبدیلی کرنے والا نہیں ہوگا۔"

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ امام جوینی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مضمون نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"القرآن هو القسم الثاني والقسم الاوّل هو السنة كما ورد انّ جبريل كان ينزل بالسنة كما ينزل بالقرآن."

یعنی دوسری قسم سے مراد قرآنِ کریم ہے جبکہ پہلی قسم سے سنت مراد ہے۔ جیسا کہ امام دارمی رحمۃ اللہ علیہ، محمد بن نصیر رحمۃ اللہ علیہ، امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ، اور امام خطیب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسان بن عطیہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سنت کو بھی قرآن ہی کی طرح لے کر اُترا کرتے تھے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ سنت کی روایت بالمعنیٰ جائز ہے کیونکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام قرآنِ کریم کو باللفظ ادا کیا تھا۔ اور راز اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو الفاظ قرآن کریم میں استعمال ہوتے ہیں وہ معجز ہیں مخلوق میں سے کسی ایک کو بھی یہ طاقت نہیں کہ وہ اس کے قائم مقام کوئی لفظ استعمال کر سکے۔ اور پھر اس میں یہ راز بھی ہے کہ اُمتِ محمدیہ کو آسانی دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل کی گئی کتاب اور وحی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک قسم وہ جس کو بعینہٖ انہی الفاظ کے ساتھ روایت کرتے ہیں جن میں وہ وحی کے ذریعہ اُتری ہے اور دوسری قسم کی روایت بالمعنیٰ کر سکتے ہیں ورنہ اگر تمام وحی منزّل صرف بلفظہٖ روایت کرنے ہی کی قسم میں داخل کر دی جاتی تو یہ بات امت پر گراں ہوتی۔ اور اگر تمام کلام الٰہی (دونوں اقسام) کو معنی کے لحاظ سے روایت کیے جانے کی قسم میں شامل کر دیتے تو اُس کے تبدیل اور تحریف کیے جانے سے امن حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ فتامل۔

میں کہتا ہوں کہ امام جوینی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کلام بہت نفیس و عمدہ ہے لیکن ہمارے پاس یا امام جوینی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں جس کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکیں کہ غیر قرآن میں حضرت جبرئیل علیہ السلام الفاظ کے اعتبار سے کسی قسم کا تصرف کرتے تھے۔ امام جوینی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں جو کچھ فرمایا وہ محض ان کا عقلی احتمال یا گمان ہے جو کہ اس باب میں ناکافی ہے۔ نیز امام جوینی رحمۃ اللہ علیہ نے کلام اللہ کی جو تقسیم کی ہے وہ بھی نامکمل ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے کلام اللہ کی دو قسمیں بیان کیں۔ ① کتاب اللہ یعنی قرآن ② سنت یعنی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور تیسری قسم یعنی حدیثِ قدسی کو بیان نہیں فرمایا۔ حدیثِ قدسی وہ حدیث ہوتی ہے جس کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے حکایۃً نقل فرماتے ہیں یہ بھی کلام اللہ کی ایک قسم ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ اس قسم کو قرآن کریم کی طرح ممتازی حیثیات حاصل نہیں ہوتیں۔ اور اس قسم یعنی حدیثِ قدسی کو قرآنِ کریم والی ممتازی حیثیات سے نہ نوازنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمتیں ہیں۔ مثلاً امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تخفیف کرنا بایں معنی کہ کتاب اللہ کی روایت بالمعنیٰ جائز نہیں جبکہ حدیثِ قدسی میں روایت بالمعنیٰ جائز ہے۔ کتاب اللہ کو حالتِ جنابت میں پڑھ، اُٹھا اور چھو نہیں سکتے جبکہ حدیثِ قدسی کو حالتِ جنابت میں پڑھ بھی سکتے ہیں اور اُٹھا بھی سکتے ہیں اور ہاتھ بھی لگا سکتے ہیں۔

خلاصہ کلام ساری بحث کا خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ بالاتفاق اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ جب کہ مشہور قول کے مطابق حدیثِ قدسی کے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کیے گئے ہیں۔ لیکن حدیثِ نبوی ﷺ کے صرف معانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیے گئے ہیں۔ لہٰذا قرآنِ کریم کو جو خصائص مثلاً اعجاز، تعبّد، وجوب المحافظہ وغیرہ حاصل ہیں وہ خصائص حدیثِ قدسی اور حدیثِ نبوی ﷺ کو حاصل نہیں ہیں۔ اس تقسیم میں حکمت یہ ہے کہ اگر قرآن کریم میں بھی روایت بالمعنیٰ کو جائز قرار دے دیا جاتا تو قرآن کریم کا اعجاز باقی نہیں رہتا۔ اور اگر حدیثِ قدسی حدیثِ نبوی ﷺ میں روایت بالمعنیٰ کو جائز نہ رکھا جائے تو امت پر مشقت ہوتی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو تین اقسام میں منقسم فرما دیا تا کہ امت پر مشقت نہ ہو اور قرآنِ کریم کو بھی ممتازی حیثیت حاصل رہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ (الحج:۶۵)

"بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رؤف ورحیم ہے۔"

قرآن کریم کے تیسرے یعنی آخری نزول کا عرصۂ مدّت

قرآنِ کریم کے نازل ہونے کی ابتداء آنحضور ﷺ کی بعثت سے ہوئی جبکہ انتہا آپ ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے سے کچھ عرصہ قبل ہوئی۔ قرآن کریم کے نزول کی ابتداء سے انتہا تک کے عرصے کی مدت بیس سال، تیئس سال یا پچیس سال ہے۔ ۲۰، ۲۳، یا ۲۵ یہ تین اقوال اس لیے ہیں کہ آپ ﷺ کے مکہ میں (بعثت کے بعد) رہنے کے زمانے میں اختلاف ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حضور اقدس ﷺ بعثت کے بعد مکہ مکرمہ میں دس سال رہے تو قرآن کریم کے نزول کا مکمل زمانہ بیس سال ہوگا اور اگر مان لیا جائے کہ حضور اکرم ﷺ تیرہ یا پندرہ سال رہے تو قرآن کریم کا زمانہ نزول بالترتیب ۲۳، یا ۲۵ سال ہوگا۔ اور رہی بات مدینہ منورہ میں قیام کی تو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے یعنی حضور اکرم ﷺ مدینہ منورہ میں بالاتفاق دس سال رہے۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ہی فرمایا ہے۔

لیکن تاریخ اسلامی کے بعض مورخین کا کہنا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی مکہ مکرمہ میں مدتِ قیام ۱۲ سال، پانچ ماہ اور تیرہ دن ہے۔ اور اس مدت کی ابتداء نبی اکرم ﷺ کی ولادتِ شریفہ کے اکتالیسویں سال سترہ رمضان المبارک سے ہوتی ہے اور انتہا آپ ﷺ کی ولادتِ شریفہ کے چوونویں سال یکم ربیع الاوّل پر ہوتی ہے۔ اور مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد آپ ﷺ کی مدتِ قیام ۹ سال، ۹ ماہ اور ۹ دن ہے۔ اس مدت کی ابتداء آپ ﷺ کی ولادتِ شریفہ کے چوونویں سال یکم ربیع الاوّل سے ہوتی ہے اور انتہا آپ ﷺ کی ولادتِ شریفہ کے تریسٹھویں سال ۹ ذی الحجہ پر ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کی ولادتِ شریفہ کا تریسٹھواں سال درحقیقت ہجرت کا دسواں سال تھا۔

مندرجہ بالا تحقیق کے مطابق وحی کا عرصہ نزول تیئس (۲۳) سال ٹھہرتا ہے۔ اور یہ تحقیق اس قول کے قریب قریب ہے جس میں آنحضور ﷺ کا بعثت کے بعد مکہ میں قیام تیرہ سال اور مدینہ میں دس سال ہے۔

لیکن اس تحقیق میں تین کجیاں ہیں:

① وحی کی ابتداء میں چھ ماہ تک حضور اکرم ﷺ کو جو رویائے صادقہ دکھائی دیتے تھے، اس تحقیق کے مطابق ان چھ ماہ کو مدت وحی میں شمار نہیں کیا گیا۔

② اس تحقیق کے مطابق نزولِ وحی کی ابتداء سترہ رمضان کو ہوئی۔ سترہ رمضان کی رات اگرچہ بعض اقوال کے مطابق لیلۃ القدر ہے لیکن مشہور اقوال کے مطابق سترہ رمضان کی رات لیلۃ القدر نہیں ہے۔ لیلۃ القدر تو رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہے صحیح اور مشہور قول کے مطابق۔

③ اس تحقیق کے مطابق قرآن کی نازل ہونے والی آخری وحی نو ذی الحجہ دس ہجری کو نازل ہوئی۔ یعنی ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ (المائدہ: ۳) یہ آیات آخری ہیں۔ حالانکہ آپ آگے جا کر پڑھیں گے کہ قرآن کریم کی آخری آیات یہ نہیں ہیں۔

قرآنِ کریم کا تیسرا یعنی آخری نزول یکبارگی نہیں ہے

جیسا کہ ماقبل گزرا کہ قرآنِ کریم کا تیسرا یعنی آخری نزول جو کہ حضرت محمد ﷺ کے قلبِ اطہر پر ہوا یکبارگی نہیں تھا بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے موقع کی مناسبت سے ہوا تھا۔ اس جگہ اس بات پر دلائل پیش کیے جا رہے ہیں۔

① ﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا﴾ (الاسراء: ۱۰۶)

"اور ہم نے قرآن کو جزو جزو کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سناؤ اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا ہے۔"

② ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا﴾ (الفرقان: ۳۲)

"اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ اس طرح آہستہ آہستہ اس لیے اتارا گیا کہ اس سے تمہارے دل کو قائم رکھیں اور اسی واسطے ہم اسکو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہیں۔"

③ ﴿وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا﴾ (الفرقان: ۳۳)

"اور یہ لوگ تمہارے پاس جو (اعتراض کی) بات لاتے ہیں ہم تمہارے پاس اس کا معقول اور خوب مشرح جواب بھیج دیتے ہیں۔"

روایت کیا گیا ہے کہ یہود اور مشرکین میں سے کفار حضور اکرم ﷺ کو طعنہ دیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر قرآن یکبارگی نازل کیوں نہیں فرما دیا۔ تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان کی آیت نمبر ۳۲ اور ۳۳ (مندرجہ بالا آیات) نازل فرمائیں۔ یہ دونوں آیات ان کفار پر ردّ ہے۔ نیز ان آیات سے درج ذیل دو اُمور ثابت ہوتے ہیں:

① قرآنِ کریم حضور اکرم ﷺ پر یکبارگی نہیں بلکہ نجماً نجماً (تھوڑا تھوڑا کر کے) نازل ہوا ہے۔

② سابقہ کتب سماویہ یکبارگی نازل ہوئی تھیں جیسا کہ جمہور علماء کے نزدیک مشہور ہے حتیٰ کہ اس پر تو اجماع بھی منعقد ہو چکا ہے۔

سابقہ کتب سماویہ یکبارگی نازل ہوئی تھیں۔ اگر وہ کتب یکبارگی نازل نہ ہوئی ہوتیں تو اللہ تعالیٰ سورۃ الفرقان کی آیت نمبر

۳۲ میں کفار کے قول کا ردّ فرماتے اور واضح کر دیتے کہ سابقہ کتب سماویہ بھی قرآن کی طرح نجماً نجماً نازل ہوئی تھیں جیسا کہ سورۃ الفرقان ہی کی آیت نمبر ۷ میں کفار کا قول نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے کہا:

﴿مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ (الفرقان:۷)

"کیسا پیغمبر ہے کہ کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔"

تو اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق ان کے قول کا جواب سورۃ الفرقان کی آیت نمبر ۲۰ میں دیا:

﴿وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّاۤ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ يَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ (الفرقان:۲۰)

"اور ہم نے تم سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے ہیں سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔"

خلاصہ کلام یہ کہ قرآن کریم کا نجماً نجماً اور سابقہ کتب سماویہ کا یکبارگی نازل ہونا سورۃ الفرقان کی آیت نمبر ۳۲ ہی سے ثابت ہو رہا ہے۔

قرآن کریم کے تنجیمی نزول میں اسرار و حکم

تنجیمی نزول سے قرآن کریم کا نجماً نجماً، درجہ بہ درجہ، تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہونا یا تدریجی نزول مراد ہے۔ قرآن کریم کے تنجیمی نزول میں متعدد اسرار اور کثیر حکمتیں ہیں، ان اسرار و حکم میں سے اجمالی طور پر چار سر یا چار حکمتیں ذیل میں بیان کی جا رہی ہیں۔

پہلی حکمت تدریجی نزول میں سب سے پہلی حکمت حضور اقدس ﷺ کے قلب اطہر کو ثبات اور قوت بخشنا تھی۔ حضور اکرم ﷺ کے قلب اطہر کو تدریجی نزول سے تقویت اور ثبات کیسے ملتا تھا؟ اس کی پانچ وجوہات ہیں: جو کہ درج ذیل ہیں:

پہلی وجہ بارگاہِ خداوندی سے نئے نئے پیغامات کا آنا اور فرشتہ وحی یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام کا ان پیغامات کو لے کر بار بار حضور اکرم ﷺ کے پاس تشریف لانا حضور اکرم ﷺ کے قلب اطہر میں سرور و لذت کی کیفیت پیدا کرتا تھا۔ اور یہ سرور و لذت آپ کے قلبِ اطہر کے لیے تقویت کا سبب تھا۔

دوسری وجہ تدریجی نزول میں فہم و حفظ کے اعتبار سے آسانی پائی جاتی ہے۔ کیونکہ جب آیات و احکام وقتاً فوقتاً نازل ہوں گے تو ان آیات و احکام کو یاد کرنا اور سمجھنا آسان ہوگا۔ اور حضور اکرم ﷺ بھی اس بات پر مطمئن رہیں گے کہ مجھے تمام احکام و حکمتیں یاد ہیں۔

تیسری وجہ ہر ضرورت کے وقت میں ضرورت کے مطابق کلام الٰہی کا نازل ہو جانا ایک معجزہ تھا۔ اور ہر بار کلام الٰہی ہونا ایک نیا معجزہ ہوتا تھا۔ اور یہ معجزہ کفار کے لیے عجز ثابت کرتا تھا۔ جبکہ مسلمانوں کے لیے بالخصوص حضور اکرم ﷺ

کے لیے ثباتِ قلب وتقویت اور اطمینان کا سبب ہوتا تھا۔

چوتھی وجہ تدریجی نزول میں حق کی تائید اور باطل کی تردید یکے بعد دیگرے پائی جاتی تھی۔ جس سے اپنی کامیابی پر بار بار لذت محسوس ہوتی تھی۔ جو کہ تقویتِ قلب کا سبب ہے۔

تیسری اور چوتھی وجہ بظاہر ملتی جلتی محسوس ہو رہی ہیں لیکن ان دونوں میں وہ فرق ہے جو کسی چیز اور اس کے اثر یا ملزوم اور اس کے لازم کے درمیان ہوتا ہے۔

پس معجزہ بذاتِ خود رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک قوت کی حیثیت رکھتا تھا جو کہ آپ کی ذاتِ اقدس کے لیے مؤید اور قلبِ اطہر کے لیے مُثبِّتِ ثابت ہوتا تھا۔ اور اس معجزہ کا اثر یا نتیجہ ایک علیحدہ طور پر حضور ﷺ کے قلبِ کریم کے لیے طمانیت تھا۔ بس یہ معاملہ اسلحہ کی مثال کی طرح ہے۔ جیسے کسی آدمی کے ہاتھ میں اسلحہ کا موجود ہونا بھی اس آدمی کو مطمئن رکھتا ہے اگرچہ وہ اس اسلحہ کو استعمال نہ کر رہا ہو اور اگر وہ اس اسلحہ کو استعمال کرتا ہے دشمن کو شکست دینے کے لیے تو وہ دوگنا طمانیت کا موجب ہوتا ہے۔

پانچویں وجہ حضور اکرم ﷺ سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ کفار و دشمنوں کی طرف سے جو شدائد آئیں گے میں ان کو آپ ﷺ پر آسان کر دوں گا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کفار کی طرف سے شدائد مختلف اوقات میں رونما ہوتے رہتے تھے تو اللہ تعالیٰ بھی ان شدائد کو سہل و آسان کرنے کے لیے مختلف اوقات میں آیات نازل کرتے رہتے تھے جن کے ذریعہ آپ ﷺ کو تسلی دی جاتی تھی۔ اس تسلی دینے کے مختلف انداز ہوتے تھے مثلاً کبھی اللہ تعالیٰ سابقہ انبیاء مرسلین کے واقعات سنا کر تسلی دیتے تھے (یہ انداز قرآن مجید میں بکثرت پایا جاتا ہے) جیسا کہ سورۃ ہود آیت نمبر ۱۲۰ میں ہے:

﴿وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ (ہود:۱۲۰)

"(اے محمد ﷺ) پیغمبروں کے وہ سب حالات جو ہم تم سے بیان کرتے ہیں ان سے ہم تمہارے دل کو قائم رکھتے ہیں۔"

اور کبھی تسلی کا انداز اس طرح ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ حضور اکرم ﷺ کو وہ وعدے یاد دلاتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ سے کیے تھے اور ان کی حفاظت کا حکم دیتے تھے جیسا کہ درج ذیل آیات میں ہے:

﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا﴾ (الطور:۴۸)

"اور تم اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں صبر کیے رہو تم تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔"

﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدۃ:۶۷)

"اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔"

اسی طرح کی آیات سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح میں بھی ہیں جن میں وعدوں اور عطایا کا بیان ہے۔

اور کبھی تسلی کا انداز اس طرح ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کو دشمنوں کی شکست کی خوش خبری سناتے تھے اور دشمن کو ڈراتے دھمکاتے تھے۔ جیسا کہ درج ذیل آیات میں ہے:

﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾ (القمر:۴۵)

"عنقریب یہ جماعت شکست کھائے گی اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔"

﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ﴾ (فصلت:۱۳)

"پھر اگر یہ منہ پھیر لیں تو کہہ دو کہ میں تم کو ایسی چنگھاڑ (کے عذاب) سے آگاہ کرتا ہوں جیسے عاد اور ثمود پر چنگھاڑ (کا عذاب آیا تھا)۔"

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (الاحقاف:۳۵)

"پس (اے محمد ﷺ) جس طرح اور عالی ہمت پیغمبر صبر کرتے رہے ہیں اسی طرح تم بھی صبر کرو۔"

اور کبھی امر کی بجائے نہی کے انداز میں ان کفار وگم راہ لوگوں کے لیے حسرت اور افسوس کرنے سے منع کیا جاتا اور فرمایا جاتا:

﴿فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ﴾ (الفاطر:۸)

"تو ان لوگوں پر افسوس کر کے تمھارا دم نہ نکل جائے یہ جو کچھ کرتے ہیں خدا اس سے واقف ہے۔"

﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ﴾ (النحل:۱۲۷)

"اور صبر ہی کرو اور تمھارا صبر بھی خدا ہی کی مدد سے ہے اور ان کے بارے میں غم نہ کرو اور جو یہ بداندیشی کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہونا۔"

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (الشعراء:۳)

"(اے پیغمبر) (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شاید تم اس (رنج) سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنے تئیں ہلاک کر دو گے۔"

﴿وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۞ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ﴾ (الانعام:۳۶،۳۵)

"اور اگر ان کی روگردانی تم پر شاق گزرتی ہے تو اگر طاقت ہو تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈھ نکالو یا آسمان میں سیڑھی (تلاش کرو) پھر ان کے پاس کوئی معجزہ لاؤ۔ اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ پس تم ہرگز نادانوں میں نہ ہونا۔ بات یہ ہے کہ (حق کو) قبول وہی کرتے ہیں جو سنتے بھی ہیں اور مُردوں کو تو خدا (قیامت ہی کو) اٹھائے گا۔ پھر اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔"

تدریجی نزول کی مذکورہ پہلی حکمت اپنی پانچوں وجوہات کے ساتھ درج ذیل آیت میں سموئی ہوئی ہے۔

﴿كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ (الفرقان:۳۲)

"اس طرح آہستہ آہستہ اس لیے اتارا گیا کہ اس سے تمہارے دل کو قائم رکھیں۔"

تدریجی نزول کی دوسری حکمت

تدریجی نزول کی دوسری حکمت امتِ محمدیہ علی صاحبھا السلام والتحیہ کی آہستہ آہستہ یا درجہ بہ درجہ علمی اور عملی اعتبار سے تربیت کرنا تھی۔ اس اجمال کی تفصیل مندرجہ ذیل پانچ اُمور میں کی جاسکتی ہے۔

① حفظِ قرآن میں سہولت

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل فرمایا تاکہ اس کو محفوظ کرنا آسان ہو جائے۔ کیونکہ اس وقت اکثر امت اُمّی تھی۔ لکھنے والوں کے پاس ادواتِ کتابت کی قلت تھی۔ امت کا ایک حصہ معاشی سرگرمیوں میں مصروف تھا جبکہ ایک حصہ دین اسلام کے دفاع کے لیے ہر وقت دشمن سے نبرد آزما تھا۔ پس ایسے حالات میں اگر قرآن مجید یک لخت یا یکبارگی نازل ہو جاتا تو اس عظیم کتاب کو یاد کرنا اور محفوظ رکھنا مشکل ہو جاتا۔ پس اس وقت حکمتِ عالیہ کا تقاضا یہ ہی تھا کہ قرآنِ کریم کو تھوڑا تھوڑا کر کے متفرقاً نازل کیا جاتا تاکہ اس کو محفوظ کرنا خواہ زبانی یاد کرنے کی صورت میں ہو یا لکھ کر رکھ لینے کی صورت میں ہو، آسان ہو جاتا۔

② فہمِ قرآن میں سہولت

جیسے حفظِ قرآن میں سہولت مقصود تھی ایسی ہی فہم قرآن میں سہولت مقصود تھی۔ اگر سارے کا سارا قرآن یکبارگی نازل ہو جاتا تو قرآن کے لطیف ودقیق مسائل کو سمجھنا بشری طاقت سے باہر ہو جاتا۔

③ عقائدِ باطلہ سے نفرت

اُمتِ محمدیہ کی تربیت کا اہم پہلو یہ تھا کہ ان میں سے باطل عقائد اور بت پرستی وغیرہ کو نکال کھڑا کیا جائے۔ لیکن یہ کام یک لخت دشوار تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آسانی کرتے ہوئے قرآنِ کریم کو متفرقاً نازل کیا تاکہ یہ باطل عقائد اور باطل اعمال تھوڑے تھوڑے کر کے امت میں سے نکل جائیں اور امت کی تربیت کا یہ پہلو بھی کامل ہو جائے۔ پھر عقائدِ باطلہ اور اعمالِ باطلہ کے ترک کروانے میں اللہ تعالیٰ نے الاهم ثم بالمهم کا اصول اپنایا۔ یہاں تک ان کو تمام اَرجاس سے پاک کر دیا اور انھیں محسوس تک نہ ہوا۔ یعنی غیر محسوس طریقے سے ان سے تمام سابقہ فتن اور عادات کا صفایا کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ فعل درحقیقت سیاستِ رشیدہ تھی۔ اور اس وقت امت کی تربیت کے لیے یہی سیاستِ رشیدہ ضروری تھی۔

④ عقائدِ حَقّہ سے محبت

اُمتِ محمدیہ کی تربیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ ان میں عقائد حَقّہ اور درست عبادات اور اعمال کا شوق اور شعور پیدا کیا جائے۔ انھیں اَخلاقِ فاضلہ سے مزین کیا جائے۔ لیکن یہ کام بھی قبل الذکر سیاست رشیدہ کے ذریعے ہی ممکن تھی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے احکام کی ابتداء ہی شرک کی ممانعت سے کی۔ ابتداء ہی توحید اور قیامت کے واقعات سے کی۔ امت کے سامنے آنکھیں کھول دینے والے دلائلِ توحید بیان کیے، موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر براہین پیش کیے، روزِ قیامت حساب وکتاب اور مسئولیت وجزا اور سزا کی حجتیں واضح طور پر بیان کیں۔

عقیدۂ توحید، یقینِ آخرت اور ایمان بعث بعد الموت کو امت محمدیہ علی صاحبھا السلام والتحیۃ کے قلوب میں راسخ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کا رُخ عبادات کی طرف پھیرا۔ پھر عبادات میں بھی سب سے پہلے (ہجرت سے پہلے) نماز فرض فرمائی۔ پھر سن ۲ ہجری میں دواکٹھی عبادات یعنی زکوٰۃ اور صوم کا حکم جاری فرمایا۔ اور آخر میں سن ۶ ہجری میں حج کا حکم نازل فرما دیا (ایک قول کے

مطابق حج چھ ہجری میں فرض ہوا تھا۔شاید علامہ الزرقانی نے اسی وجہ سے سن چھ ہجری فرمایا۔مترجم)۔اللہ تعالیٰ کی یہ ہی سنت باقی امور میں بھی جاری رہی ہے مثلاً جب منکرات کی باری آئی تو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کبائر کے بارے میں زجر اور شدید نکیر نازل فرمائی اس کے بعد نرمی کے انداز میں صغائر سے بھی منع فرمادیا۔

خلاصہ یہ کہ جو برائی اس وقت کے لوگوں میں پیوستہ تھیں ان برائیوں کو جڑ سمیت اکھاڑنے کے لیے یہ ہی طریقہ کارگر تھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنایا یعنی تدریجی نزول۔اور تدریجی نزول کے ضمن میں احکام کا تدریجی لزوم۔ایک شراب ہی کی مثال کو دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو کیسے تدریجاً حرام قرار دیا۔پس اسی تدریجی طریقہ کار کے تحت اسلام اس خطہ عرب میں مکمل طور پر پھیل گیا۔اور یہ یہ طریقہ سب سے زیادہ ہدایت پھیلانے والا اور کامیاب سیاست کے طور پر اہلِ عالم کے سامنے متعارف ہوا۔نسبتاً اُن متمدن اور مہذب اقوام کے جنھوں نے شراب کی ممانعت کے حوالے سے اپنی عوام کو بہت ہی بُری طرح ناکام اور تہی دست بنا کر رکھ دیا اور امریکہ نے جو مضحکہ خیز فیصلہ کیا ہے وہ بھی اس سے کوئی کم درجے کا نہیں۔

کیا یہ اسلام کا اعجاز اور اعزاز نہیں ہے کہ اس نے کیسی سیاستِ رشیدہ کے ذریعے قبائل کو راہ راست دکھائی اور کئی گروہوں کو مہذب بنایا اور بہت سی جماعتوں کی تربیت کی؟ کیوں نہیں! بے شک اس اعجاز و اعزاز پر تو تاریخ بھی ایک گواہ ہے۔

⑤ مومنین کے دلوں کے لیے ثبات فراہم کرنا

اُمتِ محمدیہ علی صاحبھا السلام والتحیۃ کی تربیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ ان کے قلوب کو ثابت و مضبوط رکھا جائے۔اُن کو کفار کی جانب سے پیش آنے والے مصائب و آلام پر صبر اور اجر کے ساتھ تسلی دے جائے۔بایں طور پر کہ قرآن کریم نے رفتہ رفتہ گزشتہ امتوں کے واقعات سنائے۔سابقہ انبیا و مرسلین اور ان کے متبعین و مخالفین کے انجام بد اور انجام خیر کے قصے سنا کر ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔اور بہت سی ایسی آیات نازل فرمائیں جن میں اپنے نیک بندوں کے ساتھ نصرت، اجر، تائید اور تمکین کے سچے وعدے کیے گئے تھے۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝﴾ (النور:۵۵)

"جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا وہ میری عبادت کریں گے (اور) میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔"

پس اللہ تعالیٰ نے جو وعدے فرمائے وہ بالکل سچ ثابت ہوئے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی خوب مدد فرمائی اس کے لشکر کو عزتوں سے نوازا اور دشمنوں کے لشکروں کو تنِ تنہا شکست سے دوچار کیا، اور قرآنِ مجید میں یوں فرمایا:

﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الانعام:۴۵)

"غرض ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی۔ اور سب تعریف خدائے رب العالمین ہی کو (سزاوار ہے)۔"

تدریجی نزول کی مذکورہ دوسری حکمت درج ذیل آیت میں سموئی ہوئی ہے۔

﴿وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ﴾ (الاسراء:۱۰۶)

"اور ہم نے قرآن کو جزو جزو کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سناؤ۔"

اور تدریجی نزول کے اسرار اور حکمتوں کے بیان کے باب میں مندرجہ بالا آیت کی تفسیر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر ۳۲ سے ہوتی ہے۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہے:

﴿وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا﴾ (الفرقان:۳۲)

"اور اسی واسطے ہم اسکو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہیں۔"

﴿تَرْتِيْلًا﴾ پر تنوین تعظیم کے لیے ہے۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اس ترتیل کے تحت معانی و معارف کا بیش بہا خزانہ موجود ہے۔

تدریجی نزول کی تیسری حکمت

تدریجی نزول کی تیسری حکمت پے در پے نئے نئے پیش آنے والے واقعات کا ان کے مناسب حال جواب دینا تھا۔ پس جب بھی کوئی نیا واقعہ یا حادثہ پیش آتا تو اس کی مناسبت میں قرآن نازل ہو جاتا۔ اور اللہ تعالیٰ اس واقعے سے متعلق احکام کو مفصل بیان فرما دیتے۔ اگر قرآن کو یکبارگی نازل کیا جاتا تو روز بروز رونما ہونے والے واقعات کا جواب اور اس سے متعلق مسائل کا حل کیسے بیان کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا اس حکمت کے بھی پیش نظر قرآن کریم کو تدریجاً نازل کیا گیا۔ اس حکمت کو درج ذیل چار امور میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

① سائلین کے جوابات دینا

حضور اکرم ﷺ کی طرف سائلین متوجہ ہوئے۔ اور وہ سائلین وقتاً فوقتاً متوجہ ہوتے تھے اس لیے اُن کے جواب میں آیات بھی وقتاً فوقتاً نازل ہوتی تھیں۔ اب ان سائلین کی دو قسمیں تھیں۔ ایک سائلین وہ تھے جن کے سوالوں سے حضور اکرم ﷺ کی رسالت و نبوت کی مزید تثبیت و تقویت لوگوں کے سامنے ظاہر ہوتی تھی جیسے کچھ سائل آئے اور آ کر حضور اکرم ﷺ سے "روح" کے بارے میں پوچھا:

﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (الاسراء:۸۵)

"اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ میرے پروردگار کی ایک شان ہے۔ اور تم لوگوں کو (بہت ہی) کم علم دیا گیا ہے۔"

(یہ پہلی قسم کے سائلین کے سوالات دشمنی اور عناد پر مبنی ہوتے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر آپ ﷺ کی طرف سے جواب میں تاخیر ہو جائے یا بالکل ہی جواب نہ آئے تو ہم آپ ﷺ کی رسالت کو لوگوں کے سامنے مشکوک کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان دشمنوں کی طرف سے پوچھے جانے والے تمام سوالات کے ایسے جوابات نازل فرمائے کہ سوال

پوچھنے والے لاجواب ہو گئے) پس کچھ لوگ آئے اور حضرت ذوالقرنین کے بارے میں سوال پوچھا: قرآن نے یہ واقعہ یوں نقل کیا:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا﴾ (الکھف: ۸۳)

"اور تم سے ذوالقرنین کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ میں اس کا کسی قدر حال تمہیں پڑھ کر سناتا ہوں۔"

(سورۃ الکہف کے ان آیات میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے۔ وہاں دیکھا جا سکتا ہے)

اور سائلین کی دوسری قسم وہ تھی جن کے سوال کا مقصد اللہ تعالیٰ کے حکم کی معرفت ہوتا تھا تاکہ وہ علی وجہ البصیرت اس حکم پر عمل کر سکیں۔ جیسا کہ کچھ طالبانِ حق نے سوال کیے تھے:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلِ الْعَفْوَ﴾ (البقرۃ: ۲۱۹)

"اور یہ بھی تم سے پوچھتے ہیں کہ (خدا کی راہ میں) کون سا مال خرچ کریں کہہ دو کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو۔"

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ﴾ (البقرۃ: ۲۲۰)

"اور تم سے یتیموں کے بارے میں بھی دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ ان کی (حالت کی) اصلاح بہت اچھا کام ہے اور اگر تم ان سے مل جل کر رہنا (یعنی خرچ اکٹھا رکھنا) چاہو تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔"

② واقعات کا مختلف اوقات میں رونما ہونا

آپ کو معلوم ہے کہ تمام واقعات وحادثات ایک ساتھ ہی واقع نہیں ہو جاتے بلکہ مختلف اوقات میں مختلف واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ پس قرآن کریم میں ان واقعات سے متعلق احکام بیان کرنے تھے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم تدریجاً نازل کیا۔ اور پھر ہر موقع پر پیش آنے والے واقعات سے متعلق تفصیلی احکام اپنی آخری کتاب یعنی قرآن میں بیان کر دیے۔ اس باب میں بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ایک ایسا واقعہ جو دل کو ہلا دے اور رونگٹے کھڑے کر دے۔ میری مراد اس سے دشمنوں کی جانب سے ام المومنین سیدتنا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر جھوٹا الزام لگائے جانے کا واقعہ ہے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور کی دس آیات ایک ساتھ نازل فرمائیں جن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر لگائی جانے والی تہمت کی تردید کی اور ساتویں آسمان سے ان کی پاک دامنی کی گواہی نازل فرمائی۔

اس کی ایک اور مثال سورۃ المجادلہ کی ابتدائی آیات ہیں:

﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ڰ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ﴾ (المجادلہ: ۱)

"(اے پیغمبر ﷺ) جو عورت تم سے اپنے شوہر کے بارے میں بحث وجدال کرتی اور اللہ سے شکایت (رنج وملال) کرتی تھی اللہ نے اس کی التجا سن لی۔ اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا کچھ شک نہیں کہ اللہ سنتا دیکھتا ہے"

اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اس وقت نازل فرمائیں جب حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں آ کر اپنے شوہر حضرت اوس بن الصامت رضی اللہ عنہ کی شکایت کی تھی۔ ان کے شوہر نے ان سے ظہار کر لیا تھا۔ انہوں نے آ کر حضور اکرم ﷺ

سے اپنا مسئلہ بیان کیا کہ میرے بچے بہت چھوٹے ہیں اگر میں ان کو اپنے شوہر کے پاس چھوڑتی ہوں تو یہ مرجائیں گے اور اگر اپنے پاس رکھتی ہوں تو یہ بھوکے رہیں گے۔ اب بتایئے کہ میں کیا کروں۔ تو اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا آیات میں حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا کے مسئلے کا حل بیان فرمایا۔

③ مسلمانوں کو ان کی اَغلاط کی طرف متوجہ کرنا

اُس دور میں بھی من حیث الانسان مسلمانوں سے بعض اوقات خطائیں ہو جاتی تھیں۔ اور وہ خطائیں ساری کی ساری یک لخت نہیں ہوتی تھیں بلکہ ان خطاؤں کا وقوع ازمانِ متفرقہ میں ہوتا تھا تو ظاہر بات ہے ان کی خطاؤں کی اصلاح بھی ازمانِ متفرقہ میں ہی ہونی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ جب کسی مسلمان سے کوئی خطا ہوتی تو اسی وقت اس کی اصلاح کے لیے آیات قرآنی نازل فرماتے۔ جیسا کہ غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کی ایک جماعت سے اجتہادی غلطی ہوئی۔ انھیں ایک مقام پر کھڑا کیا گیا لیکن وہ وہاں سے ہٹ گئے جس کی وجہ سے بہت نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ تو اس موقع پر درج ذیل آیت اور اس کے بعد والی بہت سی آیات اسی غلطی پر آگاہ کرنے کے لیے نازل فرمائی گئیں۔

﴿وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ (آل عمران:۱۲۱)

"اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تم صبح کو اپنے گھر سے روانہ ہو کر ایمان والوں کو لڑائی کے لیے مورچوں پر (موقع بہ موقع) متعین کرنے لگے۔"

اس کی ایک اور مثال سورۃ التوبہ کی درج ذیل آیات میں ملتی ہے:

﴿وَ يَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَ عَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ (التوبہ:۲۵،۲۶،۲۷)

"اور (جنگ) حنین کے دن جبکہ تم کو اپنی (جماعت کی) کثرت پر غرہ تھا تو وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی۔ اور زمین باوجود (اتنی بڑی) فراخی کے تم پر تنگ ہوگئی۔ پھر تم پیٹھ پھیر کر پھر گئے۔ پھر خدا نے اپنے پیغمبر (ﷺ) پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی اور (تمہاری مدد کو فرشتوں کے) لشکر جو تمہیں نظر نہیں آتے تھے (آسمان سے) اتارے اور کافروں کو عذاب دیا۔ اور کفر کرنے والوں کی یہی سزا ہے۔ پھر خدا اس کے بعد جس پر چاہے مہربانی سے توجہ فرمائے۔ اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔"

یہ آیات غزوۂ حنین کے موقع پر نازل ہوئیں جب بعض نو وارد مسلمانوں نے اپنی زیادہ تعداد تو بھلا جانا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں یہ سبق دیا کہ کثرت یا قلت پر کامیابی یا ناکامی کا دارومدار نہیں ہوتا بلکہ اصل چیز اللہ پر توکل اور اللہ کی طرف سے نصرت ہوتی ہے۔ پس ان آیات میں فوری طور پر نو وارد مسلمانوں کو متنبہ فرمایا کہ وہ اپنی سوچ کو درست کریں اور توبہ کریں۔

④ منافقین کے حال سے آگاہی

منافقین جو کہ اللہ کے دشمن ہیں، کے حال سے آگاہ کرنا، ان کے پردوں کو فاش کرنا مقصود تھا۔ تاکہ اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ اکرم رضی اللہ عنہم ان منافقین

کے اصلی چہرے سے واقف ہو جائیں اور آئندہ ان کے مکر و فریب اور شرور سے محفوظ رہیں جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ۘ‏ ...... ﴾ (البقرۃ ۸-۲۰)

"اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ ایمان نہیں رکھتے"۔....

یہ کل تیرہ آیات اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں جن میں منافقین کی فضیحت بیان ہوئی تا کہ ان کے بھیانک چہرے سے پردہ اُٹھایا جا سکے جیسا کہ سورۃ التوبہ کی بہت سی آیات میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی منافقت کا پردہ فاش کیا ہے۔ اور قرآن کریم تو اسی طرح بہت سے حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تدریجی نزول کی تیسری حکمت اپنے چاروں مضامین کے ساتھ درج ذیل آیت سے ماخوذ مفہوم ہو رہی ہے۔

﴿ وَلَا يَاۡتُوۡنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئۡنٰكَ بِالۡحَـقِّ وَاَحۡسَنَ تَفۡسِيۡرًا ؕ‏ ﴾ (الفرقان: ۳۳)

"اور یہ لوگ تمہارے پاس جو (اعتراض کی) بات لاتے ہیں ہم تمہارے پاس اس کا معقول اور خوب مشرح جواب بھیج دیتے ہیں۔"

تدریجی نزول کی چوتھی حکمت

تدریجی نزول کی چوتھی حکمت مصدرِ قرآن کی طرف راہ نمائی کرنا تھی۔ یعنی اس بات کی طرف راہ نمائی کرنا تھی کہ یہ قرآن تن تنہا اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ ممکن ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کے سوا حضورِ اکرم ﷺ یا کسی اور مخلوق کا کلام ہو۔

اے مخاطب! تو قرآن مجید کو اوّل سے لے کر آخر تک پڑھ، تجھے وہ ایک ایسے مضبوط قلعے کی مانند محسوس ہوگا جس میں کوئی دراڑ نہ ہو۔ اس کا اسلوب قلعے کی مضبوط سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کے مثل دکھائی دے گا۔ اس کی آیات میں اتصالِ کامل نظر آئے گا۔ تو اس کی سورتوں، آیتوں اور جملوں میں ایک بے مثال ربط پائے گا۔ قرآن مجید کی الف سے لے کر یاء تک اعجاز کا اجراء یوں محسوس ہوگا جیسے رگوں میں خون کا تسلسل ہوتا ہے۔ قرآن مجید گویا کہ چاندی کی اس ڈلی کی مثل ہے جس کو پگھلا کر ڈھالا گیا ہو پھر اس ڈلی کے اجزاء میں کسی قسم کی پھٹن یا کجی دکھائی نہ دیتی ہو۔ قرآن مجید گویا کہ روشن چمکدار ستاروں کا ایک حلقہ ہے یا پھر وہ نایاب موتیوں کی لڑی ہے یا پھر وہ ایک ایسا نایاب ہیرا ہے جس کی روشنی آنکھوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔ قرآنِ مجید کے حروف وکلمات کو موتیوں کی طرح ایک لڑی میں پرو دیا گیا ہے۔ اس کے جملے وآیات کو ایک خاص مقصد کی خاطر لایا گیا ہے۔ اس کا آخر اس کے اوّل کی تائید کرتا ہے جبکہ اس کا اوّل اس کے آخر کا پیش خیمہ ہے۔

یہاں پر ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ اگر یہ کلام غیر اللہ کا ہوتا تو اس کلام میں اعلیٰ درجے کا اعجاز، کلمات وجملوں میں بے مثال اتفاق ومطابقت اور آیات وسورتوں میں حیران کن ربط کیسے برقرار رہتا حالانکہ یہ کلام ایک ساتھ نازل نہیں ہوا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہونے والے ہر حصے میں اعجاز، تسلسل و ربط کا ایک جیسا معیار و اسلوب بار بار اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ کلام کسی مخلوق کا نہیں یا اس کلام میں کسی مخلوق کا حصہ بھی نہیں۔ یہ کلام خالصتاً ایک ذات یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ (النساء:۸۲)
"اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کا (کلام) ہوتا تو اس میں (بہت سا) اختلاف پاتے۔"

پس بشری طاقت کے لیے یہ کیسے اور کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اس قدر وسیع وبلیغ اور معجز کلام پیش کرے جو انسان کی طاقت سے باہر ہو۔ اس کتاب کا ہر جز و اپنے دوسرے اجزاء کے ساتھ اعلیٰ درجے کی متابعت رکھتا ہے۔ حالانکہ اس کی نازل ہونے والی آیات کے اسباب مختلف ہیں، زمان اور مکان جدا جدا ہیں، اس کے نزول کا مکمل عرصہ قریباً تیئس سال ہے۔ ان تیئس سالوں میں زمانے نے مختلف موڑ کھائے، وقت نے کئی طرح گردش کی اور مکان بھی بدلتے رہے لیکن اس کتاب کا معیارِ اعجاز، اسلوبِ بیان اور تسلسل و ربط بین الآیات والسور ایک جیسا رہا، کسی بھی قسم کے تغیر زمان و مکان سے متاثر نہیں ہوا۔ حالانکہ یہ بات لازم ہے کہ جب زمانے اور دواعی میں اختلاف پایا جائے تو عادۃً تفکک اور انحلال آ ہی جاتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کا نزول خرقِ عادت ہوا۔ اسباب و دواعی کے مختلف اور متفرق ہونے کے باوجود قرآن کا معیارِ اعجاز اور ربط وغیرہ محکم رہا۔ ابتداء سے انتہاء تک یکسانیت برقرار رہی۔

یہ تمام باتیں کیا اس امر کی واضح دلیل نہیں کہ یہ کلام طاقت وقوت کے خالق، اسباب ومسبّبات کے مالک، مخلوق وکائنات کے مدبر، ارض وسماء کو قائم رکھنے والے، ما کان اور ما یکون کا علم رکھنے والے اور زمان وحوادث سے باخبر ذات کی طرف سے ہے اور اس میں اس کا کوئی مددگار ومعاون نہیں ہے۔

غور کیجیے اس امر پر کہ جب قرآنِ مجید کی آیات وسور نازل ہوتی تھیں تو حضور اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرماتے تھے: ((ضعو ھافی مکان کذا من سورۃ کذا)). (الترمذی:۳۰۸۶) "یعنی اس آیت کو فلاں سورت میں لکھو۔" آپ ﷺ سید الانبیاء ہونے کے باوجود بشریت کے حامل تھے اور صاحبِ بشریت یہ نہیں جانتا کہ آنے والے وقت میں کون سے حوادث ہونے والے ہیں کہ وہ اس کی مطابقت کر سکے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کا آیات کے معاملے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ بتانا کہ اس آیت کو فلاں سورت میں رکھو اور فلاں سورت کو فلاں سورت کے بعد رکھو اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ کلام کسی بشر کا نہیں بلکہ علام الغیوب کی طرف سے ہے جو ماضی، حال ومستقبل تمام زمانوں سے باخبر ہے۔ تب ہی تو وہ اپنی حبیب کے ذریعے آنے والے حوادث سے متعلقہ احکام مرتب کروا دیتا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ آج جو آیات نازل ہوئی ہیں ان کا ربط اس سورت سے ہے اور جو آیات کل کو نازل ہوں گی ان کا ربط کسی اور سورت سے ہوگا اسی لیے وہ حضور اکرم ﷺ کے توسط سے ان آیات کو خاص ترتیب سے ضبط کروا دیتا تھا۔

اسی طرح تیئس سال کا ایک طویل زمانہ حضور اکرم ﷺ پر گزرتا گیا اور کلام الٰہی مکمل ہوتا رہا اور آخر کار یہ کلام مکمل اور تمام ہو گیا۔ اور اس میں ادنیٰ سا بھی اختلاف یا تفاوت نہیں۔ بلکہ یہ کلام تو مخلوق کو اپنے انسجام، وحدت اور ترابط کی بدولت عاجز کر دینے والا ثابت ہوا:

﴿كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ﴾ (ھود:۱)
"وہ کتاب ہے جس کی آیتیں مستحکم ہیں اور حکیم وخبیر (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے بہ تفصیل بیان کر دی گئی ہیں۔"

مندرجہ بالا تمام توضیحات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنِ مجید کی آیات میں جو مماثلت، اتفاق،

اتساق اور اعجاز وغیرہ پایا جاتا ہے اس کے برابر بلکہ اس کے قریب قریب بھی کسی مخلوق کے کلام میں نہیں پایا جاتا خواہ وہ مخلوق بلاغت وفصاحت کے اعلیٰ درجوں پر ہی فائز کیوں نہ ہو۔

احادیثِ نبویہ ﷺ اعلیٰ درجہ کی فصاحت وبلاغت کی متحمل ہیں لیکن ان کے اندر بھی فصاحت وبلاغت اور اعجاز کا وہ معیار نہیں پایا جاتا جو معیار قرآنِ مجید میں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بشری طاقت اس بات کی قوت اور قدرت نہیں رکھتی کہ وہ تمام اقوال، افعال اور تقاریر نبوی ﷺ کو کسی ایک کتاب میں قرآنِ مجید کی طرح یکجا اور تسلسل کے ساتھ پیش کرے۔ کیونکہ احادیثِ نبوی ﷺ بہر حال کلام بشری ہیں جب کہ قرآنِ مجید کلام الٰہی ہے۔

تمام احادیثِ نبویہ ﷺ کو ایک کتاب میں یکجا کرنے کے لیے نقصان وزیادت اور تصرف کا سہارا لینا پڑے گا جب کہ قرآن مجید کو یکجا کرنے کے لیے کسی کمی بیشی یا تصرف کا وہم بھی خیال میں نہیں گزرتا۔ یہی واضح فرق ہے کلامِ بشر اور کلامِ خالقِ بشر میں۔

قرآنِ مجید کا مختلف زمان ومکان میں نازل ہونے کے باوجود اپنے تسلسل وترابط کو برقرار رکھنا مخلوق کی اس طرف راہ نمائی کرتا ہے کہ مصدر قرآن صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس ہے کیونکہ آسمانوں وزمینوں کے سرو اسرار سے وہ ہی باخبر وواقف ہے۔

﴿قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۝﴾ (الفرقان:۶)

"کہہ دو کہ اس نے اس کو اتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے بیشک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

③ وحی اپنے معتقدین اور منکرین کے درمیان

اس سے قبل نزولِ قرآن سے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا اس کو وہ ہی شخص تسلیم وقبول کرتا ہے جو ایمان لانے والا ہے وحی پر، اس کے طریقوں پر، ملأ اعلیٰ یعنی فرشتوں پر، فرشتے کے ذریعے انبیاء علیہم السلام کے اللہ تعالیٰ کے بارے میں متعارف ہونے پر اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعے انسانوں کے اللہ تعالیٰ کے بارے میں متعارف ہونے پر۔ لیکن عقل کے غلام اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے اور الحاد ومادیت پرستی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ ان میں بہت پڑھے لکھے لوگ بھی ان بلند حقائق کو ماننے کے لیے تیار نہیں اور ان کو سمجھنے کے لیے آمادہ نہیں۔ بلکہ ماننا اور سمجھنا تو درکنار وہ مومنین کے راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ طرح طرح کے شبہات جو محض ان کی عقل کی اختراع ہیں، پیش کرتے ہیں۔ ابتداء میں وہ شبہات محض عقلی خلل و وہم پر مبنی ہوتے ہیں لیکن بعد میں وہ انہی شبہاتِ عقلیہ کو دلائل علمیہ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ پھر خود بھی گم راہ ہوتے ہیں اور دوسرے کی گم راہی کا بھی سبب بنتے ہیں۔

لہٰذا اب ضروری ہے کہ ہم وحی کی حقیقت، انواع اور کیفیات کو بے غبار انداز میں بیان کریں تاکہ تمام شبہات دور ہو جائیں۔ پھر وحی کی حقیقت اور ضرورت وغیرہ پر علمی دلائل دیں۔ پھر وحی کے ثبوت اور وقوع پر عقلی دلائل پیش کریں۔ پھر اس بحث کے اختتام پر ان شبہات کو ان کے جوابات کے ساتھ بیان کریں گے جو وحی سے متعلق ملحدین اور عقل پرستوں کی طرف سے وارد ہوتے ہیں۔

ذیل میں چار نکات بیان کیے جا رہے ہیں جن کو پڑھنے اور سمجھنے سے تمام شبہات رفع ہو جائیں۔ (ان شاء اللہ)

① وحی کی حقیقت اس کی انواع و کیفیات

وحی کی شرعاً اصطلاحی تعریف "اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب فرما کر ہدایت اور علم کی باتوں پر مطلع فرمانا۔ لیکن یہ مطلع کرنا مخفی اور سری طور پر ہوتا ہے۔ نیز بشریت کے لیے غیر معتاد ہوتا ہے۔"

وحی کی اقسام وحی کی متعدد اقسام ہیں:

① پہلی قسم یہ ہے کہ رب اور بندے کے مابین مکالمہ پایا جائے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کے درمیان (کوہ طور) پر ہوتا تھا۔

② اللہ تعالیٰ اپنے منتخب بندے کے قلب میں کوئی الہام کر دیں ایسا الہام جس کو رد کرنا خارج از استطاعت ہو نیز اس میں شک کی کوئی گنجائش نہ ہو۔

③ تیسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو سچے خواب دکھائیں ایسے سچے خواب جو اپنی صداقت میں صبح کے طلوع ہونے اور پھیلنے کی طرح ہوں۔

④ چوتھی قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے ہم کلام ہوں۔ وہ جبرئیل علیہ السلام جو کہ باعزت وشرف فرشتے ہیں، قوت وزور والے ہیں، عرش عظیم کے مکین ہیں، فرمانبردار ہیں، مزید یہ کہ امانت داری کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں۔ وحی کی یہ چوتھی قسم ہی تمام اقسام میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ قرآن کریم سارے کا سارا وحی کے اسی قبیل سے ہے۔ اور یہ ہی اصطلاحی وحی ہے۔ جیسا کہ سورۃ الشعراء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩٣﴾ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿١٩٤﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ﴿١٩٥﴾ ﴾ (الشعراء: ۱۹۳-۱۹۵)

"اس کو امانتدار فرشتہ لیکر اترا ہے۔ (یعنی اس نے) تمہارے دل پر (القا) کیا ہے تا کہ (لوگوں کو) نصیحت کرتے رہو۔ (اور القا بھی) فصیح عربی زبان میں (کیا ہے)۔"

نزولِ وحی کی کیفیات پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لے کر اُترنا متعدد کیفیات میں ہوتا تھا۔

① بعض اوقات حضرت جبرئیل علیہ السلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی حقیقی صورتِ ملکیہ میں حاضر ہوتے تھے۔

② بعض اوقات کسی انسان کی شکل میں حاضر ہوتے جن کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس بیٹھنے والے بھی دیکھتے اور سنتے تھے۔

③ بعض اوقات اس طرح مخفی انداز میں حاضر ہوتے کہ کوئی انھیں دیکھ نہ سکتا تھا۔ لیکن ان کے اثرات واضح دکھائی دیتے تھے جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت میں تغیر وتبدل کا ظاہر ہونا بایں صورت کہ آپ کو نیند کا غلبہ محسوس ہوتا، کبھی غشی اور بے ہوشی کے اثرات محسوس ہوتے لیکن وہ غشی یا بے ہوشی ہرگز نہ ہوتی تھی بلکہ وہ روحانی فرشتے سے ملاقات کے وقت استغراق کی کیفیت ہوتی

تھی اور بشری حالت سے انخلاع کی کیفیت ہوتی تھی جس کا اثر حضور اکرم ﷺ کے جسم اطہر پر عیاں ہوتا تھا۔ پھر اس کیفیت کے بعد حضور اکرم ﷺ اپنی طبیعت میں بوجھل پن محسوس کرتے تھے اور بعض اوقات تو سخت سردی کے موسم میں آپ ﷺ کی چاندی جبیں پر پسینے کے قطرات موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے واضح نمودار ہو جاتے تھے۔

④ بعض اوقات وحی کا نزول ایک گھنٹی کی آواز کے مثل ہوتا تھا جیسا کہ مسلسل کانوں میں گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی ہو۔ یہ قسم وحی کے نزول کی تمام اقسام میں سب سے زیادہ سخت تھی۔

⑤ بعض اوقات حاضرینِ مجلسِ نبوی کو حضور ﷺ کے چہرہ مبارک کے سامنے شہد کی مکھیوں کی بھنبھنانے کی سی آواز سنائی دیتی تھی لیکن کوئی کلام یا حدیث سمجھ نہیں آتا تھا لیکن حضور اکرم ﷺ اس آواز کو علی وجہ الکمال سن لیتے تھے اور یاد بھی کر لیتے تھے اور یہ بھی سمجھ لیتے تھے کہ ان کو ان کے رب نے کیا پیغام بھیجا ہے۔ آپ ﷺ اس وحی کو اس طریق پر سمجھ لیتے تھے کہ اس میں کسی قسم کا شبہ یا خفا باقی نہیں رہتا تھا۔ جب شہد کی مکھیوں کی سی آواز کا سلسلہ تھمتا تو جو کچھ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ پر نازل کیا ہوتا تھا وہ آپ ﷺ کی یادداشت میں محفوظ ہو چکا ہوتا تھا جس کو آپ ﷺ کما حقہ بیان فرما سکتے تھے۔ اور یوں محسوس ہوتا گویا کہ وہ وحی آپ ﷺ کے قلب اطہر پر لکھ دی گئی ہے جس کو آپ ﷺ نے امت کے سامنے بغیر کسی کمی وبیشی کے بیان فرما دیا۔

شرعی دلائل

جو کچھ ہم نے بیان کیا اس پر قرآن وحدیث سے درج ذیل دلائل ملاحظہ کیجیے۔

① ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ (النجم: ۳-۴)

"اور نہ خواہشِ نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں۔ یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے جو (ان کی طرف) بھیجا جاتا ہے۔"

② حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ پر وحی کے نزول کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

"بعض اوقات میرے پاس وحی گھنٹی کی آواز کی طرح آتی تھی اور یہ کیفیت مجھ پر سب سے زیادہ سخت اور بھاری ہوتی تھی۔ مگر جب یہ آواز مجھ سے بند ہو جاتی تو میں نے اچھی طرح سمجھ کر یاد کر لیا ہوتا جو کچھ اس نے کہا ہوتا اور بعض اوقات فرشتہ میری سہولت کے لیے مرد کی شکل اختیار کر کے آتا اور مجھ سے بات کرتا تو جو کچھ وہ کہتا میں اُسے سمجھ کر یاد کر لیتا۔"

(اس حدیث کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے) (صحیح البخاری: ۳۰۴۳)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"میں نے ایک مرتبہ سخت سردی کے موسم میں دیکھا کہ حضور اکرم ﷺ پر وحی نازل ہو رہی تھی اور آپ ﷺ کی پیشانی مبارک پر پسینہ نمودار ہو رہا ہے۔"

② وحی، جدید علوم کے اعتبار سے

وحی کے اعداء و منکرین نہ ہی تو شریعت پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ہی شریعت کے دلائل پر۔ وہ تو بس عقل ہی کو اپنا خدا مانتے

ہیں اور اسی بات پر ایمان لاتے ہیں جو ان کی عقل پر پوری اُترے۔

پس وہ شک کو مقدم رکھنے والے ہیں اور اسی کو معنی خیز چیز سمجھتے ہیں۔ وہ صرف حسیات کا اعتراف کرتے ہیں اور عقلیات ہی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ وہ مادیت کی جیل میں برے طریقے سے مقید ہو چکے ہیں۔ مادیت کے علاوہ تمام چیزوں کا انکار کرنے والے ہیں۔ شکوک وشبہات کی سرحدوں کو بھی پار کر چکے ہیں۔ اُمورِ الٰہیہ ونبوت کو اتنا ہلکا سمجھتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں بڑے سے بڑا ظالم بھی اس کا ارتکاب نہ کر پاتا تھا۔ ہاں اگر ان کا اپنا نیا علم ان کے سابقہ علم کی مخالفت کرے تو وہ اس کی خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ ہم وحی کے وجود پر جدید علوم وسائنس کے اعتبار سے دلائل پیش کریں گے۔ یہ دلائل عقل و مادیت پرستوں کے نزدیک امکانِ وحی کو قریب کرتے ہیں۔ اور امکان وحی کا ثبوت ہی ہمارا موضوع سخن اور بنیادی مقدمہ ہے۔

پہلی دلیل جدید علوم کے اعتبار سے امکانِ وحی کے ثبوت کے لیے سب سے پہلی دلیل "مصنوعی طور پر نیند طاری کرنا" یا "تنویم مقناطیسی" کا عمل ہے، جو اب ایک مسلمہ علمی حقیقت بن چکی ہے۔ جس کا انکشاف المانیہ کے ایک ڈاکٹر میسمر (ولادت ۱۷۳۳ء وفات: ۱۸۱۵ء) نے اٹھارویں صدی عیسوی میں کیا تھا۔ اس نے اور اس کے پیر کاروں نے پوری ایک صدی تک اس حقیقت کو ثابت کرنے اور سائنس دانوں کو اس کے اعتراف پر آمادہ کرنے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں حتیٰ کہ یہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے اور سائنس دان ہزاروں لوگوں پر اس کا تجربہ کرنے کے بعد عملی طور پر اس کے قائل ہو گئے۔ اور اظہارِ طمانیت کرنے لگے۔ ڈاکٹر میسمر کے بے شمار تجربات سے چند اصول ثابت ہوئے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

① ایک اکمل ترین انسان کے لیے عام عقل کے علاوہ ایک باطنی عقل بھی ہوتی ہے جو عام عقل سے بلند تر ہوتی ہے۔

② انسان گہری نیند میں سو جانے کے بعد بھی سن اور بول سکتا ہے، پوشیدہ باتیں بتا سکتا ہے اور آنے والے بعض حوادث کی خبر دے سکتا ہے۔ باوجود اس کے کہ عالمِ حس میں سے ادنیٰ سی علامت بھی اس موقع پر نہیں پائی جاتی۔

③ تنویم یعنی مصنوعی نیند کے طاری ہونے کے درجات میں تفاوت ہے۔ اور یہ تفاوت باطنی عقل میں تفاوت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جس میں باطنی عقل اعلیٰ درجے کی ہوگی اس پر مصنوعی نیند کا طاری ہونا بھی اعلیٰ درجے کا ہوگا۔

④ مصنوعی نیند کا طاری ہونا بعض اوقات اس درجے تک پہنچ جاتا ہے کہ اس اکمل ترین انسان کے جسم سے روح نکل جاتی ہے اور اس کے پہلو میں اس انداز میں کھڑی ہو جاتی ہے کہ نظر نہیں آتی۔ اس حالت کے دوران اگر روح اور جسد میں لطیف اور خفیف سا ربط باقی نہ ہو تو جسد یا جسم ایک مُردہ جسم کی طرح ہو جائے۔

⑤ روح جسم سے الگ ہو کر موجود رہتی ہے۔

⑥ روح اور جسم کے مابین ربط اور تعلق برقرار رہتا ہے۔

⑦ روح جسم سے مکمل طور پر جدا نہیں ہوتی۔

⑧ اس بندے کی روح اپنے سے سابقہ ارواح کے ساتھ ملاقات وبات چیت کرتی ہے حالانکہ یہ بات مادیت سے بالکل عاری ہے۔ اس بات کا تعلق مادیت سے بالکل نہیں ہے۔

اگر ہم ان تمام تحقیقات کو تسلیم بھی کر لیں تو ایسے دلائل کی ضرورت پیش آئے گی جو تجربات اور کثیر مشاہدات پر مبنی ہوں۔

لیکن مغربی ممالک میں اس نظریے کے بہت سے حمایتی موجود ہیں۔ جن کا تعلق تعلیمی شعبہ ہائے جات سے ہے مثلاً ڈاکٹرز، پروفیسرز اور سکولز، کالجز اور یونیورسٹیز وغیرہ کے سٹوڈنٹس۔ بلکہ مغربی ممالک میں تو باقاعدہ ایسے ہسپتال موجود ہیں جن میں مریضوں کا علاج ہی اس تحقیق ونظریے سے مدد لیتے ہوئے کیا جا رہا ہے۔

(اس مقناطیسی عملِ تنویم پر ماہرِ طبیعیات میسمر نے فرانس میں رہتے ہوئے ۱۷۷۵ء میں بہت سے کامیاب تجربات کیے تھے لیکن وہ اپنے ہم عصروں کو مکمل طور پر مطمئن نہ کر سکا تھا، پھر ۱۸۴۲ء میں انگلینڈ میں ایک اور شخص جیمس بریڈ (James Braid) پیدا ہوا جس نے اس عملِ تسخیر کو سائنٹفک بنیادوں پر از سرِ نو ثابت کر کے اس کا نام عملِ تنویم یا ہپناٹزم (Hypnotism) تجویز کیا۔)

ہم اس مقناطیسی عملِ تنویم کی تاریخ، تجربات اور فوائد کو تفصیل سے بیان کرتے لیکن یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی ہم اس نظریے کو اجمالاً اس قدر بیان کیے دیتے ہیں تاکہ آپ کے سامنے یہ بات واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ آج کے دور میں بھی اپنی منہ بولتی نشانیاں اور علامات اُن ماہرِ طبیعیات و مادّہ پرستوں کے ہاتھوں میں ظاہر کرتے رہتے ہیں جو مادیت کے علاوہ تمام چیزوں کے منکر ہیں اور حسیت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر ایسا ہی کیا کہ جو لوگ مادیت کے علاوہ کے منکر تھے، روحانیت کو کچھ نہیں سمجھتے تھے، اُن کی سوچ بھی اللہ کے فضل سے بدل گئی اور وہ روحانیت اور باطنیت کو تسلیم کرنے لگے بلکہ اس کے اثبات پر بیانات ضبط کروانے لگے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾ (فصلت:۵۳)

"ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ (قرآن) حق ہے۔"

اب میں آپ کے سامنے مقناطیسی عملِ تنویم کا ایک ایسا تجربہ بیان کرتا ہوں جو کسی حد تک وحی کے طریقہ کار کے قریب ہے۔ اور یہ وہ تجربہ ہے جو میں نے (محمد عبدالعظیم الزرقانی نے) اپنی آنکھوں سے خود دیکھا اور اپنے کانوں سے خود سنا ہے۔

یہ تجربہ جمعیت شبان المسلمین کے زیرِ اہتمام ایک مجلس میں کیا گیا تھا جس میں تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی۔ یہ مجلس اس لیے منعقد کی گئی تھی تاکہ مقناطیسی عملِ تنویم (Hypnotism) کی اہمیت واضح کی جائے اور اس بات کا ممکن ہونا ثابت کیا جائے کہ اس فن کو کیسے زہر آلود ہتھیار کی مانند استعمال کرتے ہوئے کسی بھولے بھالے انسان کے عقیدے اور ایمان کو خراب کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ سن ۱۳۵۱ ہجری میں شبان المسلمین کے ایک نوجوان کو اس تجربے سے گزارا گیا۔ اور اس کی سوچ اور نظریے کو بدلنے کی کوشش کی گئی۔

پس جمعیت شبان المسلمین کے زیرِ اہتمام منعقد کی گئی مجلس کا حال یہ تھا کہ ایک پروفیسر لوگوں کے سامنے سٹیج پر نمودار ہوا وہ دراصل تنویمِ مقناطیسی کا ایک ماہر استاد تھا۔ پھر اسی سٹیج پر درمیانی درجے کی استعداد کا ایک نوجوان لایا گیا۔ تنویم مقناطیسی کے اُس ماہر استاد نے اس نوجوان کی آنکھوں میں گہری نگاہیں مرکوز کیں اور اپنا مخصوص عمل شروع کیا تو ایک لحظہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ہم نے دیکھا کہ وہ نوجوان سوئے ہوئے شخص کی طرح خراٹے لے رہا ہے اس کا رنگ بدل گیا اور جسم بے حس ہو گیا۔ وہ مکمل طور پر اپنا احساس و ہوش کھو چکا تھا اور وہ سو چکا تھا۔ ہم میں سے ایک شخص اٹھا اور اس نوجوان کو سوئی چبھوئی لیکن اس میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ پھر اس

نے متعدد بار سوئی چبھوئی لیکن اس نوجوان پر کوئی اثر ظاہر نہ ہوا۔ پھر ہم میں سے ایک اور شخص اٹھا پھر ایک اور اُٹھا الغرض تین شخص ہم میں سے یکے بعد دیگرے اٹھے تینوں نے اسے سوئیاں چبھوئیں لیکن اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ اس وقت ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ مصنوعی یا مقناطیسی نیند سو چکا ہے۔ اس حالت میں استاد نے اس پر تسلط حاصل کر لیا اور اس سے پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے؟ اس نے اپنا حقیقی/اصلی نام بتایا۔ استاد نے کہا نہیں تمہارا نام یہ نہیں ہے بلکہ یہ ہے اور جھوٹ بولتے ہوئے اسے ایک دوسرا نام بتایا کہ اب یہ تمھارا نام ہے۔ اس کے بعد یہ نیا نام اس کے ذہن میں ڈالتا رہا اور پرانا نام اس کے ذہن سے مٹاتا رہا۔ تنویم مقناطیسی کے ماہر استاد کا اس نوجوان کے ذہن سے پرانا نام مٹانا اور نیا کاذب نام ڈالنا، امر اور نہی کے صیغوں کے واسطے سے تھا۔ وہ مسلسل اس کے ذہن میں فرضی اور جھوٹ پر مبنی باتیں منتقل کرتا رہا یہاں تک کہ وہ نوجوان کے ذہن پر مکمل طور پر تسلط حاصل کر چکا تھا اور نوجوان مکمل طور پر اس کی بات کو مان چکا تھا۔

اس کے بعد استاد نے بھی اور ہم نے بھی اس نوجوان کو اس کے اصلی نام سے پکارا اور بار بار پکارا لیکن وہ نوجوان ہر مرتبہ غفلت میں رہا، بالکل متوجہ نہ ہوا اور ہمارے پکارنے کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور جب ہم نے اُس کو اسے کے موضوع وفرضی نام سے پکارا تو وہ بلا تردد اور بلا تاخیر متوجہ ہو گیا اور ہمارے پکارنے کا جواب دیا۔

اس کے بعد اُستاد نے کہا کہ وہ اس نئے نام کو یاد رکھے اور بیدار ہونے کے بعد بھی نصف گھنٹے تک اسی نام کو یاد رکھے اور پھر استاد نے اسے بیدار کر دیا اس طرح وہ تجربہ بھی مکمل ہو گیا۔ لیکن ہمیں اس بات نے مزید حیران کر دیا کہ جب ہم نے اُس کے بیدار ہونے کے بعد اُسے اُس کے اصلی نام سے پکارا تو اس نے کوئی جواب نہ دیا لیکن جب اُسے جھوٹے نام سے پکارا تو وہ فوراً بول پڑا۔ وہ نوجوان مسلسل اسی حالت پر رہا یہاں تک مقررہ آدھا گھنٹا گزر گیا۔ اس کے بعد ہم نے اس نوجوان کو اس کے اوّل یعنی حقیقی نام سے پکارا تو فوراً متوجہ ہو گا۔ اب وہ اپنی پہلی یعنی اصلی حالت میں واپس آ چکا تھا۔ اور اپنے اصلی نام کو پہچاننے لگا تھا۔

اس تجربے سے اُستاد نے یہ ثابت کر دیا کہ مُنَوِّم (ہپناٹسٹ) یہ استطاعت رکھتا ہے کہ مُنَوَّم یعنی معمول یا ہپناٹائزڈ کے ذہن سے جو چاہے مٹا دے اور جو چاہے اُس کے ذہن میں اُتار دے۔ چاہے وہ انسان کا اپنا نام ہے یا کوئی مقدس چیز مثلاً عقائد دین وغیرہ۔

اس تجربے میں ہپناٹزم کے ماہر اُستاد نے نوجوان کے ذہن سے صرف نام کو محو کیا حالانکہ وہ چاہتا تو کچھ دین واسلام کے عقائد کو بھی محو کر سکتا تھا۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔

① ذہن سے دین کو مٹانا بہت برا فعل ہے اور گناہ کا کام ہے۔ اور اس کو نہ ہی تو خود استاد نے پسند کرنا تھا اور نہ ہی حاضرین میں کسی شخص نے یہ بات گوارا کرنی تھی۔

② انسان کا اپنا نام اس کے ذہن میں زیادہ راسخ ہوتا ہے نسبتاً اس کے دینی عقائد ونظریہ کے۔ تو استاد اس تجربے سے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں اُس چیز کو محو کر سکتا ہوں جو انسان کے ذہن میں اعلیٰ درجے میں پیوستہ ہو تو دین کو تو بطریق اولیٰ محو کر سکتا ہوں کیونکہ وہ تو نام کے مقابلے میں کم درجے میں پیوست ومحفوظ ہوتا ہے۔ نیز دین کو محو کرنا زیادہ آسان وسہل ہے۔

اس تجربے کو میں نے خود دیکھا اور سنا تو عملی طور پر وحی کی حقیقت میری عقل کے اور قریب ہو گئی۔ اور میں نے اس واقعہ کو وحی کے لیے ایک سائنسی دلیل بنایا۔ فرشتے کے ذریعے وحی کا اترنا دراصل ملک اور رسول کے درمیان اس اتصال اور ربط پر مبنی ہوتا

ہے جس میں فرشتہ رسول کے دل و دماغ پر اثر ڈالتا ہے اور رسول اس سے اثر قبول کرتا ہے اور یہ دونوں کے اندر تاثیر کی ایک مخصوص استعداد کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ فرشتے کے اندر القاء اور تاثیر کی قوت ہوتی ہے اس لیے کہ وہ خالص روحانی مخلوق ہے اور رسول کے اندر پیغام وصول کرنے کی قابلیت ہوتی ہے اس لیے کہ اس کی روحانیت صاف اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ جب فرشتے کا رسول پر تسلط اور تعلق قائم ہو جاتا تھا تو وہ اپنی معتاد یعنی حالت سے نکل جاتے تھے، ان پر بدلی ہوئی حالت کے آثار ظاہر ہو جاتے تھے، وہ فرشتے سے وحی وصول کرنے اور سیکھنے میں پوری طرح مستغرق اور متوجہ ہو جاتے تھے اور جو کچھ انہوں نے فرشتے سے لیا ہوتا وہ ان کے دل پر نقش اور طبع ہو جاتا تھا یہاں تک کہ جب وہ اپنی اصلی حالت یعنی معتاد حالت پر واپس آتے تو جو کچھ انہوں نے سیکھا ہوتا اُسے اپنے صحیفہ قلب پر لکھا ہوا پاتے۔

اے باعزت مخاطب! کیا تو یہ گمان کر سکتا ہے کہ مخلوق تو اس کی استطاعت رکھتی ہے کہ وہ دوسری مخلوق کے نفس میں تنویم مقناطیسی کے عمل کے ذریعے اثر ڈال سکے لیکن قوتوں اور صلاحیتوں کا خالق نعوذ باللہ استطاعت اور قدرت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے بندوں میں سے کسی بندے کے دل میں وحی کے ذریعے کوئی پیغام اُتار سکے اور اسے متاثر کر سکے۔ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ اللہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

(اس موقع پر کسی کے ذہن میں یہ شبہ نہ آئے کہ ہپناٹزم یا مقناطیسی عمل تنویم کے ذریعے کسی انسان کا متاثر ہو جانا کسی قسم کی کمزوری اور متاثر نہ ہونا کسی قسم کی قوت ارادی یا طاقت ہے۔ کیونکہ عام طور پر سنا گیا ہے کہ بعض لوگ اپنی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں کوئی ہپناٹائز نہیں کر سکتا یا ہم ہپناٹائز نہیں ہو سکتے۔ ایسے لوگوں کو دراصل کسی ہپناٹسٹ سے واسطہ ہی نہیں پڑا ہوتا۔ یا پھر وہ لوگ خود تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی خیالی قوت (تخیل) بہت کمزور ہے اور وہ کسی ایک چیز کا خیال نہیں کر سکتے۔ ان کی یکسوئی کی قوت حد درجہ کم ہے اور وہ کافی بے وقوف ہیں۔ یا پھر وہ اس حد تک پراگندہ خیالات کے مالک ہیں کہ کسی ایک شے کا خیال نہیں کر سکتے اور یکسوئی کی قوت قریب الختم ہے۔

یاد رکھیے ذہین لوگ جلد ہپناٹائز ہو جاتے ہیں کیوں کہ ان کے تخیل کی طاقت بھی طاقتور ہوتی ہے۔ کند ذہن لوگ کم ہی ہپناٹائز ہوتے ہیں جس کی وجہ یکسوئی کی قوت کی کمی ہے۔ وہ ہپناٹائز اگر ہو بھی جائیں تو عموماً ہپناٹزم کی نیند کے ابتدائی مدارج میں رہتے ہیں۔ اور رہی بات احمق کی تو احمق کو ہپناٹائز ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مترجم)

دوسری دلیل

جدید سائنسی علوم یہ طاقت رکھتے ہیں کہ وہ ایسی چیزیں ایجاد کریں جن کو ہم نے اس سے پہلے نہ ہی تو دیکھا تھا اور نہ ہی ہم اُن کو جانتے تھے مثلاً ٹیلی فون، وائرلیس، مائیکروفون اور ریڈیو وغیرہ۔ ان تمام اشیاء کے ذریعے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان سے رابطہ کر لے خواہ وہ دنیا کے کسی کونے میں ہو اور رابطہ کر کے اُسے اپنی بات سمجھا دے اور اس کی بات سمجھ لے۔ تعجب ہے کہ ان مادی ایجادات کے بعد بھی مادہ پرستوں کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ جب ایک عاجز انسان آلات کے ذریعے دوسرے انسان سے کلام کر سکتا ہے تو وہ اللہ جو ہر چیز پر قادر ہے کیا وہ وحی کے طور پر فرشتے کے ذریعے یا بدونِ فرشتہ اپنے منتخب بندوں سے کلام نہیں کر سکتا؟ بے شک اللہ تعالیٰ تو پاک و بلند ہے ان تمام باتوں سے جو مادہ پرست اس کے بارے میں کہتے ہیں۔

تیسری دلیل

سائنس کی ترقی یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ سائنس دان ایسی بے جان اشیاء جن میں سمجھ بوجھ کی صلاحیت بالکلیہ مفقود ہے، میں آواز، نغمے، گانے، باتیں حتیٰ کہ قرآن کی تلاوت تک محفوظ کر چکے ہیں۔ اور اس عمل کو اتنا آسان بنا چکے ہیں کہ عام آدمی بھی ان بے جان اشیا میں مختلف آوازیں .غیرہ ریکارڈ محفوظ کر سکتا ہے بغیر کسی محنت و مشقت کے۔ اس کی بہت ساری مثالیں ہمارے پاس موجود ہیں جن کا انکار ناممکن ہے جیسا کہ فونوگراف۔

فونوگراف اور اس طرح کی دیگر تمام ایجادات ناممکن دکھائی دیتی تھیں لیکن سائنس نے اس کو ممکن کر دکھایا۔ تو وہ اللہ جو ہر شے پر قادر ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ وہ ایک فرشتے کے ذریعے یا فرشتے کے بغیر بھی ان نفوس میں اپنی باتوں (وحی) کو ریکارڈ کروا دے، جو نفوس سمجھنے بوجھنے کی اعلیٰ درجے پر صلاحیت رکھتے ہیں۔ کیا وہ یہ طاقت نہیں رکھتا کہ اپنے چنیدہ بندوں یعنی انبیاء علیہم السلام پر مخلوق کی ہدایت کے لیے کلام نازل فرمادے اور وہ کلام ان کے سینوں میں محفوظ کروادے۔ بالکل کیوں نہیں! ضرور وہ اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ وہ اپنے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فرشتے یا بغیر فرشتے کے اپنا کلام نازل فرمائے اور اُسے ان کے سینے میں محفوظ فرمادے۔ اور پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب چاہیں بغیر کسی محنت ومشقت کے اس کلام کو امت کے سامنے بیان فرمادیں۔

(۱۸۹۳ء عیسوی میں مشہور امریکی موجد تھامس ایڈیسن نے فونوگراف ایجاد کیا۔ یہ آلہ آواز کو مکینکل ریکارڈنگ اور اس کی کوالٹی بہتر بنانے کے کام آتا تھا۔ ایجاد سے کچھ عرصہ بعد ٹیلی فون کے موجد گراہم بیل نے فونوگراف میں متعدد تبدیلیاں کیں جس کے بعد اسے گراموفون کہا جانے لگا۔ گزشتہ سو سال میں موسیقی کے شعبے میں ہونے والی ترقی اسی آلے کی مرہون منت ہے۔ مترجم)

چوتھی دلیل

بے شک ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ دنیا میں بعض حیوانات عجیب وغریب کام کرتے ہیں جس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ایسا کسی عام سوچ یا معمولی خصلت کی وجہ سے ممکن نہیں۔ اس بات سے ہمیں یقین ہوتا ہے یہ صرف عظیم سوچ کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے جو ان حیوانات کی ان عجیب وغریب کاموں، باریک بینیوں اور حیلہ سازی کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔

اور جب یہ بات دنیا کے حیوانات کے بارے میں درست ہے تو انسانوں کے بارے میں تو بدرجہ اولیٰ زیادہ صحیح ہوگی جبکہ انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے زیادہ جڑا ہوا ہے۔ اور اس سے معلومات کا حصول زیادہ بہتر طریقے سے ممکن ہے اور یہ وحی کے ذریعے ممکن ہے۔ اور اگر آپ کو ان حیوانات کی مثالوں کی ضرورت ہے جن کو اوپر سے الہام ہوتا ہے تو وہ چیونٹی اور شہد کی مکھی ہے۔ اور یہ کئی طرح کے کام سرانجام دیتی ہیں اور انتہائی باریک انداز میں تنظیمی کام سرانجام دیتی ہیں۔ اور ایک جانور عجیب وغریب ہے جس کو "اکسیکلوب" کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں فرانس کی سوربون یونیورسٹی کے استاد میلن ادوار فرماتے ہیں کہ اکسیکلوب جانور اکیلے زندگی گزارتا ہے۔ اور انڈہ دیتے ہی مرجاتا ہے۔ اور اس کے بچوں کے عام طور پر پاؤں نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو کسی دشمن کے حملے سے بچانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اور نہ ہی وہ کھانے کے لیے کوئی غذا حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی زندگی ایک بند گھر کے اندر کئی سال تک پرسکون گزرتی ہے۔ جب ماں انڈے دینے کا سوچتی ہے تو لکڑی ایک ٹکڑے پر چڑھ جاتی ہے۔ اور ایک طویل سرنگ کھودتی ہے اور اس میں کھانے کا کچھ ذخیرہ لے جاتی ہے۔ جس کا چھوٹا سا ٹکڑا ایک سال کے لیے کافی ہوتا ہے۔ یہ ذخیرہ پھولوں کی کونپلوں اور میٹھے پتوں پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کو سرنگ کے اندر پھیلا دیتی ہے۔ پھر اس کے اوپر ایک

انڈا دیتی ہے۔ پھر لکڑی کا برادہ لا کر اس کو گوندھتی ہے اور اس کے ذریعے انڈے پر چھت بناتی ہے۔ پھر کھانے کا ذخیرہ لاتی ہے اور اس انڈے کی چھت پر رکھتی ہے اور پھر انڈہ دیتی ہے اور یوں وہ تمام انڈے دینے کے بعد فارغ ہوتی ہے اور سب کچھ چھوڑ کر مر جاتی ہے۔ اس معمولی سی کمزور مخلوق جس نے عقل کو حیران کر دینے والے کام کیے اس کو کس ذات نے سکھایا؟ اور کس ذات نے اس کو بتایا کہ جب تو انڈے دے کر فارغ ہو گی تو مر جائے گی اور تیرے مرنے کے بعد تیرے بچے پیدا ہوں گے جن کو ایک سال تک کمزوری اور بے بس حالت میں اس ذخیرہ کی ضرورت ہو گی؟ وہ کون ذات ہے جس نے اس کے دل میں یہ تمام قسم کی مہربانیاں عطا کیں جس کی وجہ سے اس نے انڈے دینے کے لیے تمام مشقتیں برداشت کیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام مخلوقات کے وجود کو قائم کرنے والی ذات کائنات کو غیر محسوس طریقے سے بتاتی ہے کہ کس طرح اس نے اپنے وجود کو قائم رکھنا ہے اور کس طرح اس کو درست رکھنا ہے۔ اور یہ بات گم راہ کن اور فضول ہے کہ کوئی محقق کمزور ترین حشرات کی طرف الہام ہونے کو ثابت کرے اور پھر انسانوں کے طرف الہام کی نفی کرے جبکہ انسان کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں الہام کی زیادہ ضرورت ہے۔

پانچویں دلیل

عبقریہ۔ جس کی افلاطون نے تعریف یہ کی کہ یہ الٰہی حالت ہے جس کی بدولت انسان کو اعلیٰ قسم کے الہامات ملتے ہیں۔ جبکہ فلاسفہ کے نزدیک یہ ایک علوی قسم کی حالت ہے اس میں عقل کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اور فطری ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ طبعی طور حاصل ہوتی ہے نہ تو یہ تحقیق سے حاصل ہوتی ہے اور نہ یہ غور و فکر سے۔ عبقریہ کی یہ مثالیں وحی کے موضوع پر پریشان اور گمراہ لوگوں کے لیے سیدھے راستے کی طرف روشنی کا منارہ ہیں۔

① کیمرج یونیورسٹی میں علم النفس کے استاد میرس اپنی کتاب "انسانی شخصیت" میں لکھتے ہیں کہ مسٹر بیدر کی ایک ایسی خوبی تھی کہ شاید وہ معجزہ کے ساتھ مل جائے۔ وہ یہ ہے کہ فی البدیع ایسے ہندسوں کو آپس میں ضرب دے کر جواب دیتے تھے جن کا عدد سات یا آٹھ تک ہوتا تھا۔ اگر کسی نے پوچھا کہ وہ کون سے دو عدد ہو سکتے ہیں جن کو ایک دوسرے سے ضرب دیں تو جواب ۱۷۸۶۱ آئے تو فوراً جواب آتا ۳۳۷ کو ۵۳ کے ساتھ ضرب دیں تو یہ جواب آئے گا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ان کو نہیں پتا کہ یہ جواب کس طرح ان کو معلوم ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ جواب عمومی طبعی کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے۔

② فرانسیسی بہت بڑے شاعر "سولی بروودم" سے منقول ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ریاضی کے نظریے پر کوئی ایسی دلیل جو ایک سال ڈھونڈنے پر بھی نہ مل سکتی ہو لیکن بعض اوقات بغیر کسی غور و فکر کے وہ دلیل اچانک سے مجھے مل جاتی ہے۔

③ فرانسیسی شاعر المسیو (رینہ) کے بارے میں مذکور ہے کہ وہ اکثر شعر کا ایک جزو کہتے کہتے سو جاتے اور جب بیدار ہوتے تو شعر مکمل ہوتا۔

④ اسی طرح فرانسیسی شاعر موسیہ کہتے ہیں کہ میں صرف سنتا ہوں اور پھر مجھے جو حاصل ہوتا ہے لکھ دیتا ہوں۔ جیسے کوئی نامعلوم انسان میرے کان میں بتا رہا ہو۔

یہ مثالیں جو ہم نے ذکر کی ہیں ان سے بعض لوگوں کے اندر روحانی رابطوں کا ثبوت ملتا ہے۔ انسان علم و ہدایت کے ذریعے سے غیر فطری طریقے سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کے ذریعے وحی کے بہت زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات لوگ اس

کے بارے میں بہت زیادہ شک کرنے لگتے ہیں یہاں تک کے الوہیت اور نبوت کو جھٹلا دیتے ہیں۔ اور دین وشریعت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ جبکہ یہ انسان کی سوشل اور نظریاتی تبدیلی کے بڑے عوامل میں سے ایک ہے۔ بڑے حوادث ایسے ہیں جن کے ذریعے سے دنیا کی تاریخ کو تبدیل کر کے رکھ دیا گیا۔ اور انسان کی کرامت کو واضح طور پر غلط اس وقت قرار دیا جاتا ہے جب یہ تمام عوامل غلط فہمی اور جھوٹ پر مبنی ہوں۔

چھٹی دلیل نئے علوم سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے ساتھ روحانی معاملات ہوتے ہیں۔ جو خلاف عادت ہوتے ہیں اور علماء کو ان کے بارے میں کوئی علم نہیں ہوتا۔ اور بعض اوقات یہ لوگ جو خلاف عادت غیر معمولی باتیں بتاتے ہیں وہ خود غفلت کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اور جو وہ بیان کرتے ہیں اس کو حسی طور پر ماننا ناممکن ہوتا ہے۔ اور ان کی باتوں کو پرکھا گیا اور اس کا مشاہدہ کروانے کے لیے دینا کے مشہور شعبدہ باز اور جادوگروں کو بلایا گیا تو انہوں نے کہا کہ اس میں کسی قسم کی کوئی جادوگردی نہیں ہے، بلکہ یہ روحانی باتیں ہیں اس میں مہارت اور ہاتھ کی صفائی کا کوئی تعلق نہیں، یہ موجودہ دور کے جدید علوم کے حقائق میں سے ہے کہ بعض اوقات کچھ لوگوں پر غفلت کی حالت میں کبھی کبھار روحانی طور پر انکشافات ہوتے ہیں۔ تو پھر یہ کیسے بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے سب سے بہترین لوگوں میں سے کسی کے اوپر وحی کے ذریعے علمی انکشافات کرے؟ جبکہ یہ لوگ سمجھ بوجھ اور اخلاق کے لحاظ سے مکمل ہیں۔ پس آنکھوں کے سامنے صبح روشن ہو چکی ہے۔

② وحی عقل کے ذریعے سے

آپ نے جان لیا جو ہم نے علمی دلائل دیے کہ وحی ممکن ہے اور حقیقت میں واقع ہونے کے قریب ہے، اور اب ہم یہاں پر عقلی طور پر ثابت کریں گے کہ ایسا عملی طور پر ہوا ہے، جیسا کہ اس کے بارے میں سچے نبی محمد ﷺ نے خبر دی ہے اور جو کچھ سچے نبی محمد ﷺ نے خبر دی وہ حق ہے اور یہی چیز مطلوب ہے۔ بہرحال دلیل جس کے بارے میں محمد ﷺ نے خبر دی ہے وہ وحی کے بارے میں کتاب وسنت میں ذکر شدہ خبریں ہیں۔ بہرحال اس بات کے اُوپر دلیل کے صادق اور معصوم ﷺ نے جو کچھ بتایا ہے وہ سچ اور حق ہے تو پس یہ سچائی اور عصمت کا تقاضا ہے۔ اور اس بات پر دلیل کہ محمد ﷺ سچے اور گناہوں سے پاک ہیں تو وہ معجزہ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اپنے رسول کی تصدیق کے لیے فرمارہے ہیں:

"میرے بندے نے میری طرف سے جو کچھ پہنچایا وہ سچا ہے اور وہ میری طرف سے اس کی طرف وحی کی گئی ہے۔"

معجزہ: ایسی چیز ہے جس کی مثال پیش کرنا کسی انسان کے لیے انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر ناممکن ہو، یا وہ ایسا معاملہ ہے جو خلاف عادت ہو اور مشہور اسباب کی حدود سے باہر ہو اس کا ظہور اللہ تعالیٰ نبوت کا دعویٰ کرنے والے اپنے نبی پر دعوت وتبلیغ کے دوران اس کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ پس جب کوئی انسان کھڑا ہو جائے اور یہ کہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا بندہ ہے اس کی مخلوق کی طرف اور اس کے بندوں کی طرف بھیجا گیا رسول ہے اور کہے کہ جس کا میں دعویٰ کرتا ہوں اس کی سچائی کی نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے وہ کسی عادت کو میری ہاتھ پر تبدیل کر دے اور اپنے عام طریقہ سے ہٹ کر

اس کے وجود میں کوئی امر ظاہر کرے۔ اور اللہ تعالیٰ یہ عجیب وغریب کام اس لیے دکھاتے ہیں تاکہ تم کو پتا چلے کہ تم اس معاملے میں کتنے باکمال ہو؟ اور کتنے قادر ہو؟ اور میں تمھیں چیلنج کرتا ہوں کہ گروہ کی شکل میں یا اکیلے اکیلے اس طرح کی کوئی مثال لاکر دکھاؤ۔ اور تمھارے سامنے کھلا آپشن ہے جیسے تم مناسب سمجھتے ہو کرو۔ اور تمہارے پاس صاحب کمال لوگ موجود ہیں جیسے کہ تم دعوے کرتے ہو۔ اور پھر تم گروہ کی شکل میں ہو میں اکیلا ہوں اور یہ بات سچی بات کہی ہے اور واضح طور پر چیلنج ہے۔ اور ایسے وقت میں جب ہمارے عقائد، عادات اور اخلاق خراب ہو چکے ہیں اور ہمارے خوابوں نے اور ہماری طرح ہمارے آباؤ اجداد کے خوابوں نے ہمیں بے وقوف بنا دیا ہے۔ اور ہم زیادہ مریض ہیں اس کے بے بس ہونے پر اور مغلوب ہونے پر اور اس کے ساتھ فتح یاب ہونے پر اپنی کرامات کے دماغ میں اور اپنے پاس سب سے قیمتی چیز کی مدد کرنے پر۔

پھر زیادہ وقت نہ لگا کہ وہ کھڑا ہو گیا اور ہم بھی کھڑے ہو گئے اور وہ ایک بات پر جمع ہو گیا اور ہم بھی جمع ہو گئے اور جب ہم نے بہت دفعہ کوشش کے باوجود مقابلے کے باوجود ہم اس جیسی ایک چیز بھی نہ پیش کر سکے جو اس نے پیش کی۔ باوجود اس کے کہ وہ زیادہ عظمت والا ہے اور ہم ایک امت ہیں اور وہ اکیلا ہے جبکہ وہ ہماری سوچ کے مطابق سب سے آسان طریقوں سے ہم پر داخل ہوا اور ہمارے زمانے میں سب سے مشہور ترین فن ہے جبکہ اس نے ہم کو اس کے ساتھ مناظرے کے لیے کافی حد تک فرصت دے رکھی ہے اور ہم نے اپنے آپ سے ہر طرح کا انصاف کر لیا ہے۔

کیا مکمل عقل والا شخص سب سے بہترین انسان کے بارے میں شک کر سکتا ہے جو اپنی رسالت میں بھی سچا ہے کہ وہ اپنے نظریے کو ختم کرنے والا ہے؟ خاص طور پر جب ہم نے یہ سب کچھ بہت اچھے طریقے میں جان لیا کہ اس نے ہمارے اندر پیدائش اور بچپن سے لے کر اپنی بعثت اور رسالت تک سچائی امانت اور عمدہ اخلاق کے ساتھ زندگی گزاری۔

اگر وہ اس طریقے سے معجزہ پیش کرے جس کو ہم نہیں جانتے تو ہم کہیں گے وہ تو ایسے فن میں ماہر ہو گیا ہے جس کا ہم کو علم نہیں ہے۔ یا اس نے کوئی ہنر سیکھ لیا ہے جس کی ہمیں خبر نہیں بہر حال جب وہ ہمارے پاس کسی ایسے طریقے سے دلیل پیش کرے جس کو ہم برتر و بالا سمجھتے ہیں تو اس کو سنتے بھی ہیں اور اس پر یقین بھی کرتے ہیں جب تک ہم انصاف پسند ہوں۔

ہم آپ کو ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام لکڑی کی لاٹھی کا معجزہ لائے جس میں نہ تو روح تھی نہ حرکت اور نہ اس میں لچک تھی نہ وہ تر تھی پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نام سے زمین پر ڈالا تو وہ چلتا ہوا سانپ تھا جبکہ جس قوم نے اس کا مشاہدہ کیا وہ جادو کے ماہر تھے اور اس کا توڑ کرنے والے تھے انہوں نے جادو کے میدان میں اچھا خاصہ وقت گزارا تھا۔ خاص طور پر وہ ایک گروہ کی صورت میں تھے اور موسیٰ علیہ السلام اکیلے۔ وہ جادوگری کے فن میں ماہر ترین جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے جادو کا توڑ ایک دن بھی نہ سیکھا تھا۔ وہ اپنی تعداد اور تیاری کے بارے میں معترف تھے جبکہ موسیٰ علیہ السلام ان تمام ظاہری اسباب سے خالی ہاتھ تھے۔

کیا اس کے بعد شک کا شائبہ تک بھی ہو سکتا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی کو پھینکا تو وہ ان جادوگروں کے سانپوں کو نگلنے لگا حق ثابت ہو گیا اور جو انہوں نے عمل کیا وہ باطل ہو گیا۔

"اور جادوگر سجدہ ریز ہو گئے۔ کہنے لگے ہم جہانوں کے رب پر ایمان لے آئے۔ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے رب پر۔" (الاعراف: ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲)

حق واضح ہو گیا اسی لیے سب سے پہلے ایمان لانے والے وہی جادوگر خود تھے کیونکہ وہ جادو کو سمجھتے تھے اور اس کے نتائج سے آگاہ تھے اور انہوں نے سچائی کی آنکھوں سے اس معجزہ کو دیکھا جو جادوگری کی قسم میں سے نہیں تھا کہ جس کو پیش کرنے کے بعد کوئی انسان اس کا توڑ کر سکے اس کے نتائج محدود تھے ان کو عبور کرنا ممکن نہ تھا۔

جی ہاں جادوگروں کے سامنے حق واضح ہو جانے کے بعد اس کا اعتراف کرنے پر تاخیر کرنے کی ہمت نہ تھی حالانکہ ان کو فرعون نے قتل کرنے یا سولی پر چڑھانے کا کہہ رکھا تھا۔ گزشتہ دن فرعون کو اس کے بادشاہوں اور معبودوں نے کہا وہ بولے، ہم تجھ کو زیادہ نہ سمجھیں گے اس چیز سے جو پہنچی ہم کو صاف دلیل اور اس سے جس نے ہم کو پیدا کیا سو تو کر گزر جو تجھ کو کرنا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو اس کے بعد والی آیات کو پڑھ کر دیکھ لیں۔ ﴿وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۷۶) تک۔

یہی بات اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہر رسول کے بارے میں کہیں عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی یہی کہیں جس نے اندھے کو بینا کرنا اور برص کی بیماری والے مریض کو صحت مند کرنا، مُردوں کو زندہ کرنا، مٹی سے پرندوں کی طرز پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیدا کرنا اس قوم کے سامنے جس نے طب کے میدان میں ہر طرح کی مہارت حاصل کر رکھی تھی۔

اور یہی بات بلکہ اس سے زیادہ بہتر بات خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہیں اور اس کے بارے میں جو وہ کھلے دلائل اور واضح معجزات لے کر آئے۔ آپ کو صرف قرآن مجید ہی اکیلا عظیم ترین دلیل ہے۔ صرف تین قرآنی آیات دُنیا کے منہ پر قطعی حجت ہیں قیامت تک۔ تمام عالم انسانیت اس کی فصاحت اور بیان، علوم اور معارف، غیب کی خبروں اور حق کے شواہد پر حیران ہیں۔

اس کے ساتھ اضافہ اور بھی کر لیا کہ جن لوگوں نے وحی کے اترتے وقت اس کے خطاب کا مشاہدہ کیا وہ لوگ فصاحت و بلاغت کے امام تھے، کلام کے ماہر اور کلام کے بہترین ہونے میں متنوع، نثر اور دیباچہ شعر اور اس کی بناوٹ میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اور اس معاملے میں بہترین ہونے کی کرامت مرتب ہے وہ سونا جمع نہیں کرتے اور نہ القاب لگاتے ہیں یہاں تک کہ وہ اس میدان کی دوڑ کے فاتح نہ ہوں اور اپنی منزل تک نہ پہنچ جائیں۔ اور ہمارے لیے یہاں پر قلم کو کھلے طور پر چھوڑنا ممکن نہیں ہے تالیف کے کم ہونے اور وقت کی قلت کے ڈر سے اور آپ اعجازِ قرآنی سے باخبر ہیں یہاں پر صرف چھوٹا سا اشارہ کافی ہے اگر آپ کو مزید ضرورت ہو تو اعجازِ قرآنی پر جو کتابیں موجود ہیں ان کی طرف رجوع کریں۔

③ شبہات کو دُور کرنا

میں آپ کے سامنے اسی مناسبت سے پیش کیے جانے والے دس شبہات کا ازالہ کروں گا۔

پہلا شبہ وہ کہتے ہیں کہ معجزات میں اکثریت من گھڑت ہیں اگر اس میں انوکھا پن، خوف اور عجیب و غریب ہو تو اسی طرح علم کے اثار اور اس کے خوف و ہراس کے متعلق بھی ہو گا جو ہم دیکھتے اور سنتے ہیں۔

جواب آپ جانتے ہیں ہم نے ابھی معجزہ کی بحث میں ذکر کیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ معجزہ کے درمیان اور دنیا میں علم کے عجائبات اور فن کی مہارت اور ایجاد کی مہارت کے درمیان بہت واضح فرق ہے۔ معجزہ کے لیے معرفت کے اسباب کی ضرورت نہیں ہوتی کہ ان کے وجود سے معجزہ یا اس جیسے عمل کا ظہور ہو جبکہ معجزہ کے برعکس ان ایجادات کے لیے معروف

اسباب موجود ہیں۔ اور ان کو جاننا ہر اس شخص کے لیے آسان ہے جو ان کو سیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسرا شبہ وہ کہتے ہیں کہ معجزہ جادوگری اور شعبدہ بازی کی طرح میں ہے۔ بس یہ صرف خیالی باتیں ہیں۔

جواب آپ پر واضح ہوگا جو ہم نے معجزہ کے بارے میں بیان کیا اور موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کی مثال پیش کی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ معجزہ سے مراد حق کی حقیقت کا ایک نمونہ ہے جو نازل اسباب نظر آنے والا وسائل اور روزمرہ کی ضروریات سے بالاتر ہو کر ظاہر ہوتا ہے جبکہ جادو اور اسی طرح کی تمام چیزیں خبیث فنون ہیں جن کو ہر کوئی سیکھ سکتا ہے اور اس کے وسائل اور ذرائع تک ہر کوئی پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے موسیٰ علیہ السلام پر سب سے پہلے جادوگر ہی ایمان لائے تھے کیونکہ وہ اس واضح فرق کو سمجھتے تھے۔

تیسرا شبہ وہ کہتے ہیں جن علوم اور معارف کو تم معجزہ کہتے ہو جس کی ایک مثال قرآنِ مجید ہے یہ صرف ماہرِ فن لوگوں کی خبریں اور ایسے ماہرینِ فن اور ان کی خبریں ہر اُمت میں مل سکتی ہیں۔

جواب بے شک باکمال اور ماہرِ فن کی بتائی ہوئی باتوں اور خبروں اور افکار کے لیے وسائل اور عوامل درکار ہوتے ہیں پھر اس کی طرح کی عمومی مثالیں ہر اُمت اور نسل میں اور ہر علاقے اور ہر زمانے میں مل سکتی ہیں جبکہ معجزات کو عوامل اور اسباب کے ذریعے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس کی ہم مثل کوئی مثال آپ کو عام طور پر مل سکتی ہے۔ الّا یہ کہ ہم اپنی کائنات سے باہر نکلیں۔

چوتھا شبہ وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ خلاف عادت اپنے رسولوں کے ہاتھ سے کام کرواتے ہیں جیسا کہ تم کہتے ہو تو یہ اس عمومی نظام سے خروج کا ذریعہ ہوگا جس کا تقاضا حکمت و مصلحت کرتی ہے۔

جواب بے شک معجزہ عمومی نظام کی حدود سے تجاوز کرتا ہے لیکن یہ اس عمومی نظام کی مدد سے تجاوز کرنا نہیں ہے جس کا تقاضا حکمت کرتی ہے یا جس کے ساتھ مصلحت وابستہ ہے۔ بلکہ یہ اس عمومی نظام کی ضروریات میں سے ہے جس کے لیے حکمت اور مصلحت ضروری ہے۔ حق اور اہلِ حق کے لیے کون سے حکمت کی ضرورت ہوگی؟ مخلوق کو ان کی کامیابی کے راستے کی طرف لے جانے والی مصلحت سے زیادہ بڑی کون سی مصلحت ہوگی؟ ان معجزات کی وساطت سے اپنے رب خالق کی مراد کو اپنے رسول کی تائید کے ساتھ سمجھتے ہیں اور ان کی تصدیق اور ان کی اتباع ان کے لیے واجب ہے؟

پانچواں شبہ وہ کہتے ہیں کہ اگر وحی ممکن ہوتی تو اللہ تعالیٰ عام انسانوں کی طرف وحی کرتے تھوڑی مقدار میں افراد کا تعین نہ کرتے جو اس کے مخلوق کے درمیان واسطہ کا ذریعہ بنتے۔

جواب عام انسان کے اندر اتنی استعداد ہی نہیں ہوتی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحی کو حاصل کر سکے نہ براہِ راست اور نہ ہی فرشتے کے ذریعے سے یہاں تک کہ اگر ان کے پاس کوئی فرشتہ آ جائے تو وہ اس کو دیکھ بھی نہیں سکتے یہاں تک کہ وہ انسان کی شکل میں ظاہر نہ ہو۔ تو یہاں پر معاملہ گڑبڑ ہو جاتا ہے اور پھر اشکالات باقی رہیں گے۔ تو معاملہ یہاں پر آ کر ہی ختم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے کسی ایک خاص گروہ کو امتیازی حیثیت دے جو اللہ تعالیٰ سے وحی کو حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو پھر اس امانت کو اپنے انسان بھائیوں کے سپرد کرے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں سے ایسے سچے دلائل کا ظہور کرے کہ وہ ان کے بارے میں

تصدیق کریں اور اللہ تعالیٰ ان کو ایسی نشانیوں کے ذریعے آراستہ کرے کہ لوگ مطمئن ہو جائیں کہ وہ اپنے رب کے رسول ہیں جو اس کے احکامات کی تنفیذ کے لیے آئے ہیں۔

پھر نوع انسانی میں سے کچھ افراد کو وحی کے لیے خاص کرنے میں امتحان اور آزمائش ہے جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے یہ زندگی بنائی اور حلال کو حرام سے علیحدہ کیا۔

"اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہتا ہے خاص کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ عظیم فضل والا ہے۔" (البقرۃ)

یہ شبہ ایسا ہے کہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اس کی مثال سورۃ انعام کی دو آیات کے اندر بیان کی ہے۔

"اور وہ کہتے ہیں کیوں نہیں اترا ان پر کوئی فرشتہ اور اگر ہم اتاریں فرشتہ تو طے ہو جاوے قصہ۔ پھر ان کو مہلت بھی نہ ملے گی۔ اور اگر ہم رسول بنا کر بھیجتے کسی فرشتہ کو تو وہ بھی آدمی ہی کی صورت میں ہوتا ہے اور ان کو اسی شبہ میں ڈالتے ہیں جس میں اب پڑھ رہے ہیں۔" (الانعام: ۸-۹)

چھٹا شبہ

وہ کہتے ہیں کہ معجزہ سے کیسے ثابت ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو رسول بنا کر بھیجا جب کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو نہ تو دیکھا ہے اور نہ ہی سنا ہے۔

جواب

بے شک اللہ کے رسول کی تصدیق معجزہ کے ذریعے ایسے ہی ہے جیسے کائنات کے خالق ہونے کی تصدیق اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہے جبکہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور سنا ہی نہیں ہے۔ اس پر ہم ان کو ایک مثال دیتے ہیں تاکہ ان کو کوئی شبہ نہ رہے اور کوئی عذر نہ رہے۔ فرض کریں آپ ایک مجلس میں حاضر ہوئے ہیں اور اس میں کوئی فرشتہ موجود ہے اور فرشتے کی عادت ہے کہ وہ عام مجالس میں اپنا سر ننگا نہیں کرتا جبکہ لوگ ایک جلیل القدر کے پاس جمع ہیں۔ اچانک ایک آدمی مجلس میں کھڑا ہو جاتا ہے جو اپنی صداقت، امانت، ادب واستقامت اور حسب ونسب میں معروف ہے۔ یہ شخص فرشتے اور عوام کے سامنے کھڑا ہو کر کہتا ہے کہ اے لوگو! میرے معزز فرشتے نے مجھے یہ پیغام دیا ہے کہ آپ تک پہنچا دوں اور وہ یہ ہے کہ ایسا کرو اور ایسا نہ کرو، چھوڑ دو اور فرشتہ خاموش رہا اس نے اس آدمی کو جھٹلایا نہیں۔ پھر اس آدمی نے اپنے ماضی کے صاف شفاف ہونے اور فرشتے کے خاموش رہنے پر اکتفا نہ کیا۔ بلکہ اپنی دعوت اور پیغام کی تائید میں اُس نے کہا کہ میرے سچا ہونے کی نشانی یہ ہے کہ معزز فرشتہ اپنی عادات کے خلاف عمل کرے گا جو کہ تم سب کے علم میں ہے اور وہ یہ ہے کہ فرشتہ اپنا سر اسی مجلس میں ننگا کرے گا پھر وہ اپنا سر ننگا کرتا ہے اور اپنا تاج اتار دیتا ہے تو کیا اس فرشتے کا یہ عمل اس شخص کے اور اس کے پیغام کے سچا ہونے میں دلیل کے طور پر کافی ہوگا؟ پھر آپ کا کیا خیال ہے جب اس نے اپنی دلیل کو مضبوط کرنے کے لیے چیلنج کیا اور کہا کہ میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں کہ فرشتہ آپ کو جواب دے جس طرح مجھے جواب دیا پس وہ لوگ اس سے مطالبہ کرتے ہیں اور اس کو ملامت کرتے ہیں لیکن فرشتہ ان لوگوں کو کوئی جواب نہیں دیتا اور نہ ہی اپنی عادت کے خلاف ایک مرتبہ بھی کوئی کام کرتا ہے۔ تو کیا یہ روزِ روشن کی طرح واضح نہیں ہے کہ یہ مبلغ شخص اس فرشتے کا سچا پیغام رساں ہے؟ تو پھر بھی اس کو جھٹلانے والا شخص دشمن اور غرور اور تکبر والا نہیں کہلائے گا؟ کوئی حیوان جو نہ سمجھے اور شعور نہ رکھے وہ اس انسان کی طرح ہو سکتا ہے جو سمجھتا بھی ہے اور شعور بھی رکھتا ہے۔

اور یہ مثال ان اللہ کے رسولوں جیسی ہے جن کی تائید اللہ تعالیٰ کے معجزات کرتے ہیں۔

"اور اللہ تعالیٰ کی مثال سب سے اعلیٰ ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔" (النحل)

ساتواں شبہ وہ کہتے ہیں کہ جس وحی کے قسطوں میں ہونے کا تم دعویٰ کرتے ہو وہ اس قرآن میں غیر مرتب اور غیر منظم ہے کسی ایک مقصد کے لیے کوئی فصل اور باب متعین نہیں کیا۔ جوکہ منظم کتاب کی ایک شان وعظمت ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے مقاصد کو ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا ہے تالیف کی رعایت نہیں رکھی گئی تو ایسا کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نہیں ہوسکتا۔ یہی شبہ قرآن مجید کے ٹکڑوں میں نازل ہونے اور اس کی ترتیب پر بھی ہے۔

جواب قرآن مجید کی اس بنا پر مخالفت کرنا کہ یہ منظم تالیف شدہ کتابوں کی طرح نہیں ہے اس میں عیب کا ذریعہ نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اس کے وحی ہونے اور وحی بھیجنے والے میں عیب بن سکتا ہے بلکہ یہ اس کے برعکس اس بات پر دلیل ہے کہ یہ انسان کی وضع کردہ نہیں ہے کہ لوگوں میں سے کوئی شخص کسی ایک گروہ کے لیے اپنی معلومات کے مطابق ایک فصل مقرر کر لیتا ہے اور کئی فصلوں کو جمع کر کے ایک باب تشکیل دے دیتا ہے بلکہ وحی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت کے تقاضے کے مطابق انوارات کا ایک مجموعہ ہے اور وہ حکمت ومصلحت قرآن کے ٹکڑوں کی صورت میں نازل ہونے کے راز میں پوشیدہ ہے۔

پھر اس کا سورتوں اور حصوں میں تقسیم ہونے اس کے پڑھنے والے کے لیے محذوذ ہونے کا ذریعہ ہے اور اس کے سننے والے کے لیے شوق کا باعث ہے۔ اور فائدہ اٹھانے والے کے لیے ہر مجلس اور درس میں کئی قسم کے فوائد مہیا کرتا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تعلیم وارشاد کے حوالے سے ایک عمدہ اسلوب ہے۔ خاص طور پر ایک ان پڑھ قوم کے لیے جس پر یہ نازل ہوا۔ قرآن کے ہر حصہ کی مثال پھلوں سے بھرے ہوئے باغ کی طرح ہے جس میں انسان داخل ہوتا ہے اور کئی قسم کے پھلوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور کئی قسم کے کھانوں سے بھرے ہوئے دستر خوان کی طرح ہے جس پر ایک بھوکا انسان مختلف قسم کے کھانوں سے پیٹ بھرتا ہے۔

یہاں ایک نقطہ ہے میں چاہتا ہوں آپ سے پوشیدہ نہ رہے اللہ تعالیٰ کے قرآنی باغ کے جملوں، آیات اور سورتوں کے درمیان کمال کی مناسبت ہے اور مضبوط ربط ہے اور تالیف کا انداز بے مثال ہے یہ سب ایک معجزہ ہی ہوسکتا ہے خاص طور پر اس کا چھوٹے چھوٹے حصوں کی صورت میں کئی سالوں، مہینوں اور دنوں میں نازل ہونا۔ شیخ ولی الدین الملوی کہتے ہیں کہ "اس شخص کا صرف وہم ہوسکتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ مختلف واقعات پر قرآنی آیات مناسب مطلوب نہیں ہے اور مخاطب کا یہ کہنا کہ یہ واقعات کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا اور حکمت کے مطابق مرتب ومنظم ہے۔ تو پس قرآن مجید اسی طرح مرتب ہے سورتوں کے لحاظ اور آیات کے لحاظ سے جس طرح لوح محفوظ میں ہے اور ایک ہی دفعہ بیت العزۃ کی طرف اتارا گیا۔ اس کے اسلوب کو بیان کرنا اور اس کی حیران کرنے والی تنظیم سازی کو بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ اور مناسب یہ ہے کہ ہر آیت کے بارے میں دیکھا جائے کہ وہ گزشتہ آیت کو مکمل کرنے والی ہے یا مستقل طور پر ہے۔ اور جو مستقل طور پر ہے اس کی سابقہ آیت کے ساتھ کیا مناسبت ہے یہ ایک پوشیدہ علم ہے اسی طرح سورتوں کے بارے میں دیکھا جائے کہ سابقہ سورت کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے اور کس وجہ سے بعد میں لایا گیا ہے۔

امام فخر الدین رازی سورۃ بقرۃ کی تفسیر میں فرماتے ہیں" جس شخص نے سورتوں کی تنظیم میں باریک بینی پر اور اس کی ترتیب کے بے مثال ہونے پر غور وفکر کیا تو اس کو پتا چلے گا کہ جس طرح قرآن اپنے الفاظ اور اس کے معانی میں فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے معجزہ ہے اسی طرح ترتیب اور آیات کے منظم ومرتب ہونے میں بھی معجزہ ہے۔ شاید جن لوگوں نے کہا کہ یہ اپنے اسلوب کے

اعتبار سے معجزہ ہے تو ان کی مراد یہ ہو مگر میرے خیال میں جمہور مفسرین ان باریک بینیوں اور خفیہ رازوں سے ناواقف ہیں اور اس بابت معاملہ ویسا نہیں جیسا کہ کہا گیا ہے:

ستارہ آنکھوں کو چھوٹا دیکھائی دیتا ہے
قصور اس کے دور ہونے کا ہے ستارہ چھوٹا نہیں

آٹھواں شبہ وہ کہتے ہیں محمد ﷺ متعصب تھے مزاج میں سختی تھی (العیاذ باللہ)۔ اور وہ ہسٹریا (Hysteria) کے مریض تھے (العیاذ باللہ) اور ان کے نزدیک وحی سے مراد اس حالت سے اعراض کرنا ہے جس میں وہ مبتلا تھے۔

جواب یہ من گھڑت بات ہے جو محمد ﷺ کے بارے میں ان کی جہالت پر دلالت کرتی ہے۔ صحیح تاریخ کی گواہی اور قطعی دلائل سے پتا چلتا ہے کہ محمد ﷺ بردبار، صبر وتحمل اور نرم طبیعت کے حامل تھے۔ بلکہ وہ عظیم صبر والے، وسیع بردبار اور کھلے دل والے تھے یہاں تک کہ وہ لوگوں میں فراخ دلی اور اخلاق کی وجہ سے غالب تھے وہ بہادر انسان تھے جسم صحیح سلامت تھا یہاں تک کہ مشہور پہلوان رکانہ کو پچھاڑ دیا اپنی شجاعت کی وجہ سے۔ وہ میدان میں ثابت قدم رہتے یہاں تک کہ بہادر بھی میدان سے بھاگ جاتے لوگ گھبرا جاتے اور وہ غالب آ جاتے۔ اور آپ ﷺ فرماتے "میں نبی ہوں جھوٹا نہیں، عبدالمطلب کا بیٹا ہوں" اور فرماتے لوگوں میری طرف آؤ اور اسی طرح کرتے رہتے یہاں تک کہ صورت حال سے نمٹ نہ لیتے اور معاملہ کو حل نہ کر لیتے اور معرکہ جیت نہ لیتے اگر ہم اس موضوع میں مصروف ہو گئے تو بات بہت لمبی ہو جائے گی یہ سیرت اور محمد ﷺ کے شمائل کی کتابوں کا موضوع ہے اس کی طرف رجوع کر لیں۔ بہر حال ہسٹریا کا مرض جس کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ آپ ﷺ کو لگا ہوا ہے تو یہ جھوٹ ہے یہ پٹھوں کا لاعلاج مرض تھا جو کہ عورتوں کو زیادہ لگتا ہے اور اس کی نشانیوں میں سے فطرت کے مخالف ہونا، سانس لینے میں دشواری ہونا اور ہاضمہ میں خرابی ہونا اور بعض اوقات اس بیماری کی وجہ سے کوئی عضو شل ہو جاتا ہے۔ پھر تشنج اور بے ہوشی اور پھر مریض کی فضول حرکات اور ہاتھ پاؤں کا بغیر کسی مقصد کے ہلانا وغیرہ اور مریض کا ایک جگہ سے دوسری جگہ اچھلنا کودنا اور مریض کو ایسا لگتا ہے کہ کوئی پرچھائی سی ہے جو اس کو ڈرا دھمکا رہی ہے۔ اور کوئی اس کا دشمن ہے جو اس کے ساتھ لڑائی کرے گا یا اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اس کو آواز دے کر مخاطب کر رہا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تو کیا یہ اس کے ساتھ موافقت رکھتا ہے جو حضور ﷺ کے بارے میں مشہور ومعروف ہے کہ آپ ﷺ اخلاق میں ثابت قدم ہیں، عقل میں، خود کو قابو رکھنے میں، جسم کے سلامت ہونے اور مضبوط جسامت والا ہونے میں۔

تو پھر یہ لاعلاج مرض جس نے اطباء کو عاجز کر رکھا تھا اور محمد ﷺ کو جو کچھ میسر تھا اس سے ایک نمایاں امت کی بنیاد رکھی اور اس کی ہدایت کے ذریعے سے عمدہ تربیت کی اور اجتماعی اصول مرتب کیے اور اخلاقی قوانین کو واضح کیا اور ترقی پذیر ہونے کے قواعد کو مرتب کیا۔ یہ سب کیسے ایک ساتھ ممکن ہو سکتا ہے؟

اس کے ساتھ آپ اس میں اضافہ کریں کہ یہ معجزہ ہی تھا کہ صرف ایک صدی کے اندر یہ امت ایسی بنا دی کہ یہ امت تمام امتوں کی سردار اور علم والی اور تلوار اور قلم کی حفاظت کرنے والی بن گئی۔ تو کیا خیالات کی دنیا میں رہنے والا مریض جو صرف اپنی قیادت نہ کر سکتا ہو، کیا وہ بین الاقوامی سطح پر قیادت کیسے کر سکتا ہے اور اس میں کامیابی بھی ایسی ہو کہ عقل دنگ رہ جائے۔

کبھی آنکھیں سورج کی روشنی کو بیماری کی وجہ نہیں پہچانتی
اور منہ پانی کا ذائقہ بیماری کی وجہ سے نہیں پہچانتا

نواں شبہ وہ کہتے ہیں تم وحی کی دلیل قرآن کے معجزہ ہونے کو سمجھتے ہو اور قرآن کے معجزہ ہونے کو اس میں بلاغت کو سمجھتے ہو اور قرآن کے معجزہ ہونے کو اس میں بلاغت کو دلیل بناتے ہو جبکہ ہمیں یہ بلاغت کے پوشیدہ حقائق نہ نظر آتے ہیں اور نہ ہی ہم ان کو تسلیم کرتے ہیں تو یوں ہم اس پر مبنی وحی کو بھی نہیں مانتے۔

جواب قرآن مجید کے معجزہ ہونے میں کئی پہلو ہیں فصاحت اور بلاغت کے علاوہ بھی جو اس کے معجزہ ہونے کی دلیل ہیں۔ اور جو شخص عربی علوم میں ماہر نہ بھی ہو اس کے لیے ان کو سمجھنا آسان ہے۔ مشہور اور اعلیٰ تعلیمات اس قرآن مجید میں شامل ہیں ان میں سے درج ذیل ہیں: عقائد وعبادات شہری اور جرائم کے متعلق اور جنگ کی بابت اور تجارت کے متعلق انفرادی حقوق اور اجتماعی حقوق اور بین الاقوامی قوانین کے متعلق احکامات وغیرہ۔ آپ کو قرآنی ہدایات کے درمیان اور زمین پر موجود دینی اور غیر دینی احکامات کے درمیان تھوڑا سا موازنہ کرنے سے ہی قرآن مجید کے معجزہ ہونے کا پتا چل جائے گا۔ خاص طور پر جب آپ دیکھیں گے کہ یہ احکامات اور خلاف عادت معلومات جو شخص لایا ہے وہ شخص پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا۔ پرورش پائی اور زندگی گزاری جوان ہوئے اور قوم کے سامنے اپنی زندگی مکمل کی۔ ایسی قوم جس کو نہ کتاب کا پتا تھا اور نہ ہی ایمان کے بارے میں کچھ علم تھا۔ اسی طرح غیب کی خبریں جن کے بارے میں قرآن مجید میں ذکر آتا ہے بے شمار ہیں۔ ہر مُنصِف کے لیے ان میں سے قرآن کا معجزہ ہونے کے بارے میں معلوم کرنا نہایت آسان ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو سورہ روم کا ابتدائی حصہ تلاوت کریں تا کہ آپ کو پتا چلے کہ قرآن نے کس طرح غیبی معلومات کو چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ جبکہ ظاہر حالات اور اسباب اس کی اجازت نہ دیتے تھے اور اس کی خبر اس وقت دی جب فارس والوں کو رومیوں کے خلاف زمین کے کچھ حصے پر فتح ملے گی اور ویسا ہی ہوا جیسا کہ آپ ﷺ نے پیشینگوئی کی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے مخاطب ہوتے ہوئے یہودیوں کے ساتھ کسی لڑائی اور جھگڑے کے موقع پر ارشاد فرمایا:

"کہہ دیں اگر صرف تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں گھر ہے تو تم مرنے کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو تو۔ اور وہ ہرگز آرزو نہیں کریں گے موت کی اپنے گناہوں کی وجہ سے جو آگے بھیج چکے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں گناہگاروں کو۔"

یہ قرآن معجزہ ہونے کے بارے میں ظاہر ترین دلائل میں سے ہے کہ وہ اپنے نبی ﷺ کے لیے کسی موقع پر دشمنوں کے مقابلے میں ایک ایسا طریقہ اپنائیں کہ وہ کسی چیلنج پر جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان میں سے کسی ایک کو بھی موت کی تمنا کرنے کا کہے تا کہ محمد ﷺ کی دعوت کو باطل قرار دے سکیں لیکن وہ ایسے نہیں کر سکتے ان میں سے کوئی بھی موت کی تمنا نہیں کرتا بلکہ وہ ہمیشہ کے لیے اس سے اعراض کرنے والے ہیں۔ پھر قرآن نے اس کے بعد جو آیت بیان کی وہ اس سے بھی زیادہ بعید ہے۔

"بلکہ سب سے زیادہ دُنیا کی زندگی کا حریص اے نبی، آپ ان ہی کو پائیں گے، یہ حرص زندگی میں مشرکوں سے بھی زیادہ ہیں ان میں سے تو ہر شخص ایک ایک ہزار سال کی عمر چاہتا ہے، گو یہ عمر دیا جانا بھی انہیں عذاب سے نہیں چھڑا سکتا، اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کو بخوبی دیکھ رہا ہے۔" (البقرۃ:۹۶)

کیا یہ دلائل ہمیشہ سے قائم نہیں ہیں کہ محمد ﷺ کو وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل تھی۔ بے شک آپ کو قرآن

حکمت اور علم والے رب کی طرف سے پہنچتا تھا۔

بہر حال بلاغت کے اعتبار سے قرآن مجید کا معجزہ ہونا اس میں کسی قسم کی کوئی مذمت نہیں ہے کہ لوگ آج کل اسے کے بارے میں سمجھتے ہیں اور اس کا ذائقہ نہیں چکھتے۔ پس اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ قرآن مجید میں فصاحت و بلاغت کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ اس میں عربی زبان اور اس کے اسلوب سے ناواقفیت لوگوں کی جہالت کیوجہ سے ہے۔ اور لوگوں پر عجمیت کا غلبہ ہونے کیوجہ سے انکا ذوق نہیں رہا۔ اور مشہور تو یہ بات ہے کہ کسی شے کے بارے علم نہ ہونا اس کے وجود کی نفی کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر ہمیں کوئی اجنبی زبان کے بارے میں علم نہ ہو تو لازمی نہیں ہے کہ ہم اس بات کا انکار کریں گے کہ فلاں شخص زبان میں ماہر خصوصی ہے۔ بلکہ ہمیں یقین ہے کہ ایسی زبانیں موجود ہیں جن کو ہم نہیں جانتے اور اس طرح ان زبانوں میں مہارت رکھنے والوں کے بارے میں اور ان کی مہارت کے بارے میں بھی نہیں جانتے ماسوائے اس کے جو ہم تک باوثوق ذرائع سے ان کے بارے میں معلومات پہنچیں۔ اسی طرح قرآن مجید ہے اس کے بارے میں زمانے سے عربی لغت میں اہل فن اور متخصصین نے بغور مشاہدہ کیا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ یہ کتاب تمام کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے اور عربی زبان تمام زبانوں پر غالب ہے۔ اس میں فصاحت و بلاغت عروج کی بلندیوں پر ہوتی ہے۔ اور قرآن مجید ہم تک تواتر سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

کیا یہ تعصب اور دشمنی کی انتہاء نہیں کہ عربی زبان میں فصاحت و بلاغت کو پرکھنے کا دروازہ ابھی تک کھلا ہے جو کوئی اس کے بارے میں مشاہدہ کرنا چاہتا ہے وہ کر سکتا ہے اور قرآن مجید میں فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزہ ہونے کو دیکھ سکتا ہے۔ وہ بھی وہی فیصلہ کرے گا جو فیصلہ ہزاروں لوگ ہر زمانے میں کر چکے ہیں۔

اور تجھے چاند نظر نہ آئے تو ان لوگوں کی بات مان لے جنہوں نے آنکھوں سے دیکھا قرآن کے معجزہ ہونے کا میدان اور ہے آپ کو اگر ضرورت ہو تو ڈھونڈ لیں۔

دسواں شبہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کا معجزہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے بلکہ یہ محمد ﷺ کا اپنا کلام ہے جو اپنے رب کی طرف منسوب کر دیا ہے تا کہ اپنے رب سے اس نسبت سے مدد لے سکے۔ اور اس کا معجزہ ہونا اس طرح سے ہے کہ محمد ﷺ اکیلے فرد ہیں جنہوں نے اپنی قوم کو اس کے متعلق بتایا۔ اس لیے قرآن ایسے فرد کے پاس آیا جس کو اس کی قوم اکیلا ہی لائی۔ اس اعتبار سے اکیلے اس جیسی کتاب نہیں لا سکے۔

جوابات ہم اس شبہ کے پانچ جواب دیں گے۔

پہلا جواب ✿ جس شخص کو فصاحت و بلاغت کے ذوق کا تھوڑا سا بھی اندازہ ہو وہ قرآن اور حدیث نبوی کے اسلوب میں واضح فرق کر سکتا ہے جیسے خالق اور مخلوق کی طاقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح قرآن اور حدیث ہمارے سامنے ہیں۔ لوگوں کو واضح فرق کا پیغام دے رہے ہیں اگر ان کو فصاحت و بلاغت کے بارے میں کوئی شناسائی ہو تو۔

اگر اس شبہ کی کوئی اہمیت ہوتی تو اس کی آواز وہ عرب لوگ اٹھاتے جنہوں نے قرآن مجید اترتے دیکھا کیونکہ وہ محمد ﷺ کو بے بس اور خاموش کرنے کے زیادہ خواہش مند تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے اس کے بارے میں کچھ نہ کہہ کر خود پر احسان کیا ہے۔ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ کلام الٰہی کو کلام نبوی پر فوقیت اور برتری حاصل ہے یہ دونوں آپس میں خلط ملط نہیں

ہو سکتے۔ (اور اسی طرح جس نے ذائقہ چکھا سمجھ گیا جو محروم ہو گیا وہ انکاری ہو گیا۔)

اور کتنے لوگ صحیح بات میں عیب نکالنے والے

ان کو منہ کی بیماری سے دو چار ہونا پڑا

دوسرا جواب ✿ قرآن مجید لوگوں کے پاس خفیہ راستے سے نہیں آیا بلکہ کھلے دروازے سے آیا اور خالص عرب فصاحت و بلاغت والے راستے سے آیا ہے۔ ان کو چیلنج ہے کہ وہ کلام کی بناوٹ کے ماہر لوگ ہیں جنہوں نے ایسی مہارت حاصل کی کہ وہ کلام بنانے میں باکمال ہو گئے اور اپنی زندگیاں اس میں لگا دیں یہاں تک کہ وہ اپنے کلام کی وجہ سے فخر کرنے لگے اور فوقیت کا ذریعہ بنا لیا جو کہ اللہ تعالیٰ کے معجزات کی شان تھا۔

قرآن مجید لوگوں کے پاس تمام قسم کے مفاہیم کے ساتھ آیا تا کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام واضح ہو اس میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہ رہے اور نہ شک وشبہ رہے۔

"تا کہ ان رسولوں کے آجانے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہے اور اللہ کا اقتدار بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل۔" (النساء: ۱۶۵)

یہاں سے ہمیں پتا چلتا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ اگر قرآن مجید کا مصدر خود محمد ﷺ ہوتے جیسا کہ ملحدین کی طرف سے کہا جاتا ہے تو فصاحت و بلاغت میں باکمال اہل عرب کے لیے زیادہ آسان تھا کہ وہ سمجھ لیتے کہ یہ کلام محمد ﷺ کا اپنا ہے۔ جبکہ ان کو تنقید پر ملکہ حاصل تھا اور فہم و فراست کی صلاحیت حاصل تھی تو ان کے لیے زیادہ آسان تھا کہ وہ آپ ﷺ کے قریب رہ کر دیکھتے اگر ایسا ممکن نہ تھا تو دور سے ہی جانچ لیتے۔ یہاں تک کہ قرآن مجید نے چیلنج کے میدان میں ان کو قرآن کی سب سے چھوٹی سورت کے برابر کوئی ایک سورت پیش کرنے کو کہا جو کہ صرف تین چھوٹی آیات پر مشتمل ہو۔ جبکہ قرآن مجید ایسی کئی ہزار آیات پر مشتمل ہے۔ اور آپ کو علم ہے کہ یہ لوگ ان کو اس مقابلہ میں ہرا نہ سکے جبکہ وہ اس میدان کے شاہسوار تھے فصاحت و بلاغت کے امام تھے اگر معاملہ محمد ﷺ کا اپنے پاس سے قرآن مجید کے گھڑ لینے کا ہوتا جیسا کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں تو ان کی زبانیں کیوں گنگ ہو گئیں اور سب لوگوں کی آوازیں اس کے بعد کیوں بند ہو گئیں۔

اور معلوم ہونا چاہیے کہ ہر زمانے میں فن میں ماہر و باکمال لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے زمانے میں کسی بڑے معاملے یا بڑی چیز کی نقل نہیں اتار سکتے تو کم از کم چھوٹے معاملے اور تھوڑی چیز کی نقل تو اتار سکتے ہیں۔

تیسرا جواب ✿ اگر قرآن مجید کا مصدر محمد ﷺ خود ہوتے تو یہ زیادہ فخر والی بات تھی کہ وہ اس کو اپنی طرف منسوب کرتے یوں زیادہ مناسب تھا کہ نبوت کے دعوے کی بجائے الوہیت کا دعویٰ کرتے اگر خدا ہوتے تو لوگوں کی نگاہ میں زیادہ معزز ہوتے نسبتاً اس بات کے کہ وہ نبی ہیں۔ تو مناسب تھا کہ ان کی قرآن مجید کی بابت جھوٹی نسبت کسی اور کی طرف منتقل ہوتی۔

"تو کیا حال ہے ان لوگوں کا کہ وہ کوئی بات نہیں سمجھتے۔" (النساء: ۷۸)

چوتھا جواب ✿ یہ ملحدین بھول گئے ہیں کہ وہ معزز ترین شخصیت کے بارے میں بات کہتے ہیں جس کی عظمت اور پاکیزگی کی تاریخ گواہ ہے۔ وہ بھول گئے ہیں کہ وہ سچے اور امانت دار القاب سے شہرت یافتہ شخصیت کے بارے میں محو گفتگو ہیں۔ آپ ﷺ جب

کسی قوم کے پاس سے گزرتے تھے تو لوگ آپ کی طرف انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوتے کہتے تھے یہ سچا اور امانت دار شخص جا رہا ہے۔ پھر آپ ﷺ سے مشورے لیتے اور فیصلے کرواتے۔ عقل مند اور انصاف پسند آدمی ہمیشہ یہی کہتا یہ شخص لوگوں کے ساتھ جھوٹ بولنے سے منع کرتا ہے اور خود پرہیز کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ پر کیسے جھوٹ بول سکتا ہے۔

"اور لیکن منافق لوگ نہیں سمجھتے۔" (المنافقین:۸)

پانچواں جواب ❁ یہ شبہ قرآن مجید کے علمی مضامین، غیب کی خبروں، انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں خلافِ عادت راہنمائی چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی ان تمام چیزوں سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ قرآن مجید ایک امی شخص ایک امی قوم میں لے کر آئے جو جاہلیت کا تاریک ترین زمانہ تھا۔ اس کے ساتھ اس بات کو بھی شامل کر دیں کہ اس قرآن مجید میں نبی کریم ﷺ کی بعض اجتہادی فروگزاشتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے کبھی اللہ تعالیٰ نرمی کا معاملہ فرماتے اور کبھی سختی کا پہلو نظر آتا ہے اور اگر یہ قرآن مجید آپ ﷺ اپنا کلام ہوتا تو آپ ﷺ کبھی بھی اس بات کی اجازت نہ دیتے کے ان کے اپنے خلاف کسی بات کو قرآن میں لکھا جائے۔ لیکن ملحدین نے اپنے آپ کو بے وقوف سمجھا اور یہ سارے دلائل سامنے ہوتے ہوئے بھی اُن کو یہی گمان تھا کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کے خلاف قرآن مجید کو گھڑ لیا ہے۔ وہ جھوٹے ہیں اور گمراہ ہیں۔

"من گھڑت کلام نہیں ہے لیکن موافق ہے اس کلام کے جو اس سے پہلے ہے۔ بیان ہر چیز کا اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔" (یوسف:۱۱۱)

اس شبہ کا ضمیمہ اس شبہ کے ساتھ ایک اور شبہ بھی ملتا جلتا ہے کہ بعض کم عقل لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ قرآن مجید اور حدیث کے درمیان اتنا بڑا فرق اس وجہ سے نہیں ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور حدیث محمد ﷺ کا کلام ہے بلکہ یہ فرق اس وجہ سے ہے کہ محمد ﷺ کے کلام کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم ❁ ایسا کلام جس کا خصوصی اہتمام ہو اور توجہ کا محور ہو اور اس کو ترتیب دینے، جمع کرنے اور خوبصورت لکھنے کا خصوصی اہتمام کیا گیا وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

دوسری قسم ❁ ایسا کلام جو محمد ﷺ کی زبان سے جاری ہو اور اس کے مفہوم و معنی کے لکھنے کا اہتمام نہ ہو۔

پھر اس شبہ کو عام کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو ہم پرانے اُدباء اور فصحاء کی تاریخ میں دیکھتے ہیں بلکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایک ادیب کے سوچ و بچار اور توجہ و اہتمام والے کلام کو بہت زیادہ مرتبت حاصل ہوتی ہے بنسبت اس کلام کے جو بغیر سوچے فی البدیع کہا گیا ہو یہاں تک کہ دو مختلف لکھنے والوں کو دونوں کے کلاموں کے درمیان مشرق و مغرب کے درمیان والا فرق محسوس ہوگا۔

پہلا جواب ❁ یہ ہے کہ یہ شبہ فاسد قیاس پر مبنی ہے اور وہ ہے تابناک زمانہ جس میں قرآن نازل ہوا اور عربی زبان محفوظ تھی۔ اس زمانے کے شعراء کو قیاس کرنا ایسے شعراء کے ساتھ جو ایسے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جب زبان غیر محفوظ اور بدل چکی ہے اور ان کی زبانیں خراب ہو چکی ہیں۔ دونوں طبقوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اور دونوں زمانوں میں کتنی دُوری ہے۔

اے ثریا ستارے کو سہیل کے ساتھ
خدا کا نام لے کیا دونوں مل سکتے ہیں؟
ثریا جب بلند ہوتا ہے تو ملک شام میں ہوتا ہے
سہیل جب بلند ہوتا ہے تو وہ ملک یمن میں ہوتا ہے

فی البدیع اور بغیر توجہ سے کہے گئے کلام اور خاص اہتمام سے کہے گئے کلام میں اتنا زیادہ فرق اس وقت آیا جب اہل عرب کی زبان میں خرابی پیدا ہوئی عجمی لوگ نئے عرب لوگوں سے گھل مل گئے۔ جبکہ وہ خالص عرب لوگ جو سلیقے سے گفتگو کرتے تھے ان کی فی البدیع اور سوچ و بچار کے بعد کہی گئی گفتگو میں اتنا بڑا فرق نہیں ہوتا تھا۔

بلکہ خالص عربی زبان کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ طریقہ صاف ستھری فطرت سلیمہ پر مبنی ہے۔ اور کلام میں خوشنمائی کا پہلو اس وجہ سے نہیں تھا کہ دونوں اسلوب کے درمیاں تذبذب کا عنصر ختم ہو سکے۔ بلکہ مختصراً یہ کہ اس کی خوبصورتی کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ اپنے مقصد سے دور جائے بغیر کرے۔ اور اپنے اسلوب سے باہر نہ نکلے بغیر جو کہ خود اس کی اپنی ذات سے نکلتا ہے اور اہل عرب کی طبیعت و عادت اس سے فیض حاصل کرتی ہو۔ یہ اسلوب جو اہل فن کو اپنے قول و فعل میں تھکا دیتا ہے۔ یہ تو بہت زیادہ مشقت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ بے شک فصیح عربی کو یہ مشقت بہت زیادہ ہوتی ہے جو اس کو خوبصورتی پیدا کرتے وقت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ اس کی کلام میں شان و شوکت اور خوبصورتی پیدا ہو بلکہ یہ اتنی مقدار میں اترتی تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ اس میں اترتا جا رہا ہے۔ اسی لیے عرب لوگ اپنی کلام میں جہاں کہیں تصنع اور بناوٹ کا پہلو نظر آتا اس کو مٹا دیتے۔ وہ لوگ اس کو ایسی فصاحت سمجھتے ہیں جو مقصود سے غیر مقصود کی طرف لے جانے والی ہے۔

اور اس لیے نبی کریم ﷺ عرب لوگوں میں سب سے زیادہ اس قسم کے معاملہ اور تصنع سے دور تھے۔ یہاں تک کہ اس سے خود منع فرمایا اور اس کے ساتھ ہلاکت اور خسارہ کو منسلک کر دیا۔ مسلم اور ابو دوٗد کی روایت پر غور و فکر کریں۔ جس سے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا" ہلاک ہو گئے جھگڑا کرنے والے۔ اور کلام میں جھگڑا سے مراد ہے اس میں فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے غور و خوض کرنا۔ امام بخاری و مسلم نے روایت کی ہے کہ ہذیل قبیلہ کا ایک آدمی دیت کے معاملے میں جھگڑا کرنے کے لیے آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ ایسے شخص کی دیت کیسے ہو سکتی ہے۔ جس نے نہ پیا ہے نہ کھایا نہ بات کی ہے اور نہ کلمہ پڑھا اس جیسی بے شمار مثالیں ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تمھارے کاہن بھائیوں میں سے ایک ہے۔ جو کافیہ بند کلام کہتے ہیں۔ اور ایک روایت میں فرمایا: قافیہ بند کلام جیسے اعراب کا فیہ بند ہوں اور ایک روایت میں فرمایا: جاہلیت کے اور زمانہ جاہلیت کے کاہن لوگوں کی طرح کافیہ بند کلام کہنے والا ہے۔ پس آپ کو معلوم ہو چکا کہ اس قسم کی تصنع اور بناوٹ سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے اور اس تصنع اور بناوٹ والے شخص کو کاہن اور جاہلیت کے جہلاء میں شمار کیا ہے تو یہ انتہائی نامناسب بات ہے کہ آپ ﷺ وہی کام خود کریں جس کی مذمت بیان کریں۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں ایسا آپ ﷺ کبھی بھی نہیں کر سکتے۔ آپ کے سامنے سنّتِ نبوی شریف موجود ہے۔ جہاں سے چاہیں پڑھ لیں آپ اس کو فطرت کے عین مطابق پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ کہ آپ اس میں کسی قسم کا تکلّف اور تصنع پائیں۔ اور قرآنِ مجید تو اس سے بھی اعلیٰ اور عمدہ اسلوب کا حامل ہے۔

"البتہ تحقیق ہم نے قرآن کو ذکر کے لیے آسان بنادیا پس کوئی ہے جو نصیحت پکڑے۔" (القمر:۱۷)

دوسرا جواب ✿ بے شک یہ شبہ اپنی اساس کے ہی مخالف ہے جو کہ معروف ہے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید کا کچھ حصہ اچانک بغیر انتظار اور غور وفکر کے اور بغیر تدبر اور غلط ملط کیے اتارا گیا اور یہ بہت زیادہ دفعہ ہوا۔ اور اس کا کچھ حصہ ایسا ہے جو بہت انتظار کے بعد اتارا گیا اور ایسا بہت کم ہے اس سب کے باوجود اس کا اسلوب بہت ہی عمدہ ہے اور اس کی تنظیم وترتیب، عاجز کر دینے والی ہے دونوں صورتوں میں۔ آپ اللہ تعالیٰ کے قول ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (الکہف: ۲۳-۲۴) کے سبب نزول میں ذرا غور وفکر کریں جب یہودیوں نے قریش کے لوگوں سے کہا کہ محمد ﷺ سے روح کے بارے میں سوال کریں تو انہوں نے آپ ﷺ سے سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تم میرے پاس کل آنا میں تمہیں بتلاؤں گا۔ اور ان شاء اللہ نہیں کہا تو آپ ﷺ پر وحی کا نزول مؤخر کر دیا گیا یہاں تک کہ آپ ﷺ پر یہ دشوار گزرا تو اس کے جواب میں یہ آیات ان کے سوالات کے جوابات میں تقریباً چالیس دن کے بعد اتاری گئیں۔ آپ جب اس قرآن کو پڑھیں تو اس اسلوب اور قرآن کے دوسرے اسلوب جس میں فی الفور قرآن اتارا گیا ہو کوئی فرق نہیں کریں گے۔

اور یہی بات ہم حدیث کے بارے میں کہیں گے جو قرآن مجید کے بارے میں کہتے ہیں۔ پس حدیث میں کچھ حصہ ایسا ہے جو غور وفکر اور مشاورت اور بحث وجرح کے بعد بیان کی گئی جیسے کہ جنگ اور صلح کے مواقع کی احادیث ہیں۔ اور کچھ حصہ ایسی احادیث پر مشتمل ہے جو اچانک فی البدیع کہی گئی ہیں۔ جیسے کہ بہت زیادہ احادیث دین کے ظاہری امور کے بارے میں بیان کی گئی ہیں۔ اور کچھ حصہ ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبریل امین وحی لے کر حاضر ہوتے تھے جیسا کہ عمرہ کا احرام باندھتے ہوئے خوشبو لگانے والے کے بارے میں حدیث مبارک جس میں وہ شخص آیا اور نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ عمرہ کے دوران خوشبو کا کیا حکم ہے تو آپ ﷺ خاموش ہو گئے یہاں تک کہ وحی نازل ہو گئی تو آپ ﷺ نے پوچھا سائل کہاں ہے جو عمرہ کے بارے میں سوال کر رہا تھا تو اس صحابی رضی اللہ عنہ کو بلایا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"جو خوشبو تمھارے احرام کو لگی ہوئی ہے اس کو تین مرتبہ دھولو اور جبہ اُتار دو اور عمرہ کے اندر وہی کرو جو حج کے اندر کرتے ہو۔"

ہم اسی طرح کی مختلف کیفیات رسول ﷺ کی احادیث کے بارے میں جانتے ہیں۔ لیکن کیفیات کے مختلف ہونے کے باوجود اسلوب نبوی ﷺ میں اختلاف نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک ہی اسلوب اور نمونہ ہے جو بشریت کا عمدہ ترین نمونہ ہے۔ پس آپ اس میں کبھی بھی کوئی خاص فرق ملاحظہ نہیں کریں گے پس اس اسلوب اور نمونہ میں جو آپ ﷺ نے فی البدیع اپنایا ہو اور اس اسلوب اور نمونہ میں جو آپ ﷺ نے رائے اور مشورہ کے بعد اپنایا ہو یا وہ اسلوب جو وحی کی صورت میں اپنایا گیا ہو کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے۔ اور نہ ان احادیث میں کوئی فرق ہے جو آپ ﷺ نے اہتمام کے ساتھ قابل ذکر اقدامات اور قابل احترام جگہوں پر بیان فرمائیں۔

پس یہ دونوں ایک دوسرے سے ملتی جلتی قسمیں ہیں ان میں کوئی التباس نہیں ہے قرآن مجید پورے کا پورا ایک قسم ہے اور حدیث ایک قسم ہے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کا اثر اور بیان اور عالی مرتبہ ہونے میں ایک دوسرے سے ایک درجہ بلند ہے۔ ان

کے درمیان اس طرح فرق ہے جس طرح خالق اور مخلوق کے درمیان فرق ہے۔ اور اس طرح فرق سے جس طرح آقا اور غلام کے درمیان فرق۔ پس قرآن مجید خاص قسم کی بلاغت کے اعتبار سے اور بے مثال اندازِ بیان کی وجہ سے ممتاز ہے۔ قرآن مجید کسی ایک باب میں بھی کسی قسم کا کوئی التباس اپنے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ پیدا نہیں ہونے دیتا۔ اور قرآن مجید کسی کو یہ موقع نہیں دیتا کہ وہ اس کا مقابلہ کرے یا اس کی محفوظ حد بندی کے قریب منڈلائے بھی۔ بلکہ جس نے اس کے ساتھ جھگڑا کیا تو اس کے ساتھ جھگڑا کیا گیا اور جو اس کے مقابلے میں کھڑا ہوا اس کو مقصد پورا کیے بغیر نا کام کیا گیا۔ اور جس نے اس کے ساتھ جنگ کی اس کو ہزیمت کا سامنا ہوا بہر حال حدیث شریف اگر چہ فصاحت کے آسمان پر چھائی ہوئی ہے اور اسلوب عرب پر چھائی ہوئی ہے لیکن پھر بھی یہ عبودیت کی زمین پر ہے جو کہ معجزہ کے آسمان تک نہیں پہنچ سکتی۔ آپ ﷺ کے بعض خاص صحابہ رضی اللہ عنہم کے اسلوب میں مشابہت موجود ہے۔ اس کے اور عرب کے علم و معرفت کے درمیان بہت قریبی تعلق اور بہت تھوڑا ابہام ہے۔

برعکس قرآنِ مجید کے کہ اس میں ایسا نہیں ہے اس کی طرح کوئی چیز نہیں ہے جو اس طرح بیان کرے۔ کیونکہ وہ کلام ہی ایسا ہے جس کی کوئی مثال نہیں۔

"اور بادشاہوں کا کلام بھی کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔"

كلام الملوك ملوك الكلام

بحث ④

ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے قرآن مجید کی پہلی اور آخری آیات

اس باب میں اس بحث کو مفصلاً ذکر کیا جائے گا کہ قرآن مجید کی کون سی آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں اور سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات کون سی ہیں۔ یاد رہے یہ بحث ایسی ہے کہ ہم اس میں اپنی عقل سے کوئی بات نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ بحث اوّل تا آخر نقل و توقیف پر مبنی ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہم دلائل میں راجح اور مرجوح کی وضاحت کر سکتے ہیں یا بعض روایات میں بظاہر پائے جانے والے تعارض میں جمع و تطبیق کر سکتے ہیں۔

قرآن مجید کی ترتیب نزولی کے اعتبار سے پہلی اور آخری آیات یا ناسخ و منسوخ آیات کا جاننا بہت مفید علوم سے متعلق ہے۔ مثلاً اگر کسی ایک موضوع پر دو یا دو سے زائد آیات موجود ہوں تو جب تک آپ کو ان میں سے ناسخ اور منسوخ کا علم نہیں ہوگا اس وقت تک آپ کسی حتمی فیصلے پر نہیں پہنچ سکتے۔ (اور ناسخ و منسوخ کا علم ترتیب نزولی کے علم پر موقوف ہے کیونکہ ظاہر بات ہے کہ بعد میں نازل ہونے والی آیات ہی پہلے نازل شدہ آیات کے لیے ناسخ بن سکتی ہیں۔)

تاریخ اسلامی سے واقفیت بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ بہت سے مسائل صرف احکام کے مشروع ہونے کی تواریخ کے معلوم ہو جانے سے ہی حل ہو جاتے ہیں۔ نیز مقصود تک پہنچنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی حکمت عملی کو جانا جائے کہ لوگوں کے ساتھ کس موقع پر نرمی اور شفقت کا رویہ روا رکھنا چاہیے اور کس وقت ان میں سے رذائل کو ختم کرنے کے لیے سخت رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

قرآن مجید کی نزولی اعتبار سے پہلی و آخری آیات کے بارے میں پڑھنے سے یہ بات بھی مزید واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن اور اس میں بیان کردہ علوم کس قدر وسیع ہیں۔ ان علوم کے کنارے مشرق و مغرب کو بھی عبور کر رہے ہیں۔ اور یہ ہی احساسات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ہم قرآن کریم کی مکی، مدنی، سفری یا حضری آیات کی مباحث پڑھتے ہیں۔ نیز یہ مباحث اس بات کی منہ بولتی شواہد ہیں کہ اللہ کا کلام تغیر و تبدل سے پاک ہے، تب ہی تو آج تک اس کی ایک ایک چیز مختلف زاویوں سے محفوظ ہے۔

﴿لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٤﴾﴾ (یونس: ٦٤)

”خدا کی باتیں بدلتی نہیں۔ یہی تو بڑی کامیابی ہے۔“

ہم اس باب میں ہر ایک آیت کی ترتیب نزولی بیان نہیں کریں گے کہ فلاں آیت کس سے پہلے اور کس کے بعد نازل ہوئی۔ بلکہ ہم تو اس باب میں صرف یہ بیان کریں گے کہ علی الاطلاق سب سے پہلے اور سب سے آخر میں کون سی آیات نازل ہوئیں۔ اگر ایک ایک آیت کو تفصیلاً بیان کیا جائے تو اس میں بہت سا وقت اور جدو جہد صرف ہوگی۔ بلکہ یہ تو ایک الگ تالیف بن جائے گی۔ نیز اس کو اس قدر تفصیل سے بیان کرنا ہمارا موضوع بھی نہیں ہے۔ ہم تو اس بحث یا باب میں آسانی کی خاطر صرف دو امور کو بیان کریں گے۔

پہلا امر ❁ قرآن مجید کی علی الاطلاق یعنی مطلقاً سب سے پہلے اور سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات۔ اور یہ ہی ہمارا اہم مقصد ہے۔

دوسرا امر ❁ بعض شرعی احکام میں نازل ہونے والی پہلی اور آخری آیات۔ یعنی اس باب میں دوسرا امر یہ بیان کیا گیا ہے کہ بعض شرعی احکام مثلاً شراب اور جہاد سے متعلق چند اوائل واواخر آیات کون سی ہیں۔ ان کو نمونہ کے طور پر بیان کیا ہے۔

مطلقاً سب سے پہلے نازل ہونے والی یات

اس بارے میں چار اقوال ہیں:

پہلا قول سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں۔ وہ آیات یہ ہے۔

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ﴾ (العلق:۱-۵)

"پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے۔ پڑھیے اور آپ کا رب سب سے زیادہ عزت والا ہے۔ وہ رب جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔"

یہ قول تمام اقوال میں صحیح ترین ہے۔ اس کے دلائل ذیل میں مذکور ہیں۔

① **دلیل** ❁ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ روایت فرماتے ہیں۔ (یعنی یہ حدیث متفق علیہ ہے)

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کی ابتداء تو سچے خوابوں سے ہوئی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات میں جو خواب دیکھتے وہ ایسے پورا ہوتا جیسا صبح کی روشنی میں کوئی ریب وشک نہیں ہوتا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلوت میں عبادت کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ حرا میں خلوت نشینی اختیار فرمائی اور کئی کئی دن اور رات وہاں مسلسل عبادت اور یادِ الٰہی وذکر وفکر میں مشغول رہتے، جب تک گھر آنے کو دل نہ چاہتا توشہ ہمراہ لیے ہوئے وہاں رہتے۔ توشہ ختم ہونے پر ہی اہلیہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لاتے اور کچھ توشہ ہمراہ لے کر پھر وہاں جا کر خلوت گزیں ہو جاتے۔ یہ ہی طریقہ جاری رہا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حق منکشف ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا ہی میں قیام فرما تھے کہ اچانک حضرت جبریل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! پڑھیے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ فرشتے نے مجھے پکڑ کر اتنے زور سے بھینچا کہ میری طاقت جواب دے گئی؟ پھر مجھے چھوڑ کر کہا کہ پڑھیے! میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے مجھ کو نہایت ہی زور سے بھینچا کہ مجھ کو سخت تکلیف محسوس ہوئی۔ پھر انھوں نے کہا کہ پڑھیے! میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے مجھے تیسری مرتبہ پکڑ کر بھینچا اور چھوڑ دیا اور کہنے لگے کہ پڑھیے اپنے رب کے نام کی مدد سے جس نے پیدا کیا اور انسان کو خون کی پھٹکی سے پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب بہت ہی مہربانیاں کرنے والا ہے۔ پس یہ ہی آیات آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبریل علیہ السلام سے سن کر اس حال میں غارِ حرا سے واپس ہوئے کہ آپ کا دل اس انوکھے واقعے سے کانپ رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لائے اور

فرمایا کہ مجھے کمبل اوڑھا دو، مجھے کمبل اوڑھا دو۔ گھر والوں نے کمبل اوڑھا دیا۔ جب آپ ﷺ کا ڈر جاتا رہا تو آپ ﷺ نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تفصیل سے یہ واقعہ سنایا۔

یہ ایک طویل حدیث ہے جس میں سے ایک حصہ یہاں نقل کر دیا گیا ہے۔ بعض روایات کے مطابق حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پوری پانچ آیات حضور اکرم ﷺ کو پڑھائی تھیں۔

حدیث میں "فلق الصبح" سے صبح کی روشنی سے مراد ہے ((اَلتَّحَنُّثُ)) سے عبادت مراد ہے۔ اصل میں تحنث، ترک تحنث کو کہتے ہیں۔ (تحنث کا مطلب ہے: معاصی سے نفرت و بعد) یہ صیغہ دلالت کرتا ہے خلوت نشینی اختیار کرنے پر اس کی نظیر نماز تہجد میں ملتی ہے۔ نیز تَأَثُّمُ (خود کو گناہ گار سمجھنا) اور تَحَرُّجُ (پرہیز گاری اختیار کرنا) بھی اس کی مثالیں ہیں۔ حدیث میں لفظ "غَطَّنِیْ" آیا ہے۔ یہ غین کے فتحہ اور طاء کی تشدید کے ساتھ ہے اور طاء پر بھی فتحہ ہے۔ مطلب اس کا سختی کے ساتھ بھینچنے اور دبانے کے ہیں۔ اتنی سختی کے سانس رکنے کے قریب ہو جائے۔ حدیث میں "الجهد" کا لفظ آیا ہے۔ اس کو جیم کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ فتحہ کی صورت میں مطلب ہوگا طاقت کے اندر اندر مشقت ڈالنا جبکہ ضمہ کی صورت میں معنی ہوگا کہ اتنی مشقت ڈالنا کہ آدمی کی طاقت سے باہر ہو جائے۔ ضمہ اور فتحہ والی دونوں ہی روایتیں درست ہیں۔

② **دلیل** ۞ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

اَوَّلُ سُوْرَةٍ نَزَلَتْ مِنَ الْقُرْاٰنِ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱﴾ (العلق:۱)

"قرآن مجید کی سب سے پہلے نازل ہونے والی سورۃ اقراء ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ﴾ ہے۔

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مستدرک الحاکم اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب دلائل الکبریٰ میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

③ **دلیل** ۞ حضرت ابو رجاء العطاردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہمیں پڑھاتے تھے، ہم حلقوں کی شکل میں بیٹھے ہوتے تھے آپ رضی اللہ عنہ پر سفید رنگ کی دو چادریں ہوتی تھیں جب آپ رضی اللہ عنہ سورۃ العلق کی تلاوت کرتے تو فرماتے:

((هٰذِهٖ اَوَّلُ سُوْرَةٍ نَزَلَتْ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ)).

"یہ وہ سورت ہے جو حضور اکرم ﷺ پر سب سے پہلے نازل ہوئی تھی۔"

اس حدیث کو طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الکبیر میں نقل کیا ہے اور اس پر صحیح ہونے کا حکم لگایا ہے۔ نیز امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے "الحلیۃ" میں اور امام فاکہی رحمۃ اللہ علیہ نے "اخبار مکہ" میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

④ **دلیل** ۞ ان آیات کے بارے میں آثار سے بھی تائید ہوتی ہے اگرچہ بعض آثار میں الفاظ کی کچھ کمی زیادتی ملتی ہے جیسا کہ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے:

حضور اکرم ﷺ غار حرا میں عبادت میں مصروف تھے کہ اچانک ایک فرشتہ (حضرت جبرئیل علیہ السلام) تشریف لائے آپ ﷺ کے ہاتھ میں ریشم کے کپڑے کا ایک ٹکڑا تھا جس میں سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات یعنی:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱ .... عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝۵﴾

لکھی ہوئی تھیں۔

حدیث کے متن میں "اَلنَّمَط" کا لفظ مذکور ہے۔ اس کے نون اور میم پر فتحہ ہے۔ معنی ہے کپڑا۔ اور "اَلدِّیْبَاج" کا مطلب ہے ریشم۔

دوسرا قول

مطلقاً سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت سورۃ المدثر کی پہلی آیت ہے یعنی:

﴿ يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴾ (المدثر:۱)

جو حضرات اس قول کے حامی ہیں وہ اس درج ذیل حدیث کو دلیل بناتے ہیں جس کو امام بخاری و امام مسلم رحمہما اللہ نے اپنی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے:

حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف فرماتے ہیں: میں نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا:

((اَیُّ الْقُرْآن انزل قبل))؟

"قرآن مجید کا سب سے پہلے کون سا حصہ نازل ہوا؟

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿ يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴾ (المدثر:۱)

میں نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: ﴿ يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴾ یا ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ ﴾؟

انھوں نے جواب دیا: ((احدثکم ما حدثنا به رسول الله ﷺ)) یعنی میں تمہارے سامنے وہ ہی حدیث بیان کر رہا ہوں جو میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں غار حرا میں مقیم تھا جب میں نے اپنے قیام کی مدت پوری کی اور اُتر کر میدان کے درمیان پہنچا تو میں نے (آواز سن کر) آگے پیچھے اور دائیں بائیں دیکھا۔ پھر جب میں نے اوپر دیکھا تو اچانک دیکھا کہ وہی تھا یعنی جبرئیل علیہ السلام۔ پس مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی۔ (ایک روایت میں ہے) میں نے دیکھا جبرئیل علیہ السلام آسمان و زمین کے درمیان ایک تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھ پر (رُعب کی وجہ سے) کپکپی طاری ہوگئی۔ میں خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا اور انھیں کہا کہ مجھے کمبل اوڑھا دو (انھوں نے مجھے کمبل اوڑھا دیا) اُس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات یعنی ﴿ يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ ﴾ (المدثر:۱،۲) نازل فرمائیں۔ ①

لیکن یہ روایت قرآن مجید کی مطلقاً سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات کے لیے نص ثابت نہیں ہوسکتی کیونکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ شاید یہ فترۃ الوحی کے بعد سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات کے بارے میں ہو۔ اور یہ احتمال ہی زیادہ قوی محسوس ہوتا ہے کیونکہ حضرات شیخین (امام بخاری رحمہ اللہ و امام مسلم رحمہ اللہ) نے اس حدیث کے بعد اور بھی احادیث روایت کی ہیں مثلاً حضرت ابوسلمہ ہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں جس میں الفاظ کچھ یوں ہیں:

"میں اسی دوران چلتا جا رہا تھا کہ آسمان سے اچانک میں نے ایک آواز سنی۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ تھا جو میرے پاس غار حرا میں آیا تھا اب وہ زمین و آسمان کے درمیان میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ (اُس کو دیکھ کر

---

① صحیح البخاری، صحیح مسلم، مسند امام احمد

رُعب کی وجہ سے) میرا جسم بوجھ کی وجہ سے اتنا ثقیل ہو گیا کہ میں زمین پر گرنے لگا۔ پس میں اپنے گھر والوں کے پاس آیا اور کہا: مجھے کمبل اوڑھا دو۔ مجھے کمبل اوڑھا دو۔ (گھر والوں نے کمبل اوڑھا دیا) پس اُس وقت اللہ نے یہ پانچ آیات:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ فَاَنْذِرْ ② وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ③ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ④ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ⑤ ﴾ (المدثر:۱-۵)

نازل فرمائیں۔

حضرت ابوسلمہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "الرُّجز" سے بت مراد ہیں۔

میں کہتا ہوں: مندرجہ بالا حدیث میں آنے والا لفظ "جثثتُ" بروزنِ "فَرِحتُ" ہے۔ اور مطلب اس کا یہ ہے کہ میرا جسم بوجھ کی وجہ سے کھڑے ہونے سے قاصر ہو گیا۔ بوجھ کی وجہ اصل میں حضور اکرم ﷺ کا گھبرانا اور پریشان ہو جانا تھا۔

بظاہر یہ روایت دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اپنی روایت سے قرآن مجید کی مطلقاً پہلے نازل ہونے والی آیات پر استدلال کر رہے ہیں۔ اصل میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ سے جو سنا وہ اس کو بیان کر رہے ہیں۔ اور حقیقت میں حضور اکرم ﷺ نے ایسا ہی فرمایا تھا لیکن یہ واقعہ فترۃ الوحی کے بعد کا ہے جیسا کہ اس حدیث میں بھی الفاظ موجود ہیں کہ:

"میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ تھا جو میرے پاس غارِ حرا میں آیا تھا۔"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ سے خود سنی ہوئی بات پر ہی اکتفا فرما رہے گویا کہ وہ اجتہاد کر رہے ہیں۔ مگر وہ دلائل جو ہم نے "پہلے قول" کے ضمن میں بیان کیے ہیں، نص ہیں اور نص کے مقابلے میں اجتہاد معتبر نہیں ہوتا۔ لہٰذا حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا استدلال ساقط ہو جائے گا اور دوسرا قول یعنی سورۃ المدثر کی آیات مطلقاً سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات ہیں، بھی باطل ہو جائے گا۔ اور پہلا قول ہی ثابت رہے گا۔

تیسرا قول

مطلقاً سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات سورۃ الفاتحہ کی تمام آیات ہیں۔

جو حضرات اس قول کے حق میں ہیں وہ اس مندرجہ ذیل حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس کو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے "الدلائل" میں حضرت میسرہ عمر بن شرحبیل کی سند سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

اے خدیجہ رضی اللہ عنہا! جب میں تنہائی میں ہوتا ہوں تو مجھے ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ پس اللہ کی قسم میں اپنی جان کے بارے میں خطرے میں مبتلا ہوں کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: اللہ کی پناہ! اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز ایسا کچھ (ناگوار معاملہ) نہیں فرمائیں گے۔ آپ ﷺ تو لوگوں کی امانتوں کو ٹھیک ٹھیک طریقے سے ادا کرتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں، سچی بات بولتے ہیں۔ (تھوڑی دیر بعد) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے تو اُم المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے حضور اکرم ﷺ کی ساری بات کہی اور فرمایا: اے ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ آنحضرت ﷺ کے ساتھ (میرے چچا زاد بھائی) ورقہ بن نوفل کے پاس چلے جائیے۔

حضور اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ورقہ بن نوفل کے پاس گئے۔ حضور اکرم ﷺ نے ورقہ بن نوفل کو سارا قصہ تفصیل سے سنایا کہ:

"جب میں تنہا ہوتا ہوں تو مجھے کوئی "یا محمد!" "یا محمد!" کہہ کر پکارتا ہے۔ میں خوف کی وجہ سے اُس جگہ سے کہیں دور چلا جاتا ہوں۔"

ورقہ بن نوفل نے کہا: اب آپ ایسا مت کرنا بلکہ وہیں کھڑے رہنا اور غور سے سننا کہ وہ کیا کہتا ہے۔ پھر مجھے آ کر ساری بات بتانا۔

چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے ایسا ہی کیا۔ جب آپ ﷺ تنہائی میں تھے تو آپ کو آواز آئی:

یا محمد قُل:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۬ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ۝ اٰمِيْنَ﴾ (الفاتحہ: ۱-۷)

لیکن یہ حدیث سورۃ الفاتحہ کی آیات کے مطلقاً سب سے پہلے نازل ہونے پر دلالت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ سب سے پہلے وحی غار حرا میں نازل ہوئی تھی۔ لیکن اس حدیث سے تو یہ مفہوم ہی نہیں ہو رہا کہ سورۃ الفاتحہ غار حرا میں یا وحی اور نبوت کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی۔ بلکہ اس سے تو یہ مفہوم ہو رہا ہے کہ سورۃ الفاتحہ وحی کے نزول کے ابتدائی دَور میں نہیں بلکہ بعد والے دور میں نازل ہوئی۔ نیز آنحضرت ﷺ نے وہ غیبی آواز متعدد مرتبہ سنی ہے۔ لہٰذا اس حدیث کی بنیاد پر وثوق کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا کہ سورۃ الفاتحہ مطلقاً نازل ہونے والی پہلی سورت یا آیات ہیں۔

دوسری وجہ یہ حدیث "حدیثِ مرسل" ہے۔ اس کی سند میں ایک صحابی ساقط ہیں۔ لہٰذا یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث (پہلے قول میں مذکور ہے) کے مقابلے میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث "حدیث مرفوع" ہے، اس کی سند آنحضرت ﷺ تک متصل ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث قوی ہے جب کہ یہ قوی نہیں۔ لہٰذا مطلقاً سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات کے باب میں تیسرا قول بھی باطل ہو جائے گا اور پہلا قول ہی ثابت رہے گا۔

چوتھا قول مطلقاً سب سے پہلے نازِل ہونے والی آیت ہے:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

اس قول کے قائلین مندرجہ ذیل روایت سے استدلال کرتے ہیں جسے امام الواحدی نے حضرات عکرمہ اور حسن رحمہما اللہ کی سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ یہ دونوں حضرات فرماتے ہیں:

"سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ہے اور سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت "سورۃ العلق" ہے۔"

لیکن اس روایت سے استدلال بھی دو وجہ سے باطل ہے۔

پہلی وجہ پہلی وجہ تو وہی جو تیسرا قول ردّ ہونے کی پہلی وجہ تھی کہ یہ حدیث مرسل ہے جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث مرفوع ہے۔ پس یہ اس کے مقابلے میں نہیں آ سکتی۔

دوسری وجہ ﴿بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ﴾ ایک مستقل آیت کے طور پر نازل نہیں ہوئی بلکہ یہ سورۃ العلق تو کیا ہر سورت کی ابتداء میں اس کے ساتھ نازل ہوئی تھی۔ جو کہ اس بات کی علامت بھی ہوتی تھی کہ یہ سورت یہاں سے شروع ہو رہی ہے۔ پس اس لیے سورۃ العلق کی ابتداء میں اگر اس کا نازل ہونا مان بھی لیا جائے تو اس سے یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہوتی کہ ﴿بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ﴾ مستقلاً اور مطلقاً نازل ہونے والی سب سے پہلی آیت ہے۔

مطلقاً سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات

قرآن مجید کی علی الاطلاق سب سے آخر میں کون سی آیات نازل ہوئیں؟ اس بارے میں علمائے کرام کا اختلاف ہے۔ اس بارے میں آنحضرت ﷺ تک متصل کوئی مرفوع حدیث نہیں ملتی بلکہ تمام علمائے کرام آثار کی بنیاد پر آخری آیت کی تعیین کی کوشش کرتے ہیں اسی وجہ سے اس باب میں اشتباہ پیدا ہوا اور بہت سے مختلف اقوال وجود میں آئے۔ ذیل میں دس مختلف اقوال لکھے جا رہے ہیں۔

پہلا قول ﴿وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡہِ اِلَی اللّٰہِ ۟ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۱﴾﴾ (البقرۃ:۲۸۱)

"اور اس دن سے ڈرو جبکہ تم اللہ کے حضور میں لوٹ کر جاؤ گے اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور کسی کا کچھ نقصان نہ ہوگا۔"

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ حضرت عکرمہ عن ابن عباس کے طریق سے نقل کرتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت قرآن مجید کی نازل ہونے والی علی الاطلاق آخری آیت ہے۔

اسی طرح علامہ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: پورے قرآن مجید میں سے سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت ﴿وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡہِ اِلَی اللّٰہِ ۟ ...﴾ ہے۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور اکرم ﷺ صرف نو راتیں بقیدِ حیات رہے جس کے بعد پیر کی رات کو جبکہ ماہ ربیع الاوّل کی دو راتیں گزر چکی تھیں آپ ﷺ کا وصال ہو گیا۔

دوسرا قول امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قرآن مجید کی سب سے آخری آیت سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۷۸ ہے یعنی:

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۷۸﴾﴾ (البقرۃ:۲۷۸)

"مومنو! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔"

تیسرا قول "آیۃ الدین" ابن جریر حضرت سعید بن المسیب سے روایت کرتے ہیں آیۃ الدین (مندرجہ ذیل آیت) عرش سے نازل ہونے والی آخری آیت ہے۔

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا تَدَایَنۡتُمۡ بِدَیۡنٍ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکۡتُبُوۡہُ ؕ ... وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۲۸۲﴾﴾ (البقرۃ:۲۸۲)

"مومنو! جب تم آپس میں کسی میعادِ معین کے لیے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو..... اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔"

علامہ عبید رحمۃ اللہ علیہ ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ سے الفضائل میں نقل کرتے ہیں:

((آخر القرآن عهدًا بالعرش آية الربا وآية الدين)).

"عرش سے سب آخر میں نازل ہونے والی آیات قرآنیہ "آیت الرباء" اور "آیت الدین" ہیں۔"

تطبیق پہلے قول کے مطابق آخری آیت سوۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۸۱ ہے جبکہ دوسرے قول کے مطابق سورۃ البقرۃ ہی کی آیت نمبر ۲۷۸ اور تیسرے قول کے مطابق آیت نمبر ۲۸۲ ہے۔ ان تینوں اقوال میں تطبیق ممکن ہے جیسا کہ علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ یہ تینوں آیات ایک ساتھ ہی نازل ہوئی تھیں جیسا کہ مصاحف میں ترتیب سے لکھی ہوئی ہیں۔ توجس راوی نے ان تینوں آیات میں سے جس کو آخری سمجھا اُس کا آخری ہونا بیان کر دیا۔

مختصر یہ کہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۷۸ سے ۲۸۲ تک پانچ آیات آخر میں نازل ہوئی تھیں جو ربا اور دین سے متعلق ہیں۔ درمیان میں ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ﴾ چونکہ آیات الربا کے اختتام اور آیت الدین کی ابتداء میں آئی ہے اس لیے اس کا ذکر الگ بھی کر دیا گیا۔

میں کہتا ہوں کہ تینوں آیات یا اقوال میں سے ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ﴾ ہی کو آخری آیت تسلیم کرنے پر دل مطمئن ہوتا ہے کیونکہ اس آیت میں وحی کے اختتام کی طرف اشارہ ہے بایں طور پر کہ اس میں قیامت کے دن کی تیاری کا حکم دیا جا رہا ہے۔ روز آخرت کی تیاری پر ابھارا جا رہا ہے۔ اُس روز کسی بھی قسم کی زیادتی وظلم کے نہ ہونے کا پیغام دیا جا رہا ہے۔ لہٰذا یہ آیت ہی اختتامی آیت کہلانے کی زیادہ حقدار ہے کیونکہ اس سے متصل پہلے ربا اور دین سے متعلق احکام والی آیات نازل ہو چکی تھیں۔

نیز ابن ابی حاتم والی روایت اس معاملے میں نص ہے کیونکہ اس روایت میں وضاحت کے ساتھ مذکور ہے کہ آپ ﷺ ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ﴾ والی آیت کے نزول کے بعد صرف نو راتیں بقید حیات رہے۔ اس طرح کی کوئی بھی نص باقی دو آیات/اقوال کے ساتھ مؤید نہیں ہے۔

چوتھا قول ابن مردویہ، مجاہد سے اور مجاہد حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ قرآن مجید کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۹۵ ہے۔ یعنی:

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّيْ لَا أُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى﴾ (آل عمران:۱۹۵)

"تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کر لی (اور فرمایا) کہ میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کرتا۔"

اگر اس روایت سے متعلق مکمل واقعہ پڑھ لیا جائے تو اس قول کو رد کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ مکمل واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ہمیشہ مردوں کا ذکر کرتے ہیں۔ عورتوں کا ذکر نہیں کرتے تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ایک یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (النساء:۳۲)

"اور جس چیز میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضلیت دی ہے۔"

پھر اس کے بعد درج ذیل آیت نازل فرمائی:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ.... الخ﴾ (الاحزاب:۳۵)

"(جو لوگ اللہ کے آگے سر اطاعت خم کرنے والے ہیں یعنی) مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں... الخ۔"

پھر اس کے بعد یہ والی آیت یعنی ﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ ... الخ﴾ سب سے آخر میں نازل فرمائی۔

مکمل واقعہ پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس واقعہ میں، نازل ہونے والی مطلقاً آخری آیت کی نشاندہی نہیں کی بلکہ یہ وضاحت کی ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ صرف مردوں کے ذکر والی آیات نازل کرتے تھے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اوپر والی تین آیات نازل فرمائیں اور ﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ﴾ والی آیت ان نازل کردہ تینوں آیات میں آخری آیت تھی۔ یا پھر پہلے خاص طور پر مردوں ہی کے بارے میں قرآن مجید کا نزول ہوتے رہنے کے بعد جس قدر دوسری آیتوں کا نزول ہوا اُن میں سب سے آخری آیت یہ ہی ہے۔

لہٰذا یہ آیت مطلقاً آخری آیت نہ ہوئی بلکہ مقیداً آخری آیت ہوئی۔

پانچواں قول

قرآن مجید کی نازل ہونے والی آخری آیت یہ ہے:

﴿وَ مَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِیْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا﴾ (النساء:۹۳)

"اور جو شخص مسلمان کو قصداً مار ڈالے گا تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ (جلتا) رہے گا اور اللہ اس پر غضبناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور ایسے شخص کے لیے اس نے بڑا (سخت) عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

اس قول کے حمایتی استدلال کرتے ہیں اس روایت سے جس کو امام بخاری رحمہ اللہ امام مسلم رحمہ اللہ اور امام ابو داؤد رحمہ اللہ وغیرہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

"یہ آیت یعنی ﴿وَ مَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا... ﴾ نازل ہونے والی آخری آیت ہے اور اس کو بعد میں کسی چیز نے نسخ نہیں کیا۔" ①

لیکن یہ قول بھی باطل ہے کیونکہ اس روایت میں واضح الفاظ موجود ہیں کہ "اس کو بعد میں کسی چیز نے نسخ نہیں کیا۔" ان الفاظ سے اس بات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ یہ آیت جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرنے کی سزا یا حکم کے بارے میں نازل ہونے والی آخری آیت ہے۔ پس یہ آیت بھی نازل ہونے والی مطلقاً آخری آیت نہ ہوئی بلکہ مقیداً آخری آیت ہوئی۔

چھٹا قول

قرآن مجید کی نازل ہونے والی آخری آیت یہ ہے:

﴿یَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ ؕ﴾ (النساء:۱۷۶)

① صحیح بخاری: ۴۵۹۰، صحیح مسلم: ۷۵۴۷، سنن ابی داؤد: ۴۲۷۳

"(اے پیغمبر) لوگ تم سے (کلالہ کے بارے میں) حکم دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ اللہ کلالہ کے بارے میں یہ حکم دیتا ہے۔"

اس قول کے قائلین کا مستدل وہ روایت ہے جس کو امام بخاری رحمہ اللہ وامام مسلم رحمہ اللہ وغیرہ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

آخر آیۃ نزلت ﴿يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ﴾ وآخر سورۃ نزلت "براءۃ"①

"﴿يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ ..﴾ یہ آیت نازل ہونے والی آخری آیت ہے جبکہ آخر میں نازل ہونے والی سورت "سورۃ البراءۃ" ہے۔"

یہ قول بھی باطل ہے، کیونکہ اس میں آیت مذکورہ اور سورۃ مذکورہ کا مطلقاً نازل ہونے والی آخری آیت اور سورت نہیں بتایا جا رہا بلکہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ آیت میراث کے احکام سے متعلق نازل ہونے والی آخری آیت ہے اور یہ سورت قتال وجہاد کے احکام سے متعلق نازل ہونے والی آیت ہے۔

ساتواں قول

سورۃ المائدہ اور اس کی آیات نازل ہونے والی مطلقاً آخری آیات ہیں۔ اس قول کے قائل اُس روایت سے استدلال کرتے ہیں جسے امام ترمذی رحمہ اللہ اور امام حاکم رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔

لیکن اس قول کا بھی ردّ موجود ہے وہ یہ کہ اس روایت میں یہ بیان ہوا ہے کہ یہ سورت حلال وحرام کے احکام سے متعلق آخری سورت ہے کیونکہ اس سورت میں موجود آیات کو بعد میں کسی طرح منسوخ قرار نہیں دیا گیا تھا۔ پس یہ قول بھی دیگر سابقہ اقوال کی طرح ہی نکلا۔

آٹھواں قول

سورۃ براءۃ یعنی سورۃ التوبہ کی آخری دو آیات ﴿لَقَدْ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾ (التوبہ:۱۲۸) سے لے کر اختتام سورۃ التوبہ، قرآن مجید کی نازل ہونے والی مطلقاً آخری آیات ہیں۔ جیسا کہ امام حاکم رحمہ اللہ اور ابن مردویہ رحمہ اللہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

اس قول کا نقض اس طور پر ممکن ہے کہ یوں کہا جائے کہ یہ آیات آخری تو ہیں لیکن مطلقاً نہیں بلکہ سورۃ التوبہ کی آخری آیات ہیں۔ اس نقض کی تائید اس قول سے ہوتی ہے کہ سورۃ التوبہ کی آخری دونوں آیات یعنی ﴿لَقَدْ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾ سے لے کر آخر تک مکی آیات ہیں بخلاف پوری سورت کے کیونکہ ان دونوں آیات میں جہاد کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ دشمنوں کے معاملے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سپرد کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ مکی آیات میں دیا جاتا ہے۔

نواں قول

سورۃ الکہف کی (درج ذیل) آخری آیت قرآن مجید کی نازل ہونے والی مطلقاً آخری آیت ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾ (الکہف:۱۱۰)

"جو شخص اپنے پروردگار سے ملنے کی اُمید رکھتا ہو اُسے چاہیے کہ عمل نیک کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔"

اس روایت کو علامہ ابن جریر رحمہ اللہ نے حضرت معاویہ بن سفیان رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

---

① صحیح بخاری ۶۷۴۴، مسلم: ۴۱۲۸، ابوداؤد: ۲۸۸۸

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "مندرجہ بالا اثر میں اشکال ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت کی اس سے مراد یہ ہو کہ سورۃ الکہف کی یہ آخری آیت وہ ہے جو کہ بعد میں نہ ہی تو منسوخ ہوئی اور نہ ہی اس میں کوئی تغیر آیا۔ بلکہ اس کا حکم ثابت اور محکم ہے۔"

علامہ ابن کثیر کی وضاحت سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ سورۃ کہف کی آخری آیت بھی نازل ہونے والی آخری آیت نہیں ہے۔

دسواں قول: امام مسلم رحمہ اللہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ درج ذیل سورت قرآن مجید کی نازل ہونے والی مطلقاً آخری آیات ہیں:

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝﴾ (النصر:۱-۳)①

لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس روایت کو محمول کیا جائے اس پر کہ سورۃ النصر وہ آخری سورت ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت کی طرف اشارہ دیا گیا ہے۔ ہماری اس بات کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے مسند احمد میں روایت کیا ہے کہ جب سورۃ النصر نازل ہوئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((نُعِيَتْ اِلَيَّ نَفْسِيْ)).②

"مجھے (اس سورت میں) موت کی خبر سنائی گئی ہے۔"

اس سورت کے نازل ہونے کے وقت کبار صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی یہی سمجھا تھا کہ اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے جیسا کہ منقول ہے کہ جب عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سورت سنی تو رو پڑے اور فرمانے لگے: "الکمال دلیل الزوال" کہ کسی چیز کا مکمل ہو جانا اس کی انتہا اور تمام ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ نیز یہ بھی احتمال ہے کہ یہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورت ہو جبکہ آخری آیات ان کے علاوہ اور ہوں جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

((آخر سورة نزلت من القرآن جميعًا)). ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ ...﴾③

مندرجہ بالا دس اقوال وہ تھے جو مجھے روایات و آثار سے ملے۔ یہ تمام اقوال اور ان کی توجیہات آپ کے سامنے ہیں۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ اطمینان سب سے پہلے قول یعنی ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ ...﴾ (البقرة:۲۸۱) والے پر ہی ہے کہ یہ ہی آیت نازل ہونے والی مطلقاً آخری آیت ہے اس کے علاوہ تمام اقوال نسبتاً یا مقیداً آخری ہونے کے ہیں۔

لیکن قاضی ابو بکر رحمہ اللہ اس معاملے میں مساوات کے قائل ہیں، وہ کسی بھی ایک قول کو راجح قرار نہیں دیتے۔ انھوں نے اس مسئلے میں جو مذہب اختیار کیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

---

① مسلم: ۳۰۲۴

② المسند: ۱۸۷۳/۳۳۴۳

③ رواہ النسائی فی الکبریٰ: ۱۱۷۱۳

تمام اقوال برابر ہیں۔ کیونکہ ان اقوال میں سے کوئی قول ایسا نہیں جس کو حضور اقدس ﷺ تک مرفوع کے ذریعے تائید حاصل ہے۔ تمام قائلین اپنے اقوال میں اجتہاد وغالب ظن سے کام لے رہے ہیں۔ ان تمام اقوال میں احتمالات پائے جاتے ہیں۔ من جملہ احتمالات کے ایک احتمال یہ بھی ہے کہ روز وفات راوی نے نبی کریم ﷺ سے وہی آیت سنی ہو جسے وہ آخری کہہ رہا ہے۔ یا جو آیات آپ ﷺ پر نازل ہوئیں انھیں آپ نے تلاوت فرمایا ہو اور راوی نے یہ سمجھا ہو کہ آپ ﷺ کی تلاوت شدہ آخری آیت ہی آخری آیت ہے جو نازل ہوئی۔

گویا کہ امام قاضی ابوبکر رحمہ اللہ ان تمام اقوال میں تطبیق کے قائل ہیں۔ یہ طریقہ سہل تو ہے لیکن اس میں یہ بات واضح نہیں ہو پاتی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری عظیم کتاب کا اختتام کس آیت پر کیا۔

بعض احکام سے متعلق نازل ہونے والی ابتدائی اور انتہائی (آخری) آیات

اللہ تعالیٰ نے شریعت کے بعض احکام تدریجاً نازل کیے۔ آہستہ آہستہ لوگوں کو اس اَمر کا خوگر بنایا یا اس نہی سے روکا۔ ذیل میں شراب اور جہاد سے متعلق دو مثالیں تحریر کی جا رہی ہیں۔ ان مثالوں میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کہ حکمت ودانائی کا منبع ہیں، انھوں نے کیسے بندوں کو تدریجاً حکم یا نہی کا پورا کرنے والا بنایا۔ نیز اس امر یا نہی سے متعلق ابتدائی اور آخری آیات کونسی ہیں۔

شراب سے متعلق نازل ہونے والی ابتدائی اور آخری آیات

علامہ طیالسی رحمہ اللہ نے اپنی "المسند" میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے:

"شراب سے متعلق تین آیات نازل ہوئیں۔" سب سے پہلے:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ﴾ (البقرۃ: ۲۱۹)

"اے پیغمبر ﷺ! لوگ آپ سے شراب اور جوئے کا حکم دریافت کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ ان میں گناہ بڑے ہیں اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں۔ لیکن ان کے گناہ ان کے فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں۔"

نازل ہوئی۔ اس موقع پر کسی نے کہا کہ شراب حرام ہو چکی ہے لیکن جو لوگ شراب کے خوگر تھے انھوں نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! شراب میں جو نفع ہے ہمیں وہ نفع اٹھانے دیجیے۔ آپ ﷺ خاموش رہے (وہ لوگ اس کا نفع اٹھاتے رہے۔ یہ بات درست ہے کہ شراب میں تھوڑا سا نفع بھی ہے مثلاً اس کی تجارت سے مالی منفعت حاصل ہوتی ہے۔ شراب پینے سے چہرے کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔ دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ اس کی صحت اچھی ہو گئی ہے۔ شراب میں ایک قومی واجتماعی فائدہ بھی ہے کہ شراب کے نشہ میں مخمور ہو کر آدمی فیاض اور جرأت وجلادت کے جذبات سے سرشار ہو جاتا ہے۔ تاہم ان فوائد کے مقابلے میں شراب کی مضرت کا پہلو غالب ہے اور وہ یہ کہ شراب بذات خود ایک مرض ہے۔ شراب کے نشے کی حالت میں انسان حرام وحلال، جائز وناجائز، وغیرہ کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ نماز روزے جیسی عظیم عبادات سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے نقصانات ہیں۔)

کچھ عرصے بعد شراب سے متعلق دوسری آیت:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ (النساء:۴۳)

"اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو جب تک ان الفاظ کو جو منہ سے کہو سمجھنے نہ لگو، نماز کے پاس نہ جاؤ۔"

نازل ہوئی۔ اس موقع پر بھی کسی نے کہا شراب حرام ہو چکی ہے لیکن جو لوگ شراب کے خوگر تھے، انھوں نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا: ہم نماز کے قریبی اوقات میں شراب نہیں پئیں گے۔ آپ ﷺ خاموش رہے۔ (اور وہ لوگ نماز کے علاوہ اوقات میں شراب پیتے رہے)۔ کچھ عرصے بعد شراب کی حرمت سے متعلق آخری اور حتمی آیت:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ ﴾ (المائدۃ:۹۰،۹۱)

"اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے (تیر) یہ سب ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ شیطان تو چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوا دے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے، تو کیا تم لوگ ان کاموں سے باز آ ؤ گے؟"

نازل ہوئی۔ اب رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "حُرِّمَتُ الخمر" یعنی شراب (مکمل طور پر) حرام ہوگئی ہے۔

② جہاد سے متعلق نازل ہونے والی ابتدائی اور آخری آیات

(جاننا چاہیے جہاد کی دو قسمیں ہیں: ① دفاعی جہاد: وہ جہاد جس میں صرف دفاع مقصود ہو۔ یعنی اگر دشمن حملہ آور ہو جائے تو اس کو روکنے اور مار بھگانے کے لیے جو جہاد کیا جائے گا اس کو "جہاد دفاعی" کہتے ہیں۔ ② اقدامی جہاد: وہ جہاد جس میں دشمن کے حملہ آور ہونے سے قبل ہی اُن کو دعوتِ قتال و جہاد دیتے ہوئے اقدام کیا جائے۔)

صدر اسلام میں اقدامی تو کیا دفاعی جہاد بھی شروع نہ تھا۔ دفاعی جہاد کا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہ تھا بلکہ یہ حکم تھا کہ تم پر کوئی کتنا ہی ظلم وستم کرے، تم صرف عفو و درگزر سے کام لینا جیسا کہ درج ذیل آیت:

﴿ وَدَّ كَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۖۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَ اصْفَحُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ ﴾ (البقرۃ:۱۰۹)

"بہت سے اہل کتاب اپنے دل کی جلن سے یہ چاہتے ہیں کہ ایمان لا چکنے کے بعد تم کو پھر کافر بنا دیں حالانکہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے۔ تو تم معاف کرو، اور درگزر کرو۔ یہاں تک کہ اللہ اپنا دوسرا حکم بھیجے۔ بے شک اللہ ہر بات پر قادر ہے۔"

میں ہے۔ اس آیت میں صریح طور پر دفاعی جہاد سے بھی روکا گیا ہے۔ لیکن یہ نہی ہجرت کے دوسرے سال ہٹالی گئی اور سن ۲ ہجری میں جہاد دفاعی کا حکم نازل ہوا۔ دیکھیے درج ذیل آیات:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ﴿۳۹﴾ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ وَ لَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۴۰﴾ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾﴾

(الحج:۳۹-۴۰-۴۱)

"جن مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی جاتی ہے ان کو اجازت ہے (کہ وہ بھی لڑیں) کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ (ان کی مدد کرے گا وہ) یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے (انہوں نے کچھ تصور نہیں کیا) ہاں یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو (راہبوں کے) صومعہ اور (عیسائیوں کے) گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں خدا کا بہت سا ذکر کیا جاتا ہے ویران ہو چکی ہوتیں اور جو شخص خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی ضرور مدد کرتا ہے بیشک خدا توانا اور غالب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔"

اس آیت کے بعد مندرجہ ذیل آیات نازل ہوئیں۔ جن میں جہاد (دفاعی اور اقدامی) وقتال پر خوب ابھارا گیا۔ اور کسی قسم کی رعایت برتنے سے روکا گیا۔ ان آیات میں جہاد وقتال سے متعلق حتمی احکام موجود ہیں۔

① ﴿وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً كَمَا یُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ﴾ (التوبہ:۳۶)

"اور تم سب کے سب مشرکوں سے لڑو۔ جیسے وہ سب کے سب تم سے لڑتے ہیں۔"

② ﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿﴾﴾ (التوبہ:۴۱)

"تم سبکبار ہو یا گراں بار (یعنی مال و اسباب تھوڑا رکھتے ہو یا بہت، گھروں سے) نکل آؤ اور اللہ کے راستے میں مال اور جان سے لڑو۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے بشرطیکہ سمجھو!۔"

③ ﴿اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۙ۬ وَّ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ وَ لَا تَضُرُّوْهُ شَیْـًٔا ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿﴾﴾ (التوبہ:۳۹)

"اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا۔ اور تمہاری جگہ اور لوگ پیدا کر دے گا (جو اللہ کے پورے فرمانبردار ہونگے) اور تم اسکو کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

اعتراض:

سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۳:

﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ﴾ (المائدہ:۳)

کو آخری آیت ماننے میں کیا حرج ہے؟ حالانکہ یہ آیت معنی ومفہوم کے اعتبار سے سب سے زیادہ واضح وصریح ہے نیز یہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر سن دس ہجری میں نازل ہوئی اور اس آیت میں اکمال دین اور اتمام فرائض واحکام کا کھلم کھلا اعلان کیا گیا ہے۔

جواب (ہم اس آیت کو آخری آیت کیسے مان لیں حالانکہ) اس آیت کے بعد قرآن مجید کا نزول دو ماہ سے بھی زائد عرصے تک ہوتا رہا۔ ہم ماقبل بھی بیان کر چکے ہیں کہ ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ﴾ (البقرۃ:۲۸۱) ہی آخری آیت ہے کیونکہ اس آیت کے نزول کے بعد حضور اکرم ﷺ صرف نو (۹) راتیں بقید حیات رہے۔ پس یہ ہی بات ہمارے لیے سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۳ کو آخری آیت ماننے سے مانع ہے۔ اور رہی یہ بات کہ سورۃ المائدہ کی مذکورہ آیت میں اکمال دین اور اتمام نعمت کا ذکر ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اکمال دین کا اعلان اس معنی میں ہے کہ اس دن اکثر مسلمان ایک میدان میں جمع تھے، اسلام اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ اعدائے اسلام کی نظر میں نمایاں ہو چکا تھا اگرچہ کفار پر یہ منظر بہت بھاری تھا۔ اس روز (یوم عرفہ، دس ہجری) شرک ومشرکین، کفر وکفار، نفاق اور منافقین کی جڑیں تک کٹ چکی تھیں، بلدِ حرام نجس مشرکین سے خالی اور پاک ہو چکا تھا۔ اور حجۃ الوداع ہی سب سے پہلا حج تھا جس میں مسلمانوں کے ساتھ مشرکین شریک نہ ہوئے تھے۔ (اس حج سے قبل مسلمان اور مشرک خلط ملط ہو کر حج کرتے تھے۔ مسلمان اسلام کے مطابق فرائض حج ادا کرتے تھے جبکہ مشرکین اپنے اعمال فاسدہ وباطلہ میں مصروف رہتے تھے)۔ علامہ ابن جریر رحمہ اللہ سورۃ المائدہ کی مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"بہتر یہ ہے کہ اس آیت کی تاویل یوں کی جائے کہ اس آیت میں دین کا کامل ہونا بایں طور پر ہے کہ مسلمان کو بلد حرام میں مستقل مستقر وقرار نصیب ہوا جب کہ مشرکین سے مستقل طور پر بلادِ حرام کو پاک کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ اس سال مسلمانوں نے اس حال میں حج ادا کیا کہ ان کے ساتھ مشرکین مخالط نہیں تھے۔"

علامہ ابن جریر رحمہ اللہ کی اس تاویل کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے جس کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"مسلمان اور مشرکین پہلے ایک ساتھ ہی حج ادا کیا کرتے تھے۔ جب سورۃ براءۃ نازل ہوئی اور اس میں مشرکین کو بیت اللہ میں آنے سے روک دیا گیا تو اس وقت مسلمانوں نے اس حال میں حج کیا کہ بیت اللہ میں ان کے ساتھ مشرکین شریک نہیں تھے۔ پس اُس وقت اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنی نعمت مکمل وتمام فرما دی۔ یہ ہی مطلب ہے ﴿وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ کا۔"

اللہ سے دُعا ہے کہ اللہ ہم پر نعمت کو ایسے ہی مکمل وتمام رکھے۔ آمین۔

نوٹ ① آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے تیسرے باب میں بعنوان "قرآن کریم کے تیسرے یعنی آخری نزول کا عرصہ مدت" کے تحت ایک تحقیق اور اس تحقیق میں موجود تین کمیاں ذکر کی تھیں اور ہم نے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ آپ اس کی تفصیل آگے پڑھیں گے۔ سو اب تفصیل کے ساتھ آپ پڑھ چکے ہیں کہ قرآن مجید کی کون سی آیات آخری ہیں اور کون سی نہیں۔

② قرآن مجید کی نازل ہونے والی مطلقاً آخری آیت ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ﴾ (البقرۃ:۲۸۱) ہی ہے۔ کیونکہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور اکرم ﷺ صرف نو (۹) دن بقید حیات رہے جب کہ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ کے نازل ہونے کے بعد آپ ﷺ اکیاسی (۸۱) دن بقید حیات رہے۔ اس حساب سے بھی قرآن کریم کی نازل ہونے والی آخری آیت ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا...﴾ ہی ہے۔

③ قرآن مجید کے نزول کی ابتداء اُس وقت ہوئی جب حضرت جبرئیل علیہ السلام غار حرا میں حضور اقدس ﷺ کے پاس سورۃ العلق کی

(ابتدائی) آیات لے کر حاضر ہوئے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں یہ واقعہ رمضان کی سترہ تاریخ کا ہے۔ کیونکہ غزوۂ بدر بھی سترہ رمضان کو ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود فرمایا:

﴿اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾

"اگر تم اللہ پر اور اس پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے نازل کیا اپنے (محمد ﷺ) پر یوم الفرقان (یعنی حق و باطل میں فرق کرنے کے دن) میں جس دن دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔" (الانفال:۴۱)

یوم الفرقان سے بالاتفاق غزوۂ بدر ہی مراد ہے۔ اور آیت میں بھی "وما انزلنا" میں واضح ذکر ہے کہ ہم نے یوم الفرقان کے دن قرآن نازل کیا۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید سترہ رمضان کو یا غزوۂ بدر والے دن نازل ہونا شروع نہیں ہوا۔ بلکہ قرآن مجید تو لیلۃ القدر میں نازل ہوا جیسا کہ سورۃ القدر میں ہے۔ لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہوتی ہے۔ اور سترہ تاریخ تو آخری عشرے میں نہیں آتی۔ اور رہی یہ بات کہ پھر ﴿وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ﴾ کا کیا مطلب ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اکثر مفسرین کرام نے "ما" سے وہ نصرت، مدد اور ملائکہ کی جماعتیں مراد لی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے میدان بدر میں غزوۂ بدر کے دن مسلمانوں کی مدد کے لیے نازل فرمائی تھیں۔ اور سورۃ الانفال کی پیش کردہ آیت نمبر ۴۱ کا سیاق و سباق بھی یہی بتا رہا ہے کہ یہاں "ما" سے قرآن مجید مراد نہیں بلکہ نصرت، مدد اور ملائکہ مراد ہیں۔ دیکھیے مکمل آیت:

﴿وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾

اور جان رکھو کہ جو مال غنیمت تم کفار سے حاصل کرو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اہل قرابت کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ہے۔ اگر تم اللہ پر اور اس پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے نازل کیا اپنے بندے (محمد ﷺ) پر یوم الفرقان میں جس دن دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔" (الانفال:۴۱)

آیت کی ابتداء میں مال غنیمت کی تقسیم کا ذکر کیا کہ مال غنیمت کے پانچ حصے کرو چار حصے خود رکھو اور ایک حصہ اللہ کے نام پر جدا کر دو کیونکہ وہ ہی تو ہے جس نے تم پر آسمان سے مدد یعنی فرشتے نازل کیے اُس دن جس دن دو فوجوں میں مڈبھیڑ ہوگئی تھی اور وہ دن "فرقان" کا دن تھا۔

④ غزوۂ بدر کو یوم الفرقان کہا گیا کیونکہ یہ ہی تو وہ دن تھا جس دن مسلمانوں کی شان و شوکت دنیا والوں کے سامنے ظاہر ہوئی۔ کفر اور اسلام میں فرق کھل کر سب کے سامنے آ گیا۔ مسلمانوں کے پاس بظاہر کوئی خاص جنگی ہتھیار نہیں تھے اور نہ ہی وہ جنگ کے ارادے سے آئے تھے۔ لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عظیم اور کفار کو شکستِ فاش سے درکنار فرمایا۔

بحث ⑤

اسبابِ نزول

قرآن کریم کی آیات کی دو قسمیں ہیں:

① وہ آیات جو کسی خاص واقعے یا سبب کی بنا پر نازل نہیں ہوئیں۔ بلکہ صرف انسانیت کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں نازل فرمایا۔ اس طرح کی آیات بہت زیادہ ہیں۔ ان کے بارے میں تفصیلاً بیان ہمارا موضوع نہیں۔

② وہ آیات جو کسی خاص واقعے یا سبب کی بنا پر نازل ہوئیں۔ ایسی آیات سے متعلق بیان کرنا ہمارا موضوع ہے۔ لیکن ہم اُن تمام آیات کو بیان نہیں کریں گے جو کسی خاص واقعے یا سبب کی بنا پر نازل ہوئیں۔ کیونکہ ان تمام آیات کو بیان کرنے کے لیے علمائے کرام نے بہت سی کتب تالیف کی ہیں جن میں صرف اس قسم ہی کی آیات کو بیان کیا ہے۔ جیسا کہ امام علی بن مدینی جو کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے اُستاد ہیں، امام واحدی، علامہ جعبری، علامہ ابن حجر اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمہم اللہ نے اس دوسری قسم کی آیات کو مفصلاً بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر علامہ السیوطی رحمہ اللہ کی ایک کتاب جس کا نام "لباب النقول فی اسباب النزول" ہے، بہت اہمیت کی حامل ہے۔

ہم اس باب میں درج ذیل موضوع بیان کریں گے جو تمام آیات کے اسباب نزول کو سمجھنے میں ممد و معاون ہوں گے۔

① سبب نزول کا معنی ② اسبابِ نزول کی معرفت کے فوائد ③ اسباب نزول کی معرفت کا طریقہ ④ اسبابِ نزول سے متعلق تعبیرات ⑤ اُن آیات کا حکم جو خود واحد ہوں لیکن اُن کے اسباب متعدد ہوں ⑥ اُن آیات کا حکم جن کا سبب ایک ہو لیکن وہ خود متعدد ہوں ⑦ لفظ شارع اور اس کے سبب کے مابین عموم و خصوص ⑧ لفظ کے عام اور سبب کے خاص ہونے کے اختلاف کی تحقیق ⑨ اس بارے میں جمہور کے دلائل ⑩ مخالفین کے شبہات اور ان کے جوابات ⑪ لفظِ عام کے ساتھ سبب خاص کی مثال۔

① **سببِ نزول کا معنی:** سبب نزول سے مراد وہ واقعہ، حادثہ، سوال یا حکم ہے جو کسی آیت یا چند آیات کے نزول کا باعث بنے۔ برابر ہے اُس واقعے کا تعلق خصومت ولڑائی جھگڑے سے ہو جیسا کہ قبیلہ اوس اور خزرج کی ایک جماعت کو آپس میں لڑانے کے لیے اللہ کے دشمنوں یعنی یہود نے گھٹیا کوشش کی یہاں تک کہ یہ نوبت آ گئی کہ اوس اور خزرج کے بعض لوگ مسلمان ہونے کے باوجود آپس میں "السلاح السلاح" کی آوازیں بلند کرنے لگے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے سورت آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۰ اور اس سے پہلی اور بعد والی کچھ آیات نازل فرمائیں جن میں اہل کتاب کی اطاعت سے روکا گیا ہے اور آپس میں محبت و اتفاق کا درس دیا گیا ہے۔

یا اُس واقعے کا تعلق کسی خطاء فاحش سے ہو جس کا ارتکاب کر لیا گیا ہو۔ جیسے ایک شخص نے نشے کی حالت میں نماز کی امامت کروائی اور اس نے سورۃ الفاتحہ کے بعد سورۃ الکافرون شروع کی۔ پھر ﴿لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝﴾ میں لَآ کو حذف کر کے ﴿اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝﴾ پڑھ دیا۔ تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ (النساء: ۴۳)

یا اُس واقعے کا تعلق کسی تمنا و خواہش سے ہو جیسا کہ "موافقات عمر رضی اللہ عنہ"۔ موافقات عمر رضی اللہ عنہ کے موضوع پر الگ سے متعدد کتب بھی لکھی جا چکی ہیں۔ موافقات عمر رضی اللہ عنہ سے مراد وہ آیات ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تمنا اور خواہش کے موافق نازل ہوئیں۔ جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے رب نے تین معاملات میں میرے ساتھ موافقت کی ہے۔

① ایک مرتبہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کاش ہم مقام ابراہیم پر بھی نماز پڑھتے۔ اللہ نے یہ آیت: ﴿ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ﴾ (البقرۃ: ۱۲۵) نازل فرما دی جو کہ میری تمنا کے عین مطابق تھی۔

② میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کے اہل خانہ کے سامنے ہر طرح کے لوگ چلے جاتے ہیں اس لیے میری خواہش ہے کہ آپ اُن کو پردے کا حکم دے دیں (اُس وقت تک پردے کا حکم نہیں تھا) تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آیت پردہ نازل فرمائی۔

③ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیویاں آپ کی بابت غیرت رکھنے میں ایک سی ہو گئیں تو میں نے اُن سے کہا: ﴿ عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ ﴾۔ یعنی اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو چھوڑ دیں گے تو اُمید ہے کہ اُن کا خدا انھیں تمہارے بدلے میں تم سے اچھی بیویاں دے دے گا۔ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ) سورۃ التحریم کی آیت نمبر ۵ کے الفاظ ہیں۔

یا اُس واقعے کا تعلق کسی سوال سے ہو جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا ہو۔ خواہ اُس سوال کا تعلق زمانہ ماضی سے ہو جیسے: ﴿ وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ ... ﴾ (الکہف: ۸۳) یا زمانہ حال و حاضر سے ہو جیسے: ﴿ وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ﴾ (الاسراء: ۸۵) یا زمانہ مستقبل سے ہو۔ جیسے: ﴿ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا ﴾ (النازعات: ۴۲)

جس واقعے سے متعلق آیت یا آیات نازل ہوئی ہیں عام ہے کہ وہ آیت/آیات اُس واقعے کے فوراً بعد نازل ہو جائیں یا کسی حکمت کے تحت کچھ تاخیر ہو جائے جیسا کہ قریش نے آ کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے روح، اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے بارے میں پوچھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "غداً اخبرکم" (میں تمھیں کل بتاؤں گا)۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شاء اللہ نہیں کہا۔ اس وجہ سے وحی کا سلسلہ مؤخر کر دیا گیا۔ ابن اسحاق کے مطابق پندرہ روز تک وحی نازل نہیں ہوئی۔ جبکہ تین اور پانچ روز کے اقوال بھی ملتے ہیں۔ الغرض جتنے روز بھی وحی کا سلسلہ رکا رہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ عرصہ بہت شاق گزرا۔ پندرہ یا تین یا پانچ روز کے بعد اللہ تعالیٰ نے وحی کا سلسلہ دوبارہ سے شروع فرما دیا۔ اور قریش کے پوچھے گئے سوالات کے جوابات بھی ارشاد فرما دیے۔ پھر یہ دو آیات:

﴿ وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۟ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ؗ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ وَ قُلْ عَسٰۤى اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴾ (الکہف: ۲۳-۲۴)

"اور کسی کام کی نسبت نہ کہنا کہ میں اسے کل کر دوں گا۔ مگر (ان شاء اللہ کہہ کر یعنی اگر) اللہ چاہے تو (کر دوں گا) اور جب اللہ کا نام لینا بھول جاؤ تو یاد آنے پر لے لو اور کہہ دو کہ امید ہے کہ میرا پروردگار مجھے اس سے بھی زیادہ ہدایت کی باتیں بتائے۔"

نازل فرمائیں:

شانِ نزول کی تعریف میں "ایام وقوعه" کے الفاظ قید احترازی ہیں۔ ان الفاظ سے اُن آیات سے احتراز مقصود ہے جو ابتداءً بدون سبب نازل ہوئی ہوں، پھر بعد جب اس سے متعلق احوال و وقائع پیش آئے ہوں یا گزشتہ زمانے میں پیش آ چکے ہوں جیسے سابقہ انبیاء علیہم السلام اور امتوں کے واقعات اور حالات ہیں۔ "ایام وقوعه" کے الفاظ سے خاص وہی آیات، شانِ نزول کی تعریف میں باقی رہ گئیں جو اُن واقعات کے وقت اور ایام میں نازل ہوئیں، جن کی وجہ سے وہ آیات نازل ہوئی تھیں۔

(ف) "ایام وقوعه" کے الفاظ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی ہر ہر آیت کا شان نزول نہیں ہے۔ قرآن مجید کا بہت سا حصہ اللہ تعالیٰ نے از خود نازل فرمایا، کوئی خاص واقعہ یا کسی کا کوئی سوال وغیرہ اُس کے نزول کا سبب نہیں بنا۔

شانِ نزول کی اہمیت اور اس کے فوائد

بعض ایسے لوگ جو بصیرت علمی سے عاری ہیں وہ کہتے ہیں کہ شان نزول کی حیثیت تاریخ یا قائم مقام تاریخ سے کچھ زیادہ نہیں۔ لہٰذا وہ شان نزول کے عظیم علم کی معرفت کو کسی شمار میں نہیں لاتے اور اس کے حصول کو بے سود سمجھتے ہیں۔ ذیل میں شان نزول یا اسباب نزول کی معرفت کے چند فوائد لکھے جاتے ہیں جن سے اس علم کی اہمیت مزید واضح ہو جائے گی اور اُن بعض قائلین کا قول بھی غلط ثابت ہو جائے گا۔ (ان شاء اللہ)

① اسباب نزول جاننے کا سب سے پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس سے یقینی طور پر احکام الٰہی کی حکمتیں معلوم ہوتی ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے کن حالات میں نازل فرمایا۔ جس کے نتیجے میں اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور احکام الٰہی کو پورا کرنے اور قرآن مجید پر عمل کرنے کا شوق و ذوق پیدا ہوتا ہے۔ نیز ان احکام میں اسرار و رموز بندۂ مومن کے سامنے واضح ہوتے چلے جاتے ہیں حتی کہ کافر انسان بھی اگر منصف اور سلیم الطبع ہو تو شریعت اسلامی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے بہترین انداز میں انسان کے بشری تقاضوں وضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے اس پر احکام شریعت لازم کیے۔ ایک حرمت شراب ہی کی مثال کو دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کرنے میں حکیمانہ انداز اپناتے ہوئے یکبارگی اسے حرام قرار نہیں دیا بلکہ مصالح وحکمتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تدریجاً اس کو حرام قرار دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر شراب کی طرف دوبارہ لوٹنا یا اس سے غفلت برتنے کا وسوسہ تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں پیدا نہ ہوا۔

② اسباب نزول جاننے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے آیت کا معنی ومفہوم سمجھنے میں اور اس میں پیدا ہونے والے اشکالات کو دور کرنے میں استعانت ملتی ہے۔ جیسا کہ امام واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((لا یمکن معرفة تفسیر الآیة دون الوقوف علی قصتها وبیان نزولها)).

"آیت کے شانِ نزول اور اس سے متعلق واقعے کو جانے بغیر آیت کی تفسیر سے آگاہ ہونا ناممکن ہے۔"

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((معرفة سبب النزول یعین علی فهم الآیة، فان العلم بالسبب یورث العلم بالمسبب)).

"سبب نزول کا جاننا آیت کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے کیونکہ سبب کا جاننا ہی مسبب کی معرفت کا فائدہ دیتا ہے۔"

بسا اوقات سبب کے بغیر آیت کا صحیح مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آتا اور اگر سبب نزول سامنے نہ ہو تو انسان آیت کا بالکل غلط مطلب سمجھ سکتا ہے۔ یہ بات درج ذیل تین مثالوں سے واضح ہوگی۔

① سورۃ البقرۃ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ (البقرۃ:۱۱۵)

"اور مشرق و مغرب سب اللہ ہی کی ہیں، لہٰذا جس طرف بھی تم رخ کرو گے، وہیں اللہ کا رخ ہے۔ بے شک اللہ بہت وسعت والا اور علم والا ہے۔"

اگر اس آیت کے الفاظ کو دیکھا جائے تو اس سے یہ ہی ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں کسی خاص جہت کی طرف رخ کرنا ضروری نہیں۔ جس طرف دل چاہے رخ کر کے نماز پڑھ لو۔ چاہے سفر میں ہو یا حضر میں خانہ کعبہ کی طرف رخ کرنا ضروری نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر سمت میں موجود ہے۔ لیکن جونہی آیت کے شان نزول کو دیکھا جائے تو مذکورہ بالا مفہوم کا غلط ہونا بدیہی طور پر ثابت ہو جاتا ہے۔ اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ آیت خاص طور پر یا تو سفر میں (سواری کے اوپر) نفلی نماز پڑھنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یا پھر اُن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو کسی ایسی جگہ پر ہوں جہاں قبلے کا علم کسی کو نہ ہو اور پھر سب اجتہاد یا تحری کر کے نماز پڑھ لیں اور ان کو بعد میں معلوم ہو کہ انہوں نے غلطی کی۔ پس آیت میں مسافر کے لیے تخفیف مراد ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: وہ فرماتے ہیں: "یہ آیت سفر کی حالت میں سواری پر نماز پڑھنے والے کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ کسی بھی سمت رخ کر کے نماز پڑھ لے۔" اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: "یہ آیت اس قوم یا جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو رات کے وقت میں کسی جگہ ہوں اور انھیں قبلے کی سمت معلوم نہ ہو اور پھر وہ مختلف اطراف میں منہ کر کے نماز پڑھ لیں پھر صبح ہونے پر انھیں معلوم ہو کہ انھوں نے قبلے کی طرف رخ کر کے نمازیں نہیں پڑھی تھیں تو اُن کا عذر قبول کیا جائے گا۔" اس آیت کے سبب نزول میں اور بھی اقوال ہیں لیکن جو ہم نے ذکر کر دیے ہیں وہ کافی ہیں۔

② سورۃ آل عمران میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (آل عمران:۱۸۸)

"جو لوگ اپنے کیے ہوئے کاموں سے خوش ہوتے ہیں اور وہ کام جو کرتے نہیں ان کے لیے چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے تو آپ ان کی نسبت یہ خیال نہ کرنا کہ وہ عذاب سے چھٹکارا پائیں گے۔ اور انھیں درد دینے والا عذاب ہوگا۔"

صحیح بخاری (حدیث ۴۵۶۸) کے مطابق: حضرت مروان بن حکم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں اس آیت کے مفہوم کے بارے میں مسلسل اشکال کا شکار رہا اور سوچتا رہا کہ اس طرح تو ہم میں سے ہر ایک کو بڑا سخت دردناک عذاب دیا جائے گا، کیونکہ ہم سب بھی اپنے کیے ہوئے کاموں پر خوش ہوتے ہیں اور بعض اوقات کسی نا کردہ کام پر اپنے آپ کو تعریف کا مستحق سمجھتے ہیں۔ لیکن میرا یہ اشکال یا غلط فہمی اُس وقت دور ہوئی جب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کا شان نزول بیان کیا کہ یہ آیت اہل کتاب کے

بارے میں نازل ہوئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ نے یہود سے ایک بات پوچھی کہ کیا یہ تورات میں ہے۔ ان لوگوں نے چھپا لیا اور جو تورات میں تھا اس کے خلاف بیان کر دیا اور اپنے اس عمل بد پر خوش ہوتے ہوئے واپس آئے کہ ہم نے خوب دھوکا دیا۔ تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اُن کے لیے وعید ہے۔ شانِ نزول سننے کے بعد حضرت مروان بن حکم رضی اللہ عنہ کی تشنگی سیرابی سے بدل گئی اور اشکال رفع ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے کلام سے جو حقیقی مراد تھی وہ سمجھ آ گئی۔

④ سورۃ البقرۃ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ﴾ (البقرة: ١٥٨)

"بے شک صفا اور مروہ کی پہاڑیاں اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ تو جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے اس پر کچھ گناہ نہیں کہ دونوں کے درمیان چکر لگائے۔"

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے جب اس آیت کو شانِ نزول کے بغیر سمجھنے کی کوشش کی تو اس اشکال کا شکار ہو گئے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا صرف جائز ہے، کوئی فرض یا واجب نہیں۔ کیونکہ آیت میں "جُنَاحَ" کے لفظ سے یہ ہی مفہوم ہو رہا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے اشکال کا ذکر اپنی خالہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا۔ اُس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ رضی اللہ عنہ کو سمجھایا کہ لفظ "جناح" سے سعی کے فرض یا واجب ہونے کی نفی کرنا مراد نہیں بلکہ اس خیال کی نفی کرنا مراد ہے جو اُس وقت مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو رہا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں صفا اور مروہ دونوں پہاڑیوں پر دو بت نصب تھے۔ صفا پر جو بت نصب تھا اُسے "اساف" جبکہ مروہ پر نصب بت کو "نائلہ" کہتے تھے۔ اور مشرکین جب صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے تھے تو ان دونوں بتوں کو ہاتھ لگا لگا کر آتے تھے۔ پھر جب اسلام غالب آ گیا، ہر طرف اسلام کا بول بالا ہو گیا اور تمام بت ریزہ ریزہ ہو گئے اور پھر جب سعی کا موقع آیا تو مسلمانوں کو یہ خیال آیا کہ کہیں ان بتوں کی وجہ سے سعی کرنا ناجائز نہ ہو گیا ہو، اُن کا یہ اشکال رفع کرنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔

③ اسبابِ نزول جاننے کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے بعض آیات میں بظاہر پائے جانے والے حصر کو دُور کیا جا سکتا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُل لَّا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَن يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ ۚ﴾ (الانعام: ١٤٥)

"کہہ دیجیے کہ جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں، میں ان میں کوئی چیز، جسے کھانے والا کھائے، حرام نہیں پاتا۔ سوائے اُس کے کہ وہ مرا ہوا جانور ہو یا بہتا لہو یا سور کا گوشت کہ یہ سب ناپاک ہیں یا کوئی گناہ کی چیز ہو کہ اس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔"

اس آیت کے ظاہر سے حصر کا وہم پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ تمام مطعومات حلال ہیں سوائے چار چیزوں (مردار، بہتا ہوا خون، خنزیر کا گوشت اور وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو) کے۔ لیکن اس آیت میں یہ حصر مقصود نہیں۔ یہ محض ایک وہم ہے۔ اگر اس آیت کے سببِ نزول کی طرف نظر کی جائے تو یہ وہم حصر رفع ہو جائے گا۔ جیسا کہ علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر/سبب نزول

میں امام محمد ادریس الشافعی رحمہ اللہ کی طرف سے ایک نہایت ہی عمدہ قول نقل کرتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اس وقت نازل فرمائی جب کفار نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ضد اور عناد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ اشیا کو حرام قرار دیا۔ یعنی یہ آیت کفار کے مناقضہ اور نقیض کی غرض سے نازل ہوئی (نہ کہ یہ بتانے کی غرض سے کہ کون کون سی اشیا حلال ہیں اور کون کون سی حرام)۔

گویا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "حلال نہیں مگر جو تم نے حرام قرار دیا اور حرام نہیں مگر جو تم نے حلال ٹھہرایا۔" اس کی مثال یوں سمجھیے کہ کوئی شخص آپ سے کہے: "تم آج میٹھا نہ کھانا۔" اور آپ ضد اور مخالفت کی غرض سے اس کے جواب میں کہیں: "میں آج میٹھا ہی کھاؤں گا۔" (تو اب اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ آپ آج کے دن میٹھا ہی کھاتے رہیں گے اور میٹھے کے علاوہ کوئی چیز نہیں کھائیں گے۔ بلکہ آپ کے اس جواب کا مقصد مدِ مقابل کی بات کو رد کرنا اور اس کے ساتھ مناقضہ کرنا ہے۔ بالکل اسی طرح اس آیت میں ان چار چیزوں کے ذکر سے یہ مقصود نہیں کہ بس یہ چار چیزیں ہی حرام ہیں۔ بلکہ ان کے علاوہ اور اشیا بھی حرام ہیں۔ لیکن ان چار چیزوں کو کفار نے حلال کر رکھا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے صرف ان چار چیزوں کا ہی ذکر کیا۔) لہٰذا آپ کے جملے: "میں آج میٹھا ہی کھاؤں گا" کی حقیقت وحیثیت نفی یا اثبات والی نہیں بلکہ صرف اور صرف ضد اور مخالفت والی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مطعومات میں سے وحی الٰہی کے مطابق کسی کھانے والے پر حرام نہیں ہے مگر جسے تم نے حلال ٹھہرایا یعنی مردار، خون، سور کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ یعنی اس آیت میں مذکورہ اشیا کے علاوہ کے حلال ہونے کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں "تحریم" کو ثابت کرنا مقصد ہے، نہ کہ حلت کو۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی تائید میں امام الحرمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وهذا في غاية الحسن، ولو لاسبق الشافعي رحمه الله الى ذلك لما كنا نستجيز مخالفة مالك رحمه الله في حصر المحرمات فيما ذكرته الاية)). (الاتقان: ۹۵/۱)

"امام شافعی رحمہ اللہ کی یہ بات نہایت ہی حسین اور عمدہ ہے۔ اگر امام شافعی رحمہ اللہ اس بات کی طرف سبقت نہ لے جاتے، تو ہم محرمات کے اس حصر میں جو کہ (بظاہر) اس آیت میں موجود ہے، امام مالک رحمہ اللہ کی مخالفت کرنے کو جائز نہ سمجھتے۔"

خلاصہ کلام (از مترجم): ① اس آیت میں حصر صوری پایا جاتا ہے نہ کہ حصر حقیقی۔

② امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حرمت کا حکم، اس آیت میں مذکور اشیائے اربعہ میں محصور ہے۔ اور رہی بات ان اشیا کی، جن کی ممانعت احادیث سے ثابت ہے، تو اس ممانعت سے کراہت مراد ہے (یعنی ممانعت تحریمی مراد نہیں ہے)۔ لیکن امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد رحمہم اللہ اور اکثر فقہائے کرام کے نزدیک حکم تحریم ان چار چیزوں میں محصور ومحدود نہیں۔[1]

④ اسباب نزول جاننے کا چوتھا فائدہ یہ ہے کہ سبب کے ذریعے حکم کی تخصیص کو ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن صرف اس شخص کے نزدیک جو یہ رائے رکھتا ہو کہ "اعتبار سبب کی خصوصیت کا ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کے عموم کا۔" پس آیات ظہار، جو کہ سورۃ المجادلہ کے آغاز میں ہیں، ان آیات کا سبب یہ ہے کہ اوس بن صامت رضی اللہ عنہ نے اپنی زوجہ حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا سے ظہار کر لیا تھا۔ پس اس

① بحوالہ: التفسیر المظہری، ۲۹۹/۳، مکتبۃ الرشیدیہ، الباکستان

موقع پر حکم جو کہ ان آیات کو متضمن ہے، ان دونوں میاں بیوی کے ساتھ خاص ہے۔ (خاص رائے والے شخص کے نزدیک، جیسا کہ ہم نے اوپر بھی اشارہ دیا ہے) اور اگر یہی مسئلہ ان دونوں میاں بیوی (حضرت اوس رضی اللہ عنہ اور حضرت خولہ رضی اللہ عنہا) کے علاوہ کسی اور کے ساتھ پیش آ جائے تو اس وقت کسی اور دلیل کا سہارا لیا جائے گا قیاس وغیرہ کرتے ہوئے۔ لہٰذا اس وقت ان آیات کا معنٰی سبب نزول کی معرفت کے بغیر معلوم نہیں ہو سکے گا۔ نیز یہ آیات سبب نزول کی معرفت کے بغیر (العیاذ باللہ) بے ربط سی محسوس ہوں گی۔

فائدہ ❀ مندرجہ بالا فائدہ صرف اس شخص کے نزدیک حاصل ہوگا جو یہ رائے رکھتا ہو کہ اعتبار سبب کی خصوصیت کا ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کے عموم کا۔ لیکن یہ رائے جمہور کی رائے کے خلاف ہے۔ جمہور کی رائے یہ ہے کہ اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ سبب کی خصوصیت کا۔ یاد رہے یہ اختلاف محض نظریاتی اختلاف ہے۔ عملاً اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

⑤ سبب نزول کا پانچواں فائدہ اس بات کی معرفت کا حصول ہے کہ سبب نزول آیت کے حکم سے خارج نہیں ہوتا بشرطیکہ آیت کے لیے کوئی مخصص (خاص کرنے والا) پایا جائے۔ کیوں کہ اس پر اجماع ہے کہ سبب کا حکم قطعی طور پر باقی رہتا ہے۔ لہٰذا اس کے ماسوا پر تخصیص قاصر ہوگی۔ پس اگر سبب نزول موجود ہو تو تخصیص کی وجہ سے اُسے خارج سمجھنا جائز ہوگا۔ باوجود اس کے کہ اس کو قطعی طور خارج ماننا جائز نہیں ہے اجماع مذکور کی وجہ سے۔ اسی وجہ سے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ "المستصفی" میں فرماتے ہیں: "اسی بنا پر اجتہاد کے ذریعے حکم تخصیص کی وجہ سے سبب کو خارج کرنے کے ممنوع ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔" لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول: "الولد للفراش" میں سے مستفرشہ باندی کو خارج کر کے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے خطا کی ہے۔ کیوں کہ خبر (حدیث) وارد ہوئی ہے "زمعہ کی باندی" کے بارے میں کہ جب "زمعہ" کے بیٹے "عبد" نے کہا کہ یہ (لڑکا) میرا بھائی اور میرے باپ کی باندی کا بیٹا ہے۔ اور میرے باپ کے بستر پر پیدا ہوا ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ۔" "بچہ تو صاحب فراش کے لیے ہے اور زانی کے لیے سنگ ساری ہے۔" پس باندی کے لیے فراش ثابت ہو گیا۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تک یہ سبب نہیں پہنچا تھا اس لیے انھوں نے باندی کو عموم سے خارج مان لیا تھا۔

(سبب نزول جاننے کے پانچویں فائدے کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے:

"اگر سبب نزول یا سبب ورود معلوم نہ ہو تو انسان اجتہاد کے ذریعے سے کسی آیت یا حدیث کے حکم میں پائی جانے والی تعمیم میں تخصیص کر بیٹھتا ہے۔" مثلاً

((اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ)). (صحیح البخاری: ۲۰۵۳)

"بچہ تو صاحب فراش کے لیے اور زانی کے لیے سنگ ساری ہے۔"

اس حدیث میں بیان کردہ حکم عام ہے۔ یعنی کسی عورت کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ کوئی بھی عورت ہو، اگر اس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو بچے کا نسب اسی مرد سے ثابت ہوگا جس کے فراش میں وہ عورت ہے۔ اور جو زانی ہوگا اس کو سنگ سار کیا جائے گا۔

لیکن بعض فقہاء نے اس حدیث کے پس منظر سے لاعلمی کی وجہ سے اور اجتہاد کے ذریعے سے اس حدیث کے حکم سے مستفرشہ باندی کو خارج کر کے تعمیم میں تخصیص کر دی ہے۔ ان بعض فقہا کا کہنا ہے کہ اگر صاحب فراش مستفرشہ باندی سے پیدا

ہونے والے بچے کے نسب کا انکار کر دے تو اس کا انکار قبول کر لیا جائے گا۔ اور مستفرشہ باندی کے علاوہ باقی جتنی بھی خواتین ہیں، ان میں صاحب فراش کا انکار معتبر نہ ہوگا الا یہ کہ لعان کا حکم لگایا جائے۔ از مترجم)

⑥ اسباب نزول جاننے کا چھٹا فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے آیت کا ابہام مکمل طور پر دور ہو جاتا ہے اور علی وجہ الکمال تعیین کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ مروان بن الحکم نے تہمت لگاتے ہوئے کہا کہ یہ آیت:

﴿وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَاۤ﴾ (الاحقاف:۱۷)

"اور جس شخص نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ میں تم سے بیزار ہوں۔"

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ یعنی انھوں نے اپنے والدین سے یہ بات کہی تھی۔ تو اس موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مروان بن الحکم کی بات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا:

"اللہ کی قسم! اس آیت میں حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ مراد نہیں ہیں۔ اور اگر میں چاہوں تو نام لے کر بتا سکتی ہوں کہ اس آیت میں کون مراد ہے۔"

⑦ اسباب نزول جاننے کا ساتواں فائدہ یہ کہ اس کی وجہ سے آیات کو زبانی یاد رکھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کیونکہ اسباب کا مسببات کے ساتھ اور احکام کا حوادثات کے ساتھ بڑا گہرا ربط ہوتا ہے۔ نیز حوادثات و واقعات کے ساتھ اشخاص، ازمنہ اور امکنہ بھی متعلق ہوتے ہیں۔ لہٰذا اسباب نزول کے علم سے آیت کما حقہ اپنے تمام لوازمات کے ساتھ صرف سمجھ ہی نہیں آتی بلکہ ذہن میں راسخ ہو جاتی ہے۔

اسباب نزول جاننے کا بنیادی قاعدہ

کسی بھی آیت کا شان نزول جاننے کے لیے روایات صحیحہ کا ہونا ناگزیر ہے۔ احادیث صحیحہ کے بنا ہم کسی آیت کا شان نزول نہیں جان سکتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے امام واحدی رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((قَالَ اتَّقُوا الْحَدِیْثَ عَنِّیْ إِلَّا مَا عَلِمْتُمْ فَمَنْ كَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ وَمَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنِ بِرَأْیِهٖ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ)). (الترمذی:۲۹۵۱)

"جب تک تمھیں یقینی طور پر علم حاصل نہ ہو اس وقت تک میری جانب سے حدیث بیان کرنے سے بچو۔ کیونکہ جس نے جان بوجھ کر میری طرف کوئی جھوٹ بات منسوب کی، تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔"

قرآن کریم کے اسباب نزول کی بابت بجز ان لوگوں کی ہدایت اور سماعی بیان کے جنھوں نے قرآن کو بچشم خود دیکھا اور اسباب نزول میں درک پیدا کیا اور اس علم کی تحقیق کی ہے، کوئی دوسری بات کہنا ہرگز جائز نہیں۔

لہٰذا اسباب نزول کے باب میں صرف وہ ہی روایت مقبول ہوگی، جو کسی صحابی سے مروی ہو۔ صحابی کے علاوہ کسی اور کی روایت کو وہ تقویت نہیں ملے گی۔ کیونکہ صحابی کے قول میں کسی قسم کے اجتہاد کی گنجائش نہیں ہوتی۔ قول صحابی کا حکم مرفوع الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم

کا حکم رکھتا ہے۔ کیونکہ صحابی وہ ہستی ہے جس نے بنفس نفیس حضور اکرم ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل کیا۔ لہٰذا اس ہستی کے قول کو کسی غیر صحابی کے قول کی وجہ سے ردّ یا مرجوح قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اور وہ اسباب نزول جو حدیث مرسل کے واسطے سے نقل کیے گئے ہوں، یعنی ان کی سند میں کوئی صحابی ساقط ہو اور بیان کرنے والا تابعی ہو، تو اس وقت اس قول کو قبول نہیں کیا جائے گا اِلّا یہ کہ اس کی تائید میں کوئی اور حدیث مرسل موجود ہو اور اس کو روایت کرنے والے وہ ائمہ تفسیر ہوں جو براہِ راست صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اخذ کرتے ہیں۔ جیسے: مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہم۔

اسباب نزول بیان کرنے کی مختلف تعبیرات اور انداز

اسباب نزول بیان کرنے کے لیے مختلف الفاظ و تعبیرات اور انداز اپنائے گئے ہیں۔ مثلاً:

① بعض اوقات لفظ سبب استعمال کرتے ہوئے یوں کہا جاتا ہے: سَبَبُ نُزُوْلِ الْاٰیَةِ کَذَا .... یعنی فلاں آیت کے نزول کا سبب یہ ہے.... سبب کا لفظ استعمال کرنے والا انداز، اس آیت کی سببیت بیان کرنے میں عبارۃ النص کا درجہ رکھتا ہے۔ جس میں کسی قسم کے احتمال کی گنجائش نہیں۔

② آیت کا شانِ نزول سمجھاتے ہوئے کسی واقعے کو بیان کرنے سے پہلے لفظِ سبب کی بجائے حرف "فاء" استعمال کیا جاتا ہے۔ اس انداز سے بھی عبارۃ النص کے درجے میں سببیت پر دلالت ہوتی ہے۔ جیسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

کَانَتِ الْیَهُوْدُ تَقُوْلُ: ((مَنْ اَتَی امْرَاَةً مِّنْ دُبُرِهَا، فِیْ قُبُلِهَا، جَآءَ الْوَلَدُ اَحْوَلُ)). فَاَنْزَلَ اللّٰهُ:

﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۠ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝﴾ (البقرۃ: ۲۲۳)

"یہود یہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ پیچھے کے راستے سے اگلے حصے میں دخول کرتا ہے، تو اس کے ہاں بھینگا بچہ پیدا ہوگا۔

فانزل اللہ... پس اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی:

"تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔ تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ۔ اور اپنے لیے نیک عمل آگے بھیجو۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ ایک دن تمہیں اس کے روبرو حاضر ہونا ہے اور اے پیغمبر ﷺ! ایمان والوں کو بشارت سنا دو۔"

اس روایت میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حرف "فاء" استعمال کیا۔

③ لفظ سبب یا حرف فاء استعمال نہیں کیا جاتا، بلکہ سیاق و سباق ہی سے بہت واضح انداز میں یہ بات سمجھ آ رہی ہوتی ہے کہ اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے۔ اس کی مثال حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

((عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللہ عنه قال: کنت امشی مع النبی ﷺ بالمدینة، وهو یتوکأ علی عسیب، فمر بنفر من الیهود، فقال بعضهم: لو سألتموه فقالوا: حدثنا عن الروح. فقام ساعة ورفع رأسه فعرفت انه

یوحی الیه، حتی صعد الوحی، ثم قال:

﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (الاسراء:۸۵)

اس روایت میں لفظ "سبب" استعمال ہوا نہ ہی حرف "فاء" لیکن سیاق وسباق سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ آیت: ﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ﴾ کا شان نزول کیا ہے۔

اس تعبیر یا انداز سے بھی عبارۃ النص کے درجے میں سببیت پر دلالت ہوتی ہے۔

④ بعض اوقات لفظ "سبب"، حرف "فاء" یا سیاق وسباق کے بجائے آیت سے متعلق روایت نقل کرتے ہوئے: (نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ فِيْ كَذَا) کی طرح کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ یاد رہے یہ انداز یا تعبیر سببیت بیان کرنے میں عبارۃ النص کا درجہ نہیں رکھتی۔ بلکہ اس میں اور احتمال بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً: (نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ فِيْ كَذَا) سے مقصود یہ ہو کہ فلاں مسئلہ یا معاملہ اس آیت کے حکم کے تحت داخل ہے۔

ایک ہی موضوع میں مختلف تعبیرات پائے جانے کی صورتیں

(الف) اگر کسی ایک موضوع میں دو تعبیرات جمع ہو جائیں۔ ان میں سے ایک عبارۃ النص کا درجہ نہ رکھتی ہو، بلکہ محتمل ہو۔ تو عبارۃ النص کا درجہ رکھنے والی عبارت یا تعبیر وانداز کو ترجیح دی جائے گی۔ کیونکہ دلالت کے اعتبار سے محتمل سے نسبتاً نص کا درجہ قوی ہوتا ہے۔

مذکورہ اصول پر ذیل میں ایک مثال پیش کی جارہی ہے، جس میں ایک ہی آیت کے شان نزول کے بارے میں دو روایات جمع ہو گئی ہیں۔

(پہلی تعبیر) صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

كَانَتِ الْيَهُوْدُ تَقُوْلُ: ((مَنْ اَتَى امْرَاَةً مِّنْ دُبُرِهَا، فِيْ قُبُلِهَا، جَاءَ الْوَلَدُ اَحْوَلَ)). فَاَنْزَلَ اللهُ:

﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (البقرۃ: ۲۲۳)

(دوسری تعبیر) صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

قَالَ: اُنْزِلَتْ ﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ﴾ فِيْ اِتْيَانِ النِّسَاءِ فِيْ اَدْبَارِهِنَّ.

یہ آیت: ﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ﴾ عورتوں کے ساتھ پشت میں صحبت کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

ان دونوں تعبیرات میں سے پہلی تعبیر کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ وہ زیادہ مفصل اور صریح ہے۔ اور دوسری تعبیر کو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا استنباط قرار دیتے ہوئے کہا جائے گا کہ درحقیقت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پشت میں صحبت کرنا اس آیت کی رو سے جائز ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس آیت سے عورتوں کے ساتھ لواطت کرنے کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ (کیونکہ اس میں عورت کو کھیتی یعنی اولاد کی پیدائش کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے اور لواطت میں یہ ممکن نہیں۔)

(ب) اگر کسی ایک موضوع میں دو یا دو سے زیادہ تعبیرات جمع ہو جائیں۔ اوران تمام تعبیرات میں سے کوئی ایک بھی نص کا درجہ نہ رکھتی ہو۔ مثلاً ایک مفسر نے (نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ فِيْ كَذَا) کہا اور دوسرے مفسر نے (نَزَلَتْ فِيْ كَذَا) یا اس کے مثل کوئی بھی محتمل تعبیر استعمال کی، تو اس وقت یہ تمام تعبیرات آپس میں مساوی ہوں گی۔ اور وجہ ترجیح نہ پائے جانے کی وجہ سے کسی ایک تعبیر کو راجح قرار دیتے ہوئے اسے سبب نزول ماننا ممکن نہیں ہوگا۔ لہٰذا ان تمام تعبیرات میں سے کسی ایک کو بھی سبب نزول تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

(ج) اگر کسی ایک موضوع میں دو یا دو سے زیادہ تعبیرات جمع ہو جائیں۔ اور وہ تمام تعبیرات نص کا درجہ رکھتی ہوں تو.... یہ ایک مفصل بحث ہے جس کو ہم درج ذیل عنوان کے تحت بیان کر رہے۔

آیت ایک اور اسباب نزول متعدد

اگر موضوع یا آیت ایک ہو اور اس کے نزول سے متعلق دو روایات جمع ہو جائیں اور دونوں ہی نص کا درجہ رکھتی ہوں۔ یعنی صریح طور پر سبب بننے کی اہل ہوں، تو اس وقت چار صورتیں بنتی ہیں۔

① ان دونوں روایات میں سے کوئی ایک روایت سنداً صحیح ہوگی اور دوسری صحیح نہیں ہوگی۔

② دونوں ہی صحیح ہوں گی لیکن دونوں میں سے کسی ایک کو وجہ ترجیح کے سبب راجح اور دوسری کو مرجوع قرار دینا ممکن ہوگا۔

③ دونوں روایات صحیح ہوں لیکن وجہ ترجیح نہ پائے جانے کی وجہ سے کسی ایک کو راجح اور دوسری کو مرجوع قرار دینا ممکن نہیں ہوگا۔ لیکن دونوں روایات کو معاً تسلیم کرنا ممکن ہوگا۔

④ دونوں روایات صحیح ہوں، لیکن نہ ہی تو کوئی وجہ ترجیح پائی جائے اور نہ ہی دونوں کو معاً تسلیم کرنا ممکن ہو۔

مذکورہ بالا تمام صورتوں کو ذیل میں تفصیلاً بیان کیا جا رہا ہے۔

پہلی صورت ✿ اگر دونوں روایات میں سے صرف ایک روایت صحیح ہو تو صحیح روایت کو لے لیا جائے گا اور ضعیف یا موضوع وغیرہ کو ترک کر دیا جائے گا۔ مثلاً سورۃ الضحیٰ کی ابتدائی آیات:

﴿وَالضُّحٰى ۙ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ؕ﴾ (الضحیٰ: ۱-۳)

"(اے پیارے نبی ﷺ!) قسم ہے چڑھتے دن کی روشنی کی، اور رات کی جب اس کا اندھیر بیٹھ جائے۔ کہ تمہارے پروردگار نے نہ تمہیں چھوڑا ہے اور نہ ناراض ہوا ہے۔"

اس آیت کے سبب نزول میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ طبیعت ناساز ہونے کی بناء پر حضور اکرم ﷺ ایک یا دو راتیں نماز تہجد نہ پڑھ سکے۔ اس پر ایک کافر عورت نے یہ طعنہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے (معاذ اللہ) شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

دوسری روایت جس کو طبرانی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے حفص بن میسرہ کی نانی خولہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم ﷺ کی خادمہ تھیں۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ایک مرتبہ ایک کتے کا پلا حضور اکرم ﷺ کے گھر آ کر چارپائی

کے نیچے بیٹھ گیا اور وہیں اسے موت آ گئی۔ اس واقعہ کے چار دن تک آپ ﷺ پر وحی نازل نہ ہوئی۔ آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ اللہ کے رسول (ﷺ) کے گھر میں ایسی کیا بات ہوگئی ہے جو جبرئیل علیہ السلام میرے پاس نہیں آ رہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ مجھے گھر کی اچھی طریقے سے جھاڑو وغیرہ لگانی چاہیے۔ سو جب میں نے چارپائی کے نیچے جھاڑو ماری تو ایک پلاّ نکل آیا۔ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

مذکورہ دونوں روایات میں سے پہلی روایت کو صحیح ہونے کی وجہ سے ترجیح دی جائے گی۔ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
کتے کے پلّے کی وجہ سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے تشریف نہ لانے کا واقعہ مشہور تو ہے لیکن اس کو والضحیٰ والی آیات کا سبب نزول تسلیم کرنا صحیح نہیں۔ کیونکہ اس کی سند میں راوی مجہول ہیں لہٰذا قابل اعتماد شان نزول وہی ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مروی ہے۔

دوسری صورت ✪ اگر دونوں روایات ہی صحیح ہوں لیکن کسی ایک کو وجہ ترجیح کے سبب راجح اور دوسری کو مرجوع قرار دینا ممکن ہو۔ تو ایسی صورت میں راجح کو لے لیا جائے گا اور مرجوح کو چھوڑ دیا جائے گا۔ وجہ ترجیح کچھ بھی ہوسکتی ہے۔ مثلاً ایک روایت کی سند دوسری سے نسبتاً زیادہ قوی ہے۔ یا ایک کا راوی اس واقعہ کے وقت خود موجود تھا جب کہ دوسری کا راوی خود موجود نہیں تھا۔ تو ایسی صورت میں اس روایت کو اختیار کیا جائے گا جس کے حق میں وجہ ترجیح موجود ہے۔ مثلاً

ایک روایت ہے جو کہ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
میں ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ جا رہا تھا اور آپ ﷺ (لاٹھی کے طور پر) کھجور کی ایک شاخ کا سہارا لے کر چل رہے تھے۔ اتنے میں آپ ﷺ کا گزر کچھ یہودیوں کے پاس سے ہوا تو انہوں نے آپس میں کہا کہ حضور اکرم ﷺ سے کچھ سوالات پوچھنے چاہئیں۔ چنانچہ انھوں نے آ کر آپ ﷺ سے عرض کیا: "ہمیں روح کے بارے میں بتائیے۔" اس پر آپ ﷺ رک گئے اور تھوڑی دیر بعد آپ ﷺ نے سر اقدس اٹھایا، میں سمجھ گیا کہ آپ ﷺ پر وحی نازل ہو رہی ہے پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ...﴾ (الاسراء:۸۵)

"کہہ دیجیے روح میرے پروردگار کے حکم سے (بنی) ہے۔۔۔۔۔"

دوسری روایت وہ ہے جس کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ قریش مکہ نے یہودیوں سے کہا کہ ہمیں کوئی ایسی بات بتاؤ جو ہم ان (حضور اکرم ﷺ) سے پوچھ سکیں۔ اس پر یہودیوں نے کہا کہ ان سے روح کے بارے میں سوال کرو۔ یہودیوں نے حضور اکرم ﷺ سے روح کے بارے میں پوچھا تو یہ آیات:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾ (الاسراء:۸۵)

"اور (اے پیغمبر ﷺ) یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ (پس) آپ کہہ دیجیے کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے (بنی) ہے اور تمہیں جو علم دیا گیا ہے، وہ بس تھوڑا ہی سا علم ہے۔"

دوسری روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں اور ان کے نزول کا سبب قریش کا سوال کرنا تھا۔
لیکن یاد رہے یہ پہلی روایت زیادہ صریح ہے اور دو وجہ سے راجح ہے۔

پہلی وجہ ۞ پہلی روایت امام بخاری نے نقل کی ہے جب کہ دوسری روایت امام ترمذی نے اور یہ بات تو واضح ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جو روایت نقل کرتے ہیں وہ باقی تمام محدثین کی نقل کردہ روایات سے زیادہ صحیح ہوتی ہے۔

دوسری وجہ ۞ پہلی روایت کا راوی اس واقعے کے وقت خود موجود تھا اور وہ اپنی آنکھوں دیکھا واقعہ بیان کر رہا ہے جبکہ دوسری روایت میں ایسا نہیں۔ اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مشاہدے میں جو قوت پائی جاتی ہے وہ غیر مشاہدے میں نہیں پائی جاتی۔

تیسری صورت ۞ اگر دونوں روایات صحیح ہوں اور کوئی وجہ ترجیح بھی موجود نہ ہو لیکن ان دونوں کو معاً تسلیم کرنا اور جمع کرنا ممکن ہو تو ایسی صورت میں ان دونوں روایات کو اس ایک آیت کا شان نزول مان لیا جائے گا۔

اور ایک آیت کے دو یا دو سے زیادہ شان نزول مان لینے میں کوئی مانع موجود نہیں ہے کیونکہ عین ممکن ہے کہ دو تین واقعات زمانے کے اعتبار سے قریب قریب واقع ہوئے ہوں اور ان سب واقعات کے جواب میں ایک مرتبہ ایک ہی آیت نازل ہوگئی ہو اور وہ تمام واقعات وحادثات کا جواب بن گی اور وہ تمام واقعات اس ایک آیت کے لیے شان نزول بن گئے ہوں۔ ہماری اس بات کی تائید علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے:

((لا مانع من تعدد الاسباب)).

مثال ۞ (پہلی روایت) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ کے طریق سے نقل کیا ہے کہ حضرت ہلال بن اُمیہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی پر شریک بن سحماء کے ساتھ تہمت لگائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس پر گواہ لاؤ ورنہ تمہاری پیٹھ پر حد لگائی جائے گی۔ انھوں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم میں سے کوئی شخص اگر اپنی بیوی پر کسی دوسرے کو دیکھے گا تو گواہ ڈھونڈنے دوڑے گا؟

اور ایک روایت کے مطابق حضرت ہلال بن اُمیہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے۔ بے شک میں سچا ہوں اور ضرور بہ ضرور اللہ تعالیٰ میری پیٹھ کو حد سے بری کرنے کے لیے کچھ نازل فرمائیں گے۔ پس اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ ....﴾ (النور:۶،۷،۸،۹)

(دوسری روایت) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

حضرت عویمر رضی اللہ عنہ بن حارث حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ قبیلہ عجلان کے سردار تھے۔ انہوں نے آپ سے کہا کہ آپ لوگوں کا ایسے شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر مرد کو پالیتا ہے، کیا وہ اسے قتل کر دے؟ لیکن تم پھر اسے قصاص میں قتل کر دو گے! آخر ایسی صورت میں انسان کیا طریقہ اختیار کرے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق مجھے پوچھ کر بتایئے۔ چنانچہ عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (صورت مذکورہ میں خاوند کیا کرے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مسائل (میں سوال وجواب) کو ناپسند فرمایا۔ جب عویمر رضی اللہ عنہ نے عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انھوں نے بتا دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مسائل کو ناپسند فرمایا ہے۔ حضرت عویمر رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ کی قسم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود یہ مسئلہ پوچھوں گا۔ چنانچہ وہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ ایک غیر مرد کو دیکھتا ہے کیا وہ اس کو قتل کر دے؟ لیکن پھر قصاص میں اس کو قتل کیا جائے گا۔ ایسی صورت میں اسے کیا کرنا چاہیے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہارے اور تمہاری بیوی کے بارے میں قرآن کی آیت اتاری ہے۔ پھر آپ ﷺ نے انھیں قرآن کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق لعان کا حکم دیا ہے۔ اور عویمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کے ساتھ لعان کیا۔

یہ دونوں روایات صحیح ہیں۔ اور ان کو ایک دوسرے پر ترجیح دینے کے لیے کوئی وجہ ترجیح بھی موجود نہیں ہے۔ لہٰذا ایسی صورت حال میں حکم یہ ہوگا کہ ان دونوں روایات ہی کو ان آیات کا شان نزول مان لیا جائے کیونکہ عین ممکن ہے کہ یہ دونوں واقعات (حضرت ہلال رضی اللہ عنہ اور حضرت عویمر رضی اللہ عنہ والے واقعات) قریب قریب زمانے میں پیش آئے ہوں اور بایں طور پر کہ پہلے یہ ہی سوال حضرت ہلال رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا ہو پھر اس کے بعد حضرت عویمر رضی اللہ عنہ نے بھی یہ ہی سوال پوچھ لیا اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے جواب میں ایک ہی مرتبہ لعان والی آیات نازل فرما دیں۔

ان دونوں روایات پر ایک ساتھ عمل کرنا ممکن ہے کیونکہ ان میں کوئی تعارض نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا یہ جائز نہیں ہوگا کہ ہم ایک روایت کو اختیار کر لیں اور دوسری کو چھوڑ دیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی۔ لہٰذا دونوں روایات کو معاً اختیار کرنا ضروری ہوگا۔

امام الخطیب رحمۃ اللہ علیہ اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”شاید یہ دونوں واقعات اتفاقاً ایک ہی وقت میں پیش آئے ہوں۔“ اس موقع پر ایک اور امکان بھی ہے وہ یہ کہ آیات لعان حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کے پوچھنے پر نازل ہوئیں لیکن بعد میں حضرت عویمر رضی اللہ عنہ نے سوال پوچھا تو حضور اکرم ﷺ نے ان آیات لعان کو سامنے رکھتے ہوئے فتویٰ دے دیا جو حضرت ہلال رضی اللہ عنہ کے سوال کے جواب میں نازل ہوئی تھیں۔

علامہ ابن صباغ فرماتے ہیں: حضرت ہلال بن امیہ کے قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات لعان انہی کے سوال کے جواب میں نازل ہوئی تھیں۔ اب رہی یہ بات کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عویمر رضی اللہ عنہ سے یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے اور تیری بیوی کے بارے میں قرآن کی آیت اتاری ہے۔ تو وہ اس لیے فرمایا کہ آیات قرآنیہ سے حاصل ہونے والا حکم تو ساری انسانیت کے لیے عام ہے، جس میں حضرت عویمر رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔

چوتھی صورت ✿ کسی ایک آیت کے نزول کے بارے میں دو روایات موجود ہوں اور دونوں ہی صحت کے اعتبار سے مساوی ہوں۔ دونوں میں سے کسی ایک کے لیے وجہ ترجیح بھی موجود نہ ہو۔ لیکن دونوں روایات میں بیان کردہ واقعات میں زمانے کے اعتبار سے بہت زیادہ بعد پائے جانے کی وجہ سے دونوں پر معاً عمل کرنا ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں یہ حکم لگایا جائے گا کہ آیت تو ایک ہی ہے لیکن یہ واقعات اور اسباب کے متعدد ہونے کی وجہ سے متعدد اور مکرر یا کئی بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کر دی گئی۔ مثلاً ایک سبب پایا گیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک آیت نازل فرما دی پھر کچھ عرصہ بعد دوبارہ وہ ہی سبب پایا گیا تو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ سے وہ ہی آیت نازل فرما دی۔ اس حکم پر عمل کرنے سے دونوں یا متعدد روایات پر عمل ہو جائے گا۔ اور ایسا کرنے میں کوئی مانع بھی موجود نہیں ہے۔ جیسا کہ امام الزرکشی رحمۃ اللہ علیہ ”البرہان“ میں کہتے ہیں:

”بعض مرتبہ ایک آیت کسی معاملہ میں تعظیماً نازل ہوتی ہے پھر اسی معاملے کے مثل کوئی اور واقعہ پیش آنے پر تذکیراً نازل

کر دی جاتی ہے تا کہ اُسے یاد رکھا جائے اور بھولا نہ جائے۔"

خلاصہ یہ کہ ایک آیت کے نزول سے متعلق تمام احادیث یا روایات کو، آیت کا متعدد بار نازل ہونا تسلیم کر کے جمع کر لیا جائے گا۔اس کی مثال درج ذیل ہے۔

پہلی روایت ✿ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور امام بزار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے شہید ہونے کے بعد ان کی لاش کے پاس کھڑے ہوئے تھے اور حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش مثلہ کر دی گئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لاش سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"بے شک میں کفار میں سے ستر آدمیوں کو تمہارے عوض میں مثلہ بناؤں گا۔"

یہ کہنے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی اُسی جگہ کھڑے تھے کہ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام سورۃ النحل کی آخری تین آیات:

﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ....﴾ (النحل:۱۲۶)

"اگر تم ان کو تکلیف دینی چاہو تو اتنی ہی دو جتنی تکلیف تم کو ان سے پہنچی ہے....."

لے کر نازل ہوئے۔

دوسری روایت ✿ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: غزوۂ احد میں چونسٹھ (۶۴) انصاری اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سمیت چھ (۶) مہاجرین شہید ہوئے تھے۔ان سب کو مشرکین نے مثلہ بنا دیا تھا۔انصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب ان شہداء کی حالت دیکھی تو کہنے لگے:

"اگر ہم بھی کفار پر کسی معرکے میں فتح پائیں گے تو اس سے بدر جہا بڑھ کر برا سلوک ان کے مقتولین کے ساتھ کریں گے۔"

چنانچہ فتح مکہ کا دن آیا تو اللہ تعالیٰ نے آیات: ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ...﴾ نازل فرمائیں۔

پہلی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات غزوۂ احد کے موقع پر نازل ہوئیں اور دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے دن نازل ہوئیں۔حالانکہ غزوۂ اُحد اور فتح مکہ میں کئی سالوں کا فرق وفاصلہ ہے۔لہٰذا اب یہ کہنا بھی ممکن نہ ہو گا کہ پہلے ایک واقعہ پیش آیا اور پھر اس کے فوراً بعد ہی دوسرا واقعہ پیش آ گیا اور اللہ تعالیٰ نے دونوں واقعات کے جواب ایک ہی آیت نازل فرما دی۔اس وقت ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ ہم یہ تسلیم کر لیں کہ یہ آیت متعدد بار نازل ہوئی ہے، ایک مرتبہ غزوۂ احد کے موقع پر اور ایک مرتبہ فتح مکہ کے موقع پر۔

بعض علما کا کہنا ہے کہ یہ آیات دو نہیں بلکہ تین مرتبہ نازل ہوئیں۔ایک مرتبہ تو ہجرت سے پہلے یہ پوری مکمل سورت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی کیونکہ یہ سورت مکی ہے۔پھر اس سورت کی صرف یہ آخری آیات دوسری مرتبہ غزوۂ احد کے موقع پر اور تیسری مرتبہ فتح مکہ کے دن نازل ہوئیں۔

اور بعض علماء کا کہنا ہے کہ آخری تین آیات کے علاوہ سورۃ النحل پوری کی پوری مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکی تھی۔لیکن اس کی آخری تین آیات ہجرت کے بعد نازل ہونے کی وجہ سے مدنی ہیں۔پس ان کے نزدیک ان آیات کا نزول تین کے بجائے دو مرتبہ مانا جائے گا۔

(ف) مذکورہ قول سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ ممکن ہے کہ ایک سورت مکی ہو لیکن اس کی کچھ آیات مدنی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک سورت مدنی ہو لیکن اس کی کچھ آیات مکی ہوں۔

اعتراض ایک آیت جب ایک مرتبہ نازل ہو چکی تھی اور وہ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یاد بھی تھی تو پھر دوبارہ سے اُسی آیت کو نازل کرنے کا کیا فائدہ؟ اور اگر اسی آیت کی طرف دوبارہ متوجہ کرنا تھا تو نازل کیے بغیر بھی تو متوجہ کیا جا سکتا تھا؟

جواب ایک ہی آیت کے تکرار نزول میں سب سے بڑی حکمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو متنبہ کرنا ہے۔ نیز ان وصایا اور فوائد کی طرف متوجہ کرنا ہے جن کی ہمیں بہت زیادہ حاجت ہوتی ہے۔ سورۃ النحل کی ان آخری آیات ہی کو لے لیجیے۔ کہ ان آیات کے تکرار نزول میں درج ذیل حکمتیں اور مقاصد پوشیدہ ہیں: بندوں کو اس امر پر متنبہ کرنا کہ جب تمہارا کسی سے معاملہ ہو تو انصاف کو مدنظر ضرور رکھو کہیں جذبات یا انتقام کی بنا پر حد سے تجاوز نہ کر بیٹھنا۔ غصے کے وقت بھی اپنے اوپر قابو رکھنا۔ مخلوق سے قصاص لیتے ہوئے خالق کو ذہن میں رکھنا۔ صبر و استقامت پر عمل پیرا رہنا۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھنا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کا یقین رکھنا۔ اور یہ تمام باتیں اس کے لیے ہیں جو اللہ سے ڈرتا ہے اور اپنے اعمال کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی ہمیں ان لوگوں میں شمار کر لے۔ آمین۔

آیات متعدد اور سبب نزول واحد

مذکورہ بالا صورتوں کے برعکس، بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ متفرق، متعدد آیات کے نزول کا ایک ہی سبب بیان ہوتا ہے اور اس بات میں کوئی اشکال نہیں ہے اور ایسا کرنا لوگوں کی تذکیر و نصیحت کے لیے منافی نہیں ہے۔ بلکہ یہ طریقہ تو وعظ و نصیحت کے لیے زیادہ ابلغ اور اظہر فی البیان ہے۔

سبب ایک ہو اور نازل ہونے والی آیات متعدد ہوں، اس کی دو مثالیں ذیل میں مذکور ہیں۔

① **مثال** ✿ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

رسول اللہ ﷺ ایک درخت کے سایے میں تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ نے ہم سے فرمایا ابھی تمہارے پاس ایک آدمی آئے گا جو تمہاری طرف شیطان کی دو آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ پس جب وہ تمہارے پاس آئے تو تم اس سے کلام مت کرنا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک آدمی نمودار ہوا جس کی دونوں آنکھیں نیلی تھیں۔ آپ ﷺ نے اُسے اپنے پاس بلوایا اور فرمایا تو اور تیرے ساتھی مجھے بُرا کیوں کہتے ہیں؟ (اُس آدمی نے انکار کیا کہ ایسا نہیں) پس وہ آدمی چلا گیا اور اپنے ساتھیوں کو حضور اکرم ﷺ کے پاس لے کر آیا۔ وہ سب حضور اکرم ﷺ کے سامنے قسمیں کھانے لگے کہ ہم نے آپ کو بُرا نہیں کہا۔ وہ قسمیں کھاتے رہے یہاں تک آپ ﷺ نے ان سے درگزر فرمایا۔ پس اُس موقع پر درج ذیل آیات نازل ہوئیں:

﴿يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَ لَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَ مَا

نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَ اِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ مَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾ (التوبۃ: ۷۴)

"یہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے تو کچھ نہیں کہا حالاں کہ انھوں نے کفر کا کلمہ کہا ہے اور یہ اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے ہیں اور ایسی بات کا قصد کر چکے ہیں جس پر قدرت نہیں پا سکے۔ اور انہوں نے مسلمانوں میں عیب ہی کون سا دیکھا ہے سوائے اس کے کہ اللہ نے اپنے فضل سے اور اس کے پیغمبر ﷺ نے اپنی مہربانی سے ان کو دولت مند کر دیا ہے۔ سو اگر یہ لوگ توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہوگا اور اگر منہ پھیر لیں تو اللہ ان کو دنیا اور آخرت میں دکھ دینے والا عذاب دے گا اور زمین میں ان کا کوئی دوست اور مددگار نہ ہوگا۔"

اس واقعے کو ابن جریر الطبری، علامہ طبرانی اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے اپنی اپنی کتب میں نقل کیا ہے۔

اسی واقعے کو امام حاکم رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ نے بھی نقل کیا ہے لیکن وہ اس واقعے کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیات نازل فرمائیں:

﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾﴾ (المجادلہ: ۱۸، ۱۹)

"جس دن اللہ ان سب کو جلا اٹھائے گا تو جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں اسی طرح اس کے سامنے بھی قسمیں کھائیں گے اور خیال کریں گے کہ ایسا کرنے سے کام چل جائے گا۔ سو یہ ہی تو ہیں جھوٹے۔ شیطان نے ان کو قابو میں کر لیا ہے اور اللہ کی یاد ان کو بھلا دی ہے۔ یہ لوگ شیطان کا ٹولہ ہیں اور سن رکھو کہ شیطان کا ٹولہ ہی نقصان اٹھانے والا ہے۔"

فائدہ ❁ مثال میں واضح ہے کہ واقعہ یا شانِ نزول ایک ہی ہے جب کہ آیات متعدد ہیں۔

② **مثال** ❁ پہلی مثال میں سبب نزول ایک اور آیات دو، ہوں کا نمونہ پیش کیا گیا۔ اب دوسری مثال میں سبب نزول ایک اور آیات دو سے زیادہ، ہوں کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔ دیکھیے:

① امام ترمذی رحمہ اللہ اور امام حاکم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے: حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ ﷺ! میں نے ہجرت کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے عورتوں کا بالکل بھی ذکر نہیں سنا۔" پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾﴾ (آل عمران: ۱۹۵)

"تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کر لی (اور فرمایا) کہ میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو مرد ہو یا عورت ضائع

نہیں کرتا۔ تم ایک دوسرے کی جنس ہو تو جو لوگ میرے لیے وطن چھوڑ گئے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور لڑے اور قتل کیے گئے میں ان کے گناہ دور کر دونگا اور ان کو بہشتوں میں داخل کرلوں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ (یہ) اللہ کے ہاں سے بدلا ہے اور اللہ کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔"

② امام حاکم ہی مستدرک میں اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں: اُم المومنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم مردوں کا تو ذکر فرماتے ہیں عورتوں کا ذکر نہیں فرماتے۔ تو اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ...﴾ (الاحزاب:۳۵)

"(جو لوگ اللہ کے آگے سر اطاعت خم کرنے والے ہیں یعنی) مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں....."

اور یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ ...﴾ (آل عمران:۱۹۵)

"کہ میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کرتا....."

③ امام حاکم ہی اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں: حضرت اُم المومنین اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

"مرد جہاد کرتے ہیں اور عورتیں جہاد نہیں کرتیں اور عورتوں کے لیے میراث میں سے بھی نصف حصہ ہے۔" تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آیات نازل فرمائیں:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ......﴾ (النساء:۳۲)

"اور جن چیزوں میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضلیت دی ہے ان کی تمنا نہ کرو۔ مرد جو کچھ کمائی کریں گے ان کو اس میں سے حصہ ملے گا اور عورتیں جو کچھ کمائی کریں گی ان کو اس میں سے حصہ ملے گا۔"

اور آیات نازل فرمائیں:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ...﴾ (الاحزاب:۳۵)

"(جو لوگ اللہ کے آگے سر اطاعت خم کرنے والے ہیں یعنی) مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں....."

آیت کے اَلفاظ اور سببِ نزول کا عموم و خصوص

یہ بحث بہت اہم ہے کیوں کہ اس پر اَخذِ احکام کا دار و مدار ہے اسی لیے علمائے اصولیین نے اس بحث کو مستقلاً ذکر کیا ہے۔

ہم یہاں پر اس بحث کا خلاصہ ذکر کریں گے۔

جان لیجیے! کسی سوال یا سبب کے جواب میں وارد ہونے والا لفظ دو قسم کا ہوگا۔

(۱) وہ لفظ مستقل ہوگا۔ یعنی پوچھے جانے والے سوال یا سبب کی جانب نظر کیے بغیر بھی مفید ہوگا۔

(۲) یا وہ لفظ غیر مستقل ہوگا۔ یعنی جب تک سبب یا سوال کی طرف نظر نہ کی جائے اُس وقت تک وہ لفظ مفید نہیں ہوگا۔

غیر مستقل پس وہ جواب یا وہ لفظ جو غیر مستقل ہو اُس کا حکم یہ ہے کہ وہ اُصولیین کے نزدیک بالاتفاق اپنے عموم اور خصوص میں برابر ہوگا۔

پس اگر کوئی سائل کہے: "هَلْ يَجُوْزُ الْوُضُوْءُ بِمَآءِ الْبَحْرِ ؟" (کیا سمندر کے پانی سے وضو کرنا جائز ہے؟) تو اس کے جواب میں کہا جائے: "نَعَمْ" (ہاں) یا "يَجُوْزُ" (جائز ہے)۔ اس وقت اس جواب کا معنی ہوگا کہ ہاں! ہر ایک کے لیے سمندر کے پانی سے وضو کرنا جائز ہے۔ یعنی یہ سائل کے ساتھ خاص نہ ہوگا بلکہ اس جواب میں ہر وہ شخص داخل ہوگا جو سمندر کے پانی سے وضو کرنا چاہے۔ اس لیے کہ اس سوال میں مطلقاً جواز کا استفہام ہے نہ کہ متکلم کی خصوصی حالت کا۔ پس اس لیے یہ جواب غیر مستقل ہوگا کیوں کہ جب تک اس جواب کے ساتھ سوال کو نہ جوڑا جائے اُس وقت تک یہ جواب مفید نہیں۔

اور اگر کوئی سائل کہے: "آتوضأت بماء البحر ؟" (کیا میں سمندر کے پانی سے وضو کرسکتا ہوں؟) تو اس کے جواب میں کہا جائے: "يُجْزِئُكَ" (تیرے لیے جائز ہے) اس وقت اس جواب کا معنی ہوگا کہ سمندر کے پانی سے وضو کرنا صرف سائل کے لیے جائز ہے۔ کیوں کہ سوال خاص متکلم کے بارے میں تھا۔ یاد رہے یہ جواب بھی غیر مستقل ہی ہے کیوں کہ یہ جواب بھی بغیر سوال کے مفید نہیں ہوگا۔ نیز اس جواب سے غیر متکلم کے لیے کوئی حکم سمجھ میں نہیں آئے گا بلکہ کسی دوسری دلیل مثلاً قیاس یا حدیثِ رسول ﷺ کی ضرورت پیش آئے گی۔ حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ((حُكْمِيْ عَلَى الْوَاحِدِ حُكْمِيْ عَلَى الْجَمَاعَةِ))۔ اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ جو حکم کسی ایک کے لیے ہوگا وہ ہی حکم پوری جماعت کے لیے ہوگا۔

پس یہ دونوں جواب ہی غیر مستقل ہیں کیوں کہ یہ بدون سوال مفید نہیں۔

(ف) علمائے اصولِ حدیث کے نزدیک اس حدیث: ((حکمی علی الواحد حکمی علی الجماعة)). کی کوئی اصل موجود نہیں ہے۔ جیسا کہ علامہ الحافظ العراقی نے وضاحت کی ہے۔ نیز امام مزی اور علامہ ذہبی سے بھی، جب اس حدیث کی بابت پوچھا گیا تو دونوں نے انکار کردیا کہ یہ حدیث نہیں ہے۔ ①

مستقل پس وہ لفظ یا جواب جو مستقل ہو، وہ عام یا خاص ہونے میں بعض اوقات سبب کے مثل ہوگا۔ یعنی اگر سبب یا سوال عام ہے تو جواب بھی عام ہوگا اور اگر سبب یا سوال خاص ہے تو جواب بھی خاص ہوگا اور اس وقت اس کا حکم بھی سوال کے مساوی ہوگا۔ پس اگر لفظ عام ہے تو وہ حکم میں اپنے سبب عام کے تمام اَفراد کو شامل ہوگا اور اگر لفظ خاص ہے تو وہ حکم میں اپنے سببِ خاص کے شخصِ معین کے ساتھ مقصور اور مختص ہوگا۔ یعنی اس میں کوئی اور شامل نہ ہوگا۔ مستقل جواب کی ان دونوں صورتوں میں علمائے اصولیین کا اتفاق ہے۔ کیوں کہ سبب اور جواب (آیت) کے الفاظ میں برابری ہے۔ یا تو دونوں ہی عام ہیں یا دونوں ہی خاص ہیں۔

① الدرر المنتثرة۔ ص ۱۳۲

پہلی صورت یعنی سبب اور آیت دونوں عام ہوں:

اس صورت کی مثالیں سورۂ آلِ عمران میں بکثرت ملتی ہیں جو غزوۂ بدر اور غزوۂ اُحد کے سلسلے میں نازل ہوئیں۔ مثلاً:

﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ (آل عمران:۱۳۹)

"اور سستی نہ کرو اور غمگین نہ ہو اور اگر تم کامل مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔"

یہ آیت بالعموم اہلِ اُحد کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ اس کے الفاظ عام ہیں اور اپنے سبب عام کے تمام اُفراد کو شامل ہیں۔

دوسری صورت یعنی سبب اور آیت دونوں خاص ہوں:

سورۃ الیل میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَشْقَى ۝ الَّذِي يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرَى ۝ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى ۝ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى ۝ بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَى ۝﴾ (الیل:۱۱-۱۷)

"اور سب سے بڑے متقی کو جہنم سے بہت دور رکھا جائے گا۔ جو حصولِ پاکیزگی کے لیے اپنا مال راہِ الٰہی میں خرچ کرتا ہے۔ اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے۔ اس کا مال خرچ کرنا صرف اپنے ربِّ اعلیٰ کی رضا جوئی کے لیے ہے۔ اور وہ عنقریب راضی ہوگا۔"

تفسیر جلالین میں ہے: یہ آیات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں اُس وقت نازل ہوئیں جب انھوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خرید کر آزاد کیا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ایمان لانے کی وجہ سے سخت تکالیف دی جاتی تھیں۔ اُس موقع پر کفار نے کہا: ضرور بلال نے پہلے ابوبکر پر کوئی احسان کیا ہوگا جس کا بدلہ اُتارنے کے لیے ابوبکر نے ان کو آزاد کروایا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کفار کے قول کے ردّ میں یہ آیات نازل فرمائیں کہ کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کا ابوبکر پر کوئی دنیاوی احسان ہو جس کا بدلہ دیا جا سکے۔ ان کا یہ عمل تو محض اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہے۔

اس مثال (آیت) میں "اَلْاَتْقٰی" سے بلا شرکتِ غیرے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی مراد ہیں۔ اس تخصیص کی دلیل "الاتقٰی" کا لفظ ہے۔ "اَلْاَتْقٰی" الف لامِ عہد کے ساتھ ہے جو کہ صرف ایک ہی شخص کے لیے استعمال ہو سکتا ہے اور اَحادیث سے ثابت ہے کہ وہ شخص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ یعنی اس الف لامِ عہد کے معہود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔

مستقل جواب کی مزید دو صورتیں

ماقبل آپ جان چکے ہیں کہ جو جواب مستقل ہو وہ عام یا خاص ہونے میں اپنے سبب کی مثل ہوتا ہے اور اس وقت دو صورتیں بنتی تھیں اور دونوں صورتیں بھی آپ تفصیل سے پڑھ چکے۔ الآن آپ پڑھیں گے کہ وہ جواب جو مستقل ہو، بعض اوقات عام اور خاص ہونے میں اپنے سبب کی مثل نہیں ہوتا۔ اس وقت بھی اس کی دو صورتیں بنتی ہیں۔

پہلی صورت یعنی سببِ عام اور جوابِ خاص

سبب عام ہو اور جواب خاص ہو۔ یہ صورت محض عقلی اور فرضی ہے۔ نیز اس کی کوئی مثال قرآنِ مجید میں موجود نہیں

ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی اس سے پاک ہے کہ وہ ایسا قاصر جواب جاری کرے جو اپنے سبب یا سوال کے تمام اَفراد کو ہی شامل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا کلام تو ہمیشہ سے جامع اور مانع ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سوال یا سبب تو عام ہو اور اس کا جواب خاص ہو۔ قرآنِ کریم اپنی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے ایسی مثالوں سے خالی اور مبرا ہے۔

اس صورت کی اگر فرضی مثال بنائی جائے تو یوں بن سکتی ہے کہ ایک سائل نے سوال پوچھا:

هَلْ يَجُوْزُ لِجَمَاعَةِ الْمُسْلِمِيْنَ اَنْ يُّدَافِعُوْا عَنْ اَنْفُسِهِمْ وَيُقَاتِلُوْا مَنْ قَاتَلَهُمْ ؟

”کیا تمام مسلمانوں کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنا دفاع کریں اور جو مسلمانوں سے قتال کرے، مسلمان اُس سے قتال کریں؟“

تو جواب دینے والا اُس کو جواب دے:

لَكَ اَنْتَ اَنْ تُدَافِعَ عَنْ نَفْسِكَ وَتُقَاتِلَ مَنْ قَاتَلَكَ.

”تیرے لیے جائز ہے کہ تو صرف اپنی ذات کا دفاع کرے اور جو تجھ سے قتال کرے تو اُس سے قتال کرے۔“

اس مثال سے واضح ہے کہ سوال پوچھنے والے نے سوال عام پوچھا تھا اور جواب دینے والے نے جواب خاص دیا۔ لہٰذا سببِ عام کے مقابلے میں جوابِ خاص لانا کسی انسان سے تو ممکن ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات سے ممکن نہیں۔ اس لیے قرآنِ کریم میں اس صورت یعنی سببِ عام اور جوابِ خاص کی مثال ملنا محال ہے۔

دوسری صورت یعنی سببِ خاص اور جوابِ عام

دوسری صورت پہلی صورت کے برعکس ہے یعنی سبب خاص ہو اور اس کی وجہ سے نازل ہونے والا لفظ یا جواب عام ہو۔ یا یوں کہہ لیں کہ جواب اعم ہو سبب سے۔ یا یوں کہہ لیں کہ سبب اخص ہو جواب کے اَلفاظ سے۔ یہ صورت عقلی اعتبار سے بالکل جائز و درست ہے کیوں کہ اس میں کوئی مضائقہ یا کجی نہیں ہے، بلکہ خاص سبب کے مقابلے میں اَلفاظ کے عموم کے ساتھ جواب دینا تو غایت و مقصود کے زیادہ قریب کر دیتا ہے۔

اس موقع پر علما کا آپس میں اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ جواب کا عام ہونا معتبر ہے یا سبب کا خاص ہونا۔ جمہور کہتے ہیں: ”اَلْعِبْرَةُ بِعُمُوْمِ اللَّفْظِ لَا بِخُصُوْصِ السَّبَبِ“ یعنی ”خاص سبب کی بجائے لفظ کے عام مفہوم کو معتبر سمجھا جائے گا۔“ لہٰذا اس کا حکم شامل ہوگا جواب یا لفظ کے تمام اَفراد کو۔ (یعنی اگر کوئی آیت کسی خاص سبب کی وجہ سے نازل ہوئی لیکن اس کے اَلفاظ عام ہیں تو وہ اس سبب سمیت ان تمام اَفراد کو شامل ہے جو اس لفظ کے تحت آ سکتے ہیں۔ کیوں کہ قرآن مجید پوری امت کے لیے ایک عام شریعت کے طور پر نازل ہوا ہے۔ لہٰذا اعتبار ”عمومِ لفظ“ کا کیا جائے گا، نہ کہ ”خصوصِ سبب“ کا۔) برابر ہے کہ وہ سبب کے اَفراد میں سے ہو یا نہ ہو۔ جب کہ غیر جمہور کا کہنا ہے کہ سبب کے خاص ہونے کا اعتبار کیا جائے گا۔

اس اختلاف کو اس مثال سے سمجھیے کہ جب حضرتِ ہلال بن امیہؓ اور ان کی اہلیہ کا معاملہ پیش آیا تو اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیات نازل فرمائیں:

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝﴾ (النور:٦)

"اور جو لوگ اپنی بیویوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں اور خود ان کے سوا اور (کوئی) گواہ نہ ہوں تو ہر ایک کی شہادت یہ ہے کہ پہلے تو چار بار اللہ کی قسم کھائے کہ بے شک وہ سچا ہے۔"

ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ سبب خاص ہے یعنی حضرتِ ہلال رضی اللہ عنہ بن امیہ کا اپنی بیوی پر تہمت لگانا۔ لیکن اس کے جواب میں لفظِ عام کے ساتھ آیت نازل ہو رہی ہے۔ آیت میں لفظِ عام "اَلَّذِیْنَ" ہے، جو کہ اسمِ موصولہ ہے اور اسمِ موصولہ عموم کے صیغوں میں سے ہے۔ تحقیق اس آیت سے حکمِ ملاعنت بغیر کسی تخصیص کے ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ حکم تمام ان قاذفین کے افراد کو عموم کے ساتھ شامل ہے جنھوں نے اپنے علاوہ کسی اور کو گواہ نہ پایا ہو۔ برابر ہے کہ وہ ہلال رضی اللہ عنہ بن امیہ جو کہ صاحب سبب ہیں، ہوں، یا ان کے علاوہ کوئی اور ہو۔ اور ہمیں یہاں ہلال بن امیہ کے علاوہ کسی اور کی ذات پر یہ حکم لاگو کرنے کے لیے کسی بھی قسم کی دلیل یا قیاس کی ضرورت نہیں، کیوں کہ یہ آیت عموم کے ساتھ اس معاملے میں نص ہے۔ اور یہ بات طے شدہ ہے کہ نص کے ہوتے ہوئے کسی قیاس یا اجتہاد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پس یہ ہے جمہور کا مذہب۔

غیرِ جمہور کا مذہب ہے: "اِنَّ الْعِبْرَةَ بِخُصُوْصِ السَّبَبِ" یعنی سبب کے خاص ہونے کو معتبر سمجھا جائے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ آیت کے اَلفاظ اسی حادثے کے ساتھ مقصور ہوں گے جس کی سبب سے وہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ اور رہی بات اس حادثے کے مثل دیگر واقعات کی، تو ان کے حکم کو اس آیت کے ذریعے سے معلوم نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کو معلوم کرنے کے ایک نئی دلیل کی ضرورت ہوگی۔ اور وہ نئی دلیل قیاس بھی ہو سکتی ہے یا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول: "حُكْمِيْ عَلَى الْوَاحِدِ حُكْمِيْ عَلَى الْجَمَاعَةِ" بھی ہو سکتی ہے۔ پس آیتِ قذف جو کہ حضرتِ ہلال رضی اللہ عنہ بن امیہ کے حادثے کے وجہ سے نازل ہوئی تھی وہ حضرت ہلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہوگی۔ اور اگر اس طرح کا واقعہ کسی اور کے ساتھ پیش آئے تو اس کا حکم آیتِ قذف سے معلوم کرنے کی بجائے اس آیت پر قیاس کرتے ہوئے معلوم کیا جائے گا یا پھر حدیثِ مذکور پر عمل کرتے ہوئے معلوم کیا جائے گا۔

اس موقع پر ایک بات قابلِ لحاظ ہے وہ یہ کہ مذکورہ اختلاف صرف اس صورت میں ہے کہ جب آیت کے اَلفاظ کی تخصیص پر کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔ اگر کوئی قرینہ موجود ہو تو بالاجماع وہ حکم اس سبب کے ساتھ مقصور اور مخصوص ہوگا۔

جمہور اور غیرِ جمہور کے اسی اختلاف کی طرف علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی جانب سے بھی اِشارہ ملتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "اس باب میں علمائے تفسیر کے بہت سے اَقوال ملتے ہیں۔ مثلاً: هٰذِهِ الْاٰيَةُ نَزَلَتْ فِيْ كَذَا.... یعنی یہ آیت فلاں معاملے میں نازل ہوئی، خاص طور پر اگر کوئی شخصیت بھی مذکور ہو۔ جیسا کہ:

① ((اِنَّ اٰية الظهار نزلت فی امرأة قیس بن ثابت)).

"بے شک آیتِ ظہار قیس بن ثابت کی بیوی کے معاملے میں نازل ہوئی۔"

② ((اِنَّ اٰية الكلالة نزلت فی جابر بن عبداللّٰه)).

"بے شک آیتِ کلالہ جابر بن عبداللہ کے معاملے میں نازل ہوئی۔"

③ ((اِنَّ اٰية قوله: ﴿وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ نزلت فی بنی قریظة والنضیر)).

"بے شک اللہ تعالیٰ کا یہ قول یعنی یہ آیت: ﴿وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ بنو قریظہ اور بنو نضیر کے معاملے میں نازل ہوئی۔"

اسی طرح اور بھی بہت سی نظائر ہیں جن میں وہ کسی ایک شخص کی بجائے پوری قوم کا ذکر کرتے ہیں۔ جیسا کہ کہتے ہیں: "اِنَّہٗ نَزَلَ فِیْ قَوْمٍ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ بِمَکَّۃَ"۔ اَوْ.. "فِیْ قَوْمٍ مِّنَ الْیَهُوْدِ وَالنَّصَارٰی"۔ اَوْ.. "فِیْ قَوْمٍ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ"

الغرض وہ کسی ایک شخص کا ذِکر کریں یا کسی قوم کا، اُن کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اس آیت کا حکم صرف اس شخص یا قوم کے ساتھ خاص ہے کوئی اور اس حکم میں داخل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ان کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ اس آیت کا حکم اس خاص شخص یا قوم کی نوع کے ساتھ خاص ہے۔ پس وہ آیت جس کا کوئی سبب معیّن ہو، چاہے وہ آیت امر کی صورت میں ہو یا نہی کی، وہ شامل ہوگی اس خاص شخص کو بھی اور اس کے علاوہ ہر اس شخص کو بھی جو اس کے منزلہ میں ہو۔"

ثمرۂ اختلاف

اس اختلاف کا ثمرہ دو طرح سے ظاہر ہوسکتا ہے۔

① جمہور کے نزدیک آیت کا حکم اپنے سبب کے اَفراد کے علاوہ پر بھی ثابت ہوگا اور اس کا ثبوت اسی نازِل ہونے والی نص سے استدلال کرتے ہوئے ہوگا۔ اور یہ نص اتفاقی طور پر قطعی المتن ہوگی۔ اور بسا اوقات قطعی الدلالت بھی ہوسکتی ہے۔ اور رہی بات غیرِ جمہور کی، تو ان کے نزدیک سبب کے افراد کے علاوہ پر آیت کا حکم لگانے کے لیے آیت یا نص ہی سے دلیل نہیں پکڑی جائے گی بلکہ قیاس یا حدیثِ معروف کا سہارا لیا جائے گا۔ اور یہ دونوں غیرِ قطعی ہیں۔

② جمہور کے نزدیک غیرِ سبب کے تمام اَفراد حکم میں شامل ہوں گے، جب تک کہ لفظ اُن کو شامل رکھے۔ اور غیرِ جمہور کے نزدیک حکم ثابت نہیں ہوگا مگر ان اَفراد کے لیے جو قیاس کی شرائط پر پورا اُتریں۔

"اَلْعِبْرَۃُ بِعُمُوْمِ اللَّفْظِ" یعنی لفظ کے عموم کے معتبر ہونے، اور سبب کے خصوص کے غیرِ معتبر ہونے پر علمائے جمہور کے تین دلائل ملاحظہ کیجیے۔

پہلی دلیل

شارع علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے نکلنے والا لفظ بذاتِ خود حجت اور دلیل ہے خواہ وہ سوال یا سبب کا اِحاطہ کرنے والا نہ ہو۔ لہٰذا اب سبب کی وجہ سے لفظ کو خاص ماننے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ نیز ہم کیسے اس چیز کو جو شریعت میں حجت نہیں ہے، تخصیص کی وجہ سے مضبوط (اور معتبر) مان لیں، اُس چیز کے مقابلے میں جو شریعت میں حجت ہے؟ (یعنی لفظ، جو کہ شریعت میں حجت ہے، کے مقابلے میں سوال یا سبب جو کہ شریعت میں حجت نہیں ہے، کو تخصیص کی وجہ سے معتبر یا مستحکم و مضبوط کیسے مان لیا جائے؟ کیوں کہ مستحکم و مضبوط تو اس کو ماننا چاہیے جو شریعت میں حجت ہو۔)

شارع علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے نکلنے والا لفظ بذاتِ خود حجت ہے، اس بات کی دلیل یہ ہے کہ بعض اوقات آپ علیہ السلام کسی حکمت کے مدِّنظر سوال کو نظر انداز فرماتے ہوئے سوال کے اُسلوب سے ہٹ کر جواب اِرشاد فرماتے تھے۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ، آیت ۲۱۵ میں ہے:

﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ؕ﴾ (البقرۃ: ۲۱۵)

"(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) وہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجیے کہ جو مال بھی تم خرچ کرو، وہ والدین، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہونا چاہیے۔"

پس آیت کے ظاہر سے معلوم ہو رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا تھا کہ وہ کیا خرچ کریں۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی جانب سے جواب آیا کہ وہ کہاں خرچ کریں۔ (یعنی نبی کریم ﷺ سے مصروف کی بابت پوچھا گیا تھا لیکن آنحضرت ﷺ نے مصارف بیان فرمائے۔) اور یہ اندازِ جواب کسی حکیم و دانا کا ہی ہو سکتا ہے، کیوں کہ نفقہ وصدقہ کے مصارف کی معرفت زیادہ اہم ہے، ان دونوں (نفقہ وصدقہ) کے مصروف کی معرفت کی اہمیت سے۔ نیز انسانی فلاح و بہبود کے لیے یہ ضروری ہے کہ نفقہ وصدقہ ان کے حقیقی مستحقین تک پہنچے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جب لوگوں کو مصارف کی اہمیت معلوم ہو۔ یہ وجہ تو وہ ہے جو واضح طور پر اس آیت سے معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس آیت میں "مِنْ خَيْرٍ" کے اَلفاظ سے بڑے خفیف اِشارے کے ساتھ یہ بھی بتادِیا گیا کہ وہ کیا خرچ کریں۔ (اور واضح انداز میں مصارف بھی بیان کردیے گئے) نہیں تو اس اجمالی (خفیف) اِشارے سے سوال کی حاجت پوری نہ ہوتی۔

جمہور کی دلیلِ اوّل کو (قیاسِ منطقی کے ذریعے) منطقی دلیل کے پیرائے میں بھی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ (جس کی تفصیل یہ ہے کہ قیاسِ منطقی کی دو اقسام ہیں۔ پہلی اقترانی اور دوسری استثنائی ہے۔ قیاسِ اقترانی وہ قیاس ہے جو دو ایسے قضیوں سے مل کر بنا ہو، جن کو ماننے سے تیسرے قضیے کو ماننا لازم ہو جائے۔ اور پہلے دونوں قضیوں کے درمیان میں کوئی حرفِ استثناء مثلاً: لٰكِنْ (لیکن)، بَلْ (بلکہ) یا اِلَّا (مگر/سوائے) وغیرہ مذکور نہ ہو بلکہ لفظ "وَ" "یعنی" "اور" مذکور ہو۔ جیسے: "ہر انسان حیوان ہے اور ہر حیوان جسم والا ہے۔" نتیجہ: "ہر انسان جسم والا ہے۔" اس مثال میں "ہر انسان حیوان ہے" پہلا قضیہ جب کہ "ہر حیوان جسم والا ہے" دوسرا قضیہ ہے۔ اگر ان دونوں قضیوں کو تسلیم کرلیا جائے تو تیسرے قضیے یا نتیجے یعنی "ہر انسان جسم والا ہے" کو ماننا لازم ہو جاتا ہے۔) پس جمہور کی دلیلِ اوّل کو قیاسِ اقترانی کے آئینے میں یوں بیان کیا جائے گا:

"ہر وہ لفظِ عام جو کسی سببِ خاص پر وارِد ہوا ہو شریعت میں بذاتِ خود حجت ہے اور ہر وہ لفظِ عام جو ایسا ہو اس کا عموم معتبر ہوتا ہے۔ نتیجہ: "ہر وہ لفظِ عام جو کسی خاص سبب پر وارِد ہوا ہو اس کا عموم معتبر ہوگا۔" وَهٰذَا هُوَ الْمَطْلُوْبُ.

اسی طرح جمہور کی دلیلِ اوّل کو قیاسِ استثنائی سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ (لیکن اس سے پہلے قیاسِ استثنائی کے بارے میں جان لینا چاہیے۔ قیاسِ استثنائی میں پہلے قضیے کو حرفِ شرط مثلاً "اِنْ" کے ذریعے قضیہ شرطیہ بنایا جاتا ہے اور دوسرے قضیے کو ملانے کے لیے حرفِ استثناء مثلاً: لٰكِنْ (لیکن)، بَلْ (بلکہ) یا اِلَّا (مگر/سوائے) وغیرہ کا اِضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسے: "اگر سورج نکلا ہوا ہے تو دِن موجود ہے لیکن سورج نکلا ہوا نہیں ہے۔" نتیجہ: "دِن موجود نہیں ہے۔" اس مثال میں پہلے قضیے کا پہلا جزء "مقدم" جب کہ دوسرا جزء "تالی" کہلائے گا)۔

قیاسِ استثنائی سے جمہور کی دلیل کا ثبوت

"اگر سببِ خاص پر وارِد ہونے والے لفظِ عام کا عموم معتبر نہ ہو تو شارع علیہ السلام کے اَلفاظ بذاتِ خود حجت نہیں ہوں گے۔ لیکن شارع علیہ السلام کے اَلفاظ بذاتِ خود حجت ہیں۔" لہٰذا ثابت ہوا کہ اس صورت میں تالی باطل ہے۔ اور یہ تالی جس مقدم کی طرف لے جاتی ہے وہ بھی باطل ہے۔ پس جب مقدم اور تالی دونوں باطل ہیں تو ان کی نقیض خود بہ خود ثابت ہو جائے گی۔ اور وہ (نقیض) یہ ہے: "اِنَّ اللَّفْظَ الْعَامَّ الْوَارِدَ عَلٰى سَبَبٍ خَاصٍّ يُعْتَبَرُ عُمُوْمُهٗ" (ترجمہ: بے شک کسی سببِ خاص پر وارِد ہونے والے لفظِ عام کا عموم ہی

معتبر ہوگا)۔ وَهٰذَا هُوَ الْمَطْلُوْبُ.

دوسری دلیل

اِطلاق کے وقت، اصول یہ ہے کہ اَلفاظ اپنے ابتدائی اور اولین معانی پر محمول ہوں۔ (یعنی جن معانی کے لیے ان اَلفاظ کو وضع کیا گیا ہے، ان اَلفاظ سے وہ ہی معنی مراد لیے جائیں۔) "اِطلاق کے وقت" کا مطلب ہے کہ جب ان معانی کو مراد لینے سے کوئی مانع (وجہ یا علت وغیرہ) موجود نہ ہو۔ اور یہاں عموم کا مفہوم مراد لینے سے روکنے والا کوئی مانع موجود نہیں۔ لہٰذا لفظ اپنے عموم پر باقی رہے گا۔ (یعنی عمومِ لفظ ہی معتبر ہوگا۔) اور رہا وہ وہم جو مخالفین نے پیدا کیا، کہ سبب کا خاص ہونا، عموم مراد لینے سے روکنے والا ہے۔ تو یہ وہم دور ہوسکتا ہے، وہ اس طرح کہ محض سبب کا خاص ہونا لفظِ عام کے مفہوم میں شامل غیرِ سبب کے اَفراد کے نکالنے کو لازم نہیں کرتا۔ لہٰذا سبب کا خاص ہونا کوئی ایسا قرینۂ مانعہ نہیں، جس کی بدولت لفظِ عام سے وہ معنٰی مراد نہ لیا جائے، جس کے لیے اُسے وضع کیا گیا تھا۔ اور وہ ہے "عموم" جو اپنے تمام اَفراد کو شامل ہے۔

جمہور کی دلیلِ ثانی کو قیاسِ اقترانی سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ہر وہ لفظِ عام جو کسی سببِ خاص پر وارِد ہوا ہو اس سے اطلاق کے وقت عموم ہی مراد لیا جائے گا اور ہر وہ لفظِ عام جو ایسا ہو وہ اپنے عموم پر باقی رہتا ہے۔ لہٰذا ہر وہ لفظِ عام جو کسی خاص سبب پر وارِد ہوا ہو، اپنے عموم پر باقی رہے گا۔ وَهٰذَا هُوَ الْمَطْلُوْبُ

اس دلیل کو قیاسِ استثنائی سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ "اگر اِطلاق کے وقت کسی خاص سبب پر وارِد ہونے والا لفظِ عام اپنے عموم پر باقی رہنے والا نہ ہو، تو یہ لازم آئے گا کہ لفظ، بغیر کسی قرینے کے، اپنے موضوع لہ کے علاوہ میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن لفظ کا اپنے موضوع لہ کے علاوہ میں استعمال ہونا باطل ہے۔"

لہٰذا ثابت ہوا کہ اس صورت میں تالی باطل ہے۔ اور یہ تالی جس مقدم کی طرف لے جاتی ہے وہ بھی باطل ہے۔ پس جب مقدم اور تالی دونوں باطل ہیں تو ان کی نقیض خود بہ خود ثابت ہوجائے گی۔ اور وہ (نقیض) یہ ہے:

"اِنَّ اللَّفْظَ الْعَامَّ الْوَارِدَ عَلٰى سَبَبٍ خَاصٍّ بَاقٍ عَلٰى عُمُوْمِهٖ عِنْدَ الْاِطْلَاقِ۔"

"بے شک اطلاق کے وقت، کسی سببِ خاص پر وارِد ہونے والا لفظِ عام، اپنے عموم پر باقی رہتا ہے۔" وَذٰلِكَ هُوَ الْمَطْلُوْبُ.

تیسری دلیل

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور مجتہدینِ عظام رحمہم اللہ (جو کہ مختلف زمانوں اور علاقوں میں آباد تھے) نے تمام زمانوں اور علاقوں میں رہتے ہوئے اُن تمام حوادثات وواقعات میں (جو ان کے ہاں رونما ہو رہے تھے) خاص اَسباب پر وارِد ہونے والے اَلفاظ سے عموم ہی ثابت کیا اور اس کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے کسی اور دلیل یا قیاس وغیرہ کا سہارا نہیں لیا۔ اور اس اَمر کا انکار کیسے کیا جاسکتا ہے حالاں کہ شریعت کے بہت سے اُصول کسی خاص سبب پر وجود میں آئے تھے۔ پھر صحابہ و مجتہدین (غور وفکر کے بعد) اس نتیجے پر پہنچے کہ نازِل ہونے والے اَلفاظ سے عموم ہی مُراد ہے، اگرچہ وہ کسی خاص واقعہ سے متعلق نازِل ہوئے ہوں۔ پھر انھوں نے اسی عموم کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے بہت سے اُصول تیار کیے۔ مثلاً انھوں نے آیتِ سرقہ سے چور کا ہاتھ کاٹنے پر استدلال کیا باجودیکہ یہ سرقہ والی آیت ایک ڈھال یا حضرتِ صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ کی چادر چوری ہونے کے خاص واقعے (سبب) پر نازِل ہوئی تھی۔ اور اسی طرح انھوں نے آیاتِ ظِہار سے استدلال کیا ہے کفارۂ مذکورہ پر ہر اُس شخص کے لیے جو اپنی بیوی سے ظِہار کر بیٹھے، حالاں کہ آیاتِ ظِہار مخصوص تھیں جیسا کہ ماقبل تفصیل سے گزر چکا ہے۔ اور اسی طرح آیاتِ لعان کا معاملہ ہے کہ وہ خاص

ایک شخص سے متعلق نازل ہوئی تھیں جیسا کہ ماقبل گزر چکا۔لیکن صحابہ ومجتہدین نے ان آیات سے حاصل ہونے والا حکم ہر اس شخص پر لگایا جس نے اپنی بیوی پر قذف کیا ہو اور اس کے پاس گواہ موجود نہ ہوں۔

جمہور کی دلیلِ ثالث کو بھی قیاسِ اقترانی سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔وہ اس طرح کہ کسی بھی خاص سبب پر وارِد ہونے والے لفظ کے عموم کو صحابہ اور مجتہدین نے معتبر مانا ہے اور ہر وہ لفظ جس کو صحابہ ومجتہدین معتبر مانیں، وہ معتبر ہے۔پس کسی بھی خاص سبب پر نازِل ہونے والے لفظ کا عموم ہی معتبر ہوگا۔

اس دلیل کو قیاسِ استثنائی سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے۔وہ اس طرح کہ" اگر خاص سبب پر وارِد (نازِل) ہونے والے لفظ کا عموم معتبر نہ ہوتا تو صحابہ کرام اور مجتہدین اُس کو معتبر نہ مانتے۔لیکن صحابہ کرام ومجتہدین نے خاص سبب پر نازِل ہونے والے لفظ کے عموم کو معتبر مانا ہے۔"

لہٰذا ثابت ہوا کہ اس صورت میں تالی باطل ہے۔اور یہ تالی جس مقدم کی طرف لے جاتی ہے وہ بھی باطل ہے۔پس جب مقدم اور تالی دونوں باطل ہیں تو ان کی نقیض خود بہ خود ثابت ہو جائے گی۔وَهُوَ الْمَطْلُوْبُ۔

نوٹ ❀ آپ کے لیے مشکل نہیں کہ آپ ہمارے بیان کردہ قیاسِ اقترانیوں میں مقدِّمات صغریٰ اور کبریٰ کے حوالے سے (مزید) استدلال کریں کیوں کہ ہم اس سے قبل جمہور کے تینوں دلائل کو بغیر کسی منطقی اصطلاح کے، آسان ومالوف اَنداز میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔اور اسی طرح آپ ہمارے بیان کردہ قیاسِ استثنائیوں میں ملازَمات اور بطلانِ توالی کے حوالے سے بھی (مزید) استدلال کرنے پر قادِر ہو گئے ہوں گے۔فتأمل

مخالفین کے شبہاتِ خمسہ اور ان کا رَدّ

علمائے جمہور کے مخالفین کا کہنا ہے کہ لفظ کا عموم معتبر نہیں، بلکہ سبب کا خاص ہونا معتبر ہے۔اور وہ اپنے اس قول کی تائید میں پانچ شبہات کا سہارا لیتے ہیں۔ہم ابھی آپ کے سامنے ان پانچوں شبہات اور ان کا ردّ بیان کریں گے۔ان شاء اللہ تعالیٰ۔

شبہ اُولیٰ اس بات پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ اگر کوئی مخصص موجود ہو تو سبب خاص پر وارِد ہونے والے لفظِ عام کے حکم سے، سبب کے تحت پائے جانے والے اَفراد میں سے، کسی فرد کو نکالنا جائز نہیں ہوگا۔اور یہ اجماع اس اَمر کو مستلزم ہے کہ عام مقصور رہے گا سبب کے تحت پائے جانے والے اَفراد میں، اور کسی غیر کو شامل نہیں ہوگا۔کیوں کہ مخصص کے پائے جانے کے بعد بھی اگر اُسے سبب کے اَفراد میں مقصور نہ مانا جائے تو اس میں اور اس کے علاوہ میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔پس اس اجماع کی وجہ سے، مخصص کے موجود ہونے کی صورت میں، لفظِ عام کو سبب کے اَفراد میں مقصور نہ ماننا ممنوع ہوا۔

شبہ اُولیٰ کا جواب اجماعِ مذکور سے یہ مستلزم نہیں ہوتا کہ لفظِ عام مقصور رہے، سببِ خاص کے تحت پائے جانے والے اَفراد میں، جیسا کہ آپ نے کہا۔بلکہ یہ اجماع تو محض حد بندی کا تقاضا کرتا ہے۔مطلب یہ ہوا کہ مخصص کے پائے جانے کی صورت میں سبب کے اَفراد میں سے کسی فرد کو خارج نہیں کیا جاسکتا لیکن سبب کے اَفراد کے علاوہ اَفراد کو لفظِ

عام کے حکم میں داخل ہونے سے، یہ اجماع مانع نہیں ہے، بشرطیکہ وہ لفظِ عام ان اَفراد کو خود اپنے اندر شامل کرتا ہو۔ اور رہی مخصص کے پائے جانے کی صورت میں لفظِ عام اور اس کے علاوہ میں فرق برقرار رہنے والی بات، تو ہمارے اس بیان کردہ مطلب کے مطابق فرق بھی بالکل برقرار رہے گا۔

اگر آپ چاہیں تو اس شبہے اور اس کے جواب کو قیاسِ استثنائی کے دھاگے میں پرو کر یوں بیان کر سکتے ہیں:

اگر سبب کا خصوص معتبر نہ ہو تو مخصص کے پائے جانے کی صورت میں بھی سبب کے اَفراد کے اِخراج کا، جائز ہونا لازم آئے گا۔ لیکن مخصص کے موجود ہونے کی صورت میں سبب کے اَفراد کا اِخراج بوجہِ اجماع ممنوع ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ اس صورت میں تالی باطل ہے۔ اور یہ تالی جس مقدم کی طرف لے جاتی ہے وہ بھی باطل ہے۔ پس جب مقدم اور تالی دونوں باطل ہیں تو ان کی نقیض خود بہ خود ثابت ہو جائے گی۔ اور وہ نقیض یہ ہے: "اِنَّ الْعِبْرَةَ بِخُصُوْصِ السَّبَبِ" ترجمہ: "بے شک سبب کا خصوص معتبر ہے۔" اور اس تلازم کی دلیل یہ ہے کہ عام کے تمام اَفراد مساوی ہیں۔ پس اگر ہم لفظِ عام کے عموم کو لے لیں اور سبب کے خصوص کو نہ لیں تو سبب کے اَفراد اور سبب کے علاوہ کے اَفراد میں جو کہ لفظِ عام کے تحت پائے جاتے ہیں، تساوُت پایا جائے گا۔ پھر (بعد میں) کوئی مخصص آئے گا جس کی بنا پر سبب کے اَفراد کو خارج کرنا جائز ہوگا۔

(شبہے کا جواب) اس ملازمے یا تلازم کی دلیل کے ابطال میں جواب دیا جائے گا:

عام کے اَفراد کا متساوی ہونا ممنوع ہے۔ اور ممنوع ہونے کی سند یہ ہے کہ اجماع منعقد ہو چکا ہے اس بات پر کہ سبب کے اَفراد اپنے غیر کے اَفراد سے ممتاز ہوں گے بایں طور پر کہ انھیں تخصیص کے ذریعے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ پس اگر سبب کے اَفراد اور غیرِ سبب کے اَفراد دخول کے اعتبار سے متساوی ہو جائیں تو پھر وہ تمام خروج کے اعتبار سے متساوی نہیں ہوں گے۔ اور اس وقت لفظ کے عموم کا معتبر ہونا ہی باقی رہے گا نہ کہ سبب کا خاص ہونا۔

شبہۂ ثانیہ اسبابِ نزول نقل کرنے والے رواۃ نے بہت اہتمام کے ساتھ اسبابِ نزول بیان کیے ہیں اور اس موضوع پر کتابیں بھی تدوین کی ہیں۔ اگر یہ نہ کہا جائے کہ لفظِ عام اپنے سببِ خاص کے اَفراد میں مقصور رہتا ہے یعنی سبب کا خاص ہونا معتبر ہے نہ کہ لفظ کا عموم، تو پھر ان رواۃ کی محنت رائیگاں معلوم ہوتی ہے۔

شبہۂ ثانیہ کا جواب آپ کے پاس کوئی وجہ نہیں کہ آپ اَسبابِ نزول کا فائدہ صرف لفظِ عام کے اپنے سبب کے اَفراد میں مقصور ہونے کو قرار دیں۔ کیوں کہ اَسبابِ نزول اور رواۃ کی طرف سے اَسبابِ نزول کو نقل کرنے کے مختلف طریقوں کو جاننے کے متعدد فوائد ہیں، جن کو ہم نے اس باب (اسبابِ نزول) کے اوائل میں بیان کیا ہے۔ اور ہمارے بیان کردہ تمام فوائد اس ایک فائدہ نما کے علاوہ ہیں جسے آپ نے بیان کیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو وہاں رجوع کریں۔

اگر آپ چاہیں تو اس شبہے اور اس کے جواب کو بھی قیاسِ استثنائی کے دھاگے میں پرو کر یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

اگر سبب کا خصوص معتبر نہ ہوتا تو رواۃ کبھی بھی اَسبابِ نزول کو بیان و مدوّن کرنے کا اہتمام نہ کرتے۔ لیکن رواۃ نے ان کو بیان و مدوّن کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ لہٰذا حس اور مشاہدے سے ثابت ہوا کہ تالی باطل ہے۔ اور بطلانِ تالی کی وجہ سے مقدم کی نقیض بھی ثابت ہو گئی اور وہ یہ کہ سبب کا خصوص معتبر ہے۔ اور اس تلازم کی دلیل یہ ہے کہ سبب کے خصوص کو معتبر مانے بغیر، رواۃ کے

اَسبابِ نزول کو بیان کرنے اور اس کی طرف متوجہ ہونے کا کوئی فائدہ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔

(شبہے کا جواب) اس ملازمے یا تلازم کی دلیل کے ابطال میں جواب دیا جائے گا:

ہم اس دلیلِ تلازم کو نہیں مانتے اور مانے بھی کیوں؟ کیوں کہ اسبابِ نزول کے بہت سے فوائد ہیں جنھیں ہم اس مبحث کے آغاز میں بیان کر چکے ہیں پس وہاں رجوع کیجیے اگر آپ بھول چکے ہیں۔

شبہ ثالثہ لفظِ عام کا واقعے کے وقوع اور سوال کی توجیہ کے بعد میں بیان ہونا ہی، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سبب کا خصوص معتبر ہے۔ کیوں کہ سبب یا واقعے کے رونما ہونے کے بعد شارع علیہ السلام کے لفظ کے صادر ہونے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شارع علیہ السلام کے نزدیک، اس لفظ عام (جو خاص اس واقعے سے متعلق نازل ہوا ہے) کے ذریعے سے حکم لگاتے وقت، تنہا سبب ہی ملحوظ تھا۔ وگرنہ وہ لفظِ عام، سبب کے متصل بعد نازل ہو کر اس کے ساتھ جڑا ہوا اور مربوط نہ ہوتا بلکہ یا تو وہ اس سبب سے پہلے نازِل ہو گیا ہوتا یا پھر بعد میں (کبھی) نازل ہو جاتا۔ (لیکن لفظِ عام کے، سبب کے فوراً بعد وارِد ہونے سے یہ ہی ثابت ہوتا ہے کہ شارع علیہ السلام کے نزدیک واقعہ وسبب ہی ملحوظ ومخصوص تھا۔ نہ کہ لفظ کا عموم)

شبہ ثالثہ کا جواب لفظِ عام کو سبب کے بعد تک موخر کرنے کی حکمت میں یہ بات کافی ہے کہ وہ لفظِ عام اس واقعے کے لیے بیان بن جائے اور (اُن) واقعات کے لیے (بھی بیان جائے) جو اس خاص واقعے کے مشابہ ہوں اور لفظِ عام کے تحت شامل ہوں۔ نیز واقعے کے فوراً بعد لفظِ عام کے وارِد ہونے سے یہ لازِم نہیں آتا کہ وہ لفظِ عام، تنہا اس واقعے کے لیے بیان بنے، جیسا کہ آپ نے کہا۔

اگر آپ چاہیں تو اس شبہے اور اس کے جواب کو بھی قیاسِ استثنائی کے دھاگے میں پرو کر یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

اگر سبب کا خصوص معتبر نہ ہوتا تو (لفظِ عام کے) بیان کو وقوعِ واقعہ اور توجیہِ سوال تک مؤخر نہ کیا جاتا، لیکن لفظِ عام کے بیان کو وقوعِ واقعہ اور توجیہِ سوال تک مؤخر کیا گیا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ تالی باطِل ہے۔ اور بطلانِ تالی کی وجہ سے مقدم کی نقیض بھی ثابت ہو گئی اور وہ نقیض ہی تو مطلوب تھی۔ اور اس تلازُم یا ملازمے کی دلیل یہ ہے کہ شارع علیہ السلام کی جانب سے لفظ کو وقوعِ واقعہ اور توجیہِ سوال کے مابعد تک مؤخر کرنے سے، اس کے سوا اور کوئی بات مفہوم نہیں ہوتی کہ یہ لفظ، خاص طور پر اسی سبب (یا واقعے) کا بیان ہے۔ اور یہ ہی معنیٰ ہے سبب کے خصوص کے معتبر ہونے کا۔

(شبہے کا جواب) اس ملازمے یا تلازم کی دلیل کے ابطال میں جواب دیا جائے گا:

ہم اس دلیلِ ملازمہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ یعنی ہم یہ نہیں مانتے کہ (لفظ کے) بیان کو وقوعِ واقعہ اور توجیہِ سوال کے بعد تک مؤخر کرنے سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ ان دونوں (وقوعِ واقعہ اور توجیہِ سوال) کی وجہ سے نازِل ہونے والا لفظِ عام تنہا (خاص طور پر) اسی سبب یا واقعے کا بیان ہے۔ اور ہم یہ تسلیم بھی کیسے کر لیں؟ کیوں کہ تاخیر سے تو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ لفظِ عام، بیان کے طور پر نازِل ہوا ہے، اِن واقعے مع اس کے مشابہ اُن تمام واقعات کے لیے جو عام کے تحت داخل ہیں، ادلہ سابقہ کی وجہ سے۔

شبہ رابعہ تمام فقہائے کرام اس مسئلے میں متفق ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی دوسرے شخص کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دیتے ہوئے کہا: "تَغَدَّ عِنْدِیْ" ترجمہ: "دوپہر کا کھانا میرے پاس کھانا۔" لیکن اُس نے انکار کرتے ہوئے "عِنْدَكَ"

کا لفظ استعمال کیے بغیر کہا: "وَاللّٰہِ لَا اَتَغَدّٰی" ترجمہ: "اللہ کی قسم میں دوپہر کا کھانا نہیں کھاؤں گا" پھر اس کے بعد اس نے اس دعوت دینے والے کے علاوہ کسی اور آدمی کے پاس دوپہر کا کھانا کھالیا۔ تو کھانا کھانے والا اپنی قسم میں حانث نہ ہوگا۔ اور یہ صرف اسی وجہ سے ہے کہ لفظِ عام مخصوص ہوتا ہے اپنے سبب کے ساتھ اور وہ سبب ہے کلمہ: "تَغَدَّ عِنْدِیْ۔" (لفظ "عِنْدِیْ" ہی وہ سبب ہے) جس نے کھانا نہ کھانے کی قسم کو داعی (اِلی الغداء) کی ذات کے ساتھ خاص کر دیا تھا۔ (اور اسی وجہ سے قسم کھانے والے کو دوبارہ لفظِ "عِنْدَكَ" بولنے کی حاجت پیش نہ آئی کیوں کہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ لفظِ عام کا سبب خاص ہی معتبر ہوتا ہے۔ پس حالف نے اسی بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک مخصوص، معتبر چیز کو حذف کیا اور حانث بھی نہیں ہوا۔) پس گویا کہ حالف نے یوں کہا تھا: "لَا اَتَغَدّٰی عِنْدَكَ وَحْدَكَ" ترجمہ: "میں صرف تیرے پاس کھانا نہیں کھاؤں گا" (یعنی کسی اور کے پاس کھانا کھالوں گا۔) اسی وجہ سے وہ کسی اور کے پاس کھانا کھانے سے حانث نہیں ہوا۔

شبہ رابعہ کا جواب

اس مثال میں فقہائے کرام کا فیصلہ اس امر پر مبنی نہیں ہے کہ ہر لفظِ عام اپنے سبب کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے، جیسا کہ آپ نے سمجھا۔ بلکہ وہ تو مبنی ہے اس پر کہ یہ مثال اور اس کے مشابہ دیگر امثلہ مخصوص ہیں کسی قرینہ خارجہ کے ساتھ۔ اور وہ قرینۂ خارجہ ہے: "عُرف۔" بایں طور پر کہ حالِف صرف داعی کے ساتھ کھانا نہ کھانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ آپ سے کوئی کہے: "کَلِّمْ فُلَانًا فِیْ وَاقِعَةٍ مُعَیَّنَةٍ" ترجمہ: "فلاں شخص سے اس معین واقعے کے بارے میں بات کرنا۔" اور آپ اس کو کہیں: "وَاللّٰہِ لَا اُکَلِّمُهٗ اَبَدًا" ترجمہ: "اللہ کی قسم! میں اس سے کبھی بھی بات نہیں کروں گا۔" پھر اس کے بعد آپ اس فلاں شخص سے اس معین واقعے کے علاوہ کسی اور واقعے سے متعلق بات کرتے ہیں تو آپ حانث نہیں ہوں گے (حالاں کہ آپ قسم کھا چکے تھے کہ میں اس سے کلام نہیں کروں گا) کیوں کہ عُرف کا تقاضا اور حکم یہ ہی کہ آپ نے کلام (بات) نہ کرنے کی جو قسم کھائی ہے وہ مطلقاً نہیں ہے بلکہ صرف اس معین واقعے کے ساتھ خاص ہے۔

اگر آپ چاہیں تو اس شبہے اور اس کے جواب کو بھی قیاسِ استثنائی کے دھاگے میں پرو کر یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

اگر سبب کا خصوص معتبر نہ ہوتا تو "تَغَدَّ عِنْدِیْ" کے جواب میں "عِنْدَكَ" کے بغیر "وَاللّٰہِ لَا اَتَغَدّٰی" بولنے والا، کسی اور کے پاس کھانا کھانے کی صورت میں بھی حانث ہوجاتا۔ لیکن وہ فقہائے کرام کی نص کی وجہ سے کسی اور کے پاس کھانا کھانے کی صورت میں حانث نہیں ہوا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ تالی باطل ہے۔ اور بطلانِ تالی کی بدولت مقدم بھی باطل ہوا۔ اور جب مقدم اور تالی دونوں باطل ٹھہرے تو ان کی نقیض ثابت ہوگئی اور وہ ہی مطلوب تھی۔ اور اس تلازم یا ملازے کی دلیل یہ ہے کہ "لَا اَتَغَدّٰی" کے الفاظ مخاطب اور غیر مخاطب دونوں کے پاس کھانا کھانے کو شامل تھے، کیوں کہ یہاں معمول محذوف ہے اور معمول کے محذوف ہونے سے عموم ثابت ہوتا ہے (اسی لیے "لَا اَتَغَدّٰی" کے الفاظ مخاطب اور غیر مخاطب دونوں کو شامل تھے)۔ اور تحقیق کلمہ یعنی "لا اتغدی" ایک سبب پر واقع ہوا ہے اور وہ سبب ہے مخاطب کا اس کو دعوتِ غداء دینا۔ پس اگر ہم اس لفظ کے عموم کو لے لیں اور سبب کے خصوص کو نظر انداز کر دیں تو یہ لازم آئے گا کہ وہ غیرِ داعی کے پاس کھانا کھانے سے بھی حانث ہوجائے کیوں کہ وہ (غیرِ داعی) بھی عام کے افراد میں سے ایک فرد ہے۔

(شبہے کا جواب) اس ملازے یا تلازم کی دلیل کے ابطال میں جواب دیا جائے گا:

یہاں پر سبب کی وجہ سے جو تخصیص معتبر ہے وہ نفسِ سبب کی وجہ سے معتبر نہیں بلکہ ایک قرینۂ خارجہ کی وجہ سے معتبر ہے اور وہ قرینۂ خارجہ ہے "عُرف کا حکم۔" بایں طور پر کہ حالف صرف داعی کے ساتھ کھانا نہ کھانے کا اِرادہ رکھتا ہے۔ اور اس موقع پر ہماری بحث عُرف سے متعلق نہیں۔ کیوں کہ قرینہ خارجہ کی وجہ سے تخصیص کرنا ایک علیحدہ چیز ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے۔

شبہِ خامسہ حکمت اور فصاحت و بلاغت کے قانون کے مطابق سوال اور جواب میں مطابقت پایا جانا واجب ہے اور یہاں مطابقت موجود نہیں۔ کیوں کہ مطابقت کے لیے ضروری ہے کہ لفظ اور اس کا سببِ خاص متساوی ہوں اور ان دونوں کا متساوی ہونا ایک ہی صورت میں ممکن ہے، وہ یہ کہ ہم لفظِ عام کو اس کے سببِ خاص کی وجہ سے خاص مان لیں۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ لفظ اللہ تعالیٰ جو کہ شارع و حکیم ہے، کے کلام میں واقع ہوا ہو۔ کیوں کہ بلاغت کے باب میں قرآنِ مجید کا اعجاز سب سے بلند ہے۔

شبہِ خامسہ کا جواب عام کو اپنے عموم پر باقی رکھنے سے اس کی سببِ خاص کے ساتھ مطابقت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یہ مطابقت جس طرح دونوں کو متساوی ماننے سے حاصل ہوتی ہے، اسی طرح لفظ کو اس کے سبب سے اَعَمّ مان لینے سے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ لفظ اور سبب میں مطابقت سے مقصود یہ ہی ہے کہ لفظ سبب کے حکم کو بیان کرنے والا ہو اور مراد کو واضح کرنے سے قاصر نہ ہو۔ اور جب لفظ اپنے سبب کے مقابلے میں زیادہ اَعَمّ ہوگا تو مراد کو بطریقِ اولیٰ واضح کرنے والا ہوگا۔

اگر آپ چاہیں تو اس شبہے اور اس کے جواب کو بھی قیاسِ استثنائی کے دھاگے میں پرو کر یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

اگر سبب کا خصوص معتبر نہ ہوتا تو لفظ کا اپنے سبب کے لیے غیر مطابق ہونا لازم آتا۔ (حالاں کہ ایسا نہیں ہے یعنی لفظ اپنے سبب کے مطابق ہے) لہٰذا تالی باطل ٹھہری اور مقدم کی نقیض ثابت ہوگئی۔ اور اس تلازم یا ملازمے کی دلیل یہ ہے کہ یہاں پر کلام مفروض ہے سببِ خاص اور لفظِ عام میں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عام خاص کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ اور یہ ہی عدمِ مطابقت تالی کے بطلان کی دلیل ہے کیوں کہ عدم مطابقت حکمت کے منافی ہے اور قوانینِ بلاغت کے لیے مخل ہے۔

ملازمے کا جواب: ہم اس ملازمے اور دلیل یعنی عام مطابقت نہیں رکھتا خاص کے ساتھ، کو باطل قرار دیتے ہیں اور تسلیم نہیں کرتے۔ اور ہم اس کو تسلیم کر بھی کیسے لیں کیوں کہ لفظ کی سبب کے لیے عام و خاص ہونے کے اعتبار سے جو مطابقت متساوی ہونے کے وقت حاصل ہوتی ہے، اسی طرح اس وقت بھی حاصل ہو جاتی ہے جب لفظ اپنے سبب سے اَعَمّ ہو۔ کیوں کہ جواب سے مراد سبب اور اس کے حکم کو بیان کرنا ہوتا ہے اور یہ مراد لفظ اور سبب کے متساوی ہونے پر ہی موقف نہیں بلکہ لفظ کے سبب سے نسبتاً اَعَمّ ہونے کی صورت میں بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

نوٹ اس سارے بیان کے بعد آپ کے لیے ممکن ہو چکا ہے کہ آپ ہمارے بیان کردہ قیاسِ استثنائیوں کو قیاسِ اقترانیوں میں تبدیل کر لیں اور پھر جمہور کے دلائل کے ساتھ ہمارے لائحۂ عمل کے مطابق قیاسی مقدمات پر سہولت و یُسر کے ساتھ استدلال کریں۔ پس آپ کے سامنے ایک وسیع میدان ہے اور (میرے لیے) بات کو طول دینے پر کوئی داعیہ موجود نہیں ہے۔

اور اسی طرح میں یہ بھی امید رکھتا ہوں کہ اس مبحث کو پڑھنے والا اگر بعض مقامات پر مشقت کا شکار ہو اور اسے دلائل میں

استعمال ہونے والی فنی صناعتوں کو سمجھنے میں دقت محسوس ہو تو وہ مجھے معذور سمجھے کیوں کہ میں نے توسط یعنی درمیانی چال چلتے ہوئے دلائل بیان کیے ہیں (یعنی بہت زیادہ طوالت سے کام نہیں لیا)۔ کیوں کہ توسط ایک فیصلہ ہے جس کو کوئی ردّ نہیں کر سکتا اور صناعت کے لیے ایسا حکم ہے جس کی کوئی نقیض نہیں۔ اور میرے لیے یہ بھی لازم تھا کہ میں قاریوں کی تمام اَقسام کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس انداز میں بیان کروں کہ وہ ان کے لیے کافی ہو جائے۔ اسی وجہ سے آپ مجھے دیکھیں گے کہ میں کبھی ایک انداز میں بحث کرتا ہوں پھر اس انداز کو چھوڑ کر دوسرا انداز اپنا لیتا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ ہی علیم ہے اور علم کے دروازے کھولنے والا ہے اور وہ ہی توفیق دینے والا اور مدد کرنے والا ہے۔

لفظِ عام کے ساتھ سببِ خاص کی ایک مثال

علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "الاتقان" اور علامہ ابن السبکی اور علامہ محلی "جمع الجوامع" اور اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں کچھ ایسی آیات بھی ہیں جن کا نزول خاص اَسباب سے ہوا تھا مگر وہ نظمِ قرآن کی رعایت اور طرزِ بیان کی خوبی کی وجہ سے اپنے مناسب عام آیات کے ساتھ رکھ دی جاتی ہیں۔ اور پھر ذہن ان آیات سے فوری طور پر سببِ خاص کے علاوہ کی طرف ہی سبقت لے جاتا ہے۔ اور جب ان آیاتِ عامہ کی تخصیص کے لیے کوئی مخصص پایا جائے تو تخصیص کے ذریعے ان کے خروج کو بعید سمجھتا ہے۔ گویا کہ وہ خاص بھی قطعی طور پر عام میں داخل ہے۔ اور گویا کہ مخصص کے پائے جانے کی صورت میں بھی اس کے عدمِ خروج پر اجماع منعقد ہو گیا ہے جیسا کہ اجماع منعقد ہو چکا تھا نازل ہونے والے لفظِ عام میں سے سببِ خاص کے عدمِ خروج پر۔

اس بات کی وضاحت ایک مثال سے ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ کا اِرشاد ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۝ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ۝ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ؗ وَّ نُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝﴾ (النساء: ۵۱-۵۸)

"بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب سے حصہ دیا گیا ہے کہ بتوں اور شیطان کو مانتے ہیں اور کفار کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ مومنوں کی نسبت سیدھے راستے پر ہیں۔ یہ ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ اور جس پر اللہ

لعنت کرے تو تم اس کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔ کیا ان کے پاس بادشاہی کا کچھ حصّہ ہے اس صورت میں تو یہ لوگوں کو تل برابر بھی نہ دیں گے۔ یا جو اللہ نے لوگوں کو اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس کا حسد کرتے ہیں تو ہم نے خاندانِ ابراہیم کو کتاب اور دانائی عنایت فرمائی تھی اور سلطنتِ عظیم بھی بخشی تھی۔ پھر لوگوں میں سے کسی نے تو اس کتاب کو مانا اور کوئی اس سے رُکا رہا، تو ان نہ ماننے والوں کے لیے دوزخ کی جلتی ہوئی آگ کافی ہے۔ جن لوگوں نے ہماری آیتوں سے کُفر کیا ان کو ہم عنقریب آگ میں داخل کریں گے۔ جب کبھی ان کی کھالیں گل جائیں گی تو ہم ان کو اور کھالیں بدل کر دیں گے تاکہ ہمیشہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔ بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کو ہم بہشتوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں ان کے لیے پاک بیبیاں ہیں۔ اور ان کو ہم گھنے سائے میں داخل کریں گے۔ مسلمانو! اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ اَمانت والوں کی اَمانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو۔ اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔ اللہ تمھیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ سُنتا ہے دیکھتا ہے۔"

پس آپ نے دیکھا کہ یہ آیات یہودی خائنوں اور ان کی خیانت کی دھجیاں بکھیر رہی ہیں، ان کے لیے رُسواکُن وعیدوں کا وعدہ کر رہی ہیں اور انتہائی سخت انداز میں ان کو ملامت ولعن طعن کر رہی ہیں۔ نیز یہ آیات انتہائی واضح انداز میں اس خیانت سے متعلق نہی پر مبنی ہیں جو یہودیوں نے نبی کریم ﷺ اور مومنین کے ساتھ کی تھی کہ جب انھوں نے مشرکین کو مسلمانوں کے مقابلے میں ہدایت پر قرار دیا۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ ان آیات کو متضمن مانا جائے یہودیوں کی اس خیانت کے ساتھ جو انھوں نے نبی کریم ﷺ اور ان کے اَصحاب رضی اللہ عنہم کی حقیقی صفات کو بیان نہ کر کے کی تھی۔ بالخصوص یہ کہ جب انھوں نے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ان صفات کو چھپایا جو ان کی کتاب تورات میں بیان ہوئی تھیں، جیسا کہ قرآنِ مجید میں سورۃ الاعراف میں ہے:

﴿يَجِدُونَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ....﴾ (الاعراف:۱۵۷)

"ان کے اوصاف کو وہ اپنے ہاں توارات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں....."

اس آیت میں ضمیر نبی کریم ﷺ ہی کی طرف راجع ہے۔ اور اسی طرح سورۃ الفتح میں نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توصیف بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا:

﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۖ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ ....﴾ (الفتح:۲۹)

"ان کے یہ ہی اوصاف تورات میں ہیں اور یہ ہی اوصاف انجیل میں۔ وہ گویا ایک کھیتی ہیں جس نے پہلے زمین سے اپنی سوئی نکالی....."

ترتیبِ وضعی کے اعتبار سے ان آیات کے بعد ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾ (النساء:۵۸) والی آیت کا آنا، ایک بہترین تناسب، ربطِ بے مثال اور خوب صورت ہم آہنگی کی عکاسی کر رہا ہے۔ کیوں کہ بعد والی آیت سے عام امانت کی ادائیگی کا، جب کہ سابقہ آیات سے ایک خاص قسم کی اَمانت کی ادائیگی کا حکم ثابت ہو رہا ہے۔ اس طرح عام اور خاص کے مابین اس

سے مستحکم ربط کیا ہوسکتا ہے۔ پس یہ سببِ خاص کی وجہ سے عام اَلفاظ میں نازل ہونے والے کلام کی ایک بہت عمدہ مثال ہے۔ پس جب عام خاص کے اَفراد کو مجموعی طور پر شامل ہے تو کسی مخصص کے ذریعے اس کے اَفراد کو خارج کرنا درست نہ ہوگا۔ پس اسی طرح امانتِ خاصہ کو امانتِ عامہ کے دھاگے میں شاندار انداز میں پرو دیا جائے گا۔ اور اوّلاً خاص کا مدلول عام میں داخل ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر کہا جائے کہ "کسی مخصص کی بنا پر اِخراج سے کلام میں خوب صورتی باقی نہیں رہتی" تو کچھ بعید نہیں ہے۔

اس موقع پر علامہ ابن السبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ایک اوسط درجے کا رُتبہ ہے جو سبب سے نیچے اور تجرد سے بالا ہے۔ یعنی اس کو (مطلقاً) سبب کے مرتبے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ کیوں کہ پہلی آیت دوسری آیت میں سبب نہیں ہوسکتی۔ اور اس وجہ سے بھی کہ ان دونوں آیات میں صرف قرآنِ مجید کی وضعی ترتیب کے لحاظ سے مقارنت موجود ہے وگرنہ زمانۂ نزول کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ان میں مقارنت نہیں۔ بلکہ ان دونوں کے زمانۂ نزول میں بہت فرق ہے۔ وہ اس طرح کے دوسری آیت (امانات والی آیت) پہلی آیت سے قریباً چھ سال بعد نازل ہوئی تھی۔ لیکن دوسری آیت کا چھ سال بعد نازل ہونا اس نظمِ کلام میں کوئی نقص نہیں ڈال سکتا۔ کیوں کہ وحدت یا قربتِ زمانہ کی شرط صرف سببِ نزول میں لگائی گئی ہے نہ کہ مناسبتِ معانی میں۔ (مناسبت کا مقصود تو صرف اتنا ہی ہے کہ ایک آیت اپنے مناسب موقع میں جوڑ دی جائے ورنہ آیتوں کا نزول اپنے اپنے اَسباب پر ہوتا تھا اور پھر نبی کریم ﷺ انھیں ایسی جگہوں پر لکھنے کا حکم دیتے تھے جو انھیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے بتائی جاتی تھیں۔)

علامہ تاج الدین عبدالوہاب بن علی السبکی جو کہ مشہور ہیں "علامہ ابن السبکی" کے نام سے، نے اپنی تالیف جمع الجوامع اور امام جلال الدین المحلی نے جمع الجوامع کی شرح میں جو کچھ لکھا ہے، ہم اس موقع پر "تتمہ" کے طور پر اُسے نقل کررہے ہیں۔

"اور وہ سببِ خاص جس پر لفظِ عام وارد ہوا ہے، عام کے مدلول میں قطعی طور پر داخل ہوگا اور اجتہاد وغیرہ کے ذریعے، اس میں تخصیص جائز نہ ہوگی۔ ﴿وَيَقْرُبُ مِنْهَا﴾ اور جو اس سے قریب ہو یعنی صورتِ سبب سے قریب ہو یہاں تک کہ قطعی الدخول ہو یا ظنی الدخول، خاص ہے قرآن میں رسم کے اعتبار سے اس سے تالی یعنی مؤخر ہو۔ رسم سے مراد رسم القرآن ہے اور کسی آیت کو اس کی متعین جگہ پر رکھنے کے معنی میں ہے۔ اور اگر نزولی اعتبار سے تالی نہ ہو تو، عام ہے تالی اور متلو کے مابین نسبت کی وجہ سے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ ...﴾ (النساء:۵۱)

نیز اس بات کی تائید مفسرین کے اقوال سے بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ تفسیرِ بغوی اور تفسیرِ طبری میں ہے کہ اس آیت میں اِشارہ ہے کعب بن اشرف اور اس کے مثل دیگر علمائے یہود کی طرف، کہ جس وقت وہ لوگ مکہ آئے اور انھوں نے جنگِ بدر میں مقتول مشرکین کی لاشیں دیکھیں تو انھوں نے مشرکینِ مکہ کو رسول اللہ ﷺ سے لڑنے اور انتقام لینے پر اُبھارا۔ مشرکینِ مکہ نے اُن علمائے یہود سے کہا: مَنْ أَهْدٰى سَبِيلًا، مُحَمَّدٌ (ﷺ) وَأَصْحَابُهُ أَمْ نَحْنُ؟ کہ پہلے تم یہ بتاؤ کہ ہم دونوں میں سے سیدھے راستے پر کون ہے؟ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھی یا ہم لوگ؟ کعب بن اشرف اور اس کے ساتھیوں نے کہا: "أَنْتُمْ" تم لوگ سیدھے راستے اور حق پر ہو۔" حالاں کہ ان کو بخوبی معلوم تھا کہ ان کی آسمانی کتابوں میں نبی کریم ﷺ کی تعریف موجود ہے اور وہ آپ پر پوری طرح منطبق بھی ہوتی ہیں اور مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اس بات کا قول واقرار بھی لے لیا تھا کہ وہ پیغمبر آخرالزماں ﷺ کی نعت کو پوشیدہ نہ

رکھیں گے۔ اس لیے یہ بات اُن کے ذمہ ایک واجب الادا امانت تھی جس کو حق دار تک پہنچانے میں انھوں نے بددیانتی کی اور بوجہ اس کے کہ نبی کریم ﷺ سے دِل میں سخت جلتے تھے کفار کو یہ بتایا کہ تم ہی سیدھی راہ پر ہو، حالاں کہ ان کا یہ کہنا بالکل غلط اور خلافِ واقع تھا۔ اس لیے یہ آیت (مع اُس وعید کے، جس کا اثر ان لوگوں پر پڑتا ہے جنھوں نے نبی کریم ﷺ کی صفت اور مدح کو باوجود اپنی کتابوں میں موجود ہونے اور اُس کے بیان کرنے کے لیے مامور ہونے کے، بیان نہیں کیا اور اس طرح خیانت کے مرتکب ہوئے) اللہ تعالیٰ کے قول: "﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾ (النساء: ۵۸) سے مناسبت رکھتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دوسری آیت تمام امانتوں کے لیے عام ہے اور پہلی آیت محض ایک خاص امانت سے تعلق رکھتی ہے جو نبی کریم ﷺ کی صفت ہے اور یہ بات پچھلے بیان شدہ طریقے کے اعتبار سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ عام آیت خاص آیت سے قیدِ تحریر میں بھی بعد میں آئی ہے اور اس کا نزول بھی خاص آیت کے نزول سے بعد میں ہوا ہے۔ یعنی عام آیت خاص آیت کے لیے رسم کے اعتبار سے تالی ہے اور نزول کے اعتبار سے (بھی) قریباً چھ سال متراخی ہے کیوں کہ غزوۂ بدر کا عظیم واقعہ سن دو ہجری میں رمضان میں ہوا تھا جب کہ مکہ کی شاندار فتح سن آٹھ ہجری میں رمضان میں ہوئی تھی۔ اور جو "وَيَقْرُبُ مِنْهَا" کہا تھا وہ بھی اسی طرح ہے کیوں کہ عام اپنے سبب کی وجہ سے اپنے مدلول کے خلاف پر وارد نہیں ہوتا۔"

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّآخِرًا

بحث ⑥

قرآنِ مجید کا سات حروف پر نازِل ہونا

مقدمہ

قرآنِ مجید کے سات حروف پر نازِل ہونے سے کیا مراد ہے؟ یہ بڑی نادر، معرکۃ الآرااور طویل بحث ہے۔لیکن اس بحث میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ طویل ہونے کے ساتھ ساتھ اکتاہٹ اور وحشت جیسی خرابیوں سے پاک ہے بلکہ یہ تو بہت ہی پُرکشش اور دلچسپی کی حامل ہے۔اس بحث کے دلچسپ اور نادر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس بحث میں ہمیں اللہ تعالیٰ کے رحمت اوراس کی اپنے بندوں پر شفقت اور محبت کے مظاہر کی مثالیں نظر آتی ہیں۔اس بحث میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کو سات حروف پر نازِل فرما کر صرف عرب کے قبائل ہی پر احسان نہیں کیا بلکہ پوری امت مسلمہ کے تمام قبائل وشعوب پر احسانِ عظیم کیا ہے۔اوراسی کی بدولت تمام عرب وعجم قرآن کریم کو سہولت اور روانی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں باوجود اس کے کہ تمام لہجوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

اس بحث میں آپ حروفِ سبعہ سے متعلق بہت سے اقوال وافکار کا مطالعہ کریں گے۔نیز یہ مشاہدہ کریں گے کہ اہلِ حق، حق کو واضح کرنے کے لیے کس قدر سرگرداں رہتے ہیں۔انھوں نے حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کرنے کے لیے کس کس طریقے سے جدوجہد کیں اور قرآنِ کریم اور دینِ متین کی حفاظت کے لیے اپنی جان کی بازی لگا کر بھی دفاع کیا۔یہ بات اس بحث میں شوق اور دلچسپی کو مزید بڑھا دیتی ہے۔

اس بحث کو پڑھتے وقت بہت احتیاط درکار ہے کیونکہ اس میں قیل وقال بہت زیادہ ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات تو حقیقت تک رسائی ہی ممکن نہیں لگتی اور بعض اوقات بعض علمائے کرام کے اقوال پڑھ کر ان کے بارے میں دِل میں بدگمانی پیدا ہونے کا خطرہ لاحق ہوجاتا ہے۔اس لیے اس بحث کو مشکل بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اس موضوع پر بڑے بڑے محققین نے ضرورت محسوس کرتے ہوئے قدیم اور جدید انداز میں تحریریں لکھیں مثلاً ساتویں صدی ہجری میں علامہ ابوشامہ نے اور چودھویں صدی ہجری میں علامہ الشیخ محمد بخیت نے۔

اس موضوع پر قلم اٹھانے یا کوئی موقف اختیار کرنے میں نزاکت بھی اعلیٰ درجے کی پائی جاتی ہے کیونکہ ذراسی خطا اسلام کے دشمنوں کو قرآن مجید کے بارے میں طعن وتشنیع کا وہ موقع فراہم کرسکتی ہے، جس کی تلاش میں غیر مذاہب کی منظم اور تربیت یافتہ جماعتیں عرصہ دراز سے گھات لگائے بیٹھی ہیں۔لیکن وہ اپنے ان ناپاک عزائم میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتے۔

﴿وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا﴾ (التوبہ: ۷۴)

"انھوں نے اُس کام کا ارادہ کر لیا تھا جس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔"

ہم اللہ ہی سے مدد اور ہدایت کے طالب ہیں اور اُسی سے دُعا گو ہیں کہ وہ ہمارے لیے اس دلچسپ موضوع میں دلچسپی اور شوق پیدا کر دے اور امرِ رشید مقرر فرما دے۔

قرآنِ مجید کے حروفِ سبعہ پر نازل ہونے والا باب ایک وسیع باب ہے۔ان شاء اللہ ہم اس باب میں درج ذیل امور بیان کریں گے:

① قرآنِ مجید کے سات حروف پر نازِل ہونے کے دلائل
② سات حروف والی احادیث پر امتیازی شواہد
③ حروف اور قراءات کے اختلاف پر مبنی بہت سے فوائد
④ سات حروف پر قرآنِ مجید کے نازِل ہونے کا مفہوم
⑤ پسندیدہ مذہب کے مطابق حروف اور قراءتوں میں پائے جانے والے اختلاف کی سات اقسام
⑥ پسندیدہ مذہب اور اس سے ملتے جلتے اقوال یا مذاہب کے درمیان نسبت
⑦ پسندیدہ مذہب کو اختیار کرنے کی وجوہات
⑧ اس پر وارِد ہونے والے اعتراضات کے جوابات
⑨ مصاحف میں حروفِ سبعہ کا باقی رہنا
⑩ مصاحف میں حروفِ سبعہ کے باقی نہ رہنے والے اقوال اور ان کا ردّ
⑪ آخری اقوال کا اجمالی ردّ
⑫ اختتامیہ در علاجِ شبہاتِ وارِدہ بر موضوعِ ہذا

قرآنِ مجید کے سات حروف پر نازِل ہونے کے دلائل

اس موضوع پر صرف ان ہی احادیث سے استدلال کیا جا سکتا ہے جو حضورِ اکرم ﷺ سے صحیح طرق سے مروی ہوں۔ اور ہمارے پاس ایسی اَحادیث بہت ہیں جن میں کسی قسم کا ضعف نہیں پایا جاتا، بلکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک بڑی جماعت اس حدیث کو روایت کرتی ہے جس سے حروفِ سبعہ پر نزولِ قرآن کا اثبات ہوتا ہے۔

صحابہ کی وہ بڑی جماعت جو اس حدیث کو روایت کرتی ہے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوجہم رضی اللہ عنہ، حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ، حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ، حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ، حضرت سلمان بن صرد رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن ابوسلمہ

رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی زوجہ حضرت ام ایوب رضی اللہ عنہا۔

یہ اکیس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں جنھوں نے حروفِ سبعہ پر نزولِ قرآن والی حدیث کو روایت اور بیان کیا ہے۔

امام الحافظ ابو یعلی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "المسند الکبیر" میں ایک واقعہ روایت کرتے ہیں:

"ایک مرتبہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہا: لوگو! کیا تم میں کوئی ایسا شخص موجود ہے جس کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد یاد ہو:

((اِنَّ الْقُرْآنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ کُلُّهَا شَافٍ کَافٍ)).

"قرآنِ کریم سات حروف پر نازل کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک شافی اور کافی ہے۔"

اور ہاں میں خود بھی اس حدیث کو سننے کا گواہ ہوں۔

حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ اعلان سُن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک اتنی بڑی جماعت کھڑی ہوگئی جس کو شمار کرنا دشوار ہوگیا۔

جو حدیث اوپر نقل کی گئی ہے وہ معنی کے اعتبار سے متواتر ہے، چنانچہ مشہور محدث امام ابوعبید قاسم بن سلام رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے تواتر کی تصریح بھی کی ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ متواتر حدیث وہ کہلاتی ہے جس کو ہر دور میں روایت کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ رہی ہو جن کا جھوٹ پر جمع و متفق ہونا محال ہو۔ ہمیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے سنہری دور میں تو اس حدیث کو روایت کرنے والوں کی اتنی ہی بڑی تعداد باآسانی مل جاتی ہے۔ لیکن بعد والے اَدوار میں اتنی بڑی جماعت اس حدیث کو روایت کرنے والی نہیں ہے۔ اسی لیے ہم نے یہ کہا کہ یہ حدیث معنی کے اعتبار سے متواتر ہے اگرچہ اعتباراتِ دیگراں سے متواتر نہ ہو۔

اب ہم وہ احادیث پیش کرتے ہیں جن سے قرآنِ کریم کے حروفِ سبعہ پر نازِل ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے۔

① امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے درج ذیل حدیث اپنی اپنی کتب میں روایت کی ہیں۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ:

((اَقْرَاَنِیْ جِبْرِیْلُ عَلَیْهِ السَّلَامُ عَلٰی حَرْفٍ، فَرَاجَعْتُهٗ، فَلَمْ اَزَلْ اَسْتَزِیْدُهٗ فَیَزِیْدُنِیْ حَتّٰی انْتَهٰی اِلٰی سَبْعَةِ أَحْرُفٍ)).

زاد مسلم: قال ابن شهاب: ((بَلَغَنِیْ اَنَّ تِلْكَ السَّبْعَةَ الْاَحْرُفَ اِنَّمَا هِیَ فِی الْاَمْرِ الَّذِیْ یَکُوْنُ وَاحِدًا، لَا یَخْتَلِفُ فِیْ حَلَالٍ وَّلَا حَرَامٍ)).

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"حضرتِ جبرئیل علیہ السلام نے مجھے (پہلے) ایک حرف پر پڑھایا، تو میں نے ان سے مراجعت کی اور مسلسل زیادتی طلب کی سو وہ (قرآنِ کریم کے حروف میں) مجھے (یعنی میرے لیے) اضافہ کرتے رہے یہاں تک کہ وہ سات حروف تک پہنچ گئے۔"

امام مسلم نے ان اَلفاظ کا اضافہ نقل کیا ہے: ابن شہاب کہتے ہیں:

"مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ سبعہ حروف وہ ہیں جو کسی معاملے میں ایک ہی حکم دیتے ہوں۔ جو حلال و حرام میں اختلاف نہیں کرتے۔"

② درج ذیل حدیث بھی امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے روایت کی ہے۔صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

((اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ يَقُوْلُ: سَمِعْتُ هِشَامَ بْنَ حَكِيْمٍ يَقْرَأُ سُوْرَةَ الْفُرْقَانِ فِي حَيَاةِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَاسْتَمَعْتُ لِقِرَاءَتِهِ، فَإِذَا هُوَ يَقْرَؤُهَا عَلَى حُرُوْفٍ كَثِيْرَةٍ لَمْ يُقْرِئْنِيْهَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَذٰلِكَ، فَكِدْتُ أُسَاوِرُهُ فِي الصَّلَاةِ، فَانْتَظَرْتُهُ حَتّٰى سَلَّمَ، ثُمَّ لَبَّبْتُهُ بِرِدَائِهِ أَوْ بِرِدَائِيْ، فَقُلْتُ: مَنْ أَقْرَأَكَ هٰذِهِ السُّوْرَةَ؟ قَالَ: أَقْرَأَنِيْهَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قُلْتُ لَهُ: كَذَبْتَ، فَوَاللهِ إِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَقْرَأَنِيْ هٰذِهِ السُّوْرَةَ الَّتِيْ سَمِعْتُكَ تَقْرَؤُهَا، فَانْطَلَقْتُ أَقُوْدُهُ إِلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللهِ، إِنِّيْ سَمِعْتُ هٰذَا يَقْرَأُ بِسُوْرَةِ الْفُرْقَانِ عَلٰى حُرُوْفٍ لَمْ تُقْرِئْنِيْهَا، وَأَنْتَ أَقْرَأْتَنِيْ سُوْرَةَ الْفُرْقَانِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَرْسِلْهُ يَا عُمَرُ، اقْرَأْ يَا هِشَامُ" فَقَرَأَ عَلَيْهِ الْقِرَاءَةَ الَّتِيْ سَمِعْتُهُ يَقْرَؤُهَا، قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "هٰكَذَا أُنْزِلَتْ" ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "اقْرَأْ يَا عُمَرُ" فَقَرَأْتُ، فَقَالَ: "هٰكَذَا أُنْزِلَتْ" ثُمَّ قَالَ: "إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ، فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ")).①

"سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں ہشام بن حکیم (رضی اللہ عنہ) کو سورۃ الفرقان کی تلاوت کرتے ہوئے سنا۔ وہ اُسے بہت سے حروف پر پڑھتے جا رہے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھائے تھے۔ میں نے نماز ہی میں اُن کی خبر لینا چاہی۔ بمشکل صبر سے کام لیا یہاں تک کہ انھوں نے سلام پھیرا۔ پھر میں نے انھیں ان کی چادر یا اپنی چادر میں لپیٹا اور پوچھا: یہ سورت آپ کو کس نے پڑھائی جو میں نے ابھی آپ سے سُنی ہے؟ انھوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ میں نے کہا آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھی یہ سورت پڑھائی ہے لیکن اس طرح نہیں جس طرح میں نے آپ سے سُنی۔ یہ کہتے ہوئے میں ان کو زبردستی بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں لے گیا اور عرض کی: میں نے ان سے سورۃ الفرقان ایسے حروف میں پڑھتے ہوئے سُنی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر! انھیں چھوڑ دو۔ اور ہشام! سورۃ الفرقان پڑھو۔ ہشام نے سورت اسی قراءت پر پڑھی جو میں نے اُن سے سُنی تھی۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ سورت اسی طرح نازل ہوئی تھی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: عمر! (اب) تم پڑھو۔ میں نے اسی قراءت میں اُسے پڑھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پڑھائی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ بے شک یہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے۔ جیسے آسانی ہو پڑھ لیا کرو۔ (متفق علیہ)

③ ((عن ابی بن کعب قال: کنت فی المسجد فدخل رجل یصلی فقرأ قراءة انکرتها علیه ثم دخل آخر فقرأ قراءة سوی قراءة صاحبه فلما قضینا الصلاة دخلنا جمیعا علی رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم فقلت: ان هٰذا قرأ قراءة انکرتها علیه ودخل آخر فقرأ سوی قراءة صاحبه. فامرهما رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم فقرأ فحسن النبی صلی الله علیه وآله وسلم شأنهما فسقط فی نفسی من

① صحیح البخاری: ٦٩٣٦، صحیح مسلم: ٨١٨

التکذیب ولا اذا کنت فی الجاھلیة. فلما رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ما قدغشنی ضرب فی صدری. ففضت عرقا وکانما انظر الی اللہ عزوجل فرقا فقال لی: یاابی! ارسل الی ان اقرأ القرآن علی حرف فرددت الیہ ان ھون علی امتی فردالی الثانیة اقرأہ علی حرفین فرددت الیہ: ان ھون علی امتی فردالی الثالثة اقرأہ علی سبعة احرف ولك بكل ردة رددتها مسألة تسألنيها. فقلت: اللّٰھُمَّ اغفر لامتی اللّٰھُمَّ اغفر لامتی. واخرت الثالثة ليوم یرغب الی الخلق کلھم حتی ابراھیم))۔ ①

"حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں (ایک مرتبہ) مسجد میں تھا کہ ایک شخص مسجد میں آیا اور نماز پڑھنے لگا۔ اس نے ایسی قراءت کی جو میرے لیے اجنبی تھی، پھر اسی اثنا میں ایک اور شخص مسجد میں داخل ہوا اور اس نے ایک دوسری قراءت کی جو اس کے ساتھی کی قراءت کے علاوہ تھی۔ جب ہم نماز سے فارغ ہوئے تو ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ اس شخص نے ایسی قراءت پڑھی ہے جو (میں نے پہلے کبھی نہیں سُنی تھی اس لیے) میرے لیے اجنبی ہے۔ اور پھر دوسرا آدمی داخل ہوا اور اُس نے پہلے آدمی کے علاوہ کوئی اور قراءت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو پڑھنے کا حکم دیا۔ دونوں نے قراءت کی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کی تحسین فرمائی۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرے دِل میں ایک ایسی تکذیب کا خیال آ گیا کہ زمانۂ جاہلیت میں کبھی نہ آیا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری اس کیفیت کو دیکھا جس نے مجھے ڈھانپ رکھا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارا، میں (گھبرا گیا اور) پسینے پسینے ہو گیا اور خوف کے مارے (میری حالت یہ ہو گئی) گویا کہ میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: اے ابی! مجھے پہلے یہ ہی حکم بھیجا گیا تھا کہ میں قرآن کی تلاوت ایک حرف پر ہی کروں۔ لیکن میں نے جواب میں عرض کیا کہ میری اُمت پر آسانی فرما دیجیے۔ چنانچہ مجھے دو حروف (قراءت) پر پڑھنے کی اجازت دی گئی۔ میں نے پھر جواباً عرض کیا: میری اُمت پر (مزید) آسانی فرما دیجیے۔ چنانچہ مجھے تیسری مرتبہ سات حروف (قراءتوں) پر پڑھنے کو کہا گیا۔ اور بارگاہِ الٰہیہ سے مجھے اِرشاد ہوا: جتنی بار تم نے اُمت پر سہولت کے لیے عرض کیا ہر مرتبہ کے عوض ایک سوال ہم سے کر لو (ایک دُعا مانگ لو جو مقبول ہو گی) چنانچہ میں نے کہا: اے اللہ! میری اُمت کی مغفرت فرما دیجیے۔ اے اللہ! میری اُمت کی مغفرت فرما دیجیے۔ (دو دُعائیں مانگ لیں) اور تیسری دُعا میں نے مؤخر کر دی اس دن کے لیے جس دِن کہ ساری مخلوق میری طرف رغبت کرے گی حتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی۔" (یعنی قیامت کے دِن جب ساری انسانیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں سفارش کے لیے جائے گی اس دِن میں تیسری دُعا مانگوں گا اور وہ بھی اُمت ہی کی بخشش و مغفرت سے متعلق ہو گی)۔"

فائدہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے اس جملے:

((فَسَقَطَ فِیْ نَفْسِیْ مِنَ التَّکْذِیْبِ وَلَا اِذَا کُنْتُ فِی الْجَاهِلِیَّةِ))۔

"میرے دِل میں ایک ایسی تکذیب کا خیال آ گیا کہ زمانۂ جاہلیت میں کبھی نہ آیا تھا۔"

① الصحیح لمسلم: ۱۷۹۱

کی تشریح امام طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ یوں کی ہے:

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اُن دونوں کی تعریف وتحسین فرمائی اور یہ فرمایا کہ یہ دونوں بھی صحیح پڑھ رہے تھے تو میرے دل میں شیطان نے ان دونوں کے صحیح ہونے والے قول کی تکذیب کا وسوسہ ڈالا تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے چہرے سے اس وسوسے کو جان گئے اور تنبیہ کے طور پر میرے سینے پر زور سے ہاتھ مارا......

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ان دونوں صاحبوں نے مسجد میں آنے کے بعد جس سورت کی تلاوت کی تھی وہ ایک ہی سورت "سورۃ النحل" تھی۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے دِل میں وسوسہ پیدا ہونے کا اصل محرک یہ تھا کہ اللہ کی جانب سے اختلاف کیونکر اور کیسے پیدا ہوسکتا ہے۔لہٰذا قراءت میں اختلاف نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ یہ تو اللہ کا کلام ہے۔لیکن یہ وسوسہ محض ایک شیطانی وسوسہ تھا، جو کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تنبیہ کرنے سے فوراً دور ہوگیا اور بعد میں اس وسوسے کا نام ونشان بھی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے دِل میں یا اُن کے عمل میں باقی نہ رہا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ اپنے بندوں سے اس طرح کے وساوس پر مواخذہ نہیں فرماتا۔ہاں! اگر کوئی شخص ان وساوس کو اپنے دِل میں جگہ دیتا ہے ان پر پختگی حاصل کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت مواخذہ ہوتا ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے دِل میں پیدا ہونے والے وسوسے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس طرح کا وسوسہ پیدا ہونا آپ رضی اللہ عنہ کے اندر پائے جانے والے "صریح ایمان" کی علامت ہے۔کیوں کہ حضرتِ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا معاملہ تو درج ذیل حدیث کے قبیل سے ہے۔

"آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ لوگوں نے حاضر ہوکر عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم اپنے دِلوں میں ایسے وساوس (بُرے خیالات) پاتے ہیں جن کے بارے میں زبان سے کچھ بات کرنا ہمیں بہت بھاری لگتا ہے۔آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم ایسے وساوس پاتے رہے ہو؟ (یعنی ایسے وساوس تم پاتے ہو نہ؟ خود تو نہیں لاتے نہ؟) انھوں نے کہا: جی ہاں! (یعنی وہ وساوس ہم خود نہیں لاتے بلکہ وہ خود بہ خود آتے رہتے ہیں۔) حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذٰلِكَ صَرِيحُ الْإِيمَانُ یعنی یہ تو کھلم کھلا ایمان (کی علامت) ہے۔" ①

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کے اس اندازِ بیان سے یہ بات اور بھی واضح ہوگئی کہ اس وسوسے سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی شان میں کوئی فرق نہیں پڑا نیز نہ ہی ان کے ایمان میں کسی قسم کی خلش پیدا ہوسکی کیونکہ مصلحِ اعظم حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اُسی موقع پر ان کی اصلاح فرمادی جیسا کہ حدیث میں گزرا۔

کوئی بھی انسان اس کی استطاعت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے دِل میں وساوس کو بالکلیہ پیدا ہی نہ ہونے دے یا وہ اپنے بُرے خیالات کو دِل میں آنے ہی نہ دے۔ بلکہ انسان تو صرف یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ ان خیالاتِ سو اور شیطانی وساوس کو علم وتعلیم اور شرعی احکام کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کرتا رہے۔نہ ہی تو ان وساوس وخیالات پر عمل کرے اور نہ ہی ان کا اظہار کسی کے سامنے کرے۔ بلکہ ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان وساوس کو دور کرنے کا وہ علاج اختیار کریں جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن

① صحیح مسلم: ۲٤۰

کعب رضی اللہ عنہ کے لیے اختیار کیا تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے سینے پر زور سے ہاتھ مارا، جس سے ان کے ضمیر پر چوٹ لگی۔ لہٰذا ہمیں بھی چاہیے کہ ہم وساوس کے وقت اپنے ضمیر کو اس زور سے جھنجوڑیں کہ ہمارے دِل سے وہ وسوسہ جھڑ جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقۂ علاج اختیار کیا تھا، آپ اُس میں سو فیصد کامیاب ہوئے تھے تب ہی تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا تھا میں پسینے پسینے ہو گیا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا گویا میں اللہ عزوجل کو دیکھ رہا ہوں۔ یعنی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرب سے اُن کے دِل کا آئینہ ایسا صاف ہوا کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی ذات صاف محسوس و دکھائی دینے لگی۔

ہم نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو کچھ بیان کیا وہ صرف خلاصہ ہے۔ اگر آپ اس بارے میں مزید تفصیلات چاہتے ہوں تو الشیخ محمد عبداللہ دراز رحمۃ اللہ علیہ کی "کتاب المختار" کا مطالعہ کیجیے۔ علامہ دراز رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں بہت ہی عمدہ کلام کیا ہے۔ یاد رہے یہ مقام وہ ہے جس پر بعض حضرات کے قدم پھسل چکے ہیں۔

آخر میں، میں (عبدالعظیم الزرقانی) اتنی بات کا اضافہ کرتا چلوں کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا جو واقعہ ہم نے بیان کیا۔ وہ واقعہ اس وجہ سے رونما ہوا تھا کہ وہ اس سے پہلے حروفِ سبعہ پر نزولِ قرآن سے ناواقف تھے۔ اس لیے انھیں اس معاملے میں معذور سمجھا جائے گا اور وہ کسی مستند دلیل کے متمنی تھے۔ چنانچہ جوں ہی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حروفِ سبعہ کے بارے میں سُنا تو تمام اشکالات دُور ہو گئے اور سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ نے سات حروف پر پڑھنے کی اجازت اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا السلام والتحیہ پر نرمی اور سہولت کی خاطر دی ہے۔ نیز حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کافی وشافی کلام کو سُن کر قلبی طور پر مطمئن ہو گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے مطمئن ہونے کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جن حضرات نے اس علم یعنی حروفِ سبعہ والے علم کو اُمت تک پہنچایا اُن میں حضرتِ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا نمایاں کردار ہے۔

④ عن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کان عند أضاۃ بنی غِفار۔ قال:
فأتاہ جبریل علیہ السلام فقال: ان اللہ یأمرك ان تقرأ امتك القرآن علی حرف. فقال: "أسأل اللہ معافاتہ ومغفرتہ وان امتی لاتطیق ذلك". ثم أتاہ فقال: ان اللہ یأمرك ان تقرأ امتك القرآن علی حرفین. فقال: "أسأل اللہ معافاتہ ومغفرتہ وان امتی لاتطیق ذلك." ثم جاءہ الثالثۃ فقال: ان اللہ یأمرك ان تقرأ أمتك القرآن ثلاثۃ احرف. فقال: "أسأل اللہ معافاتہ ومغفرتہ وان امتی لاتطیق ذلك." ثم جاءہ الرابعۃ فقال: ان اللہ یأمرك ان تقرأ أمتك القرآن سبعۃ احرف. فأیما حرف قرؤوا علیہ فقد أصابوا)).

"حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنوغفار کے تالاب کے پاس تشریف فرما تھے کہ اسی دوران حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی: اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا ہے کہ آپ کی امت قرآنِ مجید کو ایک حرف (قراءت) پر پڑھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کا سوال کرتا ہوں۔ میری اُمت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام دوبارہ تشریف لائے اور عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا ہے کہ آپ اپنی اُمت کو دو حرفوں (قراءتوں) پر قرآنِ کریم پڑھائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

④ الصحیح لمسلم: ۱۷۹۳

میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کا سوال کرتا ہوں۔ میری اُمت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام تیسری مرتبہ تشریف لائے اور عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا ہے کہ آپ اپنی اُمت کو تین حرفوں (قراءتوں) پر قرآنِ کریم پڑھائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کا سوال کرتا ہوں۔ میری اُمت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام چوتھی مرتبہ تشریف لائے اور عرض کیا: بے شک اللہ عزوجل نے آپ کو حکم فرمایا ہے کہ آپ اپنی اُمت کو سات حرفوں (قراءتوں) پر قرآنِ کریم پڑھائیے۔ جس حرف پر بھی آپ کی اُمت پڑھے گی وہ ٹھیک ہوگا۔"

فائدہ • "اَضاۃ بنی غِفار" میں اَضاۃ کے ہمزہ پر فتحہ جب کہ غفار کے غین کے نیچے کسرہ ہے۔ "اَضاۃ" پانی کے تالاب کو کہتے ہیں۔ یہ تالاب مدینہ منورہ میں تھا۔ بنوغفار کی طرف منسوب ہے کیونکہ قبیلہ بنوغفار نے یہاں آکر پڑاؤ ڈالا تھا۔

⑤ عن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ قال: لقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جبریل عند احجار المروۃ قال: فقال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لجبریل: "انی بعثت الی امۃ امیین فیھم الشیخ الفانی العجوز الکبیرۃ والغلام۔" قال: "فمرھم فلیقرءوا القرآن علی سبعۃ احرف۔" وقال الترمذی: حسن صحیح

"حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات مروہ کے پتھروں کے قریب حضرتِ جبرئیل علیہ السلام سے ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا: میں ایک اَن پڑھ اُمت کی طرف بھیجا گیا ہوں جس میں لبِ گور بوڑھے بھی ہیں، سنِ رسیدہ بوڑھیاں بھی، اور بچے بھی، حضرتِ جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: اُن کو حکم دیجیے کہ وہ قرآنِ مجید کو سات حروف پر پڑھیں۔" (امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے)۔"

ترمذی ہی کی دوسری روایت میں اَلفاظ یہ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا:

((یاجبریل انی ارسلت الی امۃ امیۃ: فیھم الرجل والمرأۃ والجاریۃ والشیخ الفانی الذی لم یقرأ کتابا قط۔" قال: إِنَّ القرآن انزل علی سبعۃ احرف)).①

"اے جبرئیل! مجھے اُمّی قوم کی طرف مبعوث کیا گیا ہے اس میں مردوزن، بچے (سب ہیں۔ بلکہ) ایسے شیخِ فانی بھی ہیں جنھوں نے کبھی کتاب (وغیرہ) پڑھی ہی نہیں۔ حضرتِ جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: بے شک قرآنِ مجید سات حروف (قراءتوں) میں نازِل ہوا ہے۔"

⑥ "عن ابی قیس مولیٰ عمرو بن العاص عن عمرو رضی اللہ عنہ ان رجلا قرأ آیۃ من القرآن فقال لہ عمرو: انما ھی کذا و کذا فذکر ذلک للنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال: ان ھذا القرآن انزل علی سبعۃ احرف فأی ذلک قرأتم أصبتم فلا تماروا)).

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام ابوقیس حضرتِ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے قرآن مجید کی ایک آیت پڑھی حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اُسے کہا کہ یہ آیت ایسے ایسے ہے۔ (یعنی تو نے جس طرح پڑھی ہے اُس طرح نہیں ہے)۔ پھر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے یہ بات حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی، تو آپ نے فرمایا: بے شک

① ترمذی: ۲۹۴۴

قرآنِ مجید سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔ پس تم (ان میں سے) جس طریقے سے بھی پڑھو گے ٹھیک ہے اور اس میں کوئی شک نہ کرو۔"

حدیث کے آخری الفاظ: "فلا تماروا" ہیں۔ القاموس میں ہے:

"ماراہ، مماراۃ، مراء، امتری فیہ اور تماری: ان تمام الفاظ کا ترجمہ شک ہی کیا جاتا ہے۔ نیز المریۃ (کسرہ اور ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی بھی شک اور جدل ہوتا ہے۔"

⑦ ((عن ابن مسعود قال اقرأني رسول الله صلى الله عليه وسلم سورة من آل حم فرحت الى المسجد فقلت لرجل: أقرأها فاذا هو يقرؤها حروفا ما أقرؤها. فقال: أقرأنيها رسول الله صلى الله عليه وسلم. فانطلقنا الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فأخبرناه فتغير وجهه وقال: "انما اهلك من قبلكم الاختلاف" ثم أسر الى علي شيئا. فقال علي: انّ رسول الله صلى الله عليه وسلم يأمركم ان يقرأ كل رجل منكم كما علم. قال: فانطلقنا وكل رجل يقرأ حروفا لا يقرؤها صاحبه)).[1]

"حضرتِ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سورۂ حم سجدہ پڑھائی۔ میں (پڑھنے کے بعد) مسجد کی طرف چل پڑا۔ وہاں میں نے ایک آدمی سے کہا کہ مجھے سورۂ حم سجدہ سناؤ۔ جب اُس نے مجھے یہ سورت سنائی تو اُس کے وہ حروف (قراءت) نہ تھی جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پڑھائی تھی۔ اُس نے کہا: مجھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح پڑھائی ہے۔ ہم (یہ مسئلہ لے کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری بات بتائی۔ (غصے کی وجہ سے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "(اختلاف ونزاع نہ کیا کرو) بے شک تم سے پہلی امتیں اختلاف ہی کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔" پھر حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کی اشارہ کیا۔ حضرتِ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھیں حکم دیا ہے کہ تم سے ہر شخص اُسی طرح پڑھے جس طرح اُسے سکھایا گیا ہے۔ حضرتِ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم وہاں سے چل دیے اور (ہم میں سے) ہر آدمی اُن حروف کے ساتھ پڑھتا تھا جن کے ساتھ اُس کا ساتھی نہیں پڑھتا تھا۔

⑧ ((عن ابن مسعود رضي الله عنه: انه سمع رجلا يقرأ آية سمع النبي صلى الله عليه وآله وسلم قرأ خلافها. قال: فاخذت بيده فانطلقت به الى النبي صلى الله عليه وآله وسلم فقال: "كلا كما محسن فاقرأ)).

قال شعبة احد رواة هذا الحديث: اكبر علمي ان النبي ﷺ قال: ((فان من كان قبلكم اختلفوا فاهلكوا)).[2]

"حضرتِ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک صاحب (حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ) کو ایک آیت پڑھتے سنا، وہی آیت انھوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے خلاف سُنی تھی۔ (ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ) پھر میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور انھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم دونوں صحیح ہو۔ اس لیے اپنے اپنے طور پر پڑھو۔"

امام شعبہ جو کہ اس حدیث کے رواۃ میں سے ایک ہیں، فرماتے ہیں: میرا غالب گمان یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی

① رواه الحاكم: ۲/ ۲۲۳، ۲۲٤، وابن حبان: ۷٤٦، ۷٤۷ ② رواه البخاري: ۵۰٦۲

فرمایا (اختلاف ونزاع نہ کیا کرو) کیونکہ تم سے پہلی اُمتوں نے اختلاف کیا اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں ہلاک کر دیا۔ (اس حدیث کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔)

⑨ عن زید بن ارقم رضی اللہ عنہ قال: جاء رجل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال: أقرأنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ سورۃ اقرأنیھا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ وأقرأنیھا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فاختلف قرأتھم فبقراءۃ ایُّھم آخذ؟ فسکت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وعلی رضی اللہ عنہ الی جنبہ فقال علی رضی اللہ عنہ: لیقرأ کل انسان منکم کما علم فانہ حسن جمیل)).[1]

"حضرتِ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں: ایک آدمی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا: مجھے ایک سورت حضرتِ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ پھر وہی سورت حضرتِ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ پھر وہی سورت حضرتِ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ (لیکن) ان سب کی قراءات آپس میں مختلف ہیں۔ پس میں ان میں سے کس قراءت کو اختیار کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ سُن کو خاموش رہے لیکن پہلو میں حضرتِ علی رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے۔ حضرتِ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم میں ہر انسان کو چاہیے کہ اُسے جس طرح پڑھایا گیا ہے، اُسی طرح پڑھے، اُس کے لیے وہ ہی بہتر اور اچھا ہے۔" (اس حدیث کو امام طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔)

⑩ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ انہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ان ھذا القرآن انزل علی سبعۃ احرف، فاقرءوا ولا حرج ولکن لا تختموا ذکر رحمۃ بعذابٍ، ولا ذکر عذاب برحمۃٍ.[2]

"حضرتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بے شک قرآنِ مجید سات حروف پر نازِل کیا گیا۔ پس تم ان تمام حروف پر پڑھو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن رحمت کے تذکرے کو تذکرۂ عذاب کے ساتھ اور عذاب کے تذکرے کو تذکرۂ رحمت کے ساتھ ملا کر ختم نہ کرو (یعنی ایسی جگہ وقف نہ کرو جہاں رحمت کا ذکر، عذاب کے ساتھ اور عذاب کا ذکر، رحمت کے ساتھ خلط ملط ہو جائے)۔"

احادیثِ حروفِ سبعہ سے مستنبط ہونے والے اُمور اور حکمتیں

ماسبق میں بیان کی گئی احادیث پر غور کیا جائے تو بہت سے اُمور ثابت ہوتے ہیں اور بہت سی حکمتیں سمجھ میں آتی ہیں، جو کہ نور کے مناروں، روشنی کی مشعلوں اور اندھیروں میں چراغ کا کام دیتی ہیں۔ ذیل میں چند امور اور حکمتیں بیان کی جا رہی ہیں، ان کا بغور مطالعہ حروفِ سبعہ کے مفہوم وحقیقت کو مزید واضح کر دے گا اور اس دقیق موضوع میں رشد وہدایت اور صواب وحق کا سبب بنے گا۔ ان شاء اللہ عزوجل

نوٹ: ذیل میں آٹھ حکمتیں اور آٹھ ہی ایسے اُمور تحریر کیے جا رہے ہیں جو حروفِ سبعہ والی بیان کردہ احادیث سے ماخوذ ہوتے ہیں۔

① رواہ الطبری فی تفسیرہ: ۱/ ۱۲،۱۳ ② رواہ الطبری فی تفسیرہ: ۱/ ۱۹

(پہلا اُمر یا پہلی حکمت) اُمت پر سہولت اور آسانی

احادیث کے مطالعے سے سب سے پہلی بات/اُمر یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید کو سات حروف یا قراءتوں میں اس لیے نازل کیا گیا کہ اُمت پر خصوصاً عرب پر سہولت و آسانی ہو سکے۔ کیونکہ عرب کی زبان میں قرآنِ کریم نازل ہوا۔ عرب میں بہت سے قبائل تھے۔ ان تمام قبائل میں لب ولہجہ اور الفاظ وحروف کی ادائیگی وتلفظ میں بھی اختلاف پایا جاتا تھا۔ ایک ہی لفظ کو ایک قبیلہ کسی اور طرح سے پڑھتا اور دوسرا قبیلہ کسی اور طرح سے پڑھتا، باوجود اس کے، کہ وہ سب ایک زبان اور ایک ملک کے لوگ تھے۔ اگر قرآن مجید کو ایک ہی حرف یعنی قراءت میں نازل کیا جاتا تو ان لوگوں پر بہت مشکل ہوتا۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجیے کہ ہم میں سے یعنی قاہرہ میں رہنے والوں میں سے کوئی شخص "السیوط" کے رہنے والوں کے تلفظ میں بات کرے تو ہمیں سمجھنے میں دقت پیش آئے گی۔ حالانکہ "السیوط" اور "القاھرۃ" دونوں مصر کے شہر ہیں۔ دونوں جگہ پر مصری زبان بولی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی ہمیں سمجھنے میں دشواری پیش آئے گی۔ پس یہ ہی صورتِ حال نزولِ قرآن کے وقت تھی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کو سات حروف یا قراءتوں میں نازل فرمایا۔ اور یہ ہی حروفِ سبعہ پر نزولِ قرآن کی پہلی اور بنیادی حکمت تھی۔

اب آپ پر ان احادیث کا مطلب بھی واضح ہو جائے گا جن میں حضورِ اکرم ﷺ بار بار حضرتِ جبرئیل علیہ السلام سے حروف کے بڑھانے کا مطالبہ کرتے رہے۔ دیکھیے اجزائے احادیث:

① فرددتُ الیہ اَن ھوِّنْ علی اُمتی

② اسأل اللّٰہ معافاتہٗ ومغفرتہٗ وانّ امتی لا تطیق ذلک

③ یاجبریل! انی اُرسلتُ الی امّۃٍ امّیّۃ فیھم الرجل والمرأۃ والغلام والجاریۃ والشیخ الفانی الذی لم یقرأ کتابا قطّ

امام محقق ابن جزری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"سات حروف پر قرآنِ مجید کو نازل فرمانے کے اسباب میں سے ہیں: اس اُمت پر تخفیف کرنا، قرآن پڑھنے میں آسانی پیدا کرنا، رحمتِ خداوندی کی وسعت کا ظہور اور اس بات کا اقرار کہ رسول اللہ ﷺ ساری مخلوق میں افضل اور اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ کیا دیکھتے نہیں کہ حضرتِ جبرئیل علیہ السلام نے آکر حضورِ اکرم سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ اپنی امت کو ایک حرف (قراءت) پر قرآن پڑھائیے۔ لیکن حضورِ اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے معافی مانگتے ہوئے، عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے اور مدد مانگتے ہوئے عرض کیا: میری اُمت اس کی (یعنی ایک ہی حرف پر قرآن پڑھنے) طاقت نہیں رکھتی۔ اور آپ مسلسل اللہ تعالیٰ سے حروف یعنی قراءتوں کی تعداد بڑھانے کی درخواست کرتے رہے یہاں تک کہ تعداد سات حروف پر پہنچ گئی۔"

گویا کہ قرآنِ مجید سات دروازوں میں سے سات حروف (قراءتوں) پر نازل ہوا، جب کہ سابقہ کتبِ سماویہ ایک دروازے سے ایک حرف (قراءت) پر نازل ہوئیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام خاص قوم اور خاص علاقے کی طرف مبعوث ہوتے تھے جب کہ ہمارے پیارے نبی حضرتِ محمد ﷺ تمام انسانیت کے لیے خواہ وہ گورے ہوں یا کالے، عربی ہوں یا عجمی، رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اور وہ عرب جن کی زبان میں قرآن کریم نازل ہوا ان کی لغات میں اور تلفظات میں بہت فرق پایا جاتا تھا۔ اور ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک حرف یا لفظ کو ایک لغت سے دوسری لغت میں منتقل کرنا آسان کام

نہیں تھا۔ ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنی بولی کے علاوہ دوسروں کی زبان بولیں۔ بلکہ بعض عربوں کی حالت تو یہ تھی کہ وہ پڑھانے اور سکھانے سے بھی دوسروں کی زبان نہیں سیکھ سکتے تھے، خاص طور پر بوڑھے مرد اور عورتیں اور وہ لوگ جو کتاب وغیرہ نہیں پڑھ سکتے تھے، جیسا کہ حضورِ اکرم ﷺ نے حدیث میں اشارہ بھی فرمایا ہے۔ پس اگر ان کو صرف ایک حرف، لغت یا قراءت پر مکلف کیا جاتا تو ان کو ایسی تکلیف میں مبتلا کرنا پایا جاتا جس کی ان میں طاقت و استطاعت نہیں تھی۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ ان کی طاقت سے باہر ہونے کی وجہ سے ان میں مایوسی پیدا ہو جاتی۔

نوٹ: اوپر جو کچھ بیان ہوا، وہ ان آٹھ اُمور میں سے پہلا اَمر ہے جو کہ دراصل آٹھوں حکمتوں میں سے پہلی حکمت کی تقریر ہے۔ ذیل میں بقیہ سات حکمتیں مذکور ہیں۔ اور ان حکمتوں کے بعد ان آٹھ اُمور میں سے بقیہ سات اُمور بیان کیے جائیں گے۔

(دوسری حکمت) امتِ مسلمہ کو ایک لسان پر جمع کرنا

ایک لسان سے "لسانِ قریش" مراد ہے۔ قرآنِ مجید بھی لسانِ قریش ہی میں نازل ہوا۔

قریش کے لوگ موسمِ حج اور عرب کے بازاروں میں نشیب و فراز سے آنے والے وفودِ عرب کے اَلفاظ میں سے جن کو بلیغ و لطیف سمجھتے ان کا چناؤ کر لیتے تھے اور پھر مزید تنقیح و تہذیب کے بعد انھیں اپنی مسلمہ متفقہ ٹکسالی لغت کے دائرے میں شامل کر لیتے جس کی مقتدائیت اور اہمیت و برتری سب عرب کے یہاں مسلّم تھی۔ اسی سیاستِ رشیدہ کے موافق قرآنِ کریم سبعہ احرف پر نازل ہوا۔ قرآنِ کریم نے قریشیوں کی سیاست کے اندازے سے کہیں اونچے معیار پر قبائلِ عرب کی لغات میں سے جو لغات چاہیں منتخب کر لیں۔ یہ ہی وہ نکتہ ہے جس کی بنا پر یہ کہنا یقیناً صواب و حق ہے کہ "قرآنِ کریم لغتِ قریش پر نازل ہوا ہے" کیونکہ اس نکتے کی روشنی میں کل عرب کی سب لغتیں قریشیوں کی ایک ہی لغت میں متشخص و مجتمع ہو گئی تھیں۔ اور اتحادِ ملی کے لیے اتحادِ لسانی بھی ایک اہم کردار اَدا کرتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت میں جب کوئی قوم وملت اپنے ابتدائی اَدوار سے گزر رہی ہو۔

(تیسری حکمت) احکام کی مزید وضاحت

قرآنِ مجید کو مختلف قراءتوں کے ساتھ نازل کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ بعض احکام کی وضاحت ہو گئی۔ مثلاً:

اللہ تعالیٰ کا اِرشاد ہے:

﴿وَ اِنۡ كَانَ رَجُلٌ يُّوۡرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امۡرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوۡ اُخۡتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ﴾ (النساء: ۱۲)

"اور اگر ایسے مرد یا عورت کی میراث ہو جس کے نہ باپ ہو نہ بیٹا مگر اس کے بھائی یا بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔"

حضرتِ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی قراءت اس طرح مروی ہے:

﴿وَلَهٗۤ اَخٌ اَوۡ اُخۡتٌ مِّنۡ اُمٍّ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ﴾

اس قراءت میں "مِنۡ اُمٍّ" کے اَلفاظ کا اضافہ ہے جو کہ آیت میں بیان کردہ حکم کی مزید وضاحت کیے دیتا ہے کہ اس آیت میں بھائی یا بہن سے شقیق (سگا) بھائی، بہن یا باپ شریک بھائی، بہن مراد نہیں ہے۔ بلکہ صرف اور صرف ماں شریک بھائی یا بہن مراد ہے۔ اور یہ وہ مسئلہ ہے جس پر سب کا اتفاق ہے۔

اس باب میں ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطۡعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيۡنَ مِنۡ اَوۡسَطِ مَا تُطۡعِمُوۡنَ اَهۡلِيۡكُمۡ اَوۡ كِسۡوَتُهُمۡ اَوۡ تَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ ؕ مُؤْمِنَةٍ﴾

"(قسم توڑنے کا) کفارہ دس ناداروں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل وعیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے دینا یا ایک غلام آزاد کرنا۔"

ایک قراءت کے مطابق آیتِ بالا درج ذیل اضافے کے ساتھ آئی ہے۔ دیکھیے پوری آیت:

﴿فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطۡعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيۡنَ مِنۡ اَوۡسَطِ مَا تُطۡعِمُوۡنَ اَهۡلِيۡكُمۡ اَوۡ كِسۡوَتُهُمۡ اَوۡ تَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ ؕ مُؤْمِنَةٍ﴾

اس قراءت میں لفظ "مُؤْمِنَةٍ" کا اضافہ ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قسم کے کفارے میں جو غلام آزاد کیا جائے گا، اُس کا مومن ہونا ضروری ہے۔ اور یہ قراءت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کفارۂ یمین والے مسئلے میں موید ہے۔

پس ثابت ہوا کہ سبعہ احرف سے بعض اوقات احکام کی وضاحت کا فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے۔

(چوتھی حکمت) دو مختلف احکام کو ایک ہی آیت میں جمع کرنا

قرآنِ مجید کو مختلف قراءتوں میں نازل کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ایک ہی آیت سے دو احکام بیان کر دیے گئے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاعۡتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الۡمَحِيۡضِ ۙ وَلَا تَقۡرَبُوۡهُنَّ حَتّٰى يَطۡهُرۡنَ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۲۲)

"سو ایامِ حیض میں عورتوں سے کنارہ کش رہو۔ اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان سے مقاربت نہ کرو۔"

اس آیت میں لفظ ﴿يَطۡهُرۡنَ ۚ﴾ میں دو قراءتیں ہیں۔ ایک: تخفیف کے ساتھ یعنی ﴿يَطۡهُرۡنَ ۚ﴾ اور دوسری: تشدید کے ساتھ یعنی ﴿يَطَّهَّرۡنَ ۚ﴾۔

صیغے میں تشدید والی قراءت کی وجہ سے عورتوں کے حیض سے پاکی حاصل کرنے میں مبالغے کے وجوب کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔ کیونکہ مبنیٰ کی زیادتی معنیٰ کی زیادتی پر دال ہوتی ہے۔ جب کہ تخفیف والی قراءت میں مبالغے کا فائدہ حاصل نہیں ہو رہا۔ مختصر یہ کہ اس ایک آیت میں پائی جانے والی دو مختلف قراءتوں سے درج ذیل دو مختلف احکام ثابت ہوئے۔

پہلا حکم پہلا حکم بغیر تشدید والی قراءت کی صورت میں ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس قراءت کے مطابق مرد کا عورت کے قریب جانے کے لیے عورت کا صرف پاک ہونا ضروری ہے، پاکی میں مبالغہ یعنی غُسل کا پایا جانا ضروری نہیں۔ اور عورت کا صرف پاک ہونا، حیض کے منقطع ہو جانے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس قراءت کے مطابق اگر کسی عورت کا حیض (مدتِ مقررہ کے بعد) رُک چکا ہے تو اُس کا شوہر اُس سے وطی کر سکتا ہے، اگرچہ عورت نے ابھی غُسل نہ کیا ہو۔ (یہ قراءت احناف اور ان کے ہم خیال حضرات کے مذہب کی مؤید ہے۔)

دوسرا حکم دوسرا حکم تشدید والی قراءت کی صورت میں ثابت ہوتا ہے۔ یعنی شوہر اپنی بیوی سے اُس وقت تک وطی نہیں کر سکتا جب تک اُس کی بیوی طہارت میں خوب مبالغہ یعنی غُسل نہیں کر لیتی۔ لہٰذا اس قراءت کے مطابق دونوں طہارتوں

یعنی حیض کا منقطع ہونا اور غسل کرنا، کا پایا جانا ضروری ہے۔ تشدید والی قراءت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہم خیال حضرات کے مذہب کی موید ہے۔

(پانچویں حکمت) دو مختلف حالتوں میں دو مختلف شرعی احکام کو ایک ہی آیت میں جمع کرنا

اختلاف قراءت یا تعدد قراءت کا ایک فائدہ یا حکمت یہ بھی ہے کہ دو مختلف حالتوں کے دو مختلف احکام کو ایک ہی آیت میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً وضو کرتے وقت اگر حالت یہ ہے کہ موزے نہیں پہنے ہوئے تو اس کے لیے پاؤں دھونے کا حکم ہے اور اگر حالت یہ ہو کہ موزے پہنے ہوئے ہوں تو اس کے لیے پاؤں دھونے کا نہیں بلکہ مسح کرنے کا حکم ہے۔ اب درج ذیل آیت ملاحظہ کیجیے کہ اختلاف قراءت کے سبب دو مختلف حالتوں کے دو مختلف احکام کو ایک ہی آیت میں کیسے یکجا کیا گیا ہے۔

﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ (المائدۃ:۶)

"(مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو) تو اپنے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو اور سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں دھو لیا کرو۔"

اس آیت میں موجود لفظ "اَرْجُلَكُمْ" کو ایک قراءت کے مطابق نصب یعنی "اَرْجُلَكُمْ" اور دوسری کے مطابق جر کے ساتھ یعنی "اَرْجُلِكُمْ" پڑھا گیا ہے۔ نصب کی صورت میں اس کا عطف "وُجُوْهَكُمْ" پر ہوگا، جو کہ منصوب ہے اور دھونے کا حکم رکھتا ہے لہٰذا "اَرْجُلَكُمْ" پر بھی وہ ہی حکم لاگو ہوگا۔ جب کہ جر کی صورت میں اس کا عطف "رُءُوْسِكُمْ" پر ہوگا، جو کہ مجرور ہے اور مسح کا حکم رکھتا ہے لہٰذا "اَرْجُلِكُمْ" بھی ممسوح ہوگا۔

نیز اس مسئلے کی وضاحت رسول اللہ ﷺ نے بھی فرما دی ہے کہ موزے پہننے والا مسح کرے گا جب کہ بغیر موزے والے پر پاؤں دھونا لازم ہوں گے۔

(چھٹی حکمت) غیر مقصود احتمال کو دُور کرنا

بعض مرتبہ کسی آیت میں کوئی ایسا احتمال پیدا ہو رہا ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا مقصود نہیں ہوتا تو تعدد قراءت کی وجہ سے وہ احتمال بھی دور کرنے کا فائدہ حاصل کیا گیا۔ مثلاً نمازِ جمعہ کے بارے میں قرآنِ مجید میں ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (الجمعۃ:۹)

"مومنو! جب جمعے کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔"

اس آیت میں لفظ "فَاسْعَوْا" کا معنی ہے: "دوڑو۔" اس میں یہ احتمال ہے کہ شاید جمعہ کی نماز وخطبہ کے لیے مسجد کی طرف دوڑ کر جانے کا حکم دیا جا رہا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا یہ مقصد نہیں کہ میرے بندے مسجد کی طرف دوڑتے ہوئے آئیں۔ اس لیے احتمال کو اس دوسری قراءت میں دور کر دیا گیا، جس میں "فَاسْعَوْا" کے بجائے "فَامْضُوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ" کے الفاظ ہیں۔ اور "فَامْضُوْا" کا مدلول دوڑنا نہیں ہوتا۔

(ساتویں حکمت) ابہام دور کرنا

بعض مرتبہ ایک آیت کے کسی لفظ میں ابہام ہوتا ہے اُس ابہام کو دور کرنے کا فائدہ بھی اختلافِ قراءت یا تعددِ قراءت سے حاصل ہوتا ہے۔ جیسے:

﴿وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ﴾ (القارعۃ:۵)

"اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے دھنکی ہوئی رنگ برنگی اُون۔"

"اَلْعِهْن" کے معنی میں ابہام تھا اس کو دوسری قراءت "كَالصُّوْفِ الْمَنْفُوْشِ" کے ذریعے دور کر دیا گیا کہ العھن سے "اَلصُّوْف" یعنی اون مراد ہے۔

(آٹھویں حکمت) گم راہ لوگوں کے گم راہ کُن عقائد و نظریات کا ردّ کرنا

بعض مرتبہ اختلافِ قراءت سے کسی گم راہ فرقے کے عقائدِ فاسدہ کو ردّ کرنے کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ جیسا رؤیت باری تعالیٰ کا عقیدہ ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿وَ اِذَا رَاَیْتَ ثَمَّ رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَّ مُلْكًا كَبِیْرًا﴾ (الدھر:۲۰)

"اور جنت میں جہاں آنکھ اُٹھاؤ گے نعمتیں ہی نعمتیں اور عظیم الشان سلطنت دیکھو گے۔"

جو لوگ رؤیت باری تعالیٰ کے قائل نہیں، اُن کے اس غلط عقیدے کو درج ذیل قراءت کے ذریعے ردّ فرما دیا جس میں "م" زبر اور "ل" کسرہ کے ساتھ ہے:

﴿وَ اِذَا رَاَیْتَ ثَمَّ رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَّ مَلِكًا كَبِیْرًا﴾

"اور جنت میں جہاں آنکھ اُٹھاؤ گے نعمتیں ہی نعمتیں اور عظیم الشان بادشاہ کو دیکھو گے۔"

اس قراءت میں ان لوگوں پر ردّ ہے جو روزِ آخرت میں رؤیت باری تعالیٰ کے منکر ہیں۔ یہاں "ملک" سے ذاتِ باری تعالیٰ مراد ہے۔ کیونکہ اس روز صرف وہ ہی بادشاہ ہو گا اور اُسی کی بادشاہت ہو گی:

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (المؤمن:۱۶)

"(کہا جائے گا) کس کی بادشاہی ہے آج؟ (جواب ایک ہی ہو گا کہ) اللہ کی جو اکیلا ہے بڑا زبردست ہے۔"

خلاصہ

(حروفِ سبعہ پر نزولِ قرآن کے باب میں اختلافِ قراءات سے تنوعِ قراءات مراد ہے۔ تنوعِ قراءات کا مطلب ہے "قراءات میں پایا جانے والا تنوع۔" دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجیے: اس باب میں اختلاف کا لفظ "تضاد" (Contradiction) کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ تنوع یعنی Variety کے معنی میں ہے۔ اختلاف کے لفظ کا تنوع کے معنی میں استعمال ہونا، قرآنِ مجید سے بھی ثابت ہے۔ دیکھیے:

﴿وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ ؕ﴾ (الروم:۲۲)

"تمہاری بولیوں اور رنگوں کا اختلاف۔"

اختلاف کے لفظ کا تنوع کے معنی میں استعمال ہونا ہماری اُردو زبان سے بھی ثابت ہے۔ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ (۱۷۸۹ء تا ۱۸۵۴ء) کا شعر دیکھیے:

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق! اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

تنوعِ قراءات، تعددِ آیات کی طرح ہے اور فن بلاغت کی اقسام میں ایک قسم ہے۔ اس کی ابتدا جمالِ ایجاز اور اس کی انتہا کمالِ اعجاز ہے۔

قرآنِ مجید کے اللہ تعالیٰ کے کلام ہونے پر جو بے نقیض براہین وادلہ موجود ہیں، اُن میں سے ایک برہان ودلیل "تنوعِ قراءات" ہے۔ اور یہ تنوعِ قراءات رسول اللہ ﷺ کی بھی صداقت کی دلیل ہے۔ کیونکہ اتنی کثرت کے ساتھ پایا جانے والا اختلاف لازمی طور پر اضطراب، تضاد اور تناقض وغیرہ جیسی کجیوں کو پیدا کرتا ہے۔ لیکن آپ قرآنِ کریم کو ابتدا سے انتہا تک پڑھ لیجیے اس میں غور وفکر کر لیجیے، کسی ایک آیت حتیٰ کہ ایک لفظ میں بھی آپ کو کسی قسم کا اضطراب، تضاد یا تناقض دِکھائی نہیں دے گا۔ بلکہ ہر ایک آیت دوسری آیت کی تصدیق وتائید کرتی اور شہادت دیتی ہوئی نظر آئے گی۔ سو یہ بات اس امر کی منہ بولتی دلیل ہے کہ یہ کلام اللہ کا کلام ہے، اس کا اسلوب اعلیٰ و بے نظیر ہے، ہدایت وتعلیم کی بلندیوں کے اعتبار سے اس کا ہدف اور معیار واحد و یکتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آج تک قرآنِ مجید میں کسی قسم کا کوئی تغیر وتبدل نہیں ہو سکا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآنِ مجید کی تمام قراءات من جانب اللہ ہیں۔ لہٰذا قرآنِ مجید کو جس قراءت میں بھی پڑھا جائے گا وہ اللہ کا معجز کلام ہی کہلائے گا۔ اور اس وقت معجزات بھی متعدد ہوں گے قراءات اور حروف کے متعدد ہونے کی وجہ سے۔

نوٹ ✿ حروفِ سبعہ والی احادیث سے ثابت ہونے والی آٹھوں حکمتیں (مکمل) اور آٹھ اُمور میں سے ایک اُمر اوپر بیان کر دیا گیا ہے۔ اب ذیل میں بقیہ سات اُمور بیان کیے جا رہے ہیں۔

(دوسرا اُمر) حروف یا قراءتیں سات کے عدد میں محصور ہیں

حروفِ سبعہ والی احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حروف میں زیادتی کی درخواست کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے چھ حروف یا قراءتوں کا اضافہ کیا گیا تھا۔ یہ چھ قراءات اس ایک قراءت کے علاوہ تھیں، جو حضرتِ جبریل علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کو پہلی مرتبہ پڑھائی تھی۔ پھر درخواست کے بعد اس ایک قراءت کے ساتھ چھ اور ملا دی گئیں اور اس طرح کُل سات قراءات بن گئیں۔ اور یہاں "سات" سے مراد وہ خاص عدد ہے، جو چھ اور آٹھ کے درمیان میں ہوتا ہے۔ اور جو لوگ کہتے ہیں کہ سات حروف میں "سات" سے کثرت مراد ہے جیسا کہ عرب میں رواج تھا کہ سات کا لفظ کثرت بتانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ تو ان کا یہ کہنا غلط ہے، کیونکہ اس موقع پر سات کثرت کے لیے نہیں بلکہ مشہور ومعروف عدد یعنی "سات" ہی کے معنی میں ستعمال ہوا ہے۔ ذیل میں دو احادیث مذکور ہیں ان کو بغور پڑھنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ سات حروف یا سات قراءات سے کثرتِ قراءات یا کثرتِ حروف مراد نہیں بلکہ سات حروف یا سات قراءات ہی مراد ہیں۔

① حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اقرأني جبريل على حرف، فراجعته، فلم ازل استزيده ويزيدني حتى بلغ سبعة احرف)).

"حضرتِ جبرئیل علیہ السلام نے مجھے (پہلے) ایک حرف پر پڑھایا، تو میں نے ان سے مراجعت کی اور مسلسل زیادتی طلب کی سو وہ (قرآنِ کریم کے حروف میں) مجھے (یعنی میرے لیے) اضافہ کرتے رہے یہاں تک کہ وہ سات حروف تک پہنچ گئے۔"

② اسی طرح حضرتِ ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے فرمایا:

((فَنَظَرْتُ اِلٰی مِیْکَائِیْلَ فَسَکَتَ فَعَلِمْتُ اَنَّہٗ قَدِ انْتَھَتِ الْعِدَّۃُ)).

"میں نے میکائیل کی طرف دیکھا تو وہ خاموش تھے، میں سمجھ گیا کہ اب (حروف کو مزید بڑھائے جانے کی گنجائش یا) تعداد ختم ہو چکی ہے"

(مکمل واقعہ یہ ہے: جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرتِ جبرائیل علیہ السلام سے قرآن کریم کی قراءات میں اضافہ طلب کیا تھا تو حضرت میکائیل علیہ السلام بھی اس موقع پر موجود تھے۔ حضرتِ جبرائیل نے ایک حرف پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھایا، تو حضرتِ میکائیل نے آپ سے عرض کیا: زیادتی کی درخواست کیجیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادتی طلب کی، حضرتِ جبرائیل علیہ السلام نے ایک اور حرف کی زیادتی کر دی۔ پھر حضرتِ میکائیل علیہ السلام نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: زیادتی کی درخواست کیجیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادتی طلب کی، حضرتِ جبرائیل علیہ السلام نے ایک اور حرف کی زیادتی کر دی.... یہ سلسلہ جب سات حروف تک پہنچا اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرتِ میکائیل علیہ السلام کی طرف دیکھا تو اب آپ خاموش تھے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سکوت سے سمجھ گئے کہ اب مزید گنجائش نہیں رہی، وگرنہ حضرتِ میکائیل علیہ السلام اس مرتبہ بھی مجھے زیادتی کی درخواست کا کہتے۔)

(تیسرا امر) ساتوں کے ساتوں حروف یا قراءتیں درست ہیں

ساتوں کے ساتوں حروف صواب و درست ہیں۔ اور پڑھنے والا بھی ان میں جس مرضی حرف کو اختیار کرے اُس پر کوئی ملامت نہیں کی جا سکتی۔ ذیل میں چند اُن احادیث کے اجزا ذکر کیے جا رہے ہیں جن سے یہ واضح ہو جائے گا کہ تمام قراءتیں درست ہیں۔

① فَاَیَّمَا قَرَءُوْا عَلَیْہِ فَقَدْ اَصَابُوْا

② اَصَبْتَ

③ کِلَا کُمَا مُحْسِنٌ

④ فَاَیَّ ذٰلِكَ قَرَاْتُمْ اَصَبْتُمْ

⑤ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرتِ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے سینے پر زور سے مارنا اور سمجھانا کہ ان حروفِ سبعہ میں سے جس کو اختیار کیا جائے درست ہے۔

مندرجہ بالا تمام نکات اس پر شاہد ہیں کہ قراءاتِ سبعہ میں سے بعض کو صحیح اور بعض کو غلط کہنا یا ماننا جائز نہیں ہے۔

(چوتھا اَمر) قراءات میں پایا جانے والا تنوع مِن جانبِ اللہ ہے

قراءات میں جو بھی اختلاف یا تنوع پایا جاتا ہے، وہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس میں کسی بشر کا کوئی عمل دخل نہیں۔ بلکہ مکمل قرآنِ کریم مع اختلافاتِ قراءات منزّل من اللہ ہے، جس کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے اخذ کیا ہے۔ جیسا کہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جب دو صحابہ قراءات کا اختلاف لے کر حضورِ اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو دونوں نے یہ ہی کہا: "اَقْرَأَنِيْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ" یعنی مجھے آپ ﷺ نے یہ سورت یا آیت ایسے ہی پڑھائی تھی۔ اور حضورِ اکرم ﷺ نے ان کے جواب میں فرمایا: "هٰكَذَا اُنْزِلَتْ" یعنی یہ اسی طرح نازل ہوئی ہے۔

بالفرض والمحال اگر قرآنِ مجید میں کسی بشر نے اپنی مرضی سے قراءات کا اختلاف یا کسی بھی قسم کا کوئی تغیر پیدا کیا ہوتا، خواہ وہ تغیر اَلفاظِ مرادفہ کا ہو یا غیرِ مرادفہ کا، بہر صورت قرآنِ مجید کا قرآن ہونا باطل ہو چکا ہوتا، کیونکہ قرآن تو نام ہی اُس کلام کا ہے جو صرف اللہ کا کلام ہو اس میں کسی فرشتے یا بشر کا عمل دخل نہ ہو۔ نیز قرآنِ مجید کا اعجاز بھی رُخصت ہو چکا ہوتا۔ حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں، بلکہ قرآنِ مجید آج بھی کلام اللہ ہے اور اعجاز کی اعلیٰ درجے پر فائز ہے۔

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝﴾ (الحجر:۹)

"بے شک یہ کتابِ نصیحت ہمیں نے اُتاری ہے اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔"

قرآنِ مجید میں تغیر و تبدیلی کے امکان کو بھی اللہ تعالیٰ نے جڑوں سمیت اکھاڑ کر پھینک دیا۔ جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۝ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَ لَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝﴾ (یونس:۱۵-۱۶)

"اور جب ان کو ہماری آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی امید نہیں وہ کہتے ہیں کہ یا تو اس کے سوا کوئی اور قرآن بنا لاؤ یا اس کو بدل دو۔ (اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے: مجھ کو اختیار نہیں ہے کہ اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو اُسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف آتا ہے۔ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے سخت دن کے عذاب سے خوف آتا ہے۔ (اے نبی ﷺ!) یہ بھی کہہ دیجیے: اگر اللہ چاہتا تو نہ میں ہی یہ کتاب تم کو پڑھ کر سناتا اور نہ وہ ہی تمھیں اس سے واقف کرتا۔ پس میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر رہا ہوں اور کبھی ایک جملہ بھی اس طرح کا نہیں کہا بھلا تم سمجھتے نہیں۔"

آنحضرت ﷺ افضل الخلائق ہیں۔ اُن پر قرآن نازل ہوا۔ وہ اُمت تک قرآن پہنچنے کا واحد ذریعہ ہیں۔ لیکن وہ بھی قرآنِ کریم میں کسی تبدیلی و تغیر کے حق دار نہیں تو ان کے علاوہ کسی کی کیا مجال؟ کہ وہ قرآنِ کریم میں موجود اَلفاظ کو ان کے مترادف

یا غیر مترادف اَلفاظ کے ساتھ تبدیل کرے۔ (سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ)

(پانچواں اَمر) قراءاتِ سبعہ سے روکنا جائز نہیں

قراءاتِ سبعہ سے روکنا جائز نہیں۔ کیوں کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((فَلَا تُمَارُوْا فِيْهِ، فَإِنَّ الْمِرَآءَ فِيْهِ كُفْرٌ)).

"پس تم ان قراءات میں شک مت کرو۔ بے شک ان (کے حق ہونے) میں شک کرنا کفر ہے۔"

سابقہ وہ تمام اَحادیث، جن میں حضرات عمر، ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم کا حضورِ اکرم ﷺ کے پاس جانے کا ذِکر ہے، اس امر کی گواہی دیتی ہیں کہ قراءاتِ سبعہ میں کوئی حرج نہیں اور اگر کوئی قرآنِ کریم کو ان مختلف قراءات کے ساتھ پڑھتا ہے تو اُس کو منع کرنا جائز نہیں۔ بلکہ ان سابقہ احادیث میں تو اس موقع پر حضورِ اکرم ﷺ کی طرف سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے لیے توبیخ بھی ثابت ہے۔

(چھٹا اَمر) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قرآنِ کریم کے ساتھ خلوص

تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دین کے معاملے کسی قسم کی زیادت ونقصان کو برداشت نہیں کرتے تھے اور قرآنِ کریم کے معاملے میں تو خصوصًا اس کا اہتمام کرتے تھے۔ قرآنِ کریم کے دفاع کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر قرآنِ کریم کے اَلفاظ کی ادائیگی یا لہجے میں بھی کسی طرف سے کوئی فرق سُننے کو ملتا تو فورًا اُس کی گرفت فرماتے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ قرآنِ کریم کے حوالے سے کسی بھی قسم کا سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جیسا کہ سابقہ اَحادیث میں آپ نے دیکھا کہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے حضرتِ ہشام رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا معاملہ کیا، حالاں کہ غلط حضرتِ ہشام رضی اللہ عنہ بھی نہیں تھے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا اور اُن کا ہاتھ پکڑ کر اُنھیں حضورِ اکرم ﷺ کے دربار میں لے آئے اور جب تک حضورِ اکرم ﷺ نے یہ فیصلہ نہیں سُنا دیا کہ ہشام بھی صحیح ہے، اُس وقت تک حضرتِ ہشام رضی اللہ عنہ کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اسی طرح کے اور بھی واقعات آپ نے پڑھے جن میں حضرتِ ابی بن کعب، حضرتِ عبداللہ بن مسعود اور حضرتِ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم وغیرہ حضرات کا ذِکر ہے۔

(ساتواں اَمر) اختلافِ قراءات کے مسئلے پر اُلجھنا جائز نہیں

ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم اختلافاتِ قراءات والے مسئلے کو لے کر آپس میں جنگ وجدال کا بازار گرم کریں۔ یا ایک دوسرے پر صحیح وغلط کا حکم جاری کریں۔ یا اس اختلاف کو آپس میں سببِ تعصب وعناد بنائیں۔ بلکہ یہ سوچیں کہ یہ قراءات کا اختلاف اللہ تعالیٰ کی رحمت ونعمت ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اُمت پر آسانی و سہولت کی خاطر اس کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ لہٰذا ہم آپس میں لڑائی جھگڑا کر کے اِس سہولت کو صعوبت میں یا یُسر کو عُسر میں تبدیل مت کریں۔ حدیثِ رسول ﷺ ہے: "فلا تماروا فیہ فان المراء فیہ کفر"

نیز حضرتِ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی مستحضر رہے کہ اسی اختلاف اور دل میں ان قراءات سے متعلق وسوسہ لانے کی وجہ سے حضورِ اکرم ﷺ کے چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہوا اور آپ ﷺ نے حضرتِ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے سینے پر زور سے ہاتھ مارا۔ لہٰذا

کسی ایک قراءت کو صحیح سمجھتے ہوئے دوسری قراءات کے بارے میں شک کرنا ہمارے لیے جائز نہیں۔ تمام قراءات اللہ تعالیٰ کی طرف سے منزل ہیں۔

(آٹھواں اَمر) اختلافاتِ قراءات کا تعلق اَلفاظ کے ساتھ ہے نہ کہ معانی کے ساتھ

اختلافاتِ قراءات اصل میں اَلفاظ کا اِختلاف ہے۔ اور اس اختلاف سے معانی میں کوئی اختلاف وارد نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جب بھی اختلاف ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے ہر ایک کی قراءت کو سُنا اور سب کی تصویب فرمائی۔ مثلاً حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

((اذا هو يقرؤها على حروف كثيرة لم يقرئنيها رسول الله صلى الله عليه واٰله وسلم)).

پھر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کی قراءت سُنی اور فرمایا: "هكذا انزلت"

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: "اى ذلك قرأتم فقد اصبتم"

بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ قراءات کا اختلاف محض اَلفاظ کا اختلاف تھا نہ کہ معانی کا۔

(قراءات کا اختلاف محض اَلفاظ کا اختلاف تھا نہ کہ معانی کا" اس جملے کا یہ مطلب ہے کہ قراءات کے اختلاف سے معانی میں کوئی ایسا اختلاف پیدا نہیں ہوتا تھا، جس سے حکم ہی بدل جائے۔ مثلاً اگر کسی آیت کی ایک قراءت سے کسی چیز کی تحریم کا حکم ثابت ہو رہا ہو تو ایسا ہرگز نہیں کہ اُسی آیت کی دوسری قراءت سے اُس چیز کی تحلیل ثابت ہو جائے۔ از مترجم)

حروفِ سبعہ پر نزولِ قرآن کی لغوی تحقیق

لفظِ قرآن: اس بارے میں تفصیلی بحث پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

لفظِ انزال: اس بارے میں تحقیق تیسرے باب میں گزر چکی ہے۔

لفظِ سبعہ: اس کی تحقیق اسی باب میں بیان ہوئی ہے کہ سبعہ سے مراد مشہور عدد "سات" مراد ہے۔ وہ سات جو چھ اور آٹھ کے درمیان میں ہوتا ہے۔ یعنی سات سے کثرت مراد نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض لوگوں کو وہم ہوا ہے اور انھوں نے سات سے کثرت مراد لی ہے۔

لفظِ احرف: احرف جمع ہے حرف کی۔ اور حرف کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ علامہ مجد الدین محمد بن یعقوب الفیر وز آبادی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۸۱۷ ہجری) نے اپنی کتاب "القاموس المحیط" میں حرف کے دَس معانی لکھے ہیں:

① کسی چیز کا کنارہ ② کسی شے کی دھار، ③ کسی چیز کا پہلو ④ کسی چیز کی انتہا ② پہاڑ کی انتہائی بلندی ③ حروفِ تہجی میں سے ایک حرف ④ کمزور اونٹنی ⑤ لاغر اونٹنی ⑥ بہت بڑی اونٹنی ⑦ پانی کا سیلاب ⑧ وادیٔ بنو سُلَیم میں نصب وہ اُونچے سیاہ پتھر جو راستے میں نشانی کے طور لگائے گئے تھے۔ ⑨ نحویوں کے نزدیک حرف اس کو کہتے ہیں جس کا معنی اسم یا فعل کے ملائے بغیر سمجھ میں نہ آئے ⑩ حرف کا لفظ قرآنِ مجید میں پہلو اور کنارے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ دیکھیے سورۃ الحج آیت نمبر ۱۱:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ﴾ (الحج:١١)

"اور لوگوں میں وہ شخص بھی ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔" (توضیح القرآن۔ از مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی)

یعنی وہ لوگ قلبی اطمینان یا دلی خوشی اور بشاشت کے ساتھ اللہ کی عبادت نہیں کرتے بلکہ شک وشبہ میں مبتلا رہتے ہیں۔ جب اپنے اعمالِ بد کی وجہ سے کوئی تنگی آتی ہے تو اللہ اللہ کرنے لگتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خوشی ملتی ہے تو خوشی دینے والے ہی کو یعنی اللہ تعالیٰ کو بھول بیٹھتے ہیں۔

سات حروف سے لغاتِ عرب میں سے سات لغات مراد ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک ہی حرف میں ساتوں صورتیں پائی جائیں۔ بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ معمولی سے فرق کے ساتھ یہ ساتوں لغات پورے قرآنِ مجید میں متفرق طور پر پائی جاتی ہیں۔

"حرف" کا اتنے زیادہ معانی پر اطلاق ہونا، اس بات کی دلیل ہے کہ "حرف" مشترک اَلفاظ کے قبیل سے ہے۔ اور مشترک اَلفاظ وہ ہوتے ہیں جن کے معانی میں سے کوئی ایک معنی قرینۂ قیاس اور موقع کی مناسبت سے منتخب کیا جاسکتا ہو۔ اور اس وقت سب سے مناسب معنی ہے: "وجہ" یعنی صورت۔ جمع اس کی "وجوہ" آئے گی۔ اس کی تفصیل ہم آئندہ بیان کریں گے جو کہ اُس تفصیل سے مختلف ہوگی جسے صاحب القاموس وغیرہ نے بیان کیا تھا کیونکہ انھوں نے قاموس کے اعتبار سے تفصیل بیان کی ہے۔

لفظِ "عَلٰی": حضورِ اکرم ﷺ کے اِرشاد: "انزل القرآن علی سبعة احرف" میں لفظِ عَلٰی اس طرف مشیر ہے کہ یہ مسئلہ وسعت اور تیسیر کے ساتھ مشروط ہے۔ یعنی قرآنِ کریم کو قاری کے لیے وسعت (سہولت) کرتے ہوئے سات وُجوہ میں نازل کیا گیا کہ وہ ان ساتوں میں سے جس کو چاہے پڑھے خواہ وہ اُس کے ساتھی سے مختلف ہو۔ گویا کہ آپ ﷺ کے اِرشادِ مبارک کا مطلب یہ ہوا: قرآنِ مجید کو حروفِ سبعہ پر اس غرض اور شرط کے ساتھ اُتارا گیا کہ اس سے اُمت پر سہولت اور وسعت ہوگی۔ حدیث کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ قرآنِ مجید کا ایک ایک لفظ اوجہِ سبعہ پر پڑھا جاسکتا ہے ورنہ آپ ﷺ اپنے ارشاد میں لفظِ "عَلٰی" استعمال نہ فرماتے، بلکہ یوں فرماتے: انّ ھٰذا القرآن انزلَ سبعةَ احرفٍ۔ لہٰذا قرآنِ کریم کو حروفِ سبعہ پر نازل کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ قرآنِ کریم کے ہر لفظ کو سات طریقوں سے پڑھا جاسکتا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم اپنے دامن میں وسعت لیے اس شرط پر اُترا ہے کہ اختلاف کی صورتیں ان سات سے زائد نہ ہونے پائیں۔ خواہ ایک لفظ کی ادائیگی میں کتنا ہی تنوع پیدا ہو جائے یا خواہ ایک ہی کلمے کی قراءت یعنی اس کو پڑھنے کے مختلف طریقوں کی بھرمار ہو جائے۔ جیسے:

① ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (الفاتحہ:٣)

اس آیت کو پڑھنے کے طریقوں کی تعداد سات یا دس تک پہنچی ہوئی ہے۔

② ﴿وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ﴾ (المائدہ:٦٠)

آیت کے اس جزو کو بائیس طریقوں سے پڑھا جاسکتا ہے۔

③ ﴿اُفٍّ﴾ (الاسرا:٢٣، الانبیاء:٦٧، الاحقاف:١٧)

ابوالحسن علی بن عیسیٰ الرمانی (٢٩٦ھ/٩٠٩ء تا ٣٨٤ھ/٩٩٤ء) جو کہ ماہرِ لغات ہیں، انھوں نے اس ایک لفظ یعنی "اُفٍّ" کے اندر سینتیس (٣٧) لغات بتائی ہیں۔

یہ اور اس طرح کی تمام مثالوں کے اندر پایا جانے والا تغیر اپنی کثرت کے باوجود وجوہِ سبعہ سے باہر نہیں نکلتا۔

"وجوہِ سبعہ" کا مفہوم، پسندیدہ قول کے مطابق

یہ سوال ابھی تک ہمارے اوپر باقی ہے کہ "وجوہِ سبعہ" سے ایسی کون سی وجوہ مراد ہیں کہ ایک کلمہ اپنے اندر پائی جانے والی کثیر قراءات اور تنوع کے باوجود وجوہِ سبعہ سے باہر نہیں نکلتا۔

پس اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں بہت سی قیل وقال اور جدال واختلافات کا سامنا کرنا پڑا اور پھر آخرکار اللہ کی توفیق وہدایت سے جو قول ہم نے اختیار کیا وہ امامِ ابوالفضل الرازی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ دیکھیے:

امام ابوالفضل عبد الرحمان بن احمد بن الحسن الرازی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب اللوامح الکلام میں فرماتے ہیں: قراءتوں میں جو اختلاف پائے جاتے ہیں وہ درج ذیل سات وجوہ (اَقسام) میں منحصر ہیں:

(پہلی قِسم) اَسماء میں مفرد، تثنیہ، جمع اور تذکیر وتانیث کے اعتبار سے اختلاف

یعنی ایک قراءت میں ایک لفظ مفرد آیا ہو اور دوسری قراءت میں وہی لفظ تثنیہ یا جمع آ گیا ہو۔ یا ایک قرأت میں ایک لفظ تذکیر کے ساتھ آیا ہو اور دوسری قراءت میں وہ ہی لفظ تانیث کے ساتھ آ گیا ہو۔

① **مثال** ﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ﴾ (المؤمنون:۸) اور (المعارج:۳۲)

ایک قراءت کے مطابق "لِاَمٰنٰتِهِمْ" جمع کے ساتھ ہے جب کہ دوسری قراءت میں اسے واحد کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

② **مثال** ﴿وَلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ (البقرۃ:۴۸)

ایک قراءت کے مطابق "لَا یُقْبَلُ" تذکیر کے ساتھ ہے جب کہ دوسری قراءت میں تانیث کے ساتھ پڑھا گیا ہے: "لَا تُقْبَلُ"۔

(دوسری قِسم) اَفعال میں ماضی، مضارع یا اَمر کے صیغوں کے اعتبار سے اختلاف

③ **مثال** ﴿فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا﴾ (سباء : ۱۹)

ایک قراءت میں "رَبَّنَا" منادیٰ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور لفظِ "بَاعِدْ" فعلِ امر کیونکہ یہ مقامِ دُعا ہے اور اس مقام کے لیے یہ ہی مناسب ہے۔ دوسری قراءت میں "رَبُّنَا" مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ اور لفظِ "بَعَّدَ" فعل ماضی اور مضعف العین ہے۔ اور یہ پورا جملہ "جملہ خبریہ" ہے۔ دوسری قراءت کے مطابق آیت یوں ہے:

﴿فَقَالُوْا رَبُّنَا بَعَّدَ بَیْنَ اَسْفَارِنَا﴾

(تیسری قسم) اعراب کے اعتبار سے اختلاف

① **مثال** ﴿وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّلَا شَهِیْدٌ﴾ (البقرۃ:۲۸۲)

یُضَآرَّ کے راء کو ایک قراءت میں فتحہ جب کہ دوسری میں ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔
اگر "لَا" نہی کے لیے ہو تو لائے نہی کے بعد فعل مجزوم ہوتا ہے۔
اور اگر "لَا" نفی کے لیے ہو تو لائے نفی کے بعد فعل مرفوع ہوتا ہے۔

② **مثال** ﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ﴾ (البروج:۱۵)

ایک قراءت میں "الْمَجِیْدُ" کو مرفوع جب کہ دوسری میں مجرور پڑھا گیا ہے۔ "ذُو" کی صفت بننے کی صورت میں یہ مرفوع جب کہ "الْعَرْشِ" کی صفت بننے کی صورت میں مجرور پڑھا جائے گا۔

(چوتھی قسم) الفاظ میں کمی، زیادتی کا اختلاف

مثال ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰۤى﴾ (اللیل:۳)
اس آیت کو ایک قراءت میں ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰۤى﴾ پڑھا گیا ہے۔ جب کہ دوسری قراءت میں ﴿وَمَا خَلَقَ﴾ کے بغیر یعنی ﴿الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰۤى﴾ پڑھا گیا ہے۔

(پانچویں قسم) تقدیم و تاخیر کا اختلاف

مثال ﴿وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ (قٓ:۱۹)
اس آیت کو دوسری قراءت کے مطابق ﴿وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ﴾۔

(چھٹی قسم) الفاظ کا ایسا اختلاف جس سے حروف بدل جائیں

① **مثال** ﴿وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا﴾ (البقرۃ:۲۵۹)

دوسری قراءت میں "نُنْشِزُهَا" میں "زاء" کے بجائے "راء" پڑھی گئی ہے۔ یعنی: ﴿وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِرُهَا﴾

② **مثال** ﴿وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ﴾ (الواقعۃ:۲۹)

دوسری قراءت میں ﴿وَّطَلْحٍ﴾ کو حاء کی بجائے عین کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ یعنی: ﴿وَّطَلْعٍ مَّنْضُوْدٍ﴾

(ساتویں قسم) لہجوں کا اختلاف

جیسے تخفیف، تفخیم، امالہ، مد، قصر، اظہار اور ادغام وغیرہ۔

① **مثال** ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ مُوْسٰى﴾ (النازعات:۱۵)

② **مثال** ﴿بَلٰى قٰدِرِیْنَ﴾ (القیامۃ:۴)

دوسری قراءت میں ان تینوں الفاظ یعنی "اَتٰی. مُوْسٰی. بَلٰی" کو امالہ کر کے پڑھا گیا ہے۔

امام ابوالفضل الرازی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو پسند کرنے کے وجوہات

ہم نے امام ابوالفضل رازی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو اختیار کیا، اس کی چار وجوہات ہیں۔

پہلی وجہ حروفِ سبعہ پر نزولِ قرآنِ مجید کے دلائل میں ذکر کی گئی دس احادیث اور ان کے مثل جتنی بھی احادیث ہیں، تمام سے اسی قول کی تائید ہوتی ہے۔

دوسری وجہ یہ قول اُن اُمور کے بھی مطابق ہے جو اُن دس اَحادیث سے ثابت ہوئے تھے، جنھیں حروفِ سبعہ پر قرآنِ مجید کے نزول کے اثبات پر پیش کیا گیا تھا۔

تیسری وجہ اس مذہب یا قول میں امام ابوالفضل الرازی رحمہ اللہ نے جو استقرا بیان کیا ہے وہ سب سے زیادہ منضبط، مستحکم اور جامع و مانع ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی بھی اختلاف چھوٹا ہوا نہیں۔ جب کہ دیگر اقوال یا مذاہب میں جو استقرا بیان ہوا ہے۔ ان میں کچھ اختلافات مفقود ہیں۔ مثلاً کسی قول میں تقدیم و تاخیر کا اختلاف موجود نہیں، تو کسی میں بدلیت کا اختلاف مفقود ہے اور کوئی قول لہجات والے اختلاف سے عاری ہے۔ مختصر یہ کہ اس قول کے علاوہ تمام اقوال میں کوئی نہ کوئی نقص موجود ہے۔ لہٰذا اگر اُن دیگر اَقوال کی پیروی کی جائے تو یہ لازم آئے گا کہ آنحضور ﷺ جو کہ جامع الکلام ہیں، اُن کے کلام سے ثابت ہونے والی حصر غیر صحیح ہے۔ اور یہ تو خطائے عظیم اور اثم کبیر ہے۔

چوتھی وجہ اس قول کو اختیار کرنے والا اُن تمام ملامتوں، اعتراضات اور محذورات سے محفوظ رہتا ہے، جن سے دیگر اقوال کو اختیار کرنے والا محفوظ نہیں رہ سکتا۔

"وجوہِ سبعہ" کے مفہوم سے متعلق دیگر اقوال

قرآنِ مجید کے سات حروف میں نازل ہونے سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں اقوال کا شدید اختلاف ہے جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا۔ لیکن ہمارے نزدیک قرآنِ کریم کے "سات حروف" کی سب سے راجح تشریح اور بہترین تعبیر وہ ہے جو امام ابوالفضل الرازی رحمہ اللہ کے قول سے مستنبط ہوتی ہے۔ یعنی:

حدیث میں "حروف کے اختلاف" سے مراد "قراءتوں کا اختلاف" اور سات حروف سے مراد "اختلافِ قراءات" کی سات نوعیتیں ہیں۔

تتبع و تحری کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حروفِ سبعہ سے متعلق دیگر اقوال میں تین اقوال ایسے ہیں جو اوپر بیان کردہ راجح ترین اور عمدہ تعبیر سے ملتے جلتے ہیں۔ اُن تین اقوال میں سے پہلا قول امام ابنِ قتیبہ رحمہ اللہ (۲۱۳ھ/۸۲۸ء تا ۲۷۶ھ/۸۸۹ء)، دوسرا محقق ابن جزری رحمہ اللہ (۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء تا ۸۳۳ھ/۱۴۲۹ھ) اور تیسرا قاضی ابوبکر الطیب باقلانی رحمہ اللہ (متوفی: ۴۰۳ھ) کا ہے۔

ان تینوں حضرات کے اقوال اور امام ابوالفضل الرازی کے قول سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ سب حضرات اس بات پر تو متفق ہیں کہ حدیث میں "سات حروف" سے مراد اختلافِ قراءات کی سات نوعیتیں ہیں، لیکن پھر ان نوعیتوں کی تعین میں ان حضرات کے اقوال میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے قراءات کا استقرا اپنے اپنے طور پر الگ الگ بیان کیا ہے۔ لیکن امام ابوالفضل الرازی رحمہ اللہ کا استقرا "اهدى منهم سبيلًا واكثر توفيقًا" کا مصداق ہے۔ حتی کہ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ جیسے محقق نے امام ابوالفضل الرازی رحمہ اللہ کے قول کے بارے میں کہا:

((قلتُ وقد اخذ الرازی كلام ابن قتيبة ونقحه)).

"میں کہتا ہوں کہ امام ابوالفضل رازی نے ابن قتیبہ کا قول اختیار کر کے اُسے اور نکھار دیا۔" (فتح الباری، ص ۲۴، ج ۹)

محقق علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے امام ابوالفضل رازی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو اختیار کیا ہے۔ مثلاً الشیخ الخضری الدمیاطی اور علامہ الشیخ محمد بخیت المطیعی رحمہما اللہ۔ لیکن ان حضرات نے ان فروقِ دقیقہ کو بیان نہیں کیا جن کو امام ابوالفضل الرازی رحمۃ اللہ علیہ اور ان تینوں متقدمین علماء نے بیان کیا تھا۔ لہٰذا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ان تینوں اقوال کو بھی آپ کے پیشِ خدمت کیا جائے تا کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب یا قول کے مزید انوارات آپ پر عیاں ہو جائیں۔

① امام ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول

حروفِ سبعہ سے وہ سات وجوہ مراد ہیں جن کی وجہ سے تغایر پیدا ہوتا ہے۔ (وہ سات وجوہ درج ذیل ہیں۔)

① **تغایر اعراب** ✿ یعنی اعراب کا تغیر یا تبدُّل۔ اس صورت میں نہ ہی معنی میں کوئی تغیر پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی لفظ کی ہیئت میں۔

مثال ✿ ﴿وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ﴾ (البقرۃ: ۲۸۲)

﴿يُضَآرَّ﴾ کے راء کو ایک قراءت میں فتحہ جب کہ دوسری میں ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

② **تغایر فعل** ✿ یعنی فعل کا تغیر و تبدل۔

مثال ✿ ﴿فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا﴾ (سباء: ۱۹)

دوسری قراءت کے مطابق یہ آیت یوں ہے: ﴿فَقَالُوْا رَبُّنَا بَعَّدَ بَيْنَ اَسْفَارِنَا﴾

③ **تغایر لفظ** ✿ یعنی الفاظ کا تغیر و تبدل۔

مثال ✿ ﴿وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا﴾ (البقرۃ: ۲۵۹)

دوسری قراءت میں "نُنْشِزُهَا" میں زاء کے بجائے "راء" پڑھی گئی ہے۔ یعنی: ﴿وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِرُهَا﴾

④ **قریب المخارج حروف کا تغایر** ✿ یعنی وہ حروف جو قریب المخرج ہوں اُن کا تغیر و تبدل۔

مثال ✿ ﴿وَّ طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ﴾ (الواقعۃ: ۲۹)

دوسری قراءت میں ﴿وَّ طَلْحٍ﴾ کو حاء کی بجائے حاء کے قریب المخرج حرف یعنی عین کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ یعنی: ﴿وَّطَلْعٍ مَّنْضُوْدٍ﴾

⑤ **تغایر تقدیم و تاخیر** ✿ یعنی تقدیم و تاخیر میں تغیر و تبدل۔

مثال ✿ ﴿وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ (قٓ: ۱۹)

اس آیت کو دوسری قراءت کے مطابق ﴿وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ﴾۔

⑥ **تغایر زیادۃ و نقصان** ✿ یعنی الفاظ کو کم کرنے یا بڑھا دینے کی صورت میں تغیر و تبدل۔

مثال ✿ ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى﴾ (اللیل: ۳)

اس آیت کو ایک قراءت میں ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى﴾ پڑھا گیا ہے۔ جب کہ دوسری قراءت میں ﴿وَمَا خَلَقَ﴾ کے بغیر یعنی ﴿الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى﴾ پڑھا گیا ہے۔

⑦ **تغایرِ کلمہ** ✿ یعنی ایک مکمل کلمے کو دوسرے کلمے کے ساتھ تبدیل کر دینا۔

مثال ✿ ﴿ کَالۡعِہۡنِ الۡمَنۡفُوۡشِ ۝ ﴾ (القارعۃ:٥)

دوسری قراءات کے مطابق یہ آیت یوں ہے: ﴿ وَ کَالصُّوۡفِ الۡمَنۡفُوۡشِ ﴾

② امام محقق ابن جزری رحمۃ اللہ علیہ کا قول

میں نے صحیح، شاذ، ضعیف اور منکر ہر قسم کی قراءات کی چھان بین کر کے بخوبی دیکھ لیا کہ ان سب کا اختلاف سات وجوہ کی حد سے آگے نہیں بڑھتا۔ اور وہ سات یہ ہیں:

① اختلافِ حرکات بلا تغیرِ معنی و ہیئت: یعنی حرکات میں ایسا اختلاف پایا جائے جس سے الفاظ کے معنی یا ہیئت میں کوئی تغیر واقع نہ ہو۔ جیسے لفظِ "اَلۡبُخۡل" چاروں وجوہ ضمہ، فتحہ، کسرہ اور جزم کے ساتھ اور اسی طرح لفظِ "یَحۡسِبُ" دو وجوہ فتحہ اور کسرہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

② اختلافِ حرکات با تغیرِ معنی و ہیئت: یعنی حرکات میں ایسا اختلاف پایا جائے جس سے الفاظ کا معنی بھی بدل جاتا ہو۔

مثال ✿ ﴿ فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ ﴾ (البقرۃ:٣٧)

دوسری قراءات میں "آدَمَ" منصوب ہے۔ یعنی: ﴿ فَتَلَقّٰۤی اٰدَمَ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٌ ﴾

اس صورت میں حرکات کے ساتھ ساتھ معنی میں بھی تبدیلی آتی ہے۔

③ پھر اختلاف کا انحصار یا تو حروف میں ہوگا مگر اس طرح کہ معنی بدل جائیں صورت نہ بدلے۔ جیسے: "تَبۡلُوۡا" اور "تَتۡلُوۡا"

④ یا اس برعکس یعنی معنی نہ بدلیں اور صورت بدل جائے۔ جیسے: ① "بَصۡطَۃً" اور "بَسۡطَۃً" ② "الصِّرَاط" اور "السِّرَاط"۔

⑤ یا لفظ کی صورت اور معنی دونوں بدل جائیں۔ جیسے: "فَامۡضُوۡا" اور "فَاسۡعَوۡا"

⑥ اختلافِ تقدیم و تاخیر: یعنی تقدیم و تاخیر میں اختلاف ہو۔

مثال ✿ ﴿ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَ یُقۡتَلُوۡنَ ۟ وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىۃِ ﴾ (التوبہ:١١١)

دوسری قراءات کے مطابق اس آیت میں تقدیم و تاخیر یوں پائی جاتی ہے کہ اس میں دوسرے یقتلون کو مقدم جب کہ پہلے یقتلون کو مؤخر کر کے پڑھا جاتا ہے۔

⑦ اختلافِ زیادت و نقصان: یعنی الفاظ کی کمی بیشی میں اختلاف ہو۔ جیسے: "اَوۡصٰی" اور "وَوَصّٰی"

غرض کہ یہ سات صورتیں ہیں کہ اختلافِ قراءات ان کے دائرے سے باہر نہیں جاتا۔

(ف: "ابن الجزری" یا "الجزری" کے نام سے متعدد علمائے کرام گزرے ہیں۔ جیسا کہ فضیلۃ الشیخ عمر رضا کحالہ نے اپنی کتاب "معجم المؤلفین (تراجم مصنفی الکتب العربیہ) مطبوعہ: مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت" میں اکیس (٢١) کے قریب اس نام کے علمائے کرام کے اسماء و کنیتیں لکھی ہیں۔ لیکن یہاں ابن الجزری سے مراد قراءات کے مشہور امام ہیں۔ جن کا پورا نام یہ ہے: شمس الدین ابوالخیر محمد بن محمد بن محمد الجزری الشافعی)

③ قاضی ابوبکر الطیب باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول

امامِ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی ابوبکر الطیب باقلانی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے۔

میں نے قراءات میں اختلاف کی وجوہ تلاش کیں تو مجھے سات وجوہِ اختلاف ملیں۔

① حرکات میں ایسا اختلاف جس سے معنی اور الفاظ کی صورت میں کوئی فرق نہ پڑے۔ جیسے: ﴿هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ﴾ (ھود:۷۸) اس آیت میں لفظِ "اَطْهَرُ" کے راء کو ایک قراءت میں مضموم کی بجائے ساکن پڑھا گیا ہے۔ یعنی ﴿هُنَّ اَطْهَرْ لَكُمْ﴾۔ ایسے ہی: "يَضِيْقُ صَدْرِیْ" اور "يَضِيْقْ صَدْرِیْ" ہے۔ یعنی حرف قاف کے ضمہ اور سکون دونوں کے ساتھ۔

② حرکات میں ایسا اختلاف جس سے معنی تو تبدیل ہو جائے لیکن الفاظ کی صورت میں کوئی فرق نہ پڑے۔ جیسے: ﴿رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا﴾ میں امر کے صیغے یعنی "بَاعِدْ" کو "بَاعَدَ" (بصیغہ ماضی) پڑھنا۔

③ حروف کا ایسا اختلاف جس سے الفاظ کی صورت تو برقرار رہے لیکن معنی تبدیل ہو جائے۔ جیسے: ﴿وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا﴾ (البقرۃ:۲۵۹) کو دوسری قراءت میں "نُنْشِزُهَا" میں زاء کے بجائے "راء" پڑھا گیا ہے۔ یعنی: ﴿وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِرُهَا﴾

④ ایسا اختلاف جس سے الفاظ کی صورت تو تبدیل ہو جائے لیکن معنی برقرار رہے۔ جیسے: ﴿كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ﴾ (القارعۃ:۵) اور "وَكَالصُّوْفِ الْمَنْفُوْشِ"

⑤ ایسا اختلاف جس سے الفاظ کی صورت اور معنی دونوں میں فرق پڑ جائے۔ جیسے: ﴿وَّ طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ﴾ (الواقعۃ:۲۹) اور ﴿وَطَلْعٍ مَّنْضُوْدٍ﴾

⑥ ایسا اختلاف جس میں کلمات میں تقدیم وتاخیر پائی جائے۔ جیسے: ﴿وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ (قٓ:۱۹) اور ﴿وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ﴾

⑦ اختلافِ زیادت ونقصان: یعنی ایک قراءت میں الفاظ کم ہوں جب کہ دوسری میں زیادہ۔

مثال ﴿لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً﴾ (صٓ:۲۳)

دوسری قرأت اس آیت کو اس طرح پڑھا گیا ہے:

﴿لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً اُنْثٰى﴾ (صٓ:۲۳) یعنی لفظِ "اُنْثٰى" کے اضافے کے ساتھ۔

امام ابوالفضل الرازی رحمۃ اللہ علیہ کے قول اور دیگر اقوال کا جائزہ

بعض محققین نے بھرپور کوشش کی کہ وہ وجوہِ سبعہ کے باب میں کسی طرح امام ابوالفضل رازی رحمۃ اللہ علیہ کے قول اور اس کے مشابہ دیگر اقوال یا (کم از کم) علمائے ثلاثہ یعنی امام ابن قتیبہ، امام محقق ابن جزری اور قاضی ابوبکر الطیب باقلانی رحمہم اللہ کے اقوال کو ایک ہی قول ثابت کر دیں اور یہ باور کرا دیں کہ ان تمام اقوال میں جو اختلاف ہے وہ حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ محض لفظی اختلاف

ہے۔لیکن ان کا یہ فعل ہماری رائے میں تکلف بعید ہے۔کیوں کہ ہم نے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ سات وجوہ میں سے ایک وجہ کامل ایسی پائی ہے، جس کی علمائے ثلاثہ نے نیت تک نہیں کی۔دوسری بات یہ کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ان ساتوں وجوہ کو جو علمائے ثلاثہ نے ذکر کی تھیں، بہت جامع و دقیق انداز میں اپنی صرف چھ وجوہ میں سمو دیا ہے۔اور ساتویں ایک ایسی وجہ بیان کی جس میں وہ منفرد ہیں۔وہ وجہ ہے: اختلافاتِ لہجات۔جیسا کہ فتح، اِمالہ، ترقیق اور تفخیم وغیرہ۔

امامِ رازی اور علمائے ثلاثہ کے اقوال کا جائزہ لیتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ علمائے ثلاثہ میں سے کسی ایک نے بھی اس نوع (اِختلافاتِ لہجات) کو ذکر نہیں کیا بلکہ ہمیں تو یہ محسوس ہوا کہ انھوں نے قصداً و اِرادۃً اس نوع کو ہلکا یا معمولی سمجھتے ہوئے ترک کیا ہے۔ جیسا کہ امامِ قتیبہ فرماتے ہیں:

"اور رہی بات اختلاف اظہار و اِدغام اور روم و اِشمام اور تخفیف و تسہیل وغیرہ کی، تو وہ ایسا اختلاف نہیں جس سے لفظ یا معنی میں کوئی فرق پیدا ہوا اور اسے ایک نئی قسم (وجہ) قرار دِیا جائے۔کیوں کہ اظہار و ادغام وغیرہ ایسی صفات ہیں جن سے صرف اَدائیگی میں فرق رونما ہوتا ہے۔حقیقت میں لفظ تو ایک ہی رہتا ہے۔"

امامِ ابن قتیبہ نے اس ساتویں قسم کو ترک کرنے کی وجہ یہ بیان کی کہ اختلافِ لہجات سے صرف اَدائیگی میں فرق رونما ہوتا ہے، لفظ تو ایک ہی رہتا یعنی اَلفاظ تو ایک سے دو نہیں ہوجاتے۔لیکن میری رائے میں لفظ کا ایک سے دو ہونا یا نا ہونا مسئلہ نہیں بلکہ مسئلہ وہ اُمر ہے جو لہجات کے اختلاف سے واقع ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے فعلاً قراءات میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔اور ممکن ہے یہ ہی وہ اختلاف ہو جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان نزاع کا سبب بنا تھا (اور وہ تصفیے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے تھے)۔اور یہ ہی اختلاف ہر زمان و مکان میں قراء کے مابین محلِ نزاع بن سکتا ہے جب کہ وہ ان حروفِ سبعہ کی تعداد نہ جانتے ہوں جن میں قرآنِ کریم نازِل ہوا ہے۔لہٰذا اختلافِ لہجات بھی حروفِ سبعہ میں داخل ہے کیوں کہ جس طرح قرآنِ کریم کے حروف، کلمات، حرکات اور ترتیب میں تغیر و تبدل حرام ہے اسی طرح قرآنِ کریم کے اَلفاظ کی صورت، ان کی ادائیگی کے طریقے اور لہجات کی کیفیت میں (متعین طریقوں سے ہٹ کر) تبدیلی کرنا حرام ہے اور تحریفِ قرآن میں شامل ہے۔

اور دوسری بات یہ کہ اگر اختلافِ لہجات کو اقسامِ سبعہ سے خارج کیا جائے تو نزول القرآن علی سبعة احرف کا ایک اہم مقصد و حکمت یعنی امت پر سہولت، حاصل نہیں ہوتا۔لہٰذا اولیٰ یہ ہی ہے کہ اس قسم کو اَقسامِ سبعہ میں شمار کیا جائے نیز تخفیف و تیسیر کے لیے زیادہ مناسب بھی یہ ہی ہے۔کیوں کہ انسان کے لیے بعض اوقات یہ تو آسان ہوتا ہے کہ وہ اپنی لغت کے علاوہ کسی اور لغت کے کلمات کا ملفوظ تلفظ کرلے لیکن یہ ہرگز آسان نہیں ہوتا کہ وہ ان کلمات کو اپنے لہجے اور ادائیگی کے طریقے سے ہٹ کر تلفظ کرے۔اور ترقیق و تفخیم، ہمزہ و تسہیل، اظہار و اِدغام اور فتح و اِمالہ وغیرہ یہ ہی وہ اُمور اور کیفیات ہیں جن کی رعایت رکھنے سے تلفظ کرنے میں پیدا ہونے والی دشواریوں سے بچا جاسکتا ہے۔

عرب کے مختلف قبائل تھے اور ان کے بولنے کا لب لہجہ مختلف تھا۔پھر اسی طرح پورے عالَم میں پائے جانے والوں مسلمانوں کا بھی بولنے کا لب و لہجہ مختلف ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کو سات حروف کے ساتھ نازِل فرمایا تاکہ امت پر قرآنِ مجید پڑھنے میں کوئی دِقت نہ ہو۔الغرض امت پر سہولت اس وقت تک متحقق نہیں ہوسکتی جب تک اختلافِ لہجات کو ملحوظ نہ رکھا جائے۔حتیٰ

کہ بعض علماء نے وجوہِ سبعہ ہی کو اس ایک وجہ (اختلافِ لہجات) میں منحصر قرار دِیا ہے، جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا۔ خود امام ابنِ قتیبہ اپنی کتاب "مشکل القرآن" میں لکھتے ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسانی ہی ہے کہ اس نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دِیا کہ ہر اُمّت (اُمت سے مراد قبیلہ ہے) کو ان کی لغت اور جواُن میں رواج ہے، اس کے مطابق قرآن پڑھائیے۔ جیسا کہ ھُذَلی (بنوہُذیل) "عَتّٰی حِیْنٍ" پڑھتے ہیں۔ مراد ان کی "حَتّٰی حِیْنٍ" ہوتی ہے۔ وہ اس کو اسی طرح تلفظ کرتے اور استعمال میں لاتے ہیں۔ (یعنی نطق میں حاء کا عین سے اِقلاب کرتے ہیں۔) اور اسدی یعنی بنو اسد "یِعْلَمُوْنَ، نِعْلَمُ، تِسْوَدُّ وُجُوْہٌ، اَلَمْ اِعْھَدْ" پڑھتے ہیں۔ یعنی علاماتِ مضارع کو تمام جگہ کسرہ دیتے ہیں۔ اور تمیمی (بنوتمیم) ہمزہ پڑھتے ہیں اور قرشی (اہلِ قریش) ہمزہ نہیں پڑھتے۔ اور بعض قبائل "قِیْلَ لَھُمْ، وَغِیْضَ الْمَآءُ" کو کسرہ کے ساتھ ضمہ کا اشمام کر کے پڑھتے ہیں۔ اور "بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَیْنَا" کو ضمہ کے ساتھ کسرہ کا اشمام کر کے پڑھتے ہیں۔ اور "مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا" کو ادغام کے ساتھ ضمہ کا اشمام کر کے پڑھتے ہیں۔

ابنِ قتیبہ مزید کہتے ہیں: "اگر ہر فریق ارادہ کرتا کہ وہ اپنے اس لب و لہجے اور لغت کو چھوڑ دے جس کا وہ بچپن، جوانی، اور ادھیڑ عمر سے عادی ہے تو یہ بات ان کے لیے بہت زیادہ گراں ہوتی۔ اور ان کے لیے یہ کام ممکن نہ ہوتا مگر ریاضتِ شاقہ، تذلیلِ لسان اور خالفتِ عادت کے بعد۔ چنانچہ باری عزاسمہ نے اپنے فضل و احسان سے ان پر یہ نرمی اور سہولت فرمادی کہ وہ لغات کو اختیار کرنے میں وسعت سے کام لیں اور حرکات میں تصرف کر سکیں۔ جیسا کہ دین پر عمل کرنے کے لیے بھی ان پر آسانیاں کی گئیں تھیں۔"

آپ نے دیکھا کہ علامہ ابن قتیبہ نے مذکورہ بالا کلمات میں کتنی صراحت کے ساتھ اختلافِ لہجات اور ادائیگی کے طریقے کو معتبر قرار دِیا ہے۔

اور اسی طرح ہم علامہ ابن جزری کو بھی اختلافِ لہجات کا اعتراف کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

"ایک قبیلہ پڑھتا ہے: "عَلَیْھُمْ، وَفِیْھُمْ" یعنی ہاء کے ضمہ کے ساتھ۔ اور دوسرا قبیلہ پڑھتا ہے: "عَلَیْھِمُوْ، وَمِنْھُمُوْ" یعنی صلہ کے ساتھ۔ ایک قبیلہ پڑھتا ہے: "قَدَ اَفْلَحَ، وَقُلُ اُوْحِیَ، وَاِذَا خَلَوِا اِلٰی شَیَاطِیْنِھِمْ" یعنی نقلِ حرکت کے ساتھ۔ اور دوسرا قبیلہ "مُوْسٰی، وَعِیْسٰی" کو اِمالہ کے ساتھ پڑھتا ہے اور اس کے علاوہ تلطیف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ایک قبیلہ "خَبِیْرًا بَصِیْرًا" میں راء کو ترقیق کے ساتھ اور دوسرا قبیلہ "اَلصَّلٰوۃُ، وَالطَّلَاقُ" کو تفخیم کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ اور بہت سی مثالیں ہیں۔"

لیکن انتہائی عجیب بات ہے کہ یہ دونوں جلیل القدر امام ایک طرف تو بہت صراحت کے ساتھ اختلافِ لہجات اور ادائے طُرُق کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں اور دوسری طرف وجوہِ سبعہ کے موتیوں کو دھاگے میں پروتے وقت اس قیمتی موتی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ (والعصمۃ للہ وحدہ)

پس سب سے زیادہ محقّق اور مدقّق قول وہ ہی ہے جس کو امامِ ابوالفضل الرازی رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے علامہ ابن حجر العسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تھا: "ابوالفضل الرازی نے ابنِ قتیبہ کے قول کو اختیار کر کے اُسے اور نکھار دِیا۔" آپ ابوالفضل اور ابنِ قتیبہ کے اقوال کے مابین بہت سے واضح فرق جان چکے ہیں۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ابن حجر ابوالفضل اور ابنِ قتیبہ کے قول کے متحد ہونے کے قائل تھے۔ کیوں کہ الرازی کا قول علمائے ثلاثہ کے اقوال سے □ لقا اعم ہے۔

امام ابوالفضل الرازی رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر وارد ہونے والے اعتراضات اور ان کے جوابات

ذیل میں چند اعتراضات اور ان کے جوابات بیان ہوں گے۔ یہ وہ اعتراضات ہیں جو ابوالفضل الرازی کے مذہب (قول) اور اس کے قریب ترین مذاہب (اقوال) یعنی ابن قتیبہ، ابنِ جزری اور ابنِ طیب کے اقوال پر وارد ہوتے ہیں۔

پہلا اعتراض قائلین نے اختلافِ قرأت کی جو سات نوعیتیں بیان کی ہیں، اُن کا آپس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ نیز ان میں سے کسی ایک نے بھی یقینی طور پر یہ نہیں کہا (کہ وہ سات نوعیتیں یہ ہیں بلکہ) وہ تتبع اور استقرا کے ذریعے ثابت کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ اوجہِ سبعہ سے باہر نہیں نکل پاتے۔ اور ان کے اس طرزِ عمل سے یقین کے ساتھ کیوں کر باور کر لیا جائے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہی وہ وجوہ سبعہ ہیں جن کی وجہ سے قرءات میں اختلاف رونما ہوتا ہے۔

پہلے اعتراض کا جواب پہلی بات یہ کہ جو مذہب ہم نے اختیار کیا ہے، ہم اس میں بیان کردہ اوجہِ سبعہ میں اختلاف نہیں کرتے اور نہ ہی اس سے متعلق کسی تردُّد کا شکار ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہم اپنے مختار قول سے متعلق ایک نہیں، بلکہ متعدد دلائل رکھتے ہیں۔ تیسری بات یہ کہ ہم یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ تتبع اور استقرا دلیل بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ کیوں کہ استقرائے تام اُن دلائل میں سے ایک ہے، جس کو منطقِ قدیم اور جدید دونوں میں مانا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنی تینوں شرائط کو پورا کرنے والا ہو۔ وہ تین شرائط یہ ہیں۔ پہلی شرط: قضیہ استقرائیہ متضمن ہو حکمِ حقیقی کو۔ دوسری شرط: وہ کلیہ حقیقیہ ہو۔ یعنی اس کا موضوع ایسا کلی حقیقی ہو جو اپنے تمام اَفراد پر صادق آتا ہو، خواہ وہ اَفراد ماضی میں گزر چکے ہوں یا فی الحال موجود ہوں یا مستقبل میں اُن کا پایا جانا ممکن ہو۔ تیسری شرط: اس قضیۂ استقرائیہ تک وصول تجربہ اور ملاحظہ کے ذریعے ہوا ہو۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ امام ابوالفضل الرازی کی بیان کردہ وجوہِ سبعہ کا استقراء اپنی تینوں شرائط کے ساتھ متحقق ہوا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے تمام ممکنہ وجوہِ اختلاف کو ملحوظ رکھا ہے جس کے نتیجے میں انھوں نے ان سات کے علاوہ کوئی اور قسم نہ پائی۔ پھر اس کے بعد حکمِ حقیقی کے طور پر جو استقرائے تام صادر ہوا، وہ یہ تھا کہ حدیثِ مبارکہ میں مذکورہ احرفِ سبعہ سے کچھ مراد نہیں سوائے ان سات وجوہ کے جنھیں امام ابوالفضل الرازی نے بیان کیا۔ اس استقرا کا حکم سالبہ کلیہ کے طور پر ثابت ہوا ہے، کما تری۔

دوسرا اعتراض ابوالفضل الرازی، ابنِ قتیبہ، ابنِ جریر اور ابن الطیب ان چاروں ائمہ نے تتبع اور استقراء کے جو طریقے اختیار کیے ہیں، ان طریقوں میں یہ ائمہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ اور ان کا ایک دوسرے کے ساتھ مخالف ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ممکن ہے کہ وجوہِ سبعہ کے علاوہ بھی کوئی وجہ پائی جاتی ہو۔

دوسرے اعتراض کا جواب ائمہ کرام کے استقراء اور تتبع کے طریقوں میں محض اختلاف اس بات کو لازم نہیں کرتا کہ وجوہِ سبعہ کے علاوہ بھی کوئی وجہ پائی جاتی ہو۔ بلکہ یہ اختلاف تو صرف یہ ثابت کرتا ہے کہ ان ائمہ کرام میں سے بعض کا استقراء تام ہے اور بعض کا ناقص۔ اور یہ تو ہم پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں کہ امام الرازی کا استقراء اپنی تمام شرائط پر پورا اُترنے کی وجہ سے تام ہے۔ اور اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ کوئی انسان استقراء کا وہ راستہ اختیار

کرے جو اس کے مخالفین میں سے کسی نے نہ کیا ہو۔ کیوں کہ ہر انسان کو حق حاصل ہے کہ وہ استقراء کے لیے جس راستے کو اصوب اور اقرب سمجھتا ہوا ُسے اختیار کرے، بشرطیکہ کے وہ اپنی شرائط کو مستلزم ہو۔

تیسرا اعتراض آپ جانتے ہیں کہ حروفِ سبعہ کی رخصت کا مقصد اُمت پر سہولت تھا۔ اور اُس وقت کے اکثر لوگ کتابت اور رسم الخط کی باریکیوں سے ناواقف تھے۔ ہاں! حروف ومخارج سے متعلق ضرور جانتے ہیں۔ تو ایسی صورتِ حال میں رُخصت ظاہر نہ ہوئی فعل کو مبنی للمعلوم یا مبنی للمجہول پڑھنے میں، یا ایک حرکت کو دوسری حرکت کے ساتھ یا ایک حرف کو دوسرے حرف کے ساتھ بدلنے میں، یا تقدیم وتاخیر وغیرہ میں۔ کیوں کہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی پڑھنا مشقت کو لازم نہیں کرتا۔ حالاں کہ نبی کریم ﷺ نے امت کو مشقت سے بچانے کے لیے ہی دُعا مانگی تھی اور فرمایا تھا: "اِنَّ الْاُمَّةَ لَا تُطِيْقُ ذٰلِكَ" اور اُمت کے لیے آسانی طلب فرمائی تھی ایک حرف کو دوسرے حرف کے ساتھ بدلنے میں یا فعلِ ماضی کو فعلِ اَمر کے ساتھ بدلنے میں یا مبنی للمعلوم کو مبنی للمجہول کے ساتھ تبدیل کرنے، وغیرہ میں۔

تیسرے اعتراض کا جواب ہم آپ کی یہ بات تسلیم ہی نہیں کرتے کہ اَفعال کو مبنی یا مجہول پڑھنے، یا ایک حرکت یا ایک حرف کی جگہ دوسری حرکت یا دوسرا حرف پڑھنے، یا تقدیم وتاخیر کرنے میں رخصت دی گئی تھی۔ اور دوسری بات یہ کہ" رُخصت "غیر ظاہر نہیں، بلکہ بالکل ظاہر ہے اُس کے علاوہ میں جو آپ سمجھے، یعنی کلمات وحروف کی حرکات وترتیب وغیرہ کو ان کی حالت پر باقی رکھتے ہوئے "اختلافِ لہجات" میں۔ اور ہم بار ہا مشاہدہ ومحسوس کرتے ہیں کہ بعض لوگوں کے لیے بعض حروف کو مخصوص صفات کے ساتھ پڑھنا یا تو آسان ہوتا یا مشکل ہوتا ہے۔ پس بعض لوگوں کے لیے تفخیم میں سہولت ہوتی ہے نہ کہ ترقیق میں۔ اور بعضوں کے لیے فتحہ میں آسانی ہوتی ہے نہ کہ اِمالہ میں۔ اور بعض لوگ اظہار کرتے ہوئے سہولت سے پڑھ لیتے ہیں اور اِدغام کرتے وقت مشکل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ الغرض بعض لوگوں پر ایک صفت آسان اور بعضوں پر اس کا عکس آسان ہوتا ہے۔ پس یہ رُخصت اس وقت کیسے پائی جاسکتی ہے جب حروف یا کلمات یا حرکات وترتیب ہی کو بدل دیا گیا ہو۔

(خلاصۂ کلام: معترض یہ سمجھ رہا تھا کہ رُخصت ابدال یا تقدیم وتاخیر وغیرہ کے حق میں دی گئی تھی۔ اسی وجہ سے اُس نے کہہ دِیا تھا کہ" رُخصت ظاہر نہیں ہے۔" جواب میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ معترض کی تفہیم میں کمی تھی کیوں کہ اگر اختلافِ لہجات کے حق میں رُخصت مانی جائے تو وہ ظاہر ہوگی وگرنہ نہیں)۔

چوتھا اعتراض کلمۂ واحدہ میں قراءاتِ مذکورہ میں سے وجوہِ اختلاف کا پایا جانا متصور ہی نہیں چہ جائیکہ اس میں تیسیر وتخییر ہو۔ اور اگر آپ کی مراد کلمۂ واحدہ میں اختلاف نہیں بلکہ متفرقاً پورے قرآنِ مجید میں اختلاف مراد ہے جیسا کہ اُن کے نزدیک ہے جو سبعہ اَحرف سے لغاتِ سبعہ مراد لیتے ہیں، تو اُس وقت نہ ہی تو رُخصت کا کوئی سبب باقی رہتا تھا اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان اختلاف پیدا ہونا چاہیے تھا۔

چوتھے اعتراض کا جواب آپ کا یہ اعتراض درحقیقت امام ابوالفضل الرازی کے قول اور اس کے مشابہ دیگر اَقوال کی حقیقت سے بنیادی ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ کیوں کہ ان کے مذاہب میں یہ ہرگز بیان نہیں ہوا کہ کلمۂ واحدہ میں ساتوں وجوہ پائی جائیں گی بلکہ ان کے مذاہب میں یہ بیان ہوا ہے کہ قراءات میں تمام اختلافات ان

سات وجوہ کی طرف لوٹتے ہیں۔یعنی قراءت میں اختلاف کی نوعیت زیادہ سے زیادہ ان سات اَقسام پر مشتمل ہوسکتی ہے۔اور رہی آپ کی یہ بات کہ ان سات نوعیتوں کا اختلاف پورے قرآنِ مجید میں متفرقاً پھیلا ہوا ہو تو رُخصت متحقق نہیں ہوتی۔تو آپ کی یہ بات بھی درست نہیں۔کیوں کہ رُخصت تو متحقق ہی اس صورت میں ہوتی ہے جو ہم نے بیان کی۔اور رُخصت کو کیا ہوا کہ وہ باقی نہ رہے! حالاں کہ یہ ساتوں وجوہ شامل ہیں قراءاتِ متواترہ،صحیحہ،ضعیفہ اور شاذّہ میں موجود اختلاف کو،حتّی کہ لہجات کے اختلاف کو بھی۔اور اگر کلمے کی لغات کو بھی اس میں شامل کرلیا جائے تو پھر بعض اوقات اس کلمے کو پڑھنے کے انداز کی تعداد سینتیس تک بھی پہنچ جاتی ہے۔جیسا کہ ماقبل گزر چکا ہے کہ علامہ الرمانی کلمہ ”اُفٍ“ میں سینتیس لغات بیان کرتے ہیں۔

پانچواں اعتراض

بے شک حروفِ سبعہ کی رُخصت ثابت ہے (لیکن حروفِ سبعہ کو جن سات وجوہِ اختلاف میں آپ نے منحصر کیا ہے،اُن سے متعلق) اور اُصولِ کتابت ورسم الخط کی باریکیوں سے متعلق اُس وقت کے عام عرب ناواقف تھے۔(لہٰذا ایسی صورتِ حال میں ان وجوہِ اختلاف کو جن کو وہ جانتے ہی نہ تھے ”حروفِ سبعہ“ قرار دینا مشکل وعجیب معلوم ہوتا ہے)۔

پانچویں اعتراض کا جواب

پہلا جواب: ممکن ہے، یہ انحصار اتفاقاً واقع ہوگیا ہو اور بعد میں استقراء کے ذریعے اس پر اطلاع ہوگئی ہو۔**دوسرا جواب:** یہ بات یقینی ہے کہ یہ انحصار استقرائے تام ہی کے ذریعے معلوم ہوا ہے۔اور استقرائے تام دلائلِ قاطعہ میں سے ایک ہے جیسا کہ سابقہ اعتراض کے جواب میں بیان ہوا ہے۔اور رہی آپ کی یہ بات کہ رُخصت تو واقع ہوگئی لیکن اس وقت کے اکثر عرب (ان اصطلاحات سے) اُمّی تھے۔تو یاد رکھیے اُن کا اِن اِصطلاحات یا انحصار کی تفصیلات سے اُمّی ہونا حروفِ سبعہ کے تحت متعین کردہ قراءت کی سات نوعیتوں کی صحت کو نقصان نہیں پہنچاتا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اِن اصطلاحات کو اُن عنوانات کے ساتھ نہیں جانتے تھے جن کو بعد کے زمانے میں ہم نے بیان کیا۔لیکن وہ فیوضِ نبوی ﷺ کی برکت سے ان عنوانات کے تحت پائے جانے والے تمام مفاہیم کو ہم سے نسبتاً بخوبی جانتے اور اَدا کرتے تھے۔وہ خوب جانتے تھے کہ کون سا لفظ کس انداز میں صحیح، فصیح اور بلیغ اَدا کیا جاتا ہے۔اس کی ایک نظیر صرف ونحو کی فنّی اصطلاحات اور تقسیمات (قوانین وغیرہ) بھی ہیں کہ وہ اُس زمانے میں اس طرح رائج نہ تھیں جس طرح اَب ہمارے زمانے میں رائج ہیں۔لیکن یہ فنّی اصطلاحات جن مفاہیم سے عبارت ہیں وہ مفاہیم تو اس دور میں بھی موجود تھے۔پس اسی طرح اس دور میں حروفِ سبعہ کی تشریح متعین کرنے کی حاجتِ ماسّہ پیش نہ آئی (تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس دور میں اگر آنحضرت ﷺ سات وجوہِ اختلاف کی تفصیل بیان فرمادیتے تو شاید عوام الناس کی سمجھ سے بالاتر ہوتی۔اس لیے حضورِ اکرم ﷺ نے صرف اتنا واضح فرمادیا کہ یہ وجوہِ اختلاف کُل سات میں منحصر ہیں۔بعد میں جب یہ اصطلاحات رائج ہوگئیں تو علماء نے استقرائے تام کے ذریعے اِن وجوہِ اختلاف کو اصطلاحی اَلفاظ کا جامہ پہنادیا)۔

حروفِ سبعہ کا مصاحفِ عثمانیہ میں موجود ہونا

(حروفِ سبعہ کے معنیٰ کی تعیین کے بعد) ہم آپ کو ایک اور نقطے کے جانب لیے چلتے ہیں کہ" وہ حروفِ سبعہ جن پر قرآنِ کریم نازِل ہوا تھا وہ (آج بھی) مصاحفِ عثمانیہ میں موجود ہیں یا نہیں؟" چنانچہ فقہاء، قراء اور متکلمین کی جماعتوں کا مذہب ہے کہ (اب بھی) مصاحفِ عثمانیہ ان تمام حروفِ سبعہ پر مشتمل ہیں جن پر قرآنِ کریم نازِل ہوا تھا۔ اس کی بنیاد اس بات (دو باتوں) پر ہے (پہلی یہ) کہ اُمت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ان سات حروف میں سے کسی حرف کو نقل کرنا ترک دیں جن پر قرآنِ کریم نازِل ہوا اور (دوسری یہ کہ) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اجماعی طور پر یہ عثمانی مصاحف اُن صحیفوں سے نقل کیے تھے جو حضرتِ ابوبکر رضی اللہ عنہ (اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ) نے لکھے تھے۔ اور ان کے ماسوا جتنے صحیفے تھے اُن کو چھوڑنے پر متفق ہو گئے تھے۔ (ان دونوں باتوں کا) معنی یہ ہوا کہ حضرتِ ابوبکر رضی اللہ عنہ (اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کے پاس جو صحیفے تھے، وہ حروفِ سبعہ پر مشتمل تھے پھر ان صحیفوں کو حروفِ سبعہ سمیت بعینہٖ مصاحفِ عثمانیہ میں منتقل کر دِیا گیا۔ اور سلف وخلف کے علماء کی اکثریت کا بھی یہ قول ہے کہ یہ عثمانی مصاحف اُن حروفِ سبعہ پر مشتمل ہیں جو اُن کے رسم الخط میں سما گئے۔ اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرتِ جبرئیل علیہ السلام سے قرآنِ کریم کا جو آخری دور کیا تھا، اُس کے تمام حروف ان مصاحف میں جمع ہیں۔ (یعنی اُن میں سے کوئی ایک حرف بھی ان مصاحف میں نہیں چھوٹا۔)

علامہ ابن جریر الطبری اور ان کے متبعین کا اس بابت کہنا ہے کہ مصاحفِ عثمانیہ حروفِ سبعہ میں سے صرف ایک حرف پر مشتمل ہیں۔ اِن کی اس رائے کی بنیاد یہ ہے کہ ان کے نزدیک حروفِ سبعہ سے مراد قبائلِ عرب کی سات لغات ہیں۔ اسی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ صدرِ اسلام یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور حضراتِ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت میں اور حضرتِ عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کی ابتدا میں تو قرآنِ کریم میں ان سات حروف کا التزام کیا جاتا تھا۔ لیکن بعد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُمت کو ایک کلمہ پر جمع کرنے کی غرض سے سات حروف کی بجائے صرف ایک حرف پر اکتفا کرنے کا فیصلہ کیا۔ پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قیادت میں صرف ایک حرف (لغتِ قریش) کو باقی رکھا گیا اور اس کے علاوہ باقی چھ حروف کو چھوڑ دِیا گیا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی ایک حرف کے ساتھ چند مصاحف مرتب کروائے جس کی وجہ سے امت ایک حرف پر متحد و متفق ہو گئی۔ علامہ ابن جریر طبری کے اس مذہب اور اس میں موجود قباحتوں کا بیان ذیل میں تفصیلاً آ رہا ہے۔

مصاحفِ عثمانیہ مشتمل ہیں مکمل حروفِ سبعہ پر یا ان میں سے بعض پر؟ اس بات کا سمجھنا دو اُمور پر موقوف ہے۔

پہلا اَمر: حروفِ سبعہ کی مراد متعین کرنا۔

دوسرا اَمر: رجوع کرنا اُس کی طرف جو فی الواقع اور نفس الامر میں اِن مصاحف میں لکھا ہوا ہے یا مٹا دِیا گیا ہے۔

پہلے اَمر سے متعلق ہم ماسبق میں تفصیلاً بیان کر چکے ہیں کہ حروفِ سبعہ کی مراد وہ سات وجوہ ہیں جن کی طرف قراءات پیدا ہونے والا اختلاف لوٹتا ہے۔ برابر ہے کہ وہ قراءات صحیح ہوں، یا شاذ ہوں یا منکر ہوں۔ الغرض وہ تمام کے تمام اختلافِ قراءات ان ہی سات صورتوں (وجوہ) میں منحصر ہوں گے جن کو امامِ ابوالفضل الرازی رحمۃ اللہ علیہ نے استقرائے تام کے بعد ذِکر کیا ہے۔

اور دوسرے اَمر کے پیشِ نظر جب ہم اُن حروفِ سبعہ کی طرف دیکھتے ہیں جو فی الواقع اور نفس الامر میں مصاحفِ عثمانیہ میں مخطوط ہیں تو ہمیں ایسی حقیقت حاصل ہوتی ہے جس کی کوئی نقیض نہیں اور اس باب میں ایسا فصلِ خطاب میسر آتا ہے جس کے بعد مزید کسی کلام کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور وہ حقیقت اور فصلِ خطاب یہ ہے کہ مصاحفِ عثمانیہ پورے سات حروف پر مشتمل ہیں۔ لیکن بایں معنیٰ کہ ان مصاحف میں سے ہر ایک ان تمام حروف یا ان میں سے اُن بعض حروف پر مشتمل ہے جو اس کے رسم الخط کے موافق ہیں، بایں طور کہ مصاحفِ عثمانیہ مجموعی طور پر ان میں سے کسی حرف سے بالکل خالی نہیں ہیں۔

اب ہم اپنے مختار مذہب (امام ابوالفضل الرازی کے مذہب) کے مطابق ان وجوہ سبعہ کی مثالیں بیان کرتے ہیں جن کو مصاحفِ عثمانیہ کا رسم الخط اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

(وجہِ اوّل) اَسماء میں مفرد، تثنیہ، جمع کا اختلاف

مثال: ﴿وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ﴾ (المؤمنون: ۸) اور (المعارج: ۳۲)

ایک قراءت کے مطابق "لِاَمَانَاتِهِمْ" جمع کے ساتھ ہے جب کہ دوسری قراءت میں اسے واحد کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ یعنی: ﴿لِاَمَانَتِهِمْ﴾۔

مصاحفِ عثمانیہ میں رسمِ عثمانی کے مطابق اسے ایسے: "لامنتهم" یعنی حروفِ مفردہ کے رسم الخط کے ساتھ لکھا گیا اور (ساتھ ہی "ن" کے اوپر) ایک چھوٹا سا الف بھی ڈال دیا گیا ہے جو اس کے جمع ہونے کی طرف اِشارہ کرتا ہے اور نقطوں اور اعراب سے خالی ہے۔

(وجہِ ثانی) تصریفِ افعال کا اختلاف

مثال: ﴿يَعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ﴾ (الاعراف: ۱۳۸)

اس آیت میں موجود فعل میں "کاف" کو کسرہ اور ضمہ (یعنی بابِ ضرب اور نصر) دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ پس رسمِ عثمانی ان دونوں قراءتوں کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ چوں کہ اس وقت مصحفِ عثمانی نقطوں اور اعراب سے خالی تھے، اس لیے لکھنے میں فعل کی ہیئت بھی ایک ہی رہی اور دو مختلف قراءتوں کی صورت میں کوئی فرق بھی ظاہر نہیں ہوا۔

(از مترجم: دورِ عثمانی میں مصاحف کی جو نقلیں تیار کر کے مختلف بلادِ اسلامیہ کو بھیجی گئیں تھیں، وہ ایسے رسم الخط پر مشتمل تھیں جو ساتوں حروف کا متحمل ہو سکے۔ اور شاید اسی مقصد کے پیشِ نظر ان مصاحف کو نقطوں اور حرکات سے خالی رکھا گیا تا کہ ان حروف کی تمام متواتر قراءات جو عرضۂ اخیرہ کے وقت باقی رکھی گئی تھیں اور ان کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی ان میں سما جائیں۔

یہ مصاحف ایک زمانہ تک بلادِ اسلامیہ میں رائج رہے، لیکن جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہو گیا، بے شمار عجمی ممالک اسلام کے زیر سایہ آ گئے اور عربی اور عجمی زبانوں کا باہم اختلاط بڑھا تو عربی زبان میں لحن عام ہو گیا۔ اور یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں فصیح عربی زبان عجمی اثرات سے ناپید نہ ہو جائے۔ مزید یہ کہ عجمی لوگوں کے لیے قرآنِ کریم کو بغیر نقطوں اور حرکات کے پڑھنا کافی دشوار تھا۔ چنانچہ اسلامی حکومت کے سامنے یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں یہ صورت حال کتاب اللہ میں لحن اور لفظی تحریف پر منتج نہ ہو۔ لہٰذا اُنہوں نے اس صورت حال کے ممکنہ نتائج و اثرات سے نمٹنے کے لیے یہ فیصلہ کیا کہ اس میں نقطے اور حرکات ظاہر کی جائیں تا کہ تمام لوگ آسانی سے اس کی تلاوت کر سکیں)۔

(وجہِ ثالِث) اعراب کے اعتبار سے اختلاف

مثال: ﴿وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ﴾ (البقرۃ:۲۸۲)

لَا يُضَآرَّ کے راء کو فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے یوں کہ رسمِ عثمانی دونوں کا احتمال رکھتا ہے، جیسا کہ وجہِ سابق میں بہت واضح انداز میں بیان ہوا ہے۔

(وجہِ رابع) الفاظ میں کمی، زیادتی کا اختلاف

مثال: ﴿وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (التوبۃ:۱۰۰)

ایک قراءت میں ﴿تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ہے جب کہ دوسری قراءت میں ﴿تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ہے۔ اور یہ دونوں قراءات متواتر ہیں۔

قراءت کی اس وجہ (صورت) میں الفاظ کی کمی وزیادتی پائی جاتی ہے۔ اور قراءت کی اس وجہ (صورت) کو بعض مصاحفِ عثمانیہ کا رسم الخط اپنے اندر سموتا ہے (اور بعض کا نہیں۔ یعنی قراءات کے اس اختلاف کو ایک ہی مصحفِ عثمانی اپنے اندر سمو لیتا یہ ناممکن تھا۔ اس لیے دو علیحدہ علیحدہ مصاحفِ عثمانیہ میں اس اختلاف کو سمویا گیا۔ اس بحث سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ حروفِ سبعہ میں سے کچھ حروف ایسے بھی ہیں جن پر مجموعی طور پر تمام یا چند مصاحفِ عثمانیہ مل کر مشتمل تھے۔ یعنی ہر مصحف ان تمام حروف پر مشتمل نہیں تھا۔ مصاحفِ عثمانیہ کی تعداد کیا ہے؟ اس بارے میں دو قول ہیں۔ پہلا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پانچ نسخے تیار کروائے تھے۔ یہ ہی قول زیادہ مشہور ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کل سات نسخے تیار کروائے تھے۔ ایک نسخہ مدینہ منورہ میں رکھا تھا جب کہ بقیہ مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفہ میں ایک ایک کر بھیج دیا گیا۔ یہ قول ابنِ ابی داؤد سے ابو حاتم سجستانی نے نقل کیا ہے۔ (فتح الباری ۹/ ۲۵،۲۴) پس لفظِ "مِنْ" کی زیادتی والی قراءت مصحفِ مکی میں موجود ہے اور بدونِ "مِنْ" والی قراءت اُن مصاحفِ عثمانیہ میں موجود ہے جو مصحفِ مکی کے علاوہ ہیں۔

اس اختلاف کی ایک اور مثال: ﴿وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا﴾ (الکھف:۷۹)

حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے اس کو "يَاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ صَالِحَةٍ غَصْبًا" پڑھا ہے یعنی لفظ "صَالِحَةٍ" کے اضافے کے ساتھ۔ لیکن یہ قراءت عرضۂ اخیرہ میں منسوخ قرار دے دی گئی تھی۔ اس لیے اس قراءت کو کسی بھی مصحفِ عثمانی میں شامل نہیں کیا گیا۔ عرضۂ اخیرہ سے قرآنِ مجید کا وہ دور مراد ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری ایام میں حضرتِ جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا۔

(وجہِ خامس) تقدیم وتاخیر کا اختلاف

مثال: ﴿فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا﴾ (التوبۃ:۱۱۱)

اس صورت میں تقدیم وتاخیر کا اختلاف ہے۔ یہ صورت اپنی ماقبل صورت کے مثل ہے۔ یعنی تقدیم وتاخیر والی کچھ قراءتیں ایسی ہیں جن کو مصاحفِ عثمانی نے اپنے وسیع الظرف رسم الخط کی بنا پر اپنے اندر سمولیا ہے اور کچھ ایسی ہیں جن کو نہیں سمویا بوجہ ان قراءات کے منسوخ ہونے کے۔ مذکورہ بالا مثال میں دو قراءتیں ہیں۔ پہلی قراءت میں پہلے ﴿يَقْتُلُوْنَ﴾ کو معروف ﴿يَقْتُلُوْنَ﴾ اور دوسرے کو مجہول ﴿يُقْتَلُوْنَ﴾ پڑھا گیا ہے اور دوسری قراءت میں اس کے برعکس پڑھا گیا ہے۔ اور یہ دونوں قراءتیں متواتر ہیں۔ اس لیے رسم عثمانی نے ان دونوں قراءتوں کو جمع کر لیا (کیوں کہ اُس وقت اعراب نہیں لگے ہوئے تھے اس لیے دونوں قراءتیں باآسانی جمع ہوگئیں۔) اور تمام مصاحفِ عثمانیہ میں اس کا خلاف نہیں ملے گا۔

دوسری مثال: ﴿وَجَآءَتۡ سَكۡرَةُ الۡمَوۡتِ بِالۡحَقِّ﴾ (ق:۱۹)

یہ مثال ان دو قراءتوں کی ہے جن کو مصاحفِ عثمانیہ نے شامل نہیں کیا۔ ان میں سے ایک کے متواتر نہ ہونے کی وجہ سے۔ ایک قراءت کے مطابق ﴿وَجَآءَتۡ سَكۡرَةُ الۡمَوۡتِ بِالۡحَقِّ﴾ پڑھا گیا ہے جو کہ متواتر ہے۔ اس لیے تمام مصاحفِ عثمانیہ اس قراءت پر مشتمل ہیں۔ اور دوسری قراءت کے مطابق ﴿وَجَآءَتۡ سَكۡرَةُ الۡحَقِّ بِالۡمَوۡتِ﴾ پڑھا گیا۔ یہ قراءت اگرچہ حضرات ابوبکر الصدیق، طلحہ بن مصرف اور زین العابدین رضی اللہ عنہم سے منقول ہے لیکن متواتر نہیں ہے کیوں کہ عرضۂ اخیرہ میں اسے منسوخ قرار دے دیا گیا تھا۔ نیز مصاحفِ عثمانیہ میں موجود قراءات پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے اس لیے کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ پہلی قراءت ﴿وَجَآءَتۡ سَكۡرَةُ الۡمَوۡتِ بِالۡحَقِّ﴾ کی مخالفت کرے۔

اس موقع پر ایک اور مثال دیکھیے: " ﴿اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ۝﴾ (النصر:۱) دوسری قراءت میں اس آیت کو "اِذَا جَآءَ فَتۡحُ اللّٰهِ وَالنَّصۡرُ" پڑھا گیا ہے۔ پہلی قراءت مصاحفِ عثمانیہ میں موجود ہے اور دوسری نہیں، بوجہ منسوخ ہونے کے۔ کیوں کہ اس کو بھی عرضۂ اخیرہ میں منسوخ کر دیا گیا تھا۔

(وجہِ سادس) اَلفاظ کا ایسا اختلاف جس سے حروف بدل جائیں

یہ وجہ (صورت) بھی ایسی ہی ہے۔ یعنی ان میں سے بعض کو مصاحف نے شامل کیا ہے اور بعض کو نہیں۔

پہلی مثال: ﴿اِنۡ جَآءَكُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوۡۤا﴾ (الحجرات:۶)

ایک قراءت میں ﴿فَتَبَيَّنُوۡۤا﴾ کی جگہ "فَتَثَبَّتُوۡا" پڑھا گیا ہے۔ یہ مثال ان دو قراءتوں کی ہے جنھیں تمام مصاحفِ عثمانیہ نے (اپنے رسم الخط کی وُسعت کی بنا پر) اپنے اندر سمویا یا شامل کیا ہے۔ کیوں کہ یہ دونوں قراءات متواتر ہیں۔ اس لیے ان دونوں میں سے کسی ایک کو چھوڑنا ناممکن اور دونوں کو جمع کرنا ممکن تھا اس لیے دونوں کو جمع کر دیا گیا۔

(اعتراض: ان دونوں کو جمع کرنا کیوں کر ممکن تھا جب کہ "فَتَبَيَّنُوۡا" اور "فَتَثَبَّتُوۡا" میں واضح تفاوت ہے؟ پہلی قراءت میں کلمہ کا تیسرا، چوتھا اور پانچواں حرف بالترتیب باء، یاء اور نون ہے جب کہ دوسری قراءت میں بالترتیب ثاء، باء اور تاء ہے۔

جواب: شاید آپ کو یاد نہیں کہ مصاحفِ عثمانیہ غیرِ منقوط اور غیرِ مشکول تھے۔ نقطے اور اعراب تو بہت بعد میں لگائے گئے۔ لہٰذا نقطوں کے نہ ہونے کی وجہ سے مذکورہ بالا دونوں قراءتوں کو ایک ہی مصحف میں جمع کرنا ممکن ٹھہرا۔ از مترجم)

یہ دونوں "اِذَا نُوۡدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنۡ يَّوۡمِ الۡجُمُعَةِ فَامۡضُوۡا اِلٰی ذِكۡرِ اللّٰهِ" "وَتَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالصُّوۡفِ الۡمَنۡفُوۡشِ" مثالیں بھی عرضۂ اخیرہ میں منسوخ ہو جانے کی وجہ سے کسی بھی مصحفِ عثمانی شامل نہیں کی گئیں۔

(وجہِ سابع) لہجوں کا اختلاف

یہ اختلاف کی وہ وجہ (صورت) ہے جس کو بہت احسن اور اکمل درجے میں تمام مصاحفِ عثمانیہ اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔ کیوں کہ یہ محض اعراب (اور تلفظ) کا اختلاف ہے۔ اس میں کلمے کا جوہر تبدیل نہیں ہوتا۔ آپ اس اختلاف کی کثیر مثالیں مصاحفِ عثمانیہ میں پائیں گے۔ مثلاً:

﴿هَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰی ۝﴾ (النازعات:۱۵)

پس یہ آیت رسمِ عثمانی میں اس طرح لکھی گئی کہ فعل میں تاء کے بعد یاء لے آئے اور لفظ موسیٰ کے الف کو یا سے بدل دیا۔ (اس طرح لکھنے سے آیت کی شکل وصورت میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی کیوں کہ اُس وقت) رسمِ عثمانی بغیر اعراب اور نقطوں کے (لکھا جاتا) تھا۔ (لیکن متعدد قراءات کا پڑھنا ممکن ہوگیا۔)

حروفِ سبعہ کی تعیین میں مزید اقوال

اس عنوان کے تحت حروفِ سبعہ کے معنیٰ کی تعیین سے متعلق مَعرضِ عام کے طور پر مزید اقوال اور ان کے نقائص بیان کیے جائیں گے۔ ہم اس موقع پر ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنے قولِ مختار کے علاوہ دیگر اقوال اور ان میں موجود کمزوریاں بھی آپ کے سامنے بیان کریں تاکہ ہمارے مذہبِ مختار یعنی امامِ ابوالفضل عبدالرحمان بن احمد بن الحسن الرازی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو اختیار کرنے کے راستے میں آپ کے لیے کوئی رُکاوٹ باقی نہ رہے۔

پہلا قول جن اَحادیث میں "سَبْعَةَ اَحْرُف" کے اَلفاظ ہیں وہ تمام اَحادیث مشکل ہیں۔ کیوں کہ لفظ "اَحْرُف" کے معنیٰ مقصود تک پہنچنے کا کوئی سبیل نہیں۔ شبہے کی اصل وجہ ہے لفظِ "اَحْرُف" جو کہ جمع ہے "حرف" کی۔ اور لفظِ "حرف" مشترکِ لفظی ہے کئی معانی کے مابین۔ اور مشترکِ لفظی وہ ہے جس کے تحت معانی میں سے کسی ایک کو متعین نہ کیا جاسکتا ہو۔

اس قول کے جواب میں کہا جائے گا کہ ہم آپ کی یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ مشترکِ لفظی کے معنیٰ کو مطلقاً متعین نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ اگر اس کے معنیٰ مقصود پر کوئی قرینہ موجود ہو تو اس کے معنیٰ مقصود کو بالکل متعین کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً قائل کہتا ہے: "نَظَرْتُ بِالْعَيْنِ الْمُجَرَّدَةِ" یا کہتا ہے: "شَرِبْتُ مِنْ عَيْنِ زُبَيْدَةَ" ان دونوں مثالوں میں لفظِ "عین" استعمال ہوا ہے جو مشترکِ لفظی ہے۔ لیکن اس کا مدلول متعین ہے کہ پہلی مثال میں اس سے مراد "آنکھ" ہے اور دوسری مثال میں "نہر" ہے۔ کیوں کہ یہاں قرینہ موجود ہے جو اس کے معنیٰ کو متعین کر رہا ہے۔ اور وہ قرینہ پہلی مثال میں لفظِ "نَظَرْتُ" اور دوسری مثال میں لفظِ "شَرِبْتُ" ہے۔ لہٰذا حدیثِ شریفہ میں مذکورہ لفظِ "اَحْرُف" اور "حرف" کے لیے بھی سابقہ روایات کے سیاق سے معنیٰ مقصود متعین اور معلوم ہوجاتا ہے اور وہ ہے "الوجہ" اور "الوجوہ"۔ پس "احرف" سے مراد وہ وجوہ ہیں، جن کی طرف قراءات سے متعلق تمام اختلافات لوٹتے ہیں۔ واضح رہے اختلاف سے مراد اَلفاظ کا اختلاف ہے، معانی کا نہیں۔ اور احرف سے مراد وجوہِ مذکورہ ہی ہیں، اس اَمر پر دلیلِ عقلی بھی قائم ہوچکی ہے اور وہ ہے "استقرائے تام"۔ استقرائے تام سے متعلق ہم پہلے تفصیلاً بیان کرچکے ہیں، پس اُسے ذہن میں رکھیے اور بھولیے مت۔ نیز آٹھویں اَمر کو بھی یاد رکھیے کیوں کہ یاد رکھنا ایمان والوں کو نفع دیتا ہے۔

دوسرا قول قاضی عیاض اور ان کے متبعین کہتے ہیں: "حدیث شریفہ میں لفظِ "سبعہ" یعنی سات سے حقیقی عددِ معروف مراد نہیں ہے۔ بلکہ لفظِ "سبعة" اکائیوں میں کثرت کے لیے کنایہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ دہائیوں میں کثرت سے کنایہ کے طور پر لفظِ "سبعین" اور سینکڑوں میں لفظِ "سبعمائة" استعمال ہوتا ہے۔

اس قول یا سوال کا جواب "دوسرے اَمر" میں بیان کیا جاچکا ہے۔ وہاں رجوع کیا جائے۔

تیسرا اور چوتھا قول

"حروفِ سبعہ سے قراءاتِ سبعہ مراد ہیں۔" اگر اس قول سے مراد یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے کلمات میں سے ہر کلمے کو سات قراءات کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔ تو یہ ممکن ہی نہیں، کیوں کہ قرآنِ کریم کے بہت ہی کم ایسے کلمات ہیں جن کو ساتوں وجوہات پر پڑھا جاسکتا ہو۔

اور اگر اس قول سے مراد غایت وانتہا ہے۔ یعنی ایک کلمے میں زیادہ سے زیادہ سات وجوہات پائی جاسکتی ہیں، جیسا کہ علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ (اس طرح یہ چوتھا قول بن جاتا ہے۔) تو یہ بھی غیر مسلَّم ہے۔ کیوں کہ قرآنِ کریم میں متعدد کلمات ایسے بھی ہیں جن میں سات سے کئی زیادہ قراءات پڑھی جاتی ہیں۔ مثلاً ① "عَبَدَ الطَّاغُوْتَ" اس میں بائیس قراءات ہیں۔ ② "أُفٍّ" اس میں سینتیس قراءات ہیں۔

اور اگر اس قول سے مراد یہ لیا جائے کہ قراءات کے جتنے بھی اختلافات ہیں وہ سات وجوہ (اَقسام یا نوعیتوں) سے باہر نہیں ہیں۔ تو پھر صاحبِ قول پر لازم ہوگا کہ وہ ان سات وجوہ کو بیان کرے۔ پس اگر وہ، وہ ہی سات وجوہ بیان کرتا ہے جو ہم نے (قولِ مختار میں) بیان کی ہیں تو اس کا قول ہمارے قول میں متداخل ہوگا اور اسے علیحدہ سے مستقل قول قرار نہیں دیا جائے گا۔

فائدہ ❁ بعض اکابر علماء نے تیسرے، چوتھے قول اور اس کے مشابہ اَقوال کو ہمارے قولِ مختار کے ساتھ متحد قرار دیا ہے۔ لیکن آپ ماقبل جان چکے ہیں (کہ ہمارے قولِ مختار میں بیان کردہ وجوہات وہ ہیں جن پر مطلع ہونے میں امام ابوالفضل الرازی منفرد ہیں۔)

پانچواں، چھٹا اور ساتواں قول

پانچواں قول ابنِ قتیبہ، چھٹا ابن جزری اور ساتواں ابن الطیب کا ہے۔ تحقیق یہ تینوں اَقوال اور ان میں موجود نقائص (مثلاً یہ اَقوال تمام قراءاتِ متواترہ کو شامل نہیں ہیں وغیرہ) ہم ماقبل تفصیل سے بیان کرچکے ہیں۔ اگرچہ یہ تینوں اَقوال قولِ مختار کے قریب ترین ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کو علیحدہ مستقل اَقوال قرار دیا جائے گا۔

آٹھواں قول

"احرفِ سبعہ سے وہ وجوہ مراد ہیں جو مبنی ہیں تلاوتِ قرآن کی کیفیت یعنی ادغام واظہار، تفخیم وترقیق، امالہ واِشباع، مدوقصر، تشدید وتخفیف اور تلیین پر"

اس قول کے جواب میں کہا جائے گا کہ یہ کیفیات تو سات سے متجاوز ہیں حالاں کہ حدیث میں سات کا لفظ ہے۔ پھر اس کے جواب میں قائل کہے گا کہ حدیث میں لفظ "سات" وہ معروف عدد مراد نہیں ہے جو چھ اور آٹھ کے درمیان ہے۔ بلکہ اس سے کثرت مراد ہے۔ تو پھر ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ آپ نے تلاوتِ قرآن کی کیفیت کی جتنی بھی وجوہ (ادغام واظہار وغیرہ) بیان کی ہیں وہ دراصل ایک ہی نوع سے متعلق ہیں اور اس نوع کا نام ہے "اختلافِ لہجات۔" پس آٹھواں قول بھی مردود ہوگا کیوں کہ اس میں باقی اَنواع مثلاً اَلفاظ وحروف کا اِبدال، تقدیم وتاخیر، نقص وزیادت وغیرہ شامل نہیں ہیں۔

نواں قول

"حروفِ سبعہ سے کسی کلمۂ واحدہ کی وہ مختلف صورتیں مراد ہیں جن میں اُس کلمے کو پڑھا گیا ہو اور معنیٰ میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی ہو۔" اور اگر آپ چاہیں تو اس قول کو یوں بیان کریں۔ "حروفِ سبعہ سے قبائلِ عرب کی وہ سات مشہور لغات مراد ہیں جو کسی ایک کلمہ میں پائی جائیں اور اس کلمے کے معنیٰ میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔" جیسے: هَلُمَّ، أَقبِلْ، تعالَ، عجِّلْ، اسرِعْ، قصدِي، نحوِي یہ سات مختلف اَلفاظ ہیں لیکن ان سب کا معنیٰ ومفہوم ایک ہی ہے اور وہ ہے "طلبِ اقبال" یعنی کسی

متوجہ کرنا یا بلانا۔

یہ قول جمہور اہلِ فقہ وحدیث مثلاً سفیان، ابنِ وہب، ابن جریر الطبری اور الطحاوی کی طرف منسوب ہے۔ یہ حضرات دلیل کے طور پر یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

((عَنْ أَبِي بَكْرَةَ، " أَنَّ جِبْرِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: يَا مُحَمَّدُ اقْرَأْ الْقُرْآنَ عَلَى حَرْفٍ، قَالَ مِيكَائِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اسْتَزِدْهُ، فَاسْتَزَادَهُ، قَالَ: فَاقْرَأْ عَلَى حَرْفَيْنِ، قَالَ مِيكَائِيلُ: اسْتَزِدْهُ، فَاسْتَزَادَهُ حَتَّى بَلَغَ سَبْعَةَ أَحْرُفٍ، قَالَ: كُلٌّ شَافٍ كَافٍ مَا لَمْ تَخْتِمْ آيَةَ عَذَابٍ بِرَحْمَةٍ، أَوْ آيَةَ رَحْمَةٍ بِعَذَابٍ نَحْوَ قَوْلِكَ تَعَالَ وَأَقْبِلْ، وَهَلُمَّ وَاذْهَبْ، وَأَسْرِعْ وَأَعْجِلْ)). (مسند احمد: 20514)

"حضرتِ ابوبکرہ سے روایت ہے جبرئیل نے عرض کیا: اے محمد ﷺ قرآن کو ایک حرف پر پڑھیے۔ حضرتِ میکائیل علیہ السلام نے عرض کیا: (رسول اللہ ﷺ!) اس پر اضافہ کروائیے۔ لہٰذا ایک حرف پر اضافہ کر دیا گیا۔ پھر حضرتِ جبرئیل نے عرض کیا: دو حرفوں پر پڑھیے۔ حضرتِ میکائیل نے پھر اضافے کے لیے کہا۔ اس پر سات حروف تک اضافہ کر دیا گیا۔ پھر حضرتِ جبرئیل نے فرمایا: یہ سارے حروف شافی وکافی ہیں لیکن عذاب کی آیت کو رحمت والی آیت سے اور رحمت والی آیت کو عذاب کی آیت کے ساتھ ختم نہ کیجیے۔ جیسے: تعال، اقبل، ھلم، اذھب، اسرع اور اعجل۔"

فائدہ ۞ بعض روایات میں اعجل کی بجائے عجّل کا لفظ ہے۔

حضرتِ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ وہ "كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ" کو "كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَرُّوْا فِيهِ" اور "كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ سَعَوْا فِيهِ" بھی پڑھتے ہیں۔ اور حضرتِ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ "لِلَّذِينَ آمَنُوا انْظُرُونَا" میں "انْظُرُونَا" کی بجائے "أَمْهِلُونَا" یا "أَخِّرُونَا" پڑھتے تھے۔

اس قول کے رد ہونے کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

① اس حدیث کے مضمون میں حصر نہیں ہے کہ اس سے اس قول پر استدلال کیا جا سکے، بلکہ جیسا کہ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

"اس حدیث میں ان حروف کی (جن پر قرآن نازل ہوا ہے) تمثیل بیان کی گئی ہے کہ ان سے مراد ایسے مضامین ہیں جن کے الفاظ اگرچہ مختلف ہوں لیکن ان کے معنی ومفہوم میں اختلاف نہیں ہے یعنی وہ متضاد معانی اور متعارض وجود پر دلالت نہیں کرتے۔"

اور حصر مراد ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ کیوں کہ اس میں جو مثالیں بیان ہوئی ہیں وہ تو انواعِ اختلاف میں سے صرف ایک نوع کے بعض حصے کی طرف راجع ہیں اور وہ بعض نوع ہے "کلمات کا ابدال" یعنی ایک کلمہ کی جگہ دوسرا کلمہ پڑھنا۔ نیز ان مثالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ضروری نہیں کہ دونوں کلمے ایک دوسرے کے مترادف ہوں۔ جب کہ مذہبِ مذکور میں یہ شرط ہے کہ جن دو لفظوں کو آپس میں بدلا جا رہا ہے وہ ایک دوسرے کے مترادف ہوں۔ یعنی معنی ومفہوم واحد ہو۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا تھا کہ یہ تو ایک نوع کے بھی بعض کی طرف راجع ہے، نوعِ کامل تو در کنار۔ تو جو قول کسی ایک نوعِ کامل کو شامل نہ ہو رہا ہو وہ اُن باقی انواع کو اپنے اندر کیسے شامل کر سکے گا جو کہ آج بھی قراءاتِ متواترہ میں موجود ہیں اور آپ کے پاس موجود مصاحف میں لکھی ہوئی ہیں، جیسا کہ ہم نے مذہبِ مختار میں بیان کیا ہے۔ لہٰذا اس قول میں تو سابقہ اقوال سے بھی زیادہ شدید اور فحش قصور پایا جا رہا ہے کیوں کہ اُن میں سے بعض

قول تو ایسے بھی تھے جو کسی ایک نوعِ کامل کو شامل تھے اور بعض ایک سے زائد انواعِ کاملہ کو شامل تھے۔

② اس قول کے قائلین جلیل القدر لوگ ہیں، لیکن انھوں نے اس قول کو ترجیح دے کر اپنے آپ کو ایک تنگ گھاٹی میں بند کر لیا اور ایسے دشوار معاملے میں الجھا دیا جس میں عظیم خطرہ ہے۔ کیوں کہ انھوں نے کہا ہے:

((إنّ الباقي الآن حرفٌ واحدٌ من السّبعة التي نزل عليها القرآن. أمّا السّتّةُ الأخرٰى فقد ذهبتْ ولم يعدْلها وجود البتّة)).

" جن سات حروف پر قرآنِ کریم نازِل ہوا تھا، اب اُن میں سے صرف ایک حرف باقی ہے۔ اور بقیہ چھ حروف ختم ہو چکے اور اب ان کا کوئی وجود نہیں۔"

یہ قول اختیار کرتے وقت قائلین کے ذہن سے یہ بات نکل گئی یا وہ قصداً بھول گئے کہ آج بھی قرآنِ مجید میں وہ تمام وجوہ (حروفِ سبعہ) موجود ہیں (جیسا کہ پہلے تھیں۔) اس کے بعد قائلین نے بھرپور کوشش کی کہ وہ کسی طرح اُن چھ حروف سے متعلق، جن کے بارے میں وہ ضائع ہونے کا کہہ چکے ہیں، یہ ثابت کردیں کہ وہ منسوخ یا مرفوع ہو گئے ہیں، لیکن وہ ایسا کچھ بھی ثابت کرنے سے عاجز رہے۔ پھر اس عجز نے انھیں ایک اور خطرناک مقام پر لا کھڑا کیا۔ وہ یہ کہ انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ ایک حرف کو باقی رکھنے اور بقیہ چھ کو ترک کرنے پر تمام اُمتِ مسلمہ کا اجماع منعقد ہو چکا تھا۔ لیکن وہ قائلین اس اجماع کی دلیل کہاں سے لاتے؟ لہٰذا اس اجماع کو ثابت کرتے کرتے وہ ایک اور کھائی میں جا گرے۔ یعنی یہ کہہ بیٹھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو مصاحف لکھوائے تھے، ان تمام مصاحف میں سے حروفِ ستّہ کو ختم کر دیا گیا تھا اور صرف ایک ہی حرف باقی رکھا گیا تھا اور یہ سب کچھ پوری اُمتِ مسلمہ کے اجماع سے ہوا تھا۔

لیکن ہم ماقبل تفصیل اور مثالوں کے ساتھ ثابت کر چکے ہیں کہ آج بھی مصاحفِ عثمانیہ میں ساتوں حروف میں سے ایک ایک حرف باقی و موجود ہے۔

قائلین اس قول کو اختیار کرنے اور خطرناک گھاٹیوں میں اُترنے کا سبب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اصل میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ مبارک میں اُمت کے درمیان قراءاتِ قرآن میں اختلاف ہونے لگا اور وہ اختلاف اس حد تک بڑھ گیا کہ وہ ایک دوسرے کو کافر کہنے لگے۔ اس موقع پر فتنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ لہٰذا تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے خلیفہ حکیم حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کی قیادت میں اس مشکل کو ختم کرنے اور فتنے کو دبانے کا یہ حل نکالا کہ لوگوں کو ایک حرف پر جمع کر دیا جائے اور اسی ایک حرف کے مطابق مصاحف لکھوائے جائیں۔ اور اس کے علاوہ بقیہ حروف اور مصاحفِ منسوخہ کو مطلقاً نظر انداز و متروک کر دیا جائے۔

یقیناً مذکورہ بالا استناد کمزور اور احتجاج باطل ہے۔ اور رہی بات اختلاف کی، تو مختلف حروف والا اختلاف و نزاع تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بھی ہوا تھا۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حروف کو برقرار رکھا اور اس مشکل کا بے مثال حل یہ نکالا کہ لوگوں کو سمجھایا کہ وجوہِ قراءات کا یہ اختلاف تمھارے لیے بلکہ (قیامت تک آنے والی) پوری اُمتِ مسلمہ کے لیے رحمتِ باری تعالیٰ ہے۔ اس کی مزید صراحت اس سے بھی ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے حروف کی تعداد بڑھانے کی دُعا فرمائی کہ میری اُمت ایک ہی حرف پر پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ (لہٰذا تعداد بڑھا دی جائے۔ اس طرح وہ تعداد سات تک پہنچ گئی)۔

اور آپ تو جانتے ہیں کہ اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبھا السلام والتحیہ) قیامت تک باقی رہے گی۔اور اس چیز کی طاقت قیامت تک نہیں رکھے گی، جس کے بارے میں اس کے رسولِ معصوم رحیم صلوات اللہ وسلامہ علیہ نے اعتراف فرمایا تھا۔اور ہم اب اپنے زمانے میں بھی دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے علاقوں میں ہی بہت سی زبانیں ایسی ہیں جو دوسرے علاقے میں رہنے والے مسلمان نہیں بول سکتے۔لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو خیر القرون میں تھے وہ اس رحمتِ باری تعالیٰ کے اس دروازے کو کیسے بند کر سکتے تھے جس کو اللہ تعالیٰ نے امتِ محمدیہ (علی صاحبھا السلام والتحیہ) پر کھولا تھا۔

پس قائلین نے اس قول کو اختیار کر کے ایک ایسا رخنہ ڈال دیا جس کو دور کرنا ممکن نہیں اور ایک ایسا شگاف پیدا کر دیا جس کو بھرنا ناممکن ہے۔اور یہ ممکن ہو بھی کیسے سکتا ہے کیوں کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم ان چھ حروف کو ضائع کرنے پر راضی ہو جائیں جن پر قرآنِ کریم نازِل ہوا تھا۔باوجود اس کے کہ ان حروف کا نسخ یا رفع بھی ثابت نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قول اور فعل دونوں کے ذریعے ان حروف کو برقرار رکھا ہے۔لہٰذا کسی ایک کے بھی لیے جائز نہیں کہ وہ ان سات حروف میں سے کسی ایک حرف سے کسی کو منع کرے۔کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں اختلاف کرنے والوں کو فرمایا تھا: "ھٰکَذَا اُنْزِلَتْ۔" نیز حضرتِ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے سینے پر مارا بھی تھا جب انھوں نے قراءت کے اس اختلاف سے اشکال ظاہر کیا تھا۔(یہ واقعہ ماقبل تفصیل سے گزر چکا ہے)۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس سے بے داغ سمجھتے ہیں کہ وہ ان حروف کو ختم کرنے سے متعلق صرف سوچ و بچار کریں چہ جائیکہ وہ ان کو ضائع کرنے کا حکم دیں۔اور اللہ کی پناہ! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ انھوں نے حروفِ سبعہ میں سے کسی حرف کو ساقط کرنے کا اِقدام کیا ہو۔

اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف اس معاملے کو کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے، جب کہ یہ تو معروف و مشہور ہے کہ حضرتِ ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں جو مصاحف جمع کیے گئے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان ہی مصاحف کی نقلیں تیار کروائیں تھیں۔اور حضرتِ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں جمعِ قرآن سے قبل بھی حروفِ سبعہ والا اختلاف پایا جاتا تھا۔اس سے ثابت یہ ہوا کہ حضرتِ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں جو مصاحف تھے، ان میں بھی تمام حروفِ سبعہ شامل تھے۔کیا اُس وقت یہ ضرورت پیش نہیں آئی تھی کہ چھ حروف کو چھوڑ کر کسی ایک حرف پر اکتفاء کر لیا جائے۔لیکن اس موقع پر تو اتنا بھی ثابت نہیں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عہد صدیقی میں جمع ہونے والے مصاحف میں، چھ حروف تو درکنار کسی ایک حرف کو بھی ترک کیا ہو۔اور اگر ایسا ہوا ہوتا تو ہم تک یہ بات (ترکِ حرف یا ترکِ حروف والی بات) تواتر کے ساتھ پہنچتی کیوں کہ اس وقت تواتر کے ساتھ پہنچنے کے بہت سے دواعی موجود تھے۔

اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایسا کر بھی کیسے سکتے تھے، جب کہ وہ جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے اختلاف کا اپنے زمانے میں یہ حل نکالا تھا، کہ لوگوں کو ان ساتوں حروف کے باقی رہنے اور قرآن کے ان حروف پر نازِل ہونے سے متعلق سمجھایا تھا۔اور ان حروف میں سے کسی ایک حرف پر پڑھنے یا تمام حروف پر پڑھنے سے منع نہیں فرمایا تھا۔(یعنی اجازتِ عام تھی کہ جو چاہے ان ساتوں حروف میں سے پڑھے۔کیوں کہ قرآنِ کریم کو سات حروف پر نازِل کرنے کا مقصد تھا ہی اُمت پر آسانی کرنا۔اگر اس میں بھی شرائط و قیود لگا دی جاتیں کہ فلاں حرف پر پڑھو اور فلاں پر نہ پڑھو، تو یہ سہولت مشقت سے بدل جاتی۔)

پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کیسے حروفِ ستہ کو ترک کر دیا اور کیسے اُمت نے ان سے اس اَمر پر موافقت کر لی اور کیسے اجماع

تام ہوگیا؟ اور اجماع کے منعقد ہونے کے بعد حروف سبعہ کی تعیین میں علماء کا اختلاف کیسے ہوگیا؟ یعنی جب عہدِ عثمانی میں ایک حرف کو باقی رکھنے اور بقیہ حروف ستہ کو ترک کرنے پر اُمت کا اجماع ہوگیا تھا تو پھر علماء کے درمیان حروف سبعہ کے معنیٰ کی تعیین وتحدید سے متعلق اختلاف کیوں کر ہوا اور کیوں علماء کے اس سے متعلق اَقوال کی تعداد چالیس تک پہنچی۔ حالاں کہ اجماع مسلمانوں کے نزدیک حجت ہے۔ پس یہ وہ سوالات ہیں جو یقین کے چہرے سے شک کی ظلمتوں کو دور کردیتے ہیں۔

اور اگر ہم فرض کرلیں کہ ایامِ خلافتِ عثمان رضی اللہ عنہ میں پیدا ہونے والے نزاع کا فیصلہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو ایک حرف پر جمع کرنے اور بقیہ چھ حروف کو ترک کرنے سے کیا تھا، تو پھر یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان چھ حروف کو بطورِ تاریخ ہی باقی کیوں نہ رکھا۔ کیوں کہ ضرورت تو صرف لوگوں کے مابین اختلاف دور کرنے کی تھی۔ اور ان چھ حروف کو تاریخ ہی سے ختم کردینا یہ تو ضرورت سے اگلا درجہ ہے۔ حالاں کہ قاعدہ ہے: "اَلضَّرُوْرَۃُ تُقَدَّرُ بِقَدَرِھَا۔" نیز یہ حروف ستہ نہ ہی تو تلاوت کے اعتبار سے منسوخ تھے اور نہ ہی حکم کے اعتبار سے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تو یہ عادت رہی ہے کہ انھوں نے ان آیات کی بھی تاریخ میں محفوظ رکھا ہے جن کی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوگئے تھے۔ نیز قراءاتِ شاذہ کی حفاظت بھی فرمائی۔ پھر وہ ہم تک پہنچیں اور لکھی گئیں جس سے انھیں آج اور آج کے بعد تک کے لیے خلود ملا۔ بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے تو ہم تک احادیثِ منسوخہ بھی پہنچائیں۔ اور علماء نے احادیثِ موضوعہ کو بھی نقل کیا۔ اور ان سے ثابت اور ساقط ہونے والے احکام بھی بیان کیے۔ (تو یہ کیسے ممکن ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان حروف ستہ کو جو قائلین کے بقول حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے صحیفوں سے نکال دیے تھے، بالکلیہ ہی بُھلا دیا ہو اور ہم تک نہ پہنچایا ہو۔)

پس ہر وہ شخص جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دین کے ساتھ وابستگی، سنجیدگی، قرآن کی حمیت میں دفاع اور اس کی حفاظت پر حریص ہونے سے واقف ہوگا، وہ اس بات کو ناممکن سمجھے گا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآنِ مجید کو ایک حرف پر باقی رکھا ہو اور بقیہ چھ حروف کو ترک کردیا ہو حالاں کہ ان ساتوں حروف پر قرآنِ مجید نازل ہوا تھا۔ ماقبل بیان کردہ (سات حروف پر قرآنِ مجید کے نازل ہونے کے دلائل میں سے ساتویں دلیل اور) دس اُمور میں سے چھٹے اَمر (اور ساتویں اَمر) کا ایک بار پھر سے مطالعہ کریں تو یہ بات اور بھی واضح ہوجائے گی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرتِ ہشام، حضرتِ ابی بن کعب اور حضرتِ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اور ان کے دونوں ساتھیوں کے ساتھ حروفِ سبعہ پر تلاوت سے متعلق کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ ان حضرات نے کیسے اس قراءت کا فوراً انکار کیا تھا جو انھوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نے نہیں سُنی تھی۔ پھر اُس معاملے کو وہ حضرات کیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مشکل کو حل فرماتے ہوئے دونوں کو مصیب ومحسن قرار دیا تھا۔ اور بتایا تھا کہ "ھٰکَذَا اُنْزِلَتْ۔" اور بے شک قرآنِ مجید سات حروف پر نازل کیا گیا ہے اور جو ان میں سے کسی ایک حرف کا بھی انکار کرے گا وہ سب کے انکار کے مترادف ہوگا۔ تاکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان آئندہ اس معاملے میں اختلاف نہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ ایسا ہے کہ اب اس کے بعد کسی خطیب کی تقریر کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ جیسا کہ عرب کی ضرب المثل ہے: "قَطَعَتْ جَھِیْزَۃُ قَوْلَ کُلِّ خَطِیْبٍ"

(از مترجم: عرب میں ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک بہت سمجھ دار عورت تھی۔ جس کا نام جَھِیْزَۃ تھا۔ ایک مرتبہ دو قبیلوں میں سے ایک نے دوسرے کے آدمی کو قتل کردیا، تو لوگ دونوں میں دیت کے ذریعے صلح کرانے کے لیے جمع ہوئے۔ لیکن جہیزہ نے اپنی

فراست سے جان لیا کہ مقتول کے ورثاء میں سے کوئی وارث قاتل سے مل گیا ہے اور دیت پر صلح کے لیے لوگوں کو آمادہ کر کے لے آیا ہے۔ تو اس وقت اس نے صرف ایک جملے میں ساری صورتِ حال کو بیان کرتے ہوئے کہا: "اِنَّ الْقَاتِلَ قَدْظَفِرَبِهٖ بَعْضُ اَوْلِيَآءِ الْمَقْتُوْلِ" (یعنی مقتول کے کسی وارث نے قاتل کا کام تمام کر دیا۔) اس کے اس حیران و فیصلہ کُن جملے کی شان میں کہا گیا: "قَطَعَتْ جَهِيْزَةُ قَوْلَ كُلِّ خَطِيْبٍ" یعنی جہیزہ نے ایسی بات کہہ دی کہ اب کسی خطیب کی تقریر کی ضرورت نہ رہی۔ اہلِ عرب یہ ضرب المثل ایسے شخص کے بارے میں بولتے ہیں جو لوگوں کے کسی معاملے کو اچانک کسی بات سے ختم اور حل کر دے۔)

③ اس قول کے قائلین کا یہ بھی کہنا ہے کہ آج قراءات کے جتنے بھی اختلاف ہیں، وہ سب کے سب ایک ہی حرف کی طرف لوٹتے ہیں۔ نیز قراءاتِ حاضرہ میں اختلافات کی بنیادی وجوہات میں سے ایک ہی کلمے میں معنیٰ واحد کے ساتھ الفاظِ مترادفہ کا پایا جانا اور مختلف قبائل کی لغات ہیں۔ جیسا کہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الاتقان کی سینتیسویں نوع میں (مختلف قبائل کی لغات سے متعلق) بیان کیا ہے۔ ہم اس سے متعلق اسی بحث میں کسی اور مقام پر بیان کریں گے۔

اور ہمارے پاس ساتوں حروف کے بقاء پر دلیلِ مادّی بھی موجود ہے۔ اور وہ ہے تیسیر و تخفیف کا باقی رہنا اور امتِ مسلمہ پر ادائیگی میں سہولت کا باقی رہنا اور یہ حکمت حروفِ سبعہ میں ہی ممکن ہے۔ پس اُس وقت سے اب تک ہمارا یہ ہی مشاہدہ ہے کہ مختلف قراءات ایک آسان راستہ ہے تمام مسلمانوں کے لیے خواہ وہ عرب ہوں یا غیرِ عرب۔ اور تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اس کے فضل اور اس کی رحمت کے دوام پر اور اس تخفیف و تیسیر کے باقی رکھنے پر۔ اور اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے ان علمائے کرام کی جنھوں نے اس مسئلے میں اجتہاد کیا اگرچہ خطا پر رہے اور مقصود تک نہ پہنچ سکے۔ اور مجتہد کے لیے دو اجروں میں سے ایک اجر تو ہوتا ہی ہے خواہ وہ غلطی پر ہو۔ ہم اللہ ہی سے دُعا کرتے ہیں توفیق و سداد کی۔ آمین۔

دسواں قول

"حروفِ سبعہ سے لغاتِ عرب میں سے سات لغات مراد ہیں۔ بایں معنیٰ کہ قرآنِ کریم ان سات لغاتِ عرب کے دائرہ سے باہر نہیں نکلتا۔ وہ سات لغات یہ ہیں: لغتِ قریش، لغتِ ہذیل، لغتِ ثقیف، لغتِ ہوازن، لغتِ کنانہ، لغتِ تمیم اور لغتِ یمن۔ یہ ساتوں لغات، عرب کی فصیح ترین لغات ہیں۔

قال بعضهم: یہ قول تمام اَقوال میں اصح اور درستی کے قریب ترین ہے۔ یہ ہی وہ قول ہے جس پر اکثر علماء کا اعتماد ہے۔ امامِ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ علامہ ابہری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ اور صاحبِ قاموس نے بھی اسی پر انحصار کیا ہے۔

ابوعبید کہتے ہیں: اس قول میں یہ مراد نہیں کہ ہر کلمہ سات لغات پر پڑھا جائے گا۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ساتوں لغات متفرق طور پر قرآنِ مجید میں پائی جاتی ہیں (یعنی قرآنِ کریم مجموعی طور پر اپنے کلمات میں عربوں کی فصیح ترین سات لغات کے دائرے سے نہیں نکلتا)۔ پس بعض الفاظ لغتِ قریش پر پڑھے جائیں گے اور بعض لغتِ ہذیل، لغتِ ہوازن اور لغتِ یمن وغیرہ پر پڑھے جائیں گے۔ لہٰذا بعض لغات کو بعض لغات پر فضیلت حاصل ہوگی کیوں کہ قرآنِ کریم کا زیادہ حصہ ان پر مشتمل ہوگا۔

فائدہ: ان سات قبائل کی تعیین میں اور آراء بھی بیان کی گئی ہیں۔

(مثلاً: امامِ ابوحاتم سجستانی نے ان قبائل کے نام یہ بیان کیے ہیں: ۱۔ قریش، ۲۔ ہذیل، ۳۔ تیم الرباب، ۴۔ ازد، ۵۔ ربیعہ، ۶۔ ہوازن، ۷۔ سعد بن بکر۔ حافظ ابن عبدالبر نے درج ذیل سات کے نام شمار کروائے ہیں: ۱۔ ہذیل، ۲۔ کنانہ، ۳۔ قیس، ۴۔ ضبہ،

۵۔تیم الرباب، ۶۔اسد ابن خزیمہ، ۷۔قریش۔بحوالہ: فتح البخاری جلد ۹ صفحہ ۲۲۔ازمترجم)

دسویں قول کو دو وجوہات کی بنا پر ردّ کیا جاسکتا ہے۔

دسویں قول کو ردّ کرنے کی پہلی وجہ ❂ قول میں بیان کردہ سات قبائل کی لغات کے علاوہ اور بھی بہت سے قبائل کے الفاظ قرآنِ کریم میں موجود ہیں۔

① ﴿وَ اَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ۝﴾ (النجم:۶۱) لفظِ ﴿سٰمِدُوْنَ ۝﴾ حمیری قبیلے کا ہے۔

② ﴿اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ﴾ (یوسف:۳۶) لفظِ ﴿خَمْرًا ۚ﴾ اہلِ عمان کی لغت میں سے ہے۔کیوں کہ وہ عنب کو خمر کہتے ہیں۔ اوران کا عنب کو خمر کہنا حقیقتاً ہے مجازاً نہیں۔

③ ﴿اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا﴾ (الصافات:۱۲۵) ﴿بَعْلًا﴾ یعنی "رَبًّا" یہ لفظ قبیلہ "ازدِشنوءۃ" کی لغت کا ہے۔(ازدشنوءۃ کو ازدشنوَ ۃ بھی کہا جاتا ہے۔نصر بن ازد کی طرف منسوب ہے۔)

④ ﴿لَا یَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَیْـًٔا ؕ﴾ (الحجرات:۱۴) لفظِ ﴿لَا یَلِتْكُمْ﴾ قبیلہ بنو عبس کی لغت میں سے ہے اور معنی ہے "لاینقصکم۔"

⑤ ﴿فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ﴾ (البقرۃ:۹۰) لفظِ ﴿فَبَآءُوْ﴾ قبیلہ جُرہم کی لغت میں سے ہے اور "استوجبوا" کے معنی میں ہے۔

⑥ ﴿فَلَا رَفَثَ﴾ (البقرۃ:۱۹۷) لفظِ ﴿رَفَثَ﴾ قبیلہ مذحج کی لغت سے ہے اور "جماع" کے معنی میں ہے۔

⑦ ﴿فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ ۝﴾ (النحل:۱۰) لفظِ ﴿تُسِیْمُوْنَ ۝﴾ قبیلہ خثعم کی لغت سے اور "تَرْعَوْنَ" کے معنیٰ میں ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔اگران کا مطالعہ کرنا ہو تو علامہ جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ السیوطی کی کتاب "الاتقان" کی سینتیسویں نوع سے رجوع کریں۔

اس موقع پر آپ کے لیے علامہ ابوبکر الواسطی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ قول کافی ہوگا، جو انھوں نے قراءاتِ عشرہ کے موضوع پر اپنی تالیف میں نقل کیا ہے۔فرماتے ہیں: بے شک قرآنِ مجید میں چالیس لغاتِ عربیہ موجود ہیں۔اور وہ یہ ہیں:

۱۔قریش	۱۱۔ازدشنوءۃ	۲۱۔انمار	۳۱۔عامر بن صعصعہ
۲۔ہذیل	۱۲۔کندہ	۲۲۔غسان	۳۲۔اوس
۳۔کنانہ	۱۳۔تمیم	۲۳۔مذحج	۳۳۔مزینہ
۴۔خثعم	۱۴۔حمیر	۲۴۔خزاعہ	۳۴۔ثقیف
۵۔خزرج	۱۵۔مدین	۲۵۔غطفان	۳۵۔جذام
۶۔اشعر	۱۶۔لخم	۲۶۔سبا	۳۶۔بلی
۷۔نمیر	۱۷۔سعد العشیرۃ	۲۷۔عمان	۳۷۔عذرہ
۸۔قیس عیلان	۱۸۔حضرموت	۲۸۔بنو حنیفہ	۳۸۔ہوازن
۹۔جرہم	۱۹۔سدوس	۲۹۔ثعلب	۳۹۔نمر
۱۰۔یمن	۲۰۔عمالقہ	۳۰۔طی	۴۰۔یمامہ

اس بات سے آپ کی توجہ ہرگز نہ ہٹنے پائے کہ لغت قریش جملہ لغات عرب کی قائد ومحافظ تھی، دوسری لغات کے جن الفاظ میں اہل قریش مٹھاس پاتے اور ان کے ذوق میں وہ الفاظ لطیف وفصیح ہوتے اوّلاً قریش انھیں اخذ کرتے اور پھر ان کی اقتداء میں باقی سب لوگ بھی انھیں اپنے استعمال میں لانے لگتے تھے، اس اعتبار سے لغت قریش میں ان سب لغات کا تشخص موجود ہے اور اس بناء پر یہ کہنا درست ہے کہ "لسانِ قریش ہی عمومی لسانِ عربی ہے اور اسی میں قرآن نازل ہوا ہے۔" جیسا کہ ماقبل گزر چکا۔ پس اسے یاد رکھیے۔ اور اللہ ہی کا کام ہے ہم سب کو ہدایت دینا۔

دسویں قول کو ردّ کرنے کی دوسری وجہ: ابوعبید رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کی جو توجیہ بیان کی ہے وہ اس کا تقاضا کرتی ہے کہ قرآنِ کریم کے بعض اَلفاظ لغتِ قریش سے ہوں اور بعض لغتِ ہذیل سے اور اسی طرح مختلف لغات سے بعض بعض اَلفاظ ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک شخص کے لیے قرآنِ کریم کے اس لفظ کو پڑھنا تو ممکن ہوگا جو اُس کی اپنی لغت سے ہے اور جو لفظ لغتِ غیر سے ہے اسے پڑھنا اُس کے لیے ناممکن یا مشکل ہوگا۔ حالاں کہ قرآنِ کریم کو سات حروف پر نازِل کرنے کی حکمت اُمت کے لیے تیسیر وسہولت تھی، جو اس صورت میں فوت ہوگئی۔ لہٰذا اس قول کے باطل ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہوئی۔ اور دوسری وجہ یہ کہ اس توجیہ کو تسلیم کرنے سے ان روایاتِ سابقہ کی مخالفت لازم آتی ہے جن میں بیان ہوا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قراءات کے حوالے سے آپس میں اختلاف ہوا ہے۔ کیوں کہ وہ روایات تقاضا کرتی ہیں کہ جس لفظ میں اختلاف ہوا تھا وہ ایک ہی لفظ تھا۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرتِ ہشام رضی اللہ عنہ کا اختلاف ہوا تھا سورۃ الفرقان میں اور حضرتِ عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اپنے ساتھی سے سورۃ حم سجدہ میں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں مختلفین کو درست قرار دیا تھا حالاں کہ دونوں قریشی تھے۔

گیارھواں قول

"حروفِ سبعہ سے، عرب کے ایک خاص قبیلے، جس کا نام "مضر" ہے، کی سات لغات مراد ہیں۔ اور وہ قرآنِ کریم میں متفرق طور پر موجود ہیں۔ اور مضر کے سات قبائل یہ ہیں: قریش، کنانہ، اسد، ہذیل، تمیم، ضبہ، قیس" یہ قول بھی اسی دلیل سے ردّ ہو جاتا ہے جس سے ہم نے سابقہ قول کو ردّ کیا تھا۔ بلکہ اس قول کا بطلان تو اور بھی زیادہ آسان ہے، کیوں کہ یہ سابقہ قول کی نسبت زیادہ خاص ہے اور سابقہ قول کو ہم نے خاص اور محدود ہونے کی وجہ سے ہی باطل قرار دِیا تھا۔ اور دوسری وجہ یہ کہ مضر کے بعض قبائل شواذ ہیں۔ اور قرآنِ کریم جو کہ اللہ کی کتاب ہے، ان شواذ سے مبرا اور منزہ ہے۔ شواذ کی مثالیں ذیل میں موجود ہیں۔

① قبیلہ قیس والے مؤنث کی ضمیرِ مخاطب "ک" کو "شین" سے بدلتے ہیں۔ ان کے اس لہجے کا نام "كَشْكَشَةُ قَيْسٍ" ہے۔ اس لہجے کے مطابق، وہ اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا﴾ (مریم: ۲۴) کو ﴿قَدْ جَعَلَ رَبُّشِ تَحْتَشِ سَرِيًّا﴾ پڑھیں گے۔

② قبیلہ تمیم والے "سین" کو "تاء" سے بدلتے ہیں۔ ان کے اس لہجے کا نام "تَمْتَمَةُ تَمِيْمٍ" ہے۔ اس لہجے کے مطابق، وہ "الناس" کو "النات" پڑھیں گے۔

(ان مثالوں کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ) قرآنِ کریم نے اس طرح کی لغات کو محفوظ نہیں کیا۔

بارھویں قول سے چالیسویں قول تک

"حروف سبعہ سے مراد قرآنی آیات کی سات اَقسام ہیں۔" پھراس قول کے قائلین میں ان سات اَقسام کی تعیین وتحدید اوراسلوبِ تعبیر میں اختلاف ہونے کی وجہ سے، ان کی آراء کی تعداد چالیس اَقوال تک پہنچ گئی ہے، جوکہ درج ذیل ہے۔ پس ان میں سے بعض کہتے ہیں:

⑫ وہ سات اَقسام یہ ہیں: امر، نہی، حلال، حرام، محکم، متشابہ، اَمثال۔

⑬ وہ سات اَقسام یہ ہیں: وعدہ، وعید، حلال، حرام، مواعظ، اَمثال، احتجاج۔

⑭ وہ سات اَقسام یہ ہیں: محکم، متشابہ، ناسخ، منسوخ، خصوص، عموم، قصص۔

⑮ ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ قرآنِ مجید کے اَلفاظ ان سات اَقسام سے خالی نہیں (۱) لفظ عام ہو اور اس سے عام ہی مراد لیا گیا ہو۔ (۲) لفظ خاص ہو اور اس سے خاص ہی مراد لیا گیا ہو۔ (۳) لفظ عام ہو اور اس سے خاص مراد لیا گیا ہو۔ (۴) لفظ خاص ہو اور اس سے عام مراد لیا گیا ہو۔ (۵) وہ لفظ جو اپنے شانِ نزول ہی کے سبب اپنی تاویل سے مستغنی ہو گیا ہو۔ (۶) ایسا لفظ جس کا معنی علماء ہی سمجھتے ہو (۷) ایسا لفظ جس کی مراد علمائے راسخین کے علاوہ کسی اور کو معلوم نہیں ہوتی۔

⑯ ایک قول کے مطابق: اظہارِ ربوبیت، اثباتِ وحدانیت، تعظیمِ الوہیہ، خدا کی عبادت گزاری کرنا، شرک کی باتوں سے بچنا، ثواب کی جانب رغبت دِلانا اور عذاب وسزا سے ڈرانا۔

⑰ ایک قول کے مطابق وہ اَصناف وانواع یہ ہیں: مطلق، مقید، عام، خاص، نص، مؤوّل، ناسخ ومنسوخ، استثناء اور اس کی اقسام

⑱ ایک قول کے مطابق حروفِ سبعہ سے یہ انواع واَصناف مراد ہیں: حذف، صلہ، تقدیم، تاخیر، استعارہ، تکرار، کنایہ، حقیقت، مجاز و مجمل، مفسر اور ظاہر و غیب

اِن اَقوال کے علاوہ اور بھی اَقوال ہیں جو اسی طرز پر (مختصراً) یا سابقہ طرز پر (تفصیلاً) بیان ہوئے ہیں۔ اور ان کی تعداد چالیس تک پہنچ جاتی ہے۔

اَقوالِ اَخیرہ کا اِجمالی ردّ

آخر میں مذکورہ (یعنی بارھویں سے چالیسویں قول تک) تمام اَقوال مردود ہیں۔ ان کا اجمالی بیان ذیل میں درج ہے۔

① حروفِ سبعہ سے متعلق اَحادیث، ان اَقوالِ اخیرہ پر منطبق نہیں ہوتیں۔ کیوں کہ یہ اَصناف (مثلاً امر ونہی، وعدہ ووعید، عام و خاص، حلال وحرام وغیرہ) جو ان اَقوال میں بیان ہوئی ہیں اُن کا قراءات کے اختلاف سے کوئی تعلق نہیں۔ جب کہ احادیث میں جس اختلاف کا ذکر ہے اس کا تعلق قراءات، نطق وتلفظ کے ساتھ ہے نہ کہ ان اصناف وانواع کے ساتھ جو ان آراء میں بیان

ہوئی ہیں۔ اگر آپ مزید تفصیل چاہتے ہیں تو ماقبل بیان کردہ دس اُمور میں سے آٹھواں اَمر پڑھ لیجیے۔

② ان اَقوال کی کوئی صحیح سند موجود نہیں ہے کہ جس کے ذریعے حروفِ سبعہ کے حصر پر دلالت ہو سکے۔ اور ہم ایسی رائے کو قبول ہی نہیں کرتے جو غیر مدلل ہو اور اس کی تائید میں کوئی حجت بھی موجود نہ ہو۔

③ حروفِ سبعہ پر قرآنِ کریم کو نازل فرمانے میں رحیم وکریم شارع علیہ السلام کی طرف سے وسعت مقصود تھی۔ لیکن ان اَقوالِ اخیرہ میں مذکورہ اَصناف واَنواع میں ایسی کوئی وسعت نہیں پائی جاتی۔

④ جب ہم ان اَقوالِ اخیرہ میں سے بعض آراء کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ سات سے زیادہ اَصناف وانواع پر مشتمل ہیں۔ اب ان اَصناف وانواع کا سات سے زیادہ ہونا یا تو گنتی میں غلطی واقع ہونے کی وجہ سے ہوا ہے یا پھر ان آراء کو اختیار کرنے والے صاحبان اس سوچ ونظریہ سے متاثر ہیں کہ سات کے عدد سے حقیقی عدد سات مراد نہیں ہے بلکہ یہ کنایہ ہے کثرت سے۔ اور آپ پہلے جان چکے ہیں کہ لفظِ سبعہ سے حقیقی عدد "سات" مراد نہ لینا بھی خطا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو دس اُمور میں دوسرے اَمر کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

⑤ ان اقوالِ اخیرہ کے تحت مذکورہ آراء واَصناف میں سے اکثر ایک دوسرے میں متداخل ہیں اور ایک دوسرے کے بہت زیادہ مشابہ ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں سے بہت سے اَقوال کو علیحدہ علیحدہ مستقل قول شمار کرنا قریب المحال ہے۔

علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب الاتقان میں علامہ الشرف المرسی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں۔ علامہ مرسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"ان (اقوالِ اخیرہ کے تحت مذکورہ) وجوہ میں سے اکثر متداخل ہیں اور نہ اُن کا مستند ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اور نہ ہی پتہ لگتا ہے کہ وہ کس سے منقول ہیں۔ نہ مجھے اس بات کا علم ہو سکا کہ ان لوگوں میں سے ہر ایک نے حروفِ سبعہ کو اپنے بیان کیے ہوئے معنوں کے ساتھ کیوں خاص کیا؟ کیوں کہ وہ سب معانی قرآن میں موجود ہیں۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر تخصیص کے کیا معنیٰ ہوں گے؟ اور اس کے علاوہ میں ان کے حقیقی معنوں کو سمجھنے سے بھی قاصر رہا ہوں۔ اور میں ان میں سے اکثر باتوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرتِ ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے خلاف پاتا ہوں جو صحیح میں موجود ہے۔ کیوں کہ ان دونوں صاحبوں نے قرآن کی تفسیر اور احکام میں ہرگز اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ اُن کا اختلاف محض حروف کی قراءت میں منحصر ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ بہت سے عام لوگوں نے اس روایت: "قرآن کا نزول سات حروف پر ہوا ہے" سے، یہ گمان کیا ہے کہ اس سے سات قراءاتیں مراد ہیں۔ حالاں کہ یہ ایک بہت بُرا اور نادانی کا خیال ہے۔"

اَصلِ موضوع پر وارِد ہونے والے اعتراضات اور ان کے جوابات

(اب سے پہلے تک کسی خاص قول یا مذہب پر وارِدہ اعتراضات اور ان کے جوابات بیان کیے جا رہے تھے۔ لیکن اب نفسِ موضوع یا اصلِ موضوع یعنی "حروفِ سبعہ پر نزولِ قرآن" پر وارِد ہونے والے چار شبہات اور ان کے جوابات بیان کیے جائیں گے۔ از مترجم)

اِسلام کے دُشمن مسلمانوں سے تعداد میں زیادہ ہیں اور وہ (اِسلام و مسلمین کو اذیت ونقصان پہنچانے کے لیے) ہر وقت چوکنے اور بیدار مغزر رہتے ہیں۔ جب کہ مسلمان جہالت کی بناء پر (مذہبی اُمور میں اعتراض کر کے) اپنے ہی پیارے مذہب اِسلام اور اُمتِ مسلمہ کو اذیت پہنچاتے ہیں۔ اور یہ اذیت اُس اذیت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، جو غیروں (دشمنوں) کی طرف سے پہنچتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

لَا یَبْلُغُ الْاَعْدَاءُ من جاهل　　مایبلُغُ الجاهل من نفسه

تحقیق ہم اپنوں اور اغیار دونوں کی طرف سے توہمات اور شبہات سنتے رہتے ہیں۔ پس ایسے حالات میں لازم ہے کہ ہمارے پاس جو علم کے اَنوار اور دلائل وحجتوں کے اَنبار ہیں، وہ آپ کے سامنے پیش کریں تاکہ شبہات وتہمتوں کا اندھیرا چھٹ جائے۔

﴿وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ۝﴾ (الاحزاب: ۴)

”اور اللہ تعالیٰ ہی حق بات فرماتا ہے اور وہ ہی سیدھا راستہ دِکھاتا ہے۔“

پہلا شبہ ”سات حروف پر قرآنِ کریم کے نازِل ہونے والی اَحادیث قرآنِ مجید میں اختلاف کو ثابت کرتی ہیں۔ جب کہ خود قرآنِ کریم اپنے اندر اِختلاف، پائے جانے کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے:

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۝﴾ (النساء: ۸۲)

”کیا غور نہیں کرتے قرآن میں، اگر یہ (کلام) اللہ کے سوا کسی اور کا ہوتا تو ضرور پاتے اس میں بہت زیادہ اختلاف۔“

پس یہ ایک تناقض ہے اور ہمیں نہیں معلوم ان دونوں (قرآن وحدیث) میں سے کون صادِق ہے؟“

پہلے شبہے کا جواب اس شبہے کو رفع ودفع کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ان اَحادیث سے جو اختلاف ثابت ہوتا ہے وہ اس اختلاف کے علاوہ ہے جس کی نفی قرآنِ کریم نے کی ہے۔ لہٰذا قرآن اور حدیث دونوں ہی صادِق ہیں۔

یعنی احادیثِ شریفہ سے جو اختلاف ثابت ہوتا ہے اس کا تعلق ایک محدود دائرے میں رہتے ہوئے قرآنِ کریم کے اَلفاظ کو بولنے اور ان کی ادائیگی کے طریقوں کے ساتھ ہے، جو کہ سات حروف سے تجاوز نہیں کرتے۔ اور ان سات حروف کے لیے بھی شرط ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ سے حاصل کردہ ہوں۔ لہٰذا احادیث سے ثابت ہونے والا اختلاف تنوع کے معنی میں ہوا۔ اور رہی بات قرآنِ کریم کی، تو قرآنِ کریم اپنے اَلفاظ کے تلفظ اور ادائیگی میں تنوع کے موجود ہوتے ہوئے، اپنے معانی اور تعلیمات میں تناقض اور تدافع کی نفی کرتا ہے۔ (کیوں کہ تناقض وتدافع کی نفی اور چیز ہے جب کہ تلفظ وادائیگی میں اختلاف کی نفی اور چیز ہے۔)

یعنی قرآنِ مجید کا سات حروف پر نازِل ہونا، قرآنِ کریم کے معانی، اس کی تعلیمات اور مقاصد میں کسی بھی قسم کے تناقض، تخاذل (باہمی بے ربطی)، تضاد یا تدافع (باہمی مزاحمت) کو لازم نہیں کرتا۔ بلکہ قرآنِ کریم تو قراءات کے مختلف طرق اور متعدد انواع اَدا کے باوجود ایک مسلسل اور ایسی زنجیر کی مثل کتاب ہے جس کی کڑیاں آپس میں جڑی ہوئی ہوں۔ اس کی تمام سورتیں اور آیات محکم ہیں۔ اس کی ابتداء انتہاء کے ساتھ اور انتہاء ابتداء کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ (یعنی وہ یکجا اور یک جان کلام ہے اس کے معانی ومفاہیم

اور تعلیمات میں کسی قسم کا اختلاف نہیں)۔

ہم اس موقع پر محقق ابن الجزری (ابوالخیر شمس الدین محمد بن محمد بن محمد بن علی بن یوسف الجزری۔ پیدائش: ۲۶ نومبر ۱۳۵۰ عیسوی۔ وفات: ۲ دسمبر ۱۴۲۹ عیسوی) کا معمولی سے تصرف کے بعد، ایک بہت ہی عمدہ کلام (ان کی کتاب "النشر فی القراءات العشر" سے) نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"ہم نے قراءات کے اختلاف میں غور وفکر کیا تو ہم نے اس کو تین حال رصورتوں سے خالی نہیں پایا۔"

یا تو اختلاف صرف لفظ میں ہوگا یعنی معنیٰ میں نہیں ہوگا (یہ پہلی صورت ہے)۔ یا لفظ اور معنیٰ دونوں میں ہوگا۔ اگر لفظ اور معنیٰ دونوں میں ہو تو پھر دو حال سے خالی نہیں۔ دونوں اختلافوں کو شیء واحد میں جمع کرنے کا جواز موجود ہوگا (یہ دوسری صورت ہے)۔ یا جواز تو موجود نہیں ہوگا لیکن وہ دونوں متفق ہو گئے ہوں، کسی اور ایسی وجہ سے جو تضاد کا تقاضا نہ کرتی ہو (یہ تیسری صورت ہے)۔

تینوں احوال رصورتوں کی مثالیں ذیل میں ملاحظہ کیجیے۔

① **پہلی صورت کی مثالیں** ✿ تمام ایسی قراءتیں جن میں محض اَلفاظ کا اختلاف ہے۔ ان کی مثالیں یہ ہیں: الصِّراط، علیهم، یَؤُودُهُ، القدس، یحسب وغیرہ۔

② **دوسری صورت کی مثالیں** ✿ پہلی مثال: سورۃ الفاتحہ میں ہے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ اس آیت میں لفظِ "ملك" میں دو قراءتیں ہیں۔ پہلی قراءت "مٰلِكِ" بمعنیٰ مالِک اور دوسری قراءت "مَلِكِ" بمعنیٰ بادشاہ ہے۔ (لفظ اور معنیٰ دونوں میں اختلاف پایا جا رہا ہے لیکن ان کے اجتماع کا جواز بھی موجود ہے، وہ یہ کہ) دونوں قراءتوں میں مراد ایک ہی ذات ہے یعنی اللہ تعالیٰ۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ ہی روزِ جزا کا مالِک بھی ہے اور بادشاہ بھی۔

دوسری مثال: ﴿وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا﴾ (البقرۃ:۲۵۹)

"اور (اب اپنے گدھے کی) ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم کس طرح انھیں اُٹھاتے ہیں۔"

پہلی قراءت "زاء" کے ساتھ یعنی ﴿نُنْشِزُهَا﴾ بمعنیٰ "ہم ان کو اُٹھائیں گے" اور دوسری قراءت "راء" یعنی ﴿نُنْشِرُهَا﴾ بمعنیٰ "ہم زندہ کریں گے۔" خواہ "زاء" ہو یا "راء" مراد ہڈیاں ہی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ ہی ان ہڈیوں کو اٹھاتے ہیں اور زندہ کرتے ہیں۔ یعنی ان میں سے بعض کو بعض کے ساتھ ملاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ (جان دار) مکمل ہو جاتا ہے۔ پس (دونوں قراءتوں میں لفظ اور معنیٰ دونوں کا اختلاف پایا جا رہا ہے لیکن ان کے اجتماع کا جواز بھی موجود ہے، وہ یہ کہ) دونوں میں اللہ تعالیٰ کو ضامن ٹھہرایا جا رہا ہے۔

③ **تیسری صورت کی مثالیں** ✿ پہلی مثال: ﴿وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا﴾ (یوسف:۱۱۰)

"اور کافر لوگ یہ سمجھنے لگے کہ انھیں جھوٹی دھمکیاں دی گئی تھیں۔"

ایک قراءت میں تخفیف کے ساتھ یعنی "كُذِبُوْا" مبنی للمفعول اور ایک قراءت میں تشدید کے ساتھ یعنی "كُذِّبُوْا"۔ تشدید کی صورت میں معنی ہوگا: "رسولوں نے یقین کر لیا کہ ان کی قوم نے انھیں جھٹلایا ہے۔" اور تخفیف کی صورت میں معنی ہوگا: "قوم کو یہ وہم ہوا کہ رسولوں نے (معاذ اللہ) ان کے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔ یعنی اُن کو عذاب کے آنے سے متعلق جو پیشین گوئی کے طور پر خبریں دی تھیں وہ جھوٹی تھیں (العیاذ باللہ)۔" پس پہلی قراءت (تشدید والی صورت) میں "ظَنّ" "یقین" کے معنی میں ہوگا اور تینوں ضمائر رسولوں کی

طرف راجع ہوں گی۔ اوردوسری قراءت (تخفیف والی صورت) میں "ظن" شک اور توہم کے معنی میں ہوگا اور تینوں ضمائر مُرْسَلٌ اِلَیْهِمْ یعنی قوم کی طرف راجع ہوں گی۔

دوسری مثال: ﴿وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ﴾ (ابراہیم:۴۶)

"چاہے ان کی چالیں ایسی کیوں نہ ہوں جن سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل جائیں۔"

"لتزول" میں ایک قراءت پہلے لام کے فتح اور دوسرے کے رفع کے ساتھ ہے، یعنی: "لَتَزُوْلُ"۔ اس قراءت کے مطابق "وَاِنْ مَكْرُهُمْ" میں "اِنْ" مخففہ من الثقیلہ ہوگا، یعنی:

((وَاِنَّ مَكْرَهُمْ كَامِلُ الشِّدَّةِ تَقْتَلِعُ بِسَبَبِهِ الْجِبَالُ الرَّاسِيَاتُ مِنْ مَوَاضِعِهَا)).

"ان کا مکر شدت میں ایسا کامل ہے کہ اس کی وجہ سے زمین میں جمے ہوئے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے اُکھڑ جائیں۔"

اور دوسری قراءت میں پہلے لام کے کسرہ اور دوسرے کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اس قراءت کے مطابق "اِنْ" نافیہ ہوگا، یعنی:

((مَا كَانَ مَكْرُهُمْ وَاِنْ تَعَاظَمَ وَتَفَاقَمَ لِيَزُوْلَ مِنْهُ اَمْرُ مُحَمَّدٍ ﷺ وَدِيْنُ الْاِسْلَامِ)).

"اگر چہ ان کا مکر بہت بڑا اور سنگین تھا (لیکن) ایسا نہیں تھا کہ اس سے حضرت محمد ﷺ کا معاملہ دینِ اسلام ختم وزائل ہو جاتا)۔

پہلی قراءت میں جبال سے پہاڑ حقیقتاً مراد ہوں گے جب کہ دوسری قراءت میں مجازاً۔"

محقق ابنِ جزری رحمہ اللہ نے یہ بھی فرمایا:

((فليس فى شىء من القرآن تنافٍ ولا تضادٌ ولا تناقضٌ. وكلُّ ماصحَّ عن النبى ﷺ من ذلك، فقد وجب وقبوله، ولم يسعْ احدًا من الامة ردّه، ولزم الايمان به وانه كله منزل من عندالله، اذ كلُّ قراءة منها مع الأخرى بمنزلة الأية مع الأية، يجب الايمان بها كلها، واتباع ما تضمنته علمًا وعملًا، ولا يجوز ترك موجب إحداهما لأجل الأخرى ظنًّا أن هذا تعارض)).

"قرآنِ کریم میں تھوڑا سا بھی تعارض، تضاد یا تناقض نہیں ہے۔ اور اس (قراءات کے باب) میں نبی اکرم ﷺ سے جو کچھ ثابت ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ لہٰذا اس (حروفِ سبعہ) کو قبول کرنا اور اس پر ایمان لانا واجب ولازم ہے۔ اور اُمت میں سے کسی کے لیے گنجائش نہیں کہ وہ اس (حروفِ سبعہ) کا انکار کرے۔ اور بے شک تمام (حروف) اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازِل کردہ ہیں۔ لہٰذا ایک قراءت کی مثال دوسری قراءت کے ساتھ ایسے ہے جیسے ایک آیت کے ساتھ دوسری آیت۔ پس ان تمام (قراءتوں) پر ایمان لازم ہوگا۔ اور ان سے ثابت ہونے والے احکام کا علماً اور عملاً اتباع بھی لازم ہوگا۔ اور دونوں قراءتوں میں سے کسی ایک کے موجَب کو بھی، یہ سوچتے ہوئے کہ، یہ تعارض ہے، چھوڑنا جائز نہ ہوگا۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرف اِشارہ فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

((لَا تَخْتَلِفُوْا فِي الْقُرْاٰنِ وَلَا تَتَنَازَعُوْا فِيْهِ، فَاِنَّهُ لَا يَخْتَلِفُ وَلَا يَتَسَاقَطُ، اَلَا تَرَوْنَ اَنَّ شَرِيْعَةَ الْاِسْلَامِ فِيْهِ وَاحِدَةٌ، حُدُوْدُهَا وَقِرَاءَتُهَا وَاَمْرُ اللهِ فِيْهَا وَاحِدٌ، لَوْ كَانَ مِنَ الْحَرْفَيْنِ حَرْفٌ يَاْمُرُ بِشَيْءٍ يَنْهٰى عَنْهُ الْاٰخَرُ، كَانَ ذٰلِكَ الْاِخْتِلَافَ، وَلٰكِنَّهُ جَامِعٌ ذٰلِكَ كُلَّهُ، وَمَنْ قَرَاَ عَلٰى قِرَاءَةٍ فَلَا يَدَعُهَا رَغْبَةً عَنْهَا، فَاِنَّهُ مَنْ كَفَرَ بِحَرْفٍ

مِنۡهُ كَفَرَ بِهٖ كُلِّهٖ)).

"قرآنِ کریم میں اختلاف و جھگڑا نہ کرو کیوں کہ اس (کی آیات) میں کوئی تعارض یا تساقط (ایک دوسرے کو باہمی ساقط کرنا) نہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ شریعتِ اِسلام ایک ہے۔ اس کی مقررہ حدود اور قراءات اور اللہ تعالیٰ کے احکام ایک ہیں۔ اگر دو (مختلف) حرف ہوتے (یعنی حکم کے اعتبار سے دو مختلف حرف ہوتے۔ اور یہ تو ہم ماقبل پڑھ چکے ہیں کہ قراءات کا جتنا بھی اختلاف ہے، وہ لفظی ہے، معنوی نہیں۔)، تو ایک حرف کسی کام کو کرنے کا حکم دیتا اور دوسرا حرف اسی کام سے منع کرتا۔ (پھر اس طرح) یہ اختلاف شمار ہوتا۔ لیکن یہ قرآن تمام قراءتوں کو جامع ہے۔ پس جو شخص ایک حرف پڑھے، وہ اس کو ترک کر کے دوسرے کی طرف نہ جائے یعنی کسی وجہ (حرف) کا انکار نہ کرے کیوں کہ جس نے (سات حروف میں سے کسی) ایک حرف کا انکار کیا، گویا اُس نے تمام (حروف) کا انکار کیا۔"

دوسرا شبہ قراءات میں اس اختلاف کی وجہ سے قرآنِ کریم میں شک و ریب پیدا ہوتا ہے، خاص طور پر جب ہم ان روایات کو دیکھتے ہیں جن میں لوگوں کو مرادف اَلفاظ کے ساتھ یا ایسے اَلفاظ کے ساتھ جن کے معنیٰ میں تضاد نہ ہو، تبدیلی کا اختیار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

((كلها شاف كاف ما لم تختم آية عذاب برحمة أو آية رحمة بعذاب نحو قولك: تعال وأقبل وهلم واذهب وأسرع وعجل)).

"یہ سارے حروف شافی و کافی ہیں لیکن عذاب کی آیت کو رحمت والی آیت سے اور رحمت والی آیت کو عذاب کی آیت کے ساتھ ختم نہ کیجیے۔ جیسے: تعال، اقبل، هلم، اذهب، اسرع اور عجل۔"

مندرجہ بالا حدیث مسندِ احمد کی روایت ہے اور اس کی اِسناد بھی جید ہے۔ اور اسی کے مثل حضرتِ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ اور ان سب سے بڑھ کر وہ روایت ہے جو "فضائل اَبی عبید" میں ہے کہ حضرتِ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو پڑھایا:

﴿اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوۡمِ ۙ﴿۴۳﴾ طَعَامُ الۡاَثِيۡمِ ﴿ۖۛ۴۴﴾﴾ (الدخان: ۴۳-۴۴)

اُس آدمی نے "طَعَامُ الۡاَثِيۡمِ" کی بجائے "طَعَامُ الۡيَتِيۡمِ" پڑھا۔ حضرت نے اُسے دوبارہ پڑھایا۔ لیکن اس کی زبان پر یہ اَلفاظ جاری نہ ہو سکے۔ حضرت نے اُسے فرمایا: کیا تو "طَعَامُ الۡفَاجِرِ" پڑھ سکتا ہے۔ اُس نے کہا: ہاں۔ حضرت نے فرمایا: ٹھیک ہے تو "طَعَامُ الۡفَاجِرِ" ہی پڑھ لے۔

دوسرے شبہے کا جواب قراءات (حروف) کا اختلاف قرآنِ مجید میں کسی قسم کا شک و ریب پیدا نہیں کرتا کیوں کہ تمام حروف منزل من اللہ ہیں۔ اور رہی بات اُن روایات کی جن پر اس شبہے کی بنیاد ہے۔ تو ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان روایات سے یہ مفہوم ثابت ہو رہا ہو کہ کوئی بھی شخص اپنی مرضی سے مترادف اَلفاظ یا معنیٰ میں تضاد نہ پائے جانے والے اَلفاظ کے ساتھ تبدیلی کر سکتا ہے۔ بلکہ اس طرح کی تمام روایات سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو وسعت دی تھی، خاص طور پر وحی کے ابتدائی دور میں، کہ وہ قرآنِ مجید کو مترادف اَلفاظ کے ساتھ پڑھ لیا کریں لیکن وہ تمام مترادف، جو منزل من اللہ تھے۔ انھیں بھی اللہ تعالیٰ نے حضرتِ جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتارا تھا۔ اور رسول اللہ

ﷺ نے وہ اَلفاظ خاص طور پر پڑھ کر سنائے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے سُن لیے تھے۔ پھر بعد اللہ تعالیٰ نے جن الفاظ کو چاہا منسوخ فرمادیا اور جس کو چاہا باقی رکھ لیا۔ منسوخ کرنے یا باقی رکھنے میں جو حکمتیں تھیں ان کا بیان ان شاء اللہ نسخ کے بیان میں آئے گا۔

ان تمام حروف کے منزل من اللہ ہونے کی (پہلی واضح) دلیل حضورِ اکرم ﷺ کا مختلفین سے یہ فرمانا: "هٰكَذَا أُنْزِلَتْ" ہے۔ اور (دوسری دلیل) مختلفین میں سے ہر ایک کا اپنے ساتھی سے یہ کہنا: "اقرأنيها رسول الله ﷺ" ہے۔ اور (تیسری دلیل) جب رسول اللہ ﷺ سے کافروں کی طرف سے قرآنِ مجید میں تبدیلی کا مطالبہ کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا:

﴿قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝﴾ (یونس:۱۵)

"(اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کروں۔ میں تو کسی اور چیز کی نہیں، صرف اُس کی وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔ اگر کبھی میں اپنے رب کی نافرمانی کر بیٹھوں تو مجھے ایک زبردست دِن کے عذاب کا خوف ہے۔"

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کے بعد کسی اور کلام کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور اسی طرح اُمّت کا اجماع ہے کہ قرآنِ کریم کے نظم میں کسی بشر کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، نہ ہی تو اسلوب کے پہلو سے اور نہ ہی اس کے اَلفاظ اور ان کی ادائیگی کے قوانین کے پہلو سے۔ پس جو شخص اس اجماع سے باہر نکلے گا اور اہلِ ایمان کے راستے سے ہٹ کر چلے گا تو اللہ تعالیٰ اُسے ان ہی کے حوالے کر دے گا جن کی طرف وہ جانا چاہتا ہے اور پھر اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا جو کہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔

ہم نے اس آیت (قل مایکون لی .....) میں دیکھا کہ قرآن میں تبدیلی وتبادل کے حوالے سے کتنے سخت الفاظ میں وعید اور عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کیا ہوا اور وہ کیسے کسی شخص کو اپنی مرضی سے اس کی اجازت دے سکتے ہیں کہ وہ ایک لفظ کی بجائے دوسرا لفظ پڑھ لے۔ اگر آپ چاہیں تو مزید وضاحت کے لیے ماقبل بیان کردہ دس اُمور میں سے چوتھا اور ساتواں اَمر دوبارہ پڑھ لیجیے۔

اور رہی بات اس روایت کی جس میں حضرتِ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ﴿اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۝﴾ (الدخان: ۴۳-۴۴) میں "الاثیم" کی بجائے "الفاجر" پڑھنے کی اِجازت دی تھی۔ تو وہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرتِ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے دو روایتیں سُنی ہوں گی۔ اور جب انھوں نے دیکھا کہ اس شخص کے لیے ایک قراءت کے ساتھ پڑھنا مشکل ہو رہا ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے اُسے دوسری روایت کے مطابق "الفاجر" پڑھادیا۔ کیوں کہ دونوں ہی منزل من اللہ تھیں۔

اور اسی طرح حضرتِ ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے کہ وہ بھی اس پر دلالت نہیں کرتی کہ جس مرضی لفظ کو چاہو مترادف لفظ یا غیر متضاد معنیٰ والے لفظ کے ساتھ تبدیل کرلو، جیسا کہ معترض کو وہم ہوا ہے۔ بلکہ یہ حدیث اور اس جیسی تمام احادیث "باب الامثال" میں سے ہیں، جن میں رسول اللہ ﷺ نے ان حروف کی مثالیں دی ہیں جن پر قرآنِ کریم نازل ہوا ہے۔ تاکہ یہ بات واضح

ہوجائے کہ یہ حروف اپنے اختلاف کے باوجود ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں۔ان میں کوئی تناقض یا تضاد نہیں ہے اور نہ ہی کسی ایک میں ایسا معنی ہے جو دوسرے کے معنیٰ کی نفی کرے۔جیسا کہ رحمت، جو کہ عذاب کے خلاف اور اس کی ضد ہے۔اس وجہ سے یہ تمام احادیث اس بات کو مزید پختہ کردیتی ہیں کہ تمام حروف منزّل من اللہ ہی ہیں۔

﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ (النساء:۸۲)

اس موقع پر ایک اور دلیل ہے جسے صاحب التبیان نے اسی طرح کے مقام پر ذکر کیا ہے۔فرماتے ہیں:

"نبی کریم ﷺ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کو ایک دُعا سکھائی جس میں ایک جملہ تھا: "وَنَبِيِّكَ الَّذِيْ اَرْسَلْتَ" جب حضرتِ براء رضی اللہ عنہ نے یہ دُعا حضورِ اکرم ﷺ کو سُنائی تو اس میں یوں پڑھا "وَرَسُوْلِكَ الَّذِيْ اَرْسَلْتَ" تو نبی کریم ﷺ نے ان سے موافقت نہ فرمائی اور فرمایا: "لَا۔ وَنَبِيِّكَ الَّذِيْ اَرْسَلْتَ" یعنی "وَرَسُوْلِكَ" نہ پڑھو بلکہ "وَنَبِيِّكَ" ہی پڑھو۔پس آپ ﷺ نے لفظِ نبی کی جگہ لفظِ رسول پڑھنے سے منع فرمایا حالاں کہ دونوں لفظ درست (اور حق) ہیں۔کیوں کہ رسول اللہ ﷺ ایک ہی وقت میں رسول بھی ہیں اور نبی بھی۔"

پھر اس کے بعد صاحب التبیان فرماتے ہیں: "پس (اتنے واضح دلائل وشواہد کے باوجود) جاہل اور غافل لوگوں نے یہ کیسے کہہ دیا کہ:

((اِنَّهٗ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ كَانَ يُجِيْزُ اَنْ يُّوْضَعَ فِي الْقُرْاٰنِ الْكَرِيْمِ مَكَانَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ، غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، اَوْ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ. وَهُوَ يَمْنَعُ مِنْ ذٰلِكَ فِيْ دُعَاءٍ لَيْسَ قُرْاٰنًا، وَاللّٰهُ يَقُوْلُ مُخْبِرًا عَنْ نَّبِيِّهٖ ﷺ: ﴿مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ﴾ (یونس:۱۵) وَلَا تَبْدِيْلَ اَكْثَرُ مِنْ وَضْعِ كَلِمَةٍ مَكَانَ اُخْرٰى))۔

"حضورِ اکرم ﷺ نے قرآنِ کریم میں "عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ" کی جگہ "غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" یا "سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ" پڑھنے کی اجازت دے رکھی تھی۔حالاں کہ وہ (ﷺ) تو دُعا، جو کہ قرآن نہیں ہے، میں بھی لفظ تبدیل کرنے سے منع فرما رہے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے نبی ﷺ کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا: مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کروں۔(یونس:۱۵) اور ایک کلمے کی جگہ دوسرے کلمے کو رکھنے سے بڑی تبدیلی کوئی نہیں۔"

تیسرا شبہ یہ بات تو طے ہے کہ قرآنِ کریم ایک لغت یعنی لغتِ قریش پر نازل ہوا۔اور اگر حروفِ سبعہ پر نزولِ قرآن کو تسلیم کیا جائے تو اس طے شدہ بات کی نفی ہوتی ہے۔نیز حروفِ سبعہ پر نزولِ قرآن کو تسلیم کرنا اُس وحدت و یکجہتی کو بھی زائل کرتا ہے جو ایک زبان پر قرآنِ کریم نازل فرمانے کے سبب لازم آتی تھی۔

تیسرے شبہے کا جواب حروفِ سبعہ پر نزولِ قرآن کو تسلیم کرنے سے، نہ ہی تو کوئی منافات لازم آتی ہے اور نہ ہی وحدت و یکجہتی زائل ہوتی ہے۔کیوں کہ وہ وجوہ (حروف) سبعہ جن کے موافق قرآن کریم نازل ہوا ہے یہ سب لغتِ قریش ہی کے اندر واقع ہیں۔جس کا پس منظر یہ ہے کہ قبل از نزولِ وحی و قرآن، قریش عرب کی تمام لغات کی چھان پھٹک کرتے تھے اور بازار ہائے عرب، مواسمِ عرب، تاریخی واقعاتِ عرب نیز حج وعمرہ کے مواقع پر جائزہ لیا کرتے تھے اور ہر قبیلے کی لغات میں سے جو الفاظ انھیں چاشنی دار لگتے انہیں اخذ کرلیا کرتے اور پھر مزید تہذیب و تنقیح کے بعد ان کا اپنی زبان

میں استعمال شروع کر دیا کرتے تھے۔ اس طرح لغتِ قریش، قبائلِ عرب کی جملہ لغات میں سے پسندیدہ ومنتخب الفاظ کا مرکز واجتماعی نقطہ قرار پا گئی۔

پھر حکیم وعلیم (اللہ تعالیٰ) کی حکمت نے چاہا کہ اہلِ عرب پر قرآنِ کریم کے آفتاب کو قریش کے اُفق سے طلوع کرے اور جس آسمان پر شمسِ قرآن کا منظرِ خوشگوار دکھائی دے، وہ آسمانِ قریش ہی ہو۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے لیے قریش ہی کی لغت کو اختیار کیا، کیوں کہ اسی لغت نے ان کو تمام عرب کی سرداری بخشی تھی۔ اور اہلِ عرب نے قریش کی جانب اپنے چہروں کو متوجہ کیا ہوا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ اُن سے اِسی لسانِ عام سے مخاطب ہوا۔ تاکہ عرب کے متفرق قبائل کو یکجا کیا جاسکے اور بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک دھاگے میں پرو دیا جاسکے۔ پس اس طرح وہ حکمتِ رشیدہ پوری ہوئی، جس نے ان کو لغت کے راستے سے اعجازِ بیانی کے درجے پر فائز کیا اور وہ لغت خود بھی افصح اللغات کے درجے پر پہنچی۔ اور ایسی زبان عطا کی جس کے سامنے عرب کی تمام زبانیں مطیع ہو گئیں اور اس میں شامل ہو کر اس کا حصّہ بن گئیں۔

اگر اللہ تعالیٰ لغتِ قریش کے علاوہ کسی اور لغت میں قرآنِ کریم نازل فرماتے تو یہ عرب میں عصبیت اور انتشار کو جنم دیتا۔ اور ہر قبیلہ اپنی لغت کو قبائلِ دیگراں کی لغات پر ترجیح دیتا اور اسی کو بہتر گردانتا، جس کے نتیجے میں کبھی بھی عرب ایک لغت پر مجتمع نہ ہو پاتے۔ بلکہ لغتِ قریش کے علاوہ پر نازل ہونے سے منکرین کا شبہ اور افتراء مزید زور پکڑ جاتا کہ یہ قرآن سحر وکہانت وغیرہ ہے۔ نیز اس بات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے بھی لغتِ قریش میں قرآنِ کریم کو نازِل فرمایا کہ اگر قرآنِ کریم اُن کے اپنے دروازے کی بجائے کسی اور کے دروازے سے داخل ہوتا تو وہ اس قرآن کے ذریعے فیصلے کرنے کی استطاعت نہ رکھتے اور نہ ہی اُن دقیق امتیازات کا اِدراک حاصل کر پاتے جو قرآنِ کریم اور احادیثِ نبویہ کے مابین پائے جاتے ہیں۔ جن کو وہ اعجاز کے طور پر محسوس کرتے تھے جیسا کہ انھوں نے اس آیت کے نزول کے وقت محسوس کیا:

﴿اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝﴾ (یوسف:۱۰۰)

چوتھا شبہ جن حروفِ سبعہ پر قرآنِ کریم نازِل ہوا، اُن سے مراد وہ سات قراءات ہیں جو قرّائے کرام کے نزدیک مشہور ومعروف سات اِماموں سے منقول ہیں۔

چوتھے شبہے کا جواب یہ وہ شبہ ہے جو اکثر عوام الناس کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ شبہ اُن لوگوں کو پیدا ہوتا ہے جنھوں نے قرآن اور حدیث کے علوم سے کچھ تھوڑا سا حصّہ بھی حاصل نہیں کیا ہوتا۔ پس حروفِ سبعہ کا وہ معنیٰ جو یہ معترضین سمجھے، دو وجوہات کی بنا پر درست نہیں۔

پہلی وجہ وہ حروفِ سبعہ جن پر قرآنِ کریم نازِل ہوا، اُن سات قراءتوں سے جو کہ سات اماموں (قراء) کی طرف منسوب ہیں، عمومِ مطلق کے طور پر اعم ہیں۔ اور یہ مشہور قراءاتِ سبعہ خصوصِ مطلق کے طور پر حروفِ سبعہ (جن پر قرآن نازِل ہوا) سے اُخص ہیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے جن وجوہِ سبعہ پر اپنی کتاب کو نازِل فرمایا، وہ وجوہ شامل ہیں ہر اُس وجہ کو جس کو نبی کریم ﷺ نے پڑھا اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو پڑھایا، اور ان قراءاتِ سبعہ کو بھی شامل ہیں جو منسوب ہیں قراءت کے سات اِماموں کی طرف۔ اور اسی طرح یہ وجوہ سات سے اوپر (یعنی) دس تک اور دَس کے مابعد قراءات کو بھی شامل ہیں۔ نیز یہ وجوہ تو قرآنِ کریم

کے اُس حصّے کو بھی شامل ہیں جو منسوخ ہو گیا اور ان تمام قراء میں سے کسی ایک تک بھی نہیں پہنچا۔ اسی وجہ سے مذہب مختار میں یہ بات پہلے ہی واضح کر دی گئی تھی حروفِ سبعہ سب قراءتوں کو یعنی صحیح کو بھی اور منکر کو بھی اور شاذ کو بھی، شامل ہیں۔ جیسا کہ ماقبل بھی بیان ہوا ہے۔

دوسری وجہ جس وقت حضورِ اکرم ﷺ نے حروفِ سبعہ پر نزولِ قرآن والی حدیث اِرشاد فرمائی تھی، اُس وقت نہ ہی تو ان سات اِماموں کی تخلیق ہوئی تھی اور نہ ہی ان کا کوئی وجود تھا۔ اور یہ بات (عقلاً بھی) محال ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم پر یہ فرض کر دیں کہ قرآن کو ان حروفِ سبعہ کے ساتھ، اُس وقت تک نہ پڑھا جائے جب تک کہ وہ سات اِمام پیدا نہ ہو جائیں اور یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اُن میں سے کس نے کون سی قراءت کو اختیار کیا ہے۔ باوجودیکہ حضورِ اکرم ﷺ کے دورِ مبارک اور ان سات اماموں کے دور میں متعدد صدیوں کا فاصلہ ہے۔ نیز وہ سات امام ہوں یا ان کے علاوہ کوئی اور ہو، الغرض جو بھی ہو وہ قراءت کو نبی کریم ﷺ سے، یا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے واسطے سے اَخذ کرے گا یا پھر صحابہ رضی اللہ عنہم سے اَخذ کرنے والوں سے اَخذ کرے گا۔ (پس اس طرح تو "دَور" لازم آتا ہے کہ صحابہ کرام اُن سات اِماموں کی قراءت کے مطابق تلاوتِ قرآن کریں اور وہ سات امام صحابہ یا تابعین سے سیکھ کر قراءت کی سات اَقسام بیان کریں۔) پس یہ شبہ بھی باطل ہوا، کیوں کہ یہ دورِ باطل کو مستلزم ہے۔

اور یہ شُبہ یا قول اس اَمر کو بھی مستلزم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا قول: "اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ" اُس وقت تک غیرِ نافذ العمل اور عاری عن الفائدہ ہو، جب تک اُن سات معروف قراء کی ولادت نہ ہو جائے اور ان سے قراءت کا عِلم اَخذ نہ کر لیا جائے۔ اور یہ شُبہ اس واسطے بھی باطل ہے کہ اس کو تسلیم کرنے سے اُس قراءت کی تکذیب لازِم آتی ہے جو نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سے مروی ہے، کیوں کہ (انھوں نے یہ قراءت) ان سات مشہور قراء کی ولادت سے پہلے بیان کر دی تھیں۔

محقق ابن جزری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اگر (یہ) حدیث سات مشہور (قراء) کی قراءتوں یا ان کے علاوہ کسی اور سات قراء (پر محمول ہو اور ان) کی طرف پھرے کہ جو تابعین رحمہم اللہ کے بعد پیدا ہوئے، تو یہ بات اس طرف پہنچاتی ہے کہ یہ حدیث ان سات قراء کے پیدا ہونے تک فائدے سے خالی ہو کہ (پھر ان کی پیدائش کے بعد) ان سے قراءات کو لیا جائے۔ اور اس (نامعقول) بات کی طرف بھی پہنچاتی ہے کہ کسی صحابی کو جائز نہ ہو کہ وہ (قرآن) پڑھے مگر اسی قراءت کے ساتھ کہ (جس کے بارے میں یہ) معلوم ہے کہ یہ سات قراء جب پیدا ہوں گے اور تعلیم حاصل کریں گے تو اس قراءت کو اختیار کریں گے۔ کیا یہ بات باطل نہیں؟ کیوں کہ قراءت کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو کسی ثقہ اِمام سے لفظ بہ لفظ، اِمام در اِمام حاصل کیا جائے، یہاں تک کہ (سند کا سلسلہ) نبی کریم ﷺ تک پہنچ جائے۔"

تمت بالخیر

بحث ⑦

قرآنِ کریم کی مکی اور مدنی آیات یا سورتوں کے بیان میں

اس باب میں ہماری غرض تفصیل و دلائل کے ساتھ یہ بیان کرنا نہیں ہوگی کہ کون سی آیات و سورتیں مکی ہیں اور کون سی مدنی۔ کیوں کہ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور اس موضوع پر علیحدہ مستقل تالیفات موجود ہیں۔ بلکہ ایک بہت بڑی جماعت نے اس موضوع پر تالیفات کی ہیں جیسا کہ امامِ مکی اور علامہ العز الدرینی رحمہما اللہ تعالیٰ وغیرہ کی تالیفات۔

ہم تو اس باب میں (یہ نو چیزیں بیان کرنا) کافی سمجھتے ہیں: (۱) مکی اور مدنی کے اصطلاحی معانی و مفاہیم، (۲) مکی اور مدنی سورتوں کی شناخت کے فوائد، (۳) مکی و مدنی سورتوں یا آیات تک رسائی کا طریقہ، (۴) اُن ضوابط کا بیان جن کی مدد سے مکی یا مدنی کو پہچانا جا سکے، (۵) مکی یا مدنی یا ان میں مختلف فیہ سورتوں کے نام و تعداد، (۶) مکی و مدنی سورتوں کی انواع، (۷) ایسی وجوہ جو مکی اور مدنی دونوں قسم کی سورتوں یا آیتوں سے متعلق ہیں، (۸) مکی اور مدنی سورتوں یا آیتوں کے درمیان فروق، (۹) بعض طعنہ زنوں کی طرف سے وارد ہونے والے اعتراضات اور ان کے جوابات۔

① مکی اور مدنی کے اصطلاحی معانی

مکی اور مدنی سورتوں کے بارے میں علمائے کرام کے ہاں تین اصطلاحات ہیں۔

① **پہلی اصطلاح** ۞ مکی آیات وہ ہیں جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں اگرچہ ہجرت کے بعد ہی ہوئی ہوں۔ اور مدنی وہ ہیں جو مدینہ میں نازل ہوئیں۔ مکہ میں شہرِ مکہ کے وہ نواحی علاقے بھی داخل ہیں جن میں نبی کریم ﷺ نے تھوڑی دیر کے لیے قیام فرمایا تھا مثلاً منیٰ، عرفات اور حدیبیہ۔ اور اسی طرح مدینہ میں اس کے نواحی علاقے مثلاً میدانِ بدر اور اُحد وغیرہ بھی داخل ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس تقسیم میں مکانِ نزول کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ لیکن اصطلاح کی اس قسم پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ ضابط اور حاصر نہیں ہے کیوں کہ یہ اُن آیات کو شامل نہیں جو مکہ، مدینہ اور ان کے نواحی علاقوں کے علاوہ میں نازل ہوئیں۔ جیسا کہ سورۃ التوبہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوكَ﴾ (التوبۃ: ۴۲)

کیوں کہ یہ آیت تبوک میں نازل ہوئی تھی۔ اور سورۃ الزخرف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَسْئَلْ مَنْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رُّسُلِنَا ....﴾ الآیۃ (الزخرف: ۴۵)

کیوں کہ یہ آیت معراج کی رات بیت المقدس میں نازل ہوئی تھی۔ اس طرح ثابت ہوا کہ اس تقسیم میں عدمِ ضبط پایا گیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی تقسیم میں عدمِ ضبط ایک ایسا عیب ہے جو تقسیم کے مقصودِ اوّل میں خلل انداز ہوتا ہے۔ اور کسی بھی تقسیم کا مقصودِ اوّل ہوتا ہے ضبط اور حصر۔

② **دوسری اصطلاح** ○ مکی آیات وہ ہیں جن میں اہلِ مکہ سے خطاب کیا گیا ہو اور مدنی وہ ہیں جن میں اہلِ مدینہ سے خطاب کیا گیا ہو۔ "یا" وہ آیات جن کی ابتدا میں "یایھا الناس" کے اَلفاظ ہیں وہ مکی ہیں اور جن کی ابتدا میں "یایھا الذین امنوا" ہے وہ مدنی ہیں۔ کیوں کہ اہلِ مکہ پر کُفر غالب تھا اس لیے انھیں "یایھا الناس" سے مخاطب کیا، اگرچہ کفار کے علاوہ لوگ بھی ان داخل تھے۔ اور اہلِ مدینہ پر ایمان کا غلبہ تھا اس لیے انھیں "یایھا الذین امنوا" سے مخاطب کیا، اگرچہ اہلِ ایمان کے علاوہ لوگ بھی ان میں داخل تھے۔ اور بعض علماء نے "یایھا الناس" کے ساتھ "یا بنی آدم" کے اَلفاظ بھی ذِکر کیے ہیں۔ جیسا کہ علامہ ابوعبید کتاب فضائل القرآن میں میمون بن مہران سے نقل کرتے ہیں کہ جن آیات میں "یایھا الناس" یا "یا بنی آدم" کے اَلفاظ ہیں وہ مکی ہیں اور جن میں "یایھا الذین امنوا" کے الفاظ ہیں وہ مدنی ہیں۔

اس تقسیم میں مخاطبین کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ لیکن اس پر دو اعتراض وارِد ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ یہ تقسیم ضابط اور حاصر نہیں ہے۔ کیوں کہ قرآنِ کریم میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں نہ ہی تو "یایھا الذین امنوا" ہے اور نہ ہی "یایھا الناس" یا "یا بنی آدم" جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ ؕ.... الخ﴾ (الاحزاب:۱)

اسی طرح سورۃ المنافقون میں ہے:

﴿ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ ... الخ﴾ (المنافقون:۱)

اور دوسرا اعتراض یہ کہ یہ تقسیم مذکورہ دونوں صیغوں کے تمام موارد میں غیر مطرد ہے۔ کیوں کہ بعض مدنی آیات ایسی بھی ہیں جن میں "یایھا الناس" کا صیغہ ہے۔ اور بعض مکی آیات بھی ایسی ہیں جن میں "یایھا الذین امنوا" کے اَلفاظ ہیں۔ اس کی پہلی مثال سورۃ النساء میں ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ ... الخ﴾ (النساء:۱)

یہ آیت مدنی ہے۔ اسی طرح سورۃ البقرۃ مدنی ہے لیکن اس کی آیت نمبر ۲۱ میں ہے یایھا الناس کے الفاظ ہیں۔ دیکھیے:

"یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ" (البقرۃ:۲۱)

اور دوسری مثال سورۃ الحج کی ہے کہ یہ مکی سورت ہے اور اس کی آخری سے پہلی آیت ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا ... الخ﴾ (الحج:۷۷)

اس اصطلاح کے بارے میں بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اگر اس اصطلاح یا قول کو علی الاطلاق لیا جائے یعنی یوں کہا جائے کہ ہر وہ سورت یا آیت جس میں یایھا الناس کے الفاظ ہوں وہ مکی ہوگی تو اس میں نظر ہے۔ کیوں کہ سورۃ البقرۃ مدنی ہے لیکن اس میں "یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ" ہے۔

اسی طرح اور بھی مثالیں ہیں جن میں سے کچھ جو ماقبل بیان ہوئی ہیں۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے تو یہ صحیح بات ہے۔ لیکن میں (علامہ عبدالعظیم الزرقانی رحمہ اللہ) کہتا ہوں کہ کسی بات کا اپنی ذات کے اعتبار سے صحیح ہونا تقسیم کے صحیح ہونے کو لازم

نہیں کرتا، کیوں کہ تقسیم کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ضابط اور حاصر ہو۔ اور اگر کوئی تقسیم اپنے اَفراد کو جمع کرنے والی تو ہو لیکن غالبیتِ مرادی کی قید سے مقید ہو تو ایسی صورت میں ضبط اور حصر متحقق نہ ہونے کی وجہ سے معیوب رہتی ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: "المراد لا یدفع الایراد۔"

③ **تیسری اصطلاح** ✿ یہ ایک مشہور اصطلاح ہے۔ مکی آیات وہ ہیں جو نبی کریم ﷺ کی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں، خواہ وہ مکہ میں نازل ہوئی ہوں یا مکہ کے علاوہ کسی اور جگہ یا شہر میں۔ جب کہ مدنی وہ ہیں جو ہجرتِ نبوی کے بعد نازل ہوئی ہوں خواہ مکہ میں ہوئی ہوں۔

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس اصطلاح میں زمانۂ نزول کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور یہ تقسیم بالکل صحیح وسلیم ہے۔ کیوں کہ یہ ضابط وحاصر بھی ہے اور مُطّرِد بھی۔ اور اس میں سابقہ اختلافات میں سے کوئی اختلاف یا اعتراض بھی وارد نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے علمائے کرام نے اس پر اعتماد کیا ہے اور یہ تقسیم ان کے مابین مقبول و مشہور ہے۔ اسی تقسیم کی بنا پر آیت: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدۃ: ۳) کو مدنی کہنا درست ہے حالاں کہ یہ حجۃ الوداع کے موقع پر جمعے کے دِن میدانِ عرفات (جو کہ مکہ کے نواح میں ہے) میں نازل ہوئی تھی۔ اور اسی طرح آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا﴾ (النساء: ۵۸) ہے۔ کیوں کہ یہ مدنی آیت ہے حالاں کہ یہ مکہ مکرمہ میں بالکل جوفِ کعبہ میں فتح مکہ والے سال میں نازل ہوئی تھی۔ اور اسی طرح وہ آیات جو حضورِ اکرم ﷺ کے اَسفار میں نازل ہوئیں وہ بھی اس اصطلاح سے خارج نہیں جیسا کہ سورۃ الانفال کی ابتدائی آیات میدانِ بدر میں نازِل ہوئیں لیکن وہ مکی نہیں بلکہ مدنی ہیں (حالاں کہ بدر مکہ مکرمہ کے قریب ہے، ان کو مکی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن) اس مشہور اصطلاح کے مطابق یہ مدنی آیات ہیں۔

② مکی اور مدنی آیات کی شناخت کے فوائد

مکی اور مدنی آیات کو جاننے کے فوائد میں سے ایک فائدہ ناسخ اور منسوخ کی تمیز ہے جب کہ دو یا دو سے زیادہ آیات کسی ایک موضوع میں وارد ہو جائیں۔ اور ان آیات میں سے کسی ایک آیت پر حکم منحصر ہو۔ پھر اس دوران یہ معلوم ہو جائے کہ ان مختلف آیات میں سے کون سی مکی ہے اور کون سی مدنی تو ہم مدنی کے مقتضی پر فیصلہ کر دیں گے کیوں کہ مدنی مکی سے مؤخر ہے اس لیے مدنی ناسخ ہوئی مکی کے لیے۔

مکی اور مدنی کی معرفت کا ایک فائدہ شریعت کی تاریخ اور تدرُّج کی عمومی معرفت بھی ہے۔ اس حکمت یا فائدے کی تفصیل مکی اور مدنی آیات کے فروق والی بحث میں آئے گی۔

مکی اور مدنی کی معرفت کا ایک فائدہ قرآنِ کریم اور اس کے ہم تک تغییر اور تحریف سے سالم پہنچنے کے عمل پر ایمان و یقین میں پختگی ہے۔ نیز اس سے اس بات پر بھی دلالت ہوتی ہے کہ اس وقت کے مسلمانوں نے کس قدر اہتمام کے ساتھ ہم تک قرآن کو پہنچایا کہ یہاں تک وضاحت کر دی کہ کون سی آیات ہجرت سے پہلے نازِل ہوئیں اور کون سی بعد میں، کون سی حضر میں نازل ہوئیں اور کون سی سفر میں، کون سی دِن میں نازِل ہوئیں اور کون سی رات میں، کون سی سردیوں میں نازِل ہوئیں اور کون سی گرمیوں میں، کون سی زمین پر نازِل ہوئیں اور کون سی آسمان پر۔ وغیرہ۔

③ مکی اور مدنی آیات تک رسائی کا طریقہ

مکی اور مدنی آیات تک رسائی کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سے اس باب میں کچھ مروی ہو۔ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مکی یا مدنی سے متعلق کوئی بیان ثابت نہیں ہے۔ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں کو اس کے بیان کی کوئی حاجت نہیں تھی۔ اور حاجت ہوتی بھی کیوں؟ کیوں کہ وہ لوگ وحی اور اس کے نزول، مکان، زمان اور اسباب وغیرہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسا کہ محاورہ مشہور ہے: "وَلَيْسَ بَعْدَ الْعِيَانِ بَيَانٌ۔"

حضرتِ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((وَاللهِ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ غَيْرُهٗ، مَا نَزَلَتْ سُوْرَةٌ مِّنْ كِتَابِ اللهِ اِلَّا وَاَنَا اَعْلَمُ اَيْنَ نَزَلَتْ؟ وَلَا نَزَلَتْ اٰيَةٌ مِّنْ كِتَابِ اللهِ وَاَنَا اَعْلَمُ فِيْمَا اُنْزِلَتْ؟ وَلَوْ اَعْلَمُ اَنَّ اَحَدًا اَعْلَمُ مِنِّيْ بِكِتَابِ اللهِ تَبْلُغُهُ الْاِبِلُ لَرَكِبْتُ اِلَيْهِ)). ①

قسم ہے اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں! کہ کتاب اللہ کی جو سورت بھی نازل ہوئی ہے اس کے متعلق میں جانتا ہوں کہ کہاں نازل ہوئی اور کتاب اللہ کی جو آیت بھی نازل ہوئی اس کے متعلق میں جانتا ہوں کہ کس بارے میں نازل ہوئی۔ اور اگر مجھے خبر ہو جائے کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا جاننے والا ہے اور اونٹ ہی اس کے پاس مجھے پہنچا سکتے ہیں (یعنی اس کا گھر بہت دُور ہے) تب بھی میں سفر کر کے اس کے پاس جا کر اس سے علم کو حاصل کروں گا۔

ایوب (راوی) کہتے ہیں: ایک شخص نے حضرتِ عکرمہ (تلمیذِ حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما) سے قرآنِ کریم کی ایک آیت کے متعلق پوچھا۔ آپ نے جواب دیا: ((نَزَلَتْ فِيْ سَفْحِ ذٰلِكَ الْجَبَلِ "وَاَشَارَ اِلٰى سَلْعٍ)).

"یہ آیت اس پہاڑ کے دامن میں اُتری ہے۔" (اور پہاڑ سلع کی طرف اشارہ کیا)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مکی و مدنی کے حوالے سے کوئی بیان ثابت نہ ہونے کی جو توجیہ میں نے بیان کی ہے وہ بہتر ہے اس سے جو قاضی ابوبکر نے الانتصار میں بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کوئی قول وارد نہیں ہے۔ کیوں کہ نہ ہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا تھا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے اس کو اُمت پر فرض کیا تھا۔ اگرچہ بعض اہلِ علم کے نزدیک ناسخ و منسوخ کی تاریخ کو جاننا واجب ہے تا کہ اس سے متعلق حکم کی معرفت حاصل ہو جائے، لیکن یہ معرفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کسی نص کے بغیر ہی ہوگی۔

④ وہ قواعد وضوابط جن کے ذریعے مکی مدنی کی شناخت کی جا سکتی ہے

جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ کہ مکی و مدنی آیات کی معرفت محض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سے سماعت پر مبنی ہے۔ تاہم ہم یہاں علامات اور ضوابط بیان کریں گے جن کے ذریعے مکی اور مدنی کو پہچاننا ممکن ہو جائے گا۔

---

① البخاری: ۵۰۰۲، مسلم: ۲٤٦٣

مکی سورتوں کو پہچاننے کے ضوابط

① ہر وہ سورت جس میں لفظِ "کَلَّا" ہو وہ مکی ہے۔اور یہ لفظ قرآنِ کریم میں تینتیس مرتبہ مذکور ہے۔اور وہ بھی نصفِ اخیر کی پندرہ سورتوں میں۔

علامہ درینی کہتے ہیں:

وَمَا نَزَلَتْ كَلَّا بِيَثْرِبَ فَاعْلَمَنْ وَلَمْ تَأْتِ فِي الْقُرْآنِ فِي نِصْفِهِ الْأَعْلَى

"جان لو کہ (لفظ) کلّا یثرب (مدینہ) میں نازل نہیں ہوا۔اور قرآن کے پہلے نصف حصے میں یہ لفظ ہرگز نہیں آیا۔"

علامہ عمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: قرآنِ کریم کا نصفِ اخیر مکہ میں اُترا، جہاں کہ اکثر لوگ سرکش اور مغرور تھے اس لیے اس حصے میں یہ کلمہ انھیں تاکیداً دھمکانے اور ملامت کرنے کے طور پر کئی بار آیا ہے۔بخلاف نصفِ اوّل کے کہ اُس میں یہ کلمہ پایا نہیں جاسکتا کیوں کہ اس میں کتنا حصّہ یہودیوں کے بارے میں نازِل ہوا۔اس میں ان کی ذلت وضعف کی وجہ سے ایسے پُرزور اور مؤکد اَلفاظ لانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

② ہر وہ سورت جس میں آیتِ سجدہ ہے وہ مکی ہے۔

③ ہر وہ سورت جس کی ابتداء میں حروفِ مقطعات ہوں، وہ مکی ہے سوائے سورۃ البقرۃ اور سورۃ آلِ عمران کے، کہ یہ دونوں بالاجماع مدنی ہیں۔جب کہ سورۃ الرعد میں اختلاف ہے۔

④ ہر وہ سورت جس میں انبیائے کرام علیہم السلام اور سابقہ امتوں کے واقعات ہوں وہ مکی ہے، سوائے سورۃ البقرۃ کے۔

⑤ ہر وہ سورت جس میں حضرتِ آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ ہو وہ مکی ہے سوائے سورۃ البقرۃ کے۔

⑥ ہر وہ سورت جس میں "یَاَیُّهَا النَّاسُ" ہو اور "یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" نہ ہو وہ مکی ہے۔سوائے سورۃ الحج کے کہ اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے جیسا کہ ماقبل بھی گزرا۔

⑦ ہر وہ سورت جو مفصّل سورتوں میں سے ہو وہ مکی ہے۔طبرانی میں حضرتِ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((نَزَلَ الْمُفَصَّلُ بِمَكَّةَ، فَمَكَثْنَا حِجَجًا نَقْرَؤُهُ وَلَا يَنْزِلُ غَيْرُهُ)).

"مفصل کا نزول مکہ میں ہوا سو ہم کئی سال تک اسی کی قراءت کرتے رہے اس عرصے میں اس کے سوا قرآن کا کوئی حصّہ نازِل نہیں ہوا۔"

لیکن اس پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ مفصل میں سے بعض سورتیں مدنی ہیں کیوں کہ وہ بالاتفاق ہجرت کے بعد نازِل ہوئی تھیں، جیسا کہ سورۃ النصر، بلکہ یہ سورت تو ہجرت کے بعد سب سے آخر میں نازِل ہونے والی سورتوں میں سے ایک ہے۔بلکہ بعض مفسرین نے تو یہاں تک کہا ہے کہ یہ سورت قرآنِ مجید کی نازِل ہونے والی سب سے آخری سورت ہے، (جیسا کہ ماقبل بحث گزر چکی ہے کہ سب سے پہلی اور آخری وحی کون سی تھی۔) پس بہتر یہی ہے کہ مفصل سورتوں سے متعلق حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کو بنا بر کثرت پر محمول کیا جائے نہ کہ بنا بر جمیع پر۔

لفظِ "مُفَصَّل" بروزنِ "مُعَظَّم" ہے۔صحیح قول کے مطابق مفصل سورتوں سے قرآنِ مجید کی سورۃ الحجرات سے آخر تک تمام سورتیں مراد ہیں۔ان سورتوں کو مفصل کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر دو سورتوں کے درمیان بسملہ سے فصل لایا گیا ہے۔

پس اسی فصل کی کثرت کی وجہ سے انھیں مفصّل کہا گیا۔اور دوسری وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان سورتوں میں سے بہت کم آیات یا سورتیں منسوخ ہیں۔پس یہ قول قولِ فصل ہے جس میں کوئی نسخ یا نقض نہیں۔

مدنی سورتوں کو پہچاننے کے ضوابط

① ہر وہ سورت جس میں حدود وفرائض بیان ہوئے ہوں، وہ مدنی ہے۔

② ہر وہ سورت جس میں اِذنِ جہاد یا جہادی احکام کا بیان موجود ہو، وہ مدنی ہے۔

③ ہر وہ سورت جس میں منافقین کا ذکر ہو، وہ مدنی ہے، سوائے سورۃ العنکبوت کے۔کیوں کہ تحقیق یہ ہی کہ سورۃ العنکبوت کی پہلی گیارہ آیات مدنی ہیں اور باقی پوری سورت مکی ہے۔کیوں کہ پہلی گیارہ آیات میں ذکرِ منافقین ہے۔

⑤ مکی، مدنی اور مختلف فیہا سورتیں

علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے الاتقان میں مکی اور مدنی سورتوں کے تعین میں اقوالِ کثیرہ نقل کیے ہیں لیکن ان تمام اقوال میں سب سے اوفق وبہتر قول علامہ ابوالحسن الحصار کا ہے جو انھوں نے اپنی کتاب "الناسخ والمنسوخ" میں ذِکر کیا ہے۔آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((المدنی باتفاق عشرون سورۃ،والمختلف فیہ اثنتا عشرۃ سورۃ،وماعداذلك مكی باتفاق)).

مدنی سورتیں بالاتفاق بیس (۲۰) ہیں۔اور مختلف فیہ سورتیں بارہ ہیں۔اوران کے علاوہ تمام سورتیں بالاتفاق مکی ہیں۔

پھر اس قول کے بعد علامہ ابوالحسن ان بارہ سورتوں سے متعلق بڑے رقیق اور جامع اشعار بھی پیش کرتے ہیں۔

بیس مدنی سورتوں سے یہ سورتیں مراد ہیں: سورۃ البقرۃ ،آلِ عمران، النساء، المائدۃ، الانفال، التوبۃ، النور، الاحزاب، محمد، الفتح، الحجرات، الحدید، المجادلۃ، الحشر، الممتحنہ، الجمعہ، المنفقین، الطلاق، التحریم، النصر بارہ مختلف فیہ سورتوں سے یہ سورتیں مراد ہیں: سورۃ الفاتحہ، الرعد، الرحمٰن، الصف، التغابن، التطفیف، القدر، البینۃ، الزلزال، الاخلاص، الفلق، الناس.

مکی سورتوں سے بالاتفاق وہ سورتیں ہیں جو مدنی اور مختلف فیہ کے علاوہ ہیں۔اور وہ بیاسی (۸۲) ہیں۔علامہ ابوالحسن اپنے منظوم کلام میں مکی سورتوں سے متعلق فرماتے ہیں:

وماسوی ذاك مكی تنزله	فلاتكن من خلاف الناس فی حصر
فلیس كل خلاف جاء معتبرا	الا خلاف له حظ من النظر

ان (مدنی اور مختلف فیہ) کے علاوہ تمام قرآن کا نزول مکہ میں ہوا۔پس تو لوگوں کے اختلاف کی وجہ سے کسی شک میں مبتلا نہ ہو۔کیوں کہ ہر اختلاف معتبر نہیں ہوتا سوائے اس اختلاف کے جو قابلِ توجہ ہو۔

اہلِ علم کے نزدیک یہ اشعار ضرب المثل کی طرح مشہور ہیں۔

⑥ مکی اور مدنی سورتوں کی اقسام

بعض سورتیں ایسی ہیں جو مکمل طور پر مکی ہیں اور بعض مکمل طور پر مدنی۔اور بعض سورتیں ہیں، جن میں سے چند آیات کے علاوہ باقی تمام آیات مکی اور بعض میں چند مکی آیات کے علاوہ باقی تمام سورت مدنی ہے۔پس اس طرح کُل چار اقسام بن گئیں۔

پہلی قسم کی مثال، سورۃ المدثر ہے کہ اس کی تمام آیات مکی ہیں۔اور دوسری قسم کی مثال سورۃ آلِ عمران ہے کہ اس کی تمام آیات مدنی ہیں۔اور تیسری قسم کی مثال سورۃ الاعراف ہے کہ یہ اس ایک آیت: ﴿وَ سْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْیَةِ الَّتِیْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ﴾(الاعراف:۱۶۳) کے علاوہ تمام کی تمام مکی ہے۔قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: مذکورہ آیت سے ﴿وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ ﴾ (الاعراف:۱۷۲) تک آیات مدنی ہیں۔اور چوتھی قسم کی مثال سورۃ الحج ہے کہ چار آیات کے علاوہ تمام کی تمام مکی ہیں۔وہ چار آیات ﴿وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى ﴾ سے لے کر ﴿عَذَابُ یَوْمٍ عَقِیْمٍ ۝﴾(الحج:۵۲-۵۵) ہیں۔

یاد رکھیے کہ کسی بھی سورت کا اصل وصف مکی یا مدنی ہونا ہی ہے۔اور رہی بات مختلف فیہ سورتوں کی تو وہ ان ہی دو صفوں کی تابع ہیں یعنی ان سورتوں میں اکثر تعداد والی آیات کا حکم پوری سورت پر لگا یا جائے گا یا جو آیات ابتدا میں ہوں گی، انھی کی نسبت سے پوری سورت کو مکی یا مدنی قرار دیا جائے گا۔مثلاً اگر کسی سورت کی ابتدائی آیات مکہ میں نازل ہوئیں تو اس کو مکی سورت لکھ دیا گیا، پھر بعد میں اللہ نے جہاں چاہا اس سورت کی بقیہ آیات کو نازل فرما دیا۔لہٰذا مکی اور مدنی کی اصطلاحِ مشہور میں اگر یہ کہا جائے تو شاید زیادہ مناسب ہوگا کہ جس سورت کا ابتدائی حصہ ہجرت سے قبل نازل ہوا اس کو مکی لکھ دیا گیا اور جس کا ابتدائی حصہ ہجرت کے بعد نازل ہوا اُسے مدنی لکھ دیا گیا اور اگر اس سورت میں مستثنیٰ آیات بھی تھیں تو اس کے عنوان میں ان کا بھی ذکر کر دیا گیا۔جیسا کہ آپ اکثر مصاحف میں لکھا ہوا دیکھتے ہیں۔

تحقیق علمائے کرام نے علمِ نزولِ قرآن کے باب میں انتھک محنتیں کی ہیں۔یہاں تک کہ امام ابوالقاسم النیسابوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "التنبیہ" میں لکھا ہے:

"علومِ قرآن میں سب سے اشرف علمِ نزولِ قرآن، اُس کی جہات اور مکہ مدینہ میں نازل ہونے والی سورتوں کی ترتیب کا علم ہے اور اس بات کا جاننا ہے کہ کون سی سورت مکہ میں نازل ہوئی، مگر اس کا حکم مدنی ہے اور کون سی مدینہ میں نازل ہوئی لیکن اس کا حکم مکی ہے۔اور یہ کہ مکہ میں اہلِ مدینہ سے متعلق کیا حکم نازل ہوا اور مدینہ میں اہلِ مکہ کے بارے میں کیا بات اُتری۔نیز ان کے بارے میں جاننا جو نزولاً مکی ہیں لیکن مدنی کے مشابہ ہیں یا نزولاً مدنی ہوتے ہوئے مکی کے مشابہ ہیں۔جحف، بیت المقدس، طائف اور حدیبیہ میں نازل ہونے والی سورتوں کا علم رکھنا اور اس بات سے واقف ہونا کہ کون سی سورت رات کے وقت میں نازل ہوئی اور کون سی دن کے وقت۔یا کون سی سورت کو حضرتِ جبرائیل علیہ السلام فرشتوں کی جماعت کے ساتھ لے کر آئے یا کون سورت کا نزول تنہا جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے ہوا۔پھر مکی سورتوں میں مدنی آیتوں کا علم رکھنا اور مدنی سورتوں میں مکی آیات سے واقف ہونا اور اس بات کو جاننا کہ مکہ سے مدینہ میں قرآن کا کتنا حصہ لایا گیا اور مدینہ سے مکہ میں کتنا حصہ لایا گیا۔اور قرآن کا کتنا حصہ مدینہ سے ملکِ حبش لے جایا گیا۔اور کون سی آیت مجمل اُتری اور کس آیت کا نزول اُس کی تفسیر کے ساتھ ہوا اور کن سورتوں میں اس بات کا اختلاف ہے کہ بعض اشخاص انھیں مکی بتاتے ہیں اور بعض اُن کو مدنی کہتے ہیں۔غرض یہ کہ یہ پچیس وجہیں ایسی ہیں کہ جو شخص ان کو بخوبی نہ جانتا ہو اور ان میں باہم امتیاز نہ کر سکے تو اُس کے لیے ہرگز جائز نہ ہوگا کہ وہ کتاب اللہ سے متعلق کچھ کلام کر سکے۔" یہ نقل کرنے کے بعد علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "میں نے ان سب وجوہ کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان میں سے بعض باتوں کی مستقل ایک نوع قرار دی ہے اور چند باتوں کو دیگر انواع کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔" اللہ پاک ان تمام پاک نفوس کو بہترین جزا عطا

فرمائے جنھوں نے جملہ علومِ قرآن کے لیے جدو جہد کی۔

⑦ ایسی وجوہ جو مکی اور مدنی دونوں کے ساتھ متعلق ہیں

علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مبحث میں اس طرف بھی توجہ دِلائی ہے کہ مکی اور مدنی کی متعدد وجوہ یا صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک صورت اُن آیات کی ہے جن کو سمجھنا ممکن نہیں ہوتا یہاں تک کہ ان سے متعلق واقعے کا علم نہ ہو۔ اور ایک صورت یہ کہ بعض مکی سورتیں ایسی ہیں جن میں بعض آیات مدنی تنزیل کے مشابہ ہیں۔ جیسا کہ سورۃ النجم میں آیت نمبر ۳۲ ہے۔ یعنی: ﴿اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ﴾ (النجم: ۳۲) علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی توجیہ میں فرماتے ہیں:

((فان الفواحش كل ذنب فی حد،والكبائر كل ذنب عاقبة النار،واللمم مابين الحدين من الذنوب ولم يكن بمكة حد ولا نحوه)).

”فواحش ایسے گناہوں کو کہتے ہیں جن میں حد (دنیاوی سزا) ہو اور کبائر ان گناہوں کا نام ہے جن کا انجام جہنم کی آگ ہو۔ اور ”لمم“ وہ خطائیں ہوتی ہیں جو دونوں مذکورہ اَقسامِ ذنوب کے بین بین ہوں۔ اور مکہ (مکی دور) میں حد یا اس کے قریب قریب کسی سزا کا وجود نہ تھا۔“

لیکن اس پر دو طرح سے نظر (اعتراض) ہے۔

① علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فواحش کی جو تفسیر کی ہے وہ غیر متفق علیہ ہے۔ کیوں کہ بعض مفسرین نے فواحش کی تفسیر مطلقاً کبائر سے کی ہے اور بعض مفسرین نے فواحش کی تفسیر ان کبائر سے کی ہے جن پر صرف آخرت میں سزا ملے اور دُنیا میں کوئی حد وغیرہ جاری نہ ہو۔ اور علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے خود بھی سورۃ الانعام میں فواحش کی تفسیر کبائر ہی سے کی ہے۔

② بعض مفسرین نے سورۃ النجم جو کہ مکی ہے، کی اس آیت کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ حالاں کہ اس کا مدنی ہونا صراحت سے ثابت ہے۔

ان متعدد صورتوں میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ مدنی سورتوں میں مکی تنزیل کے مشابہ آیت یا آیات موجود ہوتی ہیں۔ جیسے سورۃ العادیات کی آیت ﴿وَ الْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا﴾ اور سورۃ الانفال جو کہ مدنی ہے، کی آیت ﴿وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ﴾ (الانفال: ۳۲) سورۃ العادیات اور سورۃ الانفال دونوں مدنی ہیں لیکن ان میں مذکورہ بالا دونوں آیات مکی تنزیل یا آیات کے مشابہ ہیں۔

لیکن علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی اس توضیح میں بھی نظر ہے کیوں کہ سورۃ العادیات کا مکی سورت ہونا مشہور و معروف ہے۔ اور سورۃ الانفال کی مذکورہ آیت کے مکی ہونے پر نص موجود ہے۔ جیسا کہ خود علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ مقاتل سے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ سورۃ الانفال المدنیہ کی یہ آیت مستثنیٰ ہے، بلکہ بعض نے تو یہ صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ یہ آیت اور اس سے پہلی دو آیات اور بعد والی چار آیات، اس طرح کُل سات آیات ہوئیں، یہ ساتوں آیات مکی ہیں اور سورۃ الانفال جو کہ مدنی سورت ہے، میں سے مستثنیٰ ہیں۔ اور منجملہ ان صورتوں میں سے ایک صورت اُن آیات یا سورتوں کی ہے جو مکہ سے مدینہ لائی گئیں جیسا کہ سورۃ یوسف، سورۃ الاخلاص اور سورۃ الاعلیٰ۔ اور جو مدینہ سے مکہ لائی گئیں جیسا کہ سورۃ البقرۃ المدنیہ میں آیۃ الربا اور سورۃ التوبہ المدنیہ کی ابتدائی آیات۔ اور جو

ملک حبشہ لائی گئیں جیسا کہ سورۃ مریم۔ تحقیق صحت سے ثابت ہے کہ حضرتِ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے شاہِ حبش نجاشی کے سامنے سورۃ مریم کی آیات کی تلاوت فرمائی تھی۔ اور جو ملکِ روم لائی گئیں جیسا کہ سورۃ آل عمران میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ﴾ (آل عمران:۶۴)

اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مکی اور مدنی کی اصطلاحِ مشہور قرآنِ کریم کے اُن تمام حصوں کو شامل ہے جو نازل ہوئے خواہ مکہ اور مدینہ میں یا ان کے علاوہ کسی اور مقام مثلاً جحفہ، طائف، بیت المقدس، حدیبیہ، منیٰ، عرفات، عسفان، تبوک، بدر، اُحد، حرا اور حمراء الاسد وغیرہ میں۔ اب اگر ہم یہاں اُن تمام مقامات اور وہاں نازل ہونے والی آیات کو بیان کریں تو حدِ طوالت سے بھی پار کر جائیں گے۔ اس لیے ہم صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں جو ہم بیان کر چکے کیوں کہ ضرب المثل مشہور ہے: "اَللَّبِيْبُ تَكْفِيْهِ الْإِشَارَةُ" یعنی عقل مند کے لیے اِشارہ ہی کافی ہے۔

⑧ مکی اور مدنی میں فروق

آپ مکی اور مدنی سور وآیات میں چند ایسے فرق بھی پائیں گے جو ان کے علاوہ ہوں گے جو ہم نے مکی مدنی کے ضوابط وغیرہ میں بیان کیے اور یہ فروق سابقہ فروق سے دقیق ہوں گے، کیوں کہ ان سب کا تعلق اُمورِ معنویہ وبلاغت کے ساتھ ہے۔ پھر ان فروق میں بعض ایسے ہیں جو اُن شبہات کا جواب ہیں جو اعدائے اِسلام کی جانب سے قرآنِ کریم پر کیے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم ایک مستقل عنوان کے ساتھ ان فروق کو بیان کر رہے ہیں، تاکہ وارد ہونے والے اعتراضات کو وجود میں آنے سے قبل ہی توڑ دیا جائے جیسا کہ کہا جاتا ہے: قَبْلَ الرَّمْيِ يُرَاشُ السَّهْمُ۔

ہم اس موقع پر قسم مکی کے اُن خواص کو بیان کریں گے جو بکثرت ان میں پائے جاتے ہیں۔

① مکی سور وآیات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں شرک اور بت پرستی کی مذمت بکثرت پائی جاتی ہے۔ نیز ان میں اہلِ مکہ کی طرف سے شرک وبت پرستی پر اصرار کرتے ہوئے وارد ہونے والے شبہات کے ایسے بلیغ جوابات موجود ہیں جو اُن پر ہر دروازے سے اُن کی پھوکی دلیلوں کو توڑتے ہوئے داخل ہوئے اور ان کو حسّی دلائل کے ساتھ محاکمہ کرنے کی دعوت دی اور اُن کے سامنے بلاغت کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔ حتی کہ ان کو یہ باور کروایا کہ تمھارے معبودانِ باطلہ اتنے کم زور وعاجز ہیں کہ وہ سارے مل کر بھی ایک انتہائی ادنیٰ جانور مثلاً مکھی بھی نہیں بنا سکتے، بلکہ اتنی بھی طاقت نہیں رکھتے کہ مکھی کی شرارت سے بچ سکیں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۚ إِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۚ وَ إِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۚ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ﴾ (الحج:۷۳)

"اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے غور سے سنو! کہ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے۔ اگرچہ اس کے لیے سب اکٹھے ہو جائیں اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے جائے تو اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ طالب اور مطلوب (یعنی عابد ومعبود) دونوں گئے گزرے ہیں۔"

اور جب اہلِ مکہ کا عناد حد سے بڑھا اور انھوں نے اپنے آباؤ اجداد سے دلیل پکڑنا شروع کی تو قرآنِ کریم نے واضح کیا کہ

انھوں نے کرامتِ انسان کواتنی پستیوں میں گرا دیا کہ اُسے پتھروں اور بتوں کے سامنے ذِلت کے ساتھ جھکا دِیا۔ اور پھران کے اور اُن کے آباء واجداد جنھوں نے آفاقِ عالَم اور خود اپنی ذات میں اللہ کی نشانیوں کو نہیں پہچانا تھا، کے اَحلام کو احمقانہ حرکت قرار دِیا اور پھر قرآنِ کریم اہلِ مکہ کی اپنے آباؤ اَجداد کی اس اندھی تقلید کی قباحت بیان کرتے ہوئے یوں گویا ہوا:

﴿وَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ﴾ (البقرۃ:۱۷۰)

"بھلا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ سیدھے راستے پر ہوں تب بھی وہ انہی کی تقلید کیے جائیں گے۔"

اوراسی طرح قرآنِ کریم ان کے دیگر عقائدِ ضالہ جن کی وجہ سے وہ بُت پرستی اختیار کرنے پر اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، انبیائے کرام علیہم السلام کی نبوت، آخرت میں اٹھائے جانے، حساب وکتاب اور جزا وسزا کے منکر ہونے پر آمادہ ہوئے، کے بطلان پر مناقشہ ومباحثہ کرتا ہے۔

② قرآنِ کریم کے مکی حصے کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اہلِ مکہ کی، اُن شواہدِ حق، جو ان کی اپنی ذات میں تھے اور رُشد و ہدایت کی وہ علامات جو کائنات میں پھیلی ہوئی تھیں، سے متعلق آنکھیں کھول دیں۔ ان کے سامنے استدلال اور اسلوبِ کلام کی نت نئی انواع بیان کیں۔ ان کو گزرے ہوئے اور موجودہ واقعات سے متعلق فیصلے سُنائے۔ ان تمام کے علاوہ ان کی راہ نمائی کی ایسی قیادت کی طرف جو راہِ راست اور حکمت سے بھرپور تھی اور وہ قیادت اللہ تعالیٰ کی الوہیت وربوبیت میں توحید، موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے اور حساب وکتاب اور جزا وسزا اور اس کی باریکیوں یا سختیوں کے اعتراف کی طرف لے جانے والی تھی۔ نیز وحی اور ہر وہ چیز جو وحی سے ثابت ہے خواہ اس کا تعلق الاہیات ونبوات کے ساتھ ہو یا عقائد میں سمعیات کے ساتھ ہو الغرض قرآن کریم کا مکی حصہ دین اور ضروریاتِ دین سے متعلق ہر اَمر کو تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

③ قرآنِ کریم کے مکی حصے کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اہلِ مکہ کی بہت سی عاداتِ قبیحہ بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً قتل وغارت، ناحق خون بہانا، بچیوں کو زندہ درگور کرنا، ایک دوسرے کی عزت وناموس کی پامالی کو اپنے لیے مباح سمجھنا، یتیموں کا ناحق مال کھانا۔ اس طرح اُن کو ان تمام عاداتِ قبیحہ میں پائی جانے والی بُرائیوں اور خرابیوں سے آگاہی حاصل ہوئی اور کلامِ الٰہی نے مسلسل کوشش جاری رکھی جس کی نتیجے میں وہ ان تمام رذائل سے پاک ہوگئے اور انھیں ان سے دُور رہنے میں نجاح حاصل ہوئی۔

④ چوتھی خاصیت یہ کہ اس میں اہلِ مکہ کے لیے اصولِ اَخلاق اور اجتماعی زندگی سے متعلق حقوق اس طرح خوب صورت انداز میں واضح کیے گئے ہیں، کہ کفر، فسوق، عصیان، جہالت پر مبنی تمام کام، طبیعت میں سرکشی، دِل کی سختی اور زبان کی کڑواہٹ کو ان کے لیے ناپسند ٹھہرایا گیا ہے۔ جب کہ ایمان، اطاعت، نظم وضبط، علم، محبت، شفقت ونرم دِلی، اخلاص، ایک دوسرے کا احترام، والدین کے ساتھ نیکی، پڑوسی کا اِکرام، دِل کی طہارت اور زبان کی سچائی وصفائی جیسے اَخلاقِ حمیدہ کو پسندیدہ قرار دِیا ہے۔

⑤ اس حصے کی پانچویں خاصیت یہ ہے کہ اس میں سابقہ امم اور انبیائے کرام علیہم السلام کے ایسے واقعات بیان ہوئے ہیں، جن میں نفع بخش عبرتیں اور دِل پر اثر کرنے والی نصیحتیں موجود ہیں۔ ان واقعات سے اہلِ کفر وطغیان کو ہلاک کرنے اور اہلِ ایمان کے ساتھ نصرت واحسان والی سنتِ الٰہیہ بھی ثابت ہوتی ہے۔ اگرچہ ان امم سابقہ کو گزرے بہت طویل زمانہ گزر چکا ہے لیکن حق کی نصرت اور ایمان کی تائید سے متعلق اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ سے یہ ہی سنت رہی ہے۔

⑥ مکی حصے کی چھٹی خاصیت یہ ہے کہ اس میں اہلِ مکہ کو ایجاز کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے۔ یہاں تک تمام سورتوں میں سب سے چھوٹی سورتیں مکی ہی ہیں۔ کیوں کہ اہلِ مکہ فصیح اور اہلِ زبان تھے۔ ان کو صنعتِ کلام اور ہمتِ بیان پر عبور تھا۔ پس مناسب حال یہ ہی تھا کہ ان سے ایجاز اور اقلال کے ساتھ کلام کیا جائے نہ کہ اسہاب و اطناب کے ساتھ۔

جیسا کہ بلند حکمت کا قانون بھی یہ ہے کہ اَفراد کی تربیت میں تدرُّج اور ارتقاء کا طریقہ اپنایا جائے کہ اہم کو مہم پر مقدم رکھا جائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عقائد، اخلاق اور عادات اہم ہیں عبادات کی اَقسام اور معاملات کے دقیق پہلوؤں سے۔ کیوں کہ پہلے آنے والی چیز بعد میں آنے والی چیز کے لیے اُصول کی طرح ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے قسم مکی میں عقائد، اَخلاق و عادات وغیرہ کی درستی کی طرف خصوصی توجہ دِلائی گئی ہے۔

قسم مکی کے خواص کے بعد اب ہم قسم مدنی کے خواص بیان کریں گے جو بکثرت ان میں پائے جاتے ہیں۔

① مدنی حصّے میں شریعت کے دقیق پہلو، احکام کی تفصیل، اجتماعی، انفرادی، جنگی، حکومتی، شخصی حقوق، عبادات اور معاملات کی تمام اَقسام کے قوانین کی انواع بیان ہوئی ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو سورۃ البقرۃ، سورۃ النساء، سورۃ المائدہ، سورۃ الانفال، سورۃ التوبہ، سورۃ الفتح اور سورۃ الحجرات وغیرہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

② مدنی سوَر و آیات میں اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کو اِسلام کی طرف مدعو کیا گیا ہے۔ ان کے عقائدِ باطلہ کا محاسبہ اور ردّ کیا گیا ہے۔ حق اور اہلِ حق کے خلاف ان کی سرگرمیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اللہ کی کتب میں ان کی طرف سے تحریفات سے متعلق آگاہ کیا گیا ہے۔ عقل اور تاریخ کی روشنی میں ان کے باطل پر ہونے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو سورۃ البقرۃ، سورۃ آل عمران، سورۃ المائدۃ اور سورۃ الفتح وغیرہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

③ قسم مدنی کے خواص میں سے تیسری خاصیت یہ ہے کہ اس کی سوَر و آیات میں اطناب اور تطویل سے کام لیا گیا ہے۔ کیوں کہ اہلِ مدینہ فصاحت و بلاغت اور ذکاوت و المعیت میں اہلِ مکہ کی طرح نہیں تھے۔ لہٰذا اہلِ مدینہ کی حالت کو دیکھتے ہوئے کلام میں کسی قدر اطناب اور طوالت برتی گئی، کیوں کہ علمِ بلاغت کی اصل رُوح ہی یہ ہے کہ کلام اپنے مخاطب اور ماحول کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ اور غیرِ اذکیاء سے کلام کا جو اسلوب اپنایا جائے وہ اس اسلوب کے علاوہ ہو جو اذکیاء کے ساتھ روا رکھا گیا تھا۔ (دونوں قسموں میں مختلف اندازِ بیان اپنانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کے احوال کو بخوبی جانتے ہیں) جیسا کہ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفت بیان ہوئی ہے: ﴿وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ ﴾ (فاطر: ۱۴) ترجمہ: اور جس ذات کو تمام باتوں کی مکمل خبر ہے، اُس کے برابر تمھیں کوئی اور صحیح بات نہیں بتائے گا۔

اس موضوع پر وارِد ہونے والے شبہات اور ان کے جوابات

ہم نے پہلے بھی کہا اور اب کہتے ہیں کہ اِسلام کے دشمن کثیر تعداد میں ہیں اور وہ سب گھات لگائے بیٹھے ہیں کہ کسی طرح انھیں موقع ملے اور وہ تیر برسا کر اسلام کا راستہ بند کر دیں۔ لیکن ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم اُن کے اِن اوچھے ہتھکنڈوں کا سدِ باب کریں اور اس

اہم معاملے میں اسلام کے دفاع کے لیے کمر بستہ ہو جائیں۔ اور یہ تب ہی ممکن ہوگا جب ہم تمام ہتھیاروں سے لیس ہوں۔ اور ابتداء ہی میں ان شبہات سے آگاہی فراہم کریں جن کی وجہ سے مصر اور مصر کے علاوہ دیگر شہروں (الغرض ہر جگہ) میں ذہنی آلودگی کی آگ بھڑک رہی ہے۔ یہاں تک کہ ہمارا پڑھا لکھا نوجوان طبقہ ان شبہات اور لغو اعتراضات پر مبنی بیانات اور کتابوں کو ادبی بیانات اور کتابیں تصور کرتا ہے۔ مصر پر ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جب ہر طرف ان شبہات کا میدانِ کارزار گرم تھا۔ پس ہم اسی طرح کے چند (چھ) شبہات (اور پھر ان کے جوابات) آپ کے سامنے بیان کریں گے۔ آپ ان شبہات اور ان کے جوابات کو خوب سمجھیے اور اچھی طرح انھیں یاد رکھیے۔ بے شک نیک کام کرنے کی طاقت اور بُرائی سے بچنے کی قوت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

أنا لا ألوم المستبد... د إذا تعنت أو تعدى

فسبيله أن يستبد... دوشأننا أن نستعدا

"جب کوئی ظالم ظلم اور حد سے تجاوز کرتا ہے تو میں اسے ملامت نہیں کرتا کیوں کہ اس کا تو کام ہی سرکشی کرنا ہے لیکن اس وقت ہمارا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ہم (اس کے مظالم کا جواب دینے کے لیے) تیار ہو جاتے ہیں۔"

پہلا شبہ

کہتے ہیں کہ ایک ناقد جب قرآنِ کریم کے اسلوب پر غور کرتا ہے تو دو ایسے متعارض اسلوب دکھائی دیتے ہیں۔ جن میں ایک کا دوسرے کا ساتھ کوئی ربط نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ کتاب مختلف حالات اور مختلف ماحول سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کی قسم مکی میں پست درجے کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جب کہ قسم مدنی میں ثقافت وتہذیب جیسی علامات ہویدا ہیں۔ پھر دیکھتے ہیں کہ قسم مکی تشدد، شدت، ظلم، غصہ، سباب، دھمکی اور ڈراوے جیسی صفات میں منفرد ہے۔ جیسے: ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ۝﴾ (اللھب:۱) اور ﴿وَ الْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝﴾ (العصر:۱، ۲) اور ﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝﴾ (الفجر:۱۳، ۱۴)

پہلے شبہے کا جواب

یہ شبہ چار شکوک وشبہات پر مشتمل ہے، اور اگر آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ شبہ تین ایسے جھوٹے مقدمات پر مشتمل ہے۔ جو از خود ایسے نتیجے کی طرف لے جاتے ہیں یا ان کا قائل جان بوجھ کر ایسے نتیجے کی طرف لے جانا چاہتا ہے جو خود بھی جھوٹ اور غلط ہے۔ وہ تینوں مقدمات یہ ہیں:

① قسم مکی سختی اور شدت میں منفرد ہے۔

② اس میں سباب اور دھمکیاں ہیں۔

③ اس میں پست درجے کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

ان تینوں مقدمات کا نتیجہ یا ان مقدمات کے قائل کا ہدف یہ ہے کہ قرآن کی آیات میں انفکاک وانتشار ہے۔ اس کے حلقات غیر متصل ہیں۔ یہ لوگوں کے مزاجوں اور ماحول سے متاثر ہے۔

اور ان کا مقصد یقیناً وہی مشہور بات ہے کہ قرآنِ پاک اللہ کا کلام نہیں ہے اور نہ ہی کوئی معجزہ ہے، بلکہ یہ محمد ﷺ کا کلام ہے، جو سب سے پہلے مکہ کے لوگوں سے متاثر ہو کر وجود میں آیا، پس اس وقت یہ کلام سخت تھا اور ان معارف عالیہ سے عاری تھا جو بعد میں مدینہ میں رہتے ہوئے اہلِ کتاب سے سیکھ لیے گئے تھے۔

پس یہ تمام باتیں وہ ہیں جو گم راہ کُن لوگوں کی جانب سے ہمیں تنقید کا نشانہ بنانے کے لیے کہی جاتی ہیں۔اور یہ تمام باتیں ان کی حق سے عداوت، اسلام سے دشمنی اور قرآن پر بے جا تنقید کو ظاہر کرتی ہیں۔نیز یہ تمام باتیں ہر قسم کے حسنِ تاویل سے خالی اور بد ترین مفروضوں سے پُر ہیں۔

ہم آپ کے سامنے اس شبہے کی بنیاد بھی بیان کریں اور اس کا بطلان بھی تاکہ آپ اس اور اس کے مثل جھوٹے اور گھٹیا شبہات کے بطلان کی گہرائیوں سے بھی واقف ہو جائیں۔

فائدہ ۞ اس شبہے کی چار بنیادیں ہیں یا یوں کہہ لیں کہ اس شبہے کے چار اجزا ہیں:

① قسم مکی شدت وغیظ میں منفرد ہے۔

② قسم مکی میں سباب ہے۔

③ قسم مکی میں پست درجے کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

④ قرآنِ کریم ماحول سے متاثر ہے۔

یعنی مکی آیات اور مدنی آیات، مکہ اور مدینہ کے ماحول سے متاثر ہوئی ہیں۔کیوں کہ دونوں شہروں کا ماحول و معاشرت علیحدہ علیحدہ تھی اسی لیے دونوں آیات کی دونوں قسموں کا اسلوب بھی جدا جدا ہے۔

① پس ان کا یہ کہنا کہ قسم مکی شدت وغیظ میں منفرد ہے، منقوض ہے۔کیوں کہ قسم مدنی میں بھی شدت وغیظ نظر آتا ہے۔لہٰذا ان کا قسم مکی کے بارے میں انفرادیت کا دعویٰ کرنا باطل ٹھہرا۔دیکھیے سورۃ البقرۃ جو کہ مدنی ہے۔

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ۝﴾ (البقرۃ:۲۴)

”پھر اگر ایسا نہ کرسکو اور ہرگز ایسا نہیں کرسکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے، جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔“

﴿اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ... الخ﴾ (البقرۃ:۲۷۵)

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قبروں سے اس طرح حواس باختہ اُٹھیں گے جیسے کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔“

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۷۸،۲۷۹)

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔پھر اگر ایسا نہ کرو گے تو تم اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سُن لو۔“

دیکھیے سورۃ آل عمران، یہ بھی مدنی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمْ وَ قُوْدُ النَّارِ ۝ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ قُلْ

لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾ (آل عمران: ۱۰-۱۲)

"جو لوگ کافر ہوئے اس دن نہ تو ان کا مال ہی اللہ کے عذاب سے ان کی بچا سکے گا اور نہ ان کی اولاد ہی کچھ کام آئے گی اور یہ لوگ آتشِ جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ ان کا حال بھی فرعونیوں اور ان سے پہلے لوگوں کا سا ہوگا جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی تو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب عذاب میں پکڑ لیا تھا اور اللہ سخت عذاب کرنے والا ہے۔ اے پیغمبر (ﷺ)! کافروں سے کہہ دیجیے کہ تم دنیا میں بھی عن قریب مغلوب ہو جاؤ گے اور آخرت میں جہنم کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے اور وہ بُری جگہ ہے۔"

پس ثابت ہوا کہ قرآنِ کریم کی دونوں قسموں میں شدت وسختی شامل ہے۔ کیوں کہ فرد اور جماعت کی اصلاحی تربیت اور قوموں وریاستوں کی سیاسی حکمتِ عملیوں کا تقاضا یہ ہی ہے کہ ان کی راہ نمائی کے لیے جو قانون بنائے جائیں ان میں ترغیب وترہیب، وعدہ و وعید اور سختی اور نرمی کا خوب صورت امتزاج ہونا چاہیے۔

مزید یہ کہ ان کا یہ دعویٰ کہ صرف مکی ہی متشدد ہے اس سے قسم مدنی کے حوالے سے یہ دعویٰ مفہوم ہوتا کہ وہ نرمی اور درگزر میں انفرا..ت رکھتا ہے جب کہ قسم مکی نرمی اور درگزر سے خالی ہے۔ حالاں کہ یہ مفہوم باطل ہے۔ اس مفہوم کے باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ سوَرِ مکیہ میں بہت سی ایسی آیاتِ کریمہ ہیں جن سے چشمے پھوٹ رہے ہیں نرمی اور درگزر کے، قطرے برس رہے ہیں سماحت وعفو کے، بلکہ وہ آیات تو منادی کر رہی ہیں کہ بُرائی کا بدلہ اچھائی سے لو۔ دیکھیے سورۃ فصلت جو کہ مکیہ ہے:

﴿وَ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَ مَا يُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَ مَا يُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۳۵﴾﴾ (فصلت: ۳۳-۳۵)

"اور اس شخص سے بڑھ کر بات کا اچھا کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی طرف بُلائے اور عمل نیک کرے اور کہے کہ مسلمان ہوں۔ اور بھلائی اور بُرائی برابر نہیں ہو سکتی۔ تو سخت کلامی کا ایسے طریق سے جواب دو، جو بہت اچھا ہو۔ ایسا کرنے سے تم دیکھو گے کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی اور تمھارا گرم جوش دوست ہے۔ اور یہ بات ان ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو برداشت کرنے والے ہیں۔ اور ان ہی کو حاصل ہوتی ہے جو بڑے صاحبِ نصیب ہیں۔"

اسی طرح سورۃ الشوریٰ، جو مکیہ ہے، میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَ الَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَ الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۱﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ

أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝﴾ (الشوریٰ:۳۶-۴۳)

"جو مال ومتاع تمھیں دیا گیا ہے وہ دنیا کی زندگی کا ناپائیدار فائدہ ہے اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے اور اپنے پروردگار پر بھروسا رکھتے ہیں۔ اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔ اور جو اپنے پروردگار کا فرمان قبول کرتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔ اور اپنے کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں۔ اور جو مال ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جو ایسے ہیں کہ جب ان پر ظلم وزیادتی ہو تو مناسب طریقے سے بدلہ بھی لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے۔ مگر جو درگزر کرے اور معاملے کو درست کر دے تو اس کا بدلہ اللہ کے ذمے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ اور جس پر ظلم ہوا ہو اگر وہ اس کے بعد انتقام لے لے تو ایسے لوگوں پر کچھ الزام نہیں۔ الزام تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں۔ یہ ہی لوگ ہیں جن کو تکلیف دینے والا عذاب ہوگا۔ اور جو صبر کرے اور قصور معاف کر دے تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

اور اسی طرح اور بھی مثالیں ہیں جو تمام مکی سورتوں سے لی گئی ہیں۔ جیسے

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (الحجر:۸۷-۸۸)

"اور ہم نے تم کو سات آیتیں جو نماز میں دُہرا کر پڑھی جاتی ہیں یعنی سورۃ الفاتحہ اور عظمت والا کلام عطا فرمایا ہے۔ ہم نے کفار کی کئی جماعتوں کو جن کو فوائد دنیاوی سے نوازا ہے تم ان کی طرف رغبت سے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھنا اور نہ ان کے حال پر رنج وغم کرنا اور مومنوں کے ساتھ تواضع سے پیش آنا۔"

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۚ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ (الزمر:۵۳)

"اے پیغمبر ﷺ! میری طرف سے لوگوں کو کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ اللہ سب گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ بے شک وہ ہی تو ہے بڑا بخشنے والا بڑا مہربان۔"

② اور جہاں تک ان کے اس دعوے کی بات ہے کہ قسم مکی میں سباب ہے۔ اور وہ سباب کا وہ ہی معنی مراد لیتے ہیں جو ان کے نزدیک مشہور ومعروف ہے یعنی ڈھٹائی، فحش کلامی اور ادب ولیاقت کی حدود سے خارج ہو کر بات کرنا۔ تو تحقیق وہ یہ دعویٰ کر کے اس آیت کا مصداق قرار پائے ہیں:

﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝﴾ (الکہف:۵)

"یہ بڑی سخت بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ اور کچھ شک نہیں کہ یہ جو کچھ کہتے ہیں محض جھوٹ ہے۔"

ہم ان معترضین کو چیلنج کرتے ہیں کہ پورے قرآن میں سے خواہ وہ مکی حصہ ہو یا مدنی، صرف ایک مثال ایسی پیش کریں جس

میں گھٹیا یا فحش لفظ استعمال ہوا ہو۔ کیا یہ بات قابل فہم ہے کہ قرآن، جو کہ لوگوں کو آداب کے اصول سکھانے آیا تھا، وہ خود آداب کے دائرے سے خارج اور سباب کی طرف مائل ہے؟ اور اگر (العیاذ باللہ) ایسا ہے تو پھر اس نے اپنے متبعین یعنی اہلِ ایمان کو اپنے مشرک دشمنوں کے حق میں سباب کو حرام قرار کیوں دیا؟ دیکھیے سورۃ الانعام کی یہ آیت:

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ... الخ﴾ (الانعام:۱۰۸)

"اور جن لوگوں کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں ان کو بُرا نہ کہنا یہ بھی کہیں اللہ کو بے ادبی سے بے سمجھے بُرا نہ کہہ بیٹھیں۔"

ہاں، صرف قسم مکی ہی نہیں بلکہ پورے قرآنِ مجید میں، واضح حجج و براہین کو نظر انداز کرنے والے آنکھوں سے اندھے اور کانوں سے بہرے طعنہ زن اپنی احمقانہ سوچ سے جس کو نامناسب کہہ رہے ہیں وہ تکلم و لہجے میں کسی قدر سختی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن پورا قرآنِ مجید اپنے اس انداز میں کہیں بھی نہ تو ادب کے دائرے سے باہر نکلا، نہ ہی حق و سچائی کے راستے سے منحرف ہوا اور نہ ہی سبیلِ حکمت سے ہٹا۔ بلکہ اس نے تو حکمت کا مقتضا پورا کیا ہے، وہ یہ کہ ان کے ساتھ شدت اختیار کی جائے کیوں کہ وہ اسی کے مستحق ہے، ان کے لیے اسی شدت میں مصلحت ہے، یہ ہی ان کے حق میں رحمت اور خیر ہے تاکہ وہ باطل سے باز آجائیں، متوجہ ہو جائیں حق و رُشد کی آواز کی جانب اور چل پڑیں دلیل و حجت کی راہ پر۔ ایسے ہی موقع پر شاعر کہتا ہے:

فقسا لیزدجروا ومن یّك حازمًا فلیقسُ احیانًا علی من یرحمُ

"اُس شخص نے سختی استعمال کی تاکہ نصیحت حاصل ہو اور جو شخص بھی سمجھ دار ہے اس کو چاہیے کہ کبھی کبھی سختی کیا کرے اس شخص کے ساتھ جس کے ساتھ وہ شفقت کرتا ہے۔ (یعنی ایسی سختی شفقت ہی میں شمار کی جائے گی۔ اگرچہ اس کا احساس شفقت میں شمار کرنے کا نہیں ہوتا۔ لیکن وہ سختی جو اصلاح و ترقی کے لیے کی جائے، شفقت ہی کا ایک جزو ہوتی ہے۔)

میں اس پر مزید اضافہ کر کے کہتا ہوں کہ یہ سختی والا لہجہ صرف مکی سورتوں میں ہی نہیں پایا جاتا بلکہ یہ تو آپ کو مدنی سورتوں میں بھی نظر آئے گا وہ الگ بات ہے کہ مکی سورتوں میں یہ سختی نسبتاً مدنی سورتوں کے زیادہ ہے کیوں کہ اہل مکہ دشمنی و بے مروتی میں بہت زیادہ شدید تھے، عناد اور آباء پرستی کی تمام حدیں عبور کر چکے تھے اور نقصان پہنچانے کا کوئی ایسا دروازہ نہ تھا جس کو انھوں نے رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھیوں پر کھولنے کی کوشش نہ کی ہو۔ حتی کہ ان کو رات کے وقت اپنے شہر اور اپنے خاندان کو چھوڑنے پر مجبور کیا اور پھر اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ وہ جہاں ہجرت کر گئے، وہاں بھی تکالیف پہنچانے کے درپے رہے۔

مدنی سورتوں میں لہجے کی سختی پر درج ذیل آیات شاہد ہیں۔

① سورۃ البقرۃ میں مشرکین سے متعلق وارد ہوا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ (البقرۃ:۶،۷)

② سورۃ البقرۃ میں منافقین سے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (البقرۃ:۸)

اس آیت سے اگلی تیرہ آیات تک، تمام میں توبیخ وتعنیف بھری ہوئی ہے، ان حشرات (سانپ اور بچھو وغیرہ) کے لیے جو انسانی شکل میں تھے اور اپناز ہر معاشرے میں پھیلا رہے تھے اور اسلامی ماحول میں دودھاری تلوار یعنی نفاق اور شک کے ساتھ فساد بپا کر رہے تھے۔ اور اسی طرح آپ مدنی سورتوں میں بھی یہود سے متعلق بہت سی ایسی آیات دیکھیں گے جو ان پر تنقید کرتی ہیں، ان کے جرائم کو عیاں کرتی ہیں، ان کے اور ان کے آباء کی جنایات کو بے نقاب کرنے کے لیے حملہ آور ہوتی ہیں۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قول ہے:

③ ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴾ (آل عمران:۱۱۲)

④ ﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ (البقرۃ:۹۰)

اور نصاریٰ سے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

⑤ ﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۫ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ ﴾ (آل عمران:۵۵-۵۶)

⑥ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴾ (آل عمران:۹۰)

اور رہی بات ان سورتوں وآیات کی جن پر انھوں نے سباب کا شبہ ظاہر کیا ہے۔ وہ آیات ہرگز دلالت نہیں کرتیں اُس شبے پر جو انھوں نے سمجھا اور جس کی وجہ سے وہ قرآن کریم کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً سورۃ لہب، یہ سورت ابولہب اور اس کی بیوی کے لیے غایت درجے کے انذار پر مشتمل ہے اور اس کے الفاظ اس اذیت کے جواب میں نازل کیے گئے ہیں جو وہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو پہنچاتے تھے۔ جیسا کہ اس سورت کا شان نزول بھی اسی پر دلالت کرتا ہے، جس کی تخریج امام احمد، شیخین اور امام ترمذی نے کی ہے اور وہ منقول ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے۔ فرماتے ہیں کہ جب آیت: ﴿وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ (الشعراء:۲۱۴) نازل ہوئی تو آپ ﷺ کوہِ صفا پر تشریف لے گئے اور منادی فرمائی: "اے بنوفہر! اے بنوعدی!" (یہ قریش کے مختلف خاندانوں کے نام ہیں)۔ یہاں تک کہ تمام قریش جمع ہو گئے۔ پس جو شخص بھی کوہِ صفا پر آ سکتا تھا آیا اور جو نہیں آ سکتا تھا اس نے اپنی طرف سے کوئی نائب مقرر کر دیا تاکہ وہ دیکھے کہ کیا معاملہ ہے۔ پس ابولہب اور دیگر قریش بھی آئے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر میں تمھیں یہ کہوں کہ اس وادی (یا پہاڑ) کے پیچھے سے ایک لشکر تم حملہ کرنے والا ہے۔ تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟ اُن سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچا ہی پایا ہے (یعنی ہم آپ کی تصدیق کریں گے)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پس میں تمھیں اس سخت عذاب سے ڈرانے والا ہوں جو تمھارے سامنے ہے۔ اِس موقع پر ابولہب نے کہا: تَبًّا لَّكَ، اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟ (ہلاکت ہو تیرے لیے۔ کیا تو نے اس لیے ہمیں یہاں جمع کیا تھا؟) (نعوذ باللہ)۔ پس اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ابنِ حاتم اورابنِ جریر نے تخریج کی ہے: ابنِ زید سے مروی ہے کہ ابولہب کی بیوی کانٹے دار جھاڑیاں چُن کر لاتی تھی اور رات کے وقت رسول اللہ ﷺ کے راستے میں پھیلا دیتی تھی۔ اور مجاہد سے مروی ہے کہ ابولہب کی بیوی حضورِ اکرم ﷺ سے متعلق چغل خوری (اور نامناسب باتیں) کیا کرتی تھی۔

پس یہ تمام اَسباب اسی اَمر کا تقاضا کرتے ہیں کہ ایک سورت ابولہب کے مقابلے میں نازل ہوتی، جس میں اس کی ہلاکت وبربادی کی دھمکی ہوتی اور یہ وضاحت ہوتی کہ اس کا مال اور اولاد اس کے کچھ کام نہیں آئے گی۔ وہ اور اس کی بیوی خسارے میں رہیں گے۔ اوران کا ٹھکانا جہنم ہوگا جو کہ بہت ہی بُری جگہ ہے۔

اوراس میں کوئی شک نہیں کہ اس وعیدِ شدید میں ابولہب اوراس کی طرح کے لوگوں کے لیے سخت ڈانٹ ہے اوران لوگوں کے لیے تسلی اور حوصلہ افزائی کا عنصر ہے جن کو ان کی طرف سے اذیتیں پہنچی تھیں۔ لہٰذا اس موقع پر ڈانٹ اور سختی پر مبنی کلام ہی عدالتِ الٰہیہ اور حکمتِ ربانیہ کے زیادہ لائق وانسب تھا۔

ووضع الندی فی موضع السیف بالعلا مضر کوضع السیف فی موضع الندی

(سختی کی جگہ نرمی کرنا اسی طرح نقصان دہ ہے جیسے نرمی کی جگہ میں سختی کرنا)

اور رہی بات سورۃ العصر کی۔ تو سورۃ العصر میں نہ ہی تو کوئی سباب ہے اور نہ ہی اس کے مشابہ کچھ اور۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس سورت نے انسانوں کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک قسم وہ جو خسران میں ڈوب چکی ہے اور دوسری وہ جو اس خسران سے نجات پا کر کامیاب ہو چکی ہے۔ یعنی وہ کامیاب لوگ جن میں سعادت کے عناصرِ اربعہ پائے جاتے ہیں۔ دیکھیے:

﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾

"عصر کی قسم۔ کہ انسان نقصان میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔" (العصر: ۱-۳)

پس آپ نے اس سورت میں کہیں سباب یا نامناسب بات کی پرچھائی بھی دیکھی ہے؟ لیکن معترضین قوم کو شرم نہیں آتی۔

اور رہی بات سورۃ التکاثر کی۔ تو اس سورت میں بلیغ انداز میں اشارہ ہے اس طرف کہ مخاطبین کو دنیا کی مشغولیت نے دین سے غافل کر رکھا ہے اور مال و دولت نے مال و دولت کے پیدا کرنے والے سے دور کر رکھا ہے۔ یہاں تک کہ اسی حال میں ان کی عمریں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور کل کو یعنی روزِ قیامت ان سے ان نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اوران کا اس ناشکری کی وجہ سے انجام عذابِ جحیم ہوگا۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝﴾ (الفجر: ۱۳) اصل میں حکایت ہے ان واقعات کی جو سابقہ اُمم ثمود وعاد کے ساتھ اس وقت پیش آئے، جب انھوں نے بلاد میں خوب سرکشی اور فساد بپا کر دیا تھا۔ اور قرآن مجید میں ان واقعات کو ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ یہ قصص واَخبار کفار کے لیے عبرت وازدجار ثابت ہو جائیں اور وہ اپنے اَسلاف کی طرح ان نافرمانیوں میں نہ پڑ جائیں۔ کیوں کہ اللہ کی سنت تو تمام امتوں کے لیے ایک ہی ہے اور اس کا میزانِ عدل بھی ہر قوم وقبیل کے لیے ایک ہی

جیسا ہے۔ جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أُولَٰئِكُمْ أَمْ لَكُم بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴾ (القمر: ۴۳)

خلاصۂ کلام

یہ کہ پورا قرآنِ مجید مخاطبین کے حالت کی رعایت رکھتے ہوئے نازل و قائم ہوا ہے۔ پس بسا اوقات اس میں سختی نظر آتی ہے اور بسا اوقات نرمی۔ یاد رکھیے سختی و نرمی کا انحصار مکی یا مدنی ہونے پر نہیں بلکہ مقتضی الحال پر ہے اور اس کی دلیل مکی و مدنی سورتوں کی وہ آیات ہیں جو ابھی آپ کے سامنے پیش کی گئیں یا آپ کی نظروں سے ایسی بہت سی امثلہ وشواہد گزرے ہوں گے جن میں آپ تہہ در تہہ وعدہ و وعید، نظر انداز کرنا و پکڑنا، مواخذہ کرنا و چھوڑنا اور اپنایت و سختی محسوس کرتے ہوں گے۔ اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مکی سورتوں میں کثرت کے ساتھ شدتِ خطاب پایا جاتا ہے جب کہ مدنی میں نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شدتِ خطاب اس اذیت و کید کا ردِ عمل ہے جو اہلِ مکہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ برتا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اہل مکہ نے ان کو ان کے اپنے شہروں سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اذیت کے اثرات جائے ہجرت تک پہنچانے کی ناکام کوششیں کرتے رہے۔

اور یہ کہ قرآنِ کریم سباب یا معنیٰ سباب والے اِلزامات سے کوسوں دور ہے۔ بلکہ قرآنِ کریم دعوت وارشاد کے باب میں حکمت وادبِ کامل کے ساتھ صبر وعفو اور احسان پر اُبھارتا ہوا دِکھائی دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سورۃ الانعام جو کہ مکی سورت ہے، میں اپنے پیارے رسول ﷺ سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

﴿ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن نَّبَإِ الْمُرْسَلِينَ ﴿٣٤﴾ وَإِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَن تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُم بِآيَةٍ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ ۚ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٣٥﴾ ﴾ (الانعام: ۳۴-۳۵)

"اور تم سے پہلے بھی پیغمبر جھٹلائے جاتے رہے۔ تو وہ تکذیب اور ایذا پر صبر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد پہنچتی رہی۔ اور اللہ کی باتوں کو کوئی بھی بدلنے والا نہیں۔ اور تم کو پیغمبروں کے احوال کی خبریں پہنچ چکی ہیں تو تم بھی صبر سے کام لو۔ اور اگر ان کی روگردانی تم پر شاق گزرتی ہے تو اگر طاقت ہو تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈ نکالو یا آسمان میں سیڑھی تلاش کرو پھر ان کے پاس کوئی معجزہ لاؤ۔ اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ پس تم ہرگز نادانوں میں نہ ہونا۔"

جوابِ مُسکِت

مکی سورتوں اور آیات پر غور کرنے سے ایک ایسی واضح حقیقت معلوم ہوتی ہے جو مذکورہ شبہے کے لیے خاموش کن جواب

ہے، تمام دشمنوں کی زبانوں کے لیے لگام ہے اور ہر متکبر اور حاسد کو سڑانے اور جلانے کا سبب ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ مکی سورتیں وآیات مکمل طور پر قتال، جہاد اور لڑائی کے احکام سے خالی ہیں، جیسا کہ وہ ایّام اپنی طوالت وکثرت کے باوجود ان اہلِ مکہ کے ساتھ قتال ومقاتلہ کے واقعات سے خالی ہیں۔ حالاں کہ اہلِ مکہ نے مسلمانوں کے ساتھ وہ کچھ کیا تھا کہ ان کے مثل کرنے والوں کے وکثرت ساتھ مقاتلہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود مکی دور میں مسلمانوں کی طرف سے نہ ہی تو تلواروں کی جھنکار سُنائی دیتی ہے، نہ ہی اسلحے کی گونج کانوں میں پڑتی ہے اور نہ دشمنوں پر دھاوا بولنے کی منادی سُننے کوملتی ہے۔ بلکہ سُنائی دیتا ہے تو صبر کا حکم، کانوں میں گونج پڑتی ہے تو عفو ودرگزر کی اور اگر کوئی منادی سُننے کوملتی ہے تو احسان مندی، قدر دانی اور خیر سگالی کی۔ اگر چہ اہلِ مکہ ان کو اذیت دینے میں تمام حدیں پار کر چکے تھے، ان کے ساتھ بے مروتی وبدلحاظی کے تمام پیمانے توڑ چکے تھے، ان کو سب وشتم اور قتل وغارت کی خطرناک گھاٹیوں میں اُتار چکے تھے، اُن پر بائیکاٹ اور قطع تعلقی کی بجلیاں گرا چکے تھے اور ان پر طرح طرح کے مظالم اور ملامتوں کے پہاڑ توڑ چکے تھے۔

۳ (پہلے شبہے کے چار اجزا ہیں جیسا کہ ماقبل گزرا۔ ان میں سے تیسرا جزو یہ ہے) اور رہا معترضین کا یہ گمان کہ قسم مکی پست درجے کی خصوصیات، علوم وامثال پر مبنی ہے۔ تو ان کا یہ گمان بھی مردود ہے اور وہ اس گمان کو جس دروازے سے بھی داخل کرنا چاہیں گے اُسے مسدود پائیں گے اور وہ اس کی جو توجیہ بھی بیان کرنا چاہیں کہ اس کارڈانھیں مل جائے گا۔ کیوں کہ اگر وہ اپنے توھُّم کے مطابق، اس سے، یہ مراد لیتے ہیں کہ قسم مکی اپنی سختی، شدت اور سباب میں منفرد ہے تو آپ اس سے متعلق پہلے جان چکے ہیں کہ ان کا یہ توھُّم محض کذب، افترا اور جہالت پر مبنی ہے۔ کیوں کہ قرآنِ کریم میں جو آیا ہے وہ ترغیب وترہیب کے قبیل سے ہے اور وہ صرف قسم مکی ہی میں نہیں بلکہ مکی ومدنی دونوں میں یکساں ہے۔

اور اگر وہ پست درجے کی خصوصیات سے مکی آیات کے مختصر ہونے یا شرعی اَحکام کی تفصیلات سے خالی ہونے کی طرف اِشارہ کرنا چاہتے ہیں تو اس سے پست خصوصیات پر دلالت نہیں ہوتی۔ بلکہ مکی آیات کے مختصر ہونے اور احکامِ شریعت کی تفصیلات سے خالی ہونے کی تو ایک اور وجہ ہے، جس کو آئندہ آنے والے شبہات میں بیان کیا جائے گا۔

اور اگر ان کی مراد یہ ہے کہ اہلِ مکہ فصاحت وبلاغت، بیان وذکاوت، ذہانت وفطانت میں پست درجے کی خصوصیات کا شکار تھے۔ تو معترضین کی یہ مراد ان کی اپنی تباہی وذلت کے لیے کافی ہے۔ کیوں کہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ قریش کو عرب کے تمام قبائل میں مرکزی قیادت حاصل تھی۔ تمام قبائلِ عرب ان کی رائے کا احترام کرتے تھے۔ ان کے فیصلوں پر عمل کرتے تھے۔ ان سے سیکھتے تھے۔ اُونٹوں کی پشتوں پر سوار ہوکر دور دراز سے سفر کر کے ان کے پاس آتے تھے اور کلام کی دونوں اَقسام یعنی منظوم اور منثور میں ان کے فیصلے کے سامنے سرنگوں رہتے تھے۔ الغرض تمام قبائلِ عرب قریش سے متعلق یہ جانتے تھے کہ وہ فصاحت، بلاغت، ذکاوت، ذہانت وفطانت اور اعزاز وقیادت جیسی اعلیٰ صفات سے متصف ہیں۔ اور قریش کو یہ امتیازات اِسلام سے پہلے ہی حاصل تھے پھر آمدِ اِسلام کی برکت سے ان امتیازات میں ایسی مداومت اور اضافہ رونما ہوا، جس کا اعتراف اہلِ مدینہ اور ان کے علاوہ تمام عرب وعجم نے کیا۔

قسم مکی کو پست درجے کی خصوصیات کے ساتھ متصف ماننا وہ اِلزامِ بے باکانہ، طعنۂ آوارانہ اور کذبِ کاشفانہ ہے جس کو اَعدائے اِسلام نے اسلام کی دعوت کا انکار کرنے کے لیے اپنے لیے پسند کر لیا تھا، خواہ وہ اَعدائے اِسلام مشرکین میں سے ہوں یا اہلِ کتاب میں سے، عرب وعجم میں سے ہوں یا اُمیین ومثقفین میں سے ہوں۔ جب کہ عرب اپنی امیت کے باوجود کلام کے تمام نشیب وفراز

اور علو ونزول سے، سب لوگوں سے نسبتاً زیادہ واقف تھے۔ جیسا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو تکلیف پہنچانے میں، ان کے دلائل کو توڑنے میں، ان کی دین میں نقص نکالنے میں اور اِسلام کو ان کے گہوارے میں ہی ختم کرنے پر سب لوگوں سے نسبتاً زیادہ حریص تھے۔ لیکن ان کے مزاج نے ان کے اس بے کار ولغوبات کی اِجازت نہ دی جس کی طرف آج ملحدین نکل پڑے یعنی قسم مکی میں پست درجے کی خصوصیات کا دعویٰ کرنا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے ان پر حیرت انگیز طور پر بادشاہت اختیار کر لی تھی اور قرآنِ کریم نے اپنی قوت کے ساتھ ان کو اِسلام کی طرف کھینچا اور عناد کو ختم کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے جب کوئی قرآن سُنتا تو وہ قرآن کی بلاغت کے سامنے جھک جاتا اور اس کی فصاحت سے اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا اور وہ قصداً اپنے آپ کو کسی اور کام میں مشغول کر لیتا، اس بات سے خوف کھاتے ہوئے کہ کہیں وہ ایمان نہ لے آئے۔

اور معترضین کا یہ گمان کہ قسم مکی اور قسم مدنی میں باہمی ربط نہیں ہے بلکہ ان دونوں کے اسلوب آپس میں متعارض ہیں۔ تو ان کا یہ گمان سابقہ غلط فہمیوں پر مبنی ہے جسے ہم ماقبل غلط ثابت کر چکے ہیں۔ نیز یہ ایک ایسا احمقانہ دعویٰ ہے جس کو حقیقت جھوٹا قرار دیتی ہے اور منصفانہ و بلیغانہ مزاج رکھنے والے اس کی تردید کرتے ہیں۔ اور اس اَمر پر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مکہ میں رہنے والے اَعدائے اِسلام جو کہ بلاغت میں یکتا تھے قرآنِ کریم کے زمانہ نزول میں بھی تنزیل کے اسالیب پر الزام واتہام لگانے کی طاقت نہ رکھتے تھے جیسا کہ آج کے دور میں ملحدین اِلزام واتہام لگا رہے ہیں۔ کیوں کہ اہلِ مکہ آج کے ملحدین سے زیادہ علم وعقل رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قرآنِ کریم کے اسلوب میں عدمِ یکسانیت کا الزام واتہام ایک ایسا کذب ہے جو چھپا نہیں رہے گا اور ایسا افترا ہے جو اپنے گھڑنے والے کو کُل عالم میں رُسوا اور ذلیل کر دے گا۔ بلکہ قریش کے ایک سردار ولید بن مغیرہ (جو کہ عرب کا بہت بڑا شاعر وادیب بھی تھا) نے جب نبی کریم ﷺ کو قرآن پڑھتے ہوئے سُنا تو اپنے ساتھیوں کو آ کر کہا:

((وَاللّٰهِ لَقَدْ سَمِعْتُ مِنْ مُحَمَّدٍ آنِفًا كَلَامًا مَا هُوَ مِنْ كَلَامِ الْإِنْسِ وَلَا مِنْ كَلَامِ الْجِنِّ إِنَّ لَهُ لَحَلَاوَةً وَإِنَّ عَلَيْهِ لَطَلَاوَةً وَإِنَّ أَعْلَاهُ لَمُثْمِرٌ وَإِنَّ أَسْفَلَهُ لَمُغْدِقٌ وَإِنَّهُ يَعْلُو وَمَا يُعْلَى)).

”اللہ کی قسم میں نے ابھی ابھی محمد (ﷺ) سے ایک ایسا کلام سُنا ہے جو نہ ہی تو کسی انسان کا کلام ہے اور نہ ہی کسی جن کا۔ اس کلام میں ایک خاص مٹھاس ہے۔ اس میں عجب حلاوت وشیرینی ہے۔ اس پر (ایک خاص) طراوت وتازگی ہے اور وہ کلام اوپر سے ثمر بار اور نیچے سے چشمہ دار ہے۔ یقیناً وہ کلام غالب آ کر رہے گا کبھی مغلوب نہ ہوگا۔“

ولید کا یہ کہنا تھا کہ قریش بولے: ”اللہ کی قسم ولید تو نے اپنا دین بدل لیا۔“ پھر اسے قرآنِ کریم پر طعن کرنے کے لیے اُبھارنے لگے۔ اب ولید نے اس کے سوا کوئی حیلہ نہ پایا کہ قرآنِ کریم پر سحر ہونے کا اِلزام لگا دے۔ لہٰذا اس نے کہا: ﴿فَقَالَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ﴾ (المدثر: ۲۴) ”یہ قرآن اثر کرنے والے جادو کے سوا کچھ نہیں۔“ الغرض یہ کہ ولید کی بھی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ قرآنِ کریم کی آیات میں کسی قسم کی پست خصوصیات کا دعویٰ کرے یا اس کے اَجزا کے مابین عدمِ ربط وعدمِ مطابقت کا الزام لگائے یا اس کے اسالیب میں سے کسی پر انحطاط کا حکم لگائے۔

④ اور جب معترضین کے سابقہ تمام زعم باطل ہو گئے تو ان کا یہ زعم کے قرآنِ پاک معاشرے وماحول سے متاثر ہے، بھی باطل ہو گیا اور وہ اپنے اس زعمِ باطل سے جو نتیجہ مرتب کرنا چاہتے تھے یعنی قرآنِ مجید اللہ ربُّ العزت کا کلام نہیں بلکہ محمد ﷺ کا کلام ہے

(نعوذ باللہ)، وہ بھی باطل ہوگیا۔ اور معترضین کے ان کے علاوہ اور جتنے بھی توہمات ہیں، وہ اپنی بے ہودگی کی وجہ سے، کسی جواب کے مستحق نہیں۔ کیوں کہ قرآنِ مجید کا اعجاز ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ ہی ہر قوم و قبیلے ہر مقابل و متکبر کے لیے قائم رہے گا۔
(قرآنِ مجید کا اعجاز ایک مستقل بحث ہے جس کا بیان آگے آئے گا۔)

اگر آج کے دور کے نیم تعلیم یافتہ لوگوں کو اوپر بیان کردہ اعتراضات والے نعروں سے بے وقوف نہ بنایا گیا ہوتا تو ہم کبھی بھی نہ اپنے آپ کو ان اعتراضات و شبہات کو دور کرنے میں تھکاتے اور نہ آپ کو تھکاتے۔ پس ہمارے ساتھ ہی اس مصیبت پر صبر کیجیے۔ بے شک اللہ ہی کے ذمے ہے ہدایت دینا ہمیں بھی اور آپ کو بھی۔

دوسرا شبہ کہتے ہیں: مکی آیات و سورتوں کا مختصر ہونا اور مدنی آیات و سورتوں کا طویل ہونا دلالت کرتا ہے قسم مکی اور قسم مدنی کے مابین عدمِ ربط اور عدمِ مطابقت پر، قسم مکی کے پست درجے کی صفات کے ساتھ متصف ہونے پر اور قسم مکی اور مدنی کے ماحول سے متاثر ہونے پر، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قرآن کلامُ اللہ نہیں بلکہ محمد ﷺ کا کلام ہے (نعوذ باللہ)۔ کیوں کہ جب آپ ﷺ مکہ میں تھے اور امیوں کے درمیان امی ہی تھے تو اس وقت جو آیات سور وجود میں آئیں وہ سب قصیر و مختصر تھیں۔ اور جب آپ مدینہ میں ثقافت و تہذیب یافتہ لوگوں میں تھے تو اس وقت جو آیات و سور وجود میں آئیں وہ قدرے طویل تھیں۔ (العیاذ باللہ حیرانی ہے ان کے اس شبہے پر) وہ اس شبہے کے ذریعے حقیقت پر مبنی اس نظریے یعنی "قرآنِ کریم مِن عند اللہ ہے" میں شک و تشکیک ڈالنا چاہتے ہیں۔ (لیکن ایں خیال است ومحال است وجنون)

﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝﴾ (التوبۃ: ۳۲)

"یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے پھونک مار کر بجھا دیں۔ اور اللہ اپنے نور کو پورا کیے بغیر رہنے کا نہیں۔ اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔"

دوسرے شبہے کا جواب دوسرے کے شبہے کے (چار) جوابات (ہیں، جو کہ) درج ذیل ہیں:

① یہ اعتراض کسی بھی صورت قابلِ قبول نہیں ہے۔ کیوں کہ مکی سورتوں میں بھی ایسی سورتیں ہیں جو خوب طویل وعریض ہیں جیسا کہ سورۃ آل عمران۔ اور مدنی سورتوں میں بھی ایسی سورتیں ہیں جو اچھی خاصی مختصر ہیں جیسا کہ ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ۝﴾ (النصر: ۱)۔

② اور اگر معترضین کی اس سے مراد قاعدہ کلیہ وشاملہ نہیں بلکہ قاعدہ اکثریہ وغالبیہ ہے یعنی ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اکثر مکی آیات و سور مختصر ہیں اور اکثر مدنی آیات و سور طویل ہیں، تو تب بھی ان کی اس بات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن کو گھڑا گیا ہے یا یہ کلام اللہ نہیں ہے۔ کیوں کہ مکی سورتوں و آیات کے اکثر حصے کے مختصر ہونے اور مدنی آیات و سور کے اکثر حصے کے مطول ہونے سے قرآنِ کریم کی دونوں قسموں (مکی و مدنی) بلکہ مجموعی طور پر قرآنِ مجید کے مابین عدمِ ربط یا عدمِ مطابقت ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس سے تو وہ صلہ، تعلق، مطابقت اور ہم آہنگی ثابت ہوتی ہے جس کو فصاحت و بلاغت سے ذوق رکھنے والا ہی سمجھ سکتا ہے۔ نیز یہ مذکورہ ہم آہنگی قرآن کے تمام اَجزا میں محکم و شائع انداز میں موجود ہے جس کی مختلف اَقسام و انواع کو علمائے کرام نے کتاب اللہ کی تفسیر کی مختلف شاخوں کے ضمن میں بیان کیا ہے۔

مکی اور مدنی آیات وسور میں اتصال وتعلق پر ایک شاہد یہ بھی ہے کہ آپ دیکھیں گے کہ بہت سی مکی آیات، مدنی سورتوں میں شامل اور ان کا حصہ ہیں اور اسی طرح بہت سی مدنی آیات، مکی سورتوں میں پائی جاتی ہیں۔ اور ان کے اس اختلاط کی وجہ سے کوئی بھی شخص ان کے مابین تفاوت وانقطاع محسوس نہیں کرتا۔ بلکہ ان کا مشاہدہ کرنے والا ان آیات میں ایک ہی قسم کا خاص جلال، کمالِ اتصال اور جمالِ یکسانیت محسوس کرتا ہے جس کی وجہ سے پورا قرآنِ کریم ایک ایسی زنجیر کی مانند لگتا ہے جس کی تمام کڑیاں آپس میں بے حد مضبوطی کے ساتھ جڑی ہوئی ہوں۔ یا ایک خوب صورت ہار کی طرح دکھائی دیتا ہے جس کے عمدہ موتی انتہائی خوب صورتی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوں۔ یا ایک ایسا قانون ومعاہدہ معلوم ہوتا ہے جس کو آغاز وانجام کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہو۔

③ مکی آیات وسور کا مختصر ہونا ان کے اس زعمِ باطل کہ قسم مکی پست درجے کی صفات سے متصف ہے، پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ ان کا اختصار تو ایجاز (ایجاز علمِ بلاغت کی اصطلاح ہے) کا مظہر ہے۔ اور کلام میں ایجاز پایا جانا علامت ہے اس بات کی کہ مخاطب ذہین اور فہیم ہے اور اس کے لیے تھوڑا سا کلام بھی کفایت کر جائے گا۔ اور جب مخاطب ذکاء وفہم میں پہلے سے کم ہو تو افادہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ کلام میں کسی درجہ اسہاب وبسط سے کام لیا جائے کیوں کہ دونوں مخاطب یکساں نہیں۔ (الغرض مکی آیات وسور میں اختصار کی وجہ مخاطبین میں پائی جانے والی اعلیٰ درجہ کی فہم وذکاء تھی اور مدنی آیات وسور میں شرح وبسط کی وجہ مخاطبین میں اس درجہ کی فہم وذکاء کا نہ ہونا تھا۔) اسی وجہ سے زیادہ تر مکی آیات وسور قصیر وموجز جب کہ مدنی آیات وسور طویل ومبسوط ہیں۔ اور یہ وہ ہی بات ہے جس کی طرف ہم ماقبل بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ قبیلۂ قریش مکہ میں رہتے ہوئے تمام قبائلِ عرب میں اپنی فہم وفراست، فصاحت وبلاغت اور شرف وشجاعت کی وجہ سے قائدانہ حیثیت رکھتا تھا۔ پس ایسے حالات میں لازم تھا کہ قرآنِ کریم اپنی آیات وسور میں ان کو اختصار کے ساتھ مخاطب کرتا، بلاغت وبیان کے قانون کی رعایت رکھتے ہوئے کہ جب مخاطب ذکی اور فہیم ہو تو کلام میں حد درجہ ایجاز ہونا چاہیے اور جب مخاطب ایسا نہ ہو تو کلام میں کسی درجہ طوالت وبسط ہونا چاہیے۔ اب کوئی یہ اشکال نہ کرے کہ اہلِ مکہ تو اُمی تھے ثقافت وتمدن جیسی صفات سے ناواقف تھے۔ کیوں کہ ثقافت وتمدن ایک علیحدہ میدان ہے اور کلام وبیان میں ذکاء ومہارت ایک علیحدہ میدان ہے۔ اور اہلِ مدینہ اپنی ثقافت وتمدن کے باوجود فصاحت وبلاغت جیسی صفات میں اہلِ مکہ سے آگے بڑھے ہوئے نہیں تھے۔ نیز مدینہ میں آباد اہلِ کتاب کا قرآنِ مجید سے مستفید ہونا اسی صورت ممکن تھا کہ مدنی آیات وسور میں کسی قدر شرح وبسط ہو لہٰذا قسم مدنی میں بسطِ کلام سے کام لیا گیا۔ اس ساری بحث کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ معترضین کے اس شبہے کا مبلغ ومقصد یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے اہلِ مکہ میں موجود پست امتیازات وصفات اور اہلِ مدینہ کی ثقافتی وتہذیبی صفات سے متاثر ہو کر قرآنِ کریم کی قسم مکی میں اختصار پر اور قسم مدنی میں طوالت پر مبنی آیات از خود بنالی تھیں اور ان کا یہ مقصد و مبلغ جھوٹ دھوکا، فریب ودجل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

④ قرآنِ کریم نے تمام انسانوں کو خواہ وہ مکی ہوں یا مدنی، عربی ہوں یا عجمی چیلنج دیا تھا کہ وہ اس کے مثل لے آئیں، اگرچہ چھوٹی سورتوں میں سے سب سے چھوٹی سورت کے مثل ہی لے آئیں۔ لیکن وہ تمام کے تمام عاجز آگئے اور ان میں سے منصف مزاج لوگوں نے تسلیم کر لیا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ پس اگر کلام کو مختصر لانا بقول معترضین اس انحطاط کی وجہ سے ہوتا جو کہ اہلِ مکہ میں موجود تھا تو وہ لوگ جو انحطاط کا شکار نہیں تھے، اس انحطاط زدہ کلام کا مثل لانے پر تو قادر ہوتے، لیکن ایسا بھی نہیں ہوا (کہ

اہلِ مدینہ قسم مکی میں موجود آیات وسور کا مثل لا سکے ہوں) کیوں کہ قرآن کریم ان تمام الزامات واعتراضات سے بالاتر شے ہے۔ ﴿سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ﴾ (النور:۱۶)

تیسرا شبہ کہتے ہیں: قسم مکی کا شرعی قوانین اور احکام سے خالی ہونا اور قسم مدنی کا ان تفاصیل سے بھر پور ہونا دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ محمد ﷺ نے اپنے موجودہ ماحول سے متاثر ہو کر (نعوذ باللہ) قرآن کو گھڑا تھا۔ کیوں کہ جب آپ ﷺ مکہ میں تھے تو قرآن کا جو حصہ وجود میں آیا وہ علوم ومعارفِ عالیہ سے خالی تھا اور جب آپ (ﷺ) مدینہ پہنچے اور وہاں اہلِ کتاب ومہذب ومثقف (ثقافت یافتہ) لوگوں کے ساتھ رہنا شروع کیا تو اس وقت قرآن کا جو حصہ وجود میں آیا وہ علوم ومعارفِ عالیہ سے بھرا ہوا نظر آنے لگا۔ (العیاذ باللہ)

تیسرے شبہے کا جواب ہم اس شبہے کو درج ذیل (چار) جوابات سے ردّ کرتے ہیں:

پہلا جواب ٥ یہ کہنا کہ قسم مکی جملہ شرعی قوانین واحکام سے خالی ہے غلط ہے۔ کیوں کہ قسم مکہ میں بھی شرعی قوانین واحکام پائے جاتے ہیں۔ وہ علیحدہ بات ہے کہ اس قسم میں شرعی قوانین واحکام نسبتاً اجمالی انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ کیوں کہ مقاصدِ دین پانچ ہیں:

① اللہ تعالیٰ، فرشتوں، تمام آسمانی کتابوں، تمام رسولوں، یومِ آخرت اور اچھی وبُری تقدیر پر ایمان لانا
② اپنے نفس کی حفاظت کرنا
③ اپنی زبان کی حفاظت کرنا
④ اپنی نسل کی حفاظت کرنا
⑤ اپنے مال کی حفاظت کرنا

اور تحقیق قسم مکی میں مندرجہ بالا پانچوں مقاصدِ دین کو اجمالاً بیان کر دیا گیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو سورۃ الانعام مکیہ:

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا﴾ (الانعام:۱۵۱)

آیت نمبر ۱۵۱ تا ۱۵۳ پڑھ لیجیے۔ اس میں کُل دس نصیحتیں بیان ہوئی ہیں جو ان پانچوں مقاصد کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔

قرآنِ کریم کے مطالعے کے بعد آپ پر یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ عقائد سے متعلق آیات قسم مکی میں بہت ظاہر، واضح اور کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ کیوں کہ اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہے۔ اور اگر مدنی سورتوں میں بھی اسی قسم کی آیات (عقائد والی) دو چند (تھوڑی سی زیادہ وضاحت یا تعداد کے ساتھ) پائی جائیں تو ان کو اختلاف شمار نہیں کیا جائے گا۔ (بلکہ زیادہ سے زیادہ یوں کہا جائے گا کہ قسم مکی میں اجمالاً بیان تھا اور قسم مدنی میں تفصیلاً)۔

دوسرا جواب ٥ قسم مدنی میں شرعی احکام کی تفاصیل کی کثرت، وہ نتیجہ مرتب نہیں کرتی جو معترضین نے کیا ہے۔ بلکہ یہ تو ایک ایسا اَمر ہے جو قوموں کی سیاست، قبائل کی تربیت اور مخلوق کی ہدایت کے لیے لابُدّی ہے۔ کیوں کہ آگے بڑھنے کے لیے چھلانگ لگانا نقصان کا سبب ہے جب کہ آہستہ آہستہ چلنا نجاح وتوفیق کا۔ اور ویسے بھی حکمت ودانائی کا اُصول ہے: "تَقْدِيْمُ الْاَهَمِّ عَلَى

الْمُهِمِّ۔" اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مکہ میں اپنے بندوں پر وہ آیات نازل کیں جو سب سے زیادہ اہم تھیں یعنی ان کے قلوب کی اصلاح اور شرک و بُت پرستی سے پاک کرنے کا انتظام فرمایا اور صحیح ایمانی عقائد اور واضح توحید سے متعلق آیات نازل فرمائیں۔ یہاں تک کہ وہ مضبوط عقائد پر قائم ہو گئے۔ اور ان کے اندر قیامت و بعثت اور جزا سے متعلق شعور پیدا ہو گیا۔ اور یہ عقائدِ راشدہ ان کے قلوب میں پیوست ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انھیں عاداتِ قبیحہ اور اَخلاقِ رذیلہ سے نجات عطا فرمائی اور آداب اور اچھی عادات کی طرف ان کی راہ نمائی فرمائی۔ پھر ان کو امہات العبادات کا مکلف بنایا۔ یہ وہ دور تھا جو مکہ میں تھا۔ اور جب وہ ان کاموں کے عادی ہو گئے اور اسی حال میں ان کو کئی ایام و سال گزر گئے تو ان کے نفوس ترقی و کمال کے لیے تیار ہو گئے۔ اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ آ گئے۔ اور مدینہ میں شرعی قوانین اور اَحکام کی تفاصیل نازل ہونا شروع ہو گئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اب ان پر دین کی تمام باریکیوں اور اسلامی قوانین کو نازل فرما کر دین کی نعمتِ عظیمہ کو مکمل و تمام فرما دیا۔ (اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا)

زمانہ قدیم اور جدید دونوں میں مذکورہ بالا حکمتِ عملی کی ایک مثال نظامِ تعلیم میں بھی ملتی ہے۔ وہ اس طرح کہ ابتدائی مراحل میں استاد مبتدئین کو مختصر اور آسان مسائل کی تعلیم دیتا ہے۔ پس یہ عمل مشابہ ہے سورتوں و قصص کے مختصر ہونے کے۔ یہاں تک کہ جب طالبِ علم کی عمر میں پختگی اور علمی استعداد میں واضح اِضافہ ہو جاتا ہے۔ تو علم کا سمندر ٹھاٹے مارنے لگتا ہے اور بہت زیادہ بڑھ جاتا۔ ایسے ہی موقع پر کہا گیا ہے: "اَلْاِمْدَادُ عَلٰى قَدْرِ الْاِسْتِعْدَادِ"

رہی بات ان کے اس زعمِ باطل کی کہ قرآنِ مجید نتیجہ ہے اس اختلاط کا، جو محمد ﷺ کا تھا اہلِ مدینہ کے ساتھ، وہ اہلِ مدینہ جو کہ تہذیب و ثقافت سے آراستہ تھے۔ پس یہ بھی ناقص ہے۔ کیوں کہ قرآنِ مجید تو اہلِ کتاب (بلکہ تمام لوگوں) کے عقائد کی اصلاح کے لیے آیا تھا، کیوں کہ وہ تمام لوگ تشریع، تحلیل، تحریم، سابقہ امتوں کے واقعات اور تاریخ سے متعلق بہت ساری غلطیوں، غیر حقیقی اور من گھڑت نظریات پر عمل پیرا تھے۔ قرآنِ مجید نے آ کر ان کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا۔ لہٰذا صحیح راستہ دِکھانے والا غلط راستے پر چلنے والوں سے راہ نمائی اور ہدایت کیسے لے سکتا ہے۔ اور کیسے ایک زندہ شخص اپنی حیات و بقا میں ایک مردہ سے مدد لے سکتا ہے۔ (یعنی قرآن کی مثال راہِ راست پر گامزن اور زندہ شخص کی سی ہے تو بھلا ایسا شخص گُم راہ اور مُردوں سے کیسے ہدایت و استمداد لے سکتا ہے۔) اگر آپ چاہیں تو یہ آیات پڑھیں:

﴿قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ... الخ﴾ (آل عمران: ۶۴)

"(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے: اہلِ کتاب جو بات ہمارے اور تمھارے دونوں کے درمیان یکساں تسلیم کی گئی ہے اس کی طرف آؤ.... (آخر تک)۔"

﴿يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۶۵﴾ (آل عمران: ۶۵)

"(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے: اہلِ کتاب تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو حالاں کہ تورات اور انجیل ان

کے بعد اُتری ہیں اور وہ پہلے ہو چکے تو کیا تم عقل نہیں رکھتے ؟"

﴿ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآءِيلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ﴾ (آل عمران: ۹۳)

"بنی اسرائیل کے لیے تورات کے نازل ہونے سے پہلے کھانے کی تمام چیزیں حلال تھیں بجز ان کے جو یعقوب نے خود اپنے اوپر حرام کر لی تھیں ...(آخر تک)۔"

آیاتِ بالا سورۂ آلِ عمران کی تھیں اور ذیل میں سورۃ المائدہ کی ایک آیت دی جا رہی ہے جس کی شان اہلِ کتاب کی طاقت اور قدرت سے بہت بلند ہے، وہ اہلِ کتاب جن کی بابت یہ کہا جا رہا ہے کہ قرآنِ مجید ان سے متاثر ہو کر وجود میں آیا (نعوذ باللہ)

﴿ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ ... الخ ﴾ (المائدہ: ۴۵)

"اور ہم نے ان لوگوں کے لیے تورات میں یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک ...(آخر تک)۔"

تیسرا جواب ✿ اگر معترضین کا زعم صحیح ہوتا تو صرف حضورِ اکرم ﷺ ہی اہلِ کتاب (جو کہ بقولِ معترضین مہذب و مثقف تھے) کا اثر قبول کیوں کرتے بلکہ اہلِ کتاب کا اثر تو ان عربوں پر ظاہر ہونا چاہیے تھا کہ جو پہلے سے مدینہ میں رہتے تھے یا مکہ یا باقی جزیرہ عرب میں رہتے تھے اور پھر وہ ہی اس نبوت و رسالت کے زیادہ حق دار ہوتے تھے اور آپ ﷺ سے پہلے بھی کوئی فصحائے عرب یا قریش کے تاجروں میں سے اس نبوت و رسالت پر سبقت لے گیا ہوتا کیوں کہ ان کا تو مدینہ اور شام میں اہلِ کتاب کے ساتھ بہت زیادہ اختلاط تھا۔

چوتھا جواب ✿ قرآنِ کریم نے تمام مکیوں اور مدنیوں بلکہ تمام انس و جن کو چیلنج دیا تھا کہ اگر وہ طاقت رکھتے ہیں تو اس کلام کا مقابلہ کریں۔ چاہے سب سے چھوٹی سورت کے مثل ہی بنا لائیں۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ اگر حضورِ اکرم ﷺ نے ان ہی لوگوں سے متاثر ہو کر قرآن گھڑا تھا (نعوذ باللہ) تو پھر وہ لوگ اپنے سے متاثرہ کلام کا مثل لانے سے عاجز کیوں رہے؟ افسوس و حیرانی ہے جھوٹ گھڑنے والی جماعت کے لیے اور بے حیائی و ڈھٹائی پر گامزن گروہ کے لیے۔

هٰذَا كَلَامٌ لَهٗ خَبِيْءٌ مَعْنَاهُ: لَيْسَتْ لَنَا عُقُوْلُ

چوتھا شبہ کہتے ہیں: قرآن نے صبح، رات، انجیر، زیتون، طورِ سینا اور دیگر بہت سی مخلوقات کی قسمیں کھائیں ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام حسی اشیا ہیں۔ اس وجہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن نے مکہ میں رہتے ہوئے مکہ کے ماحول کا اثر قبول کیا۔ کیوں کہ اہلِ مکہ اُمی تھے اور حسیات کے علاوہ سے واقف نہ تھے۔ اور جب ہجرت کا واقعہ پیش آیا اور محمد ﷺ نے اہلِ مدینہ (جو کہ روشن خیال اور دانشور تھے) سے میل جول شروع کیا تو قرآن نے جدید اعلیٰ درجے کے ماحول کا اثر قبول کیا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ قرآن کا مدنی حصہ اَیمانِ حسیہ (ایمان جمع ہے یمین یعنی قسم کی) جو کہ دلالت کرتی ہیں سادگی و انحطاط پر، سے خالی ہے۔

چوتھے شبہے کا جواب یہ شبہ درج ذیل (تین) جوابات کے ساتھ مدفوع ہے:

پہلا جواب ✿ جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا کہ اہلِ مکہ، اہلِ مدینہ سے نسبتاً زیادہ بہترین

ذوق، اعلیٰ شان اور عظیم فہم وفراست کے مالک تھے۔ اور قسم کی میں خطاب انھی سے ہے جس میں ان کی صفات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کیوں کہ قسم کی میں ایسے اَسرار ورموز اور خصائص پائے جاتے ہیں جن کا اِدراک وہ ہی کرسکتا ہے جو صنعتِ بیان سے واقف ہو اور اس میں مہارتِ تامّہ رکھتا ہو۔ لہٰذا اب یہ شبہ جو کہ معترضین کا زعمِ باطل بھی ہے کہ اہلِ مکہ حسیات کے علاوہ سے واقف نہ تھے باقی نہیں رہتا۔ نیز تاریخ بہترین گواہ اور ایک عادل حاکم کی مانند ہے اس معاملے میں کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں مکہ کے عرب کو باقی تمام عربی قبائل سے امتیاز وفضیلت حاصل تھی۔

دوسرا جواب ○ قرآنِ کریم میں صحیح یارات جیسے حسی اُمور کی قسم کھانا اہلِ مکہ کی گراوٹ پر دلالت نہیں کرتا جیسا کہ معترضین کا دعویٰ ہے۔ بلکہ یہ تو عینِ رعایت ہے اس مقتضی الحال کی جس کی خاطر قسم کھائی گئی۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن اہلِ مکہ کے سب سے بدترین عقیدے کی روک تھام کے لیے کوشش کررہا تھا جو ان میں بہت مضبوطی سے راسخ ہو چکا تھا۔ اور وہ سب سے بدترین عقیدہ تھا "شرك۔" اور اس عقیدے کا استیصال اور اس کی ضد میں صریح توحید کا قیام ممکن ہی نہیں تھا مگر اس صورت میں کہ ان کی عقول کو کائنات میں اللہ تعالیٰ کی پھیلی ہوئی نشانیوں اور اس کی مخلوق کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ نعمتوں کی اس عظیم جماعت سے آگاہ کیا جائے جس نے ہم گھیرا ہوا ہے۔ تا کہ وہ ان نعمتوں کی عظمت کا احساس کرتے ہوئے ان کے پیچھے کارفرماں قوت کا اِدراک حاصل کرسکیں اور اللہ جو کہ اپنی خدائی میں یکتا اور تنہا ہے، پر ایمان لاسکیں۔ کیوں کہ وہ ہی ان تمام نعمتوں کا تنِ تنہا خالق ہے۔ اور عقلی اعتبار سے وہ ہی عبادت کا مستحق ہے جس نے ان تمام چیزوں کو عدم سے وجود بخشا۔

﴿ اَفَمَنْ یَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا یَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۱۷ ﴾ (النحل:۱۷)

"تو جو اتنی مخلوقات پیدا کرے کیا وہ اس مخلوق جیسا ہوسکتا ہے جو کچھ بھی پیدا نہ کرسکے۔ تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے؟"

منکرینِ توحید کے سامنے بعض مخلوقات کا ذِکر کرنا بعد اس کے کہ وہ اِقرار کرچکے ہیں کہ ان مخلوقات کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے، دراصل ان پر شرک کے چھوڑنے کو لازم کرنا اور توحیدِ خالق کی طرف دعوت دینا ہے۔ اور قسمیں کھانے سے قرآنِ کریم کا یہ ہی عیلانہ مطمح اور مقصد تھا۔ اور قرآنِ کریم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والی نعمتوں کو اپنے اسلوب میں بہت خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اور وہ اپنی اسی طرح خوب صورتی کی وجہ سے لوگوں کو مقصود تک پہنچانے میں کامیاب ہوا اور اعجاز کی چوٹیوں تک پہنچنے کے لیے ایک اصول وبنیاد کی حیثیت اختیار کرگیا۔ قرآنِ کریم نے نعمتوں کے بیان میں مختلف انداز اپنائے اور مختلف انواع کے ساتھ ان کے تسلسل کو بیان کیا۔ پس کبھی تو قرآن آسمان کی تخلیق کو بیان کرتا ہے اور کبھی زمین کی پیدائش پر سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ کبھی انسان کو اس کی اپنی ذات میں غور کرنے پر اُبھارتا ہے۔ اور کبھی حیوانات، نباتات اور جمادات کی انواع کو بیان کرتا ہے۔ الغرض یہ ہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پھر قرآنِ کریم ان تمام چیزوں کو پیش کرنے میں کبھی تو بیان وشرح کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور کبھی حلف وقسم کا۔ کیوں کہ حلف وقسم میں اس عظمت کے معنی پائے جاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس نعمت میں ودیعت رکھی ہے اور وہ دلالت کرتی ہے اللہ کی توحید وعظمت پر۔ یہاں تک کہ ان نعمتوں پر قسموں کا دائر ہونا صحیح ہو جاتا ہے اور قرآنِ کریم کا ان قسموں کو بیان کرنا درست ہو جاتا ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے حسی اور معنوی دونوں اُمور کی قسمیں اُٹھائی ہیں۔ اُمورِ حسیہ کی قسمیں

تو ماقبل گزر چکیں اور اُمورِ معنویہ کی ایک مثال قرآنِ کریم خود ہے۔ دیکھیے:

﴿وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ؕ﴾ (یٰس:۲-۴)

"قسم ہے قرآن کی جو حکمت سے بھرا ہوا ہے۔ اے محمد ﷺ بے شک تم پیغمبروں میں سے ہو۔ سیدھے رستے پر ہو۔"

(اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اُمورِ حسیہ اور معنویہ دونوں کی قسمیں اُٹھائیں) تاکہ وہ متنبہ ہو جائیں کہ انعامات خواہ حسیہ ہوں یا معنویہ، اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں۔ اور وہ ان بتوں کو جو نہ ہی تو کسی کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان اور نہ ہی کائنات کی تخلیق میں ان کا کوئی حصہ ہے، اس کا شریک ٹھہرانے سے ڈر جائیں۔ جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ؕ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝﴾ (الاحقاف:۴-۶)

"کہہ دیجیے کہ بھلا تم نے ان چیزوں کو دیکھا ہے جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ۔ کہ انھوں نے زمین سے کون سی چیز پیدا کی ہے۔ یا آسمانوں میں ان کی کوئی شرکت ہے۔ اگر سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب میرے پاس لاؤ۔ یا تمھارے پاس علم انبیا علیہم السلام میں سے کچھ ہو تو پیش کرو۔ اور اس شخص سے بڑھ کر کون گم راہ ہو سکتا ہے جو ایسے کو پکارے جو قیامت تک اُسے جواب نہ دے سکے اور ان کو ان کے پکارنے ہی کی خبر نہ ہو۔ اور جب لوگ جمع کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی پرستش سے انکار کر دیں گے۔"

اور اب آپ اچھی طرح جان چکے ہیں کہ شرک میں مبتلا لوگوں کو سمجھانے اور اس سے دور رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور اسی طریقے کو قرآنِ کریم نے اختیار کیا یعنی آفاقِ عالم میں مشرکین کو نظر آنے والی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے توحیدِ باری تعالیٰ کے دلائل پیش کرنا۔ پس اب یہ ہی سبیل متعین ہو گیا ہے ہر مشرک کو مخاطب کرنے کے لیے خواہ وہ مشرک فلاسفہ میں سے ایک ہو یا عبقری شخصیت وصفات کا حامل ہو یا مہذب وترقی یافتہ قوم کا اُستاد ہو۔ پس قرآنِ کریم کا بہت سی مخلوقات اور حسیات (ومعنویات) کی قسمیں اُٹھانا ہرگز مخاطبین کی سادگی، گراوٹ یا انحطاط پر دلالت نہیں کرتا۔ اور نہ ہی اس الزام وطعن کو لازم کرتا ہے کہ نعوذ باللہ قرآن محمد ﷺ کا کلام ہے جو کہ مکہ کے باسیوں کی پست حالی اور انحطاط سے متاثر ہو کر وجود میں آیا جیسا کہ انھوں نے غلط بیانی کرتے ہوئے کہا:

﴿اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝ۚۖ﴾ (صٓ:۷)

"یہ تو بالکل گھڑی ہوئی بات ہے۔"

تیسرا جواب ٭ حسیات کی قسمیں اُٹھانے میں وہ اَسرار ورموز ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ مخاطبین سادگی، گراوٹ یا انحطاط کا شکار نہیں تھے بلکہ وہ تو اعلیٰ درجے کی قابلیت، فہم وذکا اور فصاحت وبیان جیسی بلند صفات کے مالک تھے۔ اسی وجہ سے قرآن نے یہ قسمیں اُٹھائیں جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا۔ نیز ان قسموں میں اُن اَسرارِ عظیمہ کی طرف اِشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان اُمور میں

رکھی ہیں جن کی قسم اُٹھائی ہے، تاکہ اُن کا مقسم بہ ہونا درست ہو جائے۔اوران اَسرار کا اِدراک وہ ہی کر سکتا ہے جو دانائی کی باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔کیوں کہ ان میں ان اسرار کی کوئی وضاحت وتفسیر موجود نہیں تھی۔ان کو صرف وہ ہی سمجھ سکتا تھا جو عقل میں کمال اور ذوق میں سلامتی رکھتا ہو۔اب ہم اُن اسرار میں سے چند (بطورِ مثال) یہاں ذکر کیے دیتے ہیں تاکہ واضح ہو جائے حال اور باقی نہ رہے اس شبہے کے لیے کوئی مجال۔

مثالِ اوّل

درج ذیل آیات میں اللہ تعالیٰ نے آفتاب کی روشنی اور رات کی تاریکی کی قسم اُٹھائی۔

﴿ وَالضُّحٰى ۙ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ؕ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ؕ ﴾ (الضحیٰ:۱-۵)

”آفتاب کی روشنی کی قسم۔اوررات کی تاریکی کی قسم جب وہ چھا جائے۔اے نبی ﷺ آپ کے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑ دیا اور نہ آپ سے ناراض ہی ہوا۔اورآخرت آپ کے لیے دُنیا سے کہیں بہتر ہے۔اورآپ کا پروردگار عن قریب آپ کو اتنا کچھ عطا فرمائے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔“

ان آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ کچھ عرصے کے لیے نزولِ وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔(اس عرصے کو فترتِ وحی بھی کہا جاتا ہے۔) اس موقع پر حضورِ اکرم ﷺ کو اعداء نے طعنہ دِیا کہ آپ کو آپ کے ربّ نے چھوڑ دِیا ہے اور آپ سے ناراض ہو گیا ہے۔تو اس موقع پر یہ آیات نازِل ہوئیں جن میں اللہ تعالیٰ کا قسم اُٹھانا اس طرف اِشارہ کرتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے قلبِ اطہر پر وحی کے نور کی شعاعیں ”آفتاب کی روشنی“ کی مانند ہیں۔جس سے (ہر چیز کی) زندگی کو تقویت ملتی ہے اور نباتات کے لیے نشوونما کا سبب ہوتی ہے۔اوراس کے بعد جو فترتِ وحی کا واقعہ پیش آیا وہ اس رات کی مانند ہے جس کی تاریکی چھا جائے۔تاکہ قوتوں کو ذرا راحت مل جائے اور نفس آئندہ آنے والے معاملات کے لیے مستعد ہو جائے۔کیوں کہ یہ تو معلوم ہی ہے کہ جب پہلی وحی نازِل ہوئی تو اس کی شدت کیسی تھی۔یہاں تک کہ آپ ﷺ حضرتِ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے، آپ ﷺ پر کپکپی طاری تھی۔جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں موجود ہے۔پس وحی کا منقطع ہونا صرف اُن حالات وواقعات پر تثبیت اور تقویت کے لیے تھا جن کا آپ ﷺ کو آئندہ پیش آنے کا احتمال تھا تاکہ اس تثبیت اور تقویت کی وجہ سے آپ ﷺ کو مخلوق کی طرف بھیجے جانے کی حکمت اپنے اتمام کو پہنچ سکے۔اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم ﷺ سے فرمایا:﴿ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ؕ ﴾ (اورآخرت آپ کے لیے دنیا سے کہیں بہتر ہے۔) یعنی وحی کا دوبارہ سے شروع ہونا عن قریب دین کی تکمیل کر دے گا اور اللہ کی نعمت کا اتمام کر دے گا۔اور کہاں ہے وحی کی ابتدا اپنی انتہا سے؟ اور کہاں ہے دین کا اجمال جو کہ آیا ہے اللہ تعالیٰ کے قول:﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ ﴾ (العلق:۱) عقائد اور احکام کی تفصیل سے جو کہ آئی ہیں مثانی قرآن میں۔پھر معاملہ اور بھی زیادہ مؤکد ہو جاتا ہے اس قول:﴿ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ؕ ﴾ (الضحیٰ:۵) کے ذریعے۔

پس اس تمام تفصیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر ”آفتاب کی روشنی“ اور ”رات کی تاریکی“ کی قسم اُٹھانے میں محض اللہ تعالیٰ کی نشانیوں اور نعمتوں کی طرف اِشارہ نہیں ہے بلکہ قسم اٹھانے میں دلیل قائم کرنا مقصود ہے اس پر کہ وحی کا نزول مشابہ ہے

دِن اور آفتاب کی روشنی کے جب کہ وحی کا رُک جانا رات کی تاریکی کے مثل ہے۔ پس جب انھوں نے خوشی خوشی دِن کی روشنی اور رات کی تاریکی کو قبول کرلیا، جن میں نفع ہے انسان کے لیے کہ دِن کی روشنی میں انسان معاش کے لیے کوشش کرتا ہے اور روشنی حیات کے لیے بھی ضروری ہے اور رات کی تاریکی میں آرام اور نیند کا سامان کرتا ہے، تو اُن پر واجب ہے کہ وہ ان دونوں دوروں کو بھی قبول کریں جو نبی اکرم ﷺ پر گزرے یعنی نزولِ وحی اور فترتِ وحی۔

مثالِ ثانی

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے انجیر اور زیتون کی قسم اُٹھائی ہے:

﴿وَ التِّيْنِ وَ الزَّيْتُوْنِ ۙ وَ طُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۟﴾ (التین: ۱-۴)

"انجیر کی قسم اور زیتون کی۔ اور طورِ سینین کی۔ اور اس اَمن والے شہر کی۔ کہ ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے۔"

علامہ مرحوم شیخ محمد عبدہ اس سورت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

راجح یہ ہی ہے کہ "التین" اور "الزیتون" درخت کی دو قسمیں ہیں۔ لیکن ان دونوں کے ذِکر میں کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا جیسا کہ انھوں ذِکر کیا ہے بلکہ ان دونوں کا ذِکر تو اس لیے کیا گیا ہے کہ ان کا انسانی احوال میں بہت عمل دخل ہے۔

اس قول کے قائل کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ہمارے سامنے کتابِ انسانیت کی چار فصلوں کو بیان فرمائے۔ پس جب انسان جنت میں تھا تو وہ انجیر کے پتوں کے سائے میں رہتا تھا۔ اسی دوران (ایک خطا کی وجہ سے) انسان اور اس کی بیوی کی شرمگاہ ظاہر ہونے لگی تو وہ دونوں اپنے جسم کو چھپانے کے لیے انجیر کے پتے جسم پر چپکانے لگے۔

اور زیتون سے اشارہ ہے حضرتِ نوح علیہ السلام اور ان کی ذریت کی طرف۔ جب انسان نے خوب فساد پھیلایا اور طوفان کے ذریعے جن کو ہلاک ہونا تھا وہ سب ہلاک ہوگئے اور نوح علیہ السلام کو ان کی سفینہ سمیت نجات دے دی گئی اور ان کی کشتی ایک مقام پر رُک گئی۔ اس وقت نوح علیہ السلام نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ انھیں ہر جانب پانی ہی پانی نظر آیا، زمین کا کوئی خشک حصہ دِکھائی نہ دِیا۔ سو انھوں نے ایک پرندہ بھیجا کہ وہ زمین کے کسی حصے کے خشک ہونے کی خبر لے کر آئے۔ لیکن وہ پرندہ نظروں سے اُجھل ہوگیا اور کوئی خبر نہ لایا۔ پھر نوح علیہ السلام نے ایک اور پرندہ بھیجا وہ پرندہ زیتون کے درخت کا ایک پتا اُٹھائے ہوئے واپس آیا، جو کہ خوش خبری اور بشارت تھی۔ پرندے کے اس عمل سے حضرتِ نوح علیہ السلام سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ کا غضب (عذاب) تھم گیا ہے۔ اور اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین کو آباد کرنے کی اِجازت مل گئی ہے۔ پھر نوح علیہ السلام اور ان کی اولاد سے بشریت کے عظیم قبائل وجود میں آئے جو کہ زمین سے بالکل ہی مِٹ چکے تھے۔ پس اس زمانے کو "زیتون کے زمانے" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور "زیتون" کی قسم اُٹھانے سے اسی عظیم حادثے کی یاددہانی کرانا مقصود ہے۔

(وطورِ سینین) اس سے اشارہ ہے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے اور عالَم میں نورِ توحید کے ظہور کی طرف، بعد اس کے کہ زمین کی تمام جوانب میں بُت پرستی کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ پھر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے بعد تمام انبیائے کرام علیہم السلام مسلسل اسی شریعت (موسیٰ علیہ السلام کی شریعت) طرف دعوت دیتے رہے یہاں تک ان (بنی اسرائیل) میں سے آخری نبی حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام

تشریف لے آئے جنھوں نے روحِ شریعت کو ان تمام بدعات سے پاک کر دیا جو لوگوں نے دین و شریعت میں شامل کر دی تھیں۔
پھر حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کی قوم پر طویل مدت گزر گئی اور ان کے اندر بھی دین سے متعلق وہ ہی اختلاف پیدا ہو گئے جو ان سے پہلی قوموں میں ہوئے تھے۔ بدعات کو اختیار کرنے کی وجہ سے نورِ ہدایت ان سے محجوب ہو گیا۔ اور وہ غلط تاویلات کی وجہ سے معانی میں خطا کا شکار ہو گئے۔ اور ایسی نئی باتوں اور عقائد کے مرتکب ہو گئے جن سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پس ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے تمام بشریت پر احسان کیا اور ایسی تاریخ کا آغاز کیا جس نے تمام تواریخ کو منسوخ کر دیا۔ اور انسانیت کے تمام سابقہ اور آنے والے اَطوار کو تفصیل سے بیان کیا۔ جی ہاں! اس سے مراد مکہ مکرمہ میں نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا دور ہے۔ اور "البلد الامین" سے اسی دور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اسی قول پر جس کو ہم نے تفصیل سے بیان کیا قسم اور مقسم علیہ میں مناسبت کا انحصار ہے۔

پانچواں شبہ

کہتے ہیں: قرآنِ کریم کی قسم کی، سورتوں کی ابتدائی آیات کے حوالے سے بہت سارے لغو کلام پر مشتمل ہے جیسے: "الٓمٓ" اور "کٓھٰیٰعٓصٓ۔" (العیاذ باللہ) لہٰذا مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ قرآن انسانوں کے لیے بیان اور ہدایت ہے، باطل ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ "الٓمٓ" اور "کٓھٰیٰعٓصٓ" بھی اللہ کا کلام ہے اور ان میں کون سی ہدایت یا بیان ہے؟ بلکہ یہ حروف یا ان جیسے حروف ہدایت سے غایت درجہ بعید ہیں۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ کسی ایک نے بھی ان حروف سے راہ نمائی نہیں پائی اور نہ ہی راسخ فی العلم اس کا معنیٰ جانتے ہیں۔ پس ان الفاظ سے خطاب کرنا خطابِ مہمل کی طرح ہے۔ نیز ان اَلفاظ کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وحی نازل ہونے کے بعد یہود سے وحی والی آیات مسلمانوں کے لیے لکھوایا کرتے تھے تو یہودی اپنی طرف سے کلام کی ابتدا یا انتہا کے موقع پر بطورِ تنبیہ یہ اَلفاظ لکھ دِیا کرتے تھے اور ان کے معانی یہ تھے: "اَوْعَزَاِلَیَّ مُحَمَّدٌ" (مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھنے کی ہدایت کی تھی) یا "اَمَرَنِیْ مُحَمَّدٌ" (مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دِیا تھا) اور یہودیوں کے اَلفاظ اس لکھے گئے (قرآنِ مجید) پر ایمان لانے سے بری الذمہ ہونے کی طرف اِشارہ کرتے ہیں۔ اور اس قول سے قریب ترین ایک اور قول بھی ہے، وہ یہ کہ بعض سورتوں کی ابتدا میں ناقابلِ تفہیم عربی حروف یا تو اس وجہ سے ہیں کہ ان سے تعمیہ یا تہویل کا قصد کیا گیا ہے یا پھر اس چیز کا اظہار کرنا مقصود ہے کہ قرآن بہت گہرے اور مخفی اُمور کا مظہر ہے۔ یا پھر یہ عربی حروف قرآنِ مجید اور دیگر مختلف مصاحف کے مابین امتیاز کے لیے ایک رمز کی حیثیت رکھتے تھے۔ پھر بعد میں ان حروف کو قرآن کے ساتھ لاحق کر دِیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ قرآن ہی بن گئے (یعنی قرآن کا حصّہ بن گئے)۔ (نعوذ باللہ)

پانچویں شبہے کا جواب

یہ شبہ درج ذیل (چار) اُمور کی بنا پر ختم ہو جاتا ہے:

پہلا امر ● نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی یہود سے کچھ نہیں لکھوایا۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہود سے کچھ بھی نہ لکھوانے پر تاریخ گواہ ہے) اور یہ تاریخ ایسی عادل حاکم ہے جو نہ ہی تو کسی پر رحم کرتی ہے اور نہ کسی سے دوستی۔ اے معترضین! اگر تُم سچے ہو تو تاریخ سے پوچھ کر دیکھ لو۔

دوسرا امر ●۔ ان کے پاس اس کی بھی کوئی دلیل نہیں کہ سورتوں کی ابتدا میں جو حروف استعمال ہوئے ہیں وہ ان کے گمان کردہ معانی یعنی "اَوْعَزَاِلَیَّ مُحَمَّدٌ" یا "اَمَرَنِیْ مُحَمَّدٌ" پر مشتمل ہیں۔ یہود یا غیرِ یہود بلکہ لغاتِ بشر میں سے کوئی ایک لغت بھی ان معانی پر استدلال

نہیں کرتی۔

تیسرا امر ٭ کیا یہود قرآنِ کریم میں اس طرح کے طعن سے واقف نہ تھے (جو آپ نے یہود کی طرف منسوب کرتے ہوئے بیان کیا ہے)۔ اگر یہ طعن حقیقت میں یہود کے نزدیک طعن ہوتا تو یہود ہی لوگوں میں سے سب سے پیش پیش ہوتے ان (حروفِ مقطعات) کا انکار کرنے میں اور ان کی توجیہات بیان کرنے میں کیوں کہ یہ یہود ہی وہ گروہ ہے جو نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں سے عداوت میں سب سے زیادہ سخت ہے۔ اور وہ تو تمنا کرتے ہیں کہ کاش ان کو قرآن میں کوئی مغمزہ مل جائے تا کہ وہ دعوتِ اسلام کے مینارے کو منہدم کر سکیں۔ کیا دیکھتے نہیں کہ یہود نے کیسے حق کے واضح ہو جانے کے بعد بھی حسد کرتے ہوئے قرآن (یا نبی کریم ﷺ) کا انکار کیا۔

چوتھا امر ٭ قرآنِ کریم کا ایسے کلمات پر مشتمل ہونا جن کا معنیٰ ظاہر نہ ہو، قرآن کے ہدایت، رحمت اور بیان للناس ہونے والے اوصاف کے منافی نہیں ہے۔ کیوں کہ ان اوصاف کا قرآن مجید میں پایا جانا باعتبارِ جملۃً و مجموعۃً ہے نہ کہ باعتبارِ تفصیلاً اور ایک ایک لفظ کو شامل ہونے کے اعتبار سے۔ (یعنی اگر قرآنِ مجید کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس میں یہ اوصاف کما حقہ موجود ہیں۔) اور اس میں تو کوئی شک ہے ہی نہیں کہ قرآن میں غالب اکثریت ایسی آیات کی ہے جو سراسر تعلیماتِ الٰہیہ کے لیے بیان ہے اور حق کی جانب لوگوں کے ہدایت ہے۔ اور دنیا اور آخرت میں خوش بختی وسعادت کے اُصولوں کو بیان کرنے کی وجہ سے عالَم کے لیے رحمت ہے۔

یہ جواب مبنی ہے حروفِ مقطعات سے متعلق علمائے کرام کی دو آراء میں سے ایک رائے پر۔ پہلی رائے یہ ہے کہ بے شک (حروفِ مقطعات کا) معنیٰ مطلوب ہمیں معلوم نہیں ہے۔ لیکن یہ ان رازوں میں سے ایک راز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس محفوظ رکھا اور مخلوق میں سے کسی ایک کو بھی اس پر مطلع نہیں فرمایا۔ اور ان کے معانی پر مطلع نہ فرمانا بھی اللہ تعالیٰ کی بلند حکمتوں میں سے ایک ہے۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اپنے بندوں کو آزمانا چاہتا ہے تا کہ خبیث اور طیب میں فرق ہو جائے اور منافقین و سچے ایمان والے جُدا جُدا ہو جائیں۔ بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ان کے لیے ان حروف (مقطعات) کے علاوہ بہت سی آیات اور سورتوں میں واضح نشانیاں، ہدایت پر دلائل اور اپنی رحمت کے شواہد کھول کھول کر بیان کر چکا ہے۔ اور یہ حروفِ مقطعات ان آیات اور سورتوں کے مقابلے میں کوئی نسبت نہیں رکھتے مگر وہ نسبت جو ایک قطرہ سمندر کے مقابلے میں رکھتا ہے یا "غَیْضًا مِّنْ فَیْضٍ" ہے (یہ ایک ضرب المثل)۔

پس جو لوگ ایمان والے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ حروفِ فواتح (حروفِ مقطعات) ان کے ربّ کے ہاں سے حق ہیں اگر چہ ان کو ان حروف کے معانی معلوم بھی نہیں۔ اور نہ ہی وہ ان کی مراد جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس پر اعتماد کرتے ہوئے کہ یہ حروف صادر ہوئے ہیں ایسی ذات کی طرف سے جو حکیم و علیم ہے۔ اُس کی کتاب کے معانی میں خواہ وہ معانی ظاہر ہوں یا مخفی، بہر صورت حکمت موجود ہے۔ اور اس کا علم ہر شے پر وسیع ہے چاہے مخلوق کو اس شے کا علم ہو یا نہ ہو۔

﴿ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ﴾ (البقرۃ: ۲۵۵)

"اور لوگ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر دسترس حاصل نہیں کر سکتے ہاں جس قدر وہ چاہتا ہے۔"

﴿ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۗ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ

اِلَّا اللّٰهُ ﴾ (آل عمران: ۷)

"تو جن لوگوں کے دِلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کا اتباع کرتے ہیں تا کہ فتنہ برپا کریں اور مرادِ اصلی کا پتہ لگائیں حالاں کہ مرادِ اصلی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔"

اس کی ایک مثال یہ بھی بن سکتی ہے مثلاً آپ کے بہت سارے دوست ہوں اور آپ ان سب کو یا ان میں سے بعض کو پرکھنا چاہتے ہوں کہ ان میں سے کون کون آپ کے ساتھ مخلص وسچا ہے تو آپ ان کو ایک آزمائش میں ڈال دیتے ہیں جس کی وجہ سے آپ کو کھوٹے اور کھرے کی پہچان حاصل ہو جاتی ہے۔

ایسے ہی موقع پر ایک شاعر کہتا ہے

اُبْلُ الرِّجَالَ اِذَا اَرَدْتَ اِخَاءَهُمْ وَتَوَسَّمَنَّ فِعَالَهُمْ وَتَفَقَّدِ

فَاِذَا ظَفِرْتَ بِذِی اللَّبَابَةِ وَالتُّقٰی فَبِهِ الْيَدَيْنِ قَرِيْرَ عَيْنٍ فَاشْدُدِ

اور ایسے ہی موقع پر یہ ضرب المثل "اِنَّ اَخَاكَ مَنْ وَاسَاكَ" مشہور ہے۔

اس موقع پر ایک اور مثال بھی دی جاسکتی ہے۔ فرض کریں آپ ایک استاد یا معلم ہیں اور آپ اپنے تلامذہ کو پرکھنا چاہتے ہیں کہ وہ کس قدر متوجہ وسنجیدہ ہیں اور اُن کا آپ پر کس قدر اعتماد ہے اور وہ کس حد تک آپ کی علمیت کے معترف ہیں۔ بعد اس کے کہ آپ ان کو وسیع مطالعہ اور واضح تعلیمات فراہم کر چکے ہیں۔ پس آپ ان کو کسی پہیلی یا معمہ جیسے کلمات کے ذریعے آزماتے ہیں۔ تا کہ ناسمجھوں میں سے سمجھ دار ظاہر و علیحدہ ہو جائیں۔ اور آپ پر یقین واعتماد رکھنے والے اور آپ سے محبت کرنے والے اُن سے جدا ہو جائیں جو آپ کے علم وفضل کے بارے میں متردد وشک وشبہ کا شکار ہیں۔ پس جو آپ پر پختہ اعتماد ویقین رکھتا ہوگا سو وہ جان لے گا کہ یہ پہیلیاں اور معمیات آپ کے علم کی بنا پر صادر ہوئے ہیں اگر چہ وہ خود (تلمیذ) ان پہیلیوں یا معمیات کے معانی سے ناواقف ہو۔ لیکن اس کو یہ یقین ہوگا کہ آپ کی طرف سے ان مخفی معمیات میں کوئی حکمت پوشیدہ ہے اور وہ حکمت ہے "آزمانا اور پرکھنا۔" اور جو تلمیذ آپ کے علم وفضل میں شک کا شکار ہوگا وہ اس موقع پر (اعتراضاً) کہے گا: "معلوم نہیں کہ استاد اس سوال سے کیا چاہتا ہے؟" یا "استاد نے ان الفاظ وکلمات کو بولنا مناسب کیسے سمجھا؟" یا "استاد کا مبلغِ علمی بس اتنا ہی تھا؟" سو وہ تلمیذ یہ مطلقاً فراموش کر دے گا کہ اس سے پہلے آپ اس کو وسیع وواضح معارف وحکمتوں کے موتیوں سے ایسا توشہ دے چکے ہیں جو آپ کی علم وفضل پر دلائل وبراہین کی حیثیت رکھتا ہے۔

اور اے مخاطب! اس مقام پر یہ بات بالکل بھی فراموش نہ ہونے پائے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو آزمانے سے یہ مقصود ہرگز نہیں کہ وہ پہلے ان کے حال سے ناواقف تھا، تب ہی اس نے اپنے بندوں کو آزمایا۔ "ہرگز ہرگز ایسا نہیں" بلکہ اللہ تعالیٰ کا علم تو ہر شے پر وسیع ہے۔ اس آزمائش سے تو پوشیدہ مخلوقات کو ظاہر کرنا اور بندوں پر ان کی اپنی جانوں میں موجود حجج وبراہین کو قائم کرنا مقصود ہے۔ تا کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو اس کے عدل وجزا میں موردِ الزام نہ ٹھہرا سکیں کہ اللہ نے بندوں میں سے بعض کو ثواب کا اہل بنایا اور بعض کو عقاب کا۔ سورۃ الکہف، آیت نمبر ۴۹ میں ہے: ﴿وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴾ (الکہف: ۴۹) (اور تیرا رب کسی ایک پر بھی ظلم

نہیں کرتا۔)

بعض سورتوں کے ابتدائی حروف یعنی حروفِ مقطعات سے متعلق علمائے کرام کی دوسری رائے یہ ہے کہ ان حروف کا معنیٰ مقصود معلوم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کتابِ ہدایت ہے۔ اور ہدایت کا متحقق ہونا فہمِ معنیٰ کے بغیر ممکن نہیں۔ بالخصوص جب کہ ہمیں حکم دِیا گیا ہے کہ ہم قرآنِ کریم میں تدبّر کریں اور اس سے مسائل کا استنباط کریں۔ اور یہ دونوں کام بھی بدونِ فہمِ معنیٰ ممکن نہیں۔ تاہم یہ رائے رکھنے والے علمائے کرام سے ان حروف (حروفِ مقطعات) کے معنیٰ مقصود بیان کرنے میں بہت سے اُقوال منقول ہیں۔

ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ ہر سورت کی ابتدا میں جو حرف یا حروف ہیں، وہ ان سورتوں کے نام ہیں۔ اس باب میں وہ استدلال کرتے ہیں ان آثار و مرویات سے جو اس میں مفید بھی ہیں۔ مثلاً نبی کریم ﷺ سے روایت کیا گیا ہے:

((ان لکل شیء قلبًا و قلب القراٰن یٰسٓ و من قرأیٰسٓ کتب اللہ لہ بقراءتھا قراءۃ القراٰن عشر مرات)).

"بے شک ہر چیز کا دِل ہوتا ہے اور قرآن کا دِل سورۂ یٰسٓ ہے۔ اور جو شخص ایک مرتبہ سورۂ یٰسٓ پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اس کے لیے دَس مرتبہ قرآن پڑھنے کا ثواب لکھتے ہیں۔"

یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ قَرَأَ حٰمٓ السَّجْدَةَ حُفِظَ اِلٰی اَنْ یُّصْبِحَ)).

"جس نے سورۂ حٰم السجدہ پڑھی تو صبح تک اس کی حفاظت کی جائے گی۔"

پس ان میں سے بعض سورتیں انھی ناموں کے ساتھ مشہور ہوگئیں۔ پھر چند مختلف سورتیں ایسی بھی ہیں جن کے شروع میں ایک ہی طرح کا لفظ ہے۔ (جیسے سورۃ البقرۃ اور سورۂ آلِ عمران وغیرہ) اور ایک ہی نام متعدد سورتوں کا نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ان سورتوں کے ناموں میں فرق کرنے کے لیے اس لفظِ واحد کے ساتھ ایک ایک لفظ اور ملا دیا گیا تاکہ متعدد سورتوں کے نام مختلف ہو جائیں۔ لہٰذا کہا جانے لگا "الم البقرۃ" اور "الم آلِ عمران" اور "حم السجدۃ" وغیرہ۔ اس کی ایک مثال یہ بھی ہے، جیسے لفظِ محمد بہت سارے لوگوں کا نام ہو۔ تو یہ نام بہت سارے اشخاص میں مشترک ہوا۔ اب ان میں سے ہر ایک کو دوسرے سے ممتاز کرنے کے لیے ایک اور لفظ کا اضافہ کر دِیا جاتا ہے۔ لہٰذا مصر کے رہنے والے محمد کو "محمد المصری" اور شام کے رہنے والے محمد کو "محمد الشامی" کہہ دِیا جاتا ہے۔

بعض کا رُجحان اس طرف ہے کہ یہ (حروفِ مقطعات) ان حروفِ تہجی کے اَسماء ہیں جو ان کے بالمقابل وضع شدہ ہیں۔ (یعنی "الٓمّٓ" میں سے "الف" اس "الف" کا نام ہے جو حروفِ تہجی کا سب سے پہلا حرف ہے۔ اسی طرح "لام" اس "لام" کا نام ہے جو حروفِ تہجی میں سے ایک حرف ہے۔) اور حروفِ مقطعات سے مقصود مخاطبین کو یہ باور کروانا ہے کہ یہ کلامِ الٰہی جس کا مقابلہ کرنے اور اس کا مثل لانے سے تم سب عاجز آ چکے ہو، یہ ان ہی حروفِ تہجی سے مل کر بنا ہے جو تمھارے نزدیک مشہور و معروف ہیں۔ سو قرآن کا دار و مدار بھی ان ہی حروف پر ہے اور قرآن کا کوئی حرف بھی ایسا نہیں جو ان حروف (حروفِ تہجی) سے خارج ہو۔

ان میں سے بعض کا کہنا ہے: ان حروفِ مقطعات سے مراد ایک سورت کے اختتام اور دوسری سورت کے شروع ہونے پر دلالت کرنا مقصود ہے۔

اور بعض کا کہنا ہے: ان حروفِ مقطعات سے مقصود ان کے ذریعے سے قسم کھانا ہے تاکہ ان کے شرف و فضل کو ظاہر کیا جا سکا

کیوں کہ یہ ایک اینٹ کی حیثیت رکھتے ہیں جب کہ پوری کتاب ایک عمارت کی مانند ہے۔

بعض کا کہنا ہے: ان حروفِ مقطعات سے مقصود حضرت محمد ﷺ کی نبوت کو بیان کرنا ہے بایں طور پر کہ نبی کریم ﷺ نے ان حروف کو جدا جدا بے انتہا حسنِ ادائیگی کے ساتھ اُدا کر کے دِکھایا۔ حالاں کہ آپ ﷺ اُمّی تھے اور پڑھنا لکھنا کسی سے نہ سیکھا تھا۔ اور یہ تو معروف ہے کہ حروف کو علیحدہ علیحدہ حسنِ ادائیگی کے ساتھ تلفظ کرنا کسی ماہر قاری ہی کا کام ہے۔ کیوں کہ اُمّی شخص تو ان کو نہ جانتا ہے اور نہ ہی پڑھ سکتا ہے۔ (ہم اپنے مشاہدہ میں بھی بار ہا دیکھتے ہیں کہ کوئی ایسا شخص جس نے پڑھنا لکھنا نہ سیکھا ہو وہ پنجابی یا اُردو تو بڑی روانی سے بول لے گا مگر اس سے حروفِ تہجی سن لیں یا یہ کہ یہ الفاظ کیسے بنے، اس کو کچھ پتا نہ ہوگا۔) پس آپ ﷺ کا ان حروف کو پڑھنا اور صحیح طریقے سے پڑھنے کا حق اُدا کر دینا مشرکینِ مکہ کے سامنے ایک واضح و روشن دلیل تھی کہ یہ قرآن نبی کریم ﷺ اپنی طرف سے نہیں لائے بلکہ یہ تو اِلقاء کیا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جو حکیم اور علیم ہے۔

بعض کا کہنا ہے: حروفِ مقطعات سے مقصود سامعین کو متوجہ اور بیدار کرنا ہے۔ بایں طور پر کہ کلام کی ابتدا میں ایسے حروف لا کر ان کی سماعت کو کھٹکھٹایا جائے تا کہ اُن کے دِلوں میں سمجھنے اور اس امرِ غریب کو جاننے کا داعیہ پیدا ہو۔ اور یہ داعیہ انؔ کو اس پر اُبھارے کہ وہ توجہ اور بیداری کے ساتھ آگے آنے والے کلام میں غور و فکر کریں۔ پس یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آج کل ماڈرن ایجوکیشن سسٹم میں ہوتا ہے کہ لیکچر کی ابتدا میں لیکچر سے متعلق چند اِشارات دیے جاتے ہیں تا کہ سُننے والوں میں جستجو اور طلب پیدا ہو جائے اور وہ شوق و ذوق اور توجہ سے پورا لیکچر سُنیں۔

ان میں سے بعض نے کہا: ان حروف سے مقصود مشرکینِ مکہ کی قرآن بیزاری والی خصلت کو دور کرنا اور انھیں قرآن کو کان لگا کر سُننے پر آمادہ کرنا ہے۔ کیوں کہ معروف ہے کہ دعوتِ اسلام کے ابتدائی دور میں اسلام کے دُشمن آپس میں ایک دوسرے کو کہتے تھے: ﴿لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝﴾ (حم السجدۃ:۲۶) ترجمہ: "اس قرآن کو سُنا ہی نہ کرو اور جب پڑھنے لگیں تو شور مچادِیا کرو تا کہ تُم غالب رہو۔" پس جب وہ سورتیں نازِل ہوتیں جن کی ابتدا میں حروفِ تہجی ہیں تو ان اعدائے اسلام کی سماعتوں پر دستک ہوتی کیوں کہ یہ ایسا انداز تھا کہ اس سے قبل وہ اس سے مانوس نہ تھے۔ لہٰذا وہ متوجہ ہوتے اور جیسے ہی ان حروف کے بعد آیاتِ بینات کا سلسلہ شروع ہوتا تو ان کے قلوب بے قابو ہو جاتے اور ان کی عقول اس فصیح اور بلیغ کلام کی طرف مائل ہو جاتیں۔ پھر ان میں سے جس کے ساتھ اللہ نے ہدایت کا اِرداہ کیا وہ یا تو فوری ایمان لے آیا یا پھر اللہ کی مشیت کے مطابق کچھ تاخیر سے ایمان لے آیا۔ پس اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے حجت قائم کی گئی اور ان کو سمجھانے کے مختلف طرق اختیار کیے گئے سو اب ان کا کوئی عذر قبول نہ کیا جائے گا نہ دُنیا میں اور نہ ہی آخرت میں۔

علامہ مرحوم الشیخ طنطاوی جوھری اپنی تفسیر میں سورۃ آلِ عمران کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"جان لیجیے کہ قرآن بھی آسمانی کتاب ہے۔ اور آسمانی کتابوں میں بعض اوقات کوئی بات صراحت کے ساتھ بتائی جاتی ہے اور بعض اوقات رُموز کے ذریعے۔ اور رمز یا اِشارہ مقاصدِ عالیہ، معانی اور معزز علامات میں سے ایک ہے۔ اور یہ رمز اور اشارے زمانۂ قدیم سے اہلِ دیانات میں رائج رہے ہیں۔ کیا آپ یہود کو نہیں دیکھتے کہ وہ اُس وقت یعنی ایامِ نبوت میں مدینہ منورہ اور مشرقی ممالک میں بکھرے ہوئے تھے اور کیسے ان اصطلاحات اور علامات کا آپس میں استعمال کرتے تھے؟ جو کہ آج ہمارے

دور میں حروف ابجد یا اعداد الجمل کے نام مشہور ہیں۔ پس وہ "الف" کو ایک، "باء" کو دو، "جیم" کو تین اور "دال" کو چار کے برابر قرار دیتے ہیں۔ اور اسی طرح حروف ابجد کی ترتیب کے مطابق حروف کو اعداد کے برابر قرار دیتے ہوئے "یا" کو دس اور "کاف" کو بیس کے برابر...... یہاں تک کہ "قاف" کو ایک سو اور "راء" کو دو سو...... اور "غین" کو ایک ہزار کے برابر قرار دیتے ہیں۔ آپ اس کی مزید تفصیل عنقریب جان لو گے۔

اور اسی طرح آپ اسکندریہ، مصر، بلادِ روم اور سوریا میں عیسائیوں کو دیکھ لیجیے، جو زمانۂ نزولِ قرآن میں مخصوص حروف دینی اور مذہبی رموز کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ جب کہ اُس وقت مصر میں یونانی زبان بطورِ سرکاری زبان رائج تھی۔ پس عیسائی لفظِ "إکسیس" کو اس جملے: "یسوع المسیح ابن الله المخلّص" کے لیے بطورِ رمز استعمال کرتے تھے۔ لفظِ "إکسیس" کی تفصیل یہ ہے کہ إکسیس میں سے "الف" لفظِ "إیسوس" کا پہلا حرف ہے۔ ("إیسوس" کا معنیٰ یسوع ہے)۔ اور "ک" لفظِ "کرستوس" کا پہلا حرف ہے۔ ("کرستوس" کا معنیٰ المسیح ہے۔) اور "إکسیس" کا پہلا "سین" اصل میں "ثاء" تھا جو کہ نطق میں سین سے تبدیل ہو گیا اور یہ لفظِ "ثیو" کا پہلا حرف ہے۔ ("ثیو" کا معنیٰ الله ہے)۔ اور "یا" دلالت کرتا ہے "اَیوث" پر اور "اَیوث" کا معنیٰ ہے "ابن"۔ اور "إکسیس" کا دوسرا "سین" بھی "ثاء" سے مبدّل ہے جس سے لفظِ "ثوتیر" کی طرف اشارہ ہے۔ اور "ثوتیر" کا معنیٰ ہے المخلّص۔ اور ان تمام کلمات کا مجموعہ ہوا: "یسوع المسیح ابن الله المخلّص۔" اور لفظِ "إکسیس" اتفاق سے دلالت کرتا ہے "سمکۃ" (یعنی مچھلی) کے معنیٰ پر۔ آخر کار لفظِ "السمکۃ" (مچھلی) ان لوگوں کے نزدیک ان کے معبود کے لیے "رمز" قرار پایا۔

ملاحظہ کیجیے کہ وہ کیسے ایک حرف کے ذریعے اَسماء سے رمز کی طرف منتقل ہوئے اور حرف کی رمز کے ذریعے جانور کی رمز کی طرف جو دلالت کرتی ہے بہت سارے حروف پر، منتقل ہوئے۔ ایک انگریزی پوپ صموئیل مونج کہتا ہے: رومیوں کی قبروں میں کثیر تعداد میں لکڑی اور ہڈیوں سے بنی ہوئی مچھلیوں کی چھوٹی چھوٹی تصویریں پائی گئی تھیں۔ وہ سارے کے سارے مسیحی تھے اور آپس میں تعارف کے طور پر مچھلیوں کی تصاویر کا استعمال کرتے تھے۔"

پس یہی اَنداز اُن اقوام کی فطرت میں شامل تھا جو بلادِ عرب پر چھائی ہوئی تھیں اور عرب میں گھل مل گئی تھیں۔ قرآنِ مجید چوں کہ تمام انسانوں کے لیے نازل ہوا ہے خواہ وہ عرب ہوں یا عجم۔ اس لیے لازم تھا کہ قرآنِ مجید میں وہ منہج و انداز بھی اختیار کیا جائے جس سے دوسری اقوام بھی لذت محسوس کریں اور اس میں وہ چیزیں بھی ہوں جس سے دوسری اُقوام مانوس ہیں۔ اور عنقریب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ قرآنی سورتوں کے اوائل میں موجود رموز اور یہود و نصاریٰ کی رموز و حساب الجمل وغیرہ میں کوئی نسبت وعلاقہ نہیں سوائے اس کے کہ جو نسبت ہوتی ہے ایک عقل مند آدمی اور ناسمجھ بچے کے علم میں یا علماء اور عوام الناس کے علم میں۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ کے سامنے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ یہود و نصاریٰ نے کچھ رموز متعین کر رکھی تھیں۔ اور یہود کی رموز درحقیقت حساب الجمل (حروفِ ابجد) پر مبنی تھیں۔

حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سورۃ البقرۃ: ﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ (البقرۃ:) کی تلاوت فرما رہے تھے کہ اسی اثنا میں ابو یاسر بن اخطب وہاں سے گزرا۔ پھر اس کے بعد اس کا بھائی حُیی ابن اخطب اور کعب بن اشرف بھی آ گئے۔ ان تینوں نے آپ ﷺ سے "الٓمّٓ" کے بارے میں پوچھا اور عرض کیا کہ ہم آپ

کو اس اللہ کا واسطہ دیتے ہیں کہ جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں کیا یہ آیت اسی طرح آسمان سے آپ پر نازل ہوئی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں بالکل اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ تو حُیی بولا: اگر آپ سچے ہیں تو میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ آپ کی اُمت کی مدت انتہا چند ہی سال ہے۔ پھر وہ (تینوں) کہنے لگے (ایک روایت کے مطابق یہودیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے) کہ ہم ایسے شخص کے دین میں کیوں کر داخل ہوں جس کی اُمت کے ختم ہونے کی مدت حساب الجمل کے مطابق صرف اکہتر سال ہے۔ آپ ﷺ یہ سُن کر مسکرا دیے۔ حُیی مزید بولا: کیا اس کے علاوہ (اس کے مثل) کوئی اور آیت بھی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! "الٓمٓصٓ"۔ یہ سُن کر حُیی نے کہا: یہ تو پہلی آیت سے بھی بڑی (لمبی) ہے۔ اس طرح تو "ایک سو اکسٹھ سال" ہو گئے۔ کیا اس کے علاوہ کوئی اور آیت بھی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! "الٓرٰ"۔ اب حُیی کہنے لگا: یہ تو پہلی اور دوسری آیت سے بڑی اور لمبی ہے۔ اگر آپ سچے ہیں تو ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ کی اُمت کی مدتِ انتہا "دو سو اکتیس سال" سے زیادہ نہیں ہوگی۔ پھر کہنے لگا، کیا اس کے علاوہ کوئی اور آیت بھی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! "الٓمّٓرٰ"۔ یہ سُن کر حُیی نے کہا (ایک روایت کے مطابق یہودیوں کے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا): ہم گواہی دیتے ہیں کہ ہم یقین کرنے والوں میں سے نہیں ہیں اور نہ ہی ہم یہ جانتے ہیں کہ آپ کے اَقوال میں سے کس قول کو اختیار کریں۔ اس کے بعد حُیی کا بھائی ابو یاسر بن اخطب بولا: میری بات سُنو! میں گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے انبیاء نے ہمیں اس اُمت کی بادشاہت سے متعلق خبر دی تھی لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کتنا عرصہ رہے گی۔ اگر محمد (ﷺ) اپنی باتوں میں سچے ہیں تو میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کو یہ سب کچھ ملے گا (یعنی حساب الجمل کے مطابق الٓمّٓ، الٓمٓصٓ، الٓرٰ اور الٓمّٓرٰ میں بیان کردہ تمام مدتیں یکجا ملیں گی جن کا مجموعہ سات سو چونتیس سال بنتا ہے۔) یہ سُن کر یہود کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے ہمارے لیے آپ کا سارا معاملہ ہی مشتبہ ہو چکا اور اب ہم نہیں جانتے کہ ان مدتوں میں سے قلیل کو لیں یا کثیر کو؟

ان ساری باتوں سے عاقل و ذکی سمجھ چکا ہو گا کہ حساب الجمل (اعداد الجمل) یہود کے نزدیک تعارف و پہچان کا ذریعہ تھے۔ نیز حساب الجمل رموزِ حرفیہ کی ایک نوع ہے۔ لہٰذا لازم ہو چکا تھا کہ قرآنِ مجید میں حروفِ مقطعات کو نازل کیا جاتا تاکہ دیگر مذاہب کے لوگ بھی قرآن کی طرف متوجہ ہوں اور ان حروف کو سمجھنے میں اپنی سوچ و فکر کو صرف کریں۔

میں نے جن طرق میں ان حروف (حروفِ مقطعات) میں موجود رُموز سے متعلق کچھ پڑھا ہے۔ میں ان میں سے صرف تین طریقے آپ کے سامنے بیان کروں گا۔

طریقہ اولیٰ ۞ یہ حروف اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے ٹکڑے ہیں۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ "الٓمّٓ" میں سے الف سے "آلاءُ اللّٰہ" لام سے "لُطفُ اللّٰہ" اور میم سے "مُلکُ اللّٰہ" مراد ہے۔ اور آپ رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے: "الٓرٰ" اور "حٰمٓ" اور "نٓ" کا مجموعہ "الرَّحمٰن" بنتا ہے۔ اور آپ رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے: "الٓمّٓ" کا معنیٰ ہے "اَنَا اللّٰہُ اَعۡلَمُ" (میں ہی اللہ ہوں میں زیادہ جانتا ہوں۔) اور اسی طرح ہے تمام فواتح (حروفِ مقطعات) میں۔ آپ رضی اللہ عنہما ہی سے مروی: "الٓمّٓ" میں الف سے "اللہ" لام سے "جبرئیل" اور میم سے "محمد ﷺ" مراد ہیں اور مطلب اس کا یہ ہے کہ قرآنِ مجید نازل کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرتِ جبرائیل علیہ السلام کی لسان کے ذریعے حضرتِ محمد ﷺ پر۔

میں کہتا ہوں کہ حضرتِ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ان تمام روایات سے یہ مراد واضح ہوتی ہے کہ حروفِ مقطعات میں سے اکثر اللہ

عزوجل کی یاد دلانے والے ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہر شے سے افضل ہے۔ اور جس طرح اسکندریہ اور روم میں نصاریٰ کی مقرر کردہ رمزیں ان کے معبودانِ کی طرف راجع تھیں اسی طرح (مسلمانوں کے نزدیک) ان حروف میں اللہ تعالیٰ کے اسماء بطورِ رمز پائے جاتے ہیں۔ لیکن لازم ہے کہ یہاں کچھ ایسا ہو جو اعلیٰ اور اجل ہو (یعنی کسی ایسی توجیہہ کا بیان ہو جس سے قرآنِ مجید کی عظمت و وقار مزید ظاہر ہو اور لوگوں کا اس کے مثل کلام لانے سے عاجز آ جانا اور بھی زیادہ واضح ہو جائے۔)

مزید طریقہ ثانیہ ۞ حروفِ مقطعات رسول اللہ ﷺ کی صداقت کے دلائل اور معجزات میں سے حیران کن دلیل اور معجزہ ہیں۔ اور یہی وہ توجیہہ ہے جس کو انسانی نفوس پسند کرتے ہیں۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ حروفِ تہجی کو درست تلفظ کے ساتھ صرف وہی پڑھ سکتا ہے جس نے پڑھنا لکھنا سیکھا ہو جب کہ نبی ﷺ نے امی ہونے کے باوجود ان حروف کو پڑھا ہے۔

سورتوں کے شروع میں آنے والے حروف (فواتح السور) کی کل تعداد چودہ ہے جو کہ کُل حروفِ تہجی کی تعداد کا نصف ہے بشرطیکہ سب سے پہلے حرف "الف" کو شمار نہ کیا جائے۔ اور چودہ حروف انتیس سورتوں کی ابتدا میں آئے ہیں۔ اور انتیس کا عدد کُل حروفِ تہجی کی تعداد کے برابر ہے بشرطیکہ "الف" کو شمار کیا جائے۔ اور حروفِ مقطعات میں سے پانچ حروف ایسے ہیں جو حروفِ مہموسہ میں سے ہیں۔ جب کہ کُل حروفِ مہموسہ کی تعداد دَس ہے۔ اس طرح حروفِ مقطعات میں سے حروفِ مہموسہ کو الگ کیا جائے تو وہ کُل حروفِ مہموسہ کا نصف ہوں گے۔ حروفِ مہموسہ کا مجموعہ "فحثه شخص سكت" ہے۔ اور حروفِ مقطعات میں موجود حروفِ مہموسہ یہ ہیں: حاء، ھاء، صاد، سین، کاف۔

آپ کو معلوم ہے کہ حروفِ تہجی دو ہی طرح کے ہیں مہموسہ یا مجہورہ۔ مہموسہ سے متعلق اوپر گزر چکا اور مجہورہ سے متعلق اب جان لیجیے۔ حروفِ مجہورہ کی کُل تعداد اٹھارہ ہے۔ اور اٹھارہ کا نصف "نو" ہے اور یہ "نو" کے "نو" فواتح السور یعنی حروفِ مقطعات میں موجود ہیں۔ جن کا مجموعہ ہے: "لن يقطع أمر۔"

حروفِ شدیدہ کُل آٹھ ہیں۔ مجموعہ ان کا "اجدت طبقك" ہے۔ آٹھ کا نصف چار ہوتا ہے اور یہ چاروں فواتح السور میں پائے جاتے ہیں جن کا مجموعہ "أقطك" ہے۔ اور حروفِ رخوہ کی کُل تعداد بیس ہے۔ بیس کا نصف دَس ہے اور یہ دَس بھی فواتح السور (حروفِ مقطعاتُ) میں موجود ہیں جن کا مجموعہ "خمس على نصره" ہے۔

حروفِ مطبقہ کی کُل تعداد چار ہے۔ یعنی صاد، ضاد، طاء، ظاء۔ مجموعہ ان کا "صطظض" ہے۔ چار کا نصف "دو" ہے اور یہ دونوں حروفِ مقطعات میں موجود ہیں یعنی: صاد اور طاء۔

حروفِ مطبقہ کے علاوہ باقی تمام حروف "حروفِ منفتحہ" کہلاتے ہیں۔ ان کی کُل تعداد چوبیس ہے۔ اور چوبیس کا نصف بارہ بنتا ہے اور یہ بارہ کے بارہ فواتح السور میں مذکور ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں کہ کیسے ان فواتح میں حروفِ تہجی میں سے (الف کو شمار کیے بغیر) نصف حروف استعمال ہوئے ہیں اور پھر کیسے ان حروفِ مقطعات کو انتیس سورتوں کی ابتدا میں لایا گیا ہے جب کہ الف کے ساتھ حروفِ تہجی کی تعداد بھی انتیس ہے۔ اور پھر کیسے خوب صورتی کے ساتھ حروفِ مہموسہ میں سے نصف، حروفِ مجہورہ میں سے نصف، حروفِ شدیدہ میں سے نصف، حروفِ رِخوہ میں سے نصف، حروفِ مطبقہ میں سے نصف اور حروفِ منفتحہ میں سے بھی نصف نصف حروف کو ان فواتح میں استعمال کیا گیا ہے!(یہ سب محض

اتفاق نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ عالیہ اور قرآنِ پاک کے معجزاتِ ظاہرہ میں سے ایک ہے۔ اور شاید یہ بھی اُن وجوہ میں سے ایک ہے جس کی بنا پر اہلِ عرب و عجم قرآن کا مثل لانے سے عاجز آ گئے۔)

علمائے کرام نے اس مقام پر جو ابحاث بیان کی ہیں، میں نے ان میں سے بہت قلیل آپ کے سامنے بیان کی ہیں۔ اور میں نے قصداً طوالت اختیار نہیں کی تا کہ لوگ اکتاہٹ کا شکار نہ ہو جائیں۔ اور میں نے طریقۂ ثانیہ میں صرف اتنا ہی مواد بیان کیا ہے جو آپ کو یہ سمجھانے کے لیے کافی ہو جائے کہ حروفِ مقطعات کیسے ان اوصافِ عالیہ کے حامل ہیں اور کیسے ان حروفِ مقطعات کو اس خاص نظام و سسٹم کے تحت لایا گیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر کسی سیکھنے والے سے حروفِ تہجی میں سے اس منصفانہ انداز (نصف نصف کرنے) کے ساتھ حروف لانے کو کہا جائے تو وہ ایسا کرنے کی استطاعت نہیں رکھے گا۔ کیوں کہ اگر وہ حروفِ مطبقہ میں سے نصف حروف کو مدِ نظر رکھے گا تو حروفِ شدیدہ کی رعایت کیسے رکھ پائے گا؟ اور اسی تناسب کے ساتھ حروفِ مجہورہ میں سے نصف حروف کے رعایت کیسے رکھ پائے گا؟ اور یہ تمام دلائل ہیں رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر۔ نیز اس صورت (طریقۂ ثانیہ) سے حاصل ہونے والے فوائد زیادہ اہم ہیں پہلی صورت (طریقۂ اوّل) سے۔ کیوں کہ پہلی صورت (طریقۂ اوّل) میں اَسمائے الٰہیہ کے واسطے سے تذکیرِ انسان کا فائدہ حاصل ہو رہا تھا جب کہ دوسری صورت (طریقۂ ثانیہ) میں انسانی عقول کو کلامِ الٰہیہ کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے عالَمِ حیرانی میں عاجز قرار دینے کے فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔

حروفِ مقطعات میں حروفِ تہجی اور اس کی انواع (مہموسہ و شدیدہ وغیرہ) کی نصف نصف والی تقسیم کو دیکھ کر یہ بات اور بھی زیادہ پختہ ہو جاتی ہے کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہے کیوں کہ ایامِ نبوت میں پوری دنیا میں کوئی ایک شخص بھی ان انواع سے واقف نہیں تھا۔ اور جب طویل زمانہ گزرنے کے بعد یہ اصطلاحات ظاہر ہوئیں تو ان کا نصف نصف ہونا بالکل اس تقسیم کے موافق تھا جو ایامِ نبوت میں نازل ہونے والے حروفِ مقطعات میں تھی۔

بلکہ اس تقسیم کے عجیب اور حیران کن ہونے کی وجہ سے عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ آج بھی (جب کہ یہ اصطلاحات معروف و مشہور ہیں) کوئی ان اصطلاحات کی اس طرح سے منصفانہ تقسیم کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ پس ثابت ہوا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ نیز ان اصطلاحات کے بعد میں ظہور کی وجہ سے قرآن کے منزل من اللہ ہونے کے نظریے کو مزید تقویت ملتی ہے۔

طریقۂ ثالثہ ✿ اللہ تعالیٰ نے اس سارے عالَم کو ایک مضبوط نظام اور مناسب یکسانیت کے ساتھ پیدا فرمایا ہے۔ قرآنِ مجید ایک آسمانی کتاب ہے اور اللہ کے بنائے گئے نظام کے عین مطابق، اُس کی صفتِ ابداع کے بالکل موافق اور اس کے مقررہ منہج پر رواں دواں ہے۔ اور قرآن کی یہ صفات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ کتاب اللہ ہی کی جانب سے ہے۔ کیوں کہ اگر کوئی آسمانی کتاب اللہ کے مقررہ منہج کے مخالف ہو، اُس کے اَفعال سے منافر ہو اور اس کے طریقوں سے منحرف ہو تو وہ کتاب آسمانی کتاب نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وہ ایک من گھڑت، خود ساختہ، نقل شدہ اور کذب سے بھرپور ہو گی۔ جیسا کہ اِرشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ (النساء: ۸۲)

"اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں وہ بہت سا اختلاف پاتے۔"

الف کو شمار کیے بغیر حروفِ تہجی کی تعداد اٹھائیس ہے۔اور عالم گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اٹھائیس کے عدد کو پورے عالم میں جابجا استعمال کیا ہے۔ذیل میں چند مثالیں لکھی گئی ہیں جن میں اٹھائیس کا عدد موجود ہے۔

① دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے جوڑ اٹھائیس ہیں۔یعنی ہر ہاتھ میں چودہ جوڑ

② انسان کی کمر کی ہڈی میں کُل اٹھائیس مہرے (ہڈیوں کے جوڑ جو کہ موتیوں کی مالا کی طرح آپس میں جُڑے ہوتے ہیں) ہیں۔ چودہ اوپر والے حصے میں اور چودہ ہی نیچے والے حصے میں۔

③ تمام وہ جانور جو مکمل جسم رکھتے ہیں جیسے گائے، اونٹ، گدھے، درندے اور وہ تمام حیوانات بھی جو بچے دیتے ہیں، اُن سب کی کمر کی ہڈی میں بھی اٹھائیس مہرے ہی ہیں۔چودہ صُلب کے آخری حصے میں اور چودہ ہی بدن کے پچھلے حصے میں۔

④ اُڑتے وقت پرندے اپنے بازوؤں میں سے جن پروں پر اعتماد کرتے ہیں، اُن پروں کی تعداد بھی ایک بازو میں چودہ ہے اور دونوں بازوؤں کو ملا کر اٹھائیس ہو گئے۔

⑤ لمبی دُم والے جانور مثلاً گائے اور درندے وغیرہ کی دُم میں بھی باریک باریک ہڈیوں کے اٹھائیس جوڑ ہیں۔

⑥ طویل خلقت والے جانور مثلاً مچھلیاں، سانپ اور بعض حشرات کی ریڑھ کی ہڈی میں بھی اٹھائیس جوڑ ہوتے ہیں۔

⑦ لغتُ العرب جو کہ اتمُّ اللُّغات ہے، کے کُل حروف کی تعداد بھی اٹھائیس ہے۔

اور ان اٹھائیس حروف میں سے چودہ ایسے ہیں جو لامِ تعریف میں مدغم ہو جاتے ہیں۔وہ یہ ہیں: ت ث د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ل ن چودہ ایسے ہیں جن کا لامِ تعریف میں ادغام نہیں ہوتا۔وہ یہ ہیں: أ ب ج ح خ ع غ ف ق ك م ه و ی۔

⑧ قلم کے ساتھ لکھے جانے والے حروف کی دو قسمیں ہیں۔پہلی قسم وہ جو منقوط ہیں اور ان کی تعداد بھی چودہ ہے۔دیکھیے: ب ت ث ج خ ذ ز ش ض ظ غ ف ق ن۔دوسری قسم وہ جو غیرِ منقوط ہیں اور ان کی تعداد بھی چودہ ہے۔دیکھیے: اَح د ر س ص ط ع ک د ھ ل م لا۔غیرِ منقوط حروف میں سے آخری حرف اصل میں حرفِ علت "الف" ہے اور سب سے پہلا حرف "ہمزہ" ہے۔پس اس طرح یہ بھی چودہ حروف ہی ہوئے۔اور باقی رہا "یاء" تو یہ منقوط بھی ہے اور غیرِ منقوط بھی۔اس طرح کہ اگر یہ وسطِ کلمہ میں آئے تو منقوط ہوگا اور اگر آخر میں آئے تو غیرِ منقوط۔لہٰذا نقطوں والے حروف بھی چودہ ہی ہوئے اور بغیر نقطوں والے بھی۔ اور انتیسواں حرف منقوط بھی ہے اور غیرِ منقوط بھی تاکہ تقسیم میں عدل رہے (اگر انتیسواں حرف صرف منقوط یا صرف غیرِ منقوط ہوتا تو تقسیم میں عدل باقی نہ رہتا۔) اور اس عدل کی فضیلت اس حکیم ذات کے لیے ہے جس نے عربی حروفِ تہجی وضع کیے۔

⑨ چاند کی منازل بھی اٹھائیس ہیں۔چودہ بُرجِ شمالی میں اور چودہ بُرجِ جنوبی میں۔ان تمام مثالوں کا حاصل یہ ہی ہے کہ تمام موجودات جن میں اٹھائیس کا عدد ہے ان کی دو قسمیں ہیں جن میں سے ہر ایک چودہ پر مشتمل ہے۔پس اسی طرح قرآنِ مجید میں جو حروفِ عربیہ آئے ہیں وہ بھی دو قسم پر ہیں۔ان میں سے ایک قسم چودہ حروف پر مشتمل ہے اور وہ فواتح السور میں استعمال ہوئی ہے اور دوسری قسم بھی چودہ حروف پر مشتمل ہے لیکن وہ فواتح السور میں استعمال نہیں ہوئی۔گویا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں: اے میرے بندو! بے شک چاند کی اٹھائیس منازل ہیں اور دو قسموں پر مشتمل ہیں۔ہاتھوں کے جوڑ بھی اٹھائیس ہیں اور دو قسموں (حصوں) پر مشتمل ہیں۔اسی طرح وہ حروف جن کا ادغام لامِ تعریف میں ہوتا ہے اور وہ حروف جو قلم کے ذریعے لکھے جاتے ہیں اُن میں

سے ہر ایک چودہ ہیں اوران کے اضداد بھی چودہ ہیں۔ پس اے میرے بندو! ان سب مثالوں کو سمجھو اور جان لو کہ یہ قرآن بھی میری طرف سے نازِل کردہ ہے۔ کیوں کہ میں نے ہی اس قرآن کے حروف کو پرونے میں وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو منازِل قمر، اَجسامِ انسانیہ، اَجسامِ حیوانیہ اور حروفِ تہجی کے نظام کو وجود میں لانے کے لیے اختیار کیا تھا۔ پس کوئی بشر جیسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے علاوہ کوئی اور کیسے اور کیوں کر اس نظام کو وجود میں لا سکتا ہے اور حروف کے ان اعداد و شمار کو میرے وضع کردہ نظام، میرے رسم کردہ طریقوں اور میرے جاری کردہ نہج کے مطابق کیسے بنا سکتا ہے؟ بے شک یہ قرآن میری ہی طرف سے نازِل کردہ ہے اور میں نے ہی ان حروف کو اوائل السور میں رکھا ہے تاکہ تم ان سے یہ حکمتیں اخذ کر سکو۔ سو تم جان لوگے کہ میں نے آسمان و زمین اوران کے مابین جو کچھ ہے بے فائدہ پیدا نہیں کیا۔ بلکہ عالَم اور وحی میں ایک خاص نظام مقرر کیا ہے۔ کیوں کہ اس کتاب (قرآنِ مجید) نے زمانے کی انتہا تک باقی رہنا ہے۔ اور اس کی لغت بھی اس کے ساتھ ہی باقی رہے گی۔ پورے عالَم میں کوئی ایک لغت بھی ایسی نہیں ہے جو تغیر سے محفوظ رہی ہو سوائے اس لغت کے جس کا محافظ دین ہو۔ اور لغتِ عَربیہ کے علاوہ کوئی بھی ایسی لغت نہیں جس کی حفاظت دین نے کی ہو۔

اب! آپ پر یہ اَمر مخفی نہیں رہا کہ فواتح السور سے متعلق دونوں آراء میں سے دوسری رائے شبہات کو ختم کرنے میں پہلی رائے سے نسبتاً زیادہ بلیغ و مفید ہے۔ کیوں کہ یہ رائے لوگوں کے گمان کردہ اس وہم کہ فواتح السور کا کوئی معنیٰ و مفہوم نہیں ہے، کی جڑ ہی کو ختم کر دیتی ہے اور سابقہ وجوہ میں بیان کردہ معانی و مفاہیم کو مزید پختہ و مقرر کر دیتی ہے۔ اور اگر اب بھی کوئی شخص حروفِ مقطعات کے معانی کو سمجھ نہ پائے تو یہ قرآن میں عیب شمار نہیں ہوگا بلکہ اُس کم فہم شخص کی استعداد میں عیب گردانا جائے گا۔ کیوں کہ کتابُ اللہ میں جیسے خواص کو مخاطب کیا گیا ہے بالکل اسی طرح عوام کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ قرآن میں ایسے اَلفاظ ہوں جن کو خاص خاص لوگ سمجھ سکیں اور عوام ان کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ (یعنی کوئی بھی شخص جس میں سمجھنے بوجھنے صلاحیت ہو وہ قرآن کو سمجھ سکتا ہے۔)

فواتح السور سے متعلق دونوں آراء سے آپ کے سامنے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ قرآنِ مجید میں ان اَلفاظ (حروفِ مقطعات) کا شامل ہونا نہ ہی تو کسی لغو کلام کے قبیل سے ہے، نہ ہی یہ ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ قرآنِ کریم عمیق و مخیف چیزوں کا مظہر ہے، نہ ہی یہ کہ یہ حروف قرآن کا حصہ نہیں تھے بلکہ زمانوں کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا قرآن کے ساتھ الحاق ہوتا گیا اور نہ ہی یہ کہ یہ حروف ہذیان کا ثمرہ ہیں (نعوذ باللہ)۔ بلکہ فواتح السور تو یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے من عند اللہ ہونے کی کوئی نفی نہیں کر سکتا۔ برابر ہے کہ فواتح السور کا معنیٰ ظاہر ہو یا ظاہر نہ ہو اللہ تعالیٰ کی ان حکمتوں کی بنا پر جو ان حروف کو لانے میں ہیں اور جن کو ہم بیان کر چکے ہیں۔ اور اللہ ہی حکمتوں والا اور علم والا ہے۔

چھٹا شبہ کہتے ہیں: قرآن کی قسم مکی (مکی سورتیں و آیات) اَدِلّہ اور براہین سے خالی ہیں۔ بخلاف قسم مدنی کے، کہ مدنی سورتیں و آیات دلائل سے بھری ہوئی ہیں اور حجج و براہین کے ذریعے مضبوط ہیں۔ یہ ایک نئی دلیل ہے اس پر کہ حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس ماحول میں رہے، اس سے اثر قبول کیا۔ (یعنی جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے ماحول میں تھے تو مکہ کے لوگ زیادہ ثقافت یافتہ نہ تھے اور دلائل و حجتوں کی راہ سے واقف نہ تھے اس لیے مکی حصہ دلائل و براہین سے خالی ہے۔ جب کہ اہلِ مدینہ مہذب اور ثقافت یافتہ تھے اس لیے مدینہ میں آنے کے بعد نازِل ہونے والی آیات و سورتوں نے اس اَثر کو قبول کیا اور ان میں دلائل و براہین

شامل ہو گئیں)۔

چھٹے شبہ کا جواب

① جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ اگر قرآن اس ماحول سے تاثر کا نتیجہ ہوتا جس ماحول میں حضور اکرم ﷺ رہ رہے تھے تو اس ماحول کے رہنے والے اس طعن کو پیش کرنے کے زیادہ حق دار ہوتے کیوں کہ وہ اس نقص کو سب سے زیادہ جاننے والے ہوتے۔ اور پھر وہ اس طعن کو پیش کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے اور وہ دعوتِ اسلام کو باطل کرنے کے لیے بڑے وسیع باب سے داخل ہوتے۔ خاص طور جب کہ رسول اللہ ﷺ کے مکہ اور مدینہ دونوں میں ایسے تلخ ترین دشمن پائے جاتے تھے جن کی دشمنی کا کوئی علاج نہ تھا۔ (لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا یعنی ان دونوں ماحولوں میں رہنے والوں میں سے کسی نے بھی یہ اعتراض نہ کیا کہ مکی آیات تو دلائل سے عاری ہیں جب کہ مدنی آیات دلائل سے بھری ہوئی کیوں ہیں؟)

② اگر یہ بات صحیح ہوتی تو (نعوذ باللہ) حضور اکرم ﷺ کی نبوت ضرور باطل ہو چکی ہوتی۔ اور اہلِ مکہ و مدینہ کے حق میں نبوت کا ثابت ہونا صحیح ہوتا کیوں کہ اس اعتبار سے تو وہ ہی اس کا مصدر تھے اور وہ ہی اس معاملے میں حضورِ اکرم ﷺ کے استاد تھے (نعوذ باللہ)۔ یہ جواب ان کے ماضی میں کیے جانے والے ساقط شدہ شبہات کے رد میں بھی دیا جا چکا ہے۔ اور وہ ساقط شدہ شبہات ایسے تھے جو دلالت کرتے تھے اُن کی فسادِ فطرت، حقیقت و تاریخ سے دوری و نابلدی اور گھٹیا سوچ پر۔

③ اس شبہ میں ان کا جھوٹ چھپا ہوا نہیں بلکہ بہت صریح اور واضح ہے کیوں کہ قسم مکی تو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و الٰہیت، رسول اللہ ﷺ کی رسالت و نبوت اور آخرت و قیامت سے متعلق اسلامی عقیدے پر مضبوط ترین دلائل اور عظیم حجتوں سے لبریز ہے۔ سورۃ المؤمنون جو کہ مکی ہے کو غور سے سنیے کہ وہ کیسے توحید کی بنیادوں کو بلند و مضبوط، جب کہ شرک کی اساس کو کمزور کر رہی ہے۔

﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ۝﴾ (المؤمنون:۹۱)

"اللہ نے نہ تو کسی کو اپنا بیٹا بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے۔ ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی اپنی مخلوقات کو لے کر چل دیتا اور ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتا۔ یہ لوگ جو کچھ اللہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں اللہ اس سے پاک ہے۔"

سورۃ الانبیاء میں دیکھیے یہ سورت بھی مکی ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ۝ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء:۲۲-۲۴)

"اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین اور آسمان درہم برہم ہو جاتے۔ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں تو اللہ جو مالک عرش ہے ان باتوں سے پاک ہے۔ وہ جو کام کرتا ہے اس کی پرسش نہیں ہو گی اور جو کام یہ لوگ کرتے ہیں اس کی ان سے پرسش ہو گی۔ کیا لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اور معبود بنا لیے ہیں کہہ دو کہ اس بات پر اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ میری اور

میرے ساتھ والوں کی کتاب بھی ہے اور جو مجھ سے پہلے پیغمبر ہوئے ہیں، ان کی کتابیں بھی ہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ ان میں اکثر حق بات کو نہیں جانتے اور اس لیے اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

سورۃ العنکبوت جو کہ مکی ہے، میں دیکھیے کہ وہ کیسے نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلائل پیش کر رہی ہے:

﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (العنکبوت: ۴۸-۵۱)

"اور آپ (ﷺ) اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے ایسا ہوتا تو اہل باطل ضرور شک کرتے۔ بلکہ یہ روشن آیتیں ہیں۔ جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے ان کے سینوں میں محفوظ ہیں اور ہماری آیتوں سے وہ ہی لوگ انکار کرتے ہیں جو بے انصاف ہیں۔ اور کافر کہتے ہیں کہ اس کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نازل نہیں ہوئیں کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں۔ اور میں تو کھلم کھلا خبردار کرنے والا ہوں۔ کیا ان لوگوں کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ کچھ شک نہیں کہ مومن لوگوں کے لیے اس میں رحمت اور نصیحت ہے۔"

سورۃ قٓ جو کہ مکی ہے، کی درج ذیل آیات میں تدبر کیجیے، جو کہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر بطور دلیل قائم کی گئی ہیں۔

﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۝ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۭ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝﴾ (قٓ: ۹-۱۱)

"اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اُتارا اور اس سے باغ اُگائے اور کھیتی کا اناج۔ اور لمبے لمبے کھجور کے درخت جن کے خوشے تہہ بہ تہہ ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ بندوں کو روزی دینے کے لیے کیا ہے اور اس پانی سے ہم نے مردہ زمین کو زندہ کیا بس اسی طرح قیامت کے روز نکل پڑنا ہے۔"

﴿اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ۭ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝﴾ (قٓ: ۱۵)

"تو کیا ہم پہلی بار پیدا کر کے تھک گئے ہیں؟ نہیں! بلکہ یہ از سر نو پیدا کرنے کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔"

مکی سورتوں میں تو مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے اور جزا و سزا پر عقلی دلائل بھی قائم کیے گئے ہیں۔ دیکھیے سورۃ المؤمنون:

﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝﴾ (المؤمنون: ۱۱۵)

"کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے مقصد پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے؟"

﴿اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۭ لَا يَسْتَوٗنَ ۝ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۡ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (السجدۃ: ۱۸، ۱۹)

"بھلا جو مومن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو نافرمان ہو؟ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل

کرتے رہے ان کے رہنے کے لیے باغ ہیں۔ یہ مہمانی ان کاموں کی جزا ہے جو وہ کرتے تھے۔“

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ١ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ١ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ۠ وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ۠﴾ (الجاثیۃ: ۲۱، ۲۲)

”جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور عملِ نیک کرتے رہے اور ان کی زندگی اور موت یکساں ہوگی۔ یہ جو دعوے کرتے ہیں بُرے ہیں۔ اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت سے پیدا کیا ہے اور تا کہ ہر شخص اپنے اعمال کا بدلہ پائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

اور سورۃ الانعام جو کہ مکیہ ہے کی درج ذیل آیات پر غور کیجیے کہ ان میں کس طرح مشرکین کی دلیل کو رد اور باطل کیا گیا جو وہ اللہ کی مشیت کے حوالے سے پیش کرتے تھے۔

﴿سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكْنَا وَ لَاۤ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ١ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا١ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا١ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ۠ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ١ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِیْنَ۠﴾ (الانعام: ۱۴۸، ۱۴۹)

”جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا شرک کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ اسی طرح ان لوگوں نے تکذیب کی تھی جو ان سے پہلے تھے یہاں تک کہ ہمارے عذاب کا مزہ چکھ کر رہے۔ کہہ دو کیا تمھارے پاس کوئی سند ہے اگر ہے تو اسے ہمارے سامنے لاؤ۔ تم لوگ تو بس گمان کے پیچھے چلتے اور اٹکل کے تیر چلاتے ہو۔ کہہ دو کہ اللہ ہی کی حجت غالب ہے پھر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔“

آیاتِ بالا کے علاوہ اور بھی بہت سے دلائل و براہین ہیں جن سے مکی سورتیں اور آیات بھری ہوئی ہیں۔ لیکن اس قوم کا کیا علاج کیا جائے جس نے ہدایت کے بدلے گم راہی اور اندھے پن کو پسند کر لیا ہو اور کذب و افترا کی راہ پر چل پڑی ہو۔ ہم اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ وہ فتنوں کے شر سے ہمیں بچائے اور حق پر ثابت قدم رکھے۔ کیوں کہ تمام مخلوق کے قلوب اسی کے قبضے میں ہیں اور تمام معاملات اسی کی طرف سے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے:

”اللہ جسے چاہتا ہے (اس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے) گم راہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے، (اس کے اخلاص کی وجہ سے اُسے) سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔“ (الانعام: ۳۹)

بحث ⑧

جمع وتاریخ قرآن، شبہات ان کے جوابات، اور اس بارے وارد ہونے والی روایات کے چند نمونے

"جمع قرآن" کا لفظ کبھی تو حفظ فی الصدور یعنی زبانی یاد کرنے کے معنی پر بولا جاتا ہے۔ اور کبھی اس کا اطلاق قرآن کے تمام حروف، کلمات اور سور وآیات کی کتابت پر ہوتا ہے۔ یعنی جمع قرآن کا معنی کبھی ہوتا ہے حفظ فی السطور۔ چنانچہ "جمع قرآن" کا پہلا معنی ہوا قلوب وصدور میں قرآن کا جمع ہونا اور دوسرا معنی ہوا قرآن کو کاغذ پر لکھنا۔

پھر یاد رکھیں کہ جمع بمعنی کتابت، اسلام کے عہد اوّل میں تین مرتبہ ہوا ہے:

① عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ② دورِ خلافت صدیقی میں ③ دورِ خلافت عثمانی میں صرف اس آخری دور میں مصاحف تیار کر کے مختلف علاقوں میں بھیجے گئے تھے۔ اس موضوع پر چند شبہات وارد ہوئے ہیں جس کی حقیقت کو واشگاف کرنا بہت ضروری ہے۔ ہم جب صحیح علمی حقائق کی حرارت پیش کریں گے تو وہ شبہات خود ہی پگھل کر بے نام ونشان ہو جائیں گے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۗ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۝﴾ (الرعد: ۱۸)

"پھر جو جھاگ ہے وہ یونہی جاتا رہتا ہے اور جو لوگوں کو فائدہ دے وہ زمین میں ٹھہر جاتا ہے اسی طرح اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے۔"

جمع قرآن بمعنی حفظ فی الصدور

قرآن حکیم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش ابتداء میں یہ تھی کہ اسے زبانی یاد کر کے لوگوں کے سامنے تھوڑا تھوڑا کر کے پڑھا جائے تاکہ لوگ بھی اس کو حفظ کر کے یاد کر لیں، وجہ اس کی یہی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک امی نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور امیوں میں ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ (الجمعۃ: ۲)

"وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انہیں میں سے مبعوث فرمایا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور بے شک وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے۔"

ایک اُمی کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اہم امور میں اپنے حافظہ پر اعتماد کیا کرتا ہے اور اس کا استحضار اس کے لیے مدد

معاون ہوتا ہے، خصوصاً جب اسے ایسا قوت حافظہ بھی دیا گیا ہو جس کی بدولت اس کے لیے ان امور کو جمع کرنا اور ذہن میں محفوظ رکھنا آسان ہو، یہی صورت حال نزول قرآن کے وقت امت عزکیہ کی تھی کہ دیگر خصائص میں سے اسے سرعت حفظ اور ذہانت کی صلاحیت بھی عطا ہوئی تھی، حتیٰ کہ ان کے قلوب اور اذہان ایک کتاب اور رجسٹر کی مانند تھے جس میں وہ عرب کے انساب وایام اور دیگر اشعار ومفاخر کو محفوظ کر لیتے تھے، پھر جب قرآن آیا تو اس نے ان کی قوت بیانی کو مغلوب کیا اور ان کے جذبات پر اتنا اثر وغلبہ ڈالا اور اپنے لفظ ومعنی کے اعتبار سے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو متاثر کیا، چنانچہ جب انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ قرآن روحِ حیات ہے تو انہوں نے اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھال لیا۔

حضور اکرم ﷺ قرآن زبانی یاد کرنے کا خوب اہتمام فرماتے کہ آپ ﷺ نزول وحی کی شدت کو برداشت بھی کرتے اور ایسے سخت حالات میں بھی اپنی زبان مبارک کو جلدی سے ہلاتے تھے اور دوسری طرف جبریل علیہ السلام بھی وحی لے کر پوری قوت سے نزول فرماتے، رسول کریم ﷺ ان تمام امور کو اس لیے برداشت کرتے کہ قرآن جلدی سے ان کے سینہ مبارک میں محفوظ ہو جائے، کہیں اس کا کوئی کلمہ یا حرف چھوٹ نہ جائے، آپ ﷺ کی یہی حالت رہی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اطمینان دلایا اور وعدہ کیا کہ وہ خود قرآن کو آپ ﷺ کے سینہ میں جمع بھی فرما دے گا اور آپ ﷺ کے لیے اس الفاظ کا پڑھنا اور اس کے معانی کا سمجھنا آسان بھی کر دے گا۔ چنانچہ سورۃ القیامۃ میں فرمایا:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿١٦﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿١٧﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿١٨﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿١٩﴾﴾ (القیامۃ: ۱۶-۱۹)

نیز سورۃ طٰہٰ میں آپ ﷺ کو فرمایا:

﴿فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿١١٤﴾﴾ (طٰہٰ: ۱۱۴)

"پس اللہ عالی شان والا سچا اور حقیقی بادشاہ ہے۔ تو قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کر اس سے پہلے کہ تیری طرف جو وحی کی جاتی ہے وہ پوری کی جائے، ہاں یہ دعا کر کہ پروردگار میرا علم بڑھا۔"

اسی بناء پر آپ ﷺ کو جامع القرآن بھی کہا جاتا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے قلب مبارک میں قرآن کو جمع فرمایا اور اپنے عہد مبارک کے سید الحفاظ بھی کہا جاتا ہے، نیز قرآن کے تمام امور اور علوم احسن کی مسلمانوں کو حاجت ہوتی ہے۔ ان میں آپ ﷺ مرجع المسلمین بھی ہیں۔ آنحضرت ﷺ لوگوں کے سامنے قرآن پاک اپنے مولیٰ حقیقی کے حکم کے مطابق ٹھہر ٹھہر کر تلاوت فرماتے تھے۔ آپ ﷺ اسی قرآن کے ساتھ شب بیداری بھی کرتے، نمازوں کو زینت بخشتے، جبریل علیہ السلام ہر سال اس کا آپ ﷺ کے ساتھ دور بھی کرتے تھے، آخری سال حضور ﷺ نے دو مرتبہ ان کے ساتھ دور فرمایا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ہم نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

"جبریل علیہ السلام ہر سال ایک مرتبہ میرے ساتھ قرآن کا دور کرتے تھے، مگر اس سال دو مرتبہ میرے ساتھ دور کیا ہے، میرا

خیال ہے کہ میری اجل آ چکی تھی۔"①

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی یہی حال تھا کہ کتاب اللہ ان کی توجہ کا مرکز تھا، وہ قرآن کو حفظ کرنے کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے تھے، اس کے پڑھنے اور سمجھنے میں مقابلہ کیا کرتے تھے اور قرآن کی جتنی تعداد انہیں زبانی یاد ہوتی اس پر وہ ایک دوسرے پر فخر کیا کرتے تھے۔ بسا اوقات عورت اپنے نکاح کے مہر میں قرآن کی سورت کو مقرر کرتی کہ اس کا مہر یہ ہوگا کہ اس کا شوہر اسے قرآن کی سورت سکھائے گا۔ لوگ قیام لیل اور سحری کے وقت قرآن کی تلاوت کی لذت کی خاطر اپنی نیند کی لذت اور سونے کی راحت کو قربان کر دیا کرتے تھے۔ اور جب رات کو لوگ سو رہے ہوتے وہ نماز میں قرآن پڑھ رہے ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ جو شخص رات کے اندھیرے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے گھروں کے پاس سے گزرتا تو اسے شہد کی مکھی کی سی بھنبھناہٹ سنائی دیتی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قرآن سے ان کے جذبے اور لگاؤ کو پیدا کر دیا ہوا تھا کہ جو حصہ بھی قرآن کا رب تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں تک خود پہنچاتے اور جن کے گھر دور ہوتے ان کی تعلیم وقراءت کے لیے کوئی معلم بھیج دیا کرتے تھے۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے قبل اہل مدینہ کے لیے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا کہ وہ دونوں مدینہ منورہ جا کر وہاں کو قرآن کی تعلیم دیں اور اسلام کی تعلیمات سے روشناس کرائیں۔ اسی طرح معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ہجرت کے بعد مکہ مکرمہ قرآن کی تعلیم وتحفیظ کے لیے بھیجا۔

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: "جب کوئی شخص ہجرت کرتا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے ہم میں سے ایک آدمی دے دیا کرتے جو اس کو قرآن کی تعلیم دیتا، (ایک بار تو) مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تلاوت قرآن کی وجہ سے شور ہونے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اپنی آوازیں پست رکھیں تا کہ کوئی غلطی میں مبتلا نہ ہو۔"

اس طرح حیات رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہی حفاظ قرآن کی ایک بڑی تعداد تیار ہو گئی جن میں چاروں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت سعد رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ، حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ، ان کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن السائب رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا، اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا۔ یہ سب تو وہ ہیں جن کا تعلق مہاجرین صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہے۔ انصار صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ان حضرات نے قرآن پاک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں حفظ کیا: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ، حضرت مجمع بن حارثہ رضی اللہ عنہ، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، حضرت ابو زید، (جن کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ وہ میرے چچا کے خاندان میں سے ہیں)

بعض علماء کہتے ہیں کہ: مذکورہ حضرات میں بعض ایسے ہیں جنہوں نے وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حفظ قرآن کی تکمیل کی ہے۔ بہر صورت! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد قرآن مجید حفظ کر چکی تھی۔ حتیٰ کہ بیر معونہ اور جنگ یمامہ میں ایک سو چالیس

---

① رواہ البخاری فی کتاب فضائل القرآن، باب، والمناقب ۲۵، ورواہ امام احمد فی مسندہ ۶/ ۲۸۲

حفاظِ کرام شہید ہوئے تھے۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: "جنگ یمامہ میں ستر قراء کرام شہید ہوئے اور عہد رسالت میں بیر معونہ کے موقع پر بھی اتنی ہی تعداد میں قرآء شہید ہوئے تھے۔"

محقق ابن الجزری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: "قرآن کریم کے نقل کرنے میں اصل اعتماد حفظ قلوب پر ہے، صحیفوں اور کتابوں میں لکھنے پر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امت کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز اور خصوصیت ہے، چنانچہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث صحیح روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے رب نے مجھ سے فرمایا:

اٹھیے: اور قریش کو ڈرایئے: میں نے عرض کیا کہ اے میرے رب! تب تو وہ میرا سر کچل دیں گے اور اسے روٹی بنا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

"میں تمہاری بھی آزمائش کروں گا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان کی بھی آزمائش کروں گا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی کتاب اُتارنے والا ہوں کہ جسے پانی نہ دھو سکے گا جسے تم نیند اور بیداری دونوں حالتوں میں پڑھو گے، سو آپ ایک لشکر بھیجیں میں اس کے دگنا بھیجوں گا اور اپنے فرمانبردار و کے ساتھ مل کر اپنے نافرمانوں سے لڑیں اور خرچ کریں میں بھی آیت پر خرچ کروں گا۔ ①

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ قرآن کو اپنی حفاظت کے لیے کسی ایسے کاغذ کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے جسے پانی سے دھویا جا سکتا ہو۔ بلکہ اس کی تلاوت ہر حال میں ہوگی، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی صفت وشان میں آیا ہے کہ: "اناجیلھم صدورھم" یعنی ان کی کتاب ان کے سینے ہیں۔ جبکہ اہل کتاب کا حال اس کے برخلاف ہے کہ وہ کتابت کی صورت میں ہی اپنی کتاب کو محفوظ کر سکتے ہیں اور اسے دیکھ کر ہی پڑھتے ہیں، زبانی نہیں پڑھ سکتے۔"

اس موقع پر صحیح بخاری کی اس روایت سے اشکال نہیں ہونا چاہیے جسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت صرف چار آدمیوں نے قرآن جمع کیا تھا، ابو الدرداء رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ابوزید رضی اللہ عنہ نیز فرمایا کہ "ونحن ورثناہ" کہ ہم ہی اس کے وارث ہوئے ہیں۔ ابوزید کا نام قیس بن السکن تھا جیسا کہ ابوداود نے علی شرط الشیخین کی اسناد کے ساتھ اس کو نقل کیا ہے۔ یہ اشکال اس لیے نہیں ہونا چاہیے کہ یہاں پر حصر نسبی (اضافی) ہے، حصر حقیقی نہیں ہے کہ ان چار کے علاوہ کی نفی ہو جائے کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں صرف ان ہی چار افراد نے قرآن جمع کیا تھا۔ اس امر کی دلیل کہ یہاں پر حصر حقیقی نہیں بلکہ اضافی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے جسے حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی نقل کرتے ہیں کہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں کتنے لوگوں نے قرآن کو جمع کیا تھا؟ اس پر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"چار لوگوں نے اور ان سب کا تعلق انصار سے تھا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور اور ابوزید رضی اللہ عنہ۔

آپ نے غور کیا کہ اس روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی بجائے ان چار افراد میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا ہے۔ دونوں روایتوں میں وہ سچے ہیں، کیونکہ یہ بات غیر معقول ہے کہ وہ اپنے آپ کو جھوٹا بنائیں، اس سے

---

① صحیح مسلم، بحدیث: ٦٣، ومسند احمد ٤/ ١٦٢

ثابت ہوا کہ ان کا مقصد حصر سے حصر اضافی ہی ہے، چنانچہ کہا جائے گا کہ ان کا مقصد تین افراد ذکر کرنے میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو شامل کرنے کا تھا اور کبھی تو ان افراد میں ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کو شامل کرنا تھا، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو شامل کرنا نہیں تھا۔

یہ توجیہ اگرچہ بعید از عقل لگتی ہے لیکن دونوں روایتوں میں تطبیق پیدا کرنے کے لیے اسی کو اختیار کرنا ہوگا۔ جبکہ ان مذکورہ دو روایات کے علاوہ دیگر روایات میں چار افراد کچھ اور ذکر کیے گئے ہیں۔

اسی لیے امام ماوردی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ کے قول کہ "ان کے علاوہ کسی نے قرآن کو جمع نہیں کیا" سے یہ لازم نہیں آتا کہ حقیقت میں ایسا ہی ہو، کیونکہ اس کا تو احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعداد بھی زیادہ تھی، پھر وہ مختلف علاقوں میں متفرق طور پر موجود تھے یہ دعویٰ تو تب نام ہوسکتا ہے جب ہر ہر صحابی رضی اللہ عنہ سے وہ ملاقات کرتے اور وہ ان کو اپنے بارے میں بتاتے کے عہد نبوی ﷺ میں انہوں نے جمع قرآن کو مکمل نہیں کیا تھا، ایسا ہونا بہت دشوار ہے تو پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ کی بات واقع کے مطابق کیسے ہوسکتی ہے؟ حالانکہ صحیح بخاری میں حفص بن عمر کے واسطہ سے یہ روایت آتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "قرآن چار لوگوں سے حاصل کرو۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، سالم رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔"

آنحضور ﷺ نے جن چار افراد کا ذکر کیا ان میں پہلے دو تو مہاجرین میں سے ہیں اور آخری دو کا تعلق انصار سے ہے۔[①]

امام ماوردی رحمہ اللہ کا اس سے مقصد شاید حصر حقیقی کی نفی کرنا اور حصر اضافی کی اسی طرح سے توجیہ پیش کرنا ہے جس طرح سے ہم نے پیش کی ہے اور استدلال میں حدیث انس رضی اللہ عنہ ہی کو ذکر کیا ہے۔ دیگر روایات جن کے بارے میں بعض حضرات نے تواتر کا قول کیا ہے ان میں تصریح کچھ اور ناموں کی ہے جو روایت انس میں مذکور چار افراد کے علاوہ ہیں۔ مثلاً:

① امام نسائی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"میں نے قرآن جمع کیا پس میں ہر رات اسے پڑھتا، حضور ﷺ کو یہ بات پہنچی تو ان سے فرمایا کہ:

"اس قرآن کو ایک مہینے میں پڑھا کرو..... آخر حدیث تک۔"[②]

② ابن ابی داؤد رحمہ اللہ نے سند حسن کے ساتھ محمد بن کعب القرظی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: "عہد رسالت ﷺ میں پانچ انصار صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن کو جمع کیا، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ، اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ، ابوالدرداء رضی اللہ عنہ، اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ۔"

بعض علماء نے مذکورہ حدیث انس میں یوں تطبیق دی ہے کہ "اس جمع سے" مراد کتابت قرآن ہے نہ کہ حفظ قرآن۔ اور بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ جمع قرآن سے مراد تمام وجوہِ قراءات کو جمع کرنا ہے یا اس سے مراد قرآن کو رسول کریم ﷺ سے بالمشافہ حاصل کرنا ہے یا اس سے مراد قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے جمع کرنا ہے یہاں تک کہ اس کا نزول مکمل ہوا۔

امام ابوبکر باقلانی رحمہ اللہ نے اس کے آٹھ جوابات دیئے ہیں اور اس کے ذریعہ انہوں نے حدیث انس پر ہونے والے اشکال کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے ان جوابات کی تضعیف کی ہے اور دیگر اہل علم بھی ان کی تغلیط کرتے ہیں۔

---

① اخرجہ البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب ۸

② سنن النسائی کے کتاب الصیام: ۷۶

بہر کیف! بات کرنا بہت آسان ہے ہم نے اس اشکال سے بچنے کے لیے جو جواب دیا ہے وہ کافی ہے۔

البتہ اس اشکال کا جواب جو امام مازری رحمہ اللہ نے دیا ہے وہ مجھے بہت بھایا ہے، اسے ذکر کیے دیتا ہوں کہیں وہ نہ جائے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اس قول سے ملاحدین کی ایک جماعت نے اپنے دعویٰ پر استدلال کیا ہے۔ حالانکہ اس حدیث میں ان کے لیے کوئی مستدل نہیں ہے، کیونکہ ہمیں یہ بات تسلیم نہیں کہ یہ حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے، کیونکہ اگر یہ حدیث ہم اپنے ظاہر پر تسلیم کرلیں تو ان ملاحدین کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ فی الواقع بھی معاملہ ایسا ہی تھا؟ اگر ہم ان کی بات مان بھی لیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایک جم غفیر میں سے ہر فرد کے سارے قرآن کو حفظ نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اتنے جم غفیر نے اس مجموعہ کو حفظ نہ کیا ہو! تواتر کی شرط میں یہ بات نہیں ہے کہ ہر فرد نے سارا قرآن حفظ کیا ہو، بلکہ تمام افراد بھی اگر علی التقسیم سارا قرآن حفظ کر لیں تو اس کے لیے کافی ہے، جبکہ امام قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: "جنگ یمامہ میں ستر قراء شہید ہوئے اور عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بیرِ معونہ کے موقع پر بھی اتنی ہی تعداد شہید ہوئی۔" نیز وہ کہتے ہیں کہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ نے صرف چار افراد کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ان چار افراد سے ان کا زیادہ تعلق تھا دوسروں سے اس قدر نہ تھا یا اس وجہ سے کہ یہ چار ہی ان کے ذہن میں تھے دوسرے نہیں تھے۔"

اس موقع پر ہم نے جو بات ذکر کی ہے وہ صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حد تک نہیں ہے کہ جن کے سینوں نے حیات رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں کتاب اللہ کو جمع اور محفوظ کیا، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن کے حفظ کی تکمیل کی ہے، ان میں سات صحابہ رضی اللہ عنہم قراءتِ قرآن میں مشہور ہوئے جن کے نام یہ ہیں: حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابی بن کعب، حضرت ابو الدرداء، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم۔ ان سب نے اپنے سینوں میں قرآن کو جمع بھی کیا اور دیگر بہت سے لوگوں کو پڑھایا بھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہترین جزا عطا فرمائے۔ (آمین)

قارئین کرام! حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث کے بارے میں ہم سے اس سے زیادہ کی خواہش نہ کیجیے۔

کیونکہ بعض ملاحدین نے تواتر قرآن پر الزام لگانے میں اسی حدیث کو اپنا مورد بنایا ہے اور ہمارا بھی کام ہے کہ ہم ایسے الزامات کا جواب دیں اور الزام لگانے والے کو لاجواب کریں، اسی لیے ہم نے چاہا کہ اس مناسبت سے اس موضوع پر کلام طویل کیا جائے تاکہ ایک جانب تو ذمہ داری ادا ہو اور دوسری جانب وارد شدہ شبہات کا جواب بھی ہو جائے۔"

﴿وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ (حج: ۴۰)

جمع قرآن بمعنی کتابت در عہدِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم

اس سے پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کو ابتداء میں اس بات کی بڑی فکر رہتی تھی کہ قرآن کو زبانی یاد کر کے دلوں میں محفوظ کرلیا جائے، کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی امی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی امیوں (ان پڑھوں) میں ہوئی تھی، علاوہ ازیں اس دور میں آلات کتابت بھی میسر نہیں تھے۔ اس وجہ سے حفظ فی الصدور پر اعتماد کیا جاتا تھا جو حفظ فی السطور کے مقابلہ میں زیادہ بہتر طریقہ تھا۔ پھر اس دور میں اہلِ عرب کی عادت بھی تھی کہ وہ اپنے صدور اور قلوب کے صفحات پر عرب کے اشعار، انساب اور مفاخر و ایام کو ثبت و نقش کیا کرتے تھے۔

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے قرآن کی طرف زیادہ توجہ کی، اسی لیے قرآن کو لکھنے کی طرف اس

قدر توجہ اور اہتمام نہ تھا جس قدر اس کے حفظ اور زبانی یاد کرنے پر توجہ تھی، البتہ اپنے دور میں جس قدر وسائل کتابت دستیاب تھے اس کے مطابق لکھنے کا بھی اہتمام کیا گیا۔

چنانچہ رسول کریم ﷺ نے کتابت وحی کے لیے کچھ لوگ مقرر فرمائے۔ جب بھی قرآن کا کوئی حصہ نازل ہوتا آپ ﷺ اس کے لکھنے کا حکم دیتے، تاکہ اس کو محفوظ بھی کیا جا سکے، اور کتاب اللہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ احتیاط اور ضبط واعتماد کو قائم بھی رکھا جا سکے کہ قرآن کا حفظ اور اس کی کتابت ایک دوسرے کے لیے معاون ہو جائے۔ ان کاتبانِ وحی میں بلند درجے کے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے، جن کے نام یہ ہیں: ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ، عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ، علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، معاویہ رضی اللہ عنہ، ابان بن سعید رضی اللہ عنہ، خالد بن الولید رضی اللہ عنہ، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ وغیرہ۔

آنحضرت ﷺ ان کی راہ نمائی بھی فرماتے کہ اس حصہ قرآن کو سورت کی کس جگہ لکھنا ہے، چنانچہ یہ حضرات اسے لکھتے جو ان کو میسر آتا جیسے کھجور کی شاخ، باریک قسم کا سفید پتھر، پارچے، کھال کا ٹکڑا، شانوں اور پسلیوں کی ہڈیاں وغیرہ۔ اس کے بعد لکھی ہوئی آیات وغیرہ کو بیتِ نبوی ﷺ میں رکھ دیا جاتا تھا، تو قرآن اپنی مجموعی شکل میں آپ ﷺ کے عہد مبارک میں اس طرح سے موجود تھا، البتہ کسی صحیفہ یا مصاحف میں لکھا ہوا نہیں تھا بلکہ جس طرح ہم نے ذکر کیا کہ مختلف ہڈیوں اور پارچوں وغیرہ کی شکل میں متفرق انداز میں مکتوب تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جب کوئی سورت نازل ہوتی تو آپ ﷺ کسی کاتب وحی کو بلاتے اور اس سے فرماتے: اس سورت کو اس مقام پر رکھ دو (لکھ لو) جہاں فلاں فلاں بات مذکور ہے"① زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ: "ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس قرآن کو مختلف ٹکڑوں میں جمع کرتے تھے۔"②

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنی آیات کو نبی کریم ﷺ کی ہدایت کے مطابق مرتب کیا جاتا تھا، اور یہ ترتیب بھی جبریل علیہ السلام کے بتانے پر ہوا کرتی تھی، یعنی ترتیب توقیفی تھی، کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ جبریل علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ: "اس (آیت) کو فلاں جگہ پر رکھ دو" اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جبریل علیہ السلام اللہ کے حکم سے ایسا کہتے ہوں گے۔

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن پاک کو لکھا کرتے تھے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے جتنی تعداد میں قرآن کا حصہ پاتے اسے کاغذ یا ہڈی یا شانے کی ہڈی وغیرہ پر لکھ لیتے تھے مگر سورتوں کی ترتیب اور تسلسل کا التزام نہ کرتے تھے، جس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ رسول اللہ ﷺ پر نازل شدہ کوئی سورت حفظ کر لیتے یا اسے لکھ لیتے، پھر مثلاً اگر وہ کسی سریہ میں چلے جاتے اور ان کی عدم موجودگی میں کوئی سورت نازل ہو جاتی تو واپسی پر اس کے لکھنے کے بعد اسے حفظ بھی کر لیتے، اس طرح وہ عدم موجودگی میں جو حصہ چھوٹ جاتا تھا اس کی تلافی کر لیتے تھے، اور حسب سہولت اسے بھی جمع کرتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کے لکھے ہوئے حصے میں تقدیم وتاخیر ہو جاتی۔

جبکہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے حافظے پر اعتماد کرتے تھے اور عرب کی اس عادت کے مطابق لکھا نہیں کرتے تھے کہ وہ عرب کے انساب واشعار اور ان کے مفاخر کو لکھے بغیر زبانی یاد کیا کرتے تھے۔

---

① سنن ابی داؤد، کتاب الصلوۃ باب ۱۲۲

② سنن الترمذی، المناقب، ۷۳، ورواہ احمد فی المسند ۵/ ۱۸۵

حاصل کلام یہ کہ عہد رسالت ﷺ میں سارا قرآن لکھا ہوا موجود تھا، نیز اس میں ان حروف سبعہ کی بھی رعایت رکھی گئی تھی جس پر قرآن کا نزول ہوا، البتہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم چند منسوخ التلاوت آیات اور بعض ایسی آیات جو خبر واحد سے ثابت تھیں اُنہیں لکھ چکے تھے۔ اور بعض نے غیر مرتب انداز میں لکھا تھا۔ اسی طرح قرآن اس مبارک زمانہ میں صحیفوں اور عام مصاحف میں جمع شدہ شکل میں نہیں تھا۔

عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن یا مصاحف میں جمع کیوں نہ کیا گیا؟

قرآن مجید صحف یا مصاحف میں مندرجہ ذیل وجوہات کی بناء پر جمع نہیں کیا گیا:

① ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں صحف یا مصاحف میں جمع قرآن کے جو دواعی اور اسباب پیش ہوئے وہ اس سے پہلے پیدا نہیں ہوئے تھے اس لیے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے صحیفوں میں لکھوایا، اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جو دواعی اور اسباب مصاحف میں لکھوانے کے وجود میں آئے وہ اس سے پہلے نہیں آئے تھے اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مختلف مصاحف میں قرآن کو لکھوایا۔

آنحضور ﷺ کے مبارک دور میں مسلمان خیر وبھلائی کے ساتھ تھے، قراء کی تعداد بھی زیادہ تھی اور اسلام بھی ابھی زیادہ نہیں پھیلا تھا، فتنوں سے بھی امن تھا، کتابت کی بجائے زیادہ تر اعتماد حفظ پر رہا، آلات کتابت بھی میسر نہ تھے اور حضور ﷺ کی توجہ اور اہتمام بھی قرآن کو زبانی یاد کرنے پر زیادہ تھی، یہاں تک کہ قرآن کی ان حروف سبعہ کے مطابق ادائیگی پر اہتمام تھا جس کے مطابق قرآن کا نزول ہوا۔

② ابھی حضور ﷺ پر وحی کا سلسلہ جاری تھا، قرآن کی کوئی آیت یا آیات کے منسوخ ہونے کا احتمال بھی موجود تھا۔

③ قرآن کا نزول یکبارگی نہیں ہوا تھا بلکہ بیس برس سے زیادہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔

④ قرآن کی آیات اور اس کی سورتوں کی ترتیب بھی نزول کے مطابق نہ تھی، آپ جانتے ہیں کہ قرآن کا نزول اسباب وضروریات کے مطابق ہوا ہے، لیکن اس کی ترتیب بھی دیگر وجوہات پیش نظر تھیں۔

آپ کے علم میں یہ بات ہے کہ اگر قرآن کو (عہدِ رسالت ﷺ میں) صحف یا مصاحف میں جمع کر دیا جاتا اور جبکہ حال وہ تھا جس کی ہم نے ابھی وضاحت کی ہے تو اس میں بس تغیر وتبدل کا احتمال تھا کہ قرآن کا کوئی حصہ منسوخ ہوتا یا کوئی اور سبب پیش آتا تو اس میں تبدیلی کرنا پڑتی۔ جبکہ حالات بھی ناساعد تھے اور آلات کتابت بھی ناپید تھے۔ اور اس دور میں زیادہ تر حفظ قرآن پر اعتماد کیا جاتا تھا۔

لیکن جب نزول قرآن کا اختتام اور آنحضور ﷺ کا وصال ہو گیا اور نسخ کا احتمال بھی نہ رہا اور ترتیب بھی درست ہو گئی اور پھر قرآن کو صحف یا مصاحف میں نقل کرنے کے اسباب بھی وجود میں آئے تو اللہ تعالیٰ نے خلفائے راشدین کو اس کی توفیق بخشی، چنانچہ انہوں نے حفاظت قرآن اور شریعت کے قانون اوّل کی محافظت کی خاطر اس ذمہ داری کو پورا کیا، جس کی تصدیق اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہوئی ہے۔"

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝﴾ (الحجر:۹)

"ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم میں اس کی ضرور حفاظت بھی کریں گے۔"

جمع قرآن، عہدِ صدیقی میں

آفتاب نبوت کے غروب ہونے کے بعد جب خلافت کی ذمہ داری ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر آئی تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو چند بڑی سخت قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، جن میں ایک جنگ یمامہ بھی ہے جو ۱۲ھ کو پیش آئی۔

اس جنگ میں مسلمانوں اور مسیلمہ کذاب کے شیعین کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی، یہ معرکہ بڑا خون ریز قسم کا تھا، اس میں بہت سے قراء صحابہ اور حفاظِ قرآن شہید ہو گئے جن کی تعداد ستر تک بتائی جاتی ہے، بعضوں نے تو پانچ سو تک بتائی ہے۔ جن میں سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ مسلمانوں پر اس کا بہت اثر ہوا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس معاملہ کو بڑا سنگین خیال کیا اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور انہیں سارا واقعہ بھی سنایا اور جمع قرآن کی تجویز بھی پیش کی۔

اس خدشہ کے پیش نظر کہ کہیں حفاظ قرآن کی وفات اور قراء صحابہ رضی اللہ عنہم کی شہادت سے قرآن کا ضیاع نہ ہو جائے! ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو شروع میں تو اس بارے تردد ہوا، کیونکہ وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کردہ حدود کے آگے بہت زیادہ توقف اختیار کرنے والے تھے۔ نیز انہیں یہ اندیشہ بھی ہوا کہ کہیں اس تجدیدی کارروائی سے کوئی تبدیلی واقع نہ ہو جائے یا اس نئے امر سے کسی بدعت کا ارتکاب نہ ہو جائے۔ لیکن دونوں کے درمیان تھوڑی دیر مذاکرات ہوئے پھر ان پر مصلحت کی صورت واضح ہو گئی اور انہوں نے اس درست فکر اور رائے کو تسلیم کر لیا اور اللہ نے ان کے سینہ کو کھول دیا اور انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ جس کام کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ مشورہ دے رہے ہیں وہ دراصل کتاب اللہ کی حفاظت ہی کا ایک مفید ذریعہ ہے اور اس طرح اللہ کی کتاب ہر طرح کی تحریف اور ضیاع سے محفوظ بھی رہے گی، اور یہ امر نہ تو دین میں نو پیدا امور میں سے ہے اور نہ ہی دین میں بے جا اضافے اور بدعات سے ہے۔ بلکہ یہ تو ان قواعد سے مستفاد اور ماخوذ ہے جن کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت قرآن کی مشروعیت اور کاتبانِ وحی کے لیے وضع فرمایا تھا، اور پھر ان کے لکھے ہوئے قرآن کو اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا، حتی کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔

امام ابو عبداللہ المحاسبی رحمہ اللہ اپنی کتاب "فہم السنن" میں رقمطراز ہیں کہ: "قرآن حکیم کی کتابت کوئی بدعتی امر نہیں ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوراً اس کی کتابت کا حکم دیا کرتے تھے، ہاں البتہ اس وقت قرآن مختلف پارچوں، شانے کی ہڈیوں اور کھجور کی شاخوں پر متفرق صورت میں موجود تھا، اس کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان اشیاء کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اجتماعی صورت میں نقل کرنے کا حکم دیا، یہ ایسا ہی تھا جیسے مختلف اوراق ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں موجود تھے جن پر قرآن متفرق صورت میں موجود تھا، پھر ان متفرق چیزوں کو ایک شخص نے جمع کر دیا اور ایک دھاگے سے باندھ دیا تاکہ کوئی حصہ اس کا ضائع نہ ہو جائے۔"

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے حکم کا عملی اجرا

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس خواہش کی تکمیل کا ارادہ کر لیا اور انہوں نے اللہ کے عطا کردہ نور سے یہ سمجھا کہ اس امر کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک ایسے آدمی کا انتخاب کیا جائے جو بلند مرتبہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہو، یعنی زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا، اس لیے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ذات میں جمع قرآن کے لیے جو متاثر کن صلاحیتیں موجود تھیں وہ اور کسی شخص میں موجود نہ تھیں، کیونکہ وہ حافظ قرآن بھی تھے، کاتبانِ وحی میں

سے بھی تھے، حضور ﷺ کی آخری زندگی میں قرآن کے آخری دور میں بھی موجود تھے۔ اس سے بڑھ کر وہ بڑے دانش مند، متقی پرہیز گار، امانت دار، اعلیٰ اخلاق کے مالک اور دینی استقامت رکھنے والے انسان تھے، چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا، انہوں نے اس پر اتفاق کیا، حضرت زید آئے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے سامنے اپنی فکر پیش کی اور اس امر کی خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کو عملی جامہ پہنائیں۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کو پہلے تو کچھ تردد ہوا، لیکن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کے مشکوک وشبہات کو دور کرتے رہے اور اس کی مصلحت بھی واضح کرتے رہے، یہاں تک انہیں تسلی ہوگئی اور وہ اس کام کے لیے تیار ہوگئے جس کے لیے انہیں بلایا گیا تھا، چنانچہ انہوں نے قرآن جمع کرنا شروع کر دیا، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور دیگر کبار صحابہ رضی اللہ عنہم ان کی نگرانی کرنے لگے، اور اس عظیم منصوبہ میں ان کی مدد کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کا مقصد پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

﴿وَ يَأْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝﴾ (التوبۃ: ۳۲)

"اور خدا اپنے نور کو پورا کئے بغیر رہنے کا نہیں اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔"

اسی کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ اپنی صحیح میں نقل کرتے ہیں کہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: "اہل یمامہ کی شہادت (یعنی جنگ یمامہ میں ستر قراء کی شہادت) کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے بلا بھیجا تو میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ ان کے پاس حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود ہیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: "حضرت عمر رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ جنگ یمامہ میں قرآن کے قراء کی شہادتیں بہت ہوگئی ہیں، اور مجھے اس بات کا خدشہ ہے کہ کہیں دوسری جگہوں پر بھی قراء کی شہادت سے قرآن کا اکثر حصہ ضائع نہ ہوجائے اور میرا خیال ہے کہ آپ قرآن کو جمع کرنے کا حکم دیں، میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ بھلا میں ایسا کام کیسے کرسکتا ہوں جسے حضور ﷺ نے نہیں کیا؟ عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ خدا کی قسم! یہ کام خیر والا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھ سے بار بار بات کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے اس کام کے لیے میرا سینہ کھول دیا، اور اب میری رائے بھی وہی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہے۔
زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر ابوبکر صدیق فرمانے لگے کہ:

"تم نوجوان اور عقلمند آدمی ہو، ہم تجھے الزام بھی نہیں دیتے، اور تم رسول اللہ ﷺ کے لیے وحی بھی لکھا کرتے تھے، لہٰذا قرآن کو تلاش کر کے اسے جمع کرو۔"

(زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) اللہ کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کسی پہاڑ کے منتقل کرنے کی ذمہ داری دیتے تو میں یہ کام کر لیتا، اور میرے لیے یہ زیادہ دشوار نہ ہوتا بہ نسبت اس کام کے کہ جس کا مجھے جامع قرآن نے حکم دیا ہے!

میں نے عرض کیا کہ: آپ لوگ ایسا کام بھلا کیسے کرسکتے ہو جو خود حضور ﷺ نے نہیں کیا! صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: واللہ! اس میں خیر ہے، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ برابر مجھ سے بات چیت کرتے رہے، یہاں تک کہ اللہ نے میرے لیے بھی اس کام کے لیے سینہ کھول دیا جس کے لیے اللہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کا سینہ کھولا!

چنانچہ میں نے قرآن کی تلاش شروع کر دی اور میں قرآن کو کھجور کی شاخوں، سفید پتھروں اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرتا رہا، یہاں تک کہ میں نے سورۃ التوبہ کا آخری حصہ ابوخزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس پایا۔ ان کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں ملا، یعنی

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ (التوبة:۱۲۸)

"(لوگو) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں۔ تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے۔"

تا آخر سورۃ براءت۔ پھر یہ صحف ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس رہے یہاں تک کہ ان کی وفات ہوئی، اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ان کی حیات تک رہے، پھر حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا کے پاس وہ صحف موجود ہے۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس حدیث سے پتہ چل رہا ہے کہ کبار صحابہ رضی اللہ عنہم بھی قرآن کی حفاظت کا کس قدر اہتمام فرماتے تھے: ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق کو زید بن ثابت رضی اللہ عنہ پر کتنا اعتماد تھا! نیز اس سے معلوم ہوا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ میں اس کام کی اہلیت اور صلاحیت موجود تھی، جیسا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے خود ان کے مذکورہ فضائل ذکر فرمائے، نیز حضرت زید رضی اللہ عنہ کے تقویٰ، پرہیز گاری اور امانت و دیانت پر ان کے اس قول سے تائید ہوتی ہے کہ "اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے منتقل کرنے کا کہتے تو وہ میرے لیے اس کام سے زیادہ دشوار گزار نہ ہوتا جس کا مجھے جامع قرآن نے حکم دیا۔"

اور ان کی دانش مندی کی شہادت ان کا اوّل الامر متردد ہونا اور توقف اختیار کرنا اور پھر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بات چیت کرنے کے بعد مطمئن ہونا ہے، اور ان کی تجربہ کاری کا پتہ ان کے اس قول سے لگتا ہے کہ: "پھر میں نے قرآن کو تلاش کرنا شروع کر دیا اور میں اسے کھجور کی شاخوں، سفید باریک چوڑے پتھروں اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرنے لگا۔"

کتابت صُحف میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا طریق کار

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جمع قرآن میں وہ دقیق اور محکم طریقہ اختیار کیا جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وضع کیا تھا، اس طریقہ میں اس بات کی ضمانت موجود تھی کہ کتاب اللہ اپنی شان کے مطابق پوری پوری احتیاط بہتری اور تحقیق و تدقیق پر مبنی تھی، چنانچہ انہوں نے صرف زبانی یاد ہونے پر اکتفاء نہیں کیا، نہ صرف ہاتھ سے لکھے ہونے پر اور نہ صرف کان سے سنے ہونے پر اکتفاء کیا۔ بلکہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے جمع قرآن میں دو اہم مصادر پر اعتماد کرتے ہوئے مختلف حصوں کو جمع و اخذ کرنا شروع کیا۔

① وہ حصہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا گیا ہو۔

② وہ حصہ جو لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہو۔

انہوں نے اس سلسلہ میں اس قدر حزم و احتیاط کو اختیار کیا کہ لکھے ہوئے حصے کو اس وقت تک قبول نہیں کرتے تھے جب تک کہ اس بات پر دو عادل گواہ گواہی نہ دے دیتے کہ یہ حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا گیا تھا۔

اس کی دلیل وہ روایت ہے جو ابن ابی داود رحمہ اللہ نے یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن حاطب کے طریق سے نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا: "حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے فرمایا کہ جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کا کوئی حصہ بھی حاصل کیا ہو وہ اسے لیے آئے، لوگ قرآن کو کاغذوں، تختیوں اور کھجور کی شاخوں پر لکھتے تھے، اور آپ رضی اللہ عنہ کسی کا کوئی حصہ اس وقت تک قبول نہ کرتے جب تک کہ دو گواہ اس پر گواہی دے دیتے۔"

نیز اس کی دلیل وہ روایت بھی ہے جو ابوداؤد رحمہ اللہ نے ہی نقل کی ہے لیکن ہشام بن عروہ عن ابیہ کی سند سے نقل کیا ہے کہ:

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

"تم دونوں مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ! جو شخص تمہارے پاس اس پر دو گواہ لائے کہ یہ کتاب اللہ کا حصہ ہے، اسے تم لکھ لو۔"

((وھو حدیث رجالہ ثقات وإن کان منقطعًا، قال ابن حجر: المراد بالشاھدین: الحفظ والکتابۃ)).

علامہ سخاوی رحمہ اللہ کی جمال القراء سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ: شاہدین سے دو عادل مرد مراد ہیں، ان کی عبارت یہ ہے: "اس سے مراد یہ ہے کہ دو شخص اس بات پر گواہی دیں کہ یہ حصہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا گیا تھا۔"

حضرت زید رحمہ اللہ نے صرف حفظ پر اعتماد نہیں کیا، اسی لیے امام بخاری رحمہ اللہ کی سابقہ روایت میں ہے کہ: انہوں نے سورۃ براءت کا آخری حصہ صرف حضرت ابوخذیمہ رضی اللہ عنہ کے پاس پایا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حصہ تحریری شکل میں صرف ابوخذیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس پایا تھا۔ ورنہ خود حضرت زید رضی اللہ عنہ کو اور دیگر بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو وہ حصہ زبانی یاد تھا۔ مگر ان کا ارادہ یہ تھا کہ حفظ اور کتابت دونوں صورتوں میں جمع قرآن کا کام کریں، تاکہ خوب احتیاط اور اعتماد ہو سکے۔

اس اعلیٰ درجے کے طریق کار کے مطابق قرآن پاک ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی زیر نگرانی جمع ہوا اور ساری امت کا بغیر نکیر کے اس پر اجماع منعقد ہوا۔ یہ ایک لازوال تاریخی منقبت وفضیلت ہے جس کا ذکر خیر ہوتا رہے گا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تجویز پر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی تنفیذ وتعمیل کی صورت میں اور باقی صحابہ رضی اللہ عنہم کی معاونت اور اجماع کے ساتھ سارا عمل پایہ تکمیل کو پہنچا۔

حضرت علی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "مصاحف میں اجر کے اعتبار سے عظیم انسان ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، اللہ تعالیٰ ابوبکر رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے کہ انہوں نے سب سے پہلے قرآن جمع کیا۔"[1]

حضرت زید رضی اللہ عنہ کے جمع کردہ صحف میں انتہائی احتیاط اور اہتمام خاص کا خیال رکھا گیا تھا، چنانچہ ان صحف کو پہلے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے پاس محفوظ رکھا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی وفات کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا نے اپنے پاس محفوظ رکھا۔

یہاں تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے ان صحف کو طلب کیا اور قرآن کے مصاحف کے لکھوانے میں ان ہی پر اعتماد کیا۔ اور پھر ان کو وہ واپس کر دیے۔ (اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے)

صحف کی خصوصیات

یہ صحف بہت سے امتیازی خصوصیات کی وجہ سے ممتاز حیثیت کے حامل تھے:

① ان کو تلاش وجستجو کے بہت ہی دقیق طریقوں سے جمع کیا گیا تھا نیز ان میں علمی ثبوت تحقیق کے بہترین اصول کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ جیسا کہ ابھی اس کے طریق کار کے بیان میں وضاحت ہوئی ہے۔

② ان صحف میں ان آیات پر اکتفاء کیا گیا تھا جن کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی۔

③ ان صحف کو اجماع امت کا شرف بھی حاصل ہوا اور تواتر روایات کا بھی، اور اس تواتر پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ سورت

---

① اخرجہ ابن ابی داؤد فی المصاحف بسند حسن

براءت کا آخری حصہ تو صرف ابوخذیمہ رضی اللہ عنہ کے پاس ملا تھا، کیونکہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ حصہ تحریری شکل میں صرف ان کے پاس موجود تھا۔ یہ امر اس کے منافی نہیں کہ وہ حصہ دیگر بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس محفوظ شکل میں موجود تھا جو حد تواتر کو پہنچا ہوا ہے۔ ہم نے کئی بار یہ بات کہی ہے کہ: اس وقت اصل اعتماد حفظ اور زبانی یاد ہونے پر تھا، کتابت پر اعتماد بطورِ مصدر و مآخذ صرف احتیاط اور اہتمام کی بناء پر تھا۔

یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا جمع قرآن ان حروف سبعہ کو بھی شامل تھا جس کے ساتھ قرآن امت اسلامیہ کی سہولت کی خاطر نازل ہوا تھا وہ حروف سبعہ بھی مختلف چیزوں پر لکھے گئے تھے۔

ملاحظہ ✿ مذکورہ طرز پر قرآن کا صحف یا مصحف میں اپنی سابقہ خصوصیات کے ساتھ جمع ہونا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے قبل کسی کے ہاں معروف نہ تھا، یہ اس بات کے منافی نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس تو کئی صحف یا مصاحف موجود تھے جنہوں نے اس سے پہلے ان میں قرآن لکھا تھا، (کیونکہ) ان مصاحف کو وہ شرف حاصل نہیں ہوا جو عہدِ صدیقی میں جمع کردہ صحف کو حاصل ہوا یعنی خوب باریک بینی سے بحث و جستجو، غیر منسوخ التلاوۃ آیات پر اکتفاء کرنا، پھر ان کا حدِ تواتر کو پہنچنا، نیز امت کا اس پر اجماع ہونا اور حروف سبعہ کو بھی جامع ہونا وغیرہ جیسا کہ اس سے پہلے گزرا۔ اب اس بحث میں یہ کہنا ہمارے لیے باعث اعتراض نہیں ہوگا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلے قرآن کو جمع کیا تھا۔ نیز ہمارے موضوع کے صاف اور واضح ہونے پر اس روایت سے استدلال کرنا بھی مضر نہیں ہوگا جو امام سیوطی رحمہ اللہ نے ابن الغرس سے نقل کی ہے یعنی محمد بن سیرین حضرت عکرمہ رحمہ اللہ اپنے گھر میں بیٹھے رہے، ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کسی نے کہا کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنا پسند نہیں کرتے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں بلا بھیجا اور پھر ان سے پوچھا کہ کیا آپ میری بیعت کو پسند نہیں کرتے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ کتاب اللہ میں زیادتی کی جا رہی ہے، مجھے یہ خیال آیا کہ میں جب تک اسے جمع نہ کرلوں اپنی چادر نہ پہنوں سوائے نماز کے، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: تمہارا خیال بہت اچھا ہے محمد (ابن سیرین) کہتے ہیں کہ اس نے عکرمہ سے پوچھا کہ کیا انہوں نے قرآن کو ترتیب نزول کے اعتبار سے جمع کیا تھا الاوّل فالاوّل کے مطابق؟ تو عکرمہ نے کہا کہ: اگر تمام جن وانس بھی اس طرح جمع کرنے کے لیے اکٹھے ہو جائیں تو کبھی نہ کر سکتے۔"

ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے ایک دوسرے طریق سے ابن سیرین رحمہ اللہ سے یہی اثر نقل کیا ہے اس میں یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مصحف میں ناسخ ومنسوخ آیات بھی لکھی تھیں، نیز ابن سیرین کہتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب طلب کی اور مدینہ بھی لکھا اس کے بارے میں لیکن مجھے یہ دستیاب نہ ہو سکی۔

ہم کہتے ہیں کہ اس طرح کی روایات ہماری بحث اور گفتگو کے منافی نہیں ہے اور نہ ہی اس سے ہمارے موضوع پر کوئی قدغن ہے، کیونکہ زیادہ سے زیادہ ایسی روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی ایک مصحف میں قرآن لکھا تھا، لیکن اسے وہ اجماعی شان اور مذکورہ خصوصیات حاصل نہ تھیں جو عہدِ صدیقی میں جمع کردہ صحف یا مصحف کو حاصل ہوئیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے وہ انفرادی نوعیت کے مصاحف تھے، انہیں وہ اعتماد اور خصوصیات حاصل نہ تھیں۔ اگرچہ ان کو زمانی تقدم حاصل تھا لیکن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جمع کردہ مصحف بہر صورت اولیت کا حامل ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس حقیقت کا خود بھی اعتراف کیا ہے

اس حدیث میں جس کو ابن ابی داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے مصاحف میں سند حسن کے ساتھ ابھی ذکر کیا تھا کہ: مصاحف میں اجر کے اعتبار سے سب سے عظیم انسان ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، اللہ ابوبکر پر رحم فرمائے، انہوں نے سب سے پہلے کتاب اللہ کو جمع کیا۔"

یہ ابوالحسن (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کی طرف سے واضح اعتراف ہے کہ مذکورہ طریق پر قرآن کو جمع کرنے کا اوّلین شرف ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے۔

جمع قرآن عہدِ عثمانی میں

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوگیا، آبادی میں اضافہ ہوگیا جس کی وجہ سے مسلمان مختلف اطراف وبلاد میں پھیل گئے ایک نسل نوا بھری جسے قرآن کی تعلیم کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد اور وحی ونزول قرآن کا دور بہت گزر چکا تھا، جو لوگ مختلف اسلامی علاقوں میں بستے تھے وہ اپنے اپنے علاقوں میں مشہور صحابہ رضی اللہ عنہم کی قراءت کے مطابق قرآن پڑھنے لگے تھے۔ چنانچہ شام کے لوگ ابی بن کعب کی قراءت، کوفہ کے لوگ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت کے مطابق پڑھنے لگے تھے، چنانچہ شام کے لوگ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت، کوفہ کے لوگ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت اور دیگر حضرات ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی قراءت کے مطابق قرآن پڑھتے تھے جس کی بناء پر ان میں حروف اداء اور وجوہ قراءت کا اس قدر اختلاف ہوا کہ قرآن کی تلاوت میں باہمی نزاع کا دروازہ کھل گیا، اور صحابہ کرام کے درمیان اشتباہ پیدا ہوگیا قبل اس کے کہ انہیں یہ معلوم ہوتا کہ قرآن کا نزول سات حروف پر ہوا ہے، بلکہ ان کا نزاع شدت اختیار کر گیا، جس کا سبب یہ تھا کہ وہ دورِ نبوت اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وجود باسعادت سے کافی دور ہو چکے تھے جن کے حکم اور فرمان پر انہیں اطمینان حاصل ہو جایا کرتا تھا۔ قرآن کی تلاوت کا معاملہ اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ لوگ ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگے، قریب تھا کہ زمین پر فساد عظیم برپا ہو جاتا، اور یہ شورش کہیں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی بلکہ تمام اسلامی شہروں حتیٰ کہ حجاز اور مدینہ تک اس آگ کے شعلے بھڑکنے لگے، کیا چھوٹے اور کیا بڑے سب اس کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔

ابن ابی داؤد نے المصاحف میں ابوقلابہ کی سند سے یہ بات نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں حال یہ ہوا کہ ایک معلم ایک شخص کی قراءت کے مطابق تعلیم دیتا دوسرا دوسرے آدمی کی قراءت کے مطابق قرآن سکھاتا، جب بچے آپس میں ملتے اور ان کی قراءتیں مختلف ہوتیں، یہاں تک کہ یہ بات معلمین تک پہنچتی تو وہ ایک دوسرے کی تکفیر کرتے۔ چنانچہ یہ بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو انہوں نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "تم میرے سامنے اختلاف کرتے ہو، تو جو شہر مجھ سے دور واقع ہیں ان میں اس سے زیادہ اختلاف ہوگا۔"

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بالکل سچ فرمایا، واقعی جو علاقے جیسے حجاز اور مدینہ وغیرہ ان میں زیادہ شدت سے اختلاف پایا جاتا تھا، پھر جو لوگ ان علاقوں میں موجود لوگوں کی قراءت کا اختلاف سنتے تھے وہ جب کسی مجلس میں جمع ہوتے یا دشمن سے جہاد کے موقع پر آپس میں ملتے تو اس امر پر تعجب کا اظہار کرتے اور اس تعجب اور انکار میں دوسروں کو روکتے جب بھی وہ قرآن کے طرق ادا کے اختلاف میں زیادتی کو سنتے، پھر ان کا تعجب قرآن میں شک وشبہ کی حد کو پہنچا، پھر اس سے آگے نکل کر گناہ اور معصیت کی حد کو پہنچ گیا اور اس سے ایسا فتنہ رونما ہونے لگا کہ قریب تھا کہ اس میں قتل وغارت اور خون ریزی کا ایسا سلسلہ چل نکلتا جیسے یہود ونصاریٰ میں ان کی کتاب کے بارے میں باہمی جدل واختلاف ہوا تھا، جیسا کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آئندہ آنے والی حدیث میں حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ کو صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔

علاوہ ازیں جن سات حروف پر قرآن کا نزول ہوا تھا ان علاقوں کے لوگ اس سے بھی واقف نہ تھے اور ان کے لیے آسان بھی نہ تھا کہ ان تمام حروف کی معرفت حاصل کر لیتے، اور آپس کے اختلاف کے معاملہ میں ان ہی سے محاکمہ کر لیتے۔ کیونکہ صورت حال یہ تھی کہ جو صحابی جس صوبہ یا علاقے میں موجود تھا وہ صرف ان ہی حروف کے مطابق لوگوں کو قرآن پڑھنا تھا جو اسے معلوم تھے جس کے مطابق قرآن کا نزول ہوا تھا۔ ان کے سامنے کوئی جامع مصحف موجود نہیں تھا کہ آپس کے اختلاف اور نزاع میں اس کی طرف رجوع کرتے۔

ان ہی اسباب و واقعات کی بناء پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی اصابت رائے اور صداقت فکر سے سمجھا کہ اس افتراق و انتشار کا تدارک کیا جائے قبل اس کے کہ اس میں مزید وسعت پیدا ہو، اور اس بیماری کا جڑ سے خاتمہ کر دیا جائے پہلے اس سے کہ یہ لاعلاج ہو جائے، چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم اور اصحاب بصیرت لوگوں کو جمع کیا اور اس فتنہ کے علاج کے لیے باہمی مشورہ کیا اور پھیلے ہوئے اس اختلاف و نزاع کی سرکوبی کے لیے آپس میں مشاورت کی، چنانچہ سب کا اس بات پر اجماع ہوا کہ چند مصاحف لکھ کر ان شہروں میں بھیجے جائیں اور لوگوں کو حکم دیا جائے کہ ان مصاحف کے علاوہ جو کچھ بھی ان کے پاس ہو اسے جلا دیا جائے اور ان کے علاوہ کسی اور چیز پر اعتماد نہ کیا جائے، اس سے باہمی اختلاف و نزاع بھی ختم ہو گا اور اس اختلاف کے اندھیرے میں یہ عثمانی اور قانونی مصاحف ایک روشنی کا مرتبہ حاصل کرے گا اور اس شب فتنہ میں روشن چراغ، اس نزاع و اختلاف میں حاکم عادل اور اس مرض سے واقع شدہ مصیبت سے کامل شفا کا ذریعہ بنے گا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اجتماعی فیصلہ پر عمل کروانا

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ۲۴ھ کے تقریباً آخر میں اور ۲۵ھ کے اوائل میں اس اجتماعی فیصلے پر عمل درآمد کروانا شروع کرا دیا، چنانچہ آپ نے چار منتخب صحابہ رضی اللہ عنہم اور قابل اعتماد حفاظ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کی ذمہ داری سونپی، جن کے نام یہ ہیں: زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص، اور عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم یہ آخری تین صحابہ رضی اللہ عنہم قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا، انہوں نے وہ صحیفے جو ان کے پاس موجود تھے آپ رضی اللہ عنہ کو بھجوا دیے۔ یہ صحیفے وہ تھے جن میں قرآن عہد صدیقی میں جمع کیا گیا تھا، چنانچہ چار صحابہ کی کمیٹی نے اسے نقل کرنا شروع کر دیا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ جن لوگوں کو مصاحف لکھنے کے لیے بلایا گیا تھا وہ بارہ آدمی تھے، یہ لوگ اس وقت تک کچھ نہیں لکھتے جب تک کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے اسے پیش نہ کرتے اور وہ اس بات کا اقرار نہ کرتے کہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقے پر قرآن پڑھا ہے جس کو ہم ان مصاحف میں پاتے ہیں۔

مصاحف کی کتابت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا طریق کار

ان صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس امر پر اتفاق تھا کہ وہ ان مصاحف میں تب ہی کچھ لکھتے تھے جب انہیں اس کا قرآن ہونا یقین کے ساتھ معلوم ہو جاتا کہ آخری دور کے موقع پر یہ حصہ قائم اور برقرار تھا اور اس کی صحت

کا یقین ہو جاتا کہ حضور ﷺ کی طرف اس کی نسبت بالکل درست ہے یہ حصہ منسوخ نہیں ہوا اور اس کے علاوہ جو حصہ ہوتا اسے چھوڑ دیتے تھے۔ مثلاً ﴿فَاسْعَوْا﴾ (الجمعہ:۹) کی جگہ "فامضوا الی ذکر الله" کی قراءت اور ﴿وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا﴾ (الکہف:۷۹) میں لفظ "صَالِحَةٍ" کا اضافہ حذف کر دیتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس کمیٹی نے متعدد مصاحف لکھے، اس لیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ ایک متفقہ مصحف لکھ کر مسلمانوں کے مختلف علاقوں میں بھیج دیا جائے، چونکہ علاقے متعدد تھے اس لیے متعدد مصاحف لکھوائے، نیز ان مصاحف کو اثبات حذف اور بدل وغیرہ، کے لحاظ سے بھی متفاوت لکھوایا، کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ ان مصاحف میں حروف سبعہ بھی آ جائیں۔ انہیں نقطوں اور شکل (اعراب) سے خالی رکھا تا کہ سارے احتمالات بھی پائے جائیں، چنانچہ بعض کلمات ایسے تھے کہ انہیں نقطوں اور شکل (اعراب) سے مجرد ہونے کی وجہ سے ایک سے زیادہ طریقوں سے پڑھا جا سکتا تھا۔ مثلاً ﴿فَتَبَيَّنُوْا﴾ جو کہ ﴿اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا﴾ کا حصہ ہے (الحجرات:۶) نقطے اور شکل (اعراب) سے خالی ہونے کی صورت میں ﴿فَتَثَبَّتُوْٓا﴾ بھی پڑھا جا سکتا ہے جو کہ ایک دوسری قراءت ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا﴾ (البقرۃ:۲۵۹)

"اور (اب اپنے گدھے کی) ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم کس طرح انھیں اُٹھاتے ہیں۔"

میں کلمہ ﴿نُنْشِزُهَا﴾ جب نقطوں سے مجرد ہو تو ﴿نُنْشِرُهَا﴾ راء کے ساتھ بھی پڑھا جا سکتا ہے جو کہ ایک دوسری قراءت ہے، اسی طرح لفظ ﴿اُفٍّ﴾ ہے جس کے بارے میں آتا ہے کہ اسے سینتیس (۳۷) طرح سے پڑھا جا سکتا ہے۔

البتہ جو کلمات دیگر قراءات کے باوجود نقطوں اور اعراب سے خالی ہونے پر بھی کثرت قراءت پر دلالت نہیں کرتے انہیں وہ بعض مصاحف میں اس طریقے سے لکھتے تھے کہ اس سے معلوم ہو جاتا کہ اس میں ایک اور قراءت بھی ہے اور بعض دیگر مصاحف میں دوسرے طرز پر لکھتے جس سے معلوم ہوتا کہ اس میں ایک دوسری قراءت بھی ہے۔ جیسے لفظ "وَصّٰى" تضعیف کے ساتھ اور "اَوْصٰى" ہمزہ کے ساتھ، یہ دونوں قراءتیں ہیں اس فرمان خداوندی میں:

﴿وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ﴾ (البقرۃ:۱۳۲)

"اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اسی بات کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی۔"

اسی طرح ﴿تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ﴾ کی قراءت اور ﴿مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ لفظ ﴿مِنْ﴾ کے اضافہ کے ساتھ، جو اس فرمان الٰہی میں ہیں: ﴿لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (التوبۃ:۸۹) اب یہ بھی دو قراءتیں ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جس لفظ میں وجوہ قراءات مختلف نہ ہوتیں ان کو تو وہ ایک ہی صورت میں لکھتے تھے اور جس لفظ میں وجوہ قراءات مختلف ہوتیں تو اگر محتمل وجوہ کی وجہ سے اسے ایک خط میں لکھنا ممکن نہ ہوتا تو اسے ایسے طرز پر لکھتے کہ ایک مصحف میں بعض وجوہ آ جاتیں اور پھر دوسرے مصحف میں دوسرے طریقے پہ لکھتے کہ دیگر وجوہ قراءات بھی آ جائیں۔ وہ اس بات سے بچتے کہ ایک ہی مصحف میں دو طرزوں پر اس لفظ کو لکھیں اس ڈر سے کہ کسی کو یہ وہم ہونے لگے کہ یہ لفظ ایک ہی قراءت میں مکرر طور پر دو

وجہوں پر نازل ہوا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ یہ دو مستقل قراءتیں ہیں کہ وہ لفظ ایک قراءت میں ایک پر اور دوسری قراءت میں دوسری وجہ پر نازل ہوا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ اس بات سے بھی احتیاط کرتے کہ وہ اس لفظ کو ایک مصحف میں دو طریقے پر لکھیں کہ ایک کو اصل مصحف میں اور دوسرے کو اس کے حاشیہ میں، تاکہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ دوسرا پہلے کی تصحیح کے لیے ہے۔ علاوہ ازیں ایک کو اصل میں اور دوسرے کو حاشیہ میں لکھنا یا اس کے برعکس کرنا ترجیح بلا مرجح ہے، جیسے لفظ "وَصّٰی" تضعیف کے ساتھ لکھنا اور "اَوْصٰی" ہمزہ کے ساتھ لکھنا، (جیسا کہ پہلے گزرا ہے) لیکن جس لفظ میں قراءات کا اختلاف ہوتا اور ایک ہی صورت میں اس کا رسم ہونا اس پر دلالت کرتا تو وہ اس اختلاف قراءات کا محتمل ہوتا تھا اور اس لفظ پر نقطے اور اعراب کا نہ ہونا بھی اس پر معاون ہوتا تھا، جیسے ﴿فَتَبَيَّنُوْا﴾ اور ﴿نُنْشِزُهَا﴾ وغیرہ الفاظ (جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے)

اس طرح ایک ہی خط کی دو منقول لفظوں پر دلالت ایسی ہوتی جیسے ایک مشترک لفظ دو معقول معانی پر دلالت کرتا ہے۔ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسم مصاحف میں اس خاص طرز کو اختیار کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ انہوں نے جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کو ان تمام وجوہ قراءات کے ساتھ اور ان تمام حروف کے ساتھ اخذ کیا تھا جن پر قرآن کا نزول ہوا ہے۔ چنانچہ یہ طریقہ ایسا تھا جو قرآن کی تمام وجوہِ قراءات کا احاطہ کرتا تھا، تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ ان لوگوں نے اس کی قراءت کا کوئی حصہ ساقط کر دیا یا کسی کو اس کے کسی حرف کے ساتھ قراءت کرنے سے منع کر دیا جبکہ تمام قراءات اور حروف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل تواتر کے ساتھ منقول ہیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے کہ: "تم ان میں سے جو قراءت بھی کرو گے درست کرو گے لہٰذا شک وشبہ میں نہ پڑو۔"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کام کے لیے جو طریق کار وضع کیا تھا اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ انہوں نے ان قریشی حضرات سے کہا تھا کہ: جب تمہارا اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قرآن کے کسی حصے کے بارے اختلاف ہو تو اسے قریش کی زبان میں لکھنا کہ قرآن ان ہی کی زبان میں اترا ہے۔" ①

چنانچہ انہوں نے اس پر عمل کیا، یہاں تک جب وہ مصاحف میں صحف کو لکھ چکے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ صحف حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو واپس بھیج دیئے اور تمام علاقوں میں بھی ان کا لکھا ہوا مصحف بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس کے سواء جو مصحف یا صحیفہ بھی ہوا اس کو جلا دیا جائے۔

اس بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ اپنی صحیح میں اپنی سند کے ساتھ ابن شہاب رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے ان کو بیان کیا کہ: حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، اور وہ فتح ارمینیہ اور آذربیجان میں اہل عراق کے ہمراہ اہل شام کے ساتھ لڑتے تھے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں کے اختلاف قراءات نے پریشان کر دیا۔ چنانچہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ:

"اے امیر المؤمنین! اس امت کا ادراک کیجیے پہلے اس سے کہ وہ یہود ونصاریٰ کی طرح آپس میں اختلاف کرنے لگیں۔
چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو پیغام بھیجا کہ ہمیں وہ صحف بھیج دو جو مصاحف میں لکھے ہیں ہم آپ کو واپس لوٹا دیں گے، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو وہ مصاحف بھجوا دیئے۔

---

① صحیح البخاری، کتاب الفضائل، باب جمع القرآن

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، سعید بن العاص رضی اللہ عنہ، اور عبدالرحمن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ کو لکھنے کا حکم دیا، انہوں نے مصاحف میں نقل کیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تین قریشی لوگوں سے کہا کہ: جب تمہارا اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قرآن کے کسی حصے کے بارے میں اختلاف ہو تو اسے قریش کی زبان میں لکھ لینا کہ قرآن ان ہی کی زبان میں اُترا ہے، چنانچہ انہوں نے اس حکم کی تعمیل کی، پھر جب وہ مصاحف میں ان صحف کو لکھ چکے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ صحف حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو واپس کر دیئے۔ اور تمام اطراف میں ان حضرات کو لکھا ہوا مصحف بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس کے علاوہ جو صحیفہ یا مصحف ہوا اسے جلا دیا جائے۔" (ایضاً)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مصاحف کو جلا دینا

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سابقہ صورت میں مصاحف کی نقل کا کام مکمل کروا لیا اور تمام اطراف عالم میں اسے بھیج دیا تو حکم دیا کہ اس کے علاوہ جو کچھ بھی کسی کے پاس موجود ہو اس کو جلا دیا جائے خواہ صحیفوں کی شکل میں ہو یا مصاحف کی صورت میں ہو۔ یہ کام اس لیے کیا تاکہ ایک لحاظ سے اختلاف ونزاع کا جڑ سے خاتمہ ہو اور دوسرے اعتبار سے تمام مسلمان، کتاب اللہ کے بارے میں ایک ہی طریق پر جمع ہو جائیں۔ اور ان ہی مصاحف پر عمل پیرا ہو جائیں جو ان امتیازات وخصوصیات کا حامل ہے جو کسی دوسرے میں موجود نہیں ہیں۔ وہ خصوصیات درج ذیل ہیں:

① اس طریق پر اکتفاء کرنا جو تواتر سے ثابت ہے نہ کہ جس کی روایت خبر آحاد پر مشتمل ہے۔
② منسوخ التلاوۃ آیات کا اور آخری دور میں جو حصہ برقرار نہیں رہا اسے بھی ترک کرنا۔
③ سورتوں اور آیتوں کی موجودہ معروف طریقے پر ترتیب، جبکہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صحف اس کے برخلاف تھے ان میں سورتوں کی بجائے آیات کو مرتب کیا گیا تھا۔
④ ان مصاحف کی کتابت اس طریقے پر تھی کہ قرآن کی مختلف وجوہ قراءات اور ان حروف کو جامع اور حاوی تھی جس پر نزول قرآن ہوا تھا یعنی کلمات قرآن کو نقطوں اور اعراب سے معریٰ رکھا گیا تھا اور اگر ایک طرز کتابت ان وجوہِ قراءات وغیرہ کا محتمل نہ ہوتا تو مختلف مصاحف میں وجوہِ قراءات کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ (جیسا کہ پہلے تفصیل سے بیان ہوا)۔
⑤ ان مصاحف کو ہر اس چیز سے خالی رکھا گیا جو حقیقت میں "قرآن" نہیں تھا، جس طرح بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے خاص مصاحف میں بعض الفاظ کے معانی، تشریح یا ناسخ ومنسوخ کی وضاحت وغیرہ لکھ لیتے تھے۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم کی تعمیل میں اپنے مصاحف کو جلا دیا اور مصاحف عثمانی پر سب متفق ہو گئے، یہاں تک حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جن کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے پہلے تو مصاحف عثمانی کا انکار کیا تھا اور اپنے خاص مصحف کو جلانے سے انکار کیا تھا لیکن پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت کی طرف رجوع کر لیا تھا جب ان کے سامنے مصاحف عثمانی کے امتیازی اوصاف ظاہر ہوئے اور پتہ چلا کہ ساری امت اس پر متفق ہو چکی ہے اور مسلمانوں کے کلمہ اس پر ایک ہو چکا ہے۔

اس کے بعد ایک اسلامی فضا اور ماحول سازگار ہوا جو پہلے نزاع اور افتراق کا شکار تھا، اور مصحفِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ، مصحفِ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ، مصحفِ عائشہ رضی اللہ عنہا، مصحفِ علی رضی اللہ عنہ، مصحفِ سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ، اور دیگر تمام مصاحف قصہ ماضی بن گئے یا تو انہیں

پانی میں دھو دیا گیا یا نذرِ آتش کر دیا گیا۔

﴿وَ كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴾ (الاحزاب: ۲۵)

"اور خدا مومنوں کولڑائی کے بارے میں کافی ہوا اور خدا طاقتور (اور) زبردست ہے۔"

اللہ تعالیٰ کی ذات بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے راضی ہوئی کہ انہوں نے اپنے اس عمل اور کارنامے کی بدولت اپنے رب تعالیٰ کو راضی کیا، قرآن کی محافظت کی، امت میں اتحاد و یگانگت پیدا کی، فتنہ کا دروازہ بند کیا، تمام مسلمان اس روز سے آج تک ان کے اس مبارک عمل کا ثمرہ اور پھل چنتے رہیں ہیں اور آئندہ بھی چنتے رہیں گے۔

آپ رضی اللہ عنہ کے اس عمل پر قدغن نہیں لگائی جاسکتی کہ انہوں نے مصاحفِ عثمانیہ کے خلاف باقی تمام مصاحف اور صحف کو نذرِ آتش کر دیا تھا۔ کیونکہ آپ اچھی طرح اس کی وجہ جانتے ہیں، نیز حضرت عثمان نے یہ عمل از خود نہیں کیا بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے کیا تھا، ان کی آراء بھی اس مبارک عمل میں ان کے موافق تھیں بلکہ حضرت عثمان کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی معاونت، تائید اور قدر افزائی سے ہی کامیابی حاصل ہوئی۔

ابو بکر الانباری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت سوید بن غفلہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: "میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ انہوں نے فرمایا:

"اے لوگو کی جماعت! خدا سے ڈرو، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں غلو بازی سے اجتناب کرو یعنی ان کو یہ نہ کہو کہ وہ مصاحف کو جلانے والے ہیں، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی انہوں نے مصاحف کو اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کے مشورے سے ہی جلایا تھا۔"

عمر بن سعید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت میں والی ہوتا تو میں بھی وہی کام کرتا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔"

(اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو، اور اس مبارک عمل پر ان کو بہترین جزاء عطا فرمائے؟)

خلاصہ بحث

آپ جمع قرآن کے مسئلہ کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

① عہدِ نبوی ② عہدِ صدیقی ③ عہدِ عثمانی

عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع قرآن کا معنی یہ ہے کہ آیات کو لکھنا اور ترتیب دینا اور سورتوں میں خاص جگہ پر ان کو رکھنا، البتہ اس عہد میں آیات کھجور کی شاخوں، ہڈیوں اور پتھر کے ٹکڑوں میں بکھری ہوئی تھیں اور کتابت کے آلات جس قدر میسر تھے اس قدر کاغذوں پر بھی لکھی گئیں۔ اس عہد میں جمع قرآن کا مقصد قرآن کے وثوق و اعتماد کا زیادہ سے زیادہ لحاظ رکھنا، اگرچہ اس دور میں زیادہ تر اعتماد حفظِ قرآن پر تھا۔

اور عہدِ صدیقی میں جمع قرآن کا معنی یہ ہے کہ قرآن کو صحف میں لکھنا اور نقل کرنا، آیات بھی مرتب کرنا، غیر منسوخ التلاوۃ حصے پر اکتفاء کرنا اور تواتر اور اجماع کے ساتھ اس کی توثیق کرنا۔ اس دور میں جمع قرآن کا مقصد قرآن کو کتابت کی شکل میں

مرتب مجموعہ بنا کر محفوظ کرنا، اس خدشہ کے پیش نظر کہ کہیں حاملین وحافظین قرآن کی وفات کے سبب اس قرآن کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو جائے۔

اور عہدِ عثمانی میں جمع قرآن کا معنی یہ ہے کہ قرآن کو ان صحف سے نقل کر کے ایک مصحف امام میں جمع کر دینا اور پھر اس سے مختلف مصاحف لکھوا کر اطراف عالم اسلام میں بھیج دینا، اور سورتوں اور آیات کی ترتیب کے ساتھ ان مذکورہ اوصاف وامتیازات کا بھی ان میں لحاظ رکھا جانا جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس دور میں جمع قرآن کا مقصد اس فتنہ کا خاتمہ تھا جو مسلمانوں میں اختلاف قراءات کے سبب پھیل چکا تھا اور مسلمانوں میں وحدت اور یگانگت پیدا کرنا اور کتاب اللہ کی تغیر وتبدیلی سے حفاظت کرنا مقصود تھا۔

جس کے بارے میں ارشاد ربانی ہے:

﴿لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ (یونس: ۶۴)

"خدا کی باتیں بدلتی نہیں۔ یہی تو بڑی کامیابی ہے۔"

جمعِ قرآن کے بارے میں مختلف شبہات اور ان کے جوابات

قرآن ہمیشہ سے اعدائے اسلام کا ہدف رہا ہے، اس پر مختلف مطاعن کے تیر برساتے رہے ہیں اور اس کے علوم کو محض جھوٹ اور غلط بیانی سے موردِ شبہات والزامات بناتے آئے ہیں اور پھر لوگوں میں ظلم وتعدی کے ساتھ ان شبہات کی ترویج واشاعت بھی کرتے ہیں۔ ہم ذیل میں ان کے چند شبہات مع جوابات پیش کرتے ہیں:

پہلا شبہ

اس شبہ کی بنیاد سات طرح کے شبہوں پر ہے: وہ کہتے ہیں کہ جس طریقے پر قرآن کی جمع وتدوین کا کام ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ ساقط ہوا ہے، آج ہمارے ہاتھوں وہ قرآن نہیں ہے جس کے بارے میں محمد ﷺ کا جاننا یہ ہے کہ یہ کلام اس پر نازل ہوا ہے، ان لوگوں نے اس شبہ کے بارے میں درج ذیل مزعومات پر اعتماد کیا ہے۔

① محمد ﷺ نے فرمایا کہ: اللہ فلاں شخص پر رحم فرمائے کہ اس نے مجھے فلاں فلاں آیات یاد دلا دی، میں نے تو ان آیات کو ساقط اور حذف کر دیا تھا، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ وہ آیات تو مجھے بھلا دی گئیں تھیں۔ [1] اس میں خود نبی ﷺ اعتراف کر رہے ہیں کہ انہوں نے قصداً بعض آیات قرآنی ساقط کر دی تھیں یا انہیں بھلا دی گئی تھیں!

② سورۃ الاعلیٰ میں جو یہ الفاظ آتے ہیں: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۙ اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ﴾ (الاعلیٰ: ۶،۷) اس استثناء سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد (ﷺ) نے قصداً چند آیات ساقط کر دی تھیں یا انہیں یاد نہیں رہیں بھلا دی گئی تھیں!

③ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی قرآن کا بعض وہ حصہ حذف کر دیا تھا جس کے حذف کرنے میں انہوں نے مصلحت سمجھی، اس میں آیت متعہ بھی تھی جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ساقط کر دیا تھا بلکہ جو شخص اس آیت کو پڑھتا آپ اس کو مارتے تھے، خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس پر ان کی تشنیع کرتے ہوئے فرمایا: قرآن پر کوڑے لگاتے ہیں، اس سے دوسروں کو روکتے ہیں، اس نے قرآن میں

---

[1] رواہ البخاری فی کتاب الشہادات، باب ۱۱، ومسلم فی کتاب صلاۃ المسافرین حدیث ۲۲۴، والامام احمد فی المسند ۶۰/ ۶۲

تحریف اور تبدیلی کردی ہے۔

④ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے بھی قرآن کا وہ حصہ حذف کردیا تھا جس کو وہ نقل کرتے تھے آج ہم مصحف میں یہ حصہ دستیاب نہیں پاتے۔
((اللّٰهم انا نستعينك ونستهديك ونستغفرك ونتوب اليك ونؤمن بك ونتوكل عليك ونُثنى عليك الخير كله، نشكرك ولا نكفرك ونخلع ونترك من يفجرك اللّٰهم اياك نعبد ولك نصلى وَنَسْجُدُ واليك نسعىٰ ونحفد، نرجو رحمتك ونخاف عذابك ان عذابك الجدّ بالكفار ملحق)).

⑤ قرآن کی بہت سی آیات ایسی تھیں جن کی محافظت کی صورت صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ان کو زبانی یاد رکھنا تھا۔ ان میں کچھ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں شہید ہوگئے اور کچھ ان کے خلفاء اولین کی لڑائیوں میں قتل ہوگئے اس طرح جو حصہ ان کو یاد تھا وہ ان ہی کے ساتھ ضائع ہوگیا، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جمعِ قرآن کا حکم بعد میں دیا تھا اس لیے حضرت زید رضی اللہ عنہ صرف وہ حصہ جمع کر پائے جو اس وقت موجود اور زندہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو یاد تھا۔

⑥ قرآن کا جو حصہ ہڈیوں وغیرہ پر لکھا ہوا تھا اس میں کوئی نظم وضبط نہ تھا، اس کا کچھ حصہ ضائع ہو چکا تھا اور علی کا جو خیال ہے کہ اس میں کچھ آیات ایسی تھیں جو حرفاً تو منسوخ تھیں لیکن حکماً منسوخ نہیں تھیں، ان کا عجیب قسم کا زعم وخیال ہے جبکہ حقیقتِ حال یہی ہے کہ جن ہڈیوں پر آیات لکھی تھیں وہ ضائع ہوگئی تھیں اور ان کا صرف معنیٰ ومفہوم باقی رہ گیا تھا جو لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا۔

⑦ جب حجاج نے بنوامیہ کی نصرت ومدد شروع کی تھی تو اس نے تمام مصاحف کو جمع کر کے ان سے بہت سی ایسی چیزیں حذف کردی تھیں جو ان کے بارے میں نازل ہوئیں اور بہت سی ایسی چیزوں کا ان میں اضافہ کردیا تھا جو ان میں موجود نہیں تھیں، اس نے ارادے کے مطابق چھ نئے مصاحف لکھوائے اور ان کو مصر، شام، مکہ، مدینہ اور بصرہ کوفہ بھیجا، آج یہی قرآن ہمارے ہاں متداول ہے۔ اس نے سابقہ تمام مصاحف اور اس کے نسخے منگوا کر سرکہ میں ڈال دیئے تھے حتیٰ کہ وہ ریزے ریزے ہوگئے، اس کے اس عمل کا مقصد صرف بنوامیہ کی تائید تھا، چنانچہ اب قرآن میں ایسا کوئی حصہ باقی نہیں رہا جس میں بنوامیہ کی برائیاں مذکور ہوں؟!

مزعوماتِ باطلہ کا ردّ

اس شبہ کا حاصل یہ ہے کہ اس وقت جو قرآن ہمارے پاس موجود ہے وہ ناقص ہے۔ اس کا کچھ حصہ ساقط اور حذف شدہ ہے جس کی دلیل وہ سات مذعومات ہیں جو ہم نے آپ کے سامنے بیان کیے ہیں۔ اب ہم آپ کے سامنے ان مزعومات کی تردید کرتے ہیں تاکہ ہم اس شبہ کی اصل بنیاد پیش کرسکیں۔

① ان کا پہلا استدلال (ذکر کردہ حدیث) ان کے لیے قابل حجت نہیں ہے یعنی اس بنیادی حدیث میں شک وشبہ کا ہونا جس پر قرآن کی کتابت اور اس کا جمع ہونا مبنی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ حدیث ہر طرح کے شبہ سے محفوظ اور مضبوط ہے کہ یہ آیات ان وثائق میں لکھی ہوئی تھیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو لکھوائی تھیں، نیز جن صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان آیات کو اخذ کیا تھا ان کے سینوں میں بھی وہ محفوظ تھیں ایسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد بھی حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی ہے ان تمام کا اس کی صحت پر اتفاق بھی ہے، جیسا کہ جمع قرآن کے طریقِ کار میں یہ بات معروف ہے، بہت زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آدمی کا ان آیات کو پڑھنا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یاد آوری کا باعث بنا جو آیات آپ صلی اللہ علیہ وسلم

بھلا دیئے گئے یا حصہ نے نسیاناً ان کو حذف کر دیا تھا۔ بھول کر کوئی کام ہو جانا حضور ﷺ کے اعتماد کے منافی نہیں ہے، اس سے جمع قرآن اور کتابت قرآن کی دقت مشکوک نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس آدمی سے پہلے ہی حضور ﷺ کو وہ آیات یاد تھیں نیز کا تبان وحی کو لکھوا بھی دی تھیں اور لوگوں کو بھی پہنچا دی تھیں انہوں نے ان آیات کو یاد بھی کر لیا تھا، ان ہی میں سے مذکورہ روایات میں وہ آدمی (عباد بن بشار) بھی ہیں جسے وہ آیات یاد تھیں۔ مذکورہ حدیث میں ایسی کوئی بات بھی نہیں ہے جس سے پتہ چلے کہ وہ آیات کا تبان وحی کے تحریر کردہ مجموعہ میں محفوظ نہیں تھیں اور نہ ہی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اصحاب رسول ﷺ ان آیات کو بھول گئے تھے کہ ان کے ضیاع کا اندیشہ پیدا ہونے لگے، مصحفِ امام کے لکھوانے اور جمع کرتے وقت ان آیات کے سقوط اور حذف کا احتمال پیدا ہو جائے! جیسا کہ اٹکل سے کام لینے والے لوگ، الزام تراشی کرتے ہیں، بلکہ خود مذکورہ روایت سے صراحت کے ساتھ یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ایسے حضرات بھی موجود تھے جو ان آیات کو پڑھتے تھے اور رسول کریم ﷺ ان سے وہ آیات سنا کرتے تھے۔

علاوہ ازیں جمع قرآن کا طریق کار خود اس بات کا مؤید ہے کیوں کہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مصحف میں وہی آیات لکھی تھیں جن کے حفظ اور کتابت اور قرآنیت پر سب کا اجماع ہو گیا تھا، ان ہی میں مذکورہ آیات بھی ہیں جن پر ساری بحث وکلام کا مدار ہے۔

اس موقع پر دو امور پیش نظر رہنا ضروری ہیں:

① بعض روایات میں جو لفظ "اَسْقَطْتُهُنَّ" آیا ہے اس کا معنی ہے کہ میں نے ان آیات کو نسیاناً ساقط اور حذف کر دیا، جیسا کہ دوسری روایت میں خود لفظ "اُنْسِیْتُهُنَّ" بھی وارد ہے، یہ بات ناممکن ہے کہ اس سے مراد قصداً ساقط کرنا لیا جائے، اس لیے کہ رسولِ کریم ﷺ کی شان اقدس سے یہ بعید تر ہے اور معقول بھی نہیں ہے کہ آنحضور ﷺ اپنی جانب سے قرآن میں کوئی کمی بیشی فرمائیں ورنہ (نعوذ باللہ) آپ کا خائن ہونا لازم آئے گا وہ بھی بہت بڑی خیانت! اور پھر خائن شخص، رسول ﷺ اور پیغمبر بھی نہیں ہو سکتا۔

یہ تو خواہش نفس سے خالی عقلی حکم ہے، نقلی حکم بھی یہی ہے، اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝﴾ (الحجر:۹)

"بیشک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔"

نیز فرماتے ہیں:

﴿قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۝﴾ (یونس:۱۵)

"کہہ دو کہ مجھ کو اختیار نہیں ہے کہ اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو اسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف آتا ہے۔ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے (سخت) دن کے عذاب سے خوف آتا ہے۔"

② مذکورہ حدیث کی روایات سے یہ بات معلوم اور مستفاد نہیں ہوتی کہ یہ آیات جنہیں رسول اللہ ﷺ نے عباد بن بشار سے سنا تھا

آپ ﷺ کے ذہن شریف سے بالکل محو ہو گئی تھیں، زیادہ سے زیادہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آیات آنحضور ﷺ کے ذہن میں موجود نہ ہیں پھر عباد کے پڑھنے پر یاد آ گئیں۔ کسی چیز کا ذہن سے غائب ہو جانا یا کسی چیز کے بارے ذہن کا غافل ہو جانا اس کو ساقط یا محو کرنا نہیں کہلاتا۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ جب حافظ کا ذہن کسی دوسری چیز میں مشغول ہوتا ہے تو کوئی آیت وغیرہ اس کے ذہن سے غائب ہو سکتی ہے، اور اسے اس وقت یقین ہوتا ہے کہ اس کے حافظے میں وہ اس طرح سے محفوظ ہے کہ جب اس کا کوئی داعیہ پایا جائے گا تو وہ اس کو مستحضر کر لے گا اور پھر اسے پڑھ بھی لے گا۔ البتہ ایسا مکمل نسیان جو حافظہ سے کسی چیز کے محو ہونے کے مترادف ہو حضور ﷺ کے بارے میں اس کے محال اور ناممکن ہونے پر دلیل موجود ہے کہ ایسا نسیان رسالت وتبلیغ کی ذمہ داری میں خلل انداز ہونے کی وجہ سے آنحضور ﷺ کے لیے محال ہے، جب حضور ﷺ کو کوئی نسیان پیش آتا تو وہ گرما کے موسم کے بادل کی طرح ہوتا جو ختم ہونے کے لیے آتا تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں آنحضور ﷺ کا اس موقع پر نسیان کا پیش آنا اپنی ذمہ داری کے ادا کر دینے لوگوں تک ان آیات کے پہنچا دینے اور پھر لوگوں کے ان کو یاد کر لینے کے بعد پیش آیا، ایسا نسیان ہرگز رسالت وتبلیغ کے امور میں خلل انداز نہیں ہوتا۔

علامہ بدر الدین العینی رحمہ اللہ نے اپنی شرح صحیح البخاری میں باب نسیان القرآن میں لکھا ہے کہ:

"جمہور اہل علم کہتے ہیں کہ حضور ﷺ پر نسیان کا پیش آنا ان امور میں جس کا تعلق احکام کی تبلیغ وتعلیم سے نہ ہو جائز ہے، بشرطیکہ آپ ﷺ کو اس پر قائم نہ رکھا جائے بلکہ ضروری ہے کہ آپ ﷺ کو اس کی یاد دہانی کرائی جائے، اور جو نسیان اس کے علاوہ ہو وہ تبلیغ احکام سے قبل پیش نہیں آ سکتا، اور جس امر کو حضور ﷺ نے آگے پہنچا دیا ہو اس کا نسیان جیسا کہ اس حدیث میں ہے، وہ بغیر کسی اختلاف کے جائز ہے۔

اس کتاب کی پہلی طباعت میں میں نے اس روایت کو بعض مصنفین کی اتباع میں موضوع کہا تھا، لیکن نظر ثانی اور بعض اہل علم وفطانت کے متنبہ کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مذکورہ حدیث صحیح درجہ کی ہے۔ شیخین نے اسے روایت کیا ہے۔ چنانچہ صحیح البخاری میں ہشام عن عروہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ:

"نبی کریم ﷺ نے مسجد میں ایک شخص کو (قرآن) پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا: اللہ اس پر رحمت فرمائے کہ اس نے مجھے فلاں سورت کی فلاں فلاں آیات یاد دلا دی۔"

ایک دوسری روایت میں امام بخاری نے یہ اضافہ بھی ذکر کیا ہے کہ:

"اور فرمایا کہ میں نے تو فلاں فلاں سورت سے ان آیات کو ساقط کر دیا تھا۔ ①

صحیح مسلم میں بھی ہشام اپنے والد سے وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کرتے ہیں کہ: حضور نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو رات کے وقت پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا:

"اللہ اس پر اپنی رحمت فرمائے! اس نے مجھے فلاں فلاں آیت یاد دلا دی جسے میں فلاں فلاں سورت سے ساقط کر چکا تھا۔" ②

---

① البخاری، کتاب الشہادات، باب ۱۱

② صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین حدیث ۲۲۴

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "التبیان فی آداب حملۃ القرآن" میں لکھتے ہیں کہ:

"صحیحین میں بھی یہ موجود ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمائی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا: اللہ اس پر رحم فرمائے، اس نے مجھے ایک آیت یاد دلا دی جس کو میں ساقط کر چکا تھا۔"

اور صحیح کی ایک روایت میں "کنت أُنسیتُھا" کے الفاظ ہیں کہ جو مجھے بھلا دی گئی تھی۔

سبحان ربی! ﴿لَا یَضِلُّ رَبِّیۡ وَ لَا یَنۡسَی ﴾ (طٰہٰ:۵۲)

② باقی رہا ان کا دوسرا استدلال یعنی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ﴾ (الاعلیٰ:۶،۷) میں استثناء کے ذکر سے استدلال کرنا تو یہ بھی ان کے زعم کو ثابت نہیں کرتا کیونکہ یہ حقیقی استثناء نہیں ہے بلکہ صوری استثناء ہے، اور اس کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس بات کی تعلیم دینا چاہتا ہے کہ میں نے ﴿فَلَا تَنۡسٰۤی ۙ﴾ میں جو عدم نسیان کا وعدہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہے وہ محض میرا فضل واحسان ہے، اگر میں چاہوں تو بھلا بھی سکتا ہوں۔ پھر اس صوری استثناء میں دو فائدے ہیں:

① اس کا ایک فائدہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ وقت یہ بات یاد رکھیں کہ وہ اللہ کی نعمت وفضل کے حق دار رہیں گے جب تک کہ قرآن کو یاد رکھیں گے، اسے بھولیں گے نہیں۔

② دوسرا فائدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے متعلق ہے کہ امت بھی جان لے کہ ان کے جس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے خصائص اور عطایا سے نوازا ہے وہ اس کی وجہ سے دائرہ عبودیت سے باہر نہیں ہو گئے، لہٰذا ان نصاریٰ کی طرح کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں جو اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مبتلائے فتنہ ہوئے۔ اور اس بات کی دلیل کہ مذکورہ استثناء حقیقی نہیں بلکہ صوری ہے۔ دو امور ہیں:

① ان آیات کا شان نزول اس پر دال ہے، وہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کثرت تلاوتِ قرآن سے تھکا دیا کرتے تھے نزولِ وحی کے وقت، اس ڈر سے کہ کہیں بھول نہ جائیں یا کوئی حصہ قرآن کا چھوٹ نہ جائے، چنانچہ اللہ کی رحمت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حوالے سے تسلی دیدیں اور اس مشقت سے نکال کر راحت پہنچائیں اس پر مذکورہ آیت اُتری، جیسا کہ یہ آیات نازل ہوئی تھیں:

﴿لَا تُحَرِّکۡ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعۡجَلَ بِہٖ ﴿ؕ۱۶﴾ اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَہٗ وَ قُرۡاٰنَہٗ ﴿ۚ۱۷﴾﴾ (القیامۃ:۱۶،۱۷)

"اور (اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وحی کے پڑھنے کیلئے اپنی زبان نہ چلایا کرو کہ اسکو جلد یاد کرلو۔ اسکا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔"

نیز یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَ لَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یُّقۡضٰۤی اِلَیۡکَ وَحۡیُہٗ ۫ وَ قُلۡ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا ﴿۱۱۴﴾﴾ (طٰہٰ:۱۱۴)

"اور قرآن کی وحی جو تمہاری طرف بھیجی جاتی ہے اس کے پورا ہونے سے پہلے قرآن کے (پڑھنے کے) لئے جلدی نہ کیا

کرو اور دعا کرو کہ میرا پروردگار مجھے اور زیادہ علم دے۔"

② آیت مذکورہ کے جزو ﴿ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ﴾ میں وقوع نسیان کو مشیت الٰہی پر موقوف کیا گیا ہے اور مشیت الٰہی وقوع پذیر نہیں ہوئی جس کی دلیل گزر چکی کہ ﴿ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ﴾ (القیامۃ: ۱۶، ۱۷) جب ایسا ہے تو نسیان بھی واقع نہیں ہوا۔ کیونکہ معلق علیہ کا عدم حصول، معلق کے عدم حصول کو مستلزم ہوتا ہے، جو شخص اسالیب لغت کا ذوق رکھتا ہو اور جس کی نظر وجوہِ ادلہ پر ہو اسے اس بات میں ذرا بھی تردد نہ ہوگا کہ مذکورہ آیت دراصل اللہ کی طرف سے تاکیدی وعدہ پر مشتمل ہے کہ رسول ﷺ کو اللہ خود پڑھا دیں گے۔ تو وہ کبھی نہ بھولیں گے یہ وعدہ ابدی طور پر ہے کہ کسی بھی وقت کا اس میں حقیقی استثناء نہیں ہے۔ بصورت دیگر مذکورہ آیت، حضور ﷺ کے لیے باعث تسلی کیسے ہو سکتی ہے، نیز ان آیات کا نزول بھی عبث اور لغو کلام کے مشابہ ہو جائے گا۔

علامہ شیخ محمد عبدہ مرحوم مذکورہ آیت میں استثناء کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چونکہ یہ وعدہ ربانی لزوم اور ابدی قسم کا تھا تو ممکن تھا کہ یہ وہم ہوتا کہ اللہ کی قدرت اس کے غیر کو شامل نہیں ہے اور یہ امر اس کے ارادے سے خارج ہوگا اس لیے استثناء کے انداز میں فرمایا: ﴿ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ﴾ مطلب یہ ہوا کہ جب وہ ذات آپ ﷺ کو کوئی بات بھلانا چاہے گی تو کوئی چیز اس کو بے بس نہیں کر سکتی، تو اصل مقصد ہے نسیان کی بالکلیہ نفی کرنا، اہل علم کہتے ہیں کہ: یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے صاحب سے کہتا ہے: "انت سھیمی فیما املك الا ما شاء الله" یعنی تو میرا حصے دار ہے اس چیز میں جس کا میں مالک ہوں مگر جو اللہ چاہے تو اس کا مقصد کسی چیز کا استثناء کرنا نہیں ہوتا، یہ دراصل قلت کو نفی کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ اسی طرز پر یہ ارشاد الٰہی بھی ہے:

﴿ وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ ﴾ (ھود: ۱۰۸)

"اور جو نیک بخت ہوں گے وہ بہشت میں (داخل کیے جائیں گے اور) جب تک آسمان اور زمین ہیں ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ مگر جتنا تمہارا پروردگار چاہے۔ کہ خدا کی بخشش ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی۔"

اس طرح کا استثناء اس بات پر تنبیہ کے لیے ہوتا ہے کہ اگر وہ ذات اپنی عطا کردہ چیز کو سلب کرنا چاہے تو کوئی چیز اسے روک نہیں سکتی۔ اور جو یہ بات آتی ہے کہ حضور ﷺ اپنی کوئی بات جو آپ ﷺ کو یاد تھی بھول گئے تھے۔ اگر تو یہ بات درست ہے تو اس کا تعلق اس قرآن اور احکام سے نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے جس کی تبلیغ کا آپ ﷺ کو حکم دیا گیا تھا، اس کے علاوہ جو بات بھی کہی جاتی ہے وہ اصل میں ملحدین کی کارستانیاں ہیں جس سے غافل لوگوں کی عقلیں متاثر ہوئیں چنانچہ انہوں نے اس چیز کو ملوث کر دیا جسے اللہ نے پاکیزہ بنایا تھا، لہٰذا جو شخص صاحب شریعت ﷺ کی عظمت سے واقف ہے تو وہ اللہ کی کتاب پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے یہ بات نامناسب ہے کہ وہ ایسی کسی بات کو اس سے متعلق قرار دے۔"

استثناء کے معنی و مفہوم کے سلسلہ میں یہ ایک رائے ہے، یہاں ایک اور توجیہ بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ استثناء حقیقی ہے، لیکن اس سے منسوخ التلاوۃ حصہ مراد ہے نہ کہ دوسرا کوئی حصہ۔ آیت مذکورہ کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر ﷺ کو پڑھا دیں گے

تو وہ اسے نہیں بھولیں گے مگر جسے وہ چاہے یعنی جس کی تلاوت منسوخ کر دی جائے کسی حکمت کی بناء پر جیسا کہ علماء نے نسخ کی بحث میں اس کی حکمتیں بیان کی ہیں۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾ (البقرة:۱۰۶)

"ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔"

ایک قراءت میں یوں ہے:

﴿مَا نُنْسِكَ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نَنْسَخْهَا﴾ مطلب یہ ہوا کہ ہم جس آیت کو بھی اپنی حکمت و مصلحت کے تقاضے کے مطابق لے جاتے ہیں صرف الفاظ یا صرف حکم یا دونوں کو ختم کر کے اور اس کی جگہ کوئی اور آیت لے آتے ہیں یا اس کے بدلے کوئی نہیں لاتے، ﴿نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ﴾ تو اس سے بہتر یعنی ایک اور نوع کی آیت لے آتے ہیں جو منسوخ شدہ آیت کے مقابلے میں حال و موقع کے مناسب بھی ہوتی ہے اور اجر و ثواب میں بھی بندوں کے لیے زیادہ بہتر ہوتی ہے، نیز ہمزہ کو الف سے بدل کر بھی (او مثلها) پڑھا گیا ہے۔ نفع و ثواب میں اس کے مثل ہوتی ہے۔

بہر حال! مذکورہ آیت: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىٓ ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ (الاعلیٰ:۶،۷) میں استثناء کا جو بھی مفہوم لیا جائے اس سے یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ پیغمبر ﷺ کوئی ایک حرف بھی اس کلام کا بھول گئے ہوں جس کی تلاوت اور مخلوق کو اس کی تبلیغ کا حکم دیا گیا ہو اور جس کی قراءت اور بلا نسخ جس کی قرآنیت پر بقائے شریعت کا آپ ﷺ کو حکم دیا گیا تھا۔

اور یہ اس بناء پر کہ "نسیان" سے مکمل طور پر حافظے سے محو ہونا مراد ہو، اگر اس سے ذہن سے کوئی چیز غائب ہو جانا مراد ہو تو ابھی اس سے پہلے اس پر بات ہو گئی ہے۔

یہ بات آپ کے خیال میں بھی نہ آئے کہ پیغمبر ﷺ کا سہو یا نسیان اس کے مقام و مرتبہ پر اثر انداز ہوتا ہے! کیونکہ یہ سہو و نسیان کے دواعی ایک حد تک تو قابل تعریف ہیں۔ جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے:

یا سائلی عن رسول اللہ کیف سها	والسهو من کل قلب غافل لاهی
سها عن کل شیء سره فسها	عما سوی اللہ فالتعظیم للہ

"اے وہ شخص جو رسول اللہ ﷺ کے سہو کے بارے میں پوچھتا ہے کہ آپ ﷺ کو کیسے سہو ہوا؟ سہو و نسیان تو غافل اور لاپرواہ کو ہوا کرتا ہے، آپ ﷺ کا دل اللہ کے سواء ہر چیز کو بھول چکا تھا، لہٰذا اللہ کی ذات تعظیم کی حقدار ہے۔"

③، ④ ان حضرات کا تیسرا اور چوتھا استدلال کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے مصلحت کے خیال سے جمع کردہ قرآن کا کچھ حصہ حذف کر دیا تھا، آیت متعہ اور صیغہ قنوت بھی اس میں شامل تھا! یہ استدلال بھی بے بنیاد ہے، جبکہ اس کے مقابلے میں صحیح اور کثیر نصوص اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو قرآن کی احتیاط کے معاملہ میں بہت زیادہ فکرمند رہتے تھے، قرآن کی حفاظت اور اس کے تحفظ کے بارے میں سب سے زیادہ ہوشیار تھے اس لیے انہوں نے تواتر سے ثابت شدہ حصے کو ہی قرآن میں شمار کیا اور

جو حصہ تواتر سے ثابت نہ ہوا اسے چھوڑ دیا کیونکہ وہ قطعی نہ تھا، ان کا دین بھی اور عقل بھی انہیں اس بات پر آمادہ نہیں کرتی تھی کہ وہ ایک غیر قطعی چیز کی قرآنیت کے قائل ہوں۔ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ انہوں نے عہدِ صدیقی اور عہدِ عثمانی میں صحف کی کتابت کے دوران بہت سے مضبوط دساتیر لکھے تھے۔ اگر آپ چاہیں تو ان کو ملاحظہ کر سکتے ہیں تا کہ آپ کو پتہ چلے کہ وہ لوگ کس قدر ضلالت و گمراہی سے بچنے والے تھے۔

یہ لوگ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کتاب اللہ کے بارے میں طعن والزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے کتاب اللہ کا وہ حصہ حذف کر دیا جو کہ غیر متواتر تھا یا عرضہ اخیرہ (آخری دور) کے موقع پر موجود نہ تھا یا جو حصہ منسوخ التلاوۃ تھا اور جن کو اس کے نسخ کی خبر نہ ہوئی وہ اس کو پڑھتا تھا، ہم کہتے ہیں کہ ایسے لوگ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعنہ زنی کرتے ہیں اور قرآن کے معاملہ میں اس طرح کی باتیں کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ اپنے آپ کو الزام دیں اور خود کو کسی سے بچائیں، کیونکہ مسلمان تو ہمیشہ سے معزز رہے ہیں کہ کتاب اللہ کے بارے میں بغیر علم کے کچھ نہیں کہتے، جب تک کوئی قطعی حجت موجود نہیں ہوتی کوئی بات کتاب اللہ کی طرف منسوب نہیں کرتے، ان کی طرح قرآن کے ساتھ بھی تحریف شدہ کتب یا تبدیل کردہ اناجیل جیسا سلوک نہیں کرتے۔ ہم ان کو وہ بات یاد دلاتے ہیں جسے وہ بار بار دہرایا کرتے ہیں کہ: "جس کا اپنا گھر شیشہ کا ہو وہ دوسروں پر پتھر نہ مارے۔"

اس موضوع کے بارے میں فیصلہ کن بات یہ ہے کہ جس آیت متعہ اور صیغہ قنوت کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں اور ان سے استدلال کرتے ہیں ان کا قرآن ہونا ثابت نہیں ہے۔ کہ یہ دونوں چیزیں بھی قرآن کا حصہ قرار دی جائیں (ایسا نہیں ہے) اگر ان کو ان کی قرآنیت کا دعویٰ ہے تو پھر فرمانِ الٰہی: ﴿قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ﴾ (البقرۃ:۱۱۱) کے تحت ان کے ذمہ اس کا ثبوت فراہم کرنا لازم ہوگا۔

صاحب "الانتصار" لکھتے ہیں: "کلام قنوت جو منقول ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف میں اس کو لکھا تھا، اس سے اس کا قرآن منزل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ دعا کی ایک قسم تھی، اگر بالفرض وہ قرآن ہوتا تو لازمی بات ہے کہ قرآن کی طرح ہم تک ضرور اسے نقل کیا جاتا اور اس کی صحت کا قطعی علم ہوتا، پھر وہ فرماتے ہیں کہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ وہ پہلے قرآن کا حصہ ہو پھر اسے منسوخ کر کے صرف اس کو دعا کے طور پر پڑھنے کی اجازت دے دی گئی ہو اور اسے اس حصہ کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا ہو جو قرآن نہیں ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے تو صحیح روایت کے مطابق جو بات مروی ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مصحف میں کچھ دعائیں یا تفسیری حصہ لکھ لیا تھا جو حقیقت میں قرآن کا جز نہیں تھا۔"

یہ دعا ہی قنوت ہے جسے علمائے حنفیہ نے اخذ کیا ہے۔ بعض حضرات نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے مصحف میں اس کو ثبت کیا تھا اور اس کا نام سورۃ الخلع والحفد رکھا تھا، کیونکہ اس میں یہ دو الفاظ مذکور ہوئے ہیں۔ آپ اس توجیہ سے واقف ہو چکے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو خاص اپنے لیے مصاحف لکھا کرتے تھے وہ بسا اوقات ان مصاحف میں قرآن کے بعض معانی یا تفسیری کلمات بھی لکھ لیتے تھے جو دراصل قرآن کا جز نہ ہوتے تھے یا چند دعائیں لکھ لیتے تھے جو دراصل قرآن کا جز نہ ہوتے تھے یا چند دعائیں لکھ لیتے تھے جو قرآنی دعاؤں کی طرح ہوتی تھیں یعنی جن کا نماز میں قنوت کے وقت پڑھنا

درست ہوتا، اور انہیں اس بات کا پورا علم ہوتا تھا کہ یہ چیزیں قرآن کا جزو نہیں ہیں، لیکن کتابت کا سامان دستیاب نہ ہونے اور صرف اپنے لیے قرآن کے لکھنے کی وجہ سے وہ ایسا کرتے تھے۔ کیونکہ انہیں اپنے بارے میں قرآن کے التباس واشتباہ سے پوری طرح اطمینان حاصل تھا، مگر بعض کوتاہ بین قسم کے لوگ سمجھنے لگے کہ انہوں نے مصاحف میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ محض اس لیے لکھا ہے کہ یہ قرآن ہے حالانکہ حقیقت حال ایسی نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت وہی تھی جو ابھی آپ کو معلوم ہوئی۔

علاوہ ازیں حضور نبی کریم ﷺ کی مبارک زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا ہے کہ آپ ﷺ نے غیر قرآن کی کتابت سے منع فرما دیا تھا، جیسا کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ:

"میری باتیں نہ لکھا کرو اور جس نے قرآن کے سوا میری کوئی بات لکھی ہو اسے چاہیے کہ اسے مٹا دے۔"

یہ سب اس وقت تک تھا۔ جب قرآن کا دیگر کلام کے ساتھ التباس واشتباہ کا اندیشہ موجود تھا۔

⑤ ان حضرات کا پانچواں استدلال کہ قرآن کی بہت سی آیات کے تحفظ کا ذریعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، بہت سے صحابہ شہید ہو گئے، جو حصہ ان کے پاس محفوظ تھا وہ ان کے ساتھ ہی ضائع ہو گیا!

ان کا استدلال ہمیں تسلیم نہیں، کیونکہ قرآن کا جو حصہ اُن شہداء اور قراء کو یاد تھا اور ان کے سینوں میں محفوظ تھا وہ صرف ان ہی کے پاس محفوظ نہیں تھا بلکہ جو صحابہ زندہ تھے اور شہید نہیں ہوئے وہ بھی اس حصہ کو محفوظ رکھے ہوئے تھے، جس کی دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

"مجھے خدشہ ہے کہ تمام علاقوں سے قراء کرام وفات نہ پا جائیں۔"

اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ سب کے سب فوت نہیں ہو گئے تھے، اصل مسئلہ صرف خوف واندیشہ کا تھا۔ نیز یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت اور دیگر بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی قرآن کے حافظ تھے، نیز یہ سب حضرات جمع قرآن کی تکمیل تک زندہ رہے ان کی زندگی میں ہی قرآن کو مختلف مصاحف میں نقل کیا گیا ہے، حضرت زید رضی اللہ عنہ نے مکمل قرآن لکھا تھا، کوئی لفظ بلکہ حرف بھی نہیں چھوڑا۔ حتیٰ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خود اس بات کی توثیق کرتے تھے کہ جمع قرآن کے سلسلہ میں حفظ اور کتابت دونوں پر اعتماد کیا جائے، صرف ایک چیز پر نہیں۔ اور پھر کتابت میں بھی وہ اس بات کو یقینی بناتے کہ یہ حصہ، حضور ﷺ کے سامنے لکھا گیا ہے۔ اور اس پر باقاعدہ دو گواہ طلب کیے جاتے تھے۔ جیسا کہ اس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔

⑥ ان حضرات کا چھٹا استدلال کہ ہڈیوں پر لکھا ہوا قرآن کا حصہ منظم طور پر نہیں تھا اور منضبط طریقے پر موجود نہیں تھا۔ اس استدلال کو وہ بات مخدوش کر دیتی ہے جو جمع قرآن کے بارے میں ابھی ہم نے بیان کی ہے کہ قرآن کی آیات توقیفی ہیں، اور حضور ﷺ کاتبان وحی کو ہدایت دیا کرتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت کی فلاں جگہ پر لکھ دو، نیز آپ ﷺ اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کو بھی اسی ترتیب کے مطابق پڑھایا کرتے تھے اور تمام لوگ اسے یاد بھی کرتے تھے اور کمزور حافظے والے اسی طرز پر اپنے لیے لکھ لیتے تھے، یہاں تک کہ قرآن کی ترتیب اور اس کی آیات کا نظم وضبط حفظ وکتابت دونوں اعتبار سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان معروف ہو چکا تھا۔ جو حصہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے لکھا گیا تھا اس کو قرآن کی شکل میں ہر چمڑے اور ہڈی پر بھی اسی

طرح مرتب صورت میں پایا، اگرچہ وہ ہڈیاں اور چمڑے وغیرہ منتشر اور بکھرے ہوئے ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ ہم کئی بار یہ بات کر چکے ہیں کہ (جمعِ قرآن کے سلسلہ میں) اعتماد صرف تحریر پر نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ حفظ و تعلیم پر بھی تھا۔ یقینی بات ہے کہ حفظ و کتابت دونوں کو ملحوظ رکھنا قرآنی آیات کے منظم و مرتب اور منضبط ہونے کی ضمانت دیتا ہے۔

باقی اس استدلال کے ذیل میں ان کا یہ کہنا کہ آیات قرآن کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا تھا! اس بارے میں بظاہر ان کا اعتماد اس منقول بات پر ہے کہ سورۃ براۃ کے آخر سے ایک آیت دستیاب نہیں ہو رہی تھی پھر وہ خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس ملی۔" اس سے انہوں نے سمجھا کہ شاید یہ ہماری طرف سے اس بات کا اعتراف ہے کہ لکھے ہوئے قرآن کا کچھ حصہ ضائع ہو چکا تھا!

حالانکہ بات ایسی نہیں جیسی انہوں نے سمجھی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو وہ آیت صرف حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کے پاس مکتوب حالت میں ملی جبکہ دیگر تمام آیات متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس مکتوب حالت میں موجود تھیں۔ کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس آیت کو پڑھتے بھی تھے، یاد بھی کرتے تھے، اچھی طرح اس سے واقف بھی تھے، جس کی دلیل ان کا یہ قول ہے: "ایک آیت نہیں مل رہی تھی۔" کیونکہ اگر ایسی بات تھی جیسے تم کہتے ہو تو انہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ آیت لکھنے سے رہ گئی ہے، اگر انہیں وہ آیت یاد نہیں تھی؟ نیز ان حضرات کا اس استدلال کے ذیل میں یہ بات کہنا کہ! بعض حصے کے ضائع ہونے کے سبب ہی بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو نسخ آیات کا دعویٰ کرنا پڑا۔ یہ ان کا عجیب قسم کا دعویٰ ہے، یہ بے بنیاد بات ہے، اس کا مقصد نسخ کا انکار اور اس کو مطعون کرنا ہے۔ عنقریب نسخ اور اس کی حکمت پر تفصیلی گفتگو آ رہی ہے اور ان شاء اللہ مخصوص بحث کے تحت اس بارے شبہات اور ان کے جوابات بھی ذکر کیے جائیں گے۔

⑦ ان حضرات کا ساتواں استدلال یعنی کہ حجاج کی طرف جو بات انہوں نے منسوب کی ہے۔ وہ بالکل جھوٹی ہے، اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ تاریخ سے کوئی ثبوت پیش کیا جائے کہ حجاج نے قرآن میں کمی بیشی کرنا تو دور کی بات ہے اس کا مصاحف کو جمع کرنے کا ثبوت بھی پیش نہیں کر سکتے۔

اگر یہ بات ہوتی، حجاج نے ایسا کوئی کام کیا ہوتا تو ہم تک ضرور متواتر طور پر یہ بات پہنچتی، کیونکہ ایسی باتیں تواتر سے نقل ہوا کرتی ہیں اس کے دواعی و اسباب کثرت سے موجود ہوتے ہیں، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حجاج نے ایسا کوئی کام کیا ہو ساری اُمت اس قرآن کا اقرار کرتی ہے اور اس کے دور میں حسن بصری جیسے ائمہ دین موجود تھے وہ بھلا کیسے خاموش رہ سکتے تھے، وہ کیسے نکیر نہ کرتے اور دفاع نہ کرتے اور پھر ان کو قتل کا مطالبہ نہ کیا جاتا۔ یہ محض الزام و بہتان ہے۔ علاوہ ازیں حجاج بن یوسف تو محض ایک اسلامی علاقے کا گورنر تھا وہ کیسے مصاحف کو جمع کر کے انہیں نذرِ آتش کر سکتا ہے۔

اگر ہم فرض کرلیں کہ حجاج کو ایسی شان و شوکت حاصل تھی کہ اس زمانے کے تمام لوگ اسلام اور قرآن کے بارے میں اس عظیم حادثہ کے متعلق خاموش رہے تو پھر حجاج کے زمانے کے بعد کس چیز نے مسلمانوں کو خاموش کر دیا تھا؟ اگر حجاج میں اس بات کی طاقت تھی کہ قرآن میں جیسے چاہے کمی بیشی کر کے اس کو کھلواڑ بنائے تو حفاظ کے دلوں میں جو قرآن موجود تھا اس پر اس کا تسلط کیونکر ممکن تھا! وہ بھی تو اس کے دور میں ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ سب بے بنیاد دعوے ہیں اس کا بودا پن خود ان کے الفاظ میں موجود ہے۔ لوگوں کو جہالت و ضلالت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

تیسرا شبہ وہ اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جمع قرآن کے وقت قرآن میں جس طرح کمی کی گئی اسی طرح زیادتی بھی کی گئی ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے معوذتین کو قرآن کا جزو ماننے سے انکار کیا ہے اور قرآن کا بعض حصہ ایسا ہے جو ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کا کلام ہے۔

اس شبہ کا جواب ① ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت صحیح درجہ کے ساتھ منقول نہیں ہے جس سے تم لوگ استدلال کرتے ہو کہ وہ معوذتین کو قرآن کا حصہ مانتے تھے۔ یہ مسئلہ بہت سی کتب تفسیر وعلوم قرآن میں پوری بسط وتفصیل کے ساتھ مع جوابات مذکور ہے۔

اس بارے میں علماء نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ: مسلمانوں کا تواترِ قرآن کے وجوب پر اتفاق ہے۔ لیکن اس پر اس روایت سے اشکال ہوتا ہے جس میں منقول ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ، فاتحہ اور معوذتین کی قرآنیت کا انکار کرتے تھے۔ بلکہ یہ مروی ہے کہ انہوں نے اپنے مصحف سے معوذتین کو کھرچ دیا تھا یہ خیال کرتے ہوئے کہ معوذتین، قرآن کا حصہ نہیں ہے۔ علماء نے اس کا جواب دیتے ہوئے اس روایت کی صحت سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ شرح المہذب میں لکھتے ہیں: "مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ معوذتین اور سورۃ فاتحہ، قرآن کا حصہ ہے، اور جو اس کے کسی حصے کا انکار کرتا ہے وہ کافر ہوگا اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس بارے جو کچھ منقول ہے وہ بے بنیاد اور غلط ہے۔"

ابن حزم رحمہ اللہ "القدح المعلی" میں لکھتے ہیں: یہ بات ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر جھوٹ اور من گھڑت ہے۔ بلکہ خود ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی قراءت عاصم صحیح سند کے ساتھ منقول ہے اور اس کے اندر معوذتین اور فاتحہ بھی موجود ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ: "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں سورتیں نماز میں تلاوت فرمائیں۔" ابن حبان رحمہ اللہ نے تو ایک دوسری سند سے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے یہ بھی نقل کیا ہے: "اگر تجھ سے ہو سکے کہ نماز میں یہ دونوں پڑھنا نہ چھوٹے تو ضرور ایسا کرو۔"

امام احمد رحمہ اللہ نے بھی ابو العلاء بن الشخیر کے طریق سے ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں معوذتین پڑھائیں اور ان صحابی رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا: "جب تم نماز پڑھو تو ان معوذتین کو پڑھا کرو۔" [1]

② اس بات کا احتمال موجود ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا معوذتین اور فاتحہ کا انکار اس کی صحت کے متعلق پہلے تھا، لیکن جب بعد میں ان کی قرآنیت پر اجماع ہو گیا تو ان کا نام بھی ان لوگوں کے سرفہرست آ گیا جو اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ یہ دونوں بھی قرآن کا حصہ ہیں۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ: "اس بات کا بھی احتمال ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے خود معوذتین کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سماعت نہ فرمایا ہو اور ان کے نزدیک معاملہ تواتر کی حد کو نہ پہنچا ہو اس لیے انہوں نے ان دونوں کے بارے میں توقف اختیار کیا ہو، انہوں نے انکار اس لیے نہیں کیا کہ وہ ابھی اسی بحث وجستجو میں تھے ان پر لازم تھا کہ وہ اس معاملہ میں تحقیق کرتے۔"

شاید اس جواب سے دلوں کو اطمینان اور تسلی حاصل ہو، کیونکہ عاصم کی قراءت جو زرعہ عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے منقول ہے اس میں معوذتین اور فاتحہ دونوں موجود ہیں اور یہ قراءت بھی صحیح درجہ کی ہے۔ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کا نقل ہونا بھی

① مسند احمد (۷۹/۵)۔ اسنادہ صحیح

صحیح سند کے ساتھ ہے۔ اسی طرح ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا معوذتین کا انکار کرنا ایک ایسے طریق سے مروی ہے کہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔ لہٰذا ان دو روایتوں میں تطبیق دینے کے لیے اس انکار والی روایت کو ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی پہلی روایت پر محمول کرنا چاہیے۔

جس طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے معوذتین کی قرآنیت کا انکار منقول ہے اسی طرح فاتحہ کی قرآنیت کا انکار بھی منقول ہے، بلکہ فاتحہ کی قرآنیت کا انکار تو سرے سے بے بنیاد اور گمراہی میں پڑنا ہے، اس لیے کہ سورۃ فاتحہ، ام القرآن اور السبع المثانی ہے یعنی نماز کی ہر رکعت میں اسے پڑھا اور دہرایا جاتا ہے، خواہ کوئی مسلمان مرد ہو یا مسلمان عورت سب اسے نماز میں دہراتے ہیں لہٰذا یہ بات ناممکن ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے فاتحہ کی قرآنیت کا معاملہ مخفی ہو، اس کی قرآنیت سے انکار تو بہت بعید ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات اس بارے میں ان سے منقول ہے وہ یہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اسے اپنے مصحف میں تحریر نہیں کیا تھا۔ اس سے انکار معلوم نہیں ہوتا ہے۔ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "باقی ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فاتحہ کو اپنے مصحف سے ساقط کرنا وہ اس وجہ سے نہ تھا کہ ان کا خیال تھا کہ معاذ اللہ فاتحہ قرآن کا حصہ نہیں ہے، بلکہ ان کا خیال تھا کہ قرآن تو وہ ہے جو شک ونسیان اور کمی وزیادتی کے خدشے سے دور دو لوحوں کے درمیان لکھا اور جمع کیا گیا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اپنے مصحف میں فاتحہ کے نہ لکھنے کا واضح سبب یہی تھا کہ یہ قرآن کا حصہ ہے، اور اس کے بارے میں شک ونسیان اور کمی وزیادتی کا کوئی اندیشہ بھی نہیں ہے۔

⑤ اگر ہم یہ بات تسلیم کرلیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے معوذتین کا اور فاتحہ کا بلکہ سارے قرآن کا انکار کیا تھا، تو ان کے انکار سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ اس انکار سے تواتر قرآن پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا اور اس سے وہ علمِ قطعی بھی ختم نہیں ہوتا جس کی بنیاد پر اس کا تواتر قائم ہے۔ کیونکہ دنیا میں اس بات کا کوئی بھی قائل نہیں۔ یہ کہ تواتر اور اس پر مبنی علم قطعی ویقینی کی یہ بھی شرط ہے کہ کوئی ایک بھی اس کا مخالف نہ ہو چاہے وہ کسی شمار میں بھی نہ ہو۔

ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ "مشکل القرآن" میں لکھتے ہیں: "ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے گمان کیا کہ معوذتین، قرآن کا جز نہیں ہے، اس لیے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان معوذتین کے ذریعہ حسن رضی اللہ عنہ وحسین رضی اللہ عنہ کو اللہ کی پناہ میں دیتے تھے تو ان کے خیال میں یہ بات بیٹھ گئی، ہم یہ نہیں کہتے کہ انہوں نے اس بارے میں درست کہا ہے، مہاجرین وانصار سے بھی خطائیں سرزد ہوئی ہیں۔"

⑥ ان معترضین نے یہ جو زعم کیا کہ قرآن کی آیت:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ (آل عمران: ۱۴۴)

"اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو صرف (خدا کے) پیغمبر ہیں ان سے پہلے بھی بہت پیغمبر ہو گزرے ہیں۔"

اللہ کا کلام نہیں ہے بلکہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کا کلام ہے۔ یہ محض باطل اور غلط خیال ہے جس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ روایات صحیحہ میں آتا ہے کہ یہ آیت، غزوۂ احد کے موقع پر نازل ہوئی ہے، اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جو خطا سرزد ہو گئی تھی اس پر سرزنش کی گئی تھی یہ اللہ کا کلام ہے، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کلام نہیں ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب مسلمان غزوۂ احد میں گرفتار مصیبت ہوئے،

حضور ﷺ کے رباعی دانت مبارک شہید ہوئے، چہرہ مبارک زخمی ہوا، آپ ﷺ کے گھٹنے بھی مخدوش ہوئے اور جنگجوؤں میں یہ بات پھیل گئی کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے! اس موقع پر کچھ مسلمان کہنے لگے، کاش! کوئی ہمارا قاصد بن کر عبداللہ بن ابی کے پاس جائے اور ہمارے لیے ابوسفیان سے امان لے لے، اور کچھ لوگ بے ہمت ہو کر بیٹھ گئے، کچھ منافق لوگ بھی کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) اب قتل ہو گئے ہیں لہٰذا اپنے پہلے والے دین کو اختیار کر لو۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت انس بن النضر کہنے لگے: ٹھیک ہے، حضور ﷺ شہید ہو گئے لیکن رب محمد ﷺ تو شہید نہیں ہوئے، اور حضور ﷺ کے بعد اب زندہ رہ کر تم کرو گے بھی کیا؟ لہٰذا جیسے حضور ﷺ دین کی خاطر لڑتے ہوئے چلے گئے تم بھی اسی مقصد کے لیے لڑو اور جس دین پر حضور ﷺ نے وفات فرمائی تم بھی اس پر وفات پاؤ۔ پھر کہنے لگے: اے اللہ! ان مسلمانوں نے جو بات کہی میں آپ سے اس کے بارے معذرت چاہتا ہوں اور منافقین نے جو کچھ کہا میں اس سے براءت کا اظہار کرتا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی تلوار سونتی اور لڑتے رہے حتیٰ کہ شہید ہو گئے۔

مروی ہے کہ اس دوران جس نے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کو شناخت کیا وہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ تھے، جیسا کہ مذکور ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے خود کے نیچے آپ ﷺ کی آنکھیں چمکتی ہوئی دیکھیں تو میں نے بلند آواز میں پکارا! اے مسلمانوں کی جماعت! خوشخبری سنو! اللہ کے رسول ﷺ یہاں پر باحیات ہیں، چنانچہ آپ ﷺ کے تیس صحابہ رضی اللہ عنہم فوراً پہنچے اور آپ ﷺ کا دفاع کرنے لگے پھر حضور ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو بھاگ جانے پر ملامت کی، تو وہ کہنے لگے! یارسول اللہ ﷺ! ہمارے باپ دادا اور ہماری اولاد آپ ﷺ پر قربان! ہمیں آپ ﷺ کے شہید ہونے کی خبر ملی تھی اس سے ہمارے دل مرعوب ہو گئے۔ اور ہم واپس بھاگ اٹھے۔ اس پر یہ آیت اتری:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ﴾ (آل عمران: ١٤٤)

"اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو صرف (خدا کے) پیغمبر ہیں ان سے پہلے بھی بہت پیغمبر ہو گزرے ہیں۔"

جو لوگ یہ الزام لگاتے ہیں کہ قرآن میں اس آیت کا اضافہ کیا گیا ہے اور یہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کلام ہے ان کا بظاہر استدلال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے ہے۔ جو انہوں نے وفاتِ رسول ﷺ کے وقت پیش کیا تھا۔ اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مذکورہ آیت کے ذریعہ اس کا جواب دیا تھا اور ان کے قول کی تردید کی تھی، اس سے ان معترضین نے سمجھا کہ مذکورہ آیت اصل میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کا کلام ہے۔ حالانکہ یہ بھی رب العزت کا کلام ہے جو اللہ نے وفاتِ رسول ﷺ سے چند سال پہلے نازل فرمایا تھا اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سمیت تمام مسلمان اس آیت سے بھی واقف تھے اور انہیں یہ آیت بھی یاد تھی، البتہ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس آیت کا ذہول ہو گیا تھا۔ کیونکہ وفاتِ رسول ﷺ کا صدمہ اور حادثہ بہت شدید تھا، رسول رحمت اور ہادی امت ﷺ کی وفات پر ہر ان کا دل پارہ پارہ ہوتا جا رہا تھا۔

اسی کا اثر تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس آیت سے ذہول کا شکار ہوئے اور اس دن کھڑے ہو کر کہنے لگے: کچھ منافق لوگ خیال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ہو گئی ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے پاس ملنے گئے ہیں جیسے موسیٰ بن عمران علیہ السلام گئے تھے، وہ اپنی قوم سے چالیس راتیں غائب رہے، پھر بعد میں واپس آ گئے۔ لوگ

ان کے آنے سے پہلے بھی یہی کہتے تھے کہ وہ وفات پا گئے ہیں۔ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ بھی موسیٰ علیہ السلام کی طرح ضرور واپس آئیں گے، جو لوگ حضور ﷺ کی وفات کا خیال رکھتے ہیں ان کے ہاتھ پاؤں ضرور کاٹ دیے جائیں گے۔

اس موقع پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اصل صورت حال بتانے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا: "اے عمر رضی اللہ عنہ! ٹھہرو! خاموش ہو جاؤ! پھر انہوں نے اللہ کی حمد وثناء بیان کی، پھر فرمایا: لوگو! جو شخص، محمد ﷺ کی بندگی کیا کرتا تھا تو وہ جان لے کہ وہ وفات پا گئے ہیں۔ اور جو اللہ کی بندگی کرتا تھا وہ جان لے کہ وہ زندہ جاوید ذات ہے جسے کبھی موت نہیں آئے گی پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ﴾ (آل عمران: ۱۴۴)

"اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو صرف (خدا کے) پیغمبر ہیں ان سے پہلے بھی بہت پیغمبر ہو گزرے ہیں۔"

راوی کا بیان ہے کہ خدا جانتا ہے کہ لوگوں کا حال یہ تھا کہ جیسے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تلاوت کرنے پر ہی انہیں اس آیت کے نزول کا علم ہوا ہو۔ چنانچہ لوگوں نے مذکورہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اخذ کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "میں نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ آیت تلاوت کرتے سنا تو میں حیران وششدر رہ گیا اور یہاں تک کہ زمین پر جا گرا، میرے دونوں پاؤں مجھے سہارا نہیں دے رہے تھے اور مجھے یقین ہو گیا کہ حضور ﷺ کی وفات ہو گئی ہے۔"

اب غور کریں کہ مذکورہ آیت سے ذرا بھی محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کوئی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کلام ہو! بلکہ یہ آیت بھی اپنے ضمن میں ان دلائل میں سے ایک ہے جن سے اس کا کلام اللہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی خوب جانتے تھے کہ یہ آیت، کلام اللہ میں سے ہے۔ جو حضور ﷺ کی رحلت کے حادثہ فاجعہ کے پیش آنے سے کئی سال پہلے نازل ہو چکی تھی۔

لیکن جن کو نفس کی خواہش اور ضد اور ہٹ دھرمی نے اندھا کر دیا ہو ان کا کیا کیا جائے؟

﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ۝﴾ (الحج: ۴۶)

"آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جایا کرتے ہیں جو سینوں میں موجود ہیں۔"

⑤ ان معترضین نے جو یہ دعویٰ کیا کہ آیت قرآنی: ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۲۵) اللہ کا نہیں بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کلام ہے، یہ دعویٰ بھی اسی طرح مردود ہے جس طرح ہم نے سابقہ آیات ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ ... الخ﴾ کے بارے میں ان کے دعویٰ کی تردید کی تھی۔ بلکہ ان معترضین کا یہ دعویٰ زیادہ واضح البطلان ہے۔ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تو مروی ہے کہ انہوں نے ہی نبی کریم ﷺ سے عرض کیا تھا: "کاش ہم مقام ابراہیم کو نماز گاہ بنا لیتے"! اسی پر یہ آیت اتری تھی۔ ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۲۵) [1]

یہاں ایک فرق ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس آرزو کے بارے کہے گئے الفاظ میں جو نزول آیت کا سبب بنے اور قرآن کے الفاظ میں جو اس سبب نازل ہوئے۔

---

① صحیح البخاری، کتاب الصلوٰۃ باب ۳۳

وہ فرق یہ ہے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ آیت قرآنی میں صیغۂ امر آیا ہے اور اس میں لفظ "لَوْ" شامل نہیں ہے۔ جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آرزو کردہ الفاظ میں ایک تو فعل ماضی کا صیغۂ استعمال ہوا ہے اور دوسرا یہ کہ اس میں لفظ "لَوْ" بھی شامل ہے۔

اور قرآن کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تمناؤں یا کسی کی بھی تمنا اور آرزو پورا کرنا اس بات پر دلالت نہیں کرتا ہے کہ جو حصّہ، آرزوؤں کو پورا کرنے کی خاطر نازل ہو جائے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کلام شمار کر لیا جائے۔

بلکہ دونوں کے درمیان بہت زیادہ فرق اور بُعد پایا جاتا ہے۔

تیسرا شبہ بعض غالی قسم کے شیعہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان سے پہلے والے یعنی حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے قرآن پاک میں تحریف کی اور اس کی بہت سی آیات اور سورتوں کو ساقط کر دیا وہ حضرت ہشام بن سالم عن ابی عبداللہ رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کرتے ہیں کہ: جس قرآن پاک کو حضرت جبریل علیہ السلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تھے وہ سترہ ہزار آیات پر مشتمل تھا۔ محمد بن نصر نے بھی ان سے روایت کیا کہ سورۃ "لم یکن" (یعنی سورۃ البینہ) میں قریش کے ستر آدمیوں کے اور ان کے آباء کے نام تھے۔

محمد بن جہم ہلالی وغیرہ نے حضرت ابو عبداللہ سے روایت کیا کہ سورۃ النحل کے یہ الفاظ ﴿اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ﴾ (النحل:۹۲) کلام اللہ کے الفاظ نہیں بلکہ اپنی جگہ سے ہٹے ہوئے ہیں جو الفاظ نازل ہوئے وہ درحقیقت یہ ہیں ﴿اَئِمَّةٌ هِيَ اَزْكٰى مِنْ اَئِمَّتِكُمْ﴾۔

بعض نے کہا کہ قرآن پاک میں ایک سورۃ تھی جس کا نام "سورۃ الولایت" تھا وہ پوری کی پوری ساقط کر دی گئی اور سورۃ الاحزاب کا بھی اکثر حصّہ ساقط کر دیا گیا کیونکہ وہ "سورۃ الانعام" کے برابر تھی اس میں سے انہوں نے اہل بیت کے فضائل ساقط کر دیے۔

اسی طرح انہوں نے دعویٰ کیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (التوبہ:۴۰) سے پہلے ﴿وَيْلَكَ﴾ کے الفاظ ساقط کر دیے۔ اور ﴿وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ﴾ (الصافات:۲۴) کے بعد "عَنْ وِلَايَةِ عَلِيٍّ" کے الفاظ بھی ساقط کر دیے اور ﴿وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ﴾ (الاحزاب:۲۵) کے بعد "بِعَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ" کے الفاظ ساقط کر دیے اور ﴿وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا﴾ (الشعراء:۲۲۷) کے بعد "اٰلَ مُحَمَّدٍ" کے الفاظ کو بھی ساقط کر دیا۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی جگہیں ہیں جہاں تحریف ہوئی ہے۔

لہٰذا وہ قرآن جو آج مشرق و مغرب میں مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے وہ ان شیعوں کے نزدیک تورات و انجیل سے بھی بڑھ تحریف شدہ ہے اس میں ان سے بھی زیادہ کمزور تالیف ہیں اور ان سے بھی زیادہ لغو، بے ہودہ اور بے بنیاد باتیں ہیں:

﴿قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ﴾ (التوبہ:۳۰)

"اللہ تعالیٰ نے انھیں برباد کرے کہاں بہکے جا رہے ہیں۔"

① یہ الزامات محض تہمتیں ہیں جو سند اور دلیل سے خالی ہیں یہ تو ذکر کیے جانے کے بھی مستحق نہیں ہیں لیکن چونکہ بعض ملحدین انھیں بار بار پیش کرتے ہیں اور بعض دیوانے اس سے دھوکہ کھا جاتے ہیں اس لیے ان کی تردید کرنا پڑی ان کی تردید کے لیے صرف اتنی

بات کافی ہے کہ یہ لوگ ان پر دلیل نہ لا سکے دلیل تو در کنار شبہ دلیل بھی نہ لا سکے اور کبھی بھی نہیں لا سکتے۔

والدعاوی مالم یقیموا علیها بینات ابناء ها ادعیاء

"وہ دعوے جن پر قائم نہ ہوں دلائل وہ ان لوگوں کی طرح ہیں جن کے بیٹے کسی اور کی طرف منسوب ہوں۔"

لیکن ان کی حماقت اور بے وقوفی اسی طرح مشہور معروف ہے۔

﴿وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ﴾ (الحج:۱۸)

"جس کی اللہ تعالیٰ توہین کرے اس کا اکرام کوئی نہیں کر سکتا بے شک اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔"

② بعض شیعہ علماء خود اپنے آپ کو ان بے وقوفیوں سے مبرا کرتے ہیں اور اس کی طاقت ہی نہیں رکھتے کہ یہ ان کی طرف منسوب ہو چنانچہ انھوں نے کچھ ایسے شیعوں کی طرف منسوب کر دیا جن کی طرف تکفیر بے لگام ہو کر جا گھسی اور درستگی ان سے دور ہو گئی۔

طبرسی "مجمع البیان" میں کہتا ہے:

((اما الزیادة فیه (ای فی القرآن) فمجمع علی بطلانها واما النقصان فقد روی عن قوم من اصحابنا وقوم من الحشویة والصحیح خلافه وهو الذی نصره المرتضیٰ واستوفی الکلام فیه غایة الاستیفاء... الخ)).

"قرآن پاک میں اضافہ؟ اس کے باطل ہونے پر اجماع ہے اور کمی؟ ہمارے اصحاب میں سے ایک قوم سے نیز حشویہ میں سے بھی ایک قوم سے مروی ہے لیکن صحیح قول اس کے خلاف ہے یہی وہ قول ہے جس کی مرتضیٰ نے نصرت کی اور اس میں بھرپور کلام فرمایا ہے۔"

"مجمع الزوائد" میں طبرسی کی یہ عبارت بھی ہے:

((اما الزیادة فی القرآن فمجمع علی بطلانها واما النقصان فهو اشد استحالة)).

"قرآن پاک میں زیادتی کے باطل ہونے پر جماع ہے اور کمی بھی انتہا درجہ کی محال ہے۔"

قرآن پاک کے صحیح منقول ہونے کا علم ایسے ہے جیسے شہروں، بڑے بڑے واقعات، کتب مشہورہ اور عربوں کے لکھے گئے اشعار کا علم ہے کیونکہ اس کا سخت اہتمام کیا گیا اور اس کے نقل اور حفاظت کے اسباب بہت زیادہ ہو گئے اور اس حد تک بڑھ گئے کہ ہمارے ذکر کردہ میں کوئی چیز بھی اس حد تک نہیں پہنچی اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک نبوت کا فخر ہے اور علوم شرعیہ اور احکام دینیہ کا ماخذ ہے اور مسلمان کے علماء اس کی حفاظت وحمایت میں اس حد تک پہنچے کہ انھوں نے اس میں مرجع اختلاف یعنی اعراب، قرأت، حروف اور آیات ہر چیز کو پہچان لیا تو پھر اس میں اہتمام صادق اور ضبط شدید کے باوجود تبدیلی یا نقص کیسے ممکن ہے؟۔"

③ تواتر قائم ہے اور اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ مصحف کے دو گتوں کے درمیان جو بھی موجود ہے وہ کتاب اللہ ہے اور اس میں نہ کوئی کمی ہے نہ زیادتی نہ تغیر ہے نہ تبدیلی اور علم کے طریقوں میں واضح ترین طریقہ تواتر بھی ہے اور اجماع حق کے راستوں میں سے قوی ترین راستہ ہے۔

﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ﴾ (یونس:۳۲)

"حق کے بعد گمراہی کے سواء کیا ہو سکتا ہے؟۔"

④ امام علی بن ابو طالب کرم اللہ وجہہ (جن کے بارے میں یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ ان کی نصرت کرتے ہیں اور ان نامعقول باتوں میں وہ ان کی ہم نوائی کرتے ہیں) سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ انھوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے زمانے میں بھی جمع قرآن کو سراہا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی جمع قرآن کو سراہا شاید آپ کو یاد ہو کہ انھوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے جمع قرآن کے بارے میں فرمایا کہ "مصاحف میں سب سے بڑا جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ہو گا اللہ تعالیٰ ابو بکر رضی اللہ عنہ پر رحمت فرمائے کہ وہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے کتاب اللہ کو جمع کیا" اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جمع قرآن کے بارے میں فرمایا کہ:

"اے لوگوں کی جماعت! اللہ تعالیٰ سے ڈرو! اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں غلو سے بچنا اور تمھارا کہنا کہ یہ مصاحف کو جلانے والے ہیں۔ اللہ کی قسم انھوں نے یہ مصاحف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کی موجوگی میں جلائے تھے۔"

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: "اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں میں حاکم ہوتا تو مصاحف کے بارے وہی کرتا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کیا" اس طریقے سے امام (علی رضی اللہ عنہ) نے ان بہتان بازوں کی زبانیں بند کر دیں اور ان جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے چال بازیوں کو انھی کی رسوا گردنوں میں ڈال دیا۔ تو پھر یہ کہاں تک جائیں گے؟

﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ﴾ (البقرۃ:۱۶۶)

"اس دن (کفر کے) پیشوا اپنے پیرؤوں سے بیزاری کریں گے اور (دونوں عذاب الٰہی) دیکھ لیں گے اور ان کے آپس کے تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔"

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ (آل عمران:۸)

"اے پروردگار! جب تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے تو اس کے بعد ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا کر دیجیو اور ہمیں اپنے ہاں سے نعمت عطا فرما۔ تو تو بڑا عطا فرمانے والا ہے۔"

⑤ خلافت، حضرت ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ختم ہو گئی پھر انہیں کیا مانع تھا کہ وہ اس وقت قرآن پاک کے حق میں لب کشائی کرتے اور تمہارے اس خیال اور بہتان کے مطابق پہلے والوں نے قرآن پاک میں جو غلطیاں کیں انھیں کرتے۔ جبکہ وہ ان کے باطل عقیدے کے مطابق امام معصوم بھی تھے نیز یہ کہ وہ قرآن کی حفاظت کرنے والوں میں سے ایک نمایاں شخصیت تھے اور دین واسلام کی حفاظت کرنے میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے سب سے زیادہ بہادر تھے پھر ان کے بعد امارت ان کے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف منتقل ہو گئی پھر انھیں اس فرصت کے رواں دواں ہوتے ہوئے آخر تک کس نے منع کیا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی حقیقت امت کے سامنے ظاہر ہو جائے۔ یہ بے بنیاد باتیں ہیں یہ باتین مجنون ہی کہہ سکتا ہے اور ایسی باتوں کی تصدیق صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کے اندر عقل کم ہو۔

چوتھا شبہ مروی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے مسلمانوں کی جماعت! مجھے قرآن پاک کے نسخوں کی کتابت سے برطرف کر دیا جاتا ہے اور اس کے متولی ایک آدمی بن جاتا ہے (اللہ تعالیٰ کی قسم!) میں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور وہ کافر آدمی کی پشت میں تھا۔

کہتے ہیں کہ اس آدمی سے ان کی مراد حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہیں اور اس کلام سے ان کی مراد جمع قرآن پر طعن کرنا تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قرآن جو ہمارے سامنے ہے قابل بھروسہ نہیں ہے اور حد تواتر تک بھی نہیں پہنچا ہوا۔

ان کے اس شبہ کا رد مندرجہ ذیل ہے:

① حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ کلام (اگر صحیح ہو تو بھی) جمع قرآن کے طعن پر دلالت نہیں کرتا بلکہ صرف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں یہ رائے رکھتے تھے کہ وہ زیادہ بہتر ہیں کہ ان کی طرف جمع قرآن کو منسوب کیا جائے۔ کیونکہ اس معاملہ میں انھیں حضرت زید رضی اللہ عنہ کی بنسبت اپنے اوپر زیادہ بھروسہ تھا اور یہ قطعاً اس کے منافی نہیں کہ وہ زید رضی اللہ عنہ میں بھی اس چیز کے انجام دہی کی اہلیت اور کفایت سمجھتے تھے جو ان کی طرف منسوب ہے اگرچہ اپنی جان میں وہ اپنے آپ کو ان سے بڑھ کر لائق اور قابل سمجھتے تھے۔ بہر حال مسئلہ کا تعلق اندازہ کے ساتھ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اندازہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے لیے ہونا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اندازہ کی بنسبت زیادہ درست ہے کیوں نہ ہو کہ پیچھے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ ان کے اندر کس قدر اہلیت اور خوبیاں باکمال انداز میں جمع تھیں جنہوں نے انہیں اس نامور مقصود کو سرانجام دینے کے قابل بنایا۔ مزید یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ تین آدمی اور بھی ملائے تھے پھر یہ بھی ہے کہ وہ اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم انھی کی طرف رخ کرتے تھے اور متوجہ ہوتے تھے۔ آپ کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قرآن پاک کی حفاظت کرنے والے اور اسے سکھلانے والے تھے۔

اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اعتراض کو صحیح فرض کیا جائے تو بھی وہ جمع قرآن کی کمیٹی کے کی تالیف کے طریقہ کار پر ہوگا نفس جمع قرآن پر نہ ہوگا اس کے علاوہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا گزشتہ بالا کلمہ بھی اس سے بڑھ کر کچھ بھی دلالت نہیں کرتا کہ وہ عمر میں حضرت زید رضی اللہ عنہ سے بہت زیادہ بڑے تھے کیونکہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ مسلمان تھے اور زید رضی اللہ عنہ اس وقت اپنے باپ کی پشت میں پوشیدہ تھے۔ یہ بات حضرت زید رضی اللہ عنہ پر کوئی طعن نہیں بنتی کیونکہ کتنے پہلے لوگ ہوئے ہیں جنہیں بعد والوں کی وجہ سے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

اگر معاملہ عمر کا ہوتا تو بہت سا نظام فاسد ہو جاتا پھر یہ بات بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے کلام کو دیکھا جائے تو ایک اعتبار سے حضرت زید رضی اللہ عنہ میں طعن بھی مفہوم ہوتا ہے وہ یہ کہ ان کا باپ کافر تھا حالانکہ یہ بھی طعن نہیں ہے کیونکہ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم ایسے ہیں جو شروع میں کفار تھے اور اپنے کافر آباء کی پشتوں سے نمودار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ﴾ (الانعام: ۱۶۴)

"کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔"

نیز فرمایا کہ:

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ﴾ (الانفال: ۳۸)

"آپ کفار سے کہہ دیجیے کہ اگر تم رک جاؤ تو تمہارے گزشتہ گناہ بخش دیے جائیں گے۔"

④ اگر ہم مان لیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے جو منقول ہوا وہ صحیح ہے اور یہ بھی مان لیں کہ ان کا مقصد جمع قرآن کے صحیح ہونے پر طعن ہی تھا پھر بھی یہ مسلم نہیں کہ وہ اس طعن پر برقرار رہے ہوں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ان سے ثابت ہے کہ جب انھیں معلوم ہوا کہ حضرت عثمان کا مصحف حق ہے تو انھوں نے آخری زندگی میں اپنا مصحف جلا دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف کی طرف رجوع کرلیا دوسری دلیل ان سے عاصم عن زرعہ والی جو قرأت منقول ہے وہ ہے اور وہ قرأت پیچھے گزر چکی۔

③ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ کلام (اگر مان بھی لیا جائے کہ یہ صحیح ہے اور اس سے ان کی مراد جمع قرآن کے صحیح ہونے پر طعن ہی ہے اور وہ اس پر برقرار رہے اور انھوں نے رجوع بھی نہیں کیا پھر بھی) ہم نہیں مانتے کہ یہ تواتر قرآن کے ابطال پر دلالت کرتا ہے کیونکہ پیچھے گزر چکا کہ اس کی روایت کی صحت کے قطعی ہونے میں اتنی بات کافی ہے کہ اسے اتنی جماعت روایت کرے کہ ان کا جھوٹ پر جمع ہونا محال ہو اور اس میں تواتر کی شرائط بھی پائی جاتی ہوں اور اس کی شرائط میں سے یہ نہیں ہے کہ اس میں کوئی مخالف مخالفت نہ کرتا ہو لہٰذا تواتر قرآن کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ یا ان کے علاوہ کسی اور نے مخالفت کی ہو کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک بہت بڑی جماعت تھی جس نے ایک مرتبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس طریقے پر جمع قرآن کا اقرار کیا اور دوسری مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اقرار کیا۔

پانچواں شبہ

قرآن پاک متواتر کیسے ہوسکتا ہے؟ حالانکہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جمع قرآن کے بارے میں فرمایا "میں اٹھا اور قرآن پاک پارچوں، کندھے کی ہڈیوں کھجور کے پتوں اور لوگوں کے سینوں سے تلاش کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ میں نے سورۃ التوبہ کی دو آیتیں حضرت خزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس پائیں ان کے علاوہ مجھے اور کسی کے پاس نہیں ملیں اور وہ دو آیتیں: ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾ (النحل: ۱۱۳)[1] پھر یہ بات بھی ہے کہ قرآن پاک کیسے متواتر سکتا ہے؟ حالانکہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہونے والے جمع قرآن کے بارے میں فرمایا کہ مجھے سورۃ الاحزاب کی ایک آیت جو میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے سنا کرتا تھا نہیں ملی وہ مجھے کسی کے پاس بھی نہیں ملی سوائے حضرت خزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے جن کی گواہی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کی گواہی کے برابر قرار دیا تھا اور وہ آیت: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ (الاحزاب: ۲۳) ہے۔

جواب ۵ ① حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ کلام تواتر کو باطل نہیں کرتا اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ آیتیں سورۃ التوبہ کی آخری آیتیں ہیں ان کا قرآن ہونا صرف حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کے قول سے ثابت نہیں ہوا بلکہ صحابہ کی بہت بڑی جماعت کی خبر دینے سے ثابت ہوئی ہے جنہوں نے اسے اپنے سینوں میں محفوظ کیا ہوا تھا لیکن اپنے اوراق میں لکھا ہوا نہیں تھا اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کے قول کہ "میں نے سورۃ التوبہ کی دو آیتیں ان کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں پائیں" کا مطلب یہ ہے کہ ان کے علاوہ کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہیں پائیں حضرت ابوخزیمہ رضی اللہ عنہ جس چیز میں منفرد تھے وہ ان آیتوں کی کتابت تھی حفظ نہیں تھا اور متواتر میں کتابت شرط نہیں بلکہ صرف اتنی جماعت کا روایت کرنا شرط ہے جن کا جھوٹ پر جمع ہونے سے اطمینان ہو اگرچہ ان میں سے کسی ایک نے ہی لکھا ہو چنانچہ حضرت

① صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن باب ۳

ابوخزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کا لکھنا تواتر کے مقتضی اور مطلوب سے بھی بڑھ کر بطور احتیاط اور بطور بھروسہ تھا تو اس میں ان کے منفرد ہونے سے تواتر میں فرق کیسے پڑسکتا ہے؟

② حضرت زید رضی اللہ عنہ سے سورۃ الاحزاب کی آیت ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ (الاحزاب: ۲۳) کے بارے میں جو مروی ہے اس بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور کے پاس لکھا ہوا نہیں پایا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کی اس عبارت سے ان کی مراد یہی ہے؟ اس پر دلیل حضرت زید رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے کہ انھوں نے فرمایا: "فَقَدْتُ اٰيَةً مِّنْ سُوْرَةِ الْاَحْزَابِ" (میں نے سورۃ الاحزاب کی ایک آیت نہیں پائی) اب حضرت زید کی لفظ "فقدت" کے ساتھ تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں یہ آیت یاد تھی اور وہ اس آیت کو جانتے پہچانتے تھے لیکن انھیں لکھی ہوئی نہیں مل رہی تھی انھیں ملی تو صرف حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کے پاس ملی ورنہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو کس نے بتلایا کہ انھیں ایک آیت نہیں مل رہی۔

③ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا گزشتہ بالا کلام جو سورۃ التوبہ اور سورۃ الاحزاب کے بارے میں تھا یہ ان کے عدم تواتر پر دلالت نہیں کرتا ہے کہ اگر فرض کرلیا جائے حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کے انفراد سے مراد یہ ہو کہ وہ اسے اپنے حافظے سے ذکر کرنے میں منفرد تھے تو بھی ان کا یہ کلام زیادہ سے زیادہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ابتداءً ان کے ذکر میں منفرد تھے پھر جو انہوں نے اسے ذکر کیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو یاد آ گیا اور یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت تھی جن کے جھوٹ پر جمع ہونے سے اطمینان ہے چنانچہ یہ آیات اس تواتر کے قائم ہونے کے بعد نسخوں اور مصحف میں لکھ دی گئیں۔

چھٹا شبہ قرآن پاک کی آیات پتھروں، کھجور کی شاخوں اور ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں تا کہ وہ ضائع نہ ہو جائیں اور ایک بہت بڑا حصہ ایسا باقی رہ گیا جو لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا اس نے بہت سے ایسے مسائل پیدا ہو گئے جنھیں محققین نے تسلیم کیا ہے یہ مسائل اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ موجودہ قرآن ان تمام آیات کو جامع نہیں ہیں جنھیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان سے پڑھا بعض کی قرأت میں اختلاف ہے، کسی کے الفاظ میں اور بعض کے معانی میں۔

بالفاظ دیگر موجودہ قرآن نازل شدہ پورے قرآن کو جامع نہیں ہے اس لیے کہ یقیناً اس کا ایک بہت بڑا حصہ ضائع ہو گیا ہو گا اور ایک حصہ بھلا دیا گیا ہو گا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "تم میں سے کوئی نہ کہے کہ میں نے پورا قرآن حاصل کرلیا ہے کیونکہ اس کا ایک بہت بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے بلکہ اسے کہنا چاہیے کہ میں نے اس کا ظاہری حصہ حاصل کرلیا" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ قرآن لوح محفوظ میں لکھے گئے پورے قرآن پر مشتمل نہیں ہے اور نہ ہی اس قرآن کے مطابق ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونٹوں سے صادر ہوا ہے خصوصاً یہ کہ اس کی بہت سی آیات میں ایک بہت بڑا ہوش ربا اختلاف ہوا ہے اور اس کی صحیح عبارت کو کوئی نہیں جانتا۔

جواب ① پتھروں اور ہڈیوں پر قرآن پاک کی کتابت اور اس کے ایک حصہ کا انسانوں کے سینوں میں محفوظ ہونے سے ایک بھی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا چہ جائیکہ بہت سے مسائل پیدا ہوئے ہوں یہ تو ایک وہم ہے جو ان کے خیال میں پیدا ہو گیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے اس ظالمانہ اقدام پر کوئی دلیل ذکر نہیں کی۔

② پتھر، کھجور کی شاخیں اور ہڈیوں پر قرآن پاک کی کچھ آیات لکھی ہوئی ایسی نہ تھیں کہ ان کے بارے میں معترضین یہ خیال قائم کر لیں یا لوگوں کے ذہن میں وساوس پیدا کریں کہ ان پر کتابت نہیں ہو سکتی تھی بلکہ عرب اپنے جنگلوں میں رہن سہن اور شہری وسائل سے دور ہونے کی وجہ سے پتھروں کی کثیر انواع جو ان کے پاس موجود تھیں ان میں سے باریک قسم کے پتھروں کو چن لیتے تھے جو صحیفہ کی مانند ہوتے تھے ان پر کتابت بھی ہو سکتی تھی اور وہ باقی بھی رہ سکتے تھے اور وہ ایسے ہوتے جیسے آج ہم دیکھتے ہیں کہ چونے سے بنے ہوئے صفحات پر بڑی خوبصورت لکھائی ہوتی ہے اسی طرح کھجور کی شاخوں سے پتے وغیرہ اتار لیے جاتے اور انھیں پالش اور صفائی وغیرہ کر کے ان کے چوڑے جزء پر لکھ دیا جاتا اور وہ بھی صحیفہ کی مانند ہو جاتا تھا اور ہڈیوں میں اس طرح بہت ہی کم ہوتا تھا اس کی دلیل یہ ہے کہ اس میں وارد ہونے والی روایات میں اس کی ایک خاص نوع کی تصریح ہے اور وہ خاص نوع کندھے کی ہڈی ہے وہ اس لیے کہ کندھے کی ہڈی چوڑی، باریک اور ملائم ہوتی ہے اس پر لکھائی سہولت کے ساتھ ممکن ہے۔

③ اس سے ان کا یہ نتیجہ نکالنا کہ "موجودہ قرآن پاک ان تمام آیات کو محیط نہیں ہے جو محمد ﷺ کی زبان اقدس سے صادر ہوئیں" یہ نتیجہ بھی الٹا اور سمجھ بھی الٹی۔ کیونکہ قرآن پاک کی کتابت اور اس کا ایک ہی وقت میں ہزاروں اصناف کی مخلوقات کے سینوں میں محفوظ ہو جانا اس قرآن کے بقاء کا تقاضا کرتا ہے، کیوں؟ اس لیے کہ کتابت اور حفظ میں سے کوئی ایک امر بھی اس کے اطمینان کے لیے کافی تھا پھر جب قرآن پاک پورا کا پورا بہت سے لوگوں کی لکھائی میں لکھا گیا اور بہت سی جماعتوں کے سینوں میں محفوظ ہو گیا تو پھر اس کے بارے میں آپ کو کیا شک ہے؟

④ ان کا کہنا کہ "اس کے کچھ حصہ میں قرأت، لفظ یا معنیٰ کے اعتبار سے اختلاف ہے" اگر اس سے ان کی مراد تعدادِ قرأت یا وجوہِ ادا میں اختلاف ہے تو "نزول قرآن علی سبعۃ احرف" کی بحث میں گزشتہ بالا بیان ان کی تردید کے لیے کافی ہے اور قراءات کی بحث میں بھی عنقریب اس کا بیان آ رہا ہے جو اس موضوع میں چار چاند لگا دے گا اور اگر اس سے ان کی مراد کچھ اور ہے تو اس کی وضاحت ان کی ذمہ داری ہے۔ آپ کو یہ جاننا بھی کافی ہے کہ قرآن پاک کے حروف کا اختلاف ایسا معاملہ ہے جس کا تقاضا حکمت کرتی ہے اور دعوت اسلامیہ کا عموم اس کو واجب کرتا ہے خصوصا جنھیں رسول اللہ ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی ہو اور ان کے مختلف قبائل اور کئی طرح کے لہجے ہوں اور مختلف زبانیں ہوں وہ عرب جن میں ایک ہی عربیت سرایت کی ہوئی تھی اور انھیں عام عربی زبان جمع کیے ہوئے تھی تو اگر قرآن پاک کی ادائیگی کے حروف اور ان کے کلمات کے بولنے کی کیفیات مختلف ہو گئیں تو کونسا عیب رونما ہو گیا؟ یہ تو اس لیے ہوا کہ وہ تمام عربی قبائل کو وسیع ہو جائے اور اس کے الفاظ کی تلاوت اور اس کے معانی کا فہم آسان ہو جائے۔ نیز یہ وجہ بھی تھی کہ کوئی یہ نہ کہے کہ اگر قرآن پاک ہماری زبان میں نازل ہوتا تو ہماری کیا بات تھی؟ ہم بھی اس جیسا کلام لے آتے اور ہم بھی اس کی بلاغت کا معارضہ کر لیتے۔

﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (یوسف:۲۱)

"اور اللہ تعالیٰ کو اپنے کام پر پوری قدرت ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

⑤ ان کا کہنا کہ "موجودہ قرآن کا نازل شدہ پورے قرآن پر محیط ہونا ناممکن ہے۔۔ الخ" یہ کلام سند اور دلیل سے کورا ہے اس کی تردید کی ضرورت ہی نہیں اگر وہ مذکورہ بالا دلائل سے استدلال کریں تو گویا کہ انھوں نے مکڑی کے گھر سے بھی کمزور ترین گھر کا سہارا لیا

اور مذکورہ بالا دلائل کی کمزوری آپ کو معلوم ہو چکی اور اگر وہ اس بات سے استدلال کریں جسے جو انھوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب بات کے بعد ذکر کیا تو بھی انہوں نے کوئی نئی بات نہیں کہی کیونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف یہ نسبت غلط اور جھوٹی ہے اور اگر اسے صحیح بھی فرض کر لیا جائے تو بھی یہ موقوف ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع نہیں ہے اور اگر اسے مرفوع بھی فرض کر لیا جائے تو بھی یہ تواتر قرآن اور اس میں تبدیلی یا کمی بیشی سے سلامتی کے قطعی اور بھرپور دلائل کے معارض ہونے کی بناء پر کالعدم ہے اب اس استدلال کی حیثیت گویا کہ ایک خبر واحد کی سی ہو گئی۔

⑥ انھوں نے اپنے شبہ کا اختتام ابتداء سے بھی بڑھ کر کیا اس لیے کہ انھوں نے ان شبہات کی بناء جھوٹ اور تضاد بیانی پر رکھی ہے پھر اس میں مزید نئی تہمت کا اضافہ کر دیا جو سند اور دلیل سے خالی ہے وہ یہ کہ قرآن کی بہت سی آیات میں بہت بڑا اختلاف واقع ہوا ہے اس کی صحیح عبارت کو کوئی بھی نہیں جانتا اس طریقے سے وہ ایک تہمت سے دوسری تہمت کی طرف منتقل ہو گئے اور جھوٹ پر جھوٹ سے استدلال کیا اور ان کی عزت اور عقلیں بے وقعت ہو کر رہ گئیں اور انھوں نے اس حد تک جو کہا تعصب اور خواہش کی بناء پر کہا اور آپ بخوبی جانتے ہیں کہ موجود قرآن جو ہم تک پہنچا ہے وہ ہر قسم کی فضولیات سے محفوظ ہو کر ہم تک ایسے پہنچا ہے جیسے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے صادر ہوا اور جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے قلم کے ساتھ اسے لوح محفوظ میں لکھا:

﴿وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝﴾ (فصلت: ۴۱، ۴۲)

"بے شک وہ بڑی عالی رتبہ کتاب ہے۔ باطل اس کے پاس نہ آگے سے آ سکتا ہے نہ پیچھے سے یہ حکمت والے اور خوبیوں والے کی طرف سے اتارا گیا ہے۔"

اور ان کا یہ خیال کہ اس میں بڑے بڑے ہوش ربا اختلافات ہیں اس کے بارے میں آپ کو "نزول قرآن علی سبعۃ حرف" کی بحث میں وجوہ قراءات کا اختلاف اور اس کی حکمت کو اچھی طرح جان چکے ہو اور یہ بھی جان چکے ہو کہ یہ کس پسپائی یا تناقض کا باعث بھی نہیں ہے تو پھر یہ ہوش ربا کیسے ہو گیا؟

اور قرآن پاک کی صحیح عبارت کا علم اور اس کا محفوظ ہونا ایسا اجماعی امر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے آج تک امت کے ہر ہر طبقے میں ان لوگوں کے جھوٹ پر جمع ہونے سے بالکل امن ہے۔

اب ان دجالی جاہلوں کا دعویٰ کہ قرآن پاک کی صحیح عبارتوں کا علم کسی کو بھی نہیں یہ ایسا دعویٰ ہے جس کا عیب ناک ہونا بالکل ظاہر اور اس کا جھوٹا ہونا روز روشن کی طرح واضح ہے۔

صاحب "مسلم الثبوت" (جو کہ اصول فقہ اسلامی کی مشہور ترین کتاب ہے) نے فرمایا کہ جو قرآن خبر آحاد کی طرح منقول ہوا ہو وہ کبھی بھی قرآن نہیں بن سکتا اور اس میں کسی بھی مذہب والے کا اختلاف منقول نہیں، اس پر دلیل یہ ہے کہ اس کو نقل کرنے کے محرکات بہت زیادہ تھے جو ایک چیلنج کو متضمن تھے دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ الفاظ اور معنی ہر اعتبار سے احکام کی اصل موجود ہے اسی وجہ سے صحابہ کا اس کی حفاظت کے لیے جد و جہد کرنا تواتر قطعی کے ساتھ مشہور و معروف ہے۔ اور اس کے نقل کے جتنے بھی محرکات تھے وہ

عادتاً تواتر کے ساتھ منقول ہیں لہٰذا ان کا وجود عادتاً ہر ایک کے نزدیک تواتر کو لازم ہے جب لازم یعنی تواتر منتفی ہو گیا تو ملزوم بھی بالکل منتفی ہو جائے گا اور خبر آحاد کی طرح نقل ہونے والا کبھی بھی قرآن نہیں ہو سکتا... الخ

کتاب وسنت کے دفاع کے خطوط یا محرکات یا اسباب جو صحابہ رضی اللہ عنہم میں بکثرت پائے جاتے تھے اور ان کی وجہ سے انہوں نے قرآن وحدیث کو اچھی طرح زبانی یاد کر لیا اور قرآن وحدیث میں خوب اچھی طرح پختگی حاصل کر لی۔

گزشتہ بالا اور ان جیسے شبہات میں غور کرنے والے پر روز روشن کی طرح واضح ہو چکا کہ ایک قوم صحابہ رضی اللہ عنہم سے قرآن پاک حاصل کرنے والے طریقہ پر کیچڑ اُچھالنے کی کوشش کر رہی ہے یہ قوم کبھی تو کہتی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب قرآن پاک جمع کیا انھیں زبانی یاد نہیں تھا اور جنہیں یاد تھا وہ جمع قرآن سے پہلے ہی وفات پا گئے تھے یا شہید ہو گئے تھے اور کبھی کہتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع قرآن میں پختگی ہی نہ تھی بلکہ وہ اس میں اِدھر اُدھر کی ملا لیتے اور پھر اس میں جو چاہتے کمی زیادتی کر لیتے۔

دشمنان اسلام کے اس قسم کے حملے بہت زیادہ کثرت پکڑ گئے اور اتنے ہو گئے کہ اگر ہم ان کے تمام شبہات کی چھان بین کرنے لگ جائیں تو ہماری اس کتاب کا حجم بہت زیادہ ہو جائے اور ہم ہدایت والی لذت دار علمی آب وہوا سے نکل کر قیل وقال، لڑائی جھگڑے، حملہ اور دفاع والے میدان میں نکل جائیں گے۔

اسی طرح دشمنان اسلام کے حملے صحابہ رضی اللہ عنہم کے راستے سے سنت نبویہ پر بھی کثرت کے ساتھ ہوتے چلے گئے کبھی تو یہ لوگ اس بات کو بہت بڑا سمجھتے ہیں کہ ان حضرات نے احادیث شریفہ کو کیسے حفظ کر لیا حالانکہ ان کا مجموعہ بہت بڑا ہے اور کبھی ان پر خیانت کی تہمت لگاتے ہیں، کبھی حد سے بڑھنے کی تہمت لگاتے ہیں کبھی تہمت لگاتے ہیں کہ ان میں پختگی اور تحقیق نہیں تھی۔ ان لوگوں نے اس پر جھوٹ کی اتنی بڑی بنیاد ڈال دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی کوئی دلیل نازل نہیں کی۔

وہ صحابہ رضی اللہ عنہم پر ان بہتانات کی جسارت کر کے قابل اعتماد لوگوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول سے پھسلانا چاہتے ہیں یہاں تک کہ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ان کے دین سے ہٹا دیں اور وہ غیر مسلموں کے راستے میں رکاوٹیں اور دام کھڑے کرنا چاہتے ہیں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسلام انھیں اپنے پرکشش محاسن، پلٹ کر رکھ دینے والی قوت اور پاکیزہ تعلیمات کی بدولت انھیں اپنی طرف کھینچ لے۔ ظلم یہ ہے کہ اس قوم کے تمام شبہات متشابہ ہیں اور ان کی تردید کے طریقے بھی علیحدہ متشابہات ہیں کیونکہ گزشتہ بالا مقدمہ کے بعد حفاظت اور بچاؤ کے وجوب کا تقاضا یہ ہے کہ ہم کتاب وسنت کے دفاع کے خطوط میں سے ایک مضبوط ترین خط قائم کریں اور اس خط کو دو طرح کے عنوانات کے تحت کھینچیں۔ پہلی قسم کے عوامل آسمانوں کو چھوتے ہے کیونکہ یہ ان عوامل اور دواعی کو ظاہر کرتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں پائے جاتے تھے یہاں تک کہ وہ ان میں بھرپور کثرت کے ساتھ ہو گئے جن کی بدولت وہ قرآن وسنت کو حفظ کرتے اور انھیں متواتر مستفیض طریقے سے نقل کرتے اور دوسری قسم کے عوامل واسباب بھی آسمان سے تجاوز کرتے ہیں کیونکہ ان میں وہ دواعی اور عوامل پروئے ہوئے ہیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم میں باکمال طور پر پائے جاتے تھے یہاں تک کہ ان حضرات نے ان کی بدولت قرآن پاک میں بھرپور گہرائی اور دقت نظر حاصل کی اور قرآن اور متعلقات قرآن کو جمع کیا اور حدیث شریف اور اس کے متعلقات میں بھی بھرپور گہرائی اور دقت نظری حاصل کی۔

اور میں اس عظیم الشان مہم میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی اور توفیق کا سوال کرتا ہوں۔

﴿لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ (الانفال:۴۲)

" تا کہ ہلاک ہو وہ اتمامِ حجت کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ اتمامِ حجت کے بعد زندہ رہے، بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا اور علم والا ہے۔"

پہلا سبب ❀ یعنی وہ دواعی اور اسباب جو صحابہ رضی اللہ عنہم میں کتاب وسنت اور انہیں نقل کرنے کے لیے پائے جاتے تھے۔

سب سے پہلے ہم ان عوامل اور اسباب کی تشریح کرتے ہیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم کو کتاب وسنت کی حفاظت اور نقل کرنے میں میسر آئے تا کہ کوئی بھی ان عوامل واسباب کو ان کے لیے بعید نہ سمجھے اور اس طریقے سے کتاب وسنت کے حصول میں کوئی بھی عیب جوئی نہ کرے۔

پہلا عامل پہلا عامل یہ ہے کہ وہ حضرات امی تھے (یعنی کسی سے پڑھے ہوئے نہیں تھے) نہ وہ پڑھنا جانتے تھے اور نہ ہی خط وکتابت کے ماہر تھے البتہ ایک بہت ہی تھوڑی سی جماعت تھی (جو پڑھی ہوئی تھی) ان کا حکم مجموعہ پر نہیں لگایا جاسکتا اور ان میں اس رچی بسی اُمیت کی وجہ سے دیہات پن کا غلبہ تھا اور شہری اسباب ان سے دور تھے اور اس وقت عالم کی دو مہذب جماعتیں جو علمی رسوخ رکھتی تھیں یعنی مشرق میں فارس اور مغرب میں روم یہ لوگ ان تک بھی رسائی نہیں کر سکتے تھے اور یہ بات یقینی ہے کہ کسی بھی امت میں اُمیت کو ختم کر کے لکھنے کو فروغ دنیا سادگی اور سیدھے پن کی طرز سے تہذیب وتمدن کی طرف نکلنے پر ہی موقوف ہے۔

پھر اس اُمیت نے ان لوگوں کو ایسا بنا دیا تھا کہ جن چیزوں کو یاد کرنے اور محفوظ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ان میں وہ لوگ اپنے حافظے اور یادداشت کی طرف ہی رجوع کرتے اس وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا رجوع اپنے حافظے کی طرف ہوتا تھا جسے وہ کتاب وسنت کے علم کے لیے اختیار کرتے تھے کیونکہ قرآن وحدیث کے علم کے احاطے کے لیے حافظہ ہی واحد راستہ ہے یا تقریباً واحد راستہ ہے۔

اگر ان لوگوں کے اندر کتابت شائع ہوتی تو وہ سطور ونقوش پر اعتماد کرتے نہ کہ سینے میں موجود حافظے پر، ہاں البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کی کتابت پر بھی عمل کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ کاتب تھے جو وحی لکھتے تھے اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے لیے بھی اسی طرح قرآن پاک لکھا کرتے تھے لیکن یہ اور وہ دونوں طرح کے حضرات اتنی بڑی اُمت میں ایک چھوٹی سی جماعت کی حیثیت رکھتے تھے اور شاید آپ کو یاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن پاک کی کتابت کی غرض، قرآن کریم کی احتیاط اور پختگی میں اضافہ کرنا تھا یعنی وہ اسے اپنے حافظے کے ذریعے محفوظ کر کے پھر قلم بند کرتے تھے۔ جبکہ سنت نبویہ کی کتابت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اوّلاً منع کیا تھا تا کہ قرآن پاک کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا تَكْتُبُوْا عَنِّيْ وَمَنْ كَتَبَ عَنِّيْ غَيْرَ الْقُرْاٰنِ فَلْيَمْحُهُ وَحَدِّثُوْا عَنِّيْ فَلَا حَرَجَ وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)).

"میری طرف سے کوئی بات مت لکھو جس نے بھی میری طرف سے کوئی بات لکھی ہو وہ مٹادے اور میری طرف سے حدیث

بیان کرو! اس میں کوئی حرج نہیں اور جس نے مجھ پر جھوٹ بولا اسے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنانا چاہیے۔"①

ہاں البتہ رسول اللہ ﷺ کو ڈر ہوا کہ قرآن کریم، احادیث مبارکہ کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائے کیونکہ وہ لوگ جیسے قرآن پاک کو لکھتے اسی طرح احادیث مبارکہ کو بھی لکھا کرتے تھے یا وجہ یہ تھی کہ ان کی کوششیں منتشر تھیں وہ پورے قرآن اور پوری احادیث مبارکہ کو لکھ نہیں سکتے تھے اس لیے آپ ﷺ نے انھیں اوّلاً اہم یعنی قرآن پاک پر منحصر کیا خصوصاً جب ہمیں معلوم ہے کہ ان کے پاس کتابت کے اسباب بہت ہی کم تھے حتیٰ کہ وہ لوگ جیسا کہ آپ جان چکے ہو کہ وہ لوگ باریک سفید پتھروں، کھجور کی شاخوں اور ہڈیوں پر لکھا کرتے تھے۔

ایک طرف تو ان پر رحمت کرتے ہوئے دوسری طرف انھیں اہم ترین کو اہم پر مقدم کرنے پر مقید کرتے ہوئے نیز قرآن کی احادیث مبارکہ کے ساتھ مشتبہ ہونے سے حفاظت کرنے کی غرض سے آپ ﷺ نے انھیں کتابت حدیث سے منع کر دیا کیونکہ اوراق کی قلت اور کتابت کے آلات کی کمی کے پیش نظر انہوں نے احادیث مبارکہ کو قرآن پاک کے کنارے پر لکھ دیا تھا۔

پھر جب التباس کا خوف ختم ہو گیا اور خلط ملط ہونے کا ڈر نہ رہا اور ہر شخص کے لیے معاملہ آسان ہو گیا تو ان کے لیے قرآن پاک کی طرح احادیث مبارکہ لکھنے میں بھی کوئی حرج نہ رہا اس لیے وہ احادیث جو احادیث مبارکہ لکھنے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں انھیں آخری حکم پر محمول کیا جائے گا نیز وہ احادیث جن میں کسی خاص شخص کو کتابت حدیث کی اجازت دی گئی انھیں بھی اسی پر محمول کیا جائے گا اور اس موضوع کے لیے ایک خاص بحث ہے اگر آپ چاہیں تو اسے علوم حدیث میں تلاش کریں۔

جب تک قرآن وحدیث کی کتابت نہیں تھی تو ہر چیز سے قبل سب کا رجوع حافظے اور یادداشت پر تھا اور یہ رجوع آج تک ہوتا چلا آ رہا ہے کہ لوگوں کے سینوں سے یعنی ایک ثقہ سے دوسرے ثقہ اور ایک امام سے دوسرے امام تک نبی کریم ﷺ تک احادیث کو حاصل کیا جاتا ہے۔

اب اس کے علاوہ اور کیا ہے؟ کیا ایک آدمی اُمّی ہے اور امت بھی اُمّی ہے اور وہ دونوں حافظے میں دوسروں سے بڑھ کر ہیں اس کی وجہ وہی ہے جو ہم نے پیچھے آپ کو بتا دی۔

دوسرا عامل

صحابہ کرام ؓ ایک ایسی امت تھے کہ ذہانت، فراست، قوت حافظہ، مخلصانہ طبیعت، تیز فہمی اور دلجمعی میں ان کی مثال دی جاتی تھی۔ تاریخ عربیہ میں اس کے بہت سے شواہد ہیں جن کی تفصیل طول کلام کا باعث ہو گی شاید آپ کو بھی اس کا کچھ علم ہو گا حتی کہ ان میں سے ایک شخص جو بھی سنتا تھا پہلی مرتبہ ہی اسے یاد کر لیا کرتا تھا خواہ وہ کتنا ہی زیادہ اور لمبا کیوں نہ ہو بعض اوقات وہ ان کی زبان اور لغت میں بھی نہیں ہوتا تھا بلکہ کسی دوسری زبان میں ہوتا تھا آپ کے لیے اتنا جاننا ہی کافی ہے کہ ان کے دماغ اشعار کے دفتر ہوتے تھے ان کے دل ان کے انساب کے رجسٹر ہوتے تھے اور ان کے دل ان کی جنگوں واقعات وحوادث کی پوری کتاب ہوتی تھی۔ اسلام سے پہلے یہ تمام خصائص ان میں اور تمام امت عربیہ میں مضمر تھے اس کے بعد اسلام آیا تو یہ صلاحیتیں اور قوتیں ان میں مزید تر ہو گئیں اور جب ان کی طبیعت میں مزید شائستگی آئی۔ ان کے دل مزید پاکیزہ ہوئے اور ان کی عقلوں میں مزید بلندی آئی تو ان کی خوبیاں اور خصائص کو مزید چار چاند لگ گئے خصوصاً جب وہ سچی ترین بات سنتے یعنی

① صحیح مسلم عن ابی سعید خدری، کتاب الزہد والرقائق حدیث ۷۲

کتاب اللہ سنتے اور بہترین رہنمائی یعنی محمد ﷺ کی رہنمائی کو سنتے۔

تیسرا عامل اس امت عربیہ کی بے تکلف زندگی اور ان کا اپنی زندگی میں خوش عیشی کی طرف میلان کیے بغیر ضروریات زندگی پر انحصار کرنا اور باکمال بننے میں اپنی کوشش اور وقت کو صرف نہ کرنا ہے بسا اوقات ان کے پاس چند لقمے ہوتے تھے جوان کی کمر کو سیدھا کرتے تھے ان کی معیشت کو صرف اتنی مقدار کافی ہو جاتی تھی جیسے شاعر اپنے قول میں اس طرح ذکر کرتا ہے:

وَمَا الْعَيْشُ إِلَّا نَوْمَةٌ وَّتَبَطُّحٌ	وَتَمْرٌ عَلَى رَأْسِ النَّخِيلِ وَمَاءٌ
نہیں ہے زندگی مگر تھوڑا سا سو لینا اور سیدھا ہو جانا	اور کھجور کے درخت پر کھجور اور پانی

آپ جیسے لوگ جانتے ہیں کہ اس طرح کی پر امن اور خاموش زندگی اور ایسی خوشگوار اور سیدھی زندگی بہت سا وقت اور کوشش مہیا کر دیتی ہے اور انسان موجود پر راضی ہو جاتا ہے اور جو موجود نہیں ہوتا اس میں اس کا دل مشغول نہیں ہوتا اسی وجہ سے اس کا بڑا اثر سوچ کے خلوص، قوت حافظہ اور تیز فہمی پر ہوتا ہے خصوصاً صحابہ رضی اللہ عنہم کے اذہان حفظ قرآن اور حفظ حدیث کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ یہ قائل کے مندرجہ ذیل قول کے مطابق ہے:

((فَصَادَفَ قَلْبًا خَالِيًا فَتَمَكَّنَا)).

"خالی دل میں آ کر جاگزیں ہوئی۔"

چوتھا عامل ان کی اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ سچی محبت اور ایسی محبت جوان کے دل دماغ میں رچ بس چکی تھی اور ان کا پختہ اعتقاد بن چکی تھی اور آپ علم نفسیات میں بخوبی جانتے ہیں کہ محبت جب سچی ہو اور رسوخ پکڑ جائے تو محبت کرنے والے کو اپنے محبوب کی یادگاروں کو سوچنے، اس کی بات سے لذت حاصل کرنے اس کی خبروں کو انوکھا سمجھنے اور اس سے صادر ہونے والے عمل اور منہ سے نکلنے والی ہر بات کو محفوظ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم کی اللہ تعالیٰ سے محبت کتاب اللہ اور سنت رسول کو یاد کرنے کا قوی ترین عامل ہے جیسا کہ قائل نے کہا:

لَهَا أَحَادِيثُ مِنْ ذِكْرَاكَ تَشْغَلُهَا	عَنِ الشَّرَابِ وَ تُلْهِيهَا عَنِ الزَّادِ
لَهَا بِوَجْهِكَ نُورٌ يُسْتَضَاءُ بِهِ	وَمِنْ حَدِيثِكَ فِي أَعْقَابِهَا حَادِ
إِذَا شَكَتْ مِنْ كَلَالِ السَّيْرِ وَ أَعَدَهَا	رُوحُ الْقُدُومِ فَتَحْيَا عِنْدَ مِيعَادِ

جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اللہ تعالیٰ سے گہری محبت اتنی زیادہ تھی کہ اس کی تشریح اور بیان کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس پر دلائل اور براہین قائم کرنے کی ضرورت ہے وہ خیر القرآن کے لوگ تھے، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم" (سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر اس کے بعد والا)[①] یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی جانیں اور قیمتی مال بالکل بے قیمت کر کے اس کی رضا کے راستے میں خرچ کر دیے یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرتے ہوئے دنیا کو ان چیزوں کے بدلے فروخت کر دیا جن میں وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا تلاش کیا کرتے تھے یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اسلام کی ہدایت کو

---

① بخاری، کتاب الشہادات-۹، مسند احمد ۱/ ۳۷۸

مشرق ومغرب تک پہنچایا اور دعوت اسلامیہ کی کامیابی کے حصول میں ہر شہر اور ہر دیہات میں عجیب وغریب اعمال پیش کیے اور وہی اس لائق تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قرآن پاک میں بارہا تعریف کی اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی عظیم الشان احادیث میں ان کی خوب تعریف کی۔

اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کی محبت کے مظاہر کو ان کی سچی تاریخ نے ظاہر کیا کہ کوئی کسی سے بھی اتنی محبت نہیں کرتا جتنا کہ وہ محمد ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ محبت کرتا ہے ان میں سے ہر آدمی کا خون رسول اللہ ﷺ کے قدم کے نیچے لگنے والے کانٹے پر بھی قربان ہے آپ ﷺ کے وضو کا پانی سخت سردی کے دنوں میں بھی بھاگ کر لیتے اور اس سے برکت حاصل کرتے ان کا باپ یا بیٹا اگر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دشمنی کرتا ہوتا تو وہ ان کے بدترین دشمنوں میں سے ہوتا اور محمد ﷺ کی حدیث کے لیے ان کے مردوں اور عورتوں میں ہر ایک کے دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا یہاں تک کہ یہ عورتوں کی نمائندگی کرنے والی ہے جو رسول اللہ ﷺ سے عرض کر رہی ہے کہ ”یا رسول اللہ ﷺ ہم پر ہمارے مرد آپ سے فائدہ حاصل کرنے میں ہم پر غالب ہیں آپ ہمارے لیے کوئی دن مقرر فرمادیں جس میں ہم آپ کے پاس آئیں اور آپ ہمیں وہ علم سکھلا دیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھلایا“ اس کے علاوہ بہت سے شواہد اور مظاہر ہیں جو اس عظیم اور شریف محبت کی انتہا پر دلالت کرتے ہیں اس شعر کے قائل پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔

اَسَرَتْ قُرَيْشٌ مُسْلِمًا فِيْ غَزْوَةٍ	فَمَضٰى بِلَا وَجَلٍ اِلَى السَّيَّافِ
قریش نے ایک مسلمان کو کسی غزوہ میں قید کر لیا	اور بے خوف ہو کر جلاد کے پاس پہنچ گیا
سَاَلُوْهُ هَلْ يُرْضِيْكَ اَنَّكَ سَالِمًا	وَلَكَ النَّبِيَّ فِدًى مِنَ الْاِتْلَافِ
انھوں نے پوچھا کہ کیا تمہیں پسند ہے کہ تم صحیح وسالم رہو	اور نبی کریم ﷺ کو تمہاری جگہ قتل کر دیا جائے
فَاَجَابَ كَلَّا لَا سَلِمْتُ مِنَ الرَّدٰى	وَيُصَابُ اَنْفُ مُحَمَّدٍ بِرُعَافِ

”اس نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ میں ہلاکت سے بچ جاؤں۔ اور نبی کریم ﷺ کی ناک سے نکسیر بھی پھوٹ پڑے۔“

اس محبت کے مظاہر میں سے (جیسا کہ آپ دیکھ چکے) ان کا کتاب اللہ کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھنا ہے کہ وہ اسے آپ ﷺ سے حاصل کرتے اور اسے محفوظ کرتے۔ اس کے بعد آپ ﷺ کی نورانی سنت کی طرف پیش قدمی کرتے اور آپ ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات کو پوری طرح سے یاد کرتے بلکہ آپ ﷺ کے طریقے اور اقوال کی بحث، اس کی صفت اور شکل پر آگاہی میں مہارت حاصل کرتے جیسا کہ آپ کو واضح ہوگا کہ حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ کے حلیہ کے بارے میں کیسے سوال کیا؟ اور ان کے والد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کے ماموں ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ کے ذریعے انھیں کس طرح جواب دیا گیا محمد ﷺ کی شاندار صورت اور مصور ماہر اور صانع قادر کے حکم سے کیسا منقش کیا۔ (ترمذی کتاب الشمائل)

پانچواں عامل

قرآن پاک کی بلاغت جو اس حد تک ہے کہ ہر بیان پر فائق ہے اور اس نے ہر زبان کو گونگا کر کے رکھ دیا اور ہر معارض اور مخالف کی زبان بند کر کے رکھ دی اور ہر جھگڑنے والے اور ہر الٹی سیدھی مارنے والے کی کمر توڑ کر رکھ دی یہاں تک کہ اس کا مقام قائم ہو گیا اور یہ مقام دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے حبیب ﷺ اور حق تعالیٰ کی

طرف سے اس کے رسول اللہ ﷺ کی تائید بن کر قائم و دائم رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کے اعجاز اور بلاغت کے بعد حضرت محمد ﷺ کا کلام ہے جو اپنی چمک دمک، خوشنمائی اور فوقیت میں نیز اپنے الفاظ کی فصاحت اور اپنے معانی اور ہدایت کی رفعت میں اپنی مثال آپ ہے۔ آپ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ فصیح و بلیغ تھے اور عرب میں اس اعتبار سے اپنے تمام فصحاء بلغاء کی وجہ سے مقتداء کی حیثیت رکھتے تھے اور سب سے اچھی نظم اور سب سے اچھی نثر کو یاد کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھتے تھے اسی بناء پر ان میں ایک ہوا چل پڑی کہ ہر شخص قرآن پاک کو حفظ کرنے، اسے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں لگ گیا ان کا سونا جاگنا قرآن پاک کے ساتھ ہو گیا اسی طرح سنت نبویہ کو یاد کرنا اور اس پر عمل کرنا بھی قرآن کی طرح ان کی توجہ کا مرکز بن گیا وہ اس کی ایک دوسرے سے ہدایت کرتے اور اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے جیسا کہ آپ سن چکے ہو۔

قرآن پاک کی بلاغت کے رموز اور اس کے اعجاز کی وجوہ تیز کلام نبوت کی بلاغت اور اس کا امتیاز اور میدان بیان میں عربوں کا ایک دوسرے سے آگے بڑھنا یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ کسی شرح و بیان کی محتاج نہیں ادھر اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو ہمارے سامنے حق ہی بولتی ہے یہ وہ کتاب ہے جو تمام مخلوق کو اپنے اعجاز کا چیلنج کرتی ہے اور ادھر نبوت کا سمندر ہے جو ہر گوہر اور ہر موتی کو چار چاند لگا دیتا ہے اور اپنی کامل ہدایات اور گراں قدر حکمتوں کی بدولت ٹھاٹھیں مارتا ہے اور اس طرف عربی ادب کی تاریخ ہے جو صناعت کلام میں ان عربوں کی فوقیت اور فصاحت کے میدان میں ان کی تمام مخلوق پر سبقت اور اسرار بلاغت خصوصاً قرآن پاک کی بلاغت کے ذوق میں ان کے امتیاز کو محفوظ اوراق میں مندرج کرتی ہے۔

چھٹا عامل کتاب و سنت کے علم و عمل، حفظ و فہم اور تعلیم و نشر کی ترغیب اور اسی طرح ان سے اعراض اور لاپرواہی سے ترہیب۔

قرآن پاک میں ہم اللہ تعالیٰ سبحانہ کا ارشاد پڑھتے ہیں کہ:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ۝ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝﴾ (فاطر: ۲۹، ۳۰)

"جو لوگ خدا کی کتاب پڑھتے اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں وہ اس تجارت (کے فائدے) کے امیدوار ہیں جو کبھی تباہ نہیں ہوگی۔ کیونکہ خدا ان کو پورا پورا بدلہ دے گا اور اپنے فضل سے کچھ زیادہ بھی دے گا وہ تو بخشنے والا (اور) قدردان ہے۔"

آپ غور فرمائیں کہ کیسے اللہ تعالیٰ نے تلاوت قرآن کو نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے پر مقدم کیا؟

اور آپ دیکھیں کہ ہم قرآن پاک میں اللہ جل ذکرہ کا یہ ارشاد بھی پڑھتے ہیں:

﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْۤا اٰيٰتِهٖ وَ لِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝﴾ (ص: ۲۹)

"(یہ) کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے بابرکت ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ اہل عقل نصیحت پکڑیں۔"

اب آپ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس باکمال طریقے سے قرآن میں تدبر، نصیحت اور وعظ حاصل کرنے کی کس طرح

ترغیب دی ہے؟ اسی طرح ہم اللہ تعالیٰ عز وجل کا قول پڑھتے ہیں کہ:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾ (البقرۃ:۱۵۹،۱۶۰)

"جو لوگ ہمارے حکموں اور ہدایتوں کو جو ہم نے نازل کی ہیں (کسی غرض فاسد سے) چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم نے ان لوگوں کے (سمجھانے کے) لیے اپنی کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے ایسوں پر خدا اور تمام لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔ ہاں جو توبہ کرتے ہیں اور اپنی حالت درست کر لیتے اور (احکام الٰہی کو) صاف صاف بیان کر دیتے ہیں تو میں ان کے قصور معاف کر دیتا ہوں اور میں بڑا معاف کرنے والا (اور) رحم والا ہوں۔"

اب آپ غور کریں کہ قرآن پاک اور اس کی ہدایت کو چھپانے والے کی وعید کس طرح ہے؟

اس کے بعد آپ ﷺ کا قول پڑھتے ہیں کہ:

((ما اجتمع قوم فی بیت من بیوت اللہ یتلون کتاب اللہ ویتدارسونہ بینہم الانزلت علیہم السکینۃ وغشیتہم الرحمۃ وحفتہم الملئکۃ وذکرھم اللہ فیمن عندہ))۔

"اللہ تعالیٰ کے گھروں میں سے کسی گھر میں کوئی بھی قوم جمع ہوتی ہے اور کتاب اللہ کی تلاوت اور اس کا آپس میں دور کرتی ہے تو ان پر ضرور سکینت نازل ہوتی ہے اور رحمت انھیں ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے انھیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر اس مخلوق میں کرتا ہے جو اس کے پاس ہے۔" ①

نیز صحیح بخاری کتاب الفضائل میں اور مسلم شریف میں بھی ہم ایک حدیث پڑھتے ہیں کہ:

((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ))۔

"تم میں سے سب سے بہترین وہ ہے جو قرآن پاک کو سیکھے اور سکھلائے۔"

اور ابوداود، ترمذی اور ابن ماجہ میں ہم پڑھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

((عرضت علی ذنوب امتی فلم أر ذنبا اعظم من سورۃ القرآن اوآیۃ اوتیہا رجل ثم نسیہا))۔

"میرے سامنے امت کے گناہ پیش کیے گئے میں نے اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں دیکھا کہ کسی آدمی کو قرآن پاک کی کوئی سورۃ یا آیت ملی ہو اور وہ اسے بھلا دے۔" ②

کیا یہ اور اس جیسی بہت سی مثالیں ایسی نہیں ہیں جو ہماری ہمتوں کو ابھارتی اور عزائم کو متحرک کرتی ہیں کہ قرآن پاک کو حفظ کیا جائے اسے اپنے سینے میں محفوظ کیا جائے اور اس کی ہمیشہ تلاوت کی جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے بھلانے کی وعید میں وقوع ہو جائے اور وہ وعید بہت سخت ہے جیسا کہ آپ سن چکے ہو۔

---

① مسلم کتاب الامارت ۱۴۸، مسند احمد ۲ / ۲۵۲، ابوداود ۴۵۵

② ابوداؤد کتاب الصلوۃ، ترمذی ثواب القرآن ۱۹،

جبکہ سنت نبویہ کی شان میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ (الحشر:۷)

"اور رسول جو کچھ تمہارے پاس لائیں اسے لے لو اور جس سے منع کردیں اس سے رک جاؤ۔"

نیز فرمایا کہ:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (النساء:۸۰)

"جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی ہی اطاعت کی۔"

اور فرمایا کہ:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝﴾ (الاحزاب:۲۱)

"تم کو پیغمبر خدا کی پیروی (کرنی) بہتر ہے (یعنی) اس شخص کو جسے خدا (سے ملنے) اور روز قیامت (کے آنے) کی امید ہو اور وہ خدا کا ذکر کثرت سے کرتا ہو۔"

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝﴾ (النساء:۶۵)

"تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کردو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔"

سنت نبویہ یعنی حدیث شریف کی ترغیب میں آپ ﷺ کا قول آیا ہے کہ:

((نضر اللہ امرأ سمع منا حدیثا فادّٰہ کما سمعہ فرب مبلغ اوعی من سامع)).

"اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے جس نے ہماری کوئی حدیث سنی ہو اور وہ اسے ایسے آگے پہنچا دے جیسا اس نے سنی بہت سے ایسے لوگ جن کے پاس حدیث پہنچی ہو وہ حدیث کو سننے والوں سے بھی زیادہ یاد کرنے والے ہوتے ہیں۔"①

یہ ایک متواتر حدیث ہے اور آپ ﷺ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا کہ:

((الا فلیبلغ الشاھد الغائب فلعل بعض من یبلغہ ان یکون اوعی لہ من بعض من سمعہ)).

"خبردار! موجود لوگ غائبین تک پہنچا دیں ہوسکتا ہے کہ جس تک پہنچے وہ سننے والوں میں سے بھی کسی سے زیادہ یاد کرنے والا ہو۔"②

---

① سنن ابوداؤد کتاب العلم ۱۰، سنن ترمذی کتاب العلم ۷، ابن ماجہ کتاب المالک ۷٦، مسند دارمی مقدمہ ۲۴، مسند احمد ۷ ۴۳

② صحیح بخاری کتاب العلم باب ص ۹، کتاب الصید ۸، الاضاحی ۵، الفتن ۸، صحیح مسلم کتاب الحج حدیث ۴۴٦

اور سنت سے اعراض کرنے پر وعید کے طور پر آپ ﷺ کا ارشاد وارد ہوا ہے کہ:

((من رغب عن سنتی فلیس منی)).

"جس سے میری سنت سے منہ موڑا وہ مجھ سے نہیں ہے۔" ①

آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

"کیا ایسا ہونے والا نہیں ہے کہ ایک آدمی کو میری حدیث پہنچے گی اور وہ اپنے تخت پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھا ہو گا اور کہہ رہا ہو گا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان کتاب اللہ کافی ہے ہمیں اس میں جو حلال ملا ہم نے اسے حلال سمجھا اور اس میں ہم نے جو حرام پایا اسے حرام سمجھا رسول اللہ ﷺ نے جسے حرام کیا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ کی طرح ہے۔" ②

ابوداؤد نے اس کے شروع میں یہ بھی اضافہ کیا کہ:

((انی اوتیت الکتاب ومثله معه)).

"بے شک مجھے کتاب دی گئی اور اس کے ساتھ اس جیسا اور بھی۔"

اب آپ اس جیسی آیات کریمہ اور احادیث شریف میں دیکھتے ہیں کہ ایک ضعیف مومن کی ہمت کو نبوت کی امتیازی خصوصیات کی طرف توجہ کرنے کے لیے کس طرح ابھارتی ہیں کہ ان سے ہدایت طلب کی جائے اور نبی کریم ﷺ کی انوکھی اور بے مثال باتوں کو یاد کیا جائے آپ تو کجا صحابہ ﷺ کو دیکھیں کہ وہ اس میدان میں توانا اور بلند ہمت ہونے میں بے مثال ہے۔

ساتواں عامل

کتاب وسنت کا دین میں مرتبہ ہے، چنانچہ کتاب اللہ ہی شریعت کی اصل اول ہے اور کتاب اللہ ہی دنیا اور آخرت کا جامع ترین دستور ہے اور کتاب اللہ ہی وہ منظم قانون ہے جو انسان کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرتا ہے اور یہی وہ منظم قانون ہے جو انسان کا ان تمام چیزوں کے ساتھ تعلق وابستہ کرتا ہے جس میں وہ بستا ہے۔ اس کے بعد سنت ہے جو شریعت کی اصل ثانی ہے اور سنت ہی قرآن پاک کی شرح کرتی ہے اس کے مجمل کی تفصیل مطلق کو مقید، اس کے عام کو خاص اور اس کے مبہم کو مبین کرتی ہے نیز اس کے رموز واسرار کو ظاہر کرتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ۝﴾ (النحل: ۴۴)

"اور ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کردو تاکہ وہ غور کریں۔"

اسی بنا پر یحییٰ بن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ "سنت کتاب پر قاضی ہے اور کتاب اللہ سنت پر قاضی نہیں ہے" امام سیوطی رحمہ اللہ نے ان کلمات کی مراد کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ "خلاصہ یہ کہ قرآن پاک کے سنت کی طرف محتاج ہونے کا معنی یہ ہے کہ سنت قرآن پاک کی وضاحت کرتی ہے اور اس کے مجملات کی تفصیل کرتی ہے کیونکہ اس کی بلاغت اور اختصار کی وجہ سے اس میں موتی ہیں جس کے چھپے ہوئے مخفی رازوں کو جاننے اور انھیں ظاہر کرنے والے کی ضرورت ہے اور یہی وہ چیز ہے جو آپ ﷺ پر نازل ہوئی

---

① مسلم شریف کتاب النکاح حدیث ۸

② ابوداؤد، سنن ابن ماجہ المقدمہ ۲، سنن ترمذی کتاب العلم ۱۰، مسند الدارمی مقدمہ ۳۹ مسند احمد ۴/ ۱۳۲

ہے اور سنت کے کتاب اللہ پر قاضی ہونے کا مطلب بھی یہی ہے جبکہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ وہ سنت کی وضاحت کرے اور نہ ہی اس کا قاضی ہے کیونکہ وہ خود ہی واضح ہے اس لیے کہ یہ اعجاز اور ایجاز میں قرآن کی حد تک نہیں پہنچ سکتی کیونکہ یہ اس کی شرح ہے اور شرح کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ مشروح سے زیادہ واضح مبین ہوتی ہے۔"

اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کتاب وسنت کے مرتبہ کو خوب جانتے تھے اور اس میں کوئی تعجب نہیں کہ وہ اسے سمجھنے، یاد کرنے اور اس پر عمل کرنے میں خوب حریص تھے۔

آٹھواں عامل

بہت سے واقعات وحوادث اور بہت سے سوالوں کا کلام اللہ اور کلام رسول کے ساتھ مرتبط ہونا ان کی شان بھی یہی ہے کہ اس کا بھرپور اہتمام ہو، اذہان چوکنا ہوں اور سوچ وفکر متوجہ ہو کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا کیا فیصلہ ہوتا ہے اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی کیا بات ہوتی ہے اور کیا جواب ارشاد ہوتا ہے اسی وجہ سے وحی الٰہی اور کلام نبوی نفوس میں اچھی طرح راسخ ہو جاتا ہے اور زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اذہان میں منقش ہوتا چلا جاتا ہے۔

اب آپ ایک مرتبہ قرآن پاک کے باغات میں سیر کیجئے آپ کو اس کے تجدد و وقوع میں حوادث وآفات آتے جاتے نظر آئیں گے کبھی تو یہ قرآن پاک سوال کرنے والوں کے سوالوں کے جوابات دے رہا ہوگا جیسے:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾ (الاسراء:۸۵)

"اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ میرے پروردگار کی ایک شان ہے۔ اور تم لوگوں کو (بہت ہی) کم علم دیا گیا ہے۔"

کبھی یہ پیش آمدہ مشکل کی وضاحت اور طاری شدہ فتنے کا فیصلہ کر رہا ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ جَاۗءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۭ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۭ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ﴾ (النور:۱۱)

"بے شک جو لوگ بہتان لے کر آئے وہ تمہارے اندر کی ایک جماعت ہے تم اسے اپنے لیے برا مت سمجھ بلکہ یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔"

اُولٰۗىِٕكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝﴾ (النور:۲۶) تک

"یہ لوگ بری ہیں اس بات سے جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں ان کے لیے مغفرت اور عزت کی روزی ہے۔"

یہ سورت نور کی چھ آیات ہیں جو بڑے خوفناک ترین واقعہ کے بارے میں نازل ہوئیں۔ وہ واقعہ حضرت ام المومنین سیدہ جلیلہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت ہے وہ عائشہ رضی اللہ عنہا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ وہ عائشہ رضی اللہ عنہا جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہیں۔ ان آیات میں اجتماعی اسباق ہیں جنھیں پڑھا گیا اور قیامت تک لوگوں کے سامنے پڑھی جاتی رہیں گی اور اس پاک دامن پاکیزہ خاتون کی برأت محفوظ اوراق میں لکھی جاتی رہے گی یہ وہ برأت ہے جو سات آسمان سے نازل ہوئی۔

کبھی یہ قرآن مسلمانوں کی فکروں کو ان کی غلطی کی تصحیح کی طرف متوجہ کرتا ہے اور انھیں درستگی کے طور طریقے کی طرف

رہنمائی کرتا ہے جیسا کہ سورۃ آل عمران آیت ۱۲۱ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ (آل عمران:۱۲۱)

"اور جب آپ اپنے گھر والوں سے نکل کر مومنین کو لڑائی کے ٹھکانوں پر بٹھلا رہے تھے۔"

اس کے بعد والی بہت سی آیات تک۔

یہ تمام آیات غزوۂ احد کے بارے میں نازل ہوئیں جو مسلمانوں کی اس خوفناک موقع پر ان کی غلطی پر رہنمائی کر رہی ہیں اور انھیں کسی دوسرے موقعہ پر ایسے ہولناک پریشان کن معاملہ میں واقعہ ہونے سے بچنے پر تنبیہ کر رہی ہیں۔

اسی طریقے پر قرآن پاک میں سورتیں اور آیات اس قدر نازل ہوئی ہیں کہ انھیں شمار نہیں جا سکتا اور نہ ہی وہ گنی جا سکتی ہیں۔

اور جب آپ حدیث نبوی شریف کے باغوں میں گھومیں تو آپ کو اس باب میں بھی عجیب وغریب چیزیں نظر آئیں گی۔ آپ مخزومیہ کا قصہ ہی دیکھ لیں جس نے چوری کی تھی اور اس کے بارے میں سفارش کرنے والے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا کہ:

((وایم اللہ لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا)).

"خدا کی قسم اگر فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی چوری کرتیں تو بھی میں اس کا ہاتھ ضرور کاٹتا۔"[1]

اس کے بعد آپ غور کریں قبیلہ جہینہ کی اس عورت کی حدیث کے بارے میں جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زنا کا اقرار کیا اور وہ زنا سے حاملہ تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا حکم جاری فرمایا؟ کہ اس کے وضع حمل تک اس کے ولی نے اس کی کفالت کی اس کے بعد اسے لایا گیا اور اسے رجم کیا گیا پھر رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نماز جنازہ پڑھایا۔ اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا جنازہ کیسے پڑھ رہے ہیں حالانکہ وہ زانیہ تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے ایسی توبہ کی کہ اگر اہل مدینہ سے ستر افراد پر بھی تقسیم کر دی جائے تو انھیں کافی ہو جائے کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی افضل چیز آپ نے دیکھی کہ اس نے اپنی جان کو اللہ تعالیٰ عزوجل کے لیے قربان کر دیا۔[2]

آپ غور کریں حدیث جبریل علیہ السلام میں کہ اس میں جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام ایمان، احسان اور قیامت اور اس کی علامت کے بارے میں سوال کر رہے ہیں جبکہ صحابہ رضی اللہ عنہم اسے دیکھ رہے ہیں اور سن رہے ہیں اور آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں فرماتے ہیں کہ یہ جبریل علیہ السلام ہیں جو تمہارے پاس آئے تھے تاکہ وہ تمھیں تمہارا دین سکھائیں۔[3]

سنت نبوی میں غور کرنے سے بہت سی مثالیں ملیں گیں جو اسی طرح کے واقعات حوادث اور سوالوں کے گرد گھوم رہی ہوں گی۔ علمائے نفسیات کے نزدیک یہ بات طے ہے کہ معلومات کا ان کے ساتھ فکر میں مقترن امور کے ساتھ ارتباط انھیں زمانے تک دیرپا اور نفوس میں ثابت قدم رکھتا ہے اس لیے یہ بات کوئی انوکھی نہیں کہ ہم نے جو ذکر کیا وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے کتاب اللہ اور

---

① بخاری فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۸، کتاب الحدود ۱۲، مسلم کتاب الحدود حدیث ۸، ۹، ابو داؤد ۴، ترمذی کتاب الحدود ۶، نسائی کتاب السارق ۵، ابن ماجہ کتاب الحدود ۶، داری کتاب الحدود ۵، مسند احمد ۳/ ۳۸۶

② صحیح مسلم کتاب الحدود ۲۴، ترمذی کتاب الحدود ۹، مسند احمد ۴/ ۴۳۰

③ بخاری کتاب الایمان باب ۳۷، مسلم کتاب الایمان ۴، ابو داؤد کتاب السنۃ ۱۶، نسائی کتاب المواقیت ۶، ابن ماجہ مقدمہ ۰، مسند احمد ۱/ ۱۵

سنت رسول ﷺ کو حفظ کرنے کا باعث اور سبب بن گیا اور ایسے وقت جبکہ وہ حضرات ان واقعات وحوادث کا مشاہدہ کر رہے تھے اور خطاب حق کو بالمشافہ سن رہے تھے اور سید الخلق کے کلام کو آمنے سامنے سن رہے تھے اور یہ سننا اور مشاہدہ کرنا بھی ان موزوں مناسبات اور قائم شدہ اسباب میں تھا جنھوں نے ان کے نفوس کو ان واقعات میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا منتظر بنا دیا اور ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا تشنہ بنا دیا چنانچہ کلام ان مشتاق دلوں پر ایسے اترتا جیسے خشک زمین پر بارش اترتی ہے اور وہ زمین اسے حریص ومشتاق ہو کر پی جاتی ہے اور اسے قلبی لگاؤ کے ساتھ لیتی ہے اور اسے تھامتی اور بیداری میں اس پر حریص ہوتی ہے اور اس کے ذریعے سرسبز وشاداب ہوتی ہے اور اسے حقیقت شمار کرتی ہے اس سے نفع حاصل کرتی ہے اور نفع پہنچاتی ہے بلکہ اس کے ذریعے وہ سرسبز وزرخیز ہوتی ہے پھلتی بڑھتی ہے اور ہر طرح کے تر زوتازہ جوڑے اگاتی ہے۔

نواں عامل

قرآن پاک ہمیشہ اعجاز کے ساتھ ہی مقترن رہا ہے اور بعض احادیث نبویہ ایسے امور کے ساتھ ملی ہوئی ہیں جو عادت کے خلاف ہیں جو دل کو حیران کر دیتے ہیں دیکھنے والے کا شوق بڑھاتے اور سننے والے کو مبہوت کر دیتے ہیں۔ ہم نے اس اعجاز اور خرق عادت کو حفظ صحابہ رضی اللہ عنہم کے عوامل میں شمار کیا اس لیے کہ جو چیز عام ضابطے اور قانون کے مطابق ہوتی ہے اس کی شان یہ ہوتی ہے کہ جو بھی اس کا مشاہدہ کرتا ہے وہ اس کے حافظہ میں بیٹھ جاتی ہے اور جو بھی اس کا معاینہ کرتا ہے اس کے دل میں مرتکز ہو جاتا ہے خواہ وہ فرد ہو یا پوری جماعت ہو حتیٰ کہ اسے بنیاد بنا لیا جاتا ہے، جس کے حدوث سے دنوں اور سالوں کی تاریخ لکھی جاتی ہے اور اس کے وجود پر مرنے اور جینے کو قیاس کیا جاتا ہے۔

جبکہ قرآن کریم کا اعجاز اس میں ایسے سرایت کیے ہوئے ہے جیسے پانی سبز لکڑی میں سرایت کیے ہوتا ہے کہ کوئی سورۃ اور کوئی بھی آیت اس سے خالی نہیں ہوتی اور اس کے اعجاز کی وجوہ کو سب سے زیادہ جاننے والے اور اس کی بلاغت کے اسرار کے ذوق کو سب سے زیادہ جاننے والے اصحاب محمد ﷺ ہی ہیں کیونکہ وہ لوگ اسی معرفت میں ظہور پذیر ہوئے اور یہ ذوق ان کی خالص عربی فطرت، ان کا عالی شان صاف ستھرا سلیقہ اور ان کا بیان کے فنون اور زبان کی صنعت میں ماہر ہونے ہی کا نام ہے اسی وجہ سے قرآن ان کی حیات صحیحہ تھی اسی کے ساتھ وہ کھڑے ہوتے اور بیٹھتے، اس کے ساتھ وہ سوتے اور جاگتے، اسی کے ساتھ رہتے سہتے اور معاملات کرتے اور اسی کے ساتھ متلذذ ہوتے اور عبادت گزاری کرتے اور اللہ تعالیٰ کے قول

﴿ وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ﴾ (الشوریٰ: ۵۲)

"اور ہم نے آپ کی طرف اپنی طرف سے روح کو وحی کیا۔

میں روح کا بھی یہی معنیٰ ہے اور تاریخ میں کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جسے قرآن نے روح کے ساتھ متصور کرایا ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس اعلیٰ اور اشرف طبقہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے طبقے کو متصور کرایا وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جنھوں نے اپنی زندگی اس کے سامنے پیش کر دی اس نے انھیں زندگی بخشی اور ان کی طبیعت کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انھیں میں "خلقا اٰخر" کے ساتھ تعبیر کیا۔

﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ (المؤمنین: ۱۴)

"بابرکت ہے وہ اللہ جو سب سے اچھا خالق ہے۔"

جبکہ سنت نبویہ میں سے بعض سنن ایسے معجزات کے ساتھ ملے ہوئے ہیں جو خارق للعادت ہیں اور آپ کے سامنے معجزات کی احادیث ہیں جو بہت کثرت کے ساتھ ہیں اور ان میں تعجب اور خوشی ہوتی ہے لیکن ہم آپ کو اس میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے والا ہونے سے بچانا چاہتے ہیں کیونکہ ہمارے سامنے صحیح احادیث کا بہت بڑا مجموعہ اور بہت بڑی تعداد ہے:

﴿وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ ۝﴾ (فاطر: ۱۴)

"بہت زیادہ خبر رکھے والے کی طرح آپ کو کوئی بھی خبر نہیں دے سکتا۔"

یہاں ہم آپ کے سامنے صرف ایک نمونہ پیش کرتے ہیں جسے بخاری و مسلم نے حضرت ابو العباس سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ خیبر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "کل کو میں ایک ایسے شخص کو جھنڈا عطا کروں گا جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ فتح نصیب فرمائے گا وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بھی اس کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ اب لوگوں نے بڑی بے چینی کے ساتھ رات گزاری کہ جھنڈا کسے ملے گا جب صبح ہوئی تو سب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے ہر ایک کو امید تھی کہ جھنڈا اسے ملے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کہاں ہیں؟" کسی نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی آنکھ میں تکلیف ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے بلا لاؤ! انھیں بلایا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھ پر اپنا لعاب لگایا اور ان کے لیے دعا کی وہ ٹھیک ہو گئے اور ایسے ٹھیک ہو گئے گویا کہ انھیں تکلیف تھیں ہی نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں جھنڈا عطا فرما دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں ان کے ساتھ قتال کرتا رہوں گا جب تک کہ وہ لوگ ہم جیسے نہ ہو جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ٹھیک ہے اسی طرح کرتے رہو یہاں تک کہ آپ ان کے پاس قیام پذیر ہو جاؤ پھر انھیں اسلام کی دعوت دو! اور انھیں بتلاؤ کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا کون سا حق واجب ہے؟ اللہ کی قسم! اگر تمہاری وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کسی ایک آدمی کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اُونٹوں سے بہتر ہے۔ ①

اس مقام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کرنا صرف یہی واحد ایسی چیز ہے جو ان جھوٹوں کی زبان کاٹنے کے لائق ہے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام تلوار اور طاقت کے زور پر قائم ہوا ہے اور اس نے تشدد اور سختی کا سہارا لیا ہے اور کسی دلیل اور حجت کی بناء پر نہیں پھیلا اور کسی قسم کی سلامتی اور رحمت لے کر نہیں آیا۔

﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ۚ إِن يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا ۝﴾ (الکہف: ۵)

"کتنی بڑی بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکل رہی ہے سوائے جھوٹ کے کچھ بھی نہیں بول رہے ہیں۔"

دسواں عامل

تعلیم وتربیت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت اور دعوت وارشاد میں حسن سیاست ایسی چیزیں ہیں جنھوں نے کتاب وسنت کو اذہان میں راسخ کر دیا اور حفظ و یاد کرنے کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے آسان کر دیا۔

---

① صحیح بخاری کتاب فضائل الصحابہ ۹، کتاب الغازی ۳۸، صحیح مسلم کتاب الجہاد حدیث ۱۳۲، فضائل الصحابہ ۳۲، ترمذی کتاب المناقب ۲۰، ابن ماجہ مقدمہ ۱۱، مسند امام احمد ۳۳۱/۱۰

جہاں تک قرآن پاک کا تعلق ہے تو آپ کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ اس کے ذریعے تعلیم وتربیت میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کو جان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے امت اسلامیہ پر اس زبان میں نازل کیا جو ان کے دلوں میں محبوب ترین زبان تھی اور اس دل فریب اسلوب اور اس معجز نظم پر اتارا جو دلوں میں گھر کرنے والا تھا اور اس نے اسے نازل کرنے میں تدریج کا راستہ اپنایا ایک دم میں نازل نہیں کیا کہ کہیں وہ ان پر بوجھ نہ بن جائے اور وہ اس سے عاجز ہو جائیں بلکہ اس نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے بیس یا بیس سے کچھ زائد سالوں میں نازل کیا پھر اس کی بہت سی سورتوں اور آیات کو حوادث اور اسباب خاصہ کے ساتھ جوڑا اور اسے دلیل وحجت کے ساتھ مستحکم بنایا اور اس کے ذریعے عقول وضمائر کو مخاطب کیا اور اس کے ساتھ ان کی مصلحتوں، بھلائیوں اور خوش بختیوں کو وابستہ کیا اور ان سب کے شروع میں ان کے ساتھ اپنی رحمت واسعہ کو صادر کیا گویا کہ وہ لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو رہے تھے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

﴿مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَهِّرَكُمْ وَلِیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝﴾ (المائدہ:٦)

"اللہ تعالیٰ تم پر تنگی ڈالنا نہیں چاہتا بلکہ وہ تو تمہیں پاکیزہ کرنا چاہتا ہے نیز وہ تم پر اپنی نعمت پوری کرنا چاہتا ہے تاکہ تم شکر کرو۔"

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ۝﴾ (فصلت:٤٦)

"جس نے اچھا عمل کیا اس نے اپنے لیے کیا اور جس نے برا کیا وہ اسی پر پڑے گا اور تیرا رب بندوں پر ظالم نہیں ہے۔"

جبکہ سنت نبویہ کو اس تعلیم وتربیت کے باب میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے یہاں تک کہ جب اس جدید زمانے میں علماء تعلیم وتربیت کے میدان میں ایضاح کے وسائل اور تشویق کی اقسام کو حکمت میں شمار کیا تو حضرت محمد ﷺ چودہ صدیوں پہلے بلکہ علم تربیت اور علم نفسیات کے پیدا ہونے سے بھی پہلے ایضاح کے ان وسائل کی رعایت میں معلم اوّل تھے۔

یہ شوق دلانے والے خوشگوار وسائل آپ کے سامنے ہیں کہ ان کے ذریعے ہدایت کے منتظر قلوب کھل گئے اور آپ ﷺ کی تعلیمات سے آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل پر ہو گئے اور وہ ایسے ہو گئے جیسے ان کے اندر حروف وکلمات کے ساتھ کتاب لکھ دی گئی ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ سب سے زیادہ فصیح اللسان تھے سب سے زیادہ واضح بیان کرنے والے تھے اور سب سے عمدہ تقریر کرنے والے تھے کلام کے چشمے پھوٹ پڑتے تھے آپ ہی وہ شخصیت تھے جنھیں جوامع الکلم عطا کیے گئے کلام کا آغاز وانجام بڑی وضاحت کے ساتھ کیا کرتے تھے اور اسے ایسے تفصیل کے ساتھ بیان کرتے تھے کہ اس میں مقام وافہام کی رعایت ہوتی تھی کوئی بھی بات اس طرح جاری نہیں ہوتی تھی کہ اس کی رونق کو ختم کر دے یا اس میں سے کچھ کم کر دے بلکہ اس طرح بات کرتے کہ اگر کوئی اسے شمار کرنا چاہے تو شمار کر سکے۔ آپ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ ﷺ کلام کو تین مرتبہ دہراتے بلکہ اگر ضرورت ہوتی تو تین سے بھی زیادہ مرتبہ دہراتے تاکہ وہ بات اچھی طرح یاد ہو جائے جیسا کہ مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((هلك المتنطعون)). ①

"غلو کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز کرنے والے ہلاک ہو گئے۔"

آپ ﷺ نے یہ کلمہ تین بار دہرایا اسی طرح جیسا کہ بخاری و مسلم کی حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "خبر 19 19
دار! کیا میں تمھیں سب سے بڑے کبیرہ گناہ کے بارے میں نہ بتلاؤں؟" (یہ کلمہ آپ ﷺ نے تین مرتبہ دہرایا) ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! ضرور بتلائیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور خبردار جھوٹ اور جھوٹی گواہی آپ ﷺ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے کہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اس کو بار بار دہراتے رہے حتیٰ کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ ﷺ خاموش ہو جائیں۔

آپ ﷺ کا طریقہ کار اس طرح تھا جب آپ ﷺ خطبہ ارشاد فرماتے تو آپ ﷺ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں، آواز بلند ہو جاتی اور غصہ تیز ہو جاتا حتیٰ کہ ایسا ہو جاتا جیسے کوئی لشکر کو ڈراتے ہوئے "صَبَّحكم ومساكم" کہہ رہا ہو آپ ﷺ فرمایا کرتے کہ میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے اور آپ ﷺ اپنی شہادت کی اور درمیان والی بڑی انگلی کو ملا لیتے اور فرماتے کہ "اما بعد: بے شک سب سے اچھی بات اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور سب سے اچھا طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے اور سب سے برا امر نئی پیدا ہونے والی چیز ہے اور ہر نئی پیدا ہونے والی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے" اس کے بعد فرمایا کرتے کہ "میں ہر مومن کے اس کی جان سے بھی زیادہ قریب ہوں جس نے مال چھوڑا اور جس نے قرض چھوڑا یا اہل و عیال چھوڑے تو وہ میرے ذمہ ہیں۔ ②

آپ ﷺ کے ایضاح کے وسائل میں سے یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ لوگوں کے لیے عمدہ قسم کی مثالیں بیان کیا کرتے تھے جو ان کے لیے معانی کی وضاحت کر دیتی تھیں گویا کہ وہ شب زفاف میں ظاہر ہونے والی دلہن ہے یا ایسا سورج ہے جو بلند ہو اور اس کے نیچے کوئی بادل نہ ہو۔

آپ اس بات میں غور فرمائیں کہ "آپ ﷺ امر بالمعروف اور نہی عن منکر کی ضرورت اور ان دونوں کو چھوڑ دینے کے خطرے کے پیش نظر مثال بیان کرتے" پھر غور کرنے کے بعد اپنے رب کی قسم کھا کر مجھے بتلائیے کہ کیا تمھارے ذہن میں یہ انوکھی مثال وضاحت کرتی ہے؟

بخاری شریف میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کی حدود کی پابندی کرنے والے اور ان میں پڑنے والے کی مثال اس قوم کی سی ہے جنھوں نے قرعہ کے ذریعے کشتی کی منزلوں کو مقرر کیا کوئی اس کے اوپر والے حصے میں سوار ہو گیا اور کوئی نیچے والے حصہ میں سوار ہو گیا نیچے والوں کو جب پانی کی طلب ہوتی تو وہ اوپر والوں کے پاس سے گزرتے انھوں نے کہا کہ اگر ہم اپنے حصے میں سوراخ کر لیں اور اوپر والوں کو تنگ نہ کریں تو کیسا ہے؟ اب اگر اوپر والے بھی ان کو چھوڑ دیں کہ جانے دو جو چاہیں کریں تو سب کے سب ہلاک ہو جائیں گے اور اگر ان کا ہاتھ پکڑ لیں گے تو وہ بھی بچ جائیں اور باقی بھی سب لوگ بچ جائیں گے۔ ①

---

① صحیح مسلم، کتاب العلم: ۷ ② صحیح مسلم کتاب الجمعہ حدیث ۴۳

① صحیح بخاری باب الشرکۃ فی الطعام ۶

آپ ﷺ کے ایضاح کے وسائل میں سے وہ سوالات بھی ہیں جو آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے پیش کیے جن کے ذریعے ان کی حاضر دماغی کا امتحان لیتے اور ان کا دماغ تیز کرتے تھے تا کہ وہ آپ ﷺ کی رہنمائی کو نفوس کی تشنگی اور دلوں کی پیاس کے ساتھ حاصل کریں تا کہ وہ ان میں اچھی طرح قرار پکڑ لیں اور وہ ان میں ایسے جاگزیں ہو جائیں جیسے جسم میں روح جاگزیں ہوتی ہے۔

آپ کے سامنے ایک مثال پیش کرتا ہوں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "کیا تمھیں معلوم ہے کہ مفلس کون ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوں اور نہ ہی اس کے پاس کوئی مال ومتاع ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کا مفلس وہ شخص ہوگا جو قیامت کے دن نماز، روزے اور زکوۃ لے کر آئے گا اس نے کسی کو گالی دی ہوگی کسی پر تہمت لگائی ہوگی کسی کا مال کھایا ہوگا اور کسی کا خون کیا ہوگا ان میں سے ایک کو اس کی نیکیاں دی جائیں گی، دوسرے کو دی جائیں گی، پھر جب اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی اور اس کے ذمہ قرض باقی رہ جائے گا تو ان کی برائیاں اس پر ڈال دی جائیں گی اور اس کے بعد اسے آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ①

آپ ﷺ کے ایضاح کے وسائل میں سے عجیب وغریب ذریعہ یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ اپنے ہاتھ مبارک کی لکیروں کی مدد سے معانی کی وضاحت کرتے اور انھیں اذہان کے قریب کرتے تھے حالانکہ آپ ﷺ نبی اُمّی تھے نہ آپ ﷺ نے کوئی کتاب پڑھی، نہ کسی استاذ کے پاس بیٹھے اور نہ ہی کسی مدرسہ میں گئے اور کسی قسم کی نقشہ نگاری یا انجینئرنگ نہیں پڑھی۔

صحیح بخاری میں ہم پڑھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے ایک مربع خط کھینچا اور اس کے درمیان میں ایک خط کھینچا اور اس (یعنی درمیانی) خط کے اردگرد کئی خطوط کھینچے اور ایک خط باہر کو نکلتا ہوا کھینچا اور فرمایا کہ کیا تمھیں معلوم ہے کہ یہ کیا ہے؟ ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ انسان ہے (یعنی درمیان والا خط) اور یہ اس کی موت ہے جو اسے گھیرے ہوئے ہے (یعنی مربع خط) اور یہ اعراض وحوادث ہیں جو اسے نوچ رہے ہیں (یعنی اس کے اردگرد والے خطوط) اگر ایک حادثہ سے بچ نکلتا ہے تو دوسرا آ پکڑتا ہے اور 'یہ اس کی اُمیدیں ہیں (یعنی باہر نکلا ہوا خط)۔

آپ ﷺ کی پر حکمت سیاست میں سے یہ بھی ہے کہ آپ ان کی غلط فہمی کے موقع کو غنیمت سمجھتے اور اسی وقت ان کی سوچ کو صحیح کر دیتے اور وہ چونکہ اس وقت متوجہ ہوتے تھے اس لیے انھیں صحیح تعلیم تلقین کر دیتے۔

اس قبیل سے ایک قصہ ہے جسے بخاری ومسلم نے نقل فرمایا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ازواج کے گھروں کی طرف تین آدمی آئے اور انھوں نے آپ ﷺ کی عبادت کے بارے میں سوال کیا جب انھیں بتلایا گیا تو گویا کہ انھوں نے اسے کم سمجھا اور کہنے لگے کہ ہم کہاں اور رسول اللہ ﷺ کہاں ان کے تو اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ہمیشہ نماز پڑھوں گا دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھتا رہوں گا اور تیسرے نے کہا کہ میں عورتوں سے علیحدہ رہوں گا کبھی بھی نکاح نہیں کروں گا چنانچہ ان کے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کہ تمھی ہو وہ لوگ جنھوں نے

① مسلم شریف کتاب البر والصلة حدیث ۵۹

یہ یہ کہا اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ متقی ہوں لیکن پھر بھی میں روزے بھی رکھتا ہوں چھوڑتا بھی ہوں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور بیویوں سے نکاح بھی کرتا ہوں اب جو بھی شخص میری سنت سے روگردانی کرے گا وہ مجھ سے نہیں۔

آپ ﷺ کے ایضاح کے وسائل میں سے عملی مثال پیش کرنا بھی ہے۔ آپ ﷺ نماز پڑھتے اور فرماتے کہ "نماز پڑھو اور ایسے نماز پڑھو جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو" آپ ﷺ حج کرتے اور فرماتے کہ "مجھ سے اپنے مناسک سیکھو" اور اپنی شہادت والی اور درمیان والی انگلی کو ملا کر فرماتے کہ "میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں۔

گیارہواں عامل

ترغیب وترہیب جن کے ذریعے کتاب وسنت کے سمندر بہہ رہے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ انسان کی اپنی ذات کے ساتھ محبت کی جبلت اسے اپنے لیے ہر خیر کو وجود میں لانے اور ہر شر کو مٹانے کی طرف دھکیلتی ہے خواہ ان میں جلدی ہو یا دیر، اسی بنا پر توفیق والے نفوس قرآن پاک کی ہدایت اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کو محفوظ کرنے پر حریص ہوتے ہیں اور حتی الامکان انھیں محفوظ کرنے پر عملی مجاہدہ کرتے ہیں۔

جبکہ گمراہ نفوس جن پر ذلت چھائی ہوتی ہے وہ اس سعادت سے خواہشات اور شہوت پرستی کی گردش میں پھرے ہوئے ہیں یا اس مقام سے تعصب یا فتنہ پر جمود کے حجاب میں پوشیدہ ہیں یا وہ جہالت کی تاریکی کے ساتھ گمراہی اور مصیبت کے کیچڑوں میں دھنسے ہوئے ہیں۔

ہمیں قرآن وسنت سے ترغیب وترہیب کے شواہد تلاش کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کی رو اس سے بھی زیادہ بہہ رہی ہے جتنی کہ ترغیب وترہیب کی انواع اور وعدے اور وعید ان کے فنون اور تبشیر وانذار کے مختلف طرح کے اسلوب کو مختلف وجوہ، طرح طرح کے اعتبارات میں جانا گیا ہے خواہ وہ عقائد میں ہوں یا عبادات میں یا معاملات واخلاق میں۔

آپ کی خدمت میں بطور نصیحت قرآن کی ترغیب وترہیب کی مثال پیش خدمت ہے کیونکہ نصیحت مؤمنین کو نفع دیتی ہے اللہ تبارک وتعالیٰ ایک سورۃ یعنی سورۃ السجدہ میں فرماتا ہے کہ:

﴿وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝ قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝ وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ۝ وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ۝ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِیْنٰكُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ؗ وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕؔ لَا یَسْتَوٗنَ ۝ اَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰی ۫ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ وَ

أَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوٰهُمُ النَّارُ ۖ كُلَّمَا أَرَادُوا أَن يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّذِي كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ ۝ وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنٰى دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا ۚ إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنتَقِمُونَ ۝﴾ (السجدہ: ۱۰-۲۲)

"اور کہنے لگے کہ جب ہم زمین میں ملیا میٹ ہو جائیں گے تو کیا از سر نو پیدا ہوں گے حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے پروردگار کے سامنے جانے ہی کے قائل نہیں۔ کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تمہاری روحیں قبض کر لیتا ہے پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور (تم تعجب کرو) جب دیکھو کہ گنہگار اپنے پروردگار کے سامنے سر جھکائے ہوں گے اور کہیں گے اے ہمارے پروردگار ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا تو ہم کو (دنیا میں) واپس بھیج دے کہ نیک عمل کریں بیشک ہم یقین کرنے والے ہیں۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت دے دیتے لیکن میری طرف سے یہ بات قرار پا چکی ہے کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔ سو (اب آگ کے) مزے چکھو اس لئے کہ تم نے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا (آج) ہم بھی تمہیں بھلا دیں گے اور جو کام تم کرتے تھے انکی سزا میں ہمیشہ کے عذاب کے مزے چکھتے رہو۔ ہماری آیتوں پر تو وہی لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو ان سے نصیحت کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور غرور نہیں کرتے۔ ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں (اور) وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں اور جو (مال) ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ کوئی متنفس نہیں جانتا کہ ان کے لئے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے یہ ان کے اعمال کا صلہ ہے جو وہ کرتے تھے۔ بھلا جو مومن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو نافرمان ہو؟ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے (رہنے کے) لئے باغ ہیں یہ مہمانی ان کاموں کی جزا ہے جو وہ کرتے تھے۔ اور جنہوں نے نافرمانی کی ان کے رہنے کے لئے دوزخ ہے جب چاہیں گے کہ اس میں سے نکل جائیں تو اس میں لوٹا دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ کے عذاب کو تم جھوٹ سمجھتے تھے اس کے مزے چکھو۔ اور ہم ان کو (قیامت کے) بڑے عذاب کے سوا عذاب دنیا کا بھی مزہ چکھائیں گے شاید (ہماری طرف) لوٹ آئیں۔ اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے جس کو اس کے پروردگار کی آیتوں سے نصیحت کی جائے تو وہ ان سے منہ پھیر لے ہم گنہگاروں سے ضرور بدلہ لینے والے ہیں۔"

آپ بصیرت کی آنکھ سے دیکھیں کہ ان ترغیبات میں کس کس طرح کے اسلوب اور ان ترہیبات میں کیسے کیسے فنون ہیں جو ان آیات کے ضمن میں آئی ہیں اور قرآن پورا کا پورا اسی طرح کے انوارات سے بھرا ہوا ہے آپ اس باب میں سنت نبویہ کو بھی اسی طرح کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہی سمجھئے۔ آپ کی خدمت میں ایک نمونہ بلکہ نمونے پیش خدمت ہیں جو آپ کی اس وقت تک رہنمائی کرتے رہیں گے جب تک کہ نفوس بشریہ وعدوں اور وعیدوں سے متاثر ہوتے رہیں گے اور اس تاثر کے نتیجے میں اوامر و نواہی قرار پکڑتے رہیں گے اور وہ ذہن میں جاگزیں ہوتے رہیں گے اور وہ فکر اور سوچ کے صحیفے میں منقش ہوتے رہیں گے پھر انسان اس کی

بدولت عمل واتباع کی طرف کھنچتا چلا جائے گا۔ دیکھیں آپ ﷺ ہی وہ شخصیت ہیں جو صلہ رحمی کرنے والے کو وسعت رزق اور عمر میں برکت کی خوشخبری دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "جو شخص پسند کرتا ہو کہ اس کا رزق بڑھا دیا جائے اور اس کی عمر بڑھا دی جائے اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔" ①

اور وہی شخصیت ہیں جو آخرت کو اپنا غم بنانے والے کے لیے وعدہ بیان کرتے ہیں دنیا کو اپنا غم بنانے والے کے لیے وعید بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "جس شخص کا غم آخرت بن گیا تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں غناء پیدا کر دے گا اللہ تعالیٰ اس کی اجتماعیت کو جمع کر دے گا اور دنیا ذلیل ہو کر اس کے پاس آئے گی اور جس کا غم دنیا بن گیا اللہ تعالیٰ فقر کو اس کے سامنے رکھ دے گا اس کی اجتماعیت کو بکھیر دے گا اور مقدر سے زیادہ دنیا میں ملے گی نہیں" ②

آپ ﷺ ہی وہ شخصیت ہیں جو مومنین کو قتال پر ابھارتے اور انھیں دفاع اور مقابلے پر آمادہ کرتے تھے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جو شخص اللہ کے راستے میں نکلا اللہ تعالیٰ اس کا ضامن ہے کہ اسے میرے راستے میں جہاد کرنے، مجھ پر ایمان رکھنے اور میرے رسولوں کی تصدیق کرنے کے سوا کسی نے بھی نہیں نکالا اب میرے ذمے ہے کہ میں اسے جنت میں داخل کر دوں یا اسے اس کے گھر اجر یا غنیمت کے ساتھ لوٹا دوں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے اللہ کے راستے میں کوئی بھی زخم لگتا ہے قیامت کے دن اسی صورت میں آئے گا جیسے وہ زخم لگا تھا اس کا رنگ خون کا رنگ ہی ہو گا لیکن اس کی خوشبو مشک کی طرح ہو گی اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے اگر مجھے مسلمانوں پر مشقت کا خوف نہ ہوتا تو میں اللہ عزوجل کے راستے میں جہاد کرنے والی جماعت کے پیچھے کبھی بھی نہ بیٹھتا لیکن مجھے اتنی وسعت نہیں کہ میں انھیں سوار کر سکوں اور انھیں بھی اتنی وسعت نہیں کہ وہ میرے پیچھے چلیں اور ان پر مجھ سے پیچھے رہنا شاق ہو جائے گا اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے مجھے تو صرف یہ پسند ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کروں اور قتل ہو جاؤں پھر جہاد کروں اور قتل ہو جاؤں۔" ③

ان کلمات نبویہ میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ کتنی قوت ہے زبردست اور انقلاب لانے والی قوت ہے جو انھیں ذہن میں چراغ بنا دیتی ہے جیسا کہ نفوس کو دین اور وطنوں کے دفاع کے لیے آسان اور سہل بنا دیتا ہے یہاں تک کہ ان مرغوبات کو کھاتے ہوئے سنتا ہے تو وہ کھانا ختم ہونے تک بھی صبر نہیں کر سکتا بلکہ اس کے ہاتھ میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اسے پھینک دیتا ہے اور موت کا شوق رکھتے ہوئے جہاد کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اسے یہی تڑپ ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید ہو جائے اسی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت یحییٰ بن سعید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے جہاد کی ترغیب دی اور جنت کا ذکر کیا انصار کا ایک آدمی کھجوریں کھا رہا تھا اس نے کہا کہ میں تو دنیا پر بہت حریص ہوں گا اگر میں ان کے ختم ہونے کا انتظار کروں چنانچہ اس نے اپنے ہاتھ کی کھجوروں کو پھینکا اور تلوار اٹھا کر قتال کرنے لگ گیا حتی کہ قتل ہو گیا۔ ④

---

① بخاری کتاب البیوع باب ۱۳، ترمذی

② ترمذی، ابواب القیامہ ۳۰، مسند احمد ۵/ ۱۸۳

③ بخاری کتاب الذبائح ۳۱، مسلم کتاب الامارۃ ۱۰۳، مسند احمد ۲/ ۲۳۱، نسائی کتاب الجہاد ۱۴

④ موطا امام مالک حدیث ۱۰۰۵

بارہواں عامل

صحابہ ﷺ کا کتاب اللہ اور سنت رسول سے ہدایت حاصل کرنا کہ وہ حضرات کتاب وسنت میں جسے حرام پاتے اسے حرام سمجھتے اور جسے حلال پاتے اسے حلال سمجھتے قرآن وحدیث میں جو نصیحت اور رہنمائی آتی اس کی اتباع کرتے اور ان کے ظاہر و باطن تربیت اور آداب اسلامیہ کے پابند ہوتے ان کا دستور قرآن ہے اور ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علم پر عمل کرنا اسے نفس میں پوری طرح راسخ کر دیتا ہے اور اسے نظر وفکر کے صحیفہ میں اچھی طرح نقش کر دیتا ہے جیسا کہ فن تربیت اور علم نفسیات میں معروف ہے کہ تطبیق معارف کی مؤید ہوتی ہے اور مثالیں قواعد کو مندرج کرتی ہیں اور عمل سے بڑھ کر کوئی بھی تطبیق نہیں اور اتباع سے بڑھ کر کوئی مثال نہیں خصوصاً معارف دینیہ جو کہ اس کے نفاذ سے پھلتی پھولتی ہیں اور اس کی اتباع سے بڑھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾ (الانفال:۲۹)

"اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو گے تو وہ تمہارے لیے فرق کرنے والی چیز بنادے گا۔"

یعنی ہدایت، اور نور جس کے ذریعے تم حق و باطل کے درمیان فرق کرسکو گے نیز ہدایت اور گمراہی کے درمیان فرق کرسکو گے جیسا کہ بعض تفاسیر میں آیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مجاہدہ مشاہدہ کا سبب بنتا ہے نیز دلوں کی طہارت اور نفوس کا تزکیہ بندے کے دل میں حکمت کا چشمہ جاری کرتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "کتب اور تعلیم اسے پورا نہیں کرتے (یعنی حکمت کو جو دل میں جاری ہوتی ہے) بلکہ حکمت جو اعداد و شمار سے باہر ہے وہ صرف مجاہدہ سے اور اعمال ظاہرہ اور اعمال باطنہ کے مراقبہ سے نیز خلوت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیٹھنے سے ہی حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ دل خلوص فکر کے ساتھ حاضر ہوا اور ہر چیز سے منقطع ہو کر اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہو۔ یہی الہام کی چابی اور یہی کشف کا منبع ہے، کتنے متعلم ہیں جو بڑے لمبے عرصہ تک پڑھتے رہے لیکن اپنے مسموع کے ایک کلمہ پر بھی قادر نہ ہو سکے اور کتنے لوگ ہیں جنھوں نے بہت مختصر عرصہ تعلیم حاصل کی لیکن عمل اور مراقبہ قلب میں کمال حاصل کر گئے اللہ تعالیٰ نے انھیں حکمت کے اتنے لطائف عطا کیے کہ جن میں عقلمندوں کی عقلیں حیران ہیں اسی وجہ سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جس شخص نے اپنے علم پر عمل کیا اللہ تعالیٰ اسے وہ علم بھی عطا کر دے گا جو اس کے پاس نہیں تھا۔"

تیرھواں عامل

آپ ﷺ کا ان کے درمیان موجود ہونا آپ ﷺ انھیں کتاب وسنت زبانی یاد کراتے تھے جسے انھوں نے یاد نہیں کیا تھا اور انھیں وہ علم سکھلاتے تھے جس سے وہ لوگ ناواقف تھے اور وہ لوگ جو سوال کرتے آپ ﷺ ان کا جواب دیتے اور جب وہ غلطی کرتے تو آپ ﷺ انھیں درست بات بتلاتے اور جب انھیں کسی بات میں شک ہوتا تو آپ ﷺ انھیں حقیقت امر سے آگاہ کرتے یہ سب کچھ صبر، بردباری، وسعت قلب، کرم نفس اور دل کی خوشی کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک ایسا اہم عامل ہے کہ ان کے لیے حفظ اور زبانی یاد کرنے کو آسان اور سہل بنا دیتا تھا اس لیے کہ یہ بات یقینی ہے کہ آپ ﷺ ایک واضح ماخذ اور چشمہ شیریں تھے۔ جب ہم نے ملاحظہ کرلیا کہ آپ ﷺ ہمیشہ مسکراتے چہرہ والے نرم مزاج اور رحم دل تھے۔ سخت مزاج، بدخو، اونچا بولنے والے، فحش گو اور عیب لگانے والے نہ تھے۔ جو شخص بھی آپ ﷺ

کے پاس بیٹھتا یا کسی ضرورت میں بات چیت کرتا آپ ﷺ رک جاتے جب تک وہ واپس نہ ہو لیتا اگر کوئی شخص کسی ضرورت سے سوال کرتا تو آپ ﷺ اسے رد نہ فرماتے مگر وہ حاجت پوری کر کے یا کوئی اچھی بات کہہ کر۔ آپ ﷺ کی فراخی اور اخلاق اتنا وسیع تھا کہ آپ ﷺ گویا ان کے باپ کی طرح بن چکے تھے اور آپ ﷺ کے سامنے وہ لوگ اپنے حق میں برابر تھے آپ ﷺ کی مجلس علم، حیاء، امانت اور صبر کی مجلس تھی آپ ﷺ اس میں انھیں قرآن پاک سکھلاتے اور اس میں سنت کی نشر و اشاعت ہوتی اور ہدایت کی خوشبوئیں مہکتیں۔

قرآن کریم کے خاص عوامل

گزشتہ بالا عوامل کتاب وسنت کے درمیان مشترک تھے جن کی بدولت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے کتاب وسنت کو حفظ کرنا ان کا احاطہ کرنا اور ان کو خوب سمجھنا آسان ہو گیا تھا۔

اب یہاں ان عوامل کو شروع کیا جاتا ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم میں بخوبی پائے جاتے تھے اور وہ قرآن پاک کے ساتھ خاص ہیں سنت کے ساتھ ان کا تعلق نہیں ہے۔

① اللہ تعالیٰ نے اُمت عرب کو نہیں بلکہ تمام مخلوق کو چیلنج کیا اور فرمایا کہ:

﴿فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ﴾ (الطور: ۳۴)

"اس جیسی کوئی بات تو لائیں۔"

جب وہ اس سے بھی عاجز آ گئے تو اللہ پاک نے فرمایا کہ:

﴿فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ﴾ (ہود: ۱۳)

"اس جیسی دس سورتیں ہی لے آؤ۔"

جب اس سے بھی عاجز ہو گئے تو فرمایا کہ:

﴿فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ﴾ (البقرة: ۲۳)

"اس جیسی کوئی ایک سورت لے آؤ۔"

جب تیسری مرتبہ بھی عاجز آ گئے تو ان کی شکست ان پر چسپاں کر دی اور اعجاز کے اس میدان میں قرآن پاک کی جیت کا اعلان کر دیا اور فرمایا کہ:

﴿قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا﴾ (اسراء: ۸۸)

"کہہ دو کہ اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک

دوسرے کے مددگار ہوں۔"

یہ چیلنج جس کی وجہ سے قرآن پاک کو امتیاز حاصل ہوا ہے اس نے تمام لوگوں کی آنکھوں کو کھول دیا اور وہ لوگ پوری قوت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئے دوست دشمن سب اکٹھے ہو گئے آپ ﷺ کے دوست اور متبعین نے اس حیثیت سے پڑھا کہ وہ اس کے ذریعے آپ ﷺ کے دشمنوں کو خاموش کرائیں اور اس کے اعجاز کے ذریعے اپنے دین اور نبی کی تائید کریں اور دشمن اور مخالفین نے اس کا پیچھا کیا اور چھان بین میں لگ گئے اس امید پر یہ چیلنج بھی ان اسباب میں سے ہے جو قرآن پاک نقل، تواتر اور اس کے ہر زبان پر جاری ہونے کے لیے مہیا ہو گئے۔

② آپ ﷺ کا قرآن پاک کی کتابت کا اہتمام کرنا جیسے بھی کتابت کے ذرائع مہیا ہوئے اس لیے کہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض کو وحی کی کتابت کے لیے مقرر کیا اور جس وقت آپ ﷺ نے سنت کی کتابت سے منع کیا تھا جیسا کہ پیچھے مسلم شریف کی روایت میں گزرا کہ

((لا تكتبوا عني و من كتب عني شيئًا غير القران فليمحه)).

"میری طرف سے نہ لکھو جس نے میری طرف سے قرآن کے علاوہ کچھ بھی لکھا اسے مٹا دینا چاہیے۔"

اس وقت جن حضرات نے اپنے لیے قرآن پاک کو لکھا تھا آپ ﷺ نے اسے برقرار کیا۔

اسے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ کتاب بھی حفظ اور یاد کرنے کو آسان کرنے کے ذرائع میں سے ہے۔

③ نماز میں قرآن پاک کی قرأت کا مشروع ہونا۔ خواہ وہ نماز فرض ہو یا نفل، خواہ سری ہو یا جہری، رات کی ہو یا دن کی حتیٰ کہ نماز جنازہ میں بھی قرآن پاک مشروع ہے اور اس معاملہ میں خطبہ جمعہ بھی نماز کی طرح ہے اور یہ ایک فعلی ذریعہ ہے صحابہ رضی اللہ عنہم اسے پڑھتے اور سنتے تھے، پھر اسی طرح اسے یاد کر لیتے تھے مرد عورت، چھوٹے بڑے، مالدار فقیر سب ہی برابر تھے انھیں جس قدر بھی صلاحیتیں میسر ہوتی گئیں۔

④ قرآن پاک کی تلاوت کی ترغیب خواہ غیر نماز میں ہو اور خواہ بغیر وضو کے اگر آپ چاہیں تو پڑھیں۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ۝ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝﴾ (فاطر: ۲۹، ۳۰)

"جو لوگ خدا کی کتاب پڑھتے اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں وہ اس تجارت (کے فائدے) کے امیدوار ہیں جو کبھی تباہ نہیں ہوگی۔ کیونکہ خدا ان کو پورا پورا بدلہ دے گا اور اپنے فضل سے کچھ زیادہ بھی دے گا وہ تو بخشنے والا (اور) قدردان ہے۔"

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ "جو شخص قرآن پاک پڑھتا ہے اور وہ اس کا ماہر ہے تو وہ اعمال لکھنے والے مکرم نیک کار فرشتوں کے ساتھ ہو گا اور جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور اس میں اٹکتا ہے اور اسے شاق گزرتا ہے اسے دوہرا اجر ہے۔"[①]

---

① بخاری شریف کتاب تفسیر ۸۰۔ صحیح مسلم کتاب المسافرین حدیث ۲۴۴

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ "دو اشخاص کے علاوہ کسی شخص کے بارے میں حسد جائز نہیں ایک وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک عطا کیا ہو اور وہ اسے دن رات پڑھتا ہو اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا ہو اور وہ دن رات اسے خرچ کرتا ہو۔"[1]

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جو شخص کتاب اللہ کی ایک آیت پڑھے اس کے لیے ایک نیکی اور ایک نیکی کا اجر دس گنا ہوتا ہے میں نہیں کہتا ﴿الٓمّٓ ۝﴾ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے۔"[2]

نیز آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ "تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن پاک کو سیکھے اور سکھلائے۔"[3]

کیا کوئی سمجھ سکتا ہے کہ اصحاب ﷺ محمد میں سے جس نے بھی ان احادیث کو یا ان جیسی احادیث کو سنا ہو تو کیا وہ ایک لحظہ بھی قرآن پاک کی تلاوت سے سستی کر سکتا ہے؟ پھر کیا یہ تلاوت اس بات کا وسیلہ نہیں بنے گی کہ وہ قرآن پاک کے ماہر ہو جائیں اور اسے محفوظ کریں؟

⑤ رسول اللہ ﷺ کا قرآن کی تعلیم اور اس کی نشر و اشاعت کا اہتمام کرنا۔ آپ ﷺ لوگوں کے سامنے اسے اس طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے جیسے اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا تھا اور آپ ﷺ انھیں خطبہ اور نماز میں بھی قرآن سناتے نیز دروس و مواعظ میں، دعوت و ارشاد میں اور فتویٰ و قضاء میں بھی انھیں قرآن پاک سناتے تھے۔

آپ ﷺ قراء کی جماعتیں ہر طرف کے شہروں میں بھیجتے جو انھیں کتاب اللہ کی تعلیم دیتے جیسا کہ حضرت معصب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور ابن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ کو ہجرت سے قبل مدینہ والوں کی طرف بھیجا۔ اسی طرح حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو فتح مکہ کے بعد مکہ کی طرف بھیجا تاکہ انھیں قرآن پڑھائیں۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص ہجرت کرتا تو نبی کریم ﷺ اسے ہم میں سے کسی آدمی کی طرف بھیجتے جو اسے قرآن پاک سکھلاتا۔

⑥ وہ برکتیں اور عظمتیں جن کی وجہ سے قرآن پاک دوسری کتابوں سے ممتاز ہے، کیونکہ اس میں بہت سی ایسی ترجیحات ہیں جنھیں ہم نے آپ کے سامنے بیان کر دیا اور بہت سی ایسی بھی ہیں جنھیں ہم نے آپ کے سامنے بیان نہیں کیا جیسے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا یا مثلاً جنبی، حائضہ یا نفاس والی کے لیے اس کی قرأت کا حرام ہونا اسی طرح اس کے مصحف کو ہاتھ لگانا اور اسے ان تمام لوگوں کے لیے اٹھانے کا حرام ہونا اور بے وضو کے لیے بھی اس کا چھونا حرام ہونا وغیرہ وغیرہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ برکتیں اور عظمتیں اس کی طرف نظروں کو متوجہ کرتی ہیں اس پر ایمان لانے والے اس کی طرف یکسوئی کرتے ہیں اور اس کے علم کا احاطہ کرتے ہیں اور عملی طور پر اس کی تعلیم کے لیے سرنگوں ہوتے ہیں یہ وہ اسباب ہیں جنھوں نے ہر زمانے میں اور علاقے میں مسلمانوں کو اس طرف دھکیلا کہ انھوں نے کتاب اللہ کے حفظ کا اہتمام کیا حتیٰ کہ ہمارا زمانہ بھی جس میں ہم رہتے ہیں۔ اب آپ کا کیا خیال ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا زمانہ جو نور و علم، تقویٰ و ہدایت اور نشر و دعوت کا زمانہ تھا اس میں کیا حال ہوگا؟

---

[1] بخاری فضائل قرآن باب ۲۰، مسلم کتاب المسافرین حدیث ۲۶۶

[2] ترمذی ثواب القرآن ۱۶، ابوداؤد فی الوتر ۲۰، مسند احمد ۱۹۲/ ۲

[3] بخاری کتاب فضائل القرآن ۲۱

یہ دس سے کچھ اوپر عوامل ہیں جو رسول کریم ﷺ کے صحابہ میں با کمال طور پر پائے جاتے تھے جن کی بناء پر انھوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول کو حفظ کر لیا تھا اور ہم نے اس طریقے سے جمع کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیے اور ہمارا اعتقاد ہے کہ ان کے علاوہ بھی کچھ عوامل شخصیہ ہیں جو بعض قراء اور بعض محدثین میں پائے جاتے ہیں اگر آپ ان عوامل کو جاننا چاہتے ہیں تو ان قراء کے اور صحابہ میں سے روایت کے لیے سرفہرست ہونے والے حضرات کی سوانح عمری پڑھیے اگر آپ چاہیں تو ان میں رجوع بھی کریں اور ہم نے جو آپ کے سامنے ذکر کیا اس میں حرص بھی کریں اور اس میں اپنے تیز دھار علمی آلات کو بھی ڈھال لیجئے جو انھیں ان بد دیانتوں کے سامنے بھی مشہور کر دیں جو بغیر کسی علم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں طعن کا راستہ اپناتے ہوئے کتاب وسنت میں طعن کرتے ہیں کہ ان میں حفظ وضبط نہیں تھا۔

ہم امم عالم کو ان اسباب کا چیلنج کرتے ہیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم میں پائے جاتے تھے حتیٰ کہ انھوں نے کتاب وسنت کو نقل کیا۔۔ یہ ان سے ہم تک تواتر کے ساتھ پہنچا خصوصاً قرآن کریم۔

اولئك آبائي فجئني بمثلهم إذا جمعتنا يا جرير المجامع

یہ میرے آباء ہیں ان کی مثل میرے پاس لے آ جب اے جریر مجالس ہمیں جمع کریں گی۔

اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمت اور رضا سے ڈھانپے اور ان پر اپنے جود واحسان کی بارش برسائے۔ آمین

دوسرا سبب ❀ وہ عوامل جن کی بدولت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کتاب وسنت میں تحقیق وجستجو کی۔

اب ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کتاب وسنت کے حفظ کے عوامل سے فارغ ہو چکے اب ترقی کرتے ہوئے ان عوامل کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں جن کی بدولت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تحقیق وجستجو کی چنانچہ ہم ذکر کرتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تاریخ میں غور کرنے والا جب ان کی تحقیق وجستجو کو جانتا ہے تو وہ ان کے حفظ سے بھی زیادہ حیران ہوتا ہے اس لیے کہ تحقیق وجستجو ہی ایسی فضیلت ہے جو ایک پہلو سے امانت کاملہ اور پختہ عقل کی طرف لوٹتی ہے، پھر دوسرے پہلو سے دیکھیں تو وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کمال کے درجہ کو پہنچی ہوئی تھی اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور سنت رسول ﷺ کے لیے کامل درجہ کی تحقیق وجستجو، باریک بینی کے ساتھ پرہیز، منفرد احتیاط اور گہری تحقیق کرتے تھے اور یہ صفات ان تمام چیزوں میں تھیں جو کتاب اللہ اور سنت کے ساتھ اتصال رکھتی تھیں خواہ ان کا تعلق قریب سے تھا یا بعید سے، یہ تحقیق وجستجو جو اپنی دقت اور تحقیق میں منفرد ہے اس کے بہت سے اسباب اور ذرائع ہیں جو ہمیں ابھارتے ہیں کہ ہم انھیں آپ کے سامنے پیش کریں۔ یہ کتاب وسنت کے دفاع کے لیے تیز دھار اسلحہ کی مانند ہیں نیز صحابہ رضی اللہ عنہم کے کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کی ادائیگی کے دفاع کا بھی ذریعہ ہیں۔

پہلا عامل اللہ تعالیٰ نے اپنی محکم کتاب میں تحقیق وجستجو کا حکم دیا اور قرآن کریم اور احادیث نبویہ ﷺ سے نابلد ہو کر کوئی بات بتلانے یا خبر دینے میں بے عقلی اور جلد بازی سے منع کیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِن جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓاْ أَن تُصِيبُواْ قَوْمًۢا بِجَهَٰلَةٍ فَتُصْبِحُواْ عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَٰدِمِينَ ۝﴾ (الحجرات: ٦)

"مومنو! اگر کوئی بدکردار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو (مبادا) کہ کسی قوم کو نادانی سے نقصان

پہنچا دو پھر تم کو اپنے کیے پر نادم ہونا پڑے۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بغیر دلیل کے بات کے پیچھے پڑنے سے منع فرمایا سوائے ان باتوں کے جنھیں کانوں نے سنا ہو یا آنکھوں نے دیکھا ہو یا کسی دلیل کی بنا پر دل اس کا اعتقاد رکھتا ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے عزاسمہ نے فرمایا کہ:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴾ (بنی اسرائیل:۳۶)

"اور (اے بندے) جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ۔ کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب (جوارح) سے ضرور باز پرس ہوگی۔"

قرآن پاک نے ان لوگوں کو بے نقاب کیا جو ظن کے پیچھے چلتے ہیں ایسی چیزوں میں حق میں ظن کافی نہیں ہوتا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴾ (النجم:۲۸)

"وہ صرف ظن پر چلتے ہیں اور ظن یقین کے مقابلہ میں کچھ کام نہیں آتا۔"

اس کے علاوہ کتاب وسنت میں بہت سے دلائل ہیں جو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی ان تعلیمات کے مخاطب اور ان کے سامنے بیٹھنے والے تھے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آداب اسلامیہ ان کے رسوخ اور پرہیز گاری کے اہم ترین عوامل میں سے ہیں خصوصاً ان چیزوں میں جن کا تعلق کتاب وسنت کے ساتھ ہے اور یہ بات بہت ہی بعید بلکہ پوری طرح محال ہے کہ انھوں نے ان اعلیٰ نصیحتوں کو نظر انداز کر دیا ہو حالانکہ وہ لوگ سب سے بہتر طبقہ تھے جنھیں لوگوں کے لیے مبعوث کیا گیا۔

دوسرا عامل

انھوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے کی جو شدید ترہیب، دھمکی اور وعید سن رکھی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ﴾ (الانعام:۹۳)

"اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے جھوٹ باندھے یا کہے کہ مجھ پر وحی نازل ہوگی حالانکہ اس پر کوئی وحی نازل نہیں ہوئی۔ اس نے کہا کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اسی طرح کا میں بھی نازل کروں گا۔"

آپ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر جھوٹ باندھنے والے کو کیسے اس کی لڑی میں پرویا جس نے کہا کہ مجھ پر وحی نازل ہوئی حالانکہ اس پر کوئی وحی نازل نہیں ہوئی اور اس شخص کی لڑی میں پرویا جس نے کہا کہ عنقریب میں بھی ایسے ہی نازل کروں گا جیسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا؟ پھر آپ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے اسے ان دونوں پر مقدم کیا اور وعید میں اسے پہلے لایا اور اس کی صفت کو ظلم میں حد سے تجاوز کرنے والوں میں سب سے پہلے بیان کیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ؕ﴾ (الصف:۷)

"اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا الزام لگائے حالانکہ اسے اسلام کی دعوت کی جارہی ہو۔"

﴿ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ ﴾ (الزمر:۶۰)

"اور جن لوگوں نے خدا پر جھوٹ بولا تم قیامت کے دن دیکھو گے کہ ان کے منہ کالے ہو رہے ہوں گے کیا غرور کرنے والوں کا ٹھکانہ دوزخ نہیں ہے؟"

اور سنت نبویہ ﷺ میں ہم پڑھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔"①

یہ ایک مشہور حدیث ہے بلکہ متواتر ہے۔ وارد ہے کہ اسے باسٹھ، صحابہ رضی اللہ عنہم نے نقل کیا جن میں سے عشرہ مبشرہ بھی ہیں اور کوئی حدیث ایسی مشہور و معروف نہیں ہے کہ جس پر عشرہ مبشرہ حضرات جمع ہوئے ہوں سوائے اس حدیث کے۔ اور کوئی حدیث بھی ایسی نہیں ہے جو ساٹھ سے زائد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہو سوائے اس حدیث کے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ ترہیبات بھی سنیں اور ان جیسی ترہیبات بھی سنیں اور اس جیسی ترہیبات قرآن و سنت میں کم نہیں ہیں بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے ان احادیث کی ممانعت بھی سن رکھی تھی جو جھوٹ سے کم درجہ ہو لیکن حدیث میں کمی بیشی سے متعلق ہو۔ اس لیے کہ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ضعفاء اور کم عقل راویوں کی روایت سے بھی ڈرایا اور فرمایا کہ:

"میری امت میں آخر میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو تمہیں ایسی ایسی احادیث سنائیں گے جو نہ تم نے سنی ہوں گی اور نہ ہی تمہارے آباؤ اجداد نے سنی ہوں گی تم ان سے بچ کر رہنا۔"②

بلکہ انھیں کم عقل راویوں کی روایت سے بھی ڈرایا اور فرمایا کہ "بے شک شیطان ایک آدمی کی صورت میں ایک قوم کے پاس آتا ہے اور انھیں جھوٹی حدیث سناتا ہے پھر وہ لوگ تتر بتر ہو جاتے ہیں اور ان میں سے ایک آدمی کہتا ہے کہ میں نے ایک آدمی سے سنا اس کی شکل میں پہچانتا ہوں اور نام کا پتا نہیں وہ یوں یوں حدیث بیان کر رہا تھا۔"③

تیسرا عامل

اسلام نے سچ بولنے کا حکم دیا اور جھوٹ بولنے سے مطلق منع کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ (التوبہ:۱۱۹)

"اے اہل ایمان! خدا سے ڈرتے رہو اور راستبازوں کے ساتھ رہو۔"

اور آپ بخوبی جانتے ہیں کہ اس مقام میں اس صیغہ کے ساتھ خطاب اور پھر اس سے پہلے تقویٰ کا حکم، اس میں اشارہ ہے کہ جس نے جھوٹ بولا اور بہتان لگایا اس کا راستہ کفر اور گمراہی والا راستہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے صراحتاً فرمایا کہ:

﴿ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝ ﴾ (النحل:۱۰۵)

---

① بخاری کتاب العلم باب ۳۸ کتاب الایمان ۱۱۲، ابوداود کتاب الایمان ۱، ترمذی کتاب الفتن ۷۰، ابن ماجہ ۲۳۴، دارمی مقدمہ ۲۵، ۴۶، ۵۰ مسند احمد ۱/ ۶۵

② مسلم شریف۔ ③ صحیح مسلم المقدمہ حدیث ۶

" جھوٹ افتراء تو وہی لوگ کیا کرتے ہیں جو خدا کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے۔ اور وہی جھوٹے ہیں۔"

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "سچ کو لازم پکڑو! کیونکہ وہ نیکی کے ساتھ ہے اور یہ دونوں جنت میں ہوں گے اور جھوٹ سے بچ کر رہو کیونکہ یہ گناہ کے ساتھ ہے اور یہ دونوں دوزخ میں ہوں گے۔"①

حضرت صفوان بن سلیم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! کیا مؤمن بزدل ہوسکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ہاں" ہم نے عرض کیا کہ کیا وہ بخیل ہوسکتا ہے؟ فرمایا کہ "ہاں" ہم نے عرض کیا کہ کیا مؤمن جھوٹا ہوسکتا ہے؟ فرمایا کہ "نہیں۔"②

اب آپ پہلی حدیث میں غور فرمائیں کہ کیسے سچ کو نیکی اور جنت کی طرف رہنمائی کرنے والا بتایا اور جھوٹ کو گناہ اور دوزخ کی طرف رہنمائی کرنے والا بتایا۔ اس کے بعد دوسری حدیث میں غور فرمائیں کہ کیسے جھوٹ کو بزدلی اور بخل سے بھی برا شمار کیا گیا اور اسے ایسی بھیانک صورت میں بیان کیا کہ وہ اور ایمان کبھی بھی ایک آدمی میں جمع نہیں ہوسکتے۔

اور آپ کو بڑا ہی تعجب ہوگا جب آپ کو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے جھوٹ کی مذمت میں مبالغہ کیا حتیٰ کہ بالکل معمولی اور چھوٹی چھوٹی اشیاء اور چھوٹے چھوٹے امور میں بھی۔ آپ نبی کریم ﷺ کی طرف توجہ سے کان لگائیں کہ آپ ﷺ کیسے دھمکی آمیز طریقے سے مزاح میں بھی جھوٹ بولنے سے منع فرماتے ہیں چنانچہ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ "بربادی ہو اس شخص کے لیے جو قوم کو ہنسانے کے لیے بات کرے اور جھوٹ بولے بربادی ہو اس کے لیے، بربادی ہو اس کے لیے۔"③

پھر آپ توجہ فرمائیں کہ آپ ﷺ اس شخص کے بارے میں وعید بیان کرتے ہیں جو اپنے خواب کے بارے میں جھوٹ بولتا ہے، چنانچہ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ "جو شخص خواب کے بارے میں جھوٹ بولتا ہے قیامت کے روز اسے مکلف بنایا جائے گا کہ وہ جو کے دودانوں میں گرہ لگائے اور وہ کبھی بھی ان کے درمیان گرہ نہیں لگا سکے گا۔"④

اب آپ کو رب کی قسم مجھے بتلائیے کہ کیا یہ اعلیٰ اور ممتاز طبقہ جس نے یہ احادیث سنیں اور اس سے کئی گنا احادیث رسول اللہ ﷺ دہن مبارک سے سنیں یہ وہ طبقہ ہے جس نے بڑی تحقیق اور غور وفکر کر کے ایمان قبول کیا اور اسے اپنی سعادت اور عزت کا راستہ سمجھ کر پختہ کیا، یہ وہ طبقہ ہے جس نے اپنی جانوں اور مالوں کو اللہ کے لیے جنت کے بدلے میں اس کی نعمتوں اور دوام سمیت فروخت کردیا۔ ہم کہتے ہیں کہ کیا یہ طبقہ اس کے بعد بھی پسند کرے گا کہ وہ بے سوچے سمجھے کچھ کہے یا ایڑھیوں کے بل پھر جائے؟ اور پھر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر جھوٹ بولے یا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں تحقیق وجستجو نہ کرے؟ یہ بہت ہی بعید ہے یہ صرف غافل عقلوں سے ہی ممکن ہے۔

---

① ابن ماجہ کتاب الدعاء باب ۵، مسند احمد ۱، ۵،۳

② موطا باب ماجاء فی الصدق والکذب حدیث ۱۸۱۶

③ ابوداؤد کتاب الادب ۸۰، ترمذی کتاب الزہد باب ۱۱

④ بخاری کتاب التعبیر ۲۴۵، ترمذی کتاب الرؤیا ۸، داری کتاب الرؤیا ۸

چوتھا عامل

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تفقہ اور تعلم کے دلدادہ اور بحث اور جستجو کے دیوانے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے فریفتہ تھے۔ وہ اپنی مجلس قرآن پاک کے پڑھنے پڑھانے اور اس کے فہم کے لیے منعقد کرتے اور طلب علم اور حصول علم کے لیے سفر کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں قرآن پاک سکھلانے کا خوب بڑھ چڑھ کر اہتمام کرتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سامنے قرآن پڑھتے اور ان کو خطبہ بھی قرآن کے ساتھ دیتے تھے اور اپنی نماز میں ان کی امامت کو بھی قرآن پاک کی قرأت کے ذریعے مزین کرتے۔ نیز اپنے دروس و مواعظ کو بھی قرآن پاک سے مزین کرتے اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ان کے سامنے قرآن پاک پڑھنا پسند کرتے اسی طرح ان سے سننا بھی پسند کرتے تھے۔ بخاری و مسلم نے روایت کیا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ کسی اور سے سنوں میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی حتی کہ جب میں اس آیت پر پہنچا:

﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا﴾ (النساء: ۴۱)

"بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب بس کرو! میں نے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں بہہ رہی تھیں۔ ①

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حال بھی اسی طرح تھا انھیں یہی فکر ہوتی تھی کہ وہ قرآن پاک کو پڑھیں اور سنیں بخاری و مسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اشعری لوگ جب رات کو داخل ہوتے ہیں تو میں ان کی آوازوں کو پہچان لیتا ہوں اور رات کو قرآن پاک کی تلاوت کی وجہ سے ان کے گھروں کو پہچان لیتا ہوں اگرچہ جب وہ دن کو اترتے ہیں تو میں نے ان کے گھروں کو نہ دیکھا ہو۔" ②

اور دارمی وغیرہ نے اپنی مختلف سندوں کے ساتھ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ وہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے فرمایا کرتے تھے کہ "آپ ہمیں ہمارے رب کی یاد دلایئے وہ ان رضی اللہ عنہ کے پاس قرآن پڑھا کرتے تھے۔" ③

پیچھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سنت نبوی کی حفاظت کا بھرپور اہتمام کرنا گزر چکا کہ انھوں نے کس طرح اپنی توجہ اس کی طرف کی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھنے اور علم حاصل کرنے کے لیے ملاقات کا کس قدر اہتمام کیا۔ مکحول رحمہ اللہ عبدالرحمٰن بن غنم رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دس صحابہ رضی اللہ عنہم نے بتلایا کہ ہم مسجد قباء میں علم پڑھ رہے تھے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ "جو سیکھنا چاہو سیکھ لو کیونکہ سیکھے بغیر اللہ تعالیٰ تمہیں کبھی بھی اجر نہیں دے گا۔" ④ دارمی نے اسے صحیح سند کے ساتھ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ پر موقوف نقل کیا۔ اور اس حدیث میں علم کا لفظ کتاب کے علم کو بھی شامل ہے اور حدیث کے علم کو بھی۔

---

① صحیح بخاری کتاب المغازی باب ۳۸، مسلم کتاب صلاۃ المسافرین حدیث ۲۴۸

② بخاری کتاب المغازی باب ۳۸، صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابہ حدیث ۱۶۶

③ دارمی، فضائل قرآن ۳۴

④ دارمی مقدمہ باب العمل بالعلم وحسن النیۃ ۸

کیا یہ شوق ان کے قرآن وسنت میں تحقیق وجستجو کے اسباب میں سے نہیں ہے جیسا کہ ان کے قرآن وسنت کو حفظ کرنے کے دواعی میں سے تھا اس لیے کہ کسی چیز کا مشہور اور شائع ہونا اور اس کے ساتھ زبانوں کا نرم ہونا اسے خوب ظاہر اور واضح کر دیتا ہے کہ اس میں نہ کوئی التباس رہتا ہے نہ کوئی کھوٹ رہتا ہے اور نہ اس میں کوئی دخیل دخل اندازی کرتا ہے۔

پانچواں عامل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تحقیق وجستجو کے وسائل میسر تھے اور قرآن وسنت کی معرفت میں جو چیزیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں ان کی حقیقت کو جاننے تک رسائی بھی انھیں آسان تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم عصریت حاصل تھی وہ اپنی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق وابستہ رکھتے تھے جس کی وجہ سے ان کے دل شک شبہ سے پاک رہتے تھے اور ان کے دل راحت پاتے تھے علم کے انوارات اور یقین کے حقائق ان پر منکشف ہوتے تھے۔

جب نبوت کا آفتاب غروب ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے جوار میں منتقل ہو گئے تو بھی انھیں یہ کام آسان تھا کہ جن حضرات نے اپنے کانوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو سنا وہ ان کے ساتھ وابستہ رہیں اور اس دن ایک بہت بڑی جماعت اور بہت بڑی تعداد تھی جنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو سن رکھا تھا یہ حضرات ان کے شہروں میں قیام کرتے اور ان کی مجالس میں بیٹھتے اگر ان میں سے کوئی بھی شخص کتاب اللہ کی کسی آیت میں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث میں شک کرتا تو اسے اپنے علاوہ بیسیوں لوگوں سے تحقیق وجستجو کرنا بغیر کسی کلفت اور مشقت کے آسان تھا۔

چھٹا عامل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں شجاعت جو کہ فطری شجاعت تھی نیز ان کے اندر صاف گوئی تھی اور وہ بھی ان کے اندر فطری تھی۔ یہ لوگ انھی خوبیوں میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے۔ وہ اپنی فطرت اور ماحول کے اعتبار سے انھی صفات میں ڈھلے۔ جیسا کہ جنگل میں رہنے والی قوم ہوتی ہے جو شہر کے آلودہ چکر فریب کو نہیں جانتی اور نہ ہی وہاں کے مذبذب نفاق سے مانوس ہوئی ہوتی ہے۔ پھر جب اسلام آیا تو اس نے اس مہذب قوم کو عزت دی اور انھیں مزید ترقی دی اور اس پر صحیح شہریت اور پاکیزہ رہن سہن کی بنیاد رکھی، جیسا کہ آپ نے اصداق الحدیث اور خیر الہدیٰ میں سنا، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی شخص بھرے مجمع میں کھڑا ہوتا اور امیر المؤمنین اپنی سلطنت کا خطاب کر رہا ہوتو اسے بھی پوری قوت، صراحت اور سختی کے ساتھ ٹوک دیتا تھا بلکہ اگر کوئی عورت جامع مسجد کے درمیان میں کھڑی ہوتی اور مسلمانوں کا خلیفہ خطبہ دے رہا ہوتا تو وہ خلیفہ کی بات کو کاٹ دیتی اور اس خلیفہ کی رائے اس عورت کی رائے کے معارض ہوتی اور اس کی دلیل اس عورت کی دلیل سے ٹکراتی ہوتی اور اس عورت کا اعتقاد یہ ہوتا کہ اس معاملہ میں امیر المؤمنین درستگی سے ہٹ کر غلطی کھا رہے ہیں تو بھی امیر المؤمنین ان دونوں حالتوں میں ان دونوں کی تصریح سے خوش ہوتے اور اس جرأت سے خوش ہوتے اور اس سخت مزاج عربی کے اپنی جگہ کھڑے ہوتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کرتے اور اسی طرح اپنے رائے سے اس محترم عورت کی رائے کی طرف رجوع کا اظہار کرتے جس نے آپ کے سامنے حجت قائم کی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ معاملہ آپ سے بعید نہیں اور نہ ہی آپ سے ڈھکا چھپا ہے نہ تو اس وقت کا واقعہ جب وہ اپنے خلافت کے ہوتے ہوئے کھڑے خطبہ دے رہے تھے اور نہ ہی اس وقت کا واقعہ جب وہ اپنے ممبر پر کھڑے عورتوں کے مہروں میں اضافہ کرنے سے منع کر رہے تھے۔

اب آپ دیکھیں کہ کیا عقل اور منطق پسند کرتی ہے کہ اس صاف گو اور قوی امت کو کوئی عیب لگایا جائے اور ان پر جھوٹ کی

تہمت لگائی جائے یا اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے رسول ﷺ کی سنت میں جھوٹ پر خاموش رہنے کی تہمت لگائی جائے؟

پھر آپ بتلائیں کہ کیا یہ مخلوق جن میں وہ حضرات رونما ہوئے انھیں کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ میں کامل تحقیق و جستجو، بھرپور چھان بین پر برانگیختہ نہیں کرے گی۔ (تحقیق آنکھوں والوں کے لیے صبح روشن ہو چکی)

ساتواں عامل

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اسلام نے جو ذمہ داری ڈالی ان کا اس ذمہ داری پر اجتماعی طور پر کفیل اور ذمہ دار بننا۔ اس نے ان کی آنکھوں کو ہر اس شخص پر کھول کر رکھ دیا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ باندھے یا بہتان تراشی کرے یا بغیر علم کے شریعت میں ٹانگ اڑائے یا بغیر دلیل کے دین میں فتویٰ دے۔

ہاں: تحقیق ان میں کا ہر ایک اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ امت کے جسم میں ایک عضو ہے اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اور تمام لوگ مل کر ملت کی حفاظت کریں اور اس کا اعتقاد ہے کہ وہ جماعت کی عمارت کی ایک اینٹ ہے اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ دھوکہ، فریب، افتراء پردازی اور جھوٹ سے اس کی حفاظت کرے خصوصاً شریعت کی بنیادوں یعنی قرآن اور اس کی دوسری بنیاد یعنی سنت رسول اللہ ﷺ کی سلامتی میں کوشش کرے۔

آپ کے سامنے کتاب وسنت ہے اگر آپ چاہیں تو ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دلائل پڑھیں وہ بہت کثیر اور مشہور معروف ہیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی اس اجتماعی اسلامی کفالت کو امت کے افراد کے مابین اس طرح مضبوط کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنے والوں میں سے کسی کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں اِدھر اُدھر کی مارنے والوں کے لیے کوئی حیلہ چھوڑتے ہیں۔

آپ حق تعالیٰ کے کلام کی طرف کان لگائیں کہ وہ کس طرح بھلائی کی دعوت اور نصیحت کی فضیلت پر ابھارتے ہوئے سورۃ آل عمران میں فرماتا ہے کہ:

﴿وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٤﴾ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠٥﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۟ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿١٠٦﴾ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٧﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٨﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿١٠٩﴾ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿١١٠﴾ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿١١٠﴾﴾ (آل عمران: ۱۰۴-۱۱۰)

"اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو متفرق ہو گئے اور احکام بین کے

آنے کے بعد ایک دوسرے سے (خلاف۔و) اختلاف کرنے لگے یہ وہ لوگ ہیں جن کو (قیامت کے دن) بڑا عذاب ہوگا۔ جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے اور بہت سے سیاہ تو جن لوگوں کے منہ سیاہ ہوں گے (ان سے خدا فرمائے گا) کیا تم ایمان لاکر کافر ہوگئے تھے؟ سو (اب) اس کفر کے بدلے عذاب (کے مزے) چکھو۔ اور جن لوگوں کے منہ سفید ہونگے وہ خدا کی رحمت (کے باغوں) میں ہوں گے اور ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جن لوگوں کے منہ سفید ہونگے وہ خدا کی رحمت (کے باغوں) میں ہوں گے اور ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے اور سب کاموں کا رجوع (اور انجام) خدا ہی کی طرف ہے۔ (مومنو!) جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہت اچھا ہوتا ان میں ایمان لانے والے بھی ہیں (لیکن تھوڑے) اور اکثر نافرمان ہیں۔"

آپ اللہ کے اشارہ میں غور کریں جسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ میں ارشاد فرمایا کہ:

﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝﴾ (المائدہ: ۷۸، ۷۹)

"جو لوگ بنی اسرائیل میں کافر ہوئے ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس لئے کہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ (اور) برے کاموں سے جو وہ کرتے تھے ایک دوسرے کو روکتے نہیں تھے۔ بلاشبہ وہ برا کرتے تھے۔"

پھر آپ غور فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان پر حکم قائم کیا کہ وہ خسارے میں غرق ہیں سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے چار سعادتوں کے عناصر کو جمع کیا اور وہ چار سعادتیں یہ ہیں:

① ایمان ② اچھے اعمال ③ حق کی وصیت ④ صبر کی وصیت

اور یہ اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل قول ہے

﴿وَ الْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾ (العصر: ۱۔۳)

"عصر کی قسم۔ کہ انسان نقصان میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔"

رسول اللہ ﷺ کے اصحاب نے یہ سنا اور اللہ تعالیٰ کی بات کو جو حضرت جبریل علیہ السلام کے واسطے رسول اللہ ﷺ تک پہنچی اسے خود رسول اللہ ﷺ کے دہن مبارک سے سنا پھر اس کے بعد یہی باتیں رسول اللہ ﷺ کے کلام سے بھی سنیں جیسے مندرجہ ذیل احادیث ہیں۔

① آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم ضرور بالضرور بھلائیوں کا حکم دو اور برائیوں سے منع کرو! ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب بھیج دے پھر تم دعا مانگو اور وہ قبول نہ ہو۔[1]

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ ہم ہر تنگی اور وسعت خوشی اور ناگواری کے حال میں خوب اطاعت کریں گے نیز اس بات پر بیعت کی کہ ہم پر کسی کو ترجیح دی جائے اور اس بات پر کہ ہم امیر سے جھگڑا نہیں کریں گے سوائے اس کے کہ کوئی واضح کفر سامنے آ جائے اور اس بارے میں اللہ کی طرف سے کوئی واضح دلیل ہو اور اس بات پر بیعت کی کہ ہم جہاں کہیں بھی رہیں اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے۔"[2]

آٹھواں عامل

ان کے ساتھ سچے وعدے کرنا اور انھیں عمل کرنے کے لیے تیار کرنا جیسا کہ ان کی اس طرف رہنمائی کی اور اس کے ساتھ انھیں ادب سکھلایا جیسا کہ آپ نے سن کر جان لیا اور آپ جانتے ہیں کہ تربیت تعلیم کا غیر ہے اور علم عمل کا غیر ہے اور کسی بھی فرد یا امت کی کامیابی اس کے تربیت کے پھولوں کو چوسنے اور نفسیات کے باغوں اور خلقی قوانین کے پھلوں کو توڑنے کی مقدار کے بقدر ہی مضمر ہے۔

اور اکیلا علم کبھی تو شفا کا ہتھیار ہوتا ہے اور کبھی فنا سے ڈرانے والا ہوتا ہے جیسا کہ ہم دیکھتے اور سنتے ہیں ہائے کتنا خطرہ ہے ان چیزوں میں جنھیں ہم دیکھتے اور سنتے ہیں۔

اسلام نے یہ اعلیٰ پہلو امت کی بنیاد میں پالیا اور اسے بھرپور توجہ دی اور اسے نافذ کرنے اور اس پر عمل کرنے کا اس کے علم اور کلام سے بھی بڑھ کر اہتمام کیا اور شاید آپ کو یاد ہوگا کہ آپ میں مسجد قبا میں علم پڑھنے والوں سے یہ حکمت سے بھرپور اور سونے جیسی قیمتی نصیحت کی کہ "جتنا چاہو علم حاصل کر لو عمل کیے بغیر اللہ تعالیٰ تمھیں کوئی اجر نہیں دے گا۔"

اور شاید آپ کو یاد ہو کہ اسلام جھوٹ کی کسی بھی قسم کے مرتکب کو سخت ترین سزا دینے کا حکم دیتا ہے اور جھوٹ بھی کسی کی عزت میں پڑنے کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، اور وہ سزا حد قذف ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورت نور میں فرمایا کہ:

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ﴾ (النور: ۴)

"اور جو لوگ پرہیزگار عورتوں کو بدکاری کا الزام لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسی درے مارو اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو اور یہی بدکردار ہیں۔"

آپ غور فرمائیں کہ اس جھوٹی تہمت لگانے والے کی کس طرح پکڑ کی اسی کوڑے لگانے کو مقرر کیا اور اس کی گواہی کو بھی رد کر دیا اور اس پر فاسق ہونے کا حکم لگایا بلکہ فرمایا کہ: ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ﴾ "یہی فاسق لوگ ہیں۔" یعنی ان کے علاوہ کوئی بھی فاسق نہیں ہے۔ اور ان کے علاوہ کوئی نہیں ہے جو دین اور ادب کی حدوں سے خارج ہے۔

---

① ترمذی عن حذیفہ بسند حسن، کتاب الفتن ۹ مسند احمد ۶، ۱۵۰

② بخاری، کتاب الاحکام باب ۴۳، صحیح مسلم کتاب الامارت حدیث ۴۱، ۴۲

پھر آپ اپنے سننے والے کو یہ روایت سنا کر محظوظ کریں جسے ابوداؤد نے اپنی سنن میں روایت کیا کہ حضرت عبداللہ بن عامر سے روایت ہے کہ "ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے اس وقت میں ایک چھوٹا بچہ تھا میں کھیلنے چلا گیا میری امی جان نے کہا کہ آؤ میں تمہیں کچھ دوں آپ ﷺ نے فرمایا کہ آپ اسے کیا دینا چاہتی ہیں؟ انھوں نے عرض کیا کہ کھجور آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر آپ اسے کچھ بھی نہ دیتیں تو تمہارے لیے ایک جھوٹ لکھ دیا جاتا۔"①

آپ اس اعلیٰ قسم کی تربیت کے بارے میں تصور فرمائیں کہ نبی کریم ﷺ نے ماں کے لیے اتنا بھی جائز نہیں رکھا کہ وہ اپنے چھوٹے بچے سے کوئی ایسا وعدہ کرے جو سچا نہ ہو بلکہ اسے سوال کر رہے ہیں کیا اگر بچہ آجائے تو کون سی چیز ہے جو آپ اسے دینا چاہ رہی ہیں؟ اس کے بعد مزید پختگی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر اس نے اس وعدہ کی خلاف ورزی کی تو اللہ اس کے بارے میں ایک جھوٹ لکھ دے گا۔ اسی طرح اس مقام پر "کذبہ" (جھوٹ) کا لفظ ہی اس کی ڈانٹ ڈپٹ کے لیے کافی تھا اور اسی سے وہ جان لیتی کہ جھوٹ کا لفظ ہی عذاب کا ایک کوڑا ہے، جو صحابہ رضی اللہ عنہم اور صحابیات رضی اللہ عنہن کو ڈرا کر رکھ دیتا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس کی شناعت سن رکھی تھی اور اس کی خرابی تو وہ لوگ جانتے تھے اور ان کے نفوس میں سچ کی فضیلت اور حق کا شرف جڑ پکڑے ہوئے تھا۔ کیا اس اعلیٰ تربیت کے بعد بھی یہ کہنا صحیح ہوگا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر جھوٹ بولا کرتے تھے اور تحقیق نہیں کیا کرتے تھے۔ خبردار! یہ لوگ (جو صحابہ کے بارے میں ایسا کہتے ہیں) بہتان تراشی کرتے ہوئے ایسی بات چھوڑ دیتے ہیں جسے یہ لوگ جانتے بھی نہیں اور ان اعلیٰ کردار شخصیات کو مجروح کرتے ہوئے اور ان بے قصور حضرات پر تہمت زنی کرتے ہوئے حد سے تجاوز کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ حضرات تہمت کے مستحق نہیں ہیں۔ بربادی ہو ان کے لیے اس دن جس دن کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔

نواں عامل

وہ نیک نمونہ اور عمدہ اسوہ جو وہ رسول اللہ ﷺ میں عمدہ، کامل جاذب اور پسندیدہ پاتے تھے۔ آپ سے مخفی نہ رہے کہ نیک نمونہ اور اچھی پیشوائی تعلیم وتربیت، تادیب وتہذیب کے عوامل میں سے سب سے اچھا عامل ہے، خصوصاً نبی ﷺ اور اس کے متبعین کے درمیان اور استاذ اور شاگرد کے درمیان اور امیر و مامور کے درمیان اور حاکم اور اس کی رعیت کے درمیان۔

ہم دیکھتے ہیں کہ علماء نفسیات، علماء معاشرت، تربیت وتعلیم کے سربراہ اور اخلاق وامم کے بانیین ہمیشہ اچھی پیشوائی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور اچھی پیشوائی کے بارے میں ہی وصیت بھی کرتے ہیں اور جب بحث کرتے ہیں تو بھی اسی کے بارے میں ہی بحث کرتے ہیں۔ اس لیے کہ تاثیر واصلاح، تربیت وفلاح میں اس کا اہم مقام ہے اور افراد وامم میں اس کا کردار برابر ہے۔

اور تاریخ نے محمد ﷺ سے بڑھ نہ کوئی اعلیٰ پیشوا جانا نہ اعلیٰ نمونہ اور نہ ہی ان سے بلند امامت جانی، کمال بشری کے تمام گوشوں میں نظر دوڑائیں تاریخ کبھی بھی ایسا بلند کردار نہیں جانے گی خصوصاً آپ ﷺ کا پسندیدہ اخلاق اور اعلیٰ ادب اور اس سے بھی بڑھ کر آپ ﷺ کا صدق اور امانت اور آپ ﷺ کی تحقیق اور باریک بینی۔

کیوں کہ آپ ﷺ صدق وامانت کے ساتھ مشہور ومعروف تھے حتیٰ کہ آپ ﷺ اپنی بعثت اور رسالت سے پہلے ہی

---

① سنن ابوداؤد کتاب الادب ۸۰

مشہور تھے، جب آپ ﷺ چلتے تو لوگ اپنی انگلیوں سے اشارہ کر کے کہتے کہ یہ وہ شخص ہے جو صادق ہے اور جب آپ ﷺ کوئی فیصلہ فرماتے تو وہ لوگ آپ ﷺ کے فیصلے کو پسند کرتے اور کہتے کہ یہ شخص امین ہے۔

یہ فضائل آپ ﷺ میں روزِ روشن کی طرح واضح تھے جو اہل جاہلیت میں سے منصفین کے ایمان کا باعث بنے اور آپ ﷺ کے سخت دشمن بھی ان کا اعتراف کرنے پر مجبور تھے جیسا کہ آپ ﷺ کے وفادار متبعین بھی اس پر ایمان لائے ہوئے تھے۔

دیکھیں یہ ابوسفیان بن حرب ہے جو آپ ﷺ کے معارض لشکر کا سردار ہے قیصر روم کے سامنے محمد ﷺ کے صدق کا اقرار کر رہا ہے اور اس بات کا اقرار کر رہا ہے کہ انھیں آپ ﷺ کی رسالت سے پہلے بھی آپ ﷺ کا کوئی ایک جھوٹ بھی یاد نہیں ہے اس تمام قصے کے پیش نظر قیصر قریب تھا کہ متاثر ہو کر ایمان قبول کر لیتا بوجہ اس شہادت کے جسے محمد ﷺ کے اس دن کے بدترین دشمن نے اپنی زبان سے اقرار کیا پھر ابوسفیان کی بات کاٹتے ہوئے اور محمد ﷺ کے صدق کی تعریف کرتے ہوئے یوں گویا ہوا کہ "یہ نہیں ہوسکتا کہ محمد ﷺ لوگوں کے سامنے جھوٹ بولنا چھوڑ دیں اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھیں۔

یہ حدیث لمبی ہے اور مشہور ہے اسے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا اگر آپ چاہیں تو وہاں رجوع کر سکتے ہو۔[1]

اور یہ قریش کا بولنے والا ہے جو ایک گفتگو کے ذیل میں کہتا ہے کہ ہم آپ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ جو دین لے کر آپ آئے ہیں اس دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾ (الانعام: ۳۳)[2]

"بے شک وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں۔"

پیغمبر اسلام کی قابل فخر باتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے بنی عامر بن صعصعہ پر اسلام پیش کیا اور یہ ہجرت سے پہلے اور دین کی تقویت اور شان و شوکت سے پہلے کی بات ہے ان کے ایک بڑے نے کہا کہ اگر ہم آپ کے حکم کی اتباع کر لیں پھر اللہ تعالیٰ آپ کو مخالفین پر غلبہ عطا فرما دے تو کیا آپ کے بعد امارت میں ہمارا بھی حصہ ہوگا؟ آپ ﷺ نے ان دائمی حکمت سے لبریز الفاظ میں جواب دیا کہ "امارت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے وہ جہاں چاہتا ہے اسے رکھتا ہے اس پر ان کے بڑے نے کہا کہ "کیا ہمارے سینے آپ کے علاوہ کسی اور عرب کے سامنے جھک جائیں؟ پھر جب اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ دے تو امارت کسی اور کی ہو جائے؟ ہمیں آپ کی امارت کی ضرورت نہیں۔

یہاں اسلام کی سیاست ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ایک صریح اور واضح سیاست ہے جو راہ راست پر اور بڑی بلند مرتبہ والی ہے نہ وہ چکر بازی جانتی ہے اور نہ ہی کسی جھوٹ اور گمراہی کا سہارا لیتی ہے جیسا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی صاف گوئی، ان کا صدق ان کا بلند مرتبہ ہونا ظاہر ہے۔

ہاں البتہ نبی کریم ﷺ انتہائی تنگی کے اندر ہوتے تھے دشمن یا دوست سے قدرے معاونت کے خواستگار ہوتے تھے اور

---

① بخاری کتاب بدء الوحی باب ٦

② سنن ترمذی تفسیر سورۃ الانعام آیت ۳۳، حدیث ۳۰۶۴

عرب کا یہ قبیلہ کمانے اور کمائی سے تقویت حاصل کر سکتا تھا اور آپ ﷺ نہ وعدہ خلافی کر سکتے، نہ جھوٹ بول سکتے اور نہ ہی معاہدہ شکنی کر سکتے تھے۔

وہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو کیا آپ ﷺ کے بعد یہ لوگ خلیفہ ہوں گے؟

آپ ﷺ منہ بھر کر ان کو جواب دیتے ہیں کہ "امارت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اسے وہ جہاں چاہتا ہے رکھ چھوڑتا ہے۔" اگر آپ ﷺ مثلاً انشاء اللہ کہہ دیتے تو وہ سب لوگ آپ ﷺ کے قریب ہو جاتے اور آپ کی جماعت اور مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہو جاتے۔

کیا شان ہے اسلام کی سیاست اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے اخلاق کی!۔

جب رسول اللہ ﷺ کے یہ اعلیٰ اخلاق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مشعل راہ تھے تو کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ان انوار سے پارہ نور نہ چنتے ہوں اور کمان کی اس تانت کو چلاتے نہ ہوں؟ تو پھر ان کے بارے میں کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے یا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں تحقیق نہیں کرتے تھے۔

﴿سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴾ (النور:۱۶)

"تو پاک ہے یہ تو (بہت) بڑا بہتان ہے۔"

دسواں عامل

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اسلام کے تمام فضائل پر اعلیٰ تربیت ہونا اور اس دین حنیف کے آداب کے ساتھ ان کا باکمال ادب سیکھنا اور ان کا اللہ تعالیٰ سے شدید خوف کرنا اور ان کے نفوس کا اس قدر صاف اور خالص ہونا کہ وہ جھوٹ کے ساتھ متفق نہیں ہو سکتے تھے خصوصاً اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے میں اور افضل المخلوقات صلوات اللہ وسلامہ علیہ پر بے بنیاد الزام لگانے میں۔

علماء اخلاق اور وہ علماء جو علم نفسیات یا علم معاشرت میں مشغول ہیں وہ کہتے ہیں کہ جھوٹ بہت بڑا گناہ ہے یہ گناہ صرف ایسے شخص سے ہی صادر ہو سکتا ہے جو ادب سے گرا ہوا ہو اور اس کا پھیلنا صرف اسی جگہ پر اور اسی قوم میں متصور ہو سکتا ہے جو مہذب نہ ہو۔

جب ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تاریخ میں غور کرتے ہیں تو بڑا عجیب مشاہدہ کرتے ہیں کہ اسلام نے انھیں کتنا عظیم ادب سکھلایا اور ان کی کتنی اعلیٰ تربیت کی کہ انھیں ایسے بنا دیا جیسے زمین میں چلتے فرشتے ہوں خصوصاً صدق و امانت، تحقیق و احتیاط کے معاملے میں۔ اور یہ ان کثیر فضائل میں سے ہیں جو قرآن پاک نے ان کے بارے میں بیان کیا اور رسول اللہ ﷺ کی اس توجہ کا نتیجہ ہیں جو علم، عمل اور مراقبہ کے اعتبار سے آپ ﷺ نے ان کے ساتھ برتی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور نعمت کے ساتھ ان کے دل ان پر منطبع ہو گئے اور ان کے نفوس شرف و شرافت کے مبادی سے لبریز ہو گئے ان کی شرافت انکار کرتی ہے کہ وہ جھوٹ کے قریب جائیں یا حملہ آوری کر کے بدنمائی پیدا کریں۔ خصوصاً کتاب عزیز کے مقام اور صاحب رسالت ﷺ کے کلام پر حملہ آوری کرنا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ "رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو جھوٹ سے بڑھ کر کوئی بھی خصلت گراں نہیں گزرتی تھی آپ ﷺ کو اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کے بارے میں جب معلوم ہوتا کہ اس نے جھوٹ بولا تو آپ ﷺ کے سینے سے وہ بات

اس وقت تک ختم نہیں ہوتی تھی جب تک کہ آپ ﷺ کو یہ معلوم نہ ہو جاتا کہ اس نے اللہ تعالیٰ عزوجل سے توبہ کر لی ہے۔ (مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں اسے روایت کیا)

دیگر عوامل ✪ جب آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کے حفظ کتاب وسنت کے گزشتہ بالا عوامل میں سے بعض میں غور فرمائیں گے تو بعض عوامل آپ کو ایسے بھی ملیں گے جو ان کے کتاب وسنت میں تحقیق وجستجو کے دواعی ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے اعادہ کی بجائے ان کی طرف اشارہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

① عربوں کی ذکاوت، قوت حافظہ اور ان کی طبیعت کا خلوص.. الخ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ عوامل ان کے تحقیق وجستجو کے عوامل میں سے بھی ہیں اس لیے کہ جو شخص ان صفات میں پلا بڑھا اس کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے حافظہ میں مضبوط ہو لہٰذا اسے مزید بڑھانے اور جھگڑنے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

② صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ سے محبت جس طرح ایک عامل ہے اسی طرح وہ ان حضرات کے تحقیق وجستجو کے عوامل میں سے بھی ہے اس لیے کہ محب صادق اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتا جب تک کہ اسے پوری طرح تسلی نہ ہو جائے کہ یہ اس کے حبیب کا کلام ہے اور اس میں کوئی التباس یا شک نہیں ہے اور وہ اپنے حبیب پر جھوٹ کو کبھی بھی پسند نہیں کرتا اور نہ ہی اس پر جھوٹے الزام کو پسند کرتا ہے اور نہ یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے کلام میں کوئی دھینگا مشتی ہو خصوصاً جب وہ حبیب اسے ناپسند کرتا ہو (دیکھیے حفظ کے عوامل میں سے چوتھے عامل کو)

③ صحابہ رضی اللہ عنہم کا فصاحت بیان کے میدان میں کھڑے ہونا اور نقد کلام میں ان کا بلند مرتبت ہونا نیز قرآن پاک کے اعجاز اور نبی کریم ﷺ کی بلاغت کے ادراک میں ان کا کمال ذوق۔ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جو ان کے لیے تحقیق وجستجو آسان کر دیتی ہیں اور ان پر آسان کر دیتی ہیں کہ وہ تردید کر سکیں ان چیزوں کی جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے کلام میں سے نہیں ہیں اس لیے کہ وہ فاضل اور مفضول اسالیب کے درمیان فرق کو پہچان سکتے ہیں اور ان کے کلام کا اپنی بگی بلاغیت کے ساتھ موازنہ کر سکتے ہیں۔ (دیکھیے حفظ کے عوامل میں سے پانچواں عامل)

④ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علم کا دین میں کتاب وسنت کے قائم مقام ہونا جو بلا شک وشبہ انھیں ان کی تحقیق وجستجو کا اہتمام کرنے والا اور ان میں احتیاط کرنے والا بنا دیتا ہے۔ (دیکھیے حفظ کے عوامل میں سے ساتواں عامل)

⑤ کتاب کا اعجاز کے ساتھ متصل ہونا اور سنت کا بعض معجزات وغرائب کے ساتھ متصل ہونا اس کے بعد قرآن پاک کی اکثر آیات اور اکثر احادیث رسول ﷺ کا حوادث وواقعات کے ساتھ متصل ہونا یہ سب چیزیں نفوس میں ایسی قابلیت پیدا کر دیتی ہیں کہ انھیں قرآن وسنت میں وثوق ہو جاتا ہے اور انھیں ان میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا اور نہ ہی ان میں اضافہ اور جھوٹ کو قبول کرتے ہیں۔ (دیکھیے حفظ کے عوامل میں سے آٹھواں عامل اور نواں عامل)

جب آپ نے یہ اور اس طرح کے دس عوامل جمع کر لیے جو آپ کے سامنے لکھے ہوئے ہیں تو آپ نے دس سے زائد عوامل دیکھ لیے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی امانت اور ان کے کتاب وسنت میں تحقیق وجستجو پر قائم شدہ دلائل ہیں۔

تحقیق وجستجو کے مظاہر

اسی طرح ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تاریخ کی ورق گردانی کریں اور ان کے آثار کے پیچھے چلیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ حق کے شواہد ہیں اور ان کی رگ رگ میں سچ کی فضیلت پیوستہ ہے اور وہ جھوٹ اور اس جیسی چیزوں سے خوب دور بھاگتے ہیں اور ان سے بالکل پاک صاف ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ "ہمارے نزدیک تم میں سب سے زیادہ محبوب وہ نہیں ہے جس کا نام ہمیں اچھا لگتا ہو بلکہ جب ہم تمہیں دیکھیں تو ہمیں تم میں سے سب سے زیادہ محبوب وہ ہوگا جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو اور جب ہم تمھیں جانچیں تو ہمیں تم میں سے سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہوگا جس کی بات سب سے زیادہ سچی ہو۔

اور ادھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو دیکھیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ "سب سے بڑا گناہ اللہ کے نزدیک جھوٹی زبان ہے۔" ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ "جب میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی حدیث بیان کروں میں آسمان سے گر جاؤں تو یہ مجھے زیادہ پسند ہے اس بات سے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولوں۔"

اگر آپ چاہیں تو حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کے واقعہ کو ملاحظہ کریں آپ کو تعجب ہوگا یہ بھی ان حضرات میں سے ایک تھے جن کی تربیت صحابہ رضی اللہ عنہم نے کی تھی "ایک مرتبہ ان کی آنکھیں خراب ہوگئیں اور رمد آنکھوں کے باہر تک آ گئی (اور وہ سفید میل ہے جو آنکھوں میں سے آنسوؤں کے بہنے کی جگہ سے نکلتی ہے) کسی نے ان سے کہا کہ آپ اپنی آنکھوں کو صاف کرلیں؟ انھوں نے فرمایا کہ پھر طبیب کا قول کہاں چلا جائے گا کہ اس نے کہا تھا کہ اپنی آنکھوں کو ہاتھ نہ لگانا اور میں نے کہا تھا کہ میں ایسا نہیں کروں گا۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ایک واقعہ میں غور فرمائیں کہ حضرت بشیر عدوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آئے اور انھوں نے حدیث بیان کرنی شروع کی اور فرمایا کہ "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم" (رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اسے اجازت نہیں دے رہے تھے اور نہ ہی اس کی طرف دیکھ رہے تھے انھوں نے عرض کیا کہ یا ابن عباس! کیا ہوا کہ مجھے نظر نہیں آ رہا کہ آپ میری حدیث کو سنتے ہوں؟ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حدیث سناؤں اور آپ نہ سنیں؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہم پہلے جب کسی آدمی کو "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم" کہتے سنتے تو فوراً اپنی آنکھیں اس کی طرف پھیر لیتے اور اپنے کان ادھر کو متوجہ کر لیتے تھے اب جب لوگ ہر طرح کی خشک وتر باتیں کرنے لگے تو ہم لوگوں سے صرف وہی لیتے ہیں جنھیں ہم جانتے ہوتے ہیں۔

اس انتہائی پرہیز گاری اور نازک احتیاط کی بناء پر بہت سے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم روایت حدیث سے کنارہ کشی کرنے لگے ان سے تھوڑی سی مقدار کے سوا کچھ نہیں سنا گیا حالانکہ ان کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی ایک بڑی جماعت موجود تھی۔

حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ حدیث بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ابا جان سے عرض کیا کہ کیا بات ہے کہ مجھے دکھائی نہیں دیتا کہ فلاں فلاں کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان نہیں کرتے؟ انھوں نے فرمایا کہ میں نے جب سے اسلام قبول کیا اس وقت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا نہیں ہوا لیکن میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ "جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔"①

---

① بخاری ومسلم

جب ان حضرات کے سنت نبوی ﷺ کے بارے میں تقوی اور احتیاط کا یہ عالم ہے تو ان کا کتاب اللہ کے بارے میں احتیاط اور تقوی کا کیا عالم ہوگا؟ میرا خیال یہ ہے کہ جب آپ قرآن کے سات حروف پر نازل ہونے کے ادلہ میں رجوع کریں گے تو آپ کو اس صورت حال کے خوشگوار اور تعجب خیز واقعات کا مشاہدہ ہوگا۔ دیکھیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ کی گردن کو پکڑتے ہوئے انھیں گھسیٹ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آتے ہیں انھوں نے ان سے صرف اس بات کا انتقام لیا کہ انھوں نے سورۃ الفرقان کو پڑھا لیکن اس طریقے پر نہیں پڑھا جس طریقے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہیں پڑھا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ اس طرح نازل ہوا۔ حضرت عمر نے انھیں نہیں چھوڑا بلکہ انھیں رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آئے اور آپ ﷺ نے انھیں حکم دیا کہ انھیں چھوڑ دو! پھر آپ ﷺ نے ان دونوں کو قرأت کرنے کا حکم دیا اور دونوں کی قرأت کے بارے میں فرمایا کہ اسی طرح نازل ہوا۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

"بے شک یہ قرآن پاک سات حروف پر نازل ہوا اب تم اسی حرف پر پڑھو جو تمھیں آسان لگے۔"

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ہشام رضی اللہ عنہ کے مابین ہونے والا واقعہ ہے اسی طرح کے واقعات حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ کے اپنے شاگردوں کے ساتھ پیش آئے۔ اس موضوع کی تفصیلی روایات اپنے مقام پر آپ کے سامنے پیش کی جائیں گی۔

اس کے ساتھ اس انتہائی باریک بینی کو بھی شامل کر لیں جسے ہم نے آپ کے سامنے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دستور میں میں جمع صحیفوں اور مصاحف میں جمع قرآن کے سلسلے میں اجمالاً ذکر کر دیا تھا وہ بھی آپ کے قریب ہیں اگر آپ چاہیں تو ان کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

جمع قرآن کے ان دونوں دستوروں کے مشابہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سنت کی حمایت میں دستور بھی ہے جو انتہائی احتیاط اور تحقیق وجستجو پر مشتمل ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے اصحاب رضی اللہ عنہم رسول کو جمع کیا اور اپنی امارت میں ان سے مشورہ کیا پھر مندرجہ ذیل طریقہ کار تک پہنچے۔

وہ خبر واحد کے بارے میں غور کرتے اور اس میں انتہائی گہری تحقیق اور کھود کرید سے کام لیتے انھیں کتاب اللہ پر اور متواتر یا مشہور احادیث رسول پر پیش کرتے اگر کوئی حدیث ذرا بھی مخالف ہوتی تو اسے ایک طرف کو کر دیتے اور رد کر دیتے اور اگر مخالف نہ ہوتی تو اس کے راوی میں نظر ثانی کرتے جس کی عدالت، ضبط، صدق اور تحری معلوم ہوتی اس کی روایت کو قبول کرتے ورنہ کسی اور طریق سے تزکیہ کا مطالبہ کرتے جو اس کا شاہد بنتا اور اسی روایت کو وہ بھی روایت کرتے۔ اس کے اور اُس کی ناگواری کی وجہ سے انھوں نے روایت کی تقلیل کا التزام کیا ہے کیونکہ کثرت خطاء کا محل اور اشتباہ کا مقام ہوتا ہے۔

البتہ ان کے تقوی اور اللہ سے شدید خوف نے انھیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کو اس گہرے اور راہ راست پر قائم دستور کے مطابق ان تین قواعد کی رعایت کرتے ہوئے محفوظ کریں۔

① خبر میں نظر وفکر ② مخبر میں نظر وفکر ③ کم روایتیں کرنا

اللہ تعالیٰ ابن خطاب رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے کہ انھوں نے بھی کتاب وسنت کی احتیاط میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے وضع کردہ

قوانین کو ہی اپنایا انھی کو نمونہ بنایا اور انھی کو بلند کیا اور انھیں میں اضافہ بھی کیا، یہاں تک کہ وہ امین اور ثقہ راویوں کے ساتھ مضبوط ہو گئے اور کثرت سے روایت کرنے والے صحابہ کے لیے گردن کے پھندے کو تنگ کر دیا یہاں تک مروی ہے کہ انھوں نے تین مشہور صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایک پورا سال تک قید کر دیا انھوں نے ان سے صرف اس چیز کا انتقام لیا کہ انھوں نے کثرت کے ساتھ روایات نقل کیں۔

جب یہ ثابت ہو گیا تو یہ ایک عبرتناک سبق ہے جو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف سے عام لوگوں کے لیے اصول تشریع، اور روایات میں تدقیق اور غور و فکر کے متعلق ہے خواہ اس کا تعلق اخذِ روایت سے ہو یا ادائے روایت سے ہو۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا کہ:

انی وقتلی سلیکًا ثم اعقله　　　　كالثور يضرب لما عافت البقر

"بے شک میں اور میرا سلیک کو قتل کرنا پھر اس کے ورثاء کو قتل کرنا۔ ایسے ہے جیسے گائیاں (کسی کھیت پر) چڑھ آئیں تو بیل کو مارا جاتا ہے۔"

اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آیا وہ بھی قدم بقدم ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے چلے کیونکہ کتاب نے انھی کے سائے اور حفاظت میں ایک مضبوط ستون اور گھنے سائے میں پناہ حاصل کی اور ان دونوں حضرات کے زمانے میں سنت ایک ستون کی طرح بن گئی تھی جس کی پشت قوی تھی یہاں تک کہ بنو امیہ نے اسے اسی صورت پر حاصل کیا جس صورت پر اسے خلفاء راشدین نے چھوڑا تھا یعنی سفید روشن کہ اس کی رات بھی دن کی مانند تھی۔

عہد اموی میں سنت اپنے محافظوں اور اپنے اعزاز کی حفاظت میں ٹھہری ہوئی تھی یہاں تک کہ دوسری صدی کے شروع میں بادشاہوں کا ستارہ عادل عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ طلوع ہوا انھوں نے بھی سنت نبوی کی صیانت و حفاظت کی ضرورت میں اپنے دادا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا زمانہ دوہرایا۔ لیکن انھوں نے دیکھا کہ یہ کام کتابت اور سطور میں نقش کے طریقے سے ہی ہو سکتا ہے۔

اگرچہ اس سے قبل گزشتہ ادوار میں اس کی حفاظت سینوں اور قلوب میں حفاظت کے ذریعے ہی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ایک نئے اور سعادت مند دور کی طرف منتقل ہوئی اور وہ دور کتابت اور قلم بندی کا دور تھا جس کا حدیث نبوی کا ہمارے تک پہنچنے میں انتہائی اثر تھا اور یہ علم کی انتہائی دقیق ترازو اور دقیق بحث وزن کی گئی تھی۔

نتیجہ ✿ اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ کتاب و سنت کی حفاظت فولادی دیواروں کے ذریعے ہوئی ہے اور دین کی لایعنی سے حفاظت شریعت کے اصول کے ذریعے ہوئی اور امت کے بعد والے لوگوں نے اپنے نیک اسلاف سے ایک مضبوط سبق حاصل کیا جس سے دین کی تحقیق کی ضرورت پوری ہوئی نیز انھوں نے کتاب و سنت کی حفاظت میں بیدار مغزی، راویوں کی تنقید اور مرویات کی جانچ پڑتال کے لزوم کا سبق بھی حاصل کیا اور اسی کے ذریعے مکر و فریب اور مکر و فریب کرنے والوں کے طریقوں کو پکڑا گیا اور جھوٹے اور وضاعین کے لیے جال بنا گیا اور دین اسلام محفوظ سلطنت اور محفوظ حرم والا ہو گیا اور اس درجہ تک پہنچ گیا کہ اقوام عالم اور ادیان دُنیا نے اس پر فخر کیا اور ایسا فخر کیا کہ اس کی مثل کبھی مل نہیں سکتی بلکہ جب سے اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمان کو بنایا اس وقت سے آج تک آسمانی یا وضعی شریعتوں میں سے کسی بھی شریعت کی تاریخ میں کبھی کوئی اس کے قریب بھی نہیں ہو سکتا۔

مقام کی نزاکت ✿ اے قاری مکرم یہ نہ سمجھنا کہ میں نے مبالغہ کیا یا بڑھا کر بات کی اگرچہ میں نے بات لمبی کی اور زیادہ کی لیکن پھر بھی یہ بحث بہت زیادہ قابل قدر اور نازک ہے اس کی عظمت اور نزاکت کا اتصال اس ممتاز جماعت کے ساتھ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے

اپنی کتاب کو حاصل کرنے اور اپنے رسول ﷺ کی ہم عصری کے لیے چنا۔ نیز اسے ہدایت اسلام اور دین حنیف کی چراگاہ کے دفاع کے لیے آپ ﷺ کی عمدہ طریقے سے نیابت کے لیے چنا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اس امت کی عمارت کے ایک کونہ کے پتھر ہیں۔ انھی سے امت نے کتاب اللہ کو حاصل کیا، سنت رسول میں مہارت حاصل کی، اسلام کی تعلیمات حاصل کیں ان سے پہلے کسی اور سے حاصل نہیں کیں لہٰذا ان کی شان سے چشم پوشی کرنا اور ان کی تحقیر کرنا بلکہ ان کا احترام کیے بغیر ان کی طرف نظر کرنا اس عالی شان مرکز کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا جس کا انھوں نے ٹھکانہ پکڑا اور اس عظیم مقصد کے موافق نہیں ہے جس کے لیے وہ آمادہ ہوئے اور اٹھ کھڑے ہوئے جیسا کہ ان کے بارے میں طعن اور ان میں عیب جوئی کرنا اسلام کی عمارت کو گرا دیتا ہے اور شریعت اسلام کے ستونوں کو منہدم کر دیتا ہے اور قرآن کے صحیح ہونے میں شک پیدا کرتا ہے اور سنت سید الانام کے اعتماد کو ضائع کر دیتا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم پر سب سے شدید جرح یہ ہوتی ہے کہ انھیں سوء حفظ اور عدم ضبط کی تہمت لگائی جائے اور انھیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ پر بہتان کا طعن کیا جائے اور ان میں تحقیق و جستجو اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو اُمت کی طرف نقل کرنے میں تحقیق و جستجو نہ کرنے کا عیب لگایا جائے۔

اسی وجہ سے علماء متقدمین و متاخرین نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے کھار کے دفاع کا بھرپور اہتمام کیا اس لیے کہ یہ اسلام کے قلعے کی حفاظت ہے (جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں) اور یہ دفاع خواہشات کا حملہ نہیں ہیں اور نہ ہی عصبیت کی بے رخی ہے بلکہ تجزیہ نگاری اور تحقیقات، تاریخ ابحاث اور باکمال وسیع تحقیقات کا نتیجہ ہیں جنھوں نے ان کی تعداد کو گنا اور ان کے ایک ایک فرد کی تحقیق کی ور انھیں رجال کے دقیق ترین اوزان پر پیش کیا جن کی وجہ سے امت اسلامیہ تمام امتوں اور نسلوں پر فخر کرنے لگی۔

اس تحقیق و تدقیق کے مکمل کرنے کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم اس کارنامے سے سرخرو ہوئے کیونکہ وہ خیر اُمت تھے جنھیں لوگوں کے لیے نکالا گیا اور نامور جماعت تھے جنھیں تاریخ نے جانا اور نبی کریم ﷺ کے قابل ترین صحابہ تھے جو روئے زمین پر ظہور پذیر ہوئے اور بھرپور حافظہ اور ضبط والی جماعت تھی اس لیے انھوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کی حفاظت کی۔

اہل سنت والجماعت مجبور ہیں کہ وہ اپنی رائے کا عقیدہ کی طرح اظہار کریں اس لیے انھوں نے طے کر دیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب عادل ہیں اس رائے سے صرف بدعتی اور زنادقہ علیحدہ ہوئے اللہ تعالیٰ ان کا برا کرے۔ ابوزرعہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

"جب تم دیکھو کہ کوئی شخص صحابہ رضی اللہ عنہم کی تنقیص کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ حق ہیں، قرآن پاک حق ہے اور وہ جو لائے وہ بھی حق ہے اور یہ سب کچھ ہم تک پہنچایا ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پہنچایا ہے اور یہ لوگ (یعنی زنادقہ) ہمارے گواہوں کو مجروح کرنا چاہتے ہیں تاکہ کتاب و سنت کو باطل قرار دیں جبکہ ان کی جرح زیادہ ضروری ہے کیونکہ وہ زنادقہ ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہادت عالیہ

گزشتہ بالا بڑھ کر دیکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ اصحاب محمد ﷺ کی بارہا مدح فرماتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو دیکھتے ہیں کہ وہ کئی مواقع پر بھرپور تعریف کرتے ہیں اگر آپ چاہیں تو اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل ارشادات کو پڑھیں۔

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛۖۚ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۛ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ (الفتح: ۲۹)

"محمد (ﷺ) خدا کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں تو سخت ہیں اور آپس میں رحم دل (اے دیکھنے والے) تو انکو دیکھتا ہے کہ (خدا کے آگے) جھکے ہوئے سربسجود ہیں اور خدا کا فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں (کثرت) سجود کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں ان کے یہی اوصاف تورات میں (مرقوم) ہیں اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں (وہ) گویا ایک کھیتی ہیں جس نے (پہلے زمین سے) اپنی سوئی نکالی پھر اس کو مضبوط کیا پھر موٹی ہوئی اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہوگئی اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے تا کہ کافروں کا جی جلائے جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان سے خدا نے گناہوں کی بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔"

پھر اگر آپ چاہیں تو اللہ تعالیٰ عز اسمہٗ کا مندرجہ ذیل ارشاد تلاوت فرمائیں:

﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾ (الحدید: ۱۰)

"جس شخص نے تم میں سے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور لڑائی کی وہ (اور جس نے یہ کام پیچھے کیے وہ) برابر نہیں ان لوگوں کا درجہ ان لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے جنھوں نے بعد میں خرچ (اموال) اور (کفار سے) جہاد و قتال کیا اور خدا نے سب سے (ثواب) نیک (کا) وعدہ تو کیا ہے اور جو کام تم کرتے ہو خدا ان سے واقف ہے۔"

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَ لَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ (الحشر: ۸،۹)

"(اور) ان مفلسان تارک الوطن کے لئے بھی جو اپنے گھروں اور مالوں سے خارج (اور جدا) کردیے گئے ہیں (اور) خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلبگار اور خدا اور اس کے پیغمبر کے مددگار ہیں یہی لوگ سچے (ایماندار) ہیں۔ اور (ان لوگوں کے لئے بھی) جو مہاجرین سے پہلے (ہجرت کے) گھر (یعنی مدینے) میں مقیم اور ایمان میں (مستقل) رہے اور جو لوگ ہجرت کر کے انکے پاس آتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش (اور خلش) نہیں پاتے اور انکو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو۔"

اور آپ غور فرمائیں اللہ تعالیٰ عزوجل کے اس ارشاد کے بارے میں کہ:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ... الخ﴾ (آل عمران:)

"تم بہترین امت ہو تمہیں نکالا گیا ہے لوگوں کی نفع رسانی کے لیے۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ... اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (البقرۃ: ۱۴۳)

"اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر (آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم پر گواہ بنیں اور جس قبلے پر تم (پہلے) تھے اس کو ہم نے اس لئے مقرر کیا تھا کہ معلوم کریں کہ کون (ہمارے) پیغمبر کا تابع رہتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے اور یہ بات (یعنی تحویل قبلہ لوگوں کو) گراں معلوم ہوئی مگر جن کو خدا نے ہدایت بخشی ہے (وہ اسے گراں نہیں سمجھتے) اور خدا ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو یونہی کھو دے خدا تو لوگوں پر بڑا مہربان (اور) صاحب رحمت ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس خطاب کے بالکل سامنے تھے اور وہ اس کے مضمون میں بالکل ظاہر اور واضح تھے اور اوّل امر میں اپنی ترجیحات کے ساتھ متحقق تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں شہادت

اس طرح ہم صحیح احادیث میں ایسی چیزیں پڑھتے ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ثقلین یعنی جن وانس پر سوائے انبیاء اور مرسلین کے فضیلت اور کمال امتیاز پر شاہد ہیں۔

ترمذی اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

((اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم غرضا فمن احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم ومن اذاھم فقد اذانی ومن اذانی فقد آذی اللہ فیوشك ان یاخذہ)).

"اللہ سے ڈرو! اللہ سے ڈرو! میرے صحابہؓ کے بارے میں اللہ سے ڈرو! انھیں نشانہ نہ بناؤ جس نے ان سے محبت کی اس نے میری محبت کی وجہ سے محبت کی اور جس نے ان کے ساتھ بغض کیا اس نے میرے ساتھ بغض ہونے کی وجہ سے بغض کیا جس نے انھیں ستایا اس نے مجھے ستایا اور جس نے مجھے ستایا اس نے اللہ تعالیٰ کو ستایا اب عنقریب وہ اسے گرفت میں لے لے گا۔" ①

مسند بزار میں ایک روایت ہے جس کے تمام راوی ثقہ ہیں کہ "بے شک اللہ تعالیٰ نے میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جن وانس میں سے منتخب فرمایا سوائے انبیاء و مرسلین کے۔" اور صحیح بخاری اور مسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں فرمایا کہ:

((لو انفق احد کم مثل اُحُدٍ ذھبا ما ادرك مد احدھم ولا نصیفه)). ②

"اگر تم میں سے کوئی شخص اُحد کے برابر بھی صدقہ کر دے تو ان کے ایک مد بلکہ اس کے نصف تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔"

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک متواتر حدیث ہے کہ:

((خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ... الخ)).

---

① ترمذی کتاب المناقب ۵۸، مسند احمد ۴، ۸۴

② صحیح بخاری فضائل الصحابہ ۵، صحیح مسلم فضائل الصحابہ ۲۲۱، ۲۲۲

"سب سے بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے پھر اس کے بعد والا..... "①

آپ کتاب وسنت میں ان شہادات عالیہ کو دیکھ رہے ہیں کہ کیسے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقام کو چوٹی تک پہنچا دیا ہے اور طعنہ لگانے والوں اور عیب جوئی کرنے والوں کے لیے کوئی دلیل بلکہ شبہ دلیل بھی نہیں چھوڑی ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے انتخاب میں اللہ تعالیٰ کی حکمت

درحقیقت عقل اگر خواہش نفس اور تعصب سے خالی ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت کے بارے میں محال سمجھتی ہے کہ وہ اپنی حتمی اور آخری شریعت کو نقل کرنے کے لیے امت کے نچلے درجے کے لوگوں کو یا عیب والی جماعت کو چنے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بہت زیادہ بلند وبالا ہے اسی وجہ سے اس طبقہ کریمہ یعنی طبقہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی توثیق ایک اعتبار سے کتاب وسنت اور اصول اسلام کی حفاظت ہی کا نام ہے اور دوسرے اعتبار سے اخلاقی طور پر مستحق کو اس کا انصاف فراہم کرنے کا نام ہے اور تیسرے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا اس عظیم مقصد کے لیے انھیں منتخب کرنے میں اس کی کامل حکمت کو خراج تحسین پیش کرنے کا نام ہے اسی طرح ان حضرات صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین اس حکیمانہ انتخاب میں عیب لگانا اور اس انتخاب اور تکریم میں طعن لگانے کے مترادف ہے جو اس سے بھی بڑھ کر ہے جس سے کتاب وسنت اور دین کا انہدام لازم آتا ہے۔

اُمت عربیہ کی تاریخ اور اس کے طبائع اور خصوصیات کی ورق گردانی کرنے والا ان کے عنصر، ان کے جوہر کے خالص پن ان کی خصوصیات کے عالی پن کی سلامتی کو دیکھتا ہے جو اسے اس جگہ لا کھڑا کرتی ہے کہ وہ اطمینان کے ساتھ حکم لگاتا ہے کہ یہ امت "خیر امت اخرجت للناس" ہے پھر اسلام نے انھیں پگھلایا قرآن نے انھیں پاک صاف کیا اور سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے میل کچیل کو دُور کیا۔

لیکن اسلام پر بعد میں بھی اسی طرح کی یا اس سے بھی زیادہ آزمائشیں آئیں جو اس پر پہلے آئی تھیں اور آج کے زمانے میں زبانیں کتاب اللہ کے بارے میں بغیر علم کے چلنے لگیں، سنت رسول میں بغیر دلیل کے گھسنے لگیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں بغیر کسی شرم وحیا کے عیب لگانے لگیں اور شریعت کی حفاظت کرنے والوں پر بغیر کسی دلیل کے کیچڑ اچھالا جانے لگا کبھی ان پر حافظے کی کمزوری کی تہمت لگائی جانے لگی کبھی اپنے پاس سے اضافہ کرنے کی اور کبھی عدم تحقیق کی تہمت لگانے لگے۔ ہم نے آپ کو خوب مواد فراہم کر دیا اور خوب اسلحہ بھی دے دیا اب آپ میدان میں اتریں اور دشمنوں کا خوف مت کریں۔

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝﴾ (محمد: ۷)

"اے اہل ایمان! اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تم کو ثابت قدم رکھے گا۔"

اللہ تعالیٰ اسلام کی نصرت کے ذریعے ہماری نصرت کرے اور ہمارے قدموں اور قلموں کو ثابت قدم رکھے۔ ابتداء اور انتہاء میں الحمد للہ وصلی اللہ علی سیدنا محمد والہ وصحابتہ الاعلام۔ آمین۔

---

① صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابہ حدیث ۲۱۲

بحث ⑨

قرآن پاک کی آیات اور سورتوں کی ترتیب

آیت کا معنی ○ آیات القرآن "آیۃ" کی جمع ہے اور لغت کی زبان میں آیت کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے۔

① **معجزہ** ○ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ﴾ (البقرۃ:۲۱۱)

"بنی اسرائیل سے سوال کرو کہ ہم نے تمہیں کتنے معجزے دیے۔"

② **علامت** ○ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ اٰیَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ التَّابُوْتُ فِیْهِ سَكِیْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (البقرۃ:۲۴۸)

بے شک اس کی سلطنت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک تابوت آئے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے سکینہ ہوگی۔"

③ **عبرت** ○ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً﴾ (البقرۃ:۲۴۸)

"بے شک اس میں یقیناً عبرت ہے۔"

④ **عجیب امر** ○ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْیَمَ وَ اُمَّهٗٓ اٰیَةً﴾ (المؤمنون:۵۰)

"اور ہم نے ابن مریم اور ان کی والدہ کو ایک عجیب امر بنا دیا۔"

⑤ **جماعت** ○ جیسے کہتے ہیں کہ:

((خرج القوم بآیتهم)).

"قوم اپنی جماعت کے ساتھ نکلی۔"

یعنی جماعت کے ساتھ نکلی: مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے پیچھے کچھ نہیں چھوڑا۔"

⑥ **برہان اور دلیل** ○ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ﴾ (الروم:۲۲)

"اس کے دلائل میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود، اقتدار اور اتصاف بالکمال کے دلائل میں سے آسمانوں اور زمینوں کے جہانوں کا پیدا

کرنا اور زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا ہے۔

یہ سب لغوی اطلاقات ہیں جو ایک دوسرے کو مستلزم ہیں۔ پھر اصطلاح میں آیت اس معنی کے ساتھ خاص ہے کہ وہ "ایک حصہ جو ابتداء اور انتہاء رکھتا ہے اور قرآن پاک کی سورتوں میں مندرج ہوتا ہے۔" گزشتہ بالا ان لغوی معانی اور اصطلاحی معنی کے درمیان مناسبت واضح ہے، اس لیے کہ آیت قرآنی معجزہ بھی ہے، نیز یہ اس کے لانے والے پیغمبر ﷺ کے صدق پر علامت ہے اور اس میں نصیحتیں اور عبرتیں ہیں اور جو نصیحتیں حاصل کرنا چاہے اس کے لیے نصیحت ہے اور یہ اپنے بلند اور معجز مقام پر ہونے کی وجہ سے امورِ عجیبہ میں سے بھی ہے۔ اور اس میں جماعت کا معنی بھی پایا جاتا ہے اس لیے کہ یہ کلمات اور حروف کے مجموعے کا نام ہے اور اس میں برہان اور دلیل کا معنیٰ بھی ہے۔ اور یہ دلیل ہے اس ہدایت اور علم پر جو اس کے ضمن میں پائے جاتے ہیں اور یہ دلیل ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت اس کے علم اور اس کی حکمت پر۔ نیز یہ دلیل ہے اس کے رسول ﷺ کے صدق پر یعنی وہ اپنی رسالت میں سچے ہیں۔

آیت کو پہچاننے کا طریقہ

قرآن پاک کی آیات کو پہچاننے کا کوئی طریقہ نہیں بلکہ یہ شارع کی طرف سے توقیفی ہے، کیونکہ قیاس اور رائے کی اس میں گنجائش نہیں، بلکہ یہ محض تعلیم اور ارشاد ہے۔ اس لیے کہ علماء نے ﴿الٓمٓصٓ﴾ کو ایک آیت شمار کیا ہے۔ اس کی نظیر ﴿الٓمٓرٰ﴾ کو آیت شمار نہیں۔ اور ﴿یٰسٓ﴾ کو آیت شمار کیا اور اس کی نظیر ﴿طٰسٓ﴾ کو آیت شمار نہیں کیا اور ﴿حٰمٓ ، عٓسٓقٓ﴾ کو دو آیات شمار کیا اور ان کی نظیر ﴿کٓھٰیٰعٓصٓ﴾ کو دو آیات شمار نہیں کیا، بلکہ ایک آیت شمار کیا ہے۔ اگر یہ معاملہ قیاس پر مبنی ہوتا تو مذکورہ بالا دو مثل کا حکم ایک ہوتا اور اس طرح مختلف نہ ہوتا۔

یہ کوفیوں کا مذہب ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے ہر سورۃ کے شروع میں آنے والے حرف ہجاء کو ایک آیت شمار کیا سوائے ﴿حٰمٓ ، عٓسٓقٓ﴾ کے کہ انھوں نے اسے دو آیات شمار کیا اور سوائے ﴿طٰسٓ﴾ کے اور جن میں "ر" آتا ہے یعنی ﴿الٓرٰ﴾ اور ﴿الٓمٓرٰ﴾ اور جو الگ الگ حروف ہیں جیسے "قٓ، صٓ، ن" انھیں آیت میں شمار نہیں کیا۔

اور کوفیوں کے علاوہ دیگر حضرات نے سورۃ کے شروع میں آنے والے حروف ہجاء کو مطلقاً آیت شمار نہیں کیا۔ ہم نے کہا کہ یہ مسئلہ توقیفی ہے آپ پر یہ اختلاف مشتبہ نہ رہے۔ اس لیے کہ ہر ایک اسی حد پر وقف کرتا ہے جو اس تک پہنچی ہے یا اسے معلوم ہوئی ہے۔

آپ یہ نہ کہنا کہ انھوں نے ایک کلمہ کو آیت کیسے شمار کر دیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ شارع کی طرف سے اسی طرح وارد ہوا ہے جیسا کہ "الرحمٰن" کو سورۃ الرحمٰن کے شروع میں ایک آیت شمار کیا گیا ہے اور اسی طرح "مدھامتان" کو بھی ایک آیت شمار کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جب یہ نازل ہوئی ہیں تو ان پر وقف تھا۔

بخاری، ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابوسعید بن معلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ "میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے پکارا میں نے جواب نہیں دیا، اس کے بعد میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ!

میں نماز پڑھ رہا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا کہ:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ ﴾ (الانفال: ۲۴)

"اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کا جواب دو جب بھی وہ تمہیں پکاریں۔" 2

اس کے بعد فرمایا کہ میں تمہیں ایک سورۃ سکھلانا چاہتا ہوں جو قرآن کی سب سے بڑی سورت ہے اور مسجد سے نکلنے سے پہلے سکھلانا چاہتا ہوں اس کے بعد آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا جب نکلنا چاہا تو میں نے عرض کیا کہ کیا آپ نے نہیں فرمایا تھا کہ "میں آپ کو قرآن پاک کی ایسی سورت سکھلانا چاہتا ہوں جو قرآن پاک کی سب سے بڑی سورت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (الفاتحہ: ۱)

یہ سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے... الخ۔①

یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ سورۃ فاتحہ کی سات آیات ہیں اور اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ آیت:

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝ ﴾ (الحجر: ۸۷)

"اور ہم نے آپ کو سبع مثانی اور قرآن عظیم عطا کیا۔"

اس میں سبع مثانی سے مراد یہی سورۃ فاتحہ ہے۔ ترمذی اور حاکم نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ ہر چیز کی کوئی چوٹی ہوتی ہے اور قرآن پاک کی چوٹی سورۃ البقرۃ ہے اور اس میں ایک آیت ہے جو قرآن پاک کی آیتوں کی سردار ہے اور وہ آیت الکرسی ہے۔②

مسلم اور ترمذی نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

"اے ابو المنذر کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کو قرآن پاک کی جتنی آیات یاد ہیں ان میں سے سب سے بڑی آیت کونسی ہے؟ میں نے عرض کیا ﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ ﴾ آپ ﷺ نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ اے ابو المنذر آپ کو علم مبارک ہو۔③

صحاح ستہ میں سے نسائی کے علاوہ باقی پانچ حضرات نے حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ کی روایت کو نقل فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ:

"جس شخص نے کسی رات سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات کو پڑھا تو یہ اسے کفایت کریں گی۔"④

امام احمد نے اپنی مسند میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ:

---

① بخاری تفسیر سورۃ ۱، ابوداؤد صلوۃ الوتر ۱۵، مسند احمد ۴، ۲۱۱

② سنن ترمذی کتاب فضائل القرآن باب ماجاء فی فضل سورۃ البقرۃ حدیث ۲۸۷۸، مستدرک حاکم ۱، ۵۶۰

③ مسلم کتاب صلوۃ المسافرین ۲۵۸، ابوداؤد کتاب الوتر ۱۷، مسند احمد ۵، ۱۴۲

④ مسلم کتاب صلوۃ المسافرین ۲۵۵، ۲۵۶، صحیح البخاری کتاب المغازی ۱۲

"رسول اللہ ﷺ نے مجھے "آل حم" میں سے تیس آیات والی ایک سورۃ پڑھائی" فرمایا کہ یعنی سورۃ الاحقاف اس لیے کہ جب کوئی سورت تیس آیات سے زیادہ ہو تو اسے ثلاثین کہتے ہیں۔

ابن العربی نے فرمایا کہ: نبی کریم ﷺ نے ذکر فرمایا کہ:

"سورۃ فاتحہ سات آیات ہیں اور سورۃ الملک تیس آیات ہیں... الخ۔"

دوسری رائے: آیات کی معرفت کے بارے میں بعض علماء کا مذہب یہ ہے کہ بعض آیات سماعی توقیفی ہیں اور بعض قیاسی ہیں۔ ان کا مدار فاصلہ پر ہے اور فاصلہ وہ کلمہ ہے جو آیت کے آخر میں ہوتا ہے اس کی نظیر نثر میں سجع اور شعر میں بیت کے قافیہ کی علامت ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر کسی مقام کے بارے میں ثابت ہو جائے کہ نبی کریم ﷺ نے اس جگہ ہمیشہ وقف کیا ہے تو ہم اسے متحقق سمجھیں گے کہ یہ فاصلہ ہے اور جس کے بارے میں ثابت ہو جائے کہ یہاں آپ ﷺ نے ہمیشہ وصل کیا ہے تو ہم اسے متحقق سمجھیں گے کہ یہ فاصلہ نہیں ہے اور جس جگہ کبھی وقف کیا اور کبھی وصل تو یہاں وقف میں احتمال ہے کہ یہ فاصلہ کو بتلانے کے لیے ہے یا وقف تام کو بتلانے کے لیے یا استراحت کے لیے۔ اور وصل میں احتمال ہے کہ وہ فاصلہ نہ ہو یا فاصلہ ہو اسے اس لیے ملایا گیا ہو کہ اسے پہلے بتلا دیا گیا ہو۔ اس میں قیاس کی گنجائش ہے اور قیاس کا معنی غیر منصوص کو منصوص علیہ کے ساتھ ملحق کیا جائے کسی ایسے امر کی وجہ سے جو اس کا تقاضا کرتا ہو اور اس میں کوئی ممانعت بھی نہیں ہے اس لیے کہ یہ قرآن پاک میں کسی زیادتی یا نقصان کا سبب نہیں بنتا بلکہ اس کا نتیجہ فصل یا وصل کے محل کی تعیین ہوتا ہے۔

بعض اوقات قرآن پاک کے ایک لفظ میں دو امور ملحوظ ہوتے ہیں، ان میں سے ایک تقاضا کرتا ہے کہ اسے فاصلہ سمجھا جائے اور دوسرا اس کے خلاف کا مقتضی ہوتا ہے۔ اس کی مثال سورۃ فاتحہ میں پہلا "علیہم" ہے۔ بعض حضرات نے اسے آیت کا سرا شمار کیا اور بعض حضرات نے اسے اس طرح نہیں سمجھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ "بسم اللہ" کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا وہ سورۃ فاتحہ کی آیت ہے یا نہیں؟ حلانکہ ان حضرات کا اس میں اتفاق ہے کہ سورۃ فاتحہ کی آیات کی تعداد سات ہے۔ چنانچہ جن کا مذہب یہ ہے کہ "بسم اللہ" سورۃ الفاتحہ کی آیت ہے انھوں نے ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ سورۃ کے آخر تک کو ایک آیت شمار کیا اور جن حضرات کا مذہب یہ ہے کہ "بسم اللہ" سورۃ فاتحہ کی آیت نہیں ہے وہ پہلے "علیہم" کے مابعد کو ساتویں آیت شمار کرتے ہیں اور اس کلمہ کو فاصلہ شمار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ چھٹی آیت کے بعد واقع ہوا ہے اسے فاصلہ شمار کرنے پر وجہ ترجیح یہ ہے کہ اس صورت میں آیات کی مقدار کے درمیان مناسبت متحقق ہوتی ہے بخلاف اس کے کہ اسے فاصل شمار نہ کیا جائے، کیونکہ یہ آخری آیت باقی آیات سے بہت زیادہ لمبی اور زیادہ ہو جاتی، اور اسے فاصلہ نہ شمار کرنے پر وجہ ترجیح یہ ہے کہ یہ سورۃ فاتحہ کے باقی فواصل کے مثل نہیں ہے کیونکہ اس کے فواصل میں سے ہر ایک میں آخری حرف سے پہلے "یاء" مدہ ہے۔ مزید یہ کہ کسی بھی سورت میں اس طریقے پر کوئی فاصلہ نہیں آیا ہے۔

جاننا چاہیے کہ کبھی آیت قرآنی کا اطلاق کیا جاتا ہے اور اس سے اکثر آیات یا آیت کا کچھ حصہ مراد لیا جاتا ہے لیکن یہ بطور مجاز یا توسع ہوتا ہے۔

ایک حصہ پر آیت کا اطلاق

جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قرآن پاک میں سب سے زیادہ امید والی آیت:

﴿وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ﴾ (الرعد: ۶)

"بے شک تیرا رب یقیناً لوگوں کی مغفرت کرنے والا ہے ان کے ظلم پر۔"

یہ جملہ بالاتفاق آیت کا کچھ حصہ ہے۔

ایک سے زائد حصّہ پر آیت کا اطلاق

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول کہ سب سے زیادہ محکم آیت:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾ (الزلزال: ۷، ۸) ہے۔

"توجس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔"

حالانکہ یہ بالاتفاق دو آیات ہے۔

قرآن پاک کی آیات کی تعداد

صاحب تبیان نے فرمایا: قرآن پاک کی آیات کی تعداد کے بارے میں شمار کنندگان کا اتفاق ہے کہ وہ چھ ہزار دو سو سے کچھ زائد ہیں اور زائد کتنی ہیں؟ اس کی مقدار میں ان کے شمار کے مطابق اختلاف ہے چنانچہ مدنی اوّل کے شمار کے مطابق سترہ ہیں نافع کا بھی یہی قول ہے۔

مدنی اخیر کے شمار کے مطابق شیبہ کے نزدیک چودہ ہیں اور ابو جعفر کے نزدیک دس ہیں مکی تعداد کے مطابق بیس ہیں۔

کوفی تعداد کے مطابق چھتیس ہیں اور یہ قول حمزہ زیات سے مروی ہے۔

بصری تعداد کے مطابق پانچ ہیں اور عاصم جحدری سے بھی یہی مروی ہے انھی کی ایک روایت میں چار ہیں، ایوب بن متوکل نے بھی یہی کہا ہے بصریوں کی ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے کہا کہ انیس ہیں حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے بھی یہی مروی ہے۔

شامی تعداد و شمار کے مطابق سولہ ہے اور یحییٰ بن حارث ذماری سے بھی یہی مروی ہے۔

صاحب تبیان نے اس سے پہلے یہ بھی فرمایا کہ "کل تعداد حضرت عبداللہ بن کثیر مکی رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے جو قراء سبعہ میں سے ایک ہیں، وہ یہ بات حضرت مجاہد سے اور وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اور وہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔

مدنی تعداد کی دو اقسام ہیں: ① عدد مدنی اوّل ② عدد مدنی اخیر

عدد مدنی اوّل متعین طور پر کسی کی طرف منسوب نہیں ہے اسے بس اہل کوفہ اہل مدینہ سے مرسلاً نقل کرتے ہیں اور اس میں کسی کا نام نہیں لیتے اور وہ اسے لیتے ہیں اگرچہ ان کے لیے تعداد مخصوص ہے۔

اور مدنی اخیر والا عدد ابوجعفر بن یزید بن قعقاع کی طرف منسوب ہے جو کہ قراء عشرہ میں سے ایک تھے نیز شیبہ بن نصاح کی طرف بھی منسوب ہے اسے اسماعیل بن جعفر بن ابوکثیر انصاری نے ان دونوں حضرات سے سلیمان بن حجاز رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے روایت کیا ہے۔

جس نے عدد مدنی اوّل کو ابوجعفر اور شیبہ کی طرف منسوب کیا اور عدد مدنی اخیر کو اسماعیل بن جعفر کی طرف منسوب کیا اسے غلطی لگ گئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اس غلطی میں پڑنے کا سبب یہ ہے کہ بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ نافع نے ان دونوں حضرات سے عدد مدنی اوّل کو روایت کیا اور ابوعمرو رضی اللہ عنہ نے عدد مذکور کو ابوجعفر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا اب ان دونوں حضرات سے اس طرح روایت کرنا اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ اسے ان دونوں کی طرف منسوب کیا جائے جب کہ نسبت مدنی اخیر اگر ان کی طرف منسوب ہو جائے تو اس میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ .... الخ۔

ہم نے یہ باتیں نقل کرنے کا ارادہ اس لیے کیا کہ اس موضوع میں روز روشن کی طرح وضاحت ہو جائے کیونکہ اس میں بعض منقول امور مضطرب ہیں۔

اختلاف کا سبب

اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو سکھلانے کے لیے کہ یہ آیت کا سرا ہے، آیات کے سروں پر وقف کیا کرتے تھے پھر جب انھیں معلوم ہو جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کو مابعد کے ساتھ ملا دیا کرتے تھے تاکہ پورا معنیٰ معلوم ہو جائے اب بعض لوگ سمجھتے تھے کہ جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقف کیا تھا وہ فاصلہ نہیں تھا اس وجہ سے وہ اس پوری عبارت کو ایک آیت سمجھتے ہوئے اسے مابعد کے ساتھ ملا دیتے۔ جب کہ بعض حضرات اسے مستقل آیت سمجھتے اور اسے مابعد کے ساتھ نہیں ملاتے تھے اور آپ جان چکے ہیں کہ اس بارے میں لب کشائی کرنے کی گنجائش ہے اس لیے کہ اس سے قرآن پاک میں کوئی زیادتی یا نقصان لازم نہیں آتا۔

قرآن پاک کی آیات لمبا ہونے یا چھوٹا ہونے میں مختلف ہیں سب سے لمبی آیت، آیت دَین ہے جو سب سے بڑی سورت یعنی سورۃ البقرۃ میں ہے اور سب سے چھوٹی آیت ﴿یٰسٓ ۚ﴾ ہے جو سورۃ ﴿یٰسٓ ۚ﴾ کے شروع میں واقع ہوئی ہے۔

آیات کو پہچاننے کے فوائد

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن پاک کی آیات کو پہچاننے کا کوئی فائدہ نہیں ان کی تردید کے لیے ہم اس کے ایک کی بجائے تین فوائد ذکر کرتے ہیں:

پہلا فائدہ ✿ یہ معلوم ہے کہ ہر تین چھوٹی آیتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہیں، اس طرح وہ بڑی آیت بھی اسی حکم میں ہے جو تین چھوٹی آیات کے برابر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علی الاعلان ایک سورۃ کا چیلنج کیا اور فرمایا کہ:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ (البقرۃ: ۲۳)

"اگر تمہیں اس کلام میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا تو اس جیسی کوئی سورۃ ہی لے آؤ!"

اور "سورۃ" جیسے بڑی سورۃ پر صادق آتی ہے ایسے چھوٹی سورت بھی صادق آتی ہے اور قرآن پاک میں سب سے چھوٹی سورت سورت کوثر ہے جو تین چھوٹی آیات پر مشتمل ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ہر تین چھوٹی آیتیں معجزہ ہیں اور ایک لمبی آیت جو اس کے برابر ہو وہ بھی اس کے درجہ میں ہے۔

دوسرا فائدہ ۞ جن حضرات کی رائے یہ ہے کہ فواصل پر وقف سنت ہے ان کے نزدیک آیت کے سرے پر وقف بخوبی ہو سکے گا۔ ان حضرات کی بناء ایک حدیث کے ظاہر پر ہے جس سے انھوں نے استدلال کیا ہے جسے ابوداؤد نے حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب وقف کرتے تو ایک ایک آیت پر وقف کرتے اور فرماتے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پھر وقف کرتے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ پھر وقف فرماتے ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝﴾ پھر وقف فرماتے۔

صاحب تبیان نے ایک اور مقام پر فرمایا کہ "بعض علماء نے فرمایا کہ: "اس حدیث سے استدلال کرنا جیسا کہ ذکر ہوا اس میں نظر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک حدیث غریب ہے اور اس کی سند بھی متصل نہیں ہے۔ اسے یحییٰ بن سعید اموی وغیرہ نے حضرت ابن جریج سے انھوں نے ابن ابی ملیکہ سے اور انھوں نے حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا جبکہ اصح یہ ہے کہ لیث نے ابن ابی ملیکہ سے انھوں نے یعلیٰ بن مالک سے روایت کیا کہ انھوں نے حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت اور نماز کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ تمہیں ان کی نماز سے کیا واسطہ؟ اس کے بعد انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت ایک ایک حرف کی تفصیل کے ساتھ بیان کی۔ ①

میں کہتا ہوں کہ ان دونوں احادیث کے درمیان تطبیق ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ہر فاصلہ پر وقف کر لیتے اگرچہ معنی تام نہ ہو اس کا مقصد آیات کے سروں کو بتلانا ہوتا تھا اور کبھی وقف میں تمام معنیٰ کی اتباع کرتے تھے اور آیات کے سروں پر وقف کا التزام نہیں کرتے تھے تاکہ ہر ہر حرف کی قرأت واضح ہو جائے۔ اس بناء پر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جہاں لوگوں کو آیات کے بیان کی ضرورت ہوتی وہاں آیات کے سروں پر وقف کرنا بہتر ہے اگرچہ معنی تام نہ ہو اور جہاں لوگوں کو آیات کے سرے پہچاننے کی ضرورت نہ ہو وہاں وقف بہتر نہیں سوائے اس کے کہ معنی تام ہو جائے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ گزشتہ بالا حدیث میں لفظ "مفسرۃ حرفا حرفا" (ایک ایک حرف کو وضاحت سے) مراد ترتیل ہو اور حروف کو ان کے مخارج سے نکالنا ہو اس صورت میں اس حدیث کا دوسری حدیث سے تعارض بھی نہیں ہوگا۔

تیسرا فائدہ ۞ نماز اور خطبہ میں آیات سے باخبر ہونا۔

امام سیوطی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ "آیات، ان کی تعداد اور ان کے فواصل پر احکام شرعیہ مرتب ہوتے ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ جس شخص کو سورۃ فاتحہ نہ آتی ہو اس کے لیے آیات سے باخبر ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ اس پر اس کے بدلے میں سات آیات واجب ہیں۔ نیز اسے خطبہ میں جاننا بھی ضروری ہے اس لیے کہ اس میں پوری ایک آیت کی تلاوت ضروری ہے اگر وہ آیت طویل نہ ہو تو اس کا کچھ حصہ کافی نہ ہوگا اسی طرح اگر طویل ہو پھر بھی اس کا کچھ حصہ کافی نہ ہوگا جیسا کہ جمہور نے اسے محقق کیا ہے۔

---

① ترمذی ثواب القرآن باب ۲۳ ابوداؤد کتاب الوتر ۲۰ نسائی نے افتتاح میں ۱۳، اور قیام اللیل میں ۱۳، مسند احمد ۶ / ۲۹۴

اس کے بعد فرمایا کہ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس سے باخبر ہونا اس سورت میں جو نماز میں پڑھی جاتی ہے یا جو اس کے قائم مقام ہو۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ صبح کی نماز میں ساٹھ آیات سے سو آیات تک پڑھا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قیام اللیل کی قراءت میں اس سے آگاہ ہونا... الخ سوائے اس کے کہ ہذلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "کامل" میں نقل کیا کہ جاننا چاہیے کہ ایک قوم تعداد اور اس کے فوائد سے ناواقف رہی حتی کہ زعفرانی نے فرمایا کہ "بے شک عدد علم نہیں ہے بعض لوگ صرف اپنی دکان چمکانے کے لیے اس میں مشغول ہوئے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس میں وقف کو پہچاننے کے اعتبار سے بہت سے فوائد ہیں اس لیے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ نصف آیت سے نماز صحیح نہیں ہے۔ اور علماء کی ایک جماعت نے فرمایا کہ ایک آیت کافی ہے اور دیگر حضرات نے فرمایا کہ تین آیات اور کچھ لوگوں نے کہا کہ سات آیات کے بغیر چارہ نہیں ہے اور اعجاز ایک آیت سے کم میں واقع نہیں ہوسکتا اور اس میں تعداد کا بہت بڑا فائدہ ہے.... الخ لیکن متعین طور پر ہمیں نہیں معلوم کے ہذلی رحمۃ اللہ علیہ کا اس کلام سے کیا مقصد تھا اور کس مذہب کے بارے میں وہ بات کر رہے ہیں۔

آیاتِ قرآن کی ترتیب

اُمت کا اجماع منعقد ہے کہ قرآن کریم کی آیات کی اس طریقے پر ترتیب جیسے آج ہم دیکھ رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توقیفی ہے اور رائے اور اجتہاد کی اس میں گنجائش نہیں ہے بلکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے پاس آیات لے کر نازل ہوتے اور آپ ﷺ کی قراءت کے بارے میں رہنمائی فرماتے کہ کونسی سورت کی کس آیت کو کہاں رکھے۔ پھر نبی کریم ﷺ انھیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے پڑھا کرتے اور وحی لکھنے والوں کو ان کی کتابت کا حکم دیتے اور ان کے لیے اس سورت کی تعیین کرتے جس میں وہ آیت ہے اور اس سورت میں آیت کی جگہ بھی متعین فرماتے۔ اور آپ ﷺ بار بار ان کے سامنے اس کی تلاوت کرتے کبھی نماز میں، کبھی مواعظ میں اور کبھی حکم و احکام ہیں اور جبریل علیہ السلام آپ ﷺ کے ساتھ ہر سال دور کیا کرتے اور آخری سال دو مرتبہ دور کیا۔ یہ سب اس ترتیب کے مطابق ہوتا تھا جو ہمارے ہاں مصاحف میں ہے اسی طرح ہر وہ شخص جو قرآن پاک کو حفظ کرتا یا صحابہ رضی اللہ عنہم سے قرآن پاک کا کچھ حصہ حفظ کرتا وہ بھی اسی ترتیب کے مطابق کرتا تھا اسی طرح پھیلتا اور شائع ہوتا چلا گیا اس نے مقامات اور لوگوں کے کانوں کو پر کر دیا وہ آپس میں اس کا دور کرتے اور نماز میں اس کی قرأت کرتے ایک دوسرے سے حاصل کرتے اور ایک دوسرے کو سناتے، اسی ترتیب کے ساتھ جو اس وقت قائم ہے۔ قرآن کریم کی آیات کی ترتیب میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا خلفاء راشدین میں سے کسی ایک کا بھی کوئی دخل یا تصرف نہیں تھا بلکہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو جمع ہوا وہ اس سے زیادہ نہیں تھا کہ وہ کھجور کی شاخوں اور پتھروں سے اوراق کی طرف منتقل ہو گیا اور جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جمع قرآن ہوا وہ بھی اس سے بڑھ کر نہیں ہوا کہ وہ صحیفوں سے مصاحف میں منتقل ہوا اور یہ دونوں اسی ترتیب کے موافق تھیں جو محفوظ اور متواتر ہے نبی کریم ﷺ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ ہاں البتہ اس پر پوری طرح اجماع ہو چکا اور اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے اور جنھوں نے اس اجماع کو نقل کیا وہ بھی ایک جماعت ہے جن میں سے ایک علامہ زرکشی ہیں جنھوں نے "البرهان" میں اسے نقل فرمایا اور ابو جعفر

رضی اللہ عنہ ہیں جنھوں نے "المناسبات" میں اسے نقل فرمایا۔ اس کی عبارت یوں ہے (ترجمہ) "سورتوں میں آیات کی ترتیب آپ ﷺ کی توقیف سے واقع ہوئی اور آپ ﷺ نے بغیر کسی اختلاف کے مسلمانوں کے درمیان اس کا حکم دیا۔"

یہ اجماع بہت سی نصوص کی طرف منسوب ہے جن میں سے کچھ آپ کے سامنے قریب ہی گزر چکی ہیں۔ ان میں سے ایک وہ روایت ہے جسے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے حضرت عثمان بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا تھا کہ اچانک آپ ﷺ نے اپنی نظروں کو بلند کیا اور پھر اسے پست کر لیا اس کے بعد فرمایا کہ میرے پاس حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور انھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اس آیت کو سورت کی اس جگہ رکھوں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى ... الخ﴾ (النحل: ۹۰) ①

"خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے ... الخ۔"

ان میں سے ایک وہ روایت ہے جو سنن صحیحہ میں ہے جن میں نبی کریم ﷺ کی مختلف سورتوں کی قرأت کا بیان ہے جیسے سورۃ البقرۃ، سورۃ آل عمران، سورۃ نساء وغیرہ نیز آپ ﷺ کا سورۃ الاعراف کو مغرب کی نماز میں پڑھنا اور سورۃ ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴾ کو اور سورۃ الروم کو صبح کی نماز میں پڑھنا اور سورۃ "السجدہ" اور سورۃ ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ﴾ کو جمعہ کے دن صبح کی نماز میں پڑھنا اور سورۃ "الجمعہ" اور سورۃ "المنافقین" کو جمعہ کی نماز میں پڑھنا اور سورۃ "ق" کو خطبہ میں پڑھنا اور سورۃ "اقترب" کو اور سورۃ "ق" کو عید کی نماز میں پڑھنا۔ آپ ﷺ یہ سب سورتیں آیات کی اسی ترتیب کے مطابق پڑھا کرتے تھے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے مصحف میں دیکھی اور سنی جاتی تھی۔

ان میں سے ایک وہ روایت بھی ہے جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب تفسیر القرآن میں تفسیر سورۃ البقرۃ کے تحت حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ:

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا﴾ (البقرۃ: ۲۳۴)

"وہ لوگ جو تم میں سے وفات پا جائیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں۔"

اسے ایک اور آیت نے منسوخ کر دیا پھر آپ اسے کیوں لکھ رہے ہیں یا اسے لکھی ہوئی کیوں چھوڑ رہے ہیں حالانکہ یہ منسوخ ہے انھوں نے فرمایا کہ اے بھتیجے میں اس میں سے کوئی چیز اپنی جگہ سے بدل نہیں سکتا۔

یہ حدیث روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اس آیت کو منسوخ ہونے کے باوجود اپنے مقام پر رکھنا توقیفی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اعتراف ہے کہ وہ اس میں سے کسی چیز میں تصرف نہیں کر سکتے، اس لیے کہ اس جیسی چیزوں میں رائے کی گنجائش نہیں ہے۔

ان میں ایک وہ روایت بھی ہے جسے امام مسلم نے (کتاب الفرائض میں حدیث نمبر ۹ پر) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے جتنا آیت کلالہ کے بارے میں سوال کیا اتنا کسی بھی چیز کے بارے میں سوال نہیں کیا حتی کہ آپ ﷺ نے میرے سینے میں اپنی انگلی چبھوئی اور فرمایا کہ:

---

① مسند امام احمد ۴/ ۲۱۸

”آپ کو آیت الصیف کافی ہے جو سورۃ النساء کے آخر میں ہے۔“

اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس آیت کی جگہ سورۃ النساء کے اندر بتلادی اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد:

﴿یَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ ؕ ... الخ﴾ (النساء: ۱۷۶) ہے۔

تنبیہ ✿ بعض حضرات نے ذکر کیا کہ کلمات ستتر ہزار نو سو چونتیس ہیں اور بعض نے اس کے علاوہ کہا بعض نے کہا کہ کلمات کے تعداد میں اختلاف کا سبب یہ ہے کہ کلمہ کی ایک حقیقت ہوتی ہے اور ایک مجاز۔ پھر اس کا تلفظ بھی ہوتا ہے اور کتابت بھی اور ان میں سے ہر ایک کا اعتبار جائز ہے۔ اور علماء میں سے جس نے جو بھی تعبیر کی وہ جائز ہے۔ سخاوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: ”میں نہیں جانتا کہ کلمات اور حروف کو شمار کرنے میں بھی کوئی فائدہ ہے اس لیے کہ اگر اس سے کوئی فائدہ ہو تو اس کتاب میں ہو سکتا ہے جس میں کمی بیشی کا احتمال ہو اور قرآن پاک میں یہ چیز ممکن ہی نہیں .... الخ لیکن احادیث میں حروف کا اعتبار ثابت ہے چنانچہ ترمذی نے (کتاب ثواب القرآن باب ۱۶ پر) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا کہ ”جس نے کتاب اللہ کا کوئی حرف پڑھا تو اسے اس کے بدلے ایک نیکی ملے گی اور ایک نیکی کا اجر دس گنا ہوتا ہے، میں نہیں کہتا کہ ﴿الٓمّٓ﴾ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف اور لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے“ نیز طبرانی نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا کہ ”قرآن پاک کے دس لاکھ بیس ہزار حروف ہیں جس نے انھیں صبر کے ساتھ ثواب کی امید رکھتے ہوئے پڑھا تو اسے ہر حرف کے بدلے حور عین میں سے ایک بیوی دی جائے گی“ سیوطی نے اسے ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اس کے راوی ثقہ ہیں سوائے شیخ طبرانی محمد بن عبید بن آدم بن ابو ایاس کے کہ جن کے بارے میں ذہبی رحمہ اللہ نے کلام کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ تعداد جو اس حدیث میں ذکر ہوئی قرآن پاک کی ان آیات پر محمول ہے جن کی کتابت منسوخ ہو چکی ہے۔ اس لیے کہ اس وقت جو قرآن موجود ہے وہ اس تعداد تک نہیں پہنچتا۔ ان کی مراد یہ ہے کہ یہ بڑی تعداد جو اس حدیث میں مروی ہے اس میں قرآن کے عام حروف ملحوظ ہیں جو نازل ہوئے خواہ وہ منسوخ ہوئے یا نہیں ہوئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

شبہہ اور اس کا ازالہ

کہتے ہیں کہ ابوداؤد نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے انھوں نے اپنے ابا جان سے روایت کیا کہ حارث بن خزیمہ رضی اللہ عنہ سورۃ براءت کی آخری ان دونوں آیات کو لے کر آئے اور فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے یہ دو آیات نبی کریم ﷺ سے سنیں اور محفوظ کیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ”میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے یہ دونوں آیات سنی ہیں پھر فرمایا کہ اگر تین آیات ہوتیں تو میں انھیں علیحدہ کر دیتا اب قرآن پاک کی آخری سورۃ کو لکھو اور انھیں اس کے آخر میں لگا دو!“ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ آیات کی ترتیب تمام قرآن میں توقیفی نہیں بلکہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خواہش کے مطابق تھی اور وہ اس میں تصرف کر سکتے تھے اگرچہ بعض میں ہی کیوں نہ ہو۔

جواب ✿ ① یہ خبر قطعی دلیل کے معارض ہے اور وہ قطعی دلیل امت کا اجماع ہے اور قطعی کا معارض ساقط ہوتا ہے جس کا اعتبار نہیں کیا جاتا لہٰذا یہ خبر مردود ہوگی اس کے قائل پر۔

② یہ حدیث ان تمام احادیث کے معارض ہے جو اس کے خلاف پر دلالت کرتی ہیں اور وہ ان گنت ہیں اور ان میں سے اکثر پیچھے گزر چکیں بلکہ ابن ابی داؤد ہی کی اپنی نقل کردہ حدیث بھی اس کے معارض ہے وہ یہ کہ انھوں نے یہ حدیث بھی نقل کی کہ حضرت

ابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے قرآن پاک کو جمع کیا جب وہ سورۃ برأت کی آیت:

﴿ثُمَّ انْصَرَفُوْا ۭ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَھُمْ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ﴾ (التوبہ: ۱۲۷)

تک پہنچے تو انھوں نے سمجھا کہ یہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت ہے جبکہ حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد بھی دو آیتیں پڑھائی ہیں:

﴿لَقَدْ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌ... الخ﴾ (التوبہ: ۱۲۸)

سورتوں کی ترتیب

سورۃ کا معنی: لغت میں سورۃ کا اطلاق کس معنی پر ہوتا ہے اس کے بارے میں ہم صاحب قاموس کا قول ذکر کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ: ((السورۃ اَلْمَنْزِلَةُ، ومن القرآن معروفة، لا نها منزلة بعد منزلة: مقطوعة عن الاخری والشرف وما طال من البناء وحسن وعرق من عروق الحائط)).

"سورۃ کا معنی "منزلت" ہے اور قرآن پاک کی سورتیں مشہور و معروف ہیں اس لیے کہ وہ ایک منزلت کے بعد دوسری منزلت ہے۔ اور "شرف" اور "عمارت کا بلند اور خوبصورت حصہ" اور "علامت" اور دیوار کے ردّوں میں سے ایک ردّا۔"

اس کی اصطلاحی تعریف یوں کی جاسکتی ہے "کہ آیات قرآنی کا ایک مستقل مجموعہ جس کی ابتداء بھی ہو اور انتہا بھی ہو" کہتے ہیں کہ یہ "سوُر البلد" سے مشتق ہے اس لیے کہ اس میں ایک کلمہ کو دوسرے کلمہ کی جانب میں اور ایک آیت کو دوسری آیت کی جانب میں رکھا جاتا ہے جیسے ایک دیوار میں ہر اینٹ کو دوسری اینٹ کے ساتھ رکھا جاتا ہے اور اس کے ہر ردّے کو دوسرے ردے پر قائم کیا جاتا ہے۔

یا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں علو اور معنوی رفعت کے معنی پائے جاتے ہیں جو دیوار کے علو کے اور رفعت کے مشابہ ہیں، یا اس وجہ سے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بچاؤ اور حفاظت ہیں نیز محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ کی کتاب یعنی قرآن اور دین حق یعنی اسلام لے کر آئے ہیں ان کے لیے بھی بچاؤ اور حفاظت ہیں اس اعتبار سے کہ یہ ایک معجزہ ہے جو ہر مقابل کی زبان بند کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے حق کو حق اور باطل کو باطل بنا کر واضح کرتا ہے اگرچہ مجرمین کو ناگوار محسوس ہو۔ یہ سوُر المدنیہ کے بھی مشابہ ہے اس لیے کہ وہ انھیں دشمنوں کے حملے اور گمراہوں کے غلبے سے بچاتی اور حفاظت کرتی ہے۔

قرآن کی سورتیں طویل اور مختصر ہونے میں مختلف ہیں سب سے چھوٹی سورت "سورۃ الکوثر" ہے اور یہ تین چھوٹی آیات پر مشتمل ہے اور سب سے بڑی سورت "سورۃ البقرۃ" ہے اور وہ دوسو پچاس یا دوسو چھیاسی آیات پر مشتمل ہے اور اس کی اکثر آیات لمبی ہیں بلکہ اس میں ایک آیت "آیت الدین" ہے جو قرآن پاک کی سب سے بڑی آیت ہے جیسا کہ گزر چکا اور سورۃ البقرۃ اور سورۃ الکوثر کے درمیان بہت سی سورتیں ہیں جو طوالت، توسط اور اختصار میں مختلف ہیں طویل اور متوسط ہونا اور ابتداء و انتہاء کی حد

بندی کا مرجع اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہوتا ہے۔ جو ایک بلند و بالا حکم کی وجہ سے ہوتا ہے اسے جو جانتا ہے جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ نہیں جانتا۔

سورتیں بنانے کی حکمت

قرآن پاک کی سورتوں کی شکل میں حصے بنانے میں بہت سے فوائد اور حکمتیں ہیں۔

① لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا اور انھیں قرآن پاک کا دور اور حفظ کرنے کا شوق دلانا۔ اس لیے کہ اگر وہ ایک حصے پر ہوتا اور اس کے کئی حصے نہ ہوتے تو اسے یاد کرنا اور سمجھنا دشوار ہو جاتا اور انھیں اس بڑے سمندر میں گھسنا تھکا دیتا جس میں نزدیک سے کوئی بندرگاہ یا کنارہ نظر نہیں آتا۔

② گفتگو کے موضوع یا کلام کے محور پر دلالت ہو جاتی ہے کیونکہ ہر سورۃ میں کوئی نمایاں موضوع ہوتا ہے جس کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے جیسے سورۃ البقرۃ، سورۃ یوسف، سورۃ النمل اور سورۃ الجن وغیرہ۔

③ اس بات کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے کہ قرآن پاک کے اعجاز میں سورۃ کا طویل ہونا شرط نہیں ہے اگرچہ وہ چھوٹی ہونے میں سورۃ الکوثر کی حد تک کیوں نہ ہو۔

④ صاحب کشاف نے قرآن پاک کی تفصیل اور اس کی سورتوں کی شکل میں حصے کرنے کے بہت سے فوائد لکھے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب کسی جنس کے تحت اصناف و انواع ہو جاتی ہیں تو وہ خوبصورت اور عظیم الشان بن جاتی ہے بخلاف اس کے وہ ایک باب ہو۔

⑤ پڑھنے والا جب کوئی سورت یا کتاب کا کوئی باب ختم کرتا ہے پھر دوسری سورت یا باب شروع کرتا ہے تو اسے بشاشت اور خوشی حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنے مقصد کی طرف پھرتی سے رواں دواں ہو جاتا ہے اگرچہ وہ لمبی کتاب میں ہی چلتا رہے اس کی مثال مسافر کی سی ہے کہ جب وہ ایک میل یا فرسخ طے کر لیتا ہے تو اس سے اسے تسلی سکون اور آسودگی ملتی ہے اور مزید چلنے کے لیے ہشاش بشاش ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن پاک کے سیپارے اور اخماس بنائے گئے۔

⑥ حافظ جب کسی سورۃ کو یاد کر لیتا ہے تو اس کا اعتقاد ہو جاتا ہے کہ اس نے کتاب اللہ کے ایک مستقل مجموعے کو حاصل کر لیا اب وہ اپنے یاد شدہ حصے کو بڑا سمجھتا ہے اسی سے متعلق حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ:

"جب کوئی شخص سورت بقرہ اور آل عمران پڑھ لیتا تھا تو وہ ہمارے درمیان بلند مرتبہ اور عظمت والا ہوتا تھا۔"[1]

⑦ اشکال و نظائر کے آملنے اور ان کے ایک دوسرے کے موافق ہونے کے اعتبار سے تفصیل ہو جانا اور اسی کے ذریعے معانی اور نظم بھی آملتے ہیں اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد ہیں۔

---

① مسند احمد ۳/۲۰

سورتوں کی اقسام

علماء کرام نے سورتوں کو چار اقسام میں تقسیم کیا ہے اور ہر ایک کو ایک معین نام کے ساتھ خاص کیا ہے۔ ① طوال ② مئین ③ مثانی ④ مفصل

① طوال سات سورتیں ہیں:

① سورۃ البقرۃ ② آل عمران ③ النساء ④ مائدہ ⑤ الانعام ⑥ اعراف

یہ چھ ہوئیں اور ساتویں میں اختلاف ہے آیا کہ وہ سورۃ انفال اور برأت کا مجموعہ ہے؟ کیونکہ ان دونوں کے درمیان "بسم اللہ" کے ساتھ فصل نہیں ہے یا وہ سورۃ یونس ہے؟

② مئون وہ سورتیں ہیں جن کی آیات سو سے زائد ہیں یا سو کے قریب ہیں۔

③ مثانی وہ سورتیں ہیں جو آیات کی تعداد میں مئین کے قریب قریب ہیں۔ فراء نے کہا کہ یہ وہ سورتیں ہیں جن کی آیات سو سے کم ہوں اس لیے کہ یہ طوال اور مئون کی بنسبت زیادہ مرتبہ بار بار پڑھی جاتی ہیں۔

④ مفصل یہ وہ سورتیں ہیں جو قرآن پاک کے آخر میں ہیں اور یہ کہاں سے شروع ہوتی ہیں اس میں بارہ مختلف اقوال ہیں بعض نے کہا کہ یہ سورۃ "ق" سے شروع ہوتی ہیں اور بعض نے اس کے علاوہ کا قول کیا ہے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کو صحیح قرار دیا کہ یہ سورۃ الحجرات سے شروع ہوتی ہیں انھیں مفصل اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی سورتوں کے درمیان "بسم اللہ" کے ذریعے فصل کثرت کے ساتھ ہوتا ہے بعض نے کہا کہ انھیں مفصل اس لیے کہتے ہیں کہ ان میں سے منسوخ ہونے والی سورتیں کم ہیں اسی وجہ سے انھیں محکم بھی کہتے ہیں۔ جیسا کہ بخاری میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ "جن سورتوں کو تم مفصل کہتے ہو وہ محکم ہیں۔"

مفصل کی تین اقسام ہیں: طوال، اوساط، اور قصار۔ طوال "سورۃ الحجرات" سے "بروج" تک ہیں اور اوساط "سورۃ الطلاق" سے "لم یکن" تک ہیں اور قصار "سورۃ اذا زلزلت" سے قرآن کے آخر تک ہیں۔

سورتوں کی ترتیب میں مذاہب

سورتوں کی ترتیب میں تین اقول ہیں:

① سورتوں کی ترتیب جو اس وقت ہمارے سامنے ہے یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے توقیفی نہیں ہے بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہاد سے ہے۔ یہ قول جمہور علماء کی طرف منسوب ہے۔ جن میں مالک قاضی ابو بکر بھی ہیں جیسا کہ ان دونوں کے اقول کے بارے میں معتمد قول ہے۔ اس مذہب کی طرف ابن فارس نے کتاب "المسائل الخمس" میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "قرآن کو دو طرح سے جمع کیا گیا۔

① سورتوں کی تالیف جیسے سبع طوال کو مقدم کرنا اور مئون کو ان کے بعد لانا یہ وہ کام ہے جسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے انجام دیا۔

② اور دوسرا جمع، سورتوں میں آیات کو جمع کرنا ہے یہ وہ کام ہے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرانجام دیا اور اس طریقے سے سرانجام

دیا جیسے آپ ﷺ کو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنے رب عزوجل کے حکم سے بتلایا۔

ان دونوں کی رایوں پر دو امور سے استدلال کیا گیا ہے۔

پہلی دلیل ایک تو یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو جمع قرآن ہوا اس سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مصاحف سورتوں کی ترتیب میں مختلف تھے اگر یہ ترتیب توقیفی ہوتی اور نبی کریم ﷺ سے منقول ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے قطعاً گنجائش نہ تھی کہ وہ اس سے بے پرواہی برتتے اور اس سے تجاوز کرتے اور اس میں اس طرح اختلاف کرتے جو ہمارے سامنے روایات کے ذریعہ مقرر ہوا ایک طرف حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا مصحف ہے جو سورۃ فاتحہ سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد سورۃ البقرۃ اس کے بعد سورۃ النساء اس کے بعد سورۃ آل عمران اور اس کے بعد سورۃ الانعام ہے۔

اور دوسری طرف حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مصحف ہے کہ جو سورۃ البقرۃ سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد سورۃ النساء پھر آل عمران ہے یعنی شدید اختلاف ہے۔ اور ایک جانب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مصحف ہے جس کی ترتیب نزول کے مطابق ہے سب سے پہلے "اقراء" پھر "ق" پھر "المزمل" اس کے بعد "تبت" اور پھر "التکویر" ہے۔ اسی طرح مکی سورتوں کے آخر تک اور مدنی سورتوں کے آخر تک۔

دوسری دلیل ابن اشتہ نے "المصاحف" میں سند کے ساتھ حضرت ابو محمد القرشی سے روایت کیا کہ انھوں نے فرمایا کہ "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں حکم دیا کہ وہ طوال کا سلسلہ جاری رکھیں انھوں نے سورۃ انفال اور سورۃ التوبہ کو سبع طوال میں شامل کیا اور ان دونوں کے درمیان "بسم اللہ" کے ساتھ فصل کیا... الخ" اس سے شاید اس روایت کی طرف اشارہ ہے جسے امام احمد ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ "میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ تمہیں سورۃ الانفال پر کس نے ابھارا حالانکہ وہ مثانی میں سے ہے اور سورۃ برأت پر کس نے ابھارا حالانکہ وہ مئین میں سے ہے آپ نے ان دونوں کو ملا دیا اور ان دونوں کے درمیان ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کی سطر نہیں لکھی اور تم نے انھیں سبع طوال میں رکھ دیا؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ پر متعدد سورتیں نازل ہوتی تھیں۔ آپ ﷺ پر جب کوئی چیز نازل ہوتی تو اپنے کسی کاتب کو بلاتے اور فرماتے کہ "ان آیات کو اس سورت میں رکھ دو جس میں فلاں فلاں بات لکھی ہوئی ہے" اور سورۃ الانفال مدینہ میں نازل ہونے والی پہلی سورتوں میں سے ہے اور سورۃ البرأت قرآن پاک کی آخر میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے اور ان دونوں کا قصہ ایک دوسرے سے مشابہ ہے، میں سمجھتا تھا کہ یہ بھی اسی سورت کا حصہ ہے آپ ﷺ کا وصال ہو گیا اور آپ ﷺ نے یہ واضح نہیں فرمایا کہ یہ اسی سورت کا حصہ ہے اس وجہ سے میں نے اسے اس کے ساتھ ملا دیا اور ان دونوں کے درمیان ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ نہیں لکھی اور انھیں سبع طوال میں رکھ دیا۔ ①

ممکن ہے کہ اس مذہب کے ساتھ ان احادیث کے ذریعے تجزیہ کیا جائے جو توقیف پر دلالت کرتی ہیں جو قول ثانی کے دلائل میں آپ کے سامنے آرہی ہیں۔ نیز پہلی دلیل کے ساتھ اسی احتمال کے ذریعے بھی تجزیہ ممکن ہے کہ ہوسکتا ہے کہ جن صحابہ رضی اللہ عنہم نے ترتیب میں اختلاف کیا ان کا یہ اختلاف ان کے توقیف کو جاننے سے پہلے ہوا ہو یا یہ اختلاف خاص ان سورتوں میں ہوا ہو جن میں

---

① ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ ۱۲۲، ترمذی تفسیر سورۃ التوبہ، مسند احمد ۱/ ۵۷، مستدرک حاکم ۱/ ۲۲۱

توقیف وارد نہ ہوئی ہو اور جن میں توقیف ہو ان میں اختلاف نہ ہوا ہو اور دوسری دلیل کا تجزیہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ یہ اپنے ورود کے محل کے ساتھ خاص ہے اور وہ محل سورۃ الانفال، توبہ اور یونس ہیں لہٰذا اس سے پورے قرآن پر حکم کو عام کر دینا درست نہ ہو گا۔

دوسرا قول تمام سورتوں کی ترتیب آیات کی ترتیب کی طرح توقیفی ہے ان کی رسول ﷺ نے تعلیم دی ہے اور کسی بھی سورۃ کو آپ ﷺ کے حکم کے بغیر اپنی جگہ نہیں رکھا گیا اس رائے والوں کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس مصحف پر اجماع ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں لکھا گیا اور ان میں سے کسی نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا۔ اور ان حضرات کا اجماع صرف اسی صورت میں تام ہو سکتا ہے کہ جس ترتیب پر انھوں نے اجماع کیا ہے وہ توقیفی ہو اس لیے کہ اگر وہ اجتہاد سے ہوتی تو ان کے اختلاف کی وجہ سے مصاحف والوں کے درمیان بھی یقیناً اختلاف واقع ہوتا لیکن ان میں اختلاف واقع نہیں ہوا بلکہ انھوں نے اختلاف سے گریز کیا اور اپنی ترتیب سے بھی گریز کیا اور اپنے مصاحف سے روگردانی کی اور انھیں جلا دیا اور سب نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف اور ان کی ترتیب کی طرف رجوع کیا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے اپنے مذہب کے لیے روایات کو نقل کیا جیسا کہ وہ دلائل ہیں جن پر اجماع کا دارومدار ہے۔

ان میں سے ایک روایت وہ ہے جسے امام احمد اور ابوداؤد نے حضرت حذیفہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا وہ فرماتے ہیں کہ "میں بھی اس وفد میں تھا جو ثقیف قبیلہ میں سے اسلام لایا تھا..... آگے فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ پر قرآن پاک کا ایک حزب پڑھنے سے رہ گیا تھا میں نے چاہا کہ جب تک اسے پورا نہ کرلوں اس وقت تک باہر نہ نکلوں ہم نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ تم قرآن پاک کے حزب کس طرح کرتے تھے انھوں نے کہا کہ تین سورتیں، پانچ سورتیں، سات سورتیں، نو سورتیں، گیارہ سورتیں، تیرہ سورتیں۔ اور مفصل کا ایک حزب جو کہ سورۃ "قٓ" سے قرآن پاک کے آخر تک ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ یہ دلیل ہے کہ سورتوں کی ترتیب جیسے اس وقت مصاحف کے اندر ہے رسول اللہ ﷺ کے دور میں بھی اسی طرح تھی۔ ①

لیکن ہمارے سمجھنے کے مطابق یہ دلالت واضح نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہی مدد مانگتے ہیں اس اعتراض سے نکلنے کے لیے مگر یہ کہ یہ حدیث حزب مفصل کے بارے میں خاص ہو بخلاف باقی احزاب کے۔

ان لوگوں نے اپنے مذہب کے لیے اس بات سے بھی استدلال کیا ہے کہ قرآن میں جو ہم جنس سورتیں ہیں ان میں ترتیب اور لگاتار پڑھنے کا التزام نہیں ہے اگر معاملہ اجتہاد کے ساتھ ہوتا تو اس تجانس وتماثل کا ہمیشہ لحاظ کیا جاتا حالانکہ ایسا نہیں ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ مسبّحات کے درمیان لگاتار ہونا مرتب نہیں ہے حالانکہ ان میں آپس میں مماثلت ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے ساتھ شروع کیا گیا ہے بلکہ ان سورتوں کے درمیان سورۃ قد سمع، الممتحنة اور المنافقون کے ذریعے فصل کیا گیا ہے۔ نیز یہ بھی دلیل ہے کہ طٰسٓمٓ الشعراء اور طٰسٓمٓ القصص کے درمیان بھی مماثلت ہے لیکن یہ ایک دوسرے کے بعد نہیں آئیں بلکہ ان دونوں کے درمیان ان سے بھی چھوٹی سورت کے ذریعے فصل کیا گیا ہے اور وہ سورت "طٰسٓ" ہے۔ ابوجعفر نحاس رحمہ اللہ نے بھی اس مذہب کی تائید کی ہے اور فرمایا کہ: "مختار یہ ہے کہ اس ترتیب پر سورتوں کی تالیف رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہے جس کی دلیل حضرت واثلہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ:

① مسند امام احمد ۴/۹ ابوداؤد فی شہر رمضان ۹

((اعطیت مکان التوراۃ السبع الطوال)).

"مجھے توارت کی جگہ سبع طوال ملی ہیں۔"

اسی طرح ابوبکر انباری نے بھی اس مذہب کی تائید کی اور فرمایا کہ:

"اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو آسمان دنیا کی طرف نازل کیا اس کے بعد بیس سال سے زائد عرصہ میں اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا چنانچہ کسی پیش آنے والے معاملے کے بارے میں کوئی سورت نازل ہوتی اور کسی پوچھنے والے کے جواب کے طور پر کوئی آیت نازل ہوتی اور جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کو اس سورۃ، آیات یا حروف کی جگہ سے آگاہ فرماتے یہ سب کچھ نبی کریم ﷺ کی طرف سے ہوتا تھا اب جس نے بھی کوئی سورت مقدم کی یا مؤخر کی اس نے قرآن پاک کی ترتیب خراب کر دی۔"

ابن اشتہ نے کتاب "المصاحف" میں ابن وہب عن سلیمان بن بلال کی سند سے نقل کیا کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے ربیعہ کو سنا ان سے پوچھا جا رہا تھا سورۃ البقرۃ اور آل عمران کو مقدم کیوں کیا گیا حالانکہ ان سے پہلے اسی سے بھی زائد سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں اور یہ سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں؟ انھوں نے فرمایا کہ انھیں مقدم کیا حالانکہ قرآن پاک کو اس کی اجازت سے تالیف کیا گیا جس نے اس کی تالیف کی ہے.... یہاں تک کہ فرمایا کہ یہ وہ چیز ہے جس پر اکتفاء کیا جاتا ہے سوال نہیں کیا جاتا۔

اس مذہب کا تجزیہ مندرجہ ذیل طریقوں سے ممکن ہے۔

① جو روایت انھوں نے پیش کی ہے یہ اور ان جیسی مثالیں اپنے محل کے ساتھ خاص ہوتی ہیں لہٰذا توقیف کا حکم تمام کی طرف راجع نہیں ہو سکتا پھر یہ بھی ہے کہ یہ ترتیب کے توقیفی ہونے کا فائدہ دینے میں ظنی ہے۔

② حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث جو قول اول کے بارے میں گزر چکی واضح ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے "سورۃ الانفال، التوبہ اور یونس کی ترتیب میں اجتہاد کیا تھا۔

③ اجماع جس کا انھوں نے سہارا لیا تمام سورتوں کی ترتیب کے توقیفی ہونے پر دلالت نہیں کرتا اس لیے کہ اجماع میں شرط نہیں ہے کہ وہ تمام سورتوں کی ترتیب میں کسی نص کا سہارا لے بلکہ اتنا کافی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو انھی کا اجتہاد جس کی وہ توفیق دیے گئے اس بات پر محمول کرے کہ وہ سورتوں کے بارے میں عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی ترتیب پر اجماع کر لیں اور اپنے مصاحف کی ترتیب کو چھوڑ دیں تا کہ امت کا کلمہ ایک ہو جائے اور فتنہ و نزاع کی جڑ ہی کٹ جائے۔ جب کہ ہر ایک کی رائے کو اس ترتیب پر چھوڑ دیا جائے۔

تیسرا قول: بعض سورتوں کی ترتیب نبی کریم ﷺ کی طرف سے توقیفی تھی اور بعض کی ترتیب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہاد سے تھی۔ اس رائے کی طرف بڑے بڑے علماء گئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ سب سے زیادہ بہتر رائے ہو۔ اس لیے کہ بہت سی احادیث ایسی وارد ہوئی ہیں جو بعض سورتوں کی ترتیب کا فائدہ دیتی ہیں۔ جیسا کہ رائے ثانی یعنی توقیف کے قائلین کی رائے میں گزر چکا اور دوسری بعض احادیث ایسی گزریں جو توقیف کا فائدہ دیتی ہیں بلکہ بعض آثار وارد ہوئے ہیں جو تصریح کرتے ہیں کہ بعض سورتوں میں ترتیب اجتہاد کی وجہ سے تھی جیسے ابھی حدیث گزری جو قول اوّل کے بارے میں تھی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

البتہ اس مذہب کی تائید کرنے والے اس بارے میں اختلاف کرتے ہیں کہ کن سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے اور کن کی اجتہاد سے ہے؟ چنانچہ قاضی ابو محمد بن عطیہ نے فرمایا کہ: "اکثر سورتوں کی ترتیب نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ہی معلوم تھی جیسے سبع طوال ﴿حٰمٓ﴾ والی سورتیں اور مفصل، ان کے علاوہ باقی سورتوں کے بارے میں ممکن ہے کہ ان کا معاملہ امت کے سپرد کر دیا گیا ہو۔

ابو جعفر بن زبیر نے فرمایا کہ آثار، ابن عطیہ کی عبارت سے بڑھ کر شہادت دیتے ہیں اور ان میں بہت ہی قلیل سورتیں رہ جاتی ہیں جن میں اختلاف کا جاری ہونا ممکن ہو، جیسے آپ ﷺ کا قول کہ "زہراوین کو پڑھو! یعنی سورۃ البقرۃ اور آل عمران کو۔"①

جیسے حضرت سعید بن خالد رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ:

"رسول اللہ ﷺ نے ایک رکعت میں سبع طوال کو پڑھا۔"②

اور اس میں یہ بھی ہے کہ "آپ ﷺ ایک رکعت میں مفصل کو جمع کرتے تھے" اور امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ آپ ﷺ نے "بنی اسرائیل"، "کہف"، "مریم"، "طٰہٰ"، اور "انبیاء" کے بارے میں فرمایا کہ "یہ عتاق اوّل میں سے ہیں اور یہ میری پرانی یاد کردہ سورتیں ہیں۔" انھوں نے بھی نسق میں اسی ترتیب کے مطابق پڑھا جو ترتیب قائم ہے۔ نیز صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ جب بھی رات کو اپنے بستر پر تشریف لاتے تو ہر رات کو (یہ عمل کرتے کہ) اپنی دونوں ہتھیلیوں کو جمع کرتے اور ان میں پھونک مارتے اور ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝﴾ اور معوذتین پڑھتے۔③

سیوطی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ "شرح صدر جس مذہب کی طرف ہوتا ہے وہ بیہقی کا مذہب ہے، وہ یہ کہ سورۃ براءت اور انفال کے علاوہ تمام سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے اور یہ مناسب نہیں کہ کسی سورۃ کو پہلے پڑھنے سے استدلال کیا جائے کہ اس کی ترتیب بھی اسی طرح ہے۔ اس سورت میں سورۃ نساء کو آل عمران سے پہلے پڑھنے والی حدیث کے ذریعے اعتراض لازم نہیں آئے گا اس لیے کہ قراءت میں سورتوں کی ترتیب واجب نہیں ہے اور ممکن ہے کہ یہ بیان جواز کے لیے کیا ہو۔

ہر حال میں معاملہ نرم ہے حتیٰ کہ زرکشی رحمہ اللہ نے اس اختلاف کو لفظی بنانے کی کوشش کی اور فرمایا کہ "دونوں فریقوں (یعنی یہ کہنے والے کہ ترتیب اجتہاد سے ہے اور یہ کہنے والے کہ ترتیب توقیفی ہے) کے درمیان اختلاف لفظی ہے، اس لیے کہ دوسرے قول والے کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ان کی طرف اس ترتیب کا اشارہ کیا اس لیے کہ انھیں اس کے اسباب نزول اور مواقع کلمات کا علم تھا اسی وجہ سے مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ انھوں نے قرآن پاک کو اسی ترتیب پر جمع کیا جسے وہ نبی کریم ﷺ سے سنا کرتے تھے حالانکہ ان کا قول ہے کہ سورتوں کی ترتیب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع کی وجہ سے تھی لہٰذا اختلاف اس طرف لوٹے گا کہ یہ توقیف قولی کی وجہ سے ہے یا محض اسناد فعلی کی وجہ سے ہے اس لیے کہ اس میں ان کے لیے غور و فکر کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے اس بارے میں جعفر بن زبیر نے سبقت کی ہے۔

---

① مسلم فی کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرھا حدیث ۲۵۲

② مصنف ابن ابی شیبہ

③ بخاری کتاب فضائل القرآن باب ۱۴

ترتیب کا احترام

خواہ سورتوں کی ترتیب توقیفی ہو یا اجتہادی ہر صورت میں اس ترتیب کا احترام ضروری ہے خصوصاً مصاحف کی کتابت میں اس لیے کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع کی وجہ سے ہے اور اجماع حجت ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ اس ترتیب کا خلاف فتنہ کا باعث ہوگا اور فتنہ کا ازالہ اور فساد کے ذرائع کو روکنا واجب ہے۔

بہر حال تلاوت میں سورتوں کی ترتیب واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔ آپ کی خدمت میں امام نووی رحمہ اللہ کا قول پیش کیا جاتا ہے کیونکہ ان کی کتاب "التبیان" میں اس موضوع کے بارے میں آیا ہے اس کی عبارت مندرجہ ذیل ہے:

(ترجمہ) علماء نے فرمایا کہ:

((الاختیار ان یقرأ علی ترتیب المصحف... الخ)).

یعنی پسندیدہ یہی ہے کہ اسی ترتیب پر پڑھا جائے چنانچہ پہلے سورۃ فاتحہ، پھر بقرہ، پھر آل عمران اور پھر ان کے بعد والی سورتیں ترتیب کے مطابق پڑھی جائیں خواہ قرأت نماز میں ہو یا غیر نماز میں، یہاں تک کہ ہمارے بعض اصحاب نے فرمایا کہ جب پہلی رکعت میں سورۃ ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝﴾ پڑھے تو دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ بقرہ پڑھے۔

ہمارے بعض اصحاب نے فرمایا کہ جب کوئی سورت پڑھے تو اس کے بعد والی سورت پڑھنا مستحب ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ مصحف کی یہ ترتیب کسی حکمت کی وجہ سے ہی ہے اس لیے ان کی محافظت کرنا چاہیے سوائے اس کے کہ شریعت میں اس کا کوئی استثناء وارد ہوا ہو، جیسے جمعہ کے دن صبح کی نماز کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ پہلی رکعت میں سورۃ السجدہ اور دوسری رکعت میں ﴿هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ﴾ وارد ہوئی ہیں، اور نماز عید کے بارے میں پہلی رکعت میں ق اور دوسری رکعت میں ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ﴾ پڑھنا وارد ہوئی ہیں اسی طرح فجر کی دو رکعتوں کے بارے میں پہلی رکعت میں ﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾ اور دوسری رکعت میں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝﴾ وارد ہوئی ہیں۔ اور وتر کی رکعات میں پہلی میں ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَی ۝﴾ دوسری میں ﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾ اور تیسری میں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝﴾ اور معوذتین وارد ہوئی ہیں۔

اگر لگاتار پڑھنے کو چھوڑ دے اور کوئی ایسی سورت پڑھے جو پہلی سورت کے ساتھ ملی ہوئی نہیں ہے یا ترتیب کو چھوڑ دے اور پہلے والی سورت کو پڑھ لے تو اس بارے میں بھی بہت سے آثار وارد ہوئے ہیں۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے صبح کی پہلی رکعت میں سورۃ الکہف اور دوسری میں سورۃ یوسف پڑھی۔

ایک جماعت نے مصحف کی ترتیب کی مخالفت کو مکروہ قرار دیا۔ ابن ابو داؤد نے حسن سے روایت کیا کہ وہ قرآن پاک کو مصحف کی تالیف کے علاوہ پڑھے جانے کو مکروہ سمجھتے تھے اور وہ اپنی صحیح سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھیں کہا گیا کہ فلاں شخص قرآن پاک کو الٹا پڑھتا ہے انھوں نے فرمایا کہ اس کا دل الٹا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ سورۃ کو آخر سے اول تک پڑھنا کیسا ہے؟ یہ بالکل ممنوع اور قطعی ممنوع ہے اس لیے کہ اس سے اعجاز کی

بعض قسمیں ختم ہو جاتی ہیں اور آیات کی ترتیب کی حکمتیں زائل ہو جاتی ہیں چنانچہ ابن ابی داؤد ایک جلیل القدر تابعی امام نخعی رحمہ اللہ اور امام مالک بن انس رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ یہ حضرات اسے مکروہ سمجھتے تھے اور مالک اسے عیب دار سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ:

((هذا عظيم)). "یہ بڑی سنگین بات ہے۔"

"جبکہ بچوں کو مصحف کے آخر سے اوّل تک تعلیم دینا اچھا ہے اور یہ اس باب سے نہیں ہے اس لیے کہ یہ ایک زائد قرأت ہے جو چند گنے چنے ایام میں ہوتی ہے جس کے ذریعے انھیں حفظ کرنا آسان ہو جاتا ہے واللہ اعلم۔"

دو چھوٹے اشکال ① قرآن پاک کی ترتیب توقیفی کیسے تھی حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مصاحف مختلف تھے۔؟

جواب جو لوگ کہتے ہیں کہ تمام سورتوں کی ترتیب اجتہادی ہے ان پر تو یہ شبہ وارد نہیں ہو سکتا اور جو لوگ کہتے ہیں قرآن پاک کے کچھ حصے کی ترتیب اجتہادی ہے اور کچھ کی ترتیب توقیفی ہے ان کی طرف سے آسان جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان جو اختلاف واقع ہوا وہ اجتہادی قسم میں ہوا توقیفی میں نہیں ہوا۔

اور جو لوگ کہتے ہیں کہ تمام سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے ان کی طرف سے جواب اس طرح ممکن ہے کہ انھوں نے جو اختلاف کیا وہ توقیف کے علم سے پہلے کیا تھا جب عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کو اس ترتیب پر جمع کیا تو انھیں بھی اس چیز کا علم ہو گیا جسے وہ نہیں جانتے تھے اسی وجہ سے انھوں نے اپنے مصاحف کی ترتیب کو چھوڑ دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ترتیب کو اختیار کر لیا۔ ان کے مصاحف میں اختلاف کا معاملہ اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ انفرادی مصاحف تھے وہ مصاحف انھوں نے لوگوں کے لیے نہیں لکھے تھے بلکہ اپنے لیے لکھے تھے۔ اب یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان میں سے کوئی بھی شخص ان میں کچھ لکھتا تھا تو صرف وہی لکھتا تھا جو اسے اس کے انفرادی اجتہاد کے ذریعے پہنچا کبھی اس سے کوئی ایسی چیز بھی فوت ہو جاتی جو اس کے علاوہ کسی اور سے فوت نہیں ہوتیں بوجہ کسی دقیق تحقیق یا وسیع علم کے اسی وجہ سے ان انفرادی مصاحف میں کچھ ایسی آیات بھی ملتی تھیں جو منسوخ ہو چکی تھیں اور کبھی اس مصحف والے کو اس کا نسخ ہونا پہنچا نہیں ہوتا تھا اور کبھی اس مصاحف والا اسے اسی طرح چھوڑ دیتا تھا کیونکہ اس کا نسخ مشہور ہو چکا ہوتا تھا اور اسے ختم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ جیسا کہ وارد ہوا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نسخہ میں فاتحہ نہیں تھی بعض اوقات مصحف والا اپنے مصحف میں کوئی ایسی بات لکھ دیتا جو قرآن نہیں ہوتی تھی بلکہ کسی ضرورت کی وجہ سے لکھتا تھا جیسا کہ قنوت حنفیہ میں گزر چکا کسی صحابی نے اپنے مصحف میں کچھ لکھا ہوا تھا اور اس کا نام سورت الخلع والحفد رکھا ہوا تھا۔

دوسرا شبہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک کی ترتیب کیسے توقیفی ہو سکتی ہے حالانکہ پیچھے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سورۃ الانفال اور سورۃ برأت کے بارے میں کچھ نہیں سنا بلکہ وہ ان کا اجتہاد اور نظر و فکر تھا۔

جواب جو لوگ کہتے ہیں کہ ترتیب اجتہادی ہے ان کے قول کے مطابق تو یہ شبہ وارد ہی نہیں ہوتا اور جو لوگ کہتے ہیں کہ کچھ ترتیب اجتہادی ہے اور کچھ توقیفی ان کے قول کے مطابق بھی اشکال وارد نہیں ہوتا اوّل تو ظاہر ہے اور ثانی اس لیے نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہاد قرآن پاک کے اس حصے کے بارے میں تھا جس کی ترتیب کے بارے میں شارع کی طرف سے توقیف وارد نہیں ہوئی تھی۔

اور جن لوگوں کا قول ہے کہ تمام سورتیں توقیفی ہیں انھوں نے اس شبہ کے دو جواب دیے ہیں۔

① حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اس کے راوی امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تخریج میں فرمایا کہ یہ "حسن غریب" ہے یہ یزید فارسی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند کے علاوہ کسی بھی سند سے معروف نہیں ہے اور یہ "یزید" مجہول الحال ہے اس لیے اس کی اس حدیث پر اعتماد نہیں کیا جائے گا جو ترتیب قرآنی میں منفرد ہے۔

② اس کے صحیح ہونے کو فرض کر لیا جائے تو بھی ممکن ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو جواب دینا توقیف کو جاننے سے پہلے تھا اس کے بعد انھیں علم ہو گیا۔ لیکن اس جواب پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ روایت سے مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جواب جمع قرآن اور ترتیب سور کے بعد تھا تو پھر توقیفی کیسے ہو گیا حالانکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جامع اور مرتب ہیں اور توقیف کی دلیل نہیں جانتے؟

بحث ⑮

قرآن پاک کی کتابت، رسم، مصاحف اوران کے متعلقات کے بیان میں

① کتابت

یہ بات تو مشہور ومعروف ہے کہ امت عربیہ امیت کے لقب سے موسوم تھی اس بات کے ساتھ مشہور تھی کہ وہ نہیں جانتی تھی کہ کتابت کیا ہے اور خط کیا ہے اور قرآن پاک بھی اس امت کی امیت کو بیان کرتے ہوئے اس طرح گویا ہے کہ:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ١ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍۙ۰۰۲﴾ (الجمعۃ:۲)

"وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے (محمد کو) پیغمبر بنا کر بھیجا جو ان کے سامنے اسکی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور انہیں (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔ اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔"

اس قاعدہ سے قریش کے بہت ہی قلیل لوگ مستثنیٰ تھے جنھوں نے اسلام سے پہلے لکھنا سیکھا اور پڑھا گویا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارہاص اور نبی کریم ﷺ کی بعثت کی تمہید، دین اسلام کی تثبیت اور قرآن کے ذریعے آپ ﷺ پر نازل ہونے والی وحی کی تسجیل تھی اس لیے کہ کتابت "تنزیل مقدس" کو محفوظ اور ضبط کرنے کا اعلیٰ سبب ہے اور اس کا ضائع ہونا بھول جانا اس میں زیادہ بعید ہوتا ہے۔

مؤرخین کے الفاظ متفق ہیں کہ قریش مکہ نے خط وکتابت حرب بن امیہ بن عبد شمس کے علاوہ کسی بھی راستے نہیں سیکھی لیکن حرب نے کس سے سیکھی اس میں اختلاف ہے چنانچہ ابو عمرو دانی ذکر کرتا ہے کہ اس نے عبداللہ بن جدعان سے خط وکتابت سیکھی اور زیاد بن انعم اس بارے میں یوں گویا ہے کہ "میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ اے قریش کی جماعت! کیا تم زمانہ جاہلیت میں عربی اس طرح لکھا کرتے تھے جس میں تم وہ چیزیں جمع کرتے ہو جو جمع ہیں اور ان چیزوں کو متفرق کرتے ہو جو متفرق ہیں الف لام اور میم کے ساتھ تم ہجاء کرتے ہو اور شکل وتقطیع بناتے ہو اور جو بھی چیزیں آج لکھی جاتی ہیں تم لکھتے ہو؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں میں نے عرض کیا کہ تمہیں کس نے کتابت سکھلائی؟ فرمایا کہ حرب بن امیہ نے میں نے عرض کیا کہ حرب بن امیہ کو کس نے سکھلایا؟ انھوں نے فرمایا کہ عبداللہ بن جدعان نے میں نے کہا کہ عبداللہ بن جدعان کو کس نے سکھلایا؟ فرمایا کہ اہل انبار نے میں نے عرض کیا کہ اہل انبار کو کس نے سکھلایا؟ فرمایا کہ ایک آنے والے نے جو ان کے پاس یمن کے پہاڑوں کی طرف سے آیا تھا میں نے عرض کیا کہ اسے کس نے سکھلایا فرمایا کہ خلجان بن موہم نے جو اللہ تعالیٰ کے نبی ہود علیہ السلام کا کاتب تھا۔

جبکہ کلبی کی روایت ہمارے سامنے یہ بیان کرتی ہے کہ حرب نے کتابت بشیر بن عبدالملک سے سیکھی اور اس روایت میں عوانہ کہتے ہیں کہ "سب سے ہمارے اس خط یعنی خط جزم میں جس نے لکھا وہ مرامر بن مرہ، اسلم بن سدرۃ اور عامر بن جدرہ ہیں وہ

عرب کے قبیلے طیِّ سے تھے انھوں نے سیدنا ہود علیہ السلام کے کاتب وحی سے سیکھا پھر انہوں نے اہل انبار کو سکھلایا اور انھی سے کتابت عراق، حیرہ وغیرہ میں پھیل گئی پھر اسے دومۃ الجندل والے اکیدر بن عبدالملک کے بھائی بشر بن عبدالملک نے سیکھا اسے حرب بن امیہ کی صحبت حاصل تھی اس لیے کہ اس کی تجارت ان کے ہاں عراق کے علاقے میں تھی چنانچہ حرب نے اس سے کتابت سیکھ لی اس کے بعد بشر اس کے ساتھ سفر کرتے ہوئے مکہ آیا اور اس نے صہباء بنت حرب کے ساتھ نکاح کر لیا یہ ابوسفیان کی بہن تھی چنانچہ اہل مکہ کی ایک جماعت نے اس سے کتابت سیکھ لی۔"

اسی وجہ سے ایک تعداد ملتی ہے جو اسلام سے قبل ہی لکھنا پڑھنا جانتی تھی لیکن امیوں کے اتنے بڑے جمگھٹے کے سامنے یہ ایک چھوٹی سی مقدار تھی۔ اس بارے میں اہل دومۃ الجندل کا ایک شخص قریش پر احسان جتلاتے ہوئے کہتا ہے کہ:

لا تجحدوا نعماء بشر علیکم — فقد کان میمون النقیبۃ ازھرا
تم اپنے اوپر ہونے والے بشر کے انعام کو نہ جھٹلاؤ — وہ بابرکت اور صاف شفاف رائے والا تھا

اتاکم بخط الجزم حتی حفظتمو — من المال ما قد کان مبعثرا
وہ تمہارے پاس خط جزم لے کر آیا یہاں تک کہ تم نے محفوظ کر لیا — بہت سا مال جو کہ منتشر اور بکھرا ہوا تھا

فاجریتم الاقلام عودا و بداۃ — وضاھیتمو کتاب کسری و قیصرا
تم نے قلم چلائے ابتداء میں بھی اور دوہرائی میں بھی — اور تم کسریٰ اور قیصر کے کاتبین کے مشابہ ہو گئے

واغنیتم عن مسند الحی حمیر — وما زبرت فی الصحف اقلام حمیر
تم حمیر قبیلے کی مسند سے بھی مستغنی ہو گئے — اور حمیر کے قلموں نے مصاحف میں جو کچھ لکھا ان سے بھی مستغنی ہو گئے

یہ تو اہل مکہ تھے جبکہ اہل مدینہ کے درمیان اہل کتاب یہودی تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ان میں ایک یہودی بچوں کو کتابت سکھلاتا تھا اور ان میں دس سے بھی زائد افراد تھے جو کتابت اچھی طرح جانتے تھے جن میں سے منذر بن عمرو، ابی بن وہب، عمرو بن سعید اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ اور یہی زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہیں جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہود سے کتابت سیکھی۔

اسلام میں کتابت کا مقام

پھر اسلام آیا اور امیہ نے عربوں کے ساتھ جو لڑائیاں لڑی تھیں لڑیں اور انھیں مٹانے کی کوشش کی اور کتابت کی شان بڑھنے لگی اور اس کا مقام بلند ہونے لگا۔ اگر آپ کو کوئی شک ہے تو دیکھیں یہ قرآن پاک کی وہ آیات ہیں جو شروع میں نازل ہوئیں ان میں حق تعالیٰ قلم کی مدح سرائی کرتا ہے اور قلم کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جو سکھلاتا ہے اس کی مدح سرائی کرتا ہے چنانچہ فرماتا ہے کہ:

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ ﴾ (العلق:۱-۵)

"(اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو۔ جس نے (عالم کو پیدا کیا) جس نے انسان کو خون

کی پھٹکی سے بنایا۔ پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔"

اور ادھر سورۃ "ن" ہے جس میں اللہ تعالیٰ قسم کھا رہا ہے قلم کی اور جو وہ (قلم کے ذریعے) لکھتے ہیں اس کی چنانچہ فرمایا ہے کہ:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝﴾ (القلم: ۱، ۲)

"ن قلم کی اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم۔ کہ (اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم اپنے پروردگار کے فضل سے دیوانے نہیں ہو۔"

ادھر رسول اللہ ﷺ ہے جو اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو خط سیکھنے اور کتابت میں مہارت حاصل کرنے پر آمادہ کر رہے ہیں اور ان کے لیے ہر ممکن شرعی وسیلے مہیا کر رہے ہیں۔

حتیٰ کہ وارد ہوا ہے کہ غزوہ بدر میں ساٹھ مشرک قید ہوئے آپ ﷺ ان میں سے کسی ایک سے جو فدیہ قبول کرتے ان میں سے یہ بھی ہوتا کہ میرے صحابہ میں سے دس کو خط و کتابت سکھلاؤ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنے عمل سے یہ اعلان کر دیا کہ پڑھنا اور لکھنا حریت کے برابر ہیں۔ یہی وہ انتہا تھی جس کے نتیجہ میں ایک اُمت غلامی سے آزادی حاصل کر پائی۔

اسی طرح کے طریقے سے امیت کے اندھیرے اسلام کے انوار سے ختم ہونا شروع ہو گئے اور اس کی جگہ علم، کتابت اور قراءت آ گئے اس سے یہ بات بہت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام علم، شہریت اور تمدن کا دین ہے۔

نبی کریم ﷺ پڑھتے لکھتے تھے

یہاں تک کہا گیا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی آخری عمر میں پڑھنا لکھنا بھی سیکھ لیا تھا جب کہ حجت قائم ہو چکی اور آپ ﷺ کا کلمہ بلند ہو چکا اور عرب چیلنج کے مقام پر قرآن جیسی کوئی بھی سورت لانے سے عاجز آ گئے گویا کہ اس میں حکمت یہ تھی کہ خط و کتابت کے شرف کی طرف اشارہ ہو جائے اور رسول اللہ ﷺ کی امیت جو شروع عمر میں تھی وہ وقتی حالت تھی جس کا تقاضا اقامت دلیل اور اعجاز نے کیا تھا جو محمد ﷺ کی نبوت اور رسالت اور واضح کرنے والی تھی اور اس بات کی وضاحت کرنی والی تھی کہ آپ ﷺ حق کے ساتھ مبعوث ہیں جنھیں حق تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی طرف بھیجا۔ اگر اس وقت آپ ﷺ پڑھنے لکھنے والے ہوتے اور امت ان پڑھ ہوتی تو ان کا شبہ پھیل جاتا کہ آپ ﷺ جو کچھ لائے ہیں وہ اطلاع و درس کا نتیجہ ہے اور کتابوں میں نظر و فکر اور بحث کا نتیجہ ہے۔

اس معنی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾ (العنکبوت: ۴۸، ۴۹)

"اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے ایسا ہوتا تو اہل باطل ضرور شک کرتے۔ بلکہ یہ روشن آیتیں ہیں جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے ان کے سینوں میں (محفوظ) ہیں ہماری آیتوں سے وہی لوگ

انکار کرتے ہیں جو بے انصاف ہیں۔"

علامہ آلوسی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کے بعد فرماتے ہیں کہ "اس بات میں اختلاف ہے کہ آپ ﷺ نبوت کے بعد پڑھتے لکھتے تھے یا نہیں؟ بعض نے کہا کہ آپ ﷺ اچھی طرح سے کتابت نہیں کر سکتے تھے "التھذیب" میں بغوی رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا اور فرمایا کہ یہ اصح ہے اور بعض حضرات نے دعویٰ کیا کہ آپ ﷺ کتابت کو نہیں جانتے تھے لیکن بعد میں جاننے والے بن گئے تھے۔ اور اسے نہ جاننا معجزہ کے سبب تھا جو اس آیت میں بیان ہوا جب قرآن نازل ہو گیا اور شک کرنے کا معاملہ ظاہر ہو گیا تو اس وقت آپ نے کتابت سیکھ لی۔

ابن ابی شیبہ وغیرہ نے روایت کیا کہ: "آپ ﷺ نے جب تک پڑھ لکھ نہیں لیا تھا اس وقت تک آپ ﷺ کو موت نہیں آئی تھی" شعبی رحمہ اللہ نے بھی اسے نقل کیا اور اس کی تصدیق کی اور فرمایا کہ میں نے بہت سی اقوام کو یہ کہتے سنا اور آیت میں بھی اس کے منافی کچھ نہیں ہے۔

ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس رات مجھے سیر کرائی گئی جنت کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا کہ "صدقہ دس گنا اور قرض اٹھارہ گنا" ① پھر فرمایا کہ "کتابت کے لیے بہت سی احادیث شاہد ہیں جو بخاری وغیرہ میں موجود ہیں جیسا کہ صلح حدیبیہ میں وارد ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے خط کو پکڑا آپ ﷺ ٹھیک طرح سے لکھ نہیں سکتے تھے چنانچہ آپ ﷺ نے لکھا کہ یہ محمد بن عبداللہ کا فیصلہ ہے۔" ②

یہ مذہب ابوذر عبد بن احمد ہروی، ابو فتح نیساپوری اور مغاربہ میں سے ابو الولید باجی کا ہے انھوں نے اسے سمنانی سے نقل کیا اور اس میں ایک کتاب لکھی اس کی طرف ابن منیہ نے سبقت کی۔ ابو الولید نے جب یہ کہا تو انھیں طعنہ دیا گیا اور زندیق ہونے کی تہمت لگائی گئی اور ممبر پر گالیاں دی گئیں اس کے بعد ان کے لیے مجلس قائم کی گئی اور انھوں نے اپنے دعویٰ پر دلیل قائم کی اسے اطراف کے علماء کی طرف لکھا گیا اور انھوں نے بھی انھی کے موافق جواب دیے اور آپ ﷺ کے امی ہونے کے بعد کتابت کو جان لینا معجزہ کے منافی نہیں بلکہ یہ ایک اور معجزہ ہے اس لیے کہ یہ بغیر سیکھے ہے۔

بعض اکابرین نے باجی کی کتاب کی تردید کی اس لیے کہ صحیح حدیث میں ہے:

"ہم ایک امی امت ہیں نہ لکھنا جانتے ہیں اور نہ حساب جانتے ہیں۔" ③

اور فرمایا کہ احادیث میں جہاں کہیں بھی "کتب" (لکھا) کا لفظ ہے وہاں معنی یہ ہوگا کہ "امر بالکتابۃ" (کتابت کا حکم دیا) جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ "کتب السلطان بکذا الفلان" (بادشاہ نے فلاں کے لیے یہ لکھا) اور اللہ تعالیٰ کے قول میں "من قبلہ" کا "ولا تخطہ" پر مقدم ہونا گویا کہ اس بات میں صریح ہے کہ آپ ﷺ نے مطلقاً نہیں لکھا۔ اور درمیان والی قید کا مابعد کی طرف راجع ہونا بے محل ہے۔

---

① ابن ماجہ صدقات: ۱۹

② بخاری کتاب الصلح ۶، مسلم کتاب الجہاد ۹۲، ابوداؤد کتاب الجہاد ۱۵۶، دارمی کتاب السیر ۶۴ مسند احمد ۴/ ۲۹۸

③ بخاری کتاب الصوم باب ۱۳، مسلم کتاب الصیام حدیث ۱۵، ابوداؤد کتاب الصوم باب ۴، نسائی کتاب الصیام باب ۱۷، مسند احمد ۲/ ۱۲۲

بعض اکابرین نے سمجھا کہ اس کا رجوع ما قبل اور ما بعد دونوں کی طرف ہے چنانچہ انھوں نے کہا کہ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کتاب کے نازل ہونے کے بعد لکھنے اور پڑھنے دونوں پر قادر تھے اگر یہ اعتبار نہ ہوتا تو کلام اعتبار سے خالی ہوتا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اگر ذکر کردہ رجوع کو تسلیم کر لیا جائے تو فائدے والا معاملہ تام نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ مفہوم کی حجیت کا قول نہ کیا جائے جبکہ یہ گمان کرنے والا خود اس کی حجیت کا قائل نہیں ہے۔

اس کے بعد علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ اس ردکو باطل قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"یہ بات مخفی نہیں کہ آپ ﷺ کا فرمان کہ "ہم ایک امی ہیں نہ لکھتے ہیں نہ حساب جانتے ہیں" یہ کتابت کی نفی کے استمرار میں نص نہیں ہے ہوسکتا ہے کہ یہ اس اعتبار سے ہو کہ جب آپ ﷺ کو مبعوث کیا گیا اس وقت آپ اور وہ لوگ جن کی طرف آپ ﷺ کو بھیجا گیا یعنی آپ کے سامنے جو عرب لوگ تھے ان میں سے اکثر لوگ امی ہوں اور لکھنا اور حساب کرنا نہ جانتے ہوں اب بعد میں اکثر لوگوں میں امیت کا وصف باقی نہ رہنا مضر نہیں ہے۔ اور جو ذکر کیا کہ "کتب" کی تاویل "امر بالکتابت" کے ساتھ یہ خلاف ظاہر ہے۔

صحیح مسلم کی شرح میں نووی رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"ہماری ذکر کردہ روایت میں یہ کہنا کہ "ولا یحسن یکتب فکتب" (آپ ﷺ اچھی طرح سے لکھنا نہیں جانتے تھے چنانچہ آپ ﷺ نے لکھا) گویا کہ یہ تصریح ہے کہ آپ ﷺ نے خود لکھا اب اس سے مجاز کی طرف جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر فرمایا کہ "اس مسئلہ میں ہر گروہ نے بات کو لمبا کر دیا اور ہر گروہ نے اس مسئلہ میں دوسرے کو طنز و تشنیع کی ہے۔" فاللہ تعالیٰ اعلم ... الخ۔

میں کہتا ہوں کہ تشنیع کرنا نہ علماء کا طریقہ ہے اور نہ ہی محققین کا ادب ہے اور جس مسئلہ کو ہم نے چھیڑ رکھا ہے وہ اجتہادی ہے اور اس قسم کے مسائل میں ضروری ہے کہ جو ادلہ راجح ہوں ان سے حکم لگایا جائے خواہش نفس کی بنا پر نہ لگایا جائے۔ جب ہم نے دونوں فریقین کے دلائل کا جائزہ لیا تو ہم ملاحظہ کرتے ہیں کہ امیت والے دلائل قطعی ہیں اور ﴿ كَتَبَ ﴾ اور "خَطَّ بیمینه" والے دلائل ظنی اور غیر یقینی ہیں اور کسی نے بھی ان کے قطعی اور یقینی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ پھر اس کے اور اُس کے درمیان تعارض ظاہر ہے لیکن یہ تعارض بھی ظاہری ہے اس کا رفع اس طرح ممکن ہے کہ امیت والے دلائل کو ہم پہلے حالات پر محمول کرتے ہیں اور کتابت والے دلائل کو آخری حالات پر محمول کرتے ہیں۔ اور یہ بات ادلہ کو جمع کرنے کے لیے ہے ورنہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادلہ کو جمع کرنا بہتر طریقہ ہے بنسبت اس کے کہ بعض کو عمل دیا جائے اور بعض کو مہمل چھوڑا جائے جب تک دونوں میں قوت استدلال ہو اور جب تک کسی بھی حال میں انھیں جمع کرنا ممکن ہو اور اگر جمع کرنا ممکن نہ ہو تو اس وقت قطعی کو قبول کرنے اور ظنی کو رد کرنے میں کوئی جھگڑا نہیں اس لیے کہ اوّل بنسبت ثانی کے اقوی ہے۔ اور

﴿ وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْـًٔا ﴾ (النجم: ۲۸)

"اور گمان حق بات کے مقابلے میں کچھ بھی فائدہ نہیں دیتا۔"

یہی میزان صحیح ہے تاکہ تعارض ختم ہو جائے اور ترجیح قائم ہو جائے اور اختلاف واشتباہ ... ت اسی کا فیصلہ کرو۔

﴿وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (ص:۲۶)

"اور خواہش کی پیروی مت کرو ورنہ اللہ کے راستے سے بھٹک جاؤ گے۔"

قرآن پاک کی کتابت

جب ہم نے آپ کے سامنے عربی خط وکتابت کے بارے میں ایک تاریخی لب لباب پیش کر دیا تو اب آپ کی نظر کو اس طرف پھیرتے ہیں کہ ہم نے مبحث جمع قرآن میں کتابت قرآن کی بحث کو (صفحہ ۲۳۲ سے صفحہ ۲۵۶ تک) پوری طرح بیان کر دیا اور وہاں ذکر کر دیا تھا کہ قرآن پاک کیسے لکھا گیا؟ اور کس چیز میں لکھا گیا اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں کیسے لکھا گیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا اہتمام ایک اعلیٰ اہتمام تھا اس اہتمام پر آپ کی رہنمائی اس طرح ہو سکتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ کاتبین تھے جو آپ کی وحی لکھتے تھے جن میں سے خلفاء اربعہ، حضرت معاویہ، ابان بن سعید، خالد بن ولید، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ثابت بن قیس، ارقم بن ابی اور حنظلہ بن ربیع رضی اللہ عنہم وغیرہ حضرات تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی چیز نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کاتبوں میں سے کسی کاتب کو بلاتے اور جو نازل ہوا ہوتا اس کی کتابت کا حکم دیتے اگرچہ ایک کلمہ ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ مروی ہے کہ جب

﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ﴾ (النساء:۹۵)

"نہیں برابر ہو سکتے وہ ایمان والے جو بغیر عذر کے بیٹھ رہتے ہیں اور وہ مجاہد جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنے مال اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں۔"

نازل ہوئی تو ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم دونوں نابینا ہیں کیا ہمارے لیے کوئی رخصت ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے "غیر اولی الضرر" (بغیر عذر والے) نازل کیا۔

آپ نے فرمایا کہ "کندھے کی ہڈی اور دوات لے آؤ" اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اسے لکھ دو انھوں نے لکھ دیا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "گویا کہ میں کندھے کی ہڈی کے جوڑ کے پاس اس کی جگہ کو دیکھ رہا ہوں۔" اور بخاری کی روایت میں صرف اس مقام پر عبداللہ بن اُم مکتوم پر اکتفاء کیا اس میں ابن جحش نہیں ہے۔

شاید آپ کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث یاد ہو گی کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی سورت نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کاتب کو بلاتے اور فرماتے کہ "اس آیت کو اس جگہ رکھو جہاں فلاں فلاں بات لکھی ہوئی ہے۔" نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس نے میری طرف سے کچھ لکھا اور وہ قرآن کے علاوہ ہو تو اسے مٹا دینا چاہیے۔" اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ تم ایک نوجوان آدمی ہو ہم آپ پر کوئی تہمت نہیں لگاتے کیونکہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کو لکھنے والے تھے۔

اس کے ساتھ یہ بھی ملا لیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن پاک کو ان چیزوں میں لکھتے تھے جو بھی انھیں میسر آتی تھیں حتیٰ کہ ہڈیوں میں، کپڑے کی کتروں میں، کھجور کے درخت کی شاخوں میں اور پتلے پتھروں میں وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسی چیز ہے جو دلالت کرتی ہے کہ وہ حضرات اس عظیم الشان معاملہ میں کس طرح ابتلاء میں رہے تھے۔

رسمِ مصحف مصحف کے رسم سے مراد وہ وضع ہے جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کے کلمات اور حروف کی کتابت میں پسند فرمایا، مکتوب میں اصل یہ ہے کہ وہ منطوق کے پوری طرح موافق ہو اس میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی نہ ہو اور نہ ہی کوئی تبدیلی یا تفسیر ہو لیکن مصاحف عثمانیہ میں اس قاعدے کو چھوڑ دیا گیا ہے چنانچہ اس میں بہت سے حروف ایسے پائے گئے ہیں جن کا رسم ادائے نطق کے مخالف ہے، یہ کئی معزز اغراض کی بناء پر تھا جو آپ کو بعد میں معلوم ہوں گی۔

قرآن پاک کے رسم کے بارے میں علماء کرام نے بڑے اہتمام سے کلام کیا ہے اور اس بارے میں بھی کلام کیا ہے کہ یہ کلمات جن کا رسم آیا ہے یہ ان کے الفاظ کے پیمانے کے مطابق نہیں ہے۔ بعض حضرات نے اس میں منفرد تالیفات لکھی ہیں جن میں سے امام ابوعمرو دانی بھی ہیں کہ انھوں نے اس میں ایک کتاب لکھی جس کا نام "المقنع" رکھا گیا۔ نیز علامہ ابوعباس مراکشی بھی ہیں جنھوں نے اس میں "عنوان الدلیل فی رسوم خط التنزیل" نامی کتاب لکھی۔ نیز ان میں سے علامہ شیخ محمد بن احمد بھی ہیں جو التولی کے نام سے مشہور ہیں اس لیے کہ انھوں نے ایک نظم لکھی جس کا نام "اللؤلؤ المنظوم فی ذکر جملہ من المرسوم" رکھا اس کے بعد علامہ مرحوم شیخ محمد خلف حسینی آئے جو کہ مصر کے شہروں میں قاریوں کے استاذ تھے انھوں نے اس منظوم کی شرح کی، اور اس شرح کا حاشیہ بھی لگایا اور اس کتاب کا نام "مرشد الحیوان الی معرفۃ ما یجب اتباعہ فی رسم القرآن"۔

قواعد رسم مصحف مصحف عثمانی کے خط اور رسم کے کچھ قواعد ہیں جنھیں علماء فن نے چھ قواعد میں منحصر کیا ہے۔
① حذف ② زیادتی ③ ہمزہ ④ بدل ⑤ فصل و وصل ⑥ اور جن میں دو قرأتیں ہیں وہ ان میں سے ایک مطابق پڑھی جاتی ہیں۔ اور اب آپ کی خدمت میں کچھ اجمال کے ساتھ پیش خدمت ہے تاکہ اس کے اور ہمارے زمانے کے اس اصطلاحی خط کے درمیان فرق واضح ہو جائے جو آپ کے سامنے ہے۔

① **قاعدہ حذف** ✿ اس کا خلاصہ ہے کہ "یا" نداء کے الف کو حذف کر دیا جائے جیسے "یایھا الناس" اور ہائے تنبیہ کا بھی جیسے "ھأنتم" اور کلمہ "نا" کا جبکہ وہ ضمیر کے ساتھ ملا ہو جیسے "انجینکم" اور لفظ جلالہ سے جیسے "اللّٰہ" کا اور کلمہ "الٰہ" کا بھی، الرحمٰن اور سبحٰن کا اور لام کے بعد جیسے خلٰئف اور دو لاموں کے درمیان جیسے "الکلالۃ" پر تثنیہ میں جیسے "رجلٰن" اور ہر جمع سے مذکر یا مؤنث کی تصحیح کے لیے جیسے "سمّٰعون، المؤمنات" اور ہر ایسی جمع سے جو مفاعل کے وزن پر ہو جیسے "المساجد" اور "النصاری" اور ہر عدد سے جیسے "ثلٰث، بسملہ" سے اور "مثال" وغیرہ کے امر کے شروع سے وغیرہ (سوائے ان کلمات کے جو اس سے مستثنیٰ ہیں)

اور یاء کو حذف کیا جاتا ہے ہر منقوص منون سے رفع اور جر کی صورت میں جیسے "غیر باغ ولا عاد" اور ان کلمات سے "اطیعون، اتقون، خافون، ارھبون، فارسلون، وعبدون" (سوائے مستثنیات کے)

اور واؤ کو حذف کیا جاتا ہے جبکہ دوسری واؤ کے ساتھ واقع ہو جیسے "لا یستٗن، فأو، إلی الکھف" اور لام کو حذف کیا جاتا ہے جبکہ وہ لام میں مدغم ہو جیسے "الیل" اور "الذی" (سوائے مستثنیات کے)۔

اس جگہ بعض حذف ایسے ہیں جو کسی قاعدے کے تحت داخل نہیں ہیں جیسے "مالك" کے کلمہ سے الف اور "ابراھیم" کے کلمہ سے یاء، اسی طرح افعال اربعہ میں سے واؤ کا حذف "ویدع، الانسان، ویمحو اللہ الباطل، یوم یدع الداع، سندع الزبانیہ۔"

۲ **زیادتی کا قاعدہ** ✿ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر جمع والے اسم یا وہ اسم جو جمع کے حکم میں ہو اس کے آخر میں الف زیادہ کرنا جیسے "ملا قوا ربھم، بنو اسرائیل، اولو الالباب" اور ہمزہ مرسومہ کے بعد واؤ کو زیادہ کرنا جیسے "تاللہ تفتأ" کو "تاللہ تفتؤ" لکھا جاتا ہے اور کلمات "مائۃ، مائتین، الظنون، الرسول" اور "السبیل" میں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا﴾ (الاحزاب:۱۰)

﴿وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا﴾ (الاحزاب:۶۶)

﴿فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا﴾ (الاحزاب:۶۷)

اور ان کلمات میں "یاء" کو بڑھایا جاتا ہے جیسے "نبأ، اناء، من تلقاء، بایکم المفتون، باید" جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَ السَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ﴾ (الذاریات:۴۷)

اور کچھ کلمات کے شروع میں واؤ کو بڑھایا جاتا ہے جیسے: "اولو، اولئك، اولاء، اولات۔"

۳ **ہمزہ کا قاعدہ** ✿ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمزہ جب ساکن ہو تو اپنے ماقبل کی حرکت کے مطابق لکھا جاتا ہے جیسے "ائذن، اؤتمن، البأساء" (سوائے مستثنیات کے)

جبکہ ہمزہ متحرکہ اگر کلمہ کے شروع میں ہو اور اس کے ساتھ کوئی حرف زائد بھی ہو تو مطلقاً الف ہی لکھا جاتا ہے خواہ وہ مفتوحہ ہو یا مکسورہ جیسے "أیوب"، "أولو"، "إذا"، "سأصرف"، "سأنزل"، "فبأی۔" (سوائے مستثنیات کے)

اور جب ہمزہ درمیان میں ہو تو اسے اپنی حرکت کی جنس کے حرف سے لکھا جاتا ہے جیسے "سأل، سُئِل، تقرؤہ" سوائے مستثنیات کے اور اگر ایک طرف کو ہو تو اپنے ماقبل کی حرکت کی جنس کے مطابق لکھا جائے گا۔ جیسے "سبأ، شاطئ، لؤلؤ" (سوائے مستثنیات کے) اور اگر اس کا ماقبل ساکن ہو تو وہ محذوف ہوتا ہے جیسے "ملء الارض یخرج الخبءَ" (سوائے مستثنیات کے) اور سب میں مستثنیات کثرت کے ساتھ ہیں۔

۴ **قاعدہ بدل** ✿ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "الف" کو "واؤ" لکھا جاتا ہے تاکہ اس کی عظمت شان ظاہر جائے جیسے "الصلوٰۃ، الزکوٰۃ، الحیٰوۃ" (سوائے مستثنیات کے)

اور "یاء" لکھا جاتا ہے جبکہ وہ یاء سے بدل ہو جیسے "یتوفّٰکم، یاحسرتی، یااسفٰی" اسی طرح ان کلمات میں الف کو یاء لکھا جاتا ہے "الیٰ، علیٰ، انّٰی بمعنی کیف؟، متیٰ، بلیٰ، حتّٰی، لدی، سوائے "لدا الباب" کے جو سورۃ یوسف میں آتا ہے وہ الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔

نون تاکید خفیفہ میں نون کو الف لکھا جاتا ہے نیز کلمہ اذن میں بھی۔ اور "ھاء" تانیث کو تاء مفتوحہ لکھا جاتا ہے جیسے "رحمت" جو سورۃ البقرۃ، اعراف، ھود، مریم روم اور زخرف میں آیا ہے اور "نعمت" جو سورۃ بقرۃ آل عمران، مائدہ، ابراہیم نحل، لقمان، فاطر اور

طور میں آیا ہے اور "لعنت اللہ" اور کلمہ "معصیت" میں جو سورۃ "قد سمع اللہ" میں آیا ہے اور ان کلمات میں "ان شجرت الزقوم، قرت عین، جنت نعیم، بقیت اللہ" اور "امرأۃ" کے لفظ میں جبکہ اس کی اضافت اس کے شوہر کی طرف ہو رہی ہو جیسے "امرأت عمران" اور "امرأت نوح" وغیرہ۔

⑤ **وصل وفصل کا قاعدہ** ● اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کلمہ "أن" کا کلمہ "لا" کے ساتھ وصل ہوگا جبکہ "لا" اس کا بعد آیا ہو البتہ دس مقامات اس سے مستثنیٰ ہیں جیسے "ان لا تقولوا"، "ان لا تعبدوا الا اللہ"۔

اور کلمہ "من" کا "ما" کے ساتھ وصل ہوگا جب وہ اس کے بعد آئے اور اس قاعدہ سے "من مالکت ایمانکم" جو سورۃ النساء اور روم میں واقع ہوئے ہیں اور سورۃ المنافقین میں "من مارزقناکم" مستثنیٰ ہیں۔ اور کلمہ "مِن" کو مطلقاً "مَن" کے ساتھ ملایا جائے گا۔

اور کلمہ "عن" کو کلمہ "ما" کے ساتھ ملایا جائے گا، سوائے اللہ تعالیٰ کے قول ﴿عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ﴾ کے (سورۃ الاعراف:۱۶۶)

اور کلمہ "اِن" کو "ما" کے ساتھ ملایا جائے گا اگر وہ اس کے بعد آئے سوائے اللہ تعالیٰ کے قول ﴿وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ﴾ (الرعد:۴۰) کے۔

اور کلمہ "أن" کو بھی مطلقاً "ما" کے ساتھ ملایا جائے گا اس میں کوئی استثناء نہیں۔

اور کلمہ "کل" کو بھی مابعد آنے والے "ما" کے ساتھ ملایا جائے گا سوائے اللہ تعالیٰ ﴿كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ﴾ (النساء:۹۱) اور ﴿مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ﴾ (ابراہیم:۳۴) کے اور کلمات "نعمّا"، "رُبَمَا"، "کانما" اور "ویکأنّ" کو بھی ملا کر پڑھا جائے گا۔

⑥ **قاعدہ جس میں دو قراءتیں ہوں** ● اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک کلمہ جب دو طرح سے پڑھا جائے تو اسے ان میں سے ایک کے رسم کے ساتھ لکھا جائے گا جیسا کہ مندرجہ ذیل کلمات کو مصحف میں بغیر الف کے لکھا جاتا ہے۔ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ ﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ ﴿وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى﴾ ﴿تُفٰدُوْهُمْ﴾ وغیرہ اور یہ سب کلمات الف کے اثبات اور حذف دونوں طرح پڑھے جاتے ہیں۔ اسی طرح مندرجہ ذیل کلمات تائے مفتوحہ کے ساتھ لکھے جاتے ہیں ﴿غَيٰبَتِ الْجُبِّ﴾ (یوسف:۱۵) ﴿اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ﴾ (العنکبوت:۵۰) ﴿ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا﴾ (فصلت:۴۷) ﴿وَ هُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ﴾ (سبا:۳۷) یہ اس لیے کہ یہ کلمات جمع ہیں اور انھیں جمع اور واحد دونوں طرح پڑھا جاتا ہے اور اس کے علاوہ ایسے کلمات اور بہت سے ہیں آپ کو مثال دینے اور وضاحت کرنے کے لیے اتنے ہی کافی ہیں جو ہم نے ذکر کر دیئے۔

رسم عثمانی کی خصوصیات وکمالات

اس رسم کے کئی فوئد وکمالات ہیں۔

پہلا فائدہ حتی الامکان ایک کلمہ میں مختلف قراءات کی طرف دلالت ہو جاتی ہے، وہ اس طرح کہ رسم کا قاعدہ میں یہ لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ایک کلمہ میں جب دو یا دو سے زائد قراءتیں ہوتی ہیں تو اس طرح لکھی جاتی ہے کہ اس میں ان قراءتوں کا احتمال بھی ہوتا ہے پھر اگر ایک حرف اس کا احتمال نہ رکھتا ہو اس طرح کہ اختلاف قرأت سے حرف کی صورت بدل جاتی ہو تو

رسم اس حرف پر ہوگا جو اصل قاعدہ کے خلاف ہوتا کہ اس کے ذریعے جواز قراءت اور حرف کے ذریعے اصل معلوم ہو جائے اور جب کسی کلمہ میں ایک ہی قرأت ہوتو اس کا رسم اس حرف پر ہوگا جو اصل ہے جیسے ﴿اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ﴾(طٰہٰ:۶۳) یہ ایسے کلمہ کی مثال ہے جو ایک صورت میں لکھا گیا اور متعدد صورتوں میں پڑھا جاتا ہے۔ (اب آپ دیکھیں) کہ یہ مصحف عثمانی میں "ان هذان لساحران" لکھا ہوا ہے یعنی نہ نقطہ ہے نہ اعراب نہ "ان" اور "هذان" کے نون میں شد ہے اور نہ جزم اور نہ ہی هذان کے ذال کے بعد الف ہے اور نہ ہی یاء۔

اب رسم میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس طرح آیا ہے کہ اسے چار وجوہ پر پڑھا جا سکتا ہے اور یہ چاروں وجوہ صحیح سند کی طرف لوٹتی ہیں۔

① نافع رحمہ اللہ کی قرأت جو "ان" کے نون کو شد دیتے ہیں اور "هذان" کے نون کو الف کے ساتھ تخفیف دیتے ہیں۔

② ابن کثیر کی قرأت جو کہ "ان" میں نون کو مخفف کرتے ہیں اور "هذان" میں نون کو مشدد کرتے ہیں۔

③ حفص رحمہ اللہ کی قرأت جو کہ "اِن" میں نون کو مشدد کرتے ہیں اور "هذان" میں الف کے ساتھ۔

④ ابوعمر کی قرأت جو کہ ان میں تشدید اور "هذين" میں یاء اور نون کی تخفیف کرتے ہیں۔ غور فرمائیں کہ یہ مثالی طریقہ قرأت کی وجوہ کے لیے ایک ضابطہ ہے تا کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے نیک اسلاف مصحف کے بارے میں رسم عثمانی کے قواعد میں ہم سے زیادہ دورنظری اور ہم سے زیادہ سیدھا راستہ رکھتے تھے۔

دوسرا فائدہ مختلف معانی کا فائدہ دینا ایسے طریقے کے ساتھ جو تقریباً ظاہر ہوں جیسے ﴿اَمْ مَّنْ یَّكُوْنُ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا ۝﴾ (النساء:۱۰۹) کے کلمہ میں قطع کرنا اور اللہ تعالیٰ کے قول ﴿اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝﴾ (الملک:۲۲) میں وصل کرنا۔ اس لیے کہ "امّن" اس طرح لکھا گیا ہے یعنی میم اوّل کو میم ثانی میں مدغم کر دیا گیا ہے اور ان دونوں کی کتابت ایک میم مشدد کی صورت میں کی گئی ہے اور کتابت میں ام اوّل کا قطع اس بات پر دلالت کرنے کے لیے ہے کہ یہ "ام" منقطعہ ہے جو بل کے معنیٰ میں ہے اور ام ثانیہ جس کا وصل کیا گیا ہے اس بات پر دلالت کرنے کے لیے ہے کہ یہ اس کی طرح نہیں ہے۔

تیسرا فائدہ کسی دقیق اور مخفی معنیٰ پر دلالت کرنے کے لیے جیسے "ایْیدٍ" میں یاء کی زیادتی جو کہ اللہ تعالیٰ کے قول:
﴿وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا بِاَیْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝﴾ (الذاریات:۴۷)

اور اسی طرح "بأیيد" لکھا گیا ہے یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی قوت کی تعظیم کی طرف اشارہ ہو جائے۔ جس نے آسمان کو بنایا نیز اس صرف اشارہ ہو جائے کہ اس کی قوت کے مشابہ کوئی نہیں۔ یہ اس قاعدہ مشہورہ پر متفرع ہوتا ہے کہ:

((زيادة المبنى تدل على زيادة المعنىٰ)).

"الفاظ کی زیادتی معنیٰ کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔"

ان افعال اربعہ کی کتابت بھی اسی قبیل سے ہے "ويدعو الانسان، ويمحوا الله الباطل، يوم يدع الداع، سندعو الزبانية" کہ ان میں واؤ کو حذف کیا گیا اور مصحف عثمانی میں اس طرح لکھا گیا "ويدع الانسان، ويمح الله الباطل، يوم يدع الداع، سندع الزبانية" لیکن تمام کے تمام بغیر نقطے اور اعراب کے ہیں۔

علماء نے فرمایا کہ ان کے حذف میں راز یہ ہے کہ ﴿وَ يَدْعُ الْإِنْسَانُ﴾(الاسراء:۱۱) میں دلالت ہے کہ یہ دعا انسان پر آسان ہے وہ اس میں جلدی کرتا ہے جیسے وہ بھلائیوں میں جلدی کرتا ہے بلکہ اس کی طرف شر کو ثابت کرنا اپنی ذات کے اعتبار سے خیر سے زیادہ قریب ہے اور" ويمح الله الباطل " میں واؤ کو حذف کرنے میں اشارہ ہے کہ وہ بڑی ہی جلد ختم اور مضمحل ہو جائے گا۔

اور ﴿يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ﴾(القمر:٦) میں واؤ کو حذف کرنے میں اشارہ ہے دعا کی جلدی کی طرف اور مخبرین کی بھی جلدی کی طرف اور ﴿سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ﴾(العلق:۱۸) میں واؤ کو حذف کرنے میں سرعت فعل اور ﴿الزَّبَانِيَةَ﴾(مخصوص فرشتے جو جہنمیوں کو آگ کی طرف دھکیلیں گے) کی جلدی سے بات ماننے اور ان کی گرفت کی قوت پر۔

ان اسرار کو مراکشی رحمہ اللہ کا قول جمع کرتا ہے (ترجمہ) ان چار کلمات سے انھیں حذف کر دینے میں راز یہ ہے کہ فعل فاعل پر جلدی اور سہولت کے ساتھ واقع ہو جاتا ہے نیز وجوہ میں منفعل یعنی اس سے متاثر ہونے والے کے سختی کے ساتھ قبول کرنے کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے۔

چوتھا فائدہ اصل حرکت پر دلالت، جیسے کسرہ کو یا لکھنا۔ اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل قول میں ﴿وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى﴾(النحل:۹۰) میں اس لیے کہ اس کی کابت اس طرح ہے ﴿وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى﴾(النحل:۹۰) ہیں اسی طرح ﴿سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ﴾(الاعراف:۱۴۵) میں ضمہ کی کتابت واؤ کے ساتھ ہے اس لیے کہ ﴿سَاُورِيْكُمْ﴾ اس طرح لکھا گیا ہے اسی طرح اصل حرف پر دلالت جیسے "الصلاۃ" اور "الزکوۃ" کو "الصلوٰۃ" اور "الزکوٰۃ" لکھا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ان میں الف، واؤ سے منقلب ہے (بغیر نقطے اور اعراب کے جیسا کہ گزرا)

پانچواں فائدہ بعض لغات فصیحہ کا فائدہ جیسے ھائے تانیث کو تائے مفتوحہ کی شکل میں لکھنا تاکہ طی کی لغت کی طرف اشارہ ہو جائے اور اس قسم کی مثالیں گزر چکیں اور جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ﴿يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾(ھود:۱۰۵) یہاں ("یأتی" کو) یاء کے حذف کے ساتھ لکھا گیا ہے اور "یأت" اس طرح لکھا گیا ہے تاکہ ھذیل کی لغت کی طرف اشارہ ہو جائے۔

چھٹا فائدہ لوگوں کو اس بات پر ابھارنا کہ قرآن پاک کو ثقہ رجال سے حاصل کریں اور اس رسم عثمانی کے مطابق نہ بولیں جو فی الجملہ منطوق کے مطابق صحیح واقع نہیں ہوئی۔

اس فائدے کے ضمن میں دو خوبیاں اور بھی ہیں۔

① قرآن پاک کے الفاظ، ان کے اداء کے طریقے، حسن ترتیل اور اس کی تجوید میں توثق۔ اس لیے کہ مصحف سے یہ چیزیں علی وجہ الیقین معلوم ہونا ناممکن ہے جہاں رسم کا قاعدہ اور اس کی کتابت کی اصطلاح ہوگی وہ طباعت کنندہ غلطی کرتا ہے اور بعض اوقات قاری پر تجوید کے بعض احکام بھی مخفی رہ جاتے ہیں جیسے قلقلہ، اظہار، ادغام، روم اور اشمام وغیرہ چہ جائیکہ کہ اس کی تطبیق کا اخفاء۔

اسی وجہ سے علماء نے طے کیا ہے کہ صرف مصاحف پر اعتماد کرنا جائز نہیں بلکہ اداء اور قرأت میں پختگی بھی ضروری ہے کہ وہ کسی ثقہ حافظ سے حاصل کرے اور اگر آپ کو کوئی شک ہے اپنے رب کی قسم سے مجھے بتلایئے کہ کیا صرف اکیلے مصحف خواہ کوئی بھی ہو پڑھنے والے کو سورتوں کے آغاز کے صحیح تلفظ پر رہنمائی کر سکتا ہے؟ جیسے کھیعص، حم عسق، طسم؟ اسی باب سے روم اور اشمام

بھی ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے قول "مالك لا تامنا على يوسف" میں "لا تأمننا" کے لفظ ہیں۔

دوسری خوبی ● سند کا رسول اللہ ﷺ تک متصل ہونا اور یہ اس امتِ اسلامیہ کی خصوصیات میں سے ہے جس کی وجہ سے یہ امت باقی امتوں سے ممتاز ہوئی۔

ابن حزم نے کہا ثقہ کا ثقہ سے نقل کرنا اور اسے اتصال کے ساتھ نبی پاک ﷺ تک پہنچا دینا یہ ایسی چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے مسلمانوں کو تمام ملتوں پر خصوصیت دی اور ارسال واعضال یہ تو یہود کی بھی بہت سی کتابوں میں پایا جاتا ہے لیکن وہ اس میں موسیٰ علیہ السلام کے اتنے قریب نہیں ہوتے جتنا کہ ہم محمد ﷺ کے قریب ہوتے ہیں بلکہ وہ وقوف کرتے ہیں اور اتنا وقوف کرتے ہیں کہ ان کے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان تیس صدیوں کا فاصلہ ہوتا ہے وہ تو محض شمعون علیہ السلام وغیرہ تک پہنچ سکتے ہیں اس کے بعد فرمایا کہ جبکہ نصاریٰ ان کے پاس اس طرح کی نقل سوائے طلاق کی تحریم کے کوئی نہیں اور ایسی نقل جو ایسی سند پر مشتمل ہو جس میں کذاب یا مجہول العین ہوں وہ یہود و نصاریٰ کے نقل میں کثیر ہیں اور باقی رہے صحابہ اور تابعین کے اقوال! یہود کے لیے تو ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی نبی کے صحابی یا تابعی تک پہنچ جائیں اور نصاریٰ کے لیے بھی ممکن نہیں کہ وہ شمعون اور بولص سے اوپر پہنچ سکیں۔

کیا مصحف عثمانی کا رسم توقیفی ہے

مصحف کے بارے میں علماء کی تین آراء ہیں۔

پہلی رائے یہ توقیفی ہے اس کے خلاف جائز نہیں یہ جمہور کا مذہب ہے انھوں نے استدلال یوں کیا کہ نبی کریم ﷺ کے کاتبین تھے جو وحی کو نقل کرتے تھے انھوں نے قرآن پاک کی کتابت فعلاً اسی طرح سے کی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے انھیں ان کی کتابت پر برقرار رکھا آپ ﷺ کا زمانہ گزر گیا اور قرآن پاک اسی حالت پر تھا اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی بلکہ وارد ہوا ہے کہ آپ ﷺ کاتبین وحی کے لیے قرآن پاک کی رسم اور کتابت کے بارے میں قواعد وضع کیا کرتے تھے اسی وجہ سے آپ ﷺ نے اپنے کاتب وحی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ "دوات کو درست رکھو! اور قلم کو ٹیڑھا کاٹو! سین کو جدا جدا کر کے لکھو اور میم کو مت مٹاؤ اور اللہ کو اچھا کر کے لکھو الرحمٰن کو لمبا کر اور الرحیم کو خالی چھوڑ دو اور قلم اپنے بائیں کان پر رکھو یہ یاد دہانی کا بڑا سبب ہوگا۔"

اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور انھوں نے بھی قرآن پاک کو اسی رسم کے مطابق صحیفوں میں لکھا پھر انھیں کے نقش قدم پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی خلافت میں چلے اور ان صحف کو اسی طرز پر لکھوایا اور نبی کریم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت ابوبکر اور عثمان رضی اللہ عنہما کے اس عمل کو برقرار رکھا حتی کہ معاملہ اس کے بعد تابعین تک پہنچا اور پھر تبع تابعین تک پہنچا کسی نے بھی اس رسم کی مخالفت نہیں کی اور کہیں منقول نہیں کہ کسی نے یہ سوچا ہو کہ اس رسم کو تبدیل کر کے کسی دوسری رسم میں لکھ دے جو تالیف کے فروغ، فن کے مشاغل اور علوم کے تقدم کے زمانے میں رونما ہوئیں۔ بلکہ رسم عثمانی محترم ہو کر باقی رہی مصاحف کی کتابت میں اسی کی اتباع کی گئی اس کے استقلال کو کسی نے نہیں چھیڑا اور نہ ہی اس کی چراگاہ کو کسی نے مباح سمجھا۔

اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ مصاحف عثمانیہ کا رسم کئی امور کی وجہ سے کامیاب ہوا ان میں سے ہر ایک اسے اہمیت اور وجوب اتباع کے لائق بنا دیتا ہے۔ ان امور میں سے رسول اللہ ﷺ کا اس پر برقرار رکھنا، اس کے دستور کا حکم دینا، صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع جو کہ بارہ ہزار سے زیادہ تھے پھر اس کے بعد تابعین اور ائمہ مجتہدین کے دور میں اس پر امت کا اجماع۔

اور آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع ان چیزوں میں واجب ہے جن چیزوں کا آپ ﷺ نے حکم دیا یا اس پر برقرار رکھا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ (آل عمران:۳۱)

"آپ فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو! اللہ تعالیٰ نے تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔"

اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم کی پیروی کرنا بھی واجب ہے، خصوصاً خلفاء راشدین کی اتباع، اس لیے کہ حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس میں آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ: "تم میں سے جو شخص زندہ رہے گا وہ عنقریب بہت سے اختلافات دیکھے گا تم پر میری اور میرے بعد خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے انھیں داڑھوں کے ذریعے مضبوط تھام لو۔" ①

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ امت کا اجماع خواہ کسی بھی زمانے میں ہو واجب الاتباع ہے خصوصاً عصرِ اول میں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا۠﴾ (النساء:۱۱۵)

"اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت کرے اور مومنوں کے راستے کے سوا اور راستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے ادھر ہی چلنے دیں گے اور (قیامت کے دن) جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔"

جن لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کتابت پر اجماع امت کو نقل کیا ان میں سے ایک صاحب مقنع بھی ہیں جو سند کے ساتھ حضرت مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ: "میں نے لوگوں کو پایا جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف کو ضائع کیا تو انھیں یہ اچھا لگا اور کسی نے بھی اس پر کوئی عیب نہیں لگایا" اسی طرح شارح عقیلیہ نے بھی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے ہر لشکر کی طرف ایک مصحف بھیجا اور انھیں حکم دیا کہ "اس کے خلاف کسی کے پاس کوئی بھی مصحف ہو تو وہ اسے جلا دے۔" اور کوئی بھی نہیں جانا گیا کہ جس نے ان مصاحف عثمانیہ کے رسم کی مخالفت کی ہو۔

مصحف کی ان اصطلاحات پر اجماع کا انعقاد دلیل ہے کہ ان سے عدول جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ امام خراز پر رحم کرے وہ فرماتے ہیں:

① ابوداود کتاب السنۃ ۵، ترمذی کتاب العلم ۶، ابن ماجہ مقدمہ ۶، دارمی مقدمہ ۱۶، مسند احمد ۴/ ۱۲۶

و بعده جرده الامام	فی مصحف لیقتدی الانام
اس کے بعد امام نے اسے بے اعراب کر دیا	ایک مصحف میں تاکہ سب لوگ اس کی اقتدا کریں
و لا یکون بعده اضطراب	وکان فیما قد رأی صواب
اور اس کے بعد کوئی اضطراب نہ ہو	اور ان کی رائے میں درستگی تھی
و قصة اختلافهم شهیرة	کقصة الیمامة العسیرة
ان کے اختلاف کا قصہ مشہور ہے	جیسا کہ یمامہ کا قصہ تنگی والا
فینبغی لاجل ذا ان نقتفی	مرسوم ما اصله فی المصحف
اس وجہ سے ہمیں چاہیے کہ اقتداء کریں	اسی رسم کی جس کی اصل مصحف میں ہے
و نقتدی بفعله وما رأی	فی جعله لمن یخط ملجاء
اور ہم اقتدا کریں ان کے فعل اور رائے کی	جسے انھوں نے لکھنے والے کے لیے ذریعہ حفاظت بنایا

رسم عثمانی کے التزام میں علماء کرام کے اقوال

سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ فرمایا کہ حضرت مالک رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر کوئی شخص مصحف لکھوانا چاہے تو آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ ان ہجوں کی طرح لکھ سکتا ہے جنھیں آج کل لوگوں نے بنایا ہوا ہے؟ انھوں نے فرمایا میں اسے جائز نہیں سمجھتا بلکہ وہ پہلے طریقہ کتابت پر ہی لکھے۔ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہی حق ہے اس لیے کہ اس میں پہلی حالت کی بقاء ہے تاکہ بعد والا طبقہ اس سے سیکھ لے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بعد والوں سے یہی بہتر ہے اس لیے کہ اس کے خلاف میں طبقہ اولیٰ میں پائی جانے والی اولیت سے لوگوں کو نا آشنا رکھنا لازم آتا ہے۔

ابوعمرو دانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "اس میں علماء امت کا کوئی بھی شخص مخالف نہیں ہے۔" ابوعمر دانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے قرآن پاک کے حروف کے بارے میں پوچھا گیا جیسے واؤ اور الف کہ کیا انھیں مصاحف میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اگر اس میں ایسی کوئی چیز ملے؟ انھوں نے فرمایا کہ نہیں۔ ابوعمرو نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ الف اور واؤ زائدہ ہیں جو رسم میں لفظاً معدوم ہیں جیسے "اولو" امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ واؤ، الف یا یا وغیرہ میں مصحف عثمانی کے خط کی مخالفت کرنا حرام ہے۔

"المنہج فی فقہ الشافعیہ" کے حواشی میں ہے کہ "کلمہ" "الربا" "کو" "واؤ" "اور" "الف" "کے ساتھ لکھا جاتا ہے جیسا کہ رسم عثمانی میں ہے اور قرآن پاک میں اس کلمہ کو یاء کے ساتھ یا الف کے ساتھ نہیں لکھ سکتے۔ اس لیے کہ ان کا رسم ایک سنت ہے جس کی اتباع کی جاتی ہے۔

محیط بربانی جو فقہ حنفی میں ہے میں آیا ہے کہ "(ترجمہ) مصحف کو رسم عثمانی کے بغیر لکھنا نہیں چاہیے" علامہ نظام الدین نیسا بی نے فرمایا کہ (ترجمہ) ائمہ کی ایک جماعت نے فرمایا کہ قراء، علماء، اور اہل کتاب پر واجب ہے کہ وہ مصحف کے خط میں اس رسم

کی اتباع کریں اس لیے کہ یہ رسم حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ہے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امین تھے اور وحی کے کاتب تھے۔
بیہقی نے شعب الایمان میں فرمایا کہ "جو شخص مصحف لکھے اسے چاہیے کہ اسے انھی حرف ہجاء کے مطابق لکھے جن کے مطابق یہ مصاحف لکھے گئے اور ان کی مخالفت نہ کرے اور انھوں نے جو کچھ بھی لکھا اسے تبدیل نہ کرے کیونکہ وہ کثیر علم والے سچے دل والے سچی زبان والے اور عظیم ترین امانت والے تھے اب ہمارے لیے مناسب نہیں کہ اپنی طرف سے ان کی درستگی کریں۔

اس پہلی رائے کا تجزیہ اس طرح ممکن ہے کہ ان کے بیان کردہ دلائل اس رسم کے بغیر قرآن کی کتابت کے حرام ہونے پر دلالت نہیں کرتے ہیں اس لیے کہ اس میں نہ گناہ والی ڈانٹ اور وعید ہے اور نہ ہی حرام والی نہی اور دھمکی ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ رسم عثمانی پر کتابت کے جواز، اس کی وجاہت اور وقعت پر دلالت ہے اور یہ اتفاق و تسلیم کا محل ہے۔

دوسری رائے

رسم عثمانی اصطلاحی ہے توقیفی نہیں اس بناء پر اس کی مخالفت جائز ہے اس رائے کی طرف ابن خلدون اپنے مقدمہ میں مائل ہوئے ہیں۔ قاضی ابو بکر نے "الانتصار" میں فرمایا کہ "کتابت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے امت پر کچھ بھی فرض نہیں کیا اس لیے قرآن پاک کے کاتبین اور مصاحف لکھنے والوں میں سے کسی سے معین رسم نہیں حاصل کی گئی کہ یہی واجب ہوا اور اس کے علاوہ کو ترک کرنا واجب ہوا اس لیے کہ اس کا وجوب صرف سمع و توقیف سے ہی معلوم ہوا ہے اور کتاب کی عبارتوں اور ان کے مفہوم میں ایسا نہیں ہے کہ قرآن پاک کا رسم اور اس کا ضبط ایک مخصوص طریقے اور ایک محدود حد کے علاوہ جائز ہی نہ ہوا اور اس سے تجاوز نا جائز ہوا اسی طرح سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اسے واجب کرتی ہو یا اس پر دلالت کرتی ہو اجماع امت میں بھی اس کو واجب کرنے والی کوئی چیز نہیں نیز قیاسات شریعہ اس پر دلالت نہیں کرتے۔

بلکہ سنت رسول دلالت کرتی ہے کہ رسم کسی بھی طریقے پر آسان جائز ہو، یہ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسم کا حکم دیتے اور کوئی معین طریقہ بیان نہیں کرتے اور نہ ہی کسی طریقے پر کتابت سے کسی کو منع فرماتے اسی وجہ سے مصاحف کے خطوط مختلف ہیں بعض ایسے ہیں جو الفاظ کو ان کے مخرج کے مطابق لکھتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو کمی زیادتی کرتے ہیں اس لیے کہ انھیں علم ہے کہ یہ اصطلاحی ہے اور لوگوں پر حال مخفی نہیں ہے اسی وجہ سے اسے کوفی خط کے مطابق لکھنا بھی جائز ہے اور خط اوّل کے ساتھ بھی اور لام کو کاف کی صورت میں لکھنا بھی جائز ہے اور الفات کو ٹیڑھا کرنا بھی جائز ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی دیگر وجوہ سے لکھنا جائز ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ قدیمی خط اور ہجاء کے ساتھ لکھا جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ مصحف کو جدید خطوط اور ہجاء کے ساتھ لکھا جائے اور ان کے درمیان بھی جائز ہے۔

جب مصاحف کے خطوط اور اس کے اکثر حروف مختلف ہیں اور ان کی صورتیں متغایر ہیں اور لوگوں نے اسے جائز بھی قرار دیا اور یہ بھی جائز قرار دیا کہ ہر شخص اپنی عادت کے مطابق لکھے اور آسان اور مشہور ترین اور اولیٰ ترین طریقے سے لکھے نہ اس میں کوئی گناہ ہے اور نہ ہی کوئی منکر تو اس سے معلوم ہوا کہ اس بارے میں لوگوں پر کوئی مخصوص حد منقول نہیں ہوئی جیسا کہ قرأت اور اذان میں منقول ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ خطوط علامات اور رسم ہیں جو ارشادات، عقود اور سوم کے قائم مقام ہیں اور ہر رسم کلمہ پر دلالت کرتی ہے اور اس کی قرأت کی وجوہ کے لیے مفید ہے اس کی صحت واجب اور کاتب کی تصویب ضروری ہے خواہ وہ کسی بھی وجہ پر ہو۔

بالجملہ جو بھی دعویٰ کرے کہ لوگوں پر رسم مخصوص واجب ہے اس پر اپنے دعویٰ پر دلیل قائم کرنا ضروری ہے اور کہاں سے دلیل لائے... الخ۔

اس مذہب کا تجزیہ اس طرح کیا گیا ہے۔

① وہ دلائل جو جمہور نے اپنے مذہب کی تائید میں بیان کیے ہیں وہ بالکل آپ کے سامنے بالکل قریب ہیں بعض سنت سے ہیں بعض صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے اجماع کے ساتھ ہیں۔

② ان کا یہ دعویٰ کرنا کہ سنت رسول اللہ ﷺ کی نصوص میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اسے واجب کرتی ہو یہ دعویٰ مردود ہے کیونکہ پیچھے گزر چکا کہ رسول اللہ ﷺ نے کاتبین وحی کو اس پر برقرار رکھا جن میں سے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی ہیں جنھوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا مصحف لکھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصاحف لکھے اور ابھی حدیث گزری کہ جس میں رسول اللہ ﷺ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے فرما رہے ہیں کہ: "دوات کو درست رکھو اور قلم کو ترچھا کاٹو... الخ۔"

③ قاضی ابوبکر کا کہنا کہ اسی وجہ سے مصاحف کے خطوط مختلف ہیں... الخ" یہ مسلم نہیں کیونکہ اجماع قائم ہو چکا اور منعقد بھی ہو چکا اور لوگ رسم توقیفی سے واقف ہو چکے اور وہ رسم عثمانی تھا۔

اس موقع پر ہم مزید ذکر کرتے ہیں کہ علامہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ عارف باللہ عبد العزیز دباغ سے نقل کرتے ہوئے اپنی کتاب "الابریز" میں فرمایا کہ "قرآن کا رسم اللہ تعالیٰ کے اسرار میں سے ایک سر ہے جس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور اس کی کمال رفعت کو ظاہر کرتا ہے۔" ابن مبارک نے فرمایا کہ میں نے ان سے عرض کیا کہ کیا "الصلوٰۃ، الزکوٰۃ، الحیوٰۃ اور مشکوٰۃ" میں جو واؤ الف کا بدل ہے اور "ساوریکم، اولئك، اولاء اور اولات" میں واؤ کی زیادتی اور "ھٰذھم، ملائه، بایکم اور بایئ" میں "یاء" کی زیادتی؟ کیا یہ تمام چیزیں نبی پاک ﷺ یا صحابہ رضی اللہ عنہم سے صادر ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ "یہ نبی کریم ﷺ سے صادر ہیں، آپ ﷺ نے ہی اپنے صحابہ میں سے کاتبین کو حکم دیا کہ وہ انھیں اسی صورت پر لکھیں اور انھوں نے نہ کمی کی نہ زیادتی بلکہ جو نبی پاک ؐ سے سنا وہی لکھا" میں نے عرض کیا کہ علماء کی جماعت نے رسم کے معاملہ میں رخصت دی ہے اور کہا کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اصطلاح ہے وہ اس میں اس طریقے پر چلے جس پر قریش زمانہ جاہلیت میں لکھا کرتے تھے اور یہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس لیے صادر ہوا کہ قریش نے اہل حیرہ سے کتابت سیکھی اور اہل حیرہ ربا کو واؤ کے ساتھ بولا کرتے تھے لہٰذا انھوں نے ان کی زبان کے مطابق لکھا اور قریش الف کے ساتھ بولا کرتے تھے ان کی واؤ کے ساتھ کتابت غیروں کی زبان اور ان کی تقلید کی بناء پر تھا حتیٰ کہ قاضی ابوبکر باقلانی نے فرمایا کہ "ہر وہ شخص جو دعویٰ کرتا ہو کہ لوگوں پر رسم مخصوص واجب ہے اس پر ضروری ہے کہ وہ اپنے دعویٰ پر دلیل قائم کرے کیونکہ کتاب وسنت اور اجماع میں کوئی بھی ایسی دلیل نہیں ہے جو اس پر دلالت کرتی ہو۔

صحابہ اور ان کے علاوہ کسی کے لیے بھی رسم قرآن بلکہ ایک بال میں بھی کوئی اختیار نہیں ہے یہ تو صرف نبی کریم ﷺ کی طرف سے توقیفی ہے آپ ﷺ نے ہی انھیں حکم دیا کہ وہ اسے ہیئت معروفہ پر لکھیں یعنی الف کی کمی زیادتی کے ساتھ لکھیں اس لیے کہ اس میں ایسے اسرار ہیں جن تک عقول پہنچ نہیں سکتیں۔ جیسے نظم قرآنی معجز ہے اسی طرح اس کا رسم بھی معجز ہے اور عقل اس راز تک کیسے پہنچ سکتی ہے کہ مائۃ میں الف کو زیادہ کیا گیا ہے "فئۃ" میں نہیں اسی طرح "بأیید" اور "بایکم" میں یاء کو زیادہ کیا گیا اور

﴿سَعَوْ﴾(سورۃ الحج:۵۱) میں الف کو زیادہ کیا گیا اور ﴿سَعَوْ﴾(السبا:۵) میں کم کیا گیا اور "عتو" (جہاں ① بھی ہو) میں الف کی زیادتی اور ﴿عَتَوْ﴾(الفرقان:۲۱) میں الف کی کمی اسی طرح "امنوا" میں الف کی زیادتی اور "جاؤ، ② جآؤ، ③ تبوؤ، ④ اور فاؤ ⑤" میں اس کا نہ ہونا اور ﴿یَعْفُوَا الَّذِیْ﴾(البقرۃ:۲۳۷) میں الف کی زیادتی اور ﴿یَّعْفُوَ عَنْهُمْ﴾(النساء:۹۹) میں الف کا نہ ہونا؟ یا کیسے عقل پہنچ سکتی ہے کہ متشابہ کلمات میں سے بعض کو حذف کیا گیا اور بعض کو نہیں جیسے سورۃ یوسف میں اور زخرف میں الف کو حذف کرنا اور باقی مواضع میں اسے ثابت رکھنا اور ﴿سَمٰوٰتٍ﴾(فصلت:۱۲) میں واؤ کے بعد الف کو برقرار رکھنا اور اس کے علاوہ میں حذف کرنا اور "المیعاد" میں الف کو مطلقاً ثابت رکھنا اور سورۃ الانفال میں اسے حذف کر دینا اور "سِرَاجًا" جہاں بھی واقع ہوا ہے میں "الف" کو ثابت رکھنا اور اور فرقان میں حذف کر دینا۔ اور کیسے عقل پہنچ سکتی ہے بعض تاءات کو علیحدہ کیا گیا ہے اور بعض کو دوسرے کے ساتھ ملایا گیا ہے یہ سب اسرار الٰہیہ اور اغراض نبویہ کی بناء پر ہے، انھیں لوگوں پر مخفی رکھا گیا اس لیے کہ یہ اسرار باطنی ہیں جو فتح ربانی کے بغیر کھولے نہیں جا سکتے گویا کہ یہ سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات اور الفاظ کے قائم مقام ہیں کیونکہ ان کے بڑے بڑے اسرار اور کثیر معانی ہیں اکثر لوگ ان کے اسرار تک نہیں پہنچ سکتے اور نہ ہی ان معانی الٰہیہ تک پہنچ سکتے ہیں جن کی طرف ان میں اشارہ کیا گیا ہے اسی طرح حرف بحرف اس رسم کا معاملہ بھی ہے جو قرآن پاک میں ہے۔

اور جس کسی نے کہا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے مذکورہ رسم پر اتفاق کر لیا تھا اس کے کلام کا بطلان بالکل ظاہر ہے اس لیے کہ قرآن پاک نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا گیا اس صورت میں جس چیز پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اتفاق کیا وہ یا تو عین ہیئت ہے یا غیر ہیئت۔ اگر عین ہیئت ہے تو اصطلاح باطل ہے، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سابق ہونا اس کے منافی ہے اور اتباع کو واجب کرتا ہے اور اگر غیر ہیئت ہے تو کیسے ہو سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہیئت پر لکھا جو مثلاً رسم قیاسی کی طرح ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کی مخالفت کی اور کسی اور ہیئت پر لکھ لیا؟ یہ دو وجوہ کی بناء پر غیر صحیح ہے۔

① صحابہ رضی اللہ عنہم کی مخالفت کی طرف نسبت اور یہ محال ہے۔

② صحابہ اور غیر صحابہ تمام امت نے اجماع کر لیا کہ قرآن پاک میں کسی حرف کی زیادتی یا نقصان جائز نہیں اور دو گتوں کے درمیان جو ہے وہ کلام اللہ ہے جب مثلاً نبی کریم نے الرحمٰن اور عالمین کا الف ثابت کر دیا اور مائۃ میں الف کو نہیں بڑھایا اور نہ ہی "ولا وضعوا" میں اور نہ ہی "بایید" میں یاء کو زیادہ کیا تو کیا صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کے برعکس کیا اور اس کی مخالفت کی؟ اس سے لازم آتا ہے کہ انھوں نے قرآن پاک میں زیادتی یا کمی کر کے تصرف کیا (حالانکہ وہ اس سے بالکل بری تھے) اور کسی ایسے کام میں پڑ گئے کہ جس میں انھوں نے اور دوسروں نے ایسی چیز پر اجماع کر لیا جس کا کرنا کسی ایک کے لیے بھی جائز نہ تھا۔ اور (اس صورت میں) دو گتوں کے درمیان جو کچھ بھی ہے سب کے سب میں شک پیدا ہو جائے گا اس لیے کہ جہاں بھی ہم نے سمجھا کہ اس جگہ حروف ناقص ہیں یا زائد ہیں ان حروف پر جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں تھا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا یا یہ سمجھا کہ یہ وحی نہیں ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ہم اسے بعینہٖ نہیں جانتے تو ہم تمام قرآن میں شک کریں گے اور اگر ہم کسی

---

① سورۃ الاعراف:۷۷-۱۶۶، سورۃ الذریات:۵۱ ② سورۃ البقرۃ:۶۱
③ آل عمران:۱۸۴ ④ سورۃ الحشر:۹ ⑤ سورۃ البقرۃ:۲۲۶

صحابی کے بارے میں جائز سمجھ لیں کہ انھوں نے قرآن پاک کی کتابت میں کوئی حرف ایسا بڑھ دیا جو وحی نہیں ہے تو لازم آئے گا کہ ہم کسی دوسرے صحابی کے بارے میں جائز قرار دیں کہ انھوں نے وحی کے کسی حرف میں کمی بھی کی ہوگی اس لیے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں اس صورت میں اسلام کا کڑا پورا کا پورا ٹوٹ جائے گا۔

اس کے بعد ابن المبارک نے کلام کرنے کے بعد فرمایا کہ" میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر رسم توقیفی ہے اور اس کی وحی نبی کریم ﷺ کی طرف کی گئی ہے اور یہ الفاظ قرآن کی طرح ہے تو یہ تواتر کے ساتھ نقل ہوتی کیوں نہیں آئی تا کہ اس کا شک بالکل ختم ہو جاتا اور الفاظ قرآنی کی طرح اس پر دل مطمئن ہو جاتا؟ کیونکہ قرآن پاک کا کوئی بھی حرف ایسا نہیں جو متواتر نقل نہ ہو اور اس میں کسی قسم کا اختلاف اور اضطراب بھی واقع نہیں ہوا ہے جبکہ رسم، اخبار آحاد کے ذریعے نقل ہوئی ہے جیسا کہ اس موضوع کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے اور جو چیز اخبار آحاد سے نقل ہوتی ہے اس کے ناقلین میں اکثر اضطراب واقع ہوتا ہے تو امت وحی میں سے کسی چیز کو کیسے ضائع کر سکتی ہے؟ فرمایا کہ "امت نے وحی سے کچھ بھی ضائع نہیں کیا قرآن پاک بحمد اللہ الفاظاً بھی محفوظ اور رسماً بھی اہل عرفان، گواہوں اور دیکھنے والوں نے اس کے الفاظ اور رسم کو محفوظ کیا اور اس میں سے ایک بال بھی ضائع نہیں کیا اور اسے مشاہدہ سے اور دیکھ کر پایا جو تواتر سے بھی اوپر کی چیز ہے اور باقی لوگوں نے ان کے الفاظ کو محفوظ کیا جو ان تک تواتر کے ساتھ پہنچے اور رسم کے بعض حروف میں ان کا اختلاف مضر نہیں اور نہ ہی امت کو ضائع کرنے والا کہہ سکتے ہیں جیسا کہ عام لوگوں کو قرآن کی جہالت اور اس کے الفاظ کا حفظ نہ ہونا مضر نہیں ہے۔

تیسری رائے: صاحب تبیان اور ان سے پہلے صاحب برہان کا میلان عز بن عبد السلام کے کلام کے مفہوم کی طرف ہے کہ جائز ہے بلکہ واجب ہے کہ اس وقت عام لوگوں کے لیے مصحف کی کتابت ان کے ہاں معروف اصطلاح کے مطابق کی جائے اور ان کے لیے رسم عثمانی کے مطابق کتابت کرنا جائز نہیں تا کہ جہاں کی طرف سے کوئی تغیر واقع نہ ہو لیکن اس وقت بھی رسم عثمانی کی حفاظت واجب ہے جیسے ہمارے سلف صالحین کی طرف سے وارثت میں ملنے والے آثار نفیسہ کا اثر چالیس جاہلین کی جہالت کی رعایت کی وجہ سے اسے چھوڑا نہیں جائے گا بلکہ عارفین کے ہاتھوں میں باقی رہ جائے گا جن سے زمین خالی نہیں ہے۔

اس مقام پر تبیان کی عبارت آپ کی خدمت میں پیش ہے کہ وہ کہتے ہیں:

((واما كتابته اي المصحف على ما احدث الناس من الهجاء .... الخ)).

"جبکہ مصحف کی کتابت ان حروف تہجی پر جنھیں لوگوں نے تیار کر لیا ہے اس پر اہل مشرق جاری ہیں اس بناء پر کہ یہ التباس سے بعید ہے اور اہل مغرب نے اس سے کنارہ کشی کی ان کی نبیاد امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ان سے سوال کیا گیا کہ کیا مصحف کو ان حروف ہجاء پر لکھ سکتے ہیں جنھیں آج کل کے لوگوں نے تیار کیا ہوا ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ نہیں بلکہ پہلی کتابت کے مطابق ہی لکھا جائے۔ برہان میں ہے کہ میں نے کہا کہ یہ پہلی صدی میں تھا اور علم زندہ اور تر و تازہ تھا لیکن التباس کا خوف ہے۔" اسی وجہ سے شیخ عزالدین بن عبد السلام نے فرمایا کہ:

"اس وقت ائمہ کی اصطلاح کے مطابق رسم اوّل کے مطابق مصحف کی کتابت کرنا جائز نہیں تا کہ جہاں کی طرف سے تغیر واقع نہ ہو جائے لیکن اسے مطلقاً جاری کرنا جائز نہیں کہ کہیں علم کے مٹ جانے کا سبب نہ بن جائے۔ اور ایک اور چیز بھی

ہے جسے قدماء نے مستحکم کیا ہے وہ یہ کہ جاہلین کی جہالت کی مراغمات کو ترک نہیں کیا جائے گا اور اللہ کے لیے حجت قائم کرنے والے سے زمین خالی نہیں ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ رائے دو اعتبار سے قرآن پاک کی احتیاط کی رعایت پر قائم ہوتی ہے۔

① اس کی کتابت ہر زمانے میں اس کی معروف رسم کے مطابق کی جائے تا کہ لوگ التباس اور خلط فی القرآن سے دور ہو جائیں۔

② اس کی رسم اوّل جو منقول ہے اسے باقی رکھا جائے جیسے عارفین اور وہ لوگ پڑھتے ہیں جن پر التباس کا خوف نہیں ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ احتیاط بھی ایک بہت بڑا دینی مقصود ہے خصوصاً قرآن پاک کی حفاظت میں۔

قرآن کی کتابت اور اس کے رسم کے بارے میں پیدا ہونے والے شبہات

پہلا شبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب ان کی خدمت میں مصحف پیش کیا گیا تو فرمایا کہ:

((احسنتم واجملتم ان فی القرآن لحنا ستقیمه العرب بالسنتها)).

"بہت اچھا اور عمدہ کام کیا بے شک قرآن پاک میں غلطیاں بھی ہوتی ہیں جنھیں عرب اپنی زبانوں سے درست کر لیں گے۔"

اور کہتے ہیں کہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اسے تبدیل نہ کرو کیونکہ عرب اسے تبدیل کر لیں گے یا فرمایا کہ عرب اپنی زبانوں کے ساتھ اسے درست کر لیں گے اگر کاتب ثقیف سے ہو اور لکھانے والا ھذیل سے ہو تو بھی اس میں یہ حروف نہیں ملیں گے۔

اسلام کے دشمنوں نے یہ دونوں روایتیں ذکر کیں اور کہا کہ یہ دونوں رسم عثمانی میں صریح طعنے ہیں تو مصحف عثمان اور ان کا جمع قرآن محل ثقہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع کیسے بن سکتا ہے اور کیسے توقیفی بن سکتا ہے؟ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خود فرما رہے ہیں اور منہ بھر کر فرما رہے ہیں کہ "ان فیه لحنا" اس میں غلطیاں ہیں۔

جواب ① یہ دونوں روایتیں ضعیف الاسناد ہیں اور ان میں اضطراب وانقطاع ہے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "یہ بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بالکل ثابت ہی نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ آپ بھی میرے ساتھ ان دونوں روایتوں کے سقوط کی طرف نظر ڈالیں تو آپ کو ان دونوں دلیلوں میں تناقض سا نظر آئے گا جو ان کے وصف میں ظاہر ہے کہ مصحف کے لکھنے والوں کو تو کہہ رہے ہیں کہ انھوں نے اچھا کیا اور عمدہ کیا اور انھوں نے جو مصحف لکھا اس کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ اس میں غلطیاں ہیں کیا جن لوگوں نے مصحف میں غلطیاں کی ہوں انھیں یوں کہا جاتا ہے کہ تم نے اچھا کیا اور عمدہ کیا؟

اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہی جواب دیا جا سکتا ہے کہ یوں کہا جائے کہ اس سے مراد کوئی اور معنی ہے۔

② حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کمال ضبط اور احتیاط جو کہ معروف ہے وہ اس جیسی مثالوں کے صدور کو محال بنا دیتی ہیں آپ ان کا گزشتہ بالا دستور دیکھیں جو انھوں نے جمع قرآن میں اپنایا پھر اس روایت کو دیکھیں جسے حضرت ابو عبید رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے

غلام عبدالرحمن بن ہانی سے روایت کیا کہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس تھا کہ وہ مصاحف کو پیش کر رہے تھے انھوں نے مجھے بکری کے کندھے کی ہڈی دے کر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجا اس میں لکھا ہوا تھا "لَمْ يَتَسَنَّ" اور "لا تبديل للخلق" اور "فَأَمْهِلِ الْكَافِرِيْنَ" انھوں نے دوات منگائی اور دو لاموں میں سے ایک کو مٹا دیا اور "لِخَلْقِ اللهِ" لکھ دیا اور "فامهل" کو مٹا کر "مَهِّلْ" لکھ دیا اور "لم يتسنَّهْ" لکھ دیا اور اس میں ہاء کو بڑھا دیا۔

ابن الانباری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ "کیسے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے غلطی کو دیکھ کر اسے جاری کر دیا؟ حالانکہ وہ جو لکھتے تھے اس میں خوب غور و فکر کرتے تھے اور اس پر دوسروں کو مطلع کرتے تھے اور اسے لکھنے والوں کے ذریعے اس کے اختلاف کو دور کیا کرتے تھے اور حق کو ثابت کرتے اور درستگی کا اثبات انھیں لازم کرتے اور اسے قائم رکھتے۔

③ اگر مذکورہ بالا دونوں روایتوں کو صحیح فرض کر لیا جائے تو بھی اس کی تاویل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے صحیح مصحف کو لکھوانے اور جمع میں قرآن میں صحیح متواتر اور متفق علیہ روایات سے ہو نیز انتہائی تحقیق و جستجو، دقت اور ضبط سے ہو سکتی ہے۔

بایں طور کہ "لحنًا" (غلطی) سے مراد مذکورہ دونوں روایتوں میں قرأت اور لغت کی غلطی ہو اور معنی یہ ہوگا کہ قرآن پاک اور اس کے مصحف کے رسم میں ایسی وجہ ہے کہ اس پر تمام عربوں کی زبان جاری نہیں ہو سکتی لیکن تھوڑا زمانہ بھی گزرے گا کہ مشق اور کثرت کے ساتھ تلاوت قرآن کی وجہ سے تمام کی زبانیں جاری ہو جائیں گی بعض جلیل القدر علماء نے بھی اس کی مثال دی ہے کہ مثلا کلمہ "الصراط" جو کہ سین سے بدل ہے اب عرب رسم پر عمل کرتے ہوئے اسے صاد کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اصل پر عمل کرتے ہوئے سین کے ساتھ۔

دوسرا شبہ

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ "والمقيمين الصلوة" پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کاتبوں کی غلطی ہے۔

جواب: سابقہ طرز کے مطابق اس کی توجیہ بھی یہی ہوگی کہ حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کلمہ لحن سے مراد خطا نہیں لیا بلکہ لغت اور وجہ قرأت مراد لی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ (محمد: ۳۰)

"آپ انھیں انداز گفتگو سے بھی پہچان لو گے۔"

اس توجیہ کے پر دلیل یہ ہے کہ حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ خود پڑھتے تھے ﴿وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ﴾ (النساء: ۱۶۲) اگر لحن سے ان کی مراد خطا ہوتی تو وہ خود اپنے لیے بھی اس قرأت کو پسند نہ کرتے جب وہ ایک چیز کو خطا سمجھ رہے ہیں تو پھر اسے پسند کیسے کر رہے ہیں؟

یہ کلمہ سورۃ النساء اس طرح ہے:

﴿لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا۠﴾ (النساء: ۱۶۲)

"مگر جو لوگ ان میں سے علم میں پکے ہیں اور جو مومن ہیں وہ اس (کتاب) پر جو تم پر نازل ہوئی اور جو (کتابیں) تم سے پہلے نازل ہوئیں (سب پر) ایمان رکھتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور خدا اور روز آخرت کو مانتے ہیں۔ ان کو ہم عنقریب اجر عظیم دیں گے۔"

اب کلمہ ﴿وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ﴾ (النساء: ۱۶۲) کو جمہور نے "یا" کے ساتھ منصوب پڑھا، جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اور ایک جماعت نے واؤ کے ساتھ پڑھا جن میں سے ابو عمرو بھی ہیں جیسا کہ ان کی روایت یونس اور ہارون سے ہے دونوں قراءتوں میں سے ایک صحیح وجہ پر ہے اور لغت عربیہ میں فصیح ہے نصب کا مدار مدح پر ہوگا اور تقریری عبارت "وامدح المقيمين الصلوة" ہوگی اور رفع کا مدار عطف پر ہوگا اور معطوف علیہ مرفوع ہے جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

تیسرا شبہ وہ کہتے ہیں کہ کیا جمع قرآن اور اس کے رسم پر اعتراض کے طور پر یہ روایت کافی نہیں ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿حَتّٰى تَسْتَاْذِنُوْا وَتُسَلِّمُوْا﴾ (النور: ۲۷) کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ کاتب سے غلطی ہوگئی درست ﴿حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا﴾ (النور: ۲۷) ہے۔

جواب ① ابو حیان اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ جس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی وہ اسلام پر اعتراض کرنے والا اور دین میں ملحد ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس سے بری ہیں۔

② ابن ابی حاتم اور ابن الانباری نے "المصاحف" میں اور ابن جریر اور ابن مردویہ نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ انھوں نے "تستأنسوا" کی تفسیر میں فرمایا کہ "یعنی اجازت والے سے اجازت لے لو یعنی گھر والے سے۔"

③ قراء نے "تستأنسوا" کے علاوہ کوئی بھی قراءت نقل نہیں کی اگر یہ نقل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح ہوتی تو وہ بھی نقل کرتے کہ انھوں نے "تستأذنوا" پڑھا۔

④ اگر ہم تسلیم کرلیں کہ یہ خبر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے تو بھی ہم اسے پس پشت ڈالتے ہوئے رد کرتے ہیں کہ صحت کا یہ دعویٰ صحیح نہیں اس لیے کہ یہ قطعی اور متواتر قراءت کے معارض اور وہ قراءت "تستانسوا" ہے اور قاعدہ ہے کہ قطعی کا معارض ساقط ہوتا ہے اور روایت جب مصحف کی رسم کے مخالف ہو تو وہ شاذ ہوتی ہے اور اس کی طرف التفات نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اس پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔

چوتھا شبہ وہ کہتے ہیں کہ کیا جمع قرآن اور رسم قرآنی پر اعتراض کے طور پر یہ روایت کافی نہیں جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے "افلم يتبين الذين امنوا لو يشاء الله لهدى الناس جميعا" پڑھا انھیں کہا گیا کہ مصحف میں ﴿اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا﴾ (الرعد: ۳۱) ہے انھوں نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ کاتب نے اسے سوتے ہوئے لکھا تھا۔

جواب یہ روایت بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ مروی نہیں ہے ابو حیان نے فرمایا کہ بلکہ یہ کسی ملحد اور زندیق کا قول ہے۔ زمخشری نے فرمایا کہ ہم اس کی تصدیق نہیں کر سکتے جو اللہ تعالیٰ کی اس کتاب میں آیا جس کے پاس باطل نہ سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے یہ کیسے مخفی رہ سکتا ہے کہ امام (یعنی مصحف امام) یعنی مصحف عثمان دونوں گتوں کے درمیان باقی ہے حالانکہ یہ

مصحف ان حضرات کے ہاتھ میں رہا تھا جو اللہ تعالیٰ کے دین میں محتاط اور اس پر نگہبان تھے اس کی عظمتوں اور دقائق سے غافل نہ تھے۔ خصوصاً اس قانون سے جس کی طرف رجوع ہوتا تھا اور اس قاعدہ اور بنیاد پر جس پر بناء تھی اللہ کی قسم یہ ایک جھوٹا الزام ہے اس میں ذرا بھی سچ نہیں ہے۔ فراء نے فرمایا کہ: "لایتلی الا کما اُنزل" (جیسے نازل ہوا اس کے علاوہ کس طرح بھی نہیں پڑھا گیا) "اَفَلَمْ یایئس... الخ" اس بناء پر یہ روایت درمنثور وغیرہ میں حضرت ابن عباس سے غیر صحیح روایت ہے اور "افلم یایئس" کا معنیٰ "اَفَلَمْ یَعْلَمُوا" (کیا انھوں نے نہیں جانا) ہے قاسم بن معن نے فرمایا کہ یہ ہوازن کی لغت ہے۔ اور اس میں عربی شعر بھی آیا ہے شاعر نے کہا:

اقوال لھم بالشعب اذ یا سروننی　　　　اَلَمْ تایئسو انی ابن فارس زھدم

"میں انھیں گھاٹی میں کہہ رہا تھا وہ مجھے قید کر رہے تھے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں گھوڑ سوار زہدم کا بیٹا ہوں۔

یعنی "اَلَمْ تعلموا" (کیا تم نہیں جانتے؟)

پانچواں شبہ: وہ کہتے ہیں کہ اعتراض کی وجوہ میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قول ﴿وَ قَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ﴾ (الاسراء: ۲۳) کے بارے (اور آپ کے رب نے فیصلہ کیا کہ تم اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو) کے بارے میں فرمایا کہ یہ "ووصی ربك" واؤ صاد کے ساتھ مل گئی اور وہ ﴿وَ وَصّٰی رَبُّكَ﴾ پڑھا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ﴿اَمَرَ رَبُّكَ﴾ (تیرے نے حکم دیا) یہ دونوں واؤ میں ایک صاد کے ساتھ مل گئی اور ان سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے یہ تمہارے نبی کی زبان میں نازل کیا۔" ﴿وَ قَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ﴾ (الاسراء: ۲۳) ایک واؤ کے ساتھ مل گئی اب لوگوں نے ﴿وَ قَضٰی رَبُّكَ﴾ پڑھ دیا اگر "قضاء" کے لفظ سے نازل ہوتا تو کوئی بھی شرک نہ کرتا۔

ان سب کا جواب: ① ابن الانباری فرماتے ہیں کہ یہ روایات ضعیفہ ہیں۔

② یہ روایات متواتر اور قطعی روایات کے معارض ہیں اور وہ قرأت "وقضی" ہے اور قطعی کا معارض ساقط ہوتا ہے۔

③ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے خود مشہور ہے کہ انھوں نے "وَقَضٰی" پڑھا اور یہ اس لیے کہ ان روایات میں ان کی طرف جو یہ پُر فریب روایات منسوب ہیں جنھیں دشمنان اسلام نے ملمع سازی کرتے ہوئے گھڑا ان پر دلیل ہو جائے۔

ابو حیان نے "البحر" میں فرمایا کہ متواتر "وقضی" ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مشہور و معروف ہے نیز حضرت حسن اور قتادہ سے بھی اسی طرح مشہور و معروف ہے جس کا معنیٰ "اَمَرَ" ہے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے فرمایا کہ یہ "وَصّٰی" کے معنیٰ میں ہے اس صورت میں "وقضی" والی روایت جس پر حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہ کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ نہیں ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ہم اسے بعینہ نہیں جانتے تو ہم تمام قرآن میں شک کریں گے اور اگر ہم کسی اس لیے اس طرح کی گری پڑی روایات کو ملحدوں کے علاوہ کسی کے پلے کے ساتھ نہیں لٹکایا جائے گا۔

چھٹا شبہ: وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ: ﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَ ضِیَآءً﴾ (الانبیاء: ۴۸) پڑھتے اور فرماتے کہ اس واؤ کو لے کر ﴿اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ﴾ (آل عمران: ۱۷۳) میں لگا دو اور یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ اس واؤ کو ہٹا کر ﴿اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ

حَوْلَهُ﴾ (غافر: ۷) میں لگادو۔

جواب ① یہ متواتر اور اجماعی قرأت کے معارض ہونے کی وجہ سے ساقط ہے۔

② قرآن پاک کی بلاغت واؤ کے وجود کا فیصلہ کرتی ہے حذف کا نہیں اس لیے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آیت میں مذکور "الفرقان" کی تفسیر کی ہے "النصر" کے ساتھ۔

اسی بناء پر "الضیاء" بمعنی "التوراۃ" یا "الشریعۃ" ہوگی لہٰذا واؤ کا یہ مقام اسی تغایر کی وجہ سے ہے۔

ساتواں شبہ

وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ﴾ (النور: ۳۵)

کے بارے میں بھی منقول ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے وہ اس سے بہت بڑا ہے کہ اس کا نور طاقچے کے نور کی طرح ہو بلکہ مومن کا نور طاقچے کی طرح ہوتا ہے۔

جواب ① یہ روایت متواتر اور قطعی روایات کے معارض ہونے کی وجہ سے ساقط ہے۔

② کسی بھی قاری سے یہ منقول نہیں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے "مثل نور المومن" پڑھا ہو، پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کسی چیز کو خطا سمجھتے ہوں اور پھر اسے پڑھتے بھی ہوں؟ اور جسے وہ درست سمجھتے ہوں اسے چھوڑتے ہوں؟ خبر دار یہ ایک بدنام جھوٹ ہے اگر ان لوگوں نے اسے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہوتو معاملہ اور بھی زیادہ آسان ہوجائے گا اس لیے کہ قراءات شاذہ میں مروی ہے کہ حضرات ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے "مثل نور المومن" پڑھا اور مناسب یہ ہے کہ ان روایات کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے قراءت معروفہ متواترہ میں ضمیر کی تفسیر کا ارادہ کیا اور وہ "مثل نورہ" ہے لہٰذا یہ روایت ان سے تفسیر میں ہے قرأت میں نہیں دلیل یہ ہے کہ وہ "مثل نورہ" پڑھا کرتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا عمومی دفاع

ان شبہات میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جتنی بھی روایات ہیں ان کا ایک عمومی دفاع بھی ہے وہ یہ کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قرآن پاک حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے سیکھا اور جمع مصاحف میں یہ دونوں تھے اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہونے والے جمع قرآن میں بھی تھے اور کاتب وحی بھی تھے اور یہ وہی لکھا کرتے تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یا ان کا اقرار ہوتا تھا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اسے جانتے تھے اور اس کا یقین بھی رکھتے تھے اب اس صورت میں محال ہے کہ وہ اپنی زبان سے کوئی ایسا کلمہ بولیں جو جمع قرآن یا رسم قرآن پر اعتراض کا باعث ہو۔ ورنہ کیسے ممکن ہے کہ وہ حضرت زید رضی اللہ عنہ اور ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے حاصل بھی کریں اور ان کے جمع اور رسم پر اعتراض بھی کریں۔

آٹھواں شبہ

وہ کہتے ہیں کہ حضرت ہشام بن عروہ کے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ﴿اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ﴾ کے بارے میں سوال کیا اور ﴿وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ﴾ (النساء: ۱۶۲) اور ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ﴾ (المائدہ: ۶۹) کے لحن کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اے بھتیجے! یہ کاتبوں کا عمل ہے انھوں نے کتابت میں غلطی کی۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا کہ اس کی سند صحیح اور شیخین کی

شرط کے مطابق صحیح ہے۔

وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت ابو خلف جو کہ بنی جمح کے مولیٰ ہیں روایت کرتے ہیں کہ میں عبید بن عمیر کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا میں آپ کے پاس ایک آیت کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے کیسے پڑھتے تھے؟ انھوں نے فرمایا کہ کون سی آیت؟ میں نے عرض کیا کہ ﴿وَ الَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ﴾(المؤمنون:۶۰) یا ﴿الَّذِیْنَ یَاْتُوْنَ مَآ اَتَوْا وَّ﴾؟ انھوں نے فرمایا کہ تمھیں کیسے پسند ہے؟ میں نے عرض کیا کہ "اس جان کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے ان میں سے ایک طریقے سے پڑھنا مجھے تمام دنیا سے زیادہ پسند ہے انھوں نے فرمایا کہ وہ کون سا طریقہ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ: ﴿الَّذِیْنَ یَاْتُوْنَ مَآ اَتَوْا وَّ﴾ انھوں نے فرمایا کہ میں گواہی دیتی ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ ہم اسی طرح پڑھا کرتے تھے اور اسی طرح نازل ہوئی۔ (اور فرمایا کہ) لکن الھجاء حرف" لیکن ہجاء ایک حرف ہے۔"

جواب ① ان روایات کی سند جتنی بھی صحیح ہو پھر بھی متواتر قطعی کے خلاف ہے اور قطعی کا معارض مردود ہوتا ہے اس لیے اس کی طرف توجہ نہیں دی جائے گی اور ان پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

② "کتاب اتحاف فضلاء البشر" میں تصریح ہے کہ "ھذان" کو مصحف میں بغیر الف اور یاء کے لکھا گیا ہے تاکہ اس میں پائی جانے والی چار قرأتوں کا احتمال ہو سکے، جیسا کہ ہم نے پیچھے رسم عثمانی کے فوائد میں کھول کھول کر بیان کر دیا اس صورت میں یہ کہنا معقول نہ ہوگا کہ کاتب نے خطا کی کیونکہ کاتب نے نہ الف لکھا اور نہ یہ یاء لکھا اگر اس مقام پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خیال کے مطابق خطا ہوتی تو وہ کاتب کی طرف منسوب نہ کرتیں بلکہ ان قاریوں کی طرف منسوب کرتیں جو "ان" کی تشدید اور "ھذان" میں الف کا تلفظ کرتے ہیں حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بلکہ کسی اور سے بھی منقول نہیں ہے کہ انھوں نے مذکورہ بالا طریقے سے پڑھنے والوں کو غلط قرار دیا ہو۔ وہ کیسے غلط قرار دے سکتی ہیں حالانکہ یہ قرأت متواترہ ہے اور اجماعی ہے؟ بلکہ اکثر قراء کی قرأت ہے اور عربی میں اس کا ایک فصیح مرتبہ اور مقام ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جیسوں پر مخفی نہیں رہ سکتا۔ یہ تثنیہ کے تمام حالات میں اس کے ساتھ الف کو لازم کرنا ہے۔ عربی شاعر کے قول میں بھی آیا ہے۔

واھًا لسلمی ثم واھاثم واھًا　　　یالیت عیناھا لنا وفاھا

"واہ سلمی کے لیے پھر واہ اور پھر واہ۔ کاش کہ اس کی آنکھوں نے ہمارے ساتھ وفا کی ہوتی۔"

وموضع الخلخال من رجلاھا　　　بثمن یرضی به اباھا

"اس کے پاؤں میں اس کے پازیب کی جگہ۔ کی اتنی قیمت ہے کہ اس کا باپ بھی اس پر راضی ہو جاتا ہے۔"

ان اباھا وابا اباھا　　　قد بلغا فی المجد غایتاھا

"بے شک اس کا باپ اور دادا۔ بزرگی میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بعید ہے کہ وہ اس قرأت کا انکار کریں اگرچہ اسے مصحف کا رسم اکیلے ہی لائے۔

③ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف جو منسوب ہے کہ انھوں نے ﴿وَ الْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ﴾ میں یاء کے ساتھ مصحف کے رسم کو غلط قرار د[یا] یہ بھی مردود ہے اس لیے کہ ابو حیان نے "البحر" میں فرمایا کہ:

"اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابان بن عثمان رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اسے "یاء" کے ساتھ لکھنا مصحف کے کاتب کی غلطی ہے۔"

جبکہ یہ بات ان دونوں سے ثابت نہیں کیونکہ یہ دونوں عربی اور فصیح تھے اور قطعِ صفات عرب زبان میں مشہور ہے اور یہ ایک وسیع باب ہے جس پر سیبویہ نے شواہد قائم کیے ہیں۔

زمخشری نے فرمایا کہ انھوں نے جو دعویٰ کیا ہے کہ مصحف کے خط میں خطا ہے اس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا اس کی طرف کبھی وہ شخص توجہ کر سکتا ہے جس نے کتاب میں (یعنی سیبویہ کی کتاب میں) نظر نہ کی ہو اور نہ ہی عرب کے مذاہب کو جانا ہو اور نہ ہی اسے معلوم ہو کہ اختصاص کی بناء پر نصب بھی ایک تفنن ہے اور اس پر یہ بات بھی مخفی ہو کہ سابقین اولین جن کی مثالیں تورات میں بھی اور انجیل میں بھی وہ اسلامی غیرت اور اس کے اعتراضات کو دُور کرنے میں بہت زیادہ باہمت تھے پھر وہ کتاب اللہ میں کیسے ایک دراڑ چھوڑ سکتے تھے جس بعد والوں کو بھرنا پڑے اور کیسے پھٹن چھوڑ سکتے ہیں جسے بعد والے سیتے رہیں۔

④ "الصائبون" واؤ کے ساتھ اس قرأت کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہی نہیں کہ اسے پڑھنے والے کو انھوں نے غلطی پر قرار دیا ہو اور یہ بھی منقول نہیں کہ انھوں نے واؤ کو چھوڑ کر "یاء" کے ساتھ پڑھا ہو لہٰذا یہ معقول ہی نہیں کہ انھوں نے واؤ لکھنے والے کو غلطی پر قرار دیا ہو۔

⑤ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کلام جو اللہ تعالیٰ کے قول "یوتون ما اتو" کے بارے میں ہے یہ قرأت متواترہ اجماعی کے انکار کا فائدہ نہیں دیتا بلکہ انھوں نے سوال کرنے والے کو کہا کہ تمہیں دونوں میں سے کونسا پسند ہے؟ اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے اور خود پڑھے ہوئے پر منحصر نہیں کر رہیں بلکہ صرف یہ فرما رہی ہیں کہ مسموع و منزل فقط اسی طرح ہے۔ اور یہ دوسری قرأت کے مسموع قرأت ہونے کے منافی نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر ہو۔

اور ان کا فرمایا کہ "لکن الھجاء حرف" یہ کلمہ "حرف" سے ماخوذ ہے جس کا معنیٰ قرأت اور لغت ہے لہٰذا معنیٰ یہ ہوگا کہ یہ قرأت متواترہ جس کے ساتھ مصحف لکھا گیا یہ بھی ایک لغت اور قرآن کریم کی وجوہ اداء میں سے ایک وجہ ہے۔ اور یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث میں "حرف" کا کلمہ "تحریف" سے ماخوذ ہے جس کا معنیٰ خطاء ہے ورنہ یہ حدیث متواتر کے معارض ہو جائے گی اور قطعی کا معارض ساقط ہوتا ہے۔

نواں شبہ

وہ کہتے ہیں کہ حضرت خارجہ بن زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ اے ابو سعید! آپ کو غلطی لگ گئی یہ "ثمانیہ ازواج من الضان اثنین اثنین و من الاہل اثنین اثنین و من البقر اثنین اثنین" ہے انھوں نے فرمایا کہ نہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

﴿فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ﴾ (القیامۃ: ۳۹)

"یہ دو جوڑے ہیں ان میں سے ہر ایک جوڑا ہے مذکر ایک جوڑا اور مؤنث ایک جوڑا... الخ۔"

دشمنانِ اسلام نے کہا کہ یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ مصحف لکھنے والوں نے تصرف کیا اور انھوں نے قرآن پاک کی کتابت اور رسم میں جو چاہا اختیار کر لیا۔

جواب حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ کلام ان کے دعویٰ پر دلالت نہیں کرتا بلکہ انھوں نے جو لکھا اور پڑھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا اس کی توجیہ بیان کرنے پر دلالت کرتا ہے اس پر نہیں کہ یہ ان کا تصرف اور اپنی طرف سے خواہش ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم سے قرآن پاک میں اس طرح کیسے متصور ہو سکتا ہے حالانکہ وہ اپنے کمال ضبط اور کتاب سنت میں تحقیق و جستجو میں ضرب المثال تھے خصوصاً حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور آپ نے گزشتہ بالا سطور میں جان لیا کہ حضرت زید اپنے حفظ، امانت، دین اور تقویٰ میں کیا تھے؟ اور آپ نے مصحف اور مصحف کی کتابت میں ان کا دقیق و حکیم طریقہ کار بھی جان لیا تو پھر کہاں الٹے جا رہے ہیں؟

دسواں شبہ وہ کہتے ہیں کہ مروان نے ہی سورۃ فاتحہ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ (الفاتحہ: ۳) یعنی ﴿مٰلِكِ﴾ میں الف کے حذف کے ساتھ پڑھا تھا اور وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے اسے اپنی طرف سے حذف کیا تھا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس میں کوئی حدیث وارد نہیں ہوئی چہ جائیکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لفظاً یا قراءتاً متواتر ہو یا کتابتاً اور رسماً آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ہو۔

جواب یہ بالکل جھوٹا اور بدنام قسم کا بہتان ہے اس لیے کہ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ہی کوئی سند ہے۔

دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ دلیل قائم ہو چکی اور تواتر تام ہو چکا اور اجماع بھی منعقد ہو چکا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ (الفاتحہ: ۳) کو الف کو قائم رکھ کر بھی پڑھا اور اسے حذف کر کے بھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان سے اسے حاصل کیا اب جنھوں نے دونوں طرح پڑھا وہ حضرت علی، ابن مسعود اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم ہیں اور جنھوں نے قصر کے ساتھ یعنی الف کو حذف کر کے پڑھا وہ ابوالدرداء، ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم ہیں اور جنھوں نے مد کے ساتھ یعنی الف کو ثابت رکھتے ہوئے پڑھا وہ ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم ہیں یہ سب لوگ مروان سے پہلے تھے بلکہ مروان کے پیدا ہونے سے پہلے اور مروان کے پڑھنے سے پہلے کے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مروان کی قرأت اتفاقاً قصر کی ہو فقط اور اس سے ہمیں کچھ بھی نقصان نہیں۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ ﴿مٰلِكِ﴾ کا کلمہ مصحف عثمانی میں "ملك" اس طرح لکھا ہوا ہے جیسا کہ گزرا۔

جواب کا خلاصہ یہ اور ان جیسے شبہات نصوص قطعیہ اور واضح دلائل کے ذریعے مدفوع ہیں۔ کہ تمام قرآن جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اور اس کے اثبات اور رسم کا حکم دیا اور کسی ناسخ نے اسے اپنی تلاوت میں نسخ نہیں کیا یہ وہ قرآن ہے جس کا مصحف عثمانی نے دو گتوں کے درمیان احاطہ کیا اور اس سے نہ کسی چیز کو کم کیا اور نہ زیادہ کیا بلکہ اس کی ترتیب اور نظم دونوں اسی طرح ثابت میں جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے پرو دیا اور جس آیت یا سورت کی جیسے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ترتیب بنائی اس میں سے نہ کسی مؤخر کو مقدم کیا اور نہ ہی کسی مقدم کو مؤخر، اور امت نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر سورت کی ترتیب اور اس کے موقع کو ضبط کیا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نفس قرأت اور نفس تلاوت ثابت ہیں جیسا کہ گزرا اور جیسا کہ عنقریب قراءات پر کلام کرتے ہوئے آگے آئے گا ان شاء اللہ۔

اس طرح کے شبہات کے رد میں ہمیشہ دو امور ملاحظہ کرنے چاہئیں:

① یہ سنہری قاعدہ جسے علماء نے وضع کیا ہے کہ خبر آحاد جب کسی قطعی دلیل کے معارض ہو جائیں تو وہ درجہ اعتبار سے ساقط ہو جائیں گی اور انھیں دیوار پر مار دیا جائے گا تو پھر اس کی سند کا درجہ صحیح کیسے ہو سکتا ہے۔

② ہم نے آٹھویں بحث میں دفاعی لائن کھینچی ہے وہ ایک مضبوط قلعہ ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کو سوء حفظ، عدم تحقیق و جستجو اور چھان میں خصوصاً کتاب اللہ اور سنت رسول میں ہو اس سے بچاتی ہے۔

ہمارے زمانے میں میں رسم عثمانی کے التزام پر شبہ

وہ کہتے ہیں کہ بہت سے طلباء قرآن پاک کو محفوظ نہیں کر پاتے اور مصحف میں قرأت اچھی طرح سے نہیں کر پاتے اس لیے کہ انھیں رسم عثمانی کی معرفت نہیں ہوتی پھر ہم اس رسم کے پابند کیوں ہیں اور آج کی معروف اصطلاحی کتابت پر اسے کیوں نہیں لکھ پاتے تا کہ مبتدیوں کے لیے آسانی ہو جائے اور لوگوں کے سہل ہو جائے۔

جواب ① اس کے جواز میں علماء کی آراء مختلف ہیں بلکہ بعض نے کہا (یعنی عز بن عبدالسلام نے کہا) کہ عام لوگوں کے لیے مصحف کی کتابت ان کی حدیث کی کتابت کی اصطلاح کے مطابق کرنا واجب ہے کیونکہ اس کے بغیر التباس کا خوف ہے جیسا کہ اس کی کتابت رسم عثمانی کے مطابق کرنا واجب ہے تا کہ اس گراں قدر میراث کی حفاظت ہو جائے اور علماء کرام کی آراء کی تشریح گزر چکی اور وہ آپ سے بعید نہیں ہے۔

② رسم عثمانی کے کچھ مرجحات اور فوائد بھی ہیں جنھیں ہم نے پیچھے ذکر کر دیا۔

③ جمہور کا مذہب بھرپور دلائل پر مبنی ہے جو ان کے نزدیک اس رسم کے التزام کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں اور وہ دلائل بھی پیچھے گزر چکے ہیں۔

④ ہمارے زمانے کے اصطلاحی خط اور کتابت میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے اور قرآن کی عظمت میں مبالغہ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اسے رسم میں تبدیلی اور تغیر سے محفوظ رکھا جائے۔

⑤ مصحف کو جدید خط کی اصطلاحات کے تابع کرنا بسا اوقات اسے فتنہ کی طرف گھسیٹ لے جاتا ہے جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک فتنہ رونما ہوا جس نے انھیں جمع قرآن پر مجبور کر دیا۔ بعض اوقات بعض لوگ یا بعض قبیلے مصحف کے رسم میں ان کے قواعد کے اختلاف کے وقت ایک دوسرے کو کہتے ہیں کہ میرا رسم تم سے اچھا ہے یا میرا مصحف تم سے اچھا ہے یا میرا رسم تم سے درست اور تمہارا رسم غلط ہے بلکہ بعض اوقات تو معاملہ یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو گنہگار کہنے یا ایک دوسرے سے لڑائی کرنے لگ جاتے ہیں۔

اور یہ بات طے ہے کہ ان مفاسد کو دور کرنا جلب مصلحت پر مقدم ہے۔

⑥ رسم عثمانی اس عام رسم کے مشابہ ہے جو امت کو تمام زمان و مکان میں اپنے رب کی کتاب کو لکھنے پر جمع کرتی ہے جیسے لغت عربیہ ایسی زبان ہے جو امت کو ہر زمانے اور ہر مکان میں اپنے رب کی کتاب کو پڑھنے پر جمع کرتی ہے اور یہ رسم امت کو ایک لڑی میں پروتی ہے نہ ماضی میں کوئی فرق پڑتا ہے نہ حال میں اور نہ ہی مستقبل میں۔

⑦ لوگوں کے لیے قرآن پاک کی خوب اشاعت کرتے ہوئے قرآن پاک کی قرأت آسان ہو جاتی ہے اور یہ اشاعت بھی ایک مضبوط اور دقیق ہو جاتی ہے نیز مدارس میں تجوید اور متعلمین کے صیغوں میں بھی مضبوط اشاعت ہو جاتی اور آخر میں ممکن ہے کہ جیسا کہ "مجلة الازھر" میں فرمایا کہ مصحف کے ہر صفحہ کے ذیل میں ہم آپ کو بتلائیں گے کہ ان میں کتنے کلمات ہیں جو رسم

معروف اور اصطلاحی مالوف کے مخالف ہیں خصوصاً مصاحف عثمانیہ کی رسم جو خط واملاء میں ہمارے قواعد کے مخالف نہیں ہے مگر بہت کم اور مزید یہ کہ دونوں اسموں کے فرق سے ہوشیار قاری کو اس میں غور وفکر کے وقت التباس اکثر نہیں ہوتا۔

اور امت پر صدیاں اور زمانے گزر چکے لیکن انھیں رسم عثمانی کے التزام میں ذرا بھی عیب محسوس نہیں ہوا حالانکہ شروع میں سب سے پہلے جس چیز پر بھروسہ کیا گیا وہ لوگوں کے سینوں سے (قرآن پاک کو) وصول کرنے کا طریقہ تھا اور تلقی (یعنی وصول کرنے) سے رسم کا ابہام ختم ہو جاتا ہے خواہ وہ ابہام کیسا ہو کیوں نہ ہو۔ آنکھوں کے دیکھنے کے بعد بیان کی ضرورت نہیں۔

مصاحف کی تفصیل

شاید آپ کو یاد ہو کہ گزشتہ بالا ابحاث میں ہم نے مصاحف عثمانیہ کے فروغ اس کی کتابت ورسم کو ذکر کر دیا تھا اور یہ بھی ذکر کیا تھا کہ اس کے علاوہ جو انفرادی مصاحف بعض صحابہ کے پاس تھے انھیں جلوا دیا اور ان مصاحف کو بھی جلوا دیا جو ایک دوسرے کے مخالف تھے جس قدر بھی انھیں معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی ایک کو قراءات کے حروف کا علم ہے یا ان میں سے کسی کو آخری مرتبہ میں ہونے والے منسوخ یا غیر منسوخ کا علم ہے۔ مصاحف عثمانیہ کے متعلقات کے احاطہ کے لیے مناسب یہ ہے ہم آپ کے ساتھ مندرجہ ذیل باتیں کریں۔

مصاحف عثمانیہ میں حروف سبعہ

جن مصاحف کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لکھا ان کا مجموعہ ان حروف سبعہ پر مشتمل تھا جن پر قرآن پاک نازل ہوا جیسا کہ ہم اسے نزول قرآن علی سبعۃ احرف کی بحث میں ایک خاص عنوان کے تحت اچھی طرح سے بیان کر آئے ہیں اگر آپ چاہیں تو وہاں رجوع کر لیں اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ان مصاحف کو ان صحیفوں سے لکھا گیا ہے جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جمع کیے گئے اور یہ صحیفے حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھے۔

اور اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ صحیفے جن میں قرآن پاک لکھا گیا انھی حروف سبعہ کے ساتھ لکھا گیا جن پر یہ نازل ہوا اور یہ کہیں وارد نہیں ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان میں سے چھ حروف کو ترک کرنے اور ایک کو باقی رکھنے کا حکم دیا جیسا کہ بعض علماء کا یہ مذہب ہے۔ لہٰذا ہمیں متفق علیہ کو پکڑنا چاہیے تاکہ ہمارے پاس ایسی چیز ثابت ہو جائے جو اس کی نفی کرنے والی ہو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم شک کی وجہ سے یقین کو چھوڑ دیں؟ پھر فتنہ کو ہٹانا اور مسلمانوں کے درمیان کلمہ کا ایک ہونا اس بات پر موقوف نہیں کہ ہم چھ حروف کو چھوڑ دیں اور ایک حرف کو باقی رکھیں بلکہ فتنہ کو ہٹنے اور کلمہ کا ایک ہونے کا ذریعہ یہ ہے کہ نازل ہونے والے کا اسی طرح اقرار کیا جائے جس طرح وہ نازل ہوا یعنی اس کے حروف سات ہونے کو اس امت کے لیے رحمت شمار کرنا۔ اس باب میں زیادہ سے زیادہ جو چیز واجب ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان علمی طور پر ان حروف کو گھیر لیں اور باقی کو چھوڑ دیں اور اس کے سوا کسی پر اعتماد نہ کریں حتیٰ کہ ان میں سے ہر ایک اپنے علاوہ کی قرائت کو درست سمجھے جب تک کہ اس کی قراءت حد سے تجاوز نہ کرے۔ اسی طریقے سے ان کے فتنے دور ہوں گے اور ان کا کلمہ ایک ہوگا اور اسی طریقے پر ہوں: بن سیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کیا جبکہ بعض صحابہ کے درمیان اس طرح

کے فتنے بھڑک گئے تھے چنانچہ آپ ﷺ نے ان کا علاج اس طرح سے کیا کہ انھیں سمجھایا کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا اور یہ معنی ان میں پختہ ہوگیا اور آپ نے حکم دیا کہ اختلاف کرنے والوں میں سے ہر ایک اپنی قرأت میں درست ہے اور قرآن پاک اسی طرح نازل ہوا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تمام امت سے ممکن نہیں کہ وہ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کے طریقے کو چھوڑ دیں۔ "وَاِنَّ خَيْرَ هَدْيٍ هَدْيُ مُحَمَّدٍ۔"

باقی رہی یہ بات کہ ہم آپ کے سامنے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قول کے معنی کی تفسیر کر دیں جو انھوں نے قریش کی ایک جماعت سے فرمایا تھا کہ "جب تم اور زید رضی اللہ عنہ قرآن پاک کی کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے قریش کی زبان میں لکھو کیونکہ یہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔" بعض حضرات نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس جملہ سے یہ سمجھا کہ انھوں نے چھ حروف کو چھوڑنے کا حکم دیا اور مصاحف لکھنے میں صرف قریش کے حروف اور صرف ان کی لغت میں لکھنے پر اقتصار کیا۔

یہ کئی وجوہ سے مردود ہے۔

① الفاظ یہ معنی ادا نہیں کر رہے۔

② قرآن پاک میں بہت سے کلمات ایسے ہیں جو دوسرے قبائل کی لغت سے ہیں قریش کی لغت سے نہیں اس بارے میں آپ اس بحث کو دیکھیں جو ہم نے پیچھے نزول قرآن علی سبعۃ احرف کی بحث میں بیان کر آئے ہیں نیز اس بحث کو دیکھیں جسے علامہ سیوطی نے "الاتقان" میں "النوع السابع والثلاثین" میں بیان کیا۔

③ مصاحف عثمانیہ سبعۃ احرف پر مشتمل تھے جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا۔

④ ہمارے پاس کوئی صریح نقل ایسی نہیں آئی کہ انھوں نے سبعۃ احرف میں سے کچھ بھی چھوڑا ہو چہ جائیکہ وہ ایک کے علاوہ سب کو چھوڑ دیں اگر انھوں نے ایسا کیا ہوتا تو یہ بھی متواتر منقول ہوتا اس لیے کہ یہ ایک عظیم الشان امر ہے جس کے نقل اور تواتر پر بہت سے اسباب متوجہ ہیں۔ ہمارے پاس بعض سندوں سے جو بات پہنچی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے "التابوت" کے بارے میں اختلاف کیا جو اللہ تعالیٰ کے کلام میں سورۃ البقرۃ آیت ۲۴۸ میں ہے:

﴿وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (البقرۃ:۲۴۸)

"ان سے ان کے نبی ﷺ نے کہا کہ اس کی امارت کی علامت یہ ہے کہ وہ تمہارے پاس ایک تابوت لائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے سکینہ ہوگی۔"

اب ان میں اختلاف ہوا کہ وہ اسے "تائے مفتوحہ" (ت) کے ساتھ لکھیں یا ہاء کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں حکم دیا کہ وہ اسے تائے مفتوحہ کے ساتھ لکھیں اس لیے کہ لغت قریش میں یہ اسی طرح ہے۔

یہ ہمیں واضح کرتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اس کلمہ میں صرف کتابت اور رسم کے اختلاف کو مراد لیا الفاظ، لغات اور حروف کا اختلاف مراد نہیں لیا یا ان کی مراد یہ تھی کہ لغت قریش میں کامل درجہ کا تواتر ہے جو دوسری لغتوں میں نہیں لہٰذا اختلاف کی صورت میں اسی کو پکڑ و حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد صرف اسی غرض سے تھا یہی وہ تواتر تھا جس کی انھوں نے اپنی کتابت اور جمع کے دستور میں شرط رکھی تھی۔ مزید یہ کہ وہ مصاحف جو ان صحیفوں سے نقل ہوئے جنھیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جمع کیا اور جو تواتر اور اجماع

امت کے ساتھ منصۂ شہود میں آئے جیسا کہ ہم ذکر کر آئے تو کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے موافق صحابہ رضی اللہ عنہم اس بات کو پسند کرتے تھے کہ وہ اس اجماع کو توڑ دیں اور اس تواتر کو بے کار چھوڑ دیں اور وہ بھی ایک ایسے معاملہ میں جس میں اللہ تعالیٰ نے تعدد وجوہ اور تعدد حروف کو آج تک امت کے لیے رحمت بنا رکھا ہے یہ بعید از عقل ہے۔

صحیفے اور مصاحف

ہم نے کہا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کو صحیفوں میں جمع کیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے مصاحف میں جمع کیا اور لکھا۔ صحف اور مصاحف میں بنیادی فرق یہ ہے کہ صحف صحیفہ کی جمع اور صحیفہ ورق یا چمڑے کا وہ ٹکڑا ہے جس میں لکھا جاتا ہے۔

جبکہ مصحف "أَصْحَفَ" سے اسم مفعول کے وزن پر ہے ("أَصْحَفَ کا معنی" لکھے ہوئے اوراق کو جمع کرنا) یعنی اس میں صحیفوں کو جمع کیا گیا۔ گویا کہ مصحف کے لغوی معنی اس میں دوگتوں کا معنی ملحوظ ہے اور وہ اس کی دو جانب یا دو جلدیں ہیں جن میں ان کے اوراق کے مجموعے کو لیا جاتا ہے تا کہ اس کے صحیفوں کی حفاظت اور پختگی ہو سکے۔

اور "صُحُف" میں یہ معنیٰ ملحوظ نہیں ہیں اگرچہ ان دونوں الفاظ کا ان دونوں معانی میں استعمال ہونا صحیح ہے اور ان کے استعمال میں توسع ہے۔

یہ لغوی بناء تھی جبکہ اصطلاح میں صحیفوں سے مراد وہ اوراقِ مجردہ ہیں جن میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قرآن پاک جمع کیا گیا اور وہ سورتیں تھیں جن میں صرف ان کی آیات مرتب تھیں اور ہر سورۃ علیحدہ تھی ایک دوسرے کے بعد مرتب نہ تھیں اور "مصحف" سے اصطلاحی مراد وہ اوراق ہیں جن میں قرآن کو جمع کیا گیا اور ان میں آیات اور سورتوں کی وہی ترتیب تھی جس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں امت جمع تھی۔

بعض حضرات نے مصحف کا اطلاق حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے صحیفوں پر کیا اور اس کی توجیہ ظاہر ہے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس صحیفے موجود تھے کہ ان کی وفات کا وقت قریب آ گیا انھوں نے یہ صحیفے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیئے، اس لیے کہ انہوں نے اس کی وصیت ان ہی کے حق میں کی تھی پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو یہ صحیفے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت سے ان کی بیٹی اُم المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل ہو گئے اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں طلب کیا اور ان سے مصاحف کو لکھا اور انھیں واپس کر دیا اور وہ صحیفے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی وفات تک ان کے پاس ہے۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے جنازہ میں اس وقت مدینے کا والی مروان موجود تھا اس نے چاہا کہ ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وہ صحیفے اس کے پاس بھیج دیں انھوں نے وہ صحیفے اس کے پاس بھیج دیے اس سے پہلے بھی مروان نے یہ صحیفے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے مانگے تھے انھوں نے انکار کر دیا تھا۔

ابن ابوداؤد نے ایک روایت میں نقل کیا کہ مروان کے وہ صحیفے جلا دیے ایک روایت میں نقل کیا کہ انھیں دھو ڈالا اور ایک روایت میں ہے کہ انھیں پھاڑ ڈالا اور ان روایات کو جمع کرنے میں کچھ بھی مانع نہیں کہ اول انھوں نے انھیں دھو ڈالا ہو پھر انھیں پھاڑ دیا ہو اور اس کے بعد آخر میں انھیں جلا دیا ہو تا کہ تکریم محو میں مبالغہ ہو جائے۔ جیسا کہ مروی ہے کہ اس نے کہا کہ میں نے یہ اس لیے کیا کہ مجھے خوف ہوا کہ اگر زمانہ لمبا ہو گیا تو شک کرنے والے ان صحیفوں کے بارے میں شک کریں گے یعنی وہ سمجھیں گے کہ ان

میں جو کچھ ہے وہ مصاحف کے مخالف ہے کیونکہ وہ بکھرے ہوئے صحیفے تھے مرتب اور جمع کیے ہوئے مصاحف کی شکل میں نہ تھے۔

مصاحف کی تعداد

مصاحف کی تعداد میں اختلاف ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو مصاحف لکھے وہ کتنے تھے؟ چنانچہ ابن عاشر نے صحیح یہ قرار دیا کہ وہ چھ تھے ایک مکی، ایک شامی، ایک بصری، ایک کوفی اور ایک مدنی عام تھا جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی کتابت کے محل سے اس کے ٹھکانے تک بھیجا اور ایک مدنی خاص جسے انھوں نے اپنے لیے روک لیا جسے "امام" کے ساتھ موسوم کیا گیا۔ اور "زاد القراء" والے نے یہ بھی اضافہ کیا کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے "الامام" نامی مصحف میں جمع کیا تو اس سے کئی مصاحف لکھے جن میں سے ایک مکہ کو بھیجا، ایک کوفہ کو، ایک بصرہ کو۔ ایک شام اور ایک مصحف مدینہ میں روک لیا یہ قول بھی سابقہ قول کی طرح ہے کہ وہ چھ تھے جبکہ سیوطی اور ابن حجر کا مذہب یہ ہے کہ وہ پانچ تھے ممکن ہے کہ ان دو حضرات کی پانچ سے مراد مصحفِ امام کے علاوہ مصاحف تھے تا کہ یہ اختلاف اس قول اور اس سے پہلے دونوں اقوال کے درمیان اختلاف لفظی ہو جائے۔

بعض نے کہا کہ یہ آٹھ تھے ان میں سے پانچ متفق علیہ تھے یعنی کوفی، بصری، شامی، مدنی عام اور مدنی خاص اور تین اختلافی تھے مصحف مکی، مصحف بحرین اور مصحف یمن اور بعض نے کہا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصر کی طرف بھی ایک مصحف بھیجا تھا۔

شاید یہ قول کہ ان کی تعداد چھ تھی یہی قول قبولیت کے لیے بہتر ہے اور ہر حال میں مفہوم یہ ہے، کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف کی ایک ایسی تعداد کو لکھوایا جس سے امت کی ضرورت پوری ہو جائے اور ان کا کلمہ مجتمع ہو جائے اور ان کا فتنہ ختم ہو جائے اس میں تعداد کی تعین کی کوئی بڑی غرض نہیں تھی اس لیے اس کی تعیین میں اس اختلاف کے دلائل کے بقدر اختلاف ہو گیا اور حقیقت کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف عثمانیہ کو کیسے بھیجا؟

نقل قرآنی میں اعتماد ہمیشہ لوگوں کے سینوں سے حاصل کرنے پر رہا کہ ایک ثقہ سے دوسرے ثقہ سے اور ایک امام دوسرے امام سے حاصل کرتا، اسی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایسے حفاظ کو منتخب کیا جن پر انھیں بھروسہ تھا اور انھیں بلاد اسلامیہ میں بھیجا اور ان مصاحف کے معاملہ میں مبالغہ کرتے ہوئے اور قرآن پاک کی پختگی اور مسلمانوں کا کلمہ جمع کرنے کی غرض سے ان مصاحف کو دوہرا اصول سمجھا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہر ملک میں اپنا مصحف اس شخص کے ساتھ بھیجتے جس کی قرأت اکثر واغلب اس کے مطابق ہوتی تھی۔ مروی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ مصحف مدنی سے پڑھائیں اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن السائب کو مکی مصحف دے کر بھیجا اور مغیرہ بن شہاب کو شامی دے کر بھیجا اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سلمی کو کوفی اور عامر بن عبد قیس کو بصری دے کر بھیجا پھر تابعین رحمہم اللہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا اور مصر والوں نے اپنے مصحف میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سیکھ کر پڑھا جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دہنِ مبارک سے پڑھا اور اس معاملہ میں وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے قائم مقام ہو گئے جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دہنِ مبارک سے سیکھا اس کے بعد قوم پڑھنے، سیکھنے اور یاد کرنے کے لیے فارغ ہو گئی حتیٰ کہ اس بات میں وہ لوگ ایسے امام بن گئے کہ ان کی طرف سفر کیا جانے لگا اور اس سے قرآن سیکھا جانے لگا اور ان کے علاقے والے ان کی قرأت سیکھنے اور ان کی روایت پر اعتماد کرنے پر جمع ہو گئے اسی وجہ سے قرأت ان کی طرف منسوب ہونے لگی اور ان مصاحف میں جو کچھ تھا امت

کا اس پر اجماع ہو گیا (اور امت اپنے اجماع میں معصوم ہے) اور اس کے خلاف کسی بھی زیادتی کی یا تبدیلی کو ترک کرنے پر امت نے اجماع کر لیا اس لیے کہ اس کا قرآن ہونا ان کے نزدیک ثبوت متواتر کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔

اس وقت مصاحف عثمانیہ کہاں ہیں؟

ہمارے سامنے کوئی قطعی دلیل نہیں ہے کہ اس وقت مصاحف عثمانیہ کہاں ہیں؟ چہ جائیکہ ہمیں ان کے مقامات کی تعیین معلوم ہو جائے ہمیں ان کے بارے میں جو آخری معلومات ہے وہ یہ ہے کہ ابن جزری نے اپنے زمانے میں اہل شام کا نسخہ دیکھا اور مصر میں بھی مصحف دیکھا۔

البتہ مصر میں مصاحف اثر یہ جن پر وہاں کی کتب کی الماریاں اور پرانی یادگاریں مشتمل ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مصاحف عثمانیہ ہیں ان کے بارے میں ہمیں بہت زیادہ شک ہے کہ ان کی نسبت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف کی جائے اس لیے کہ ان میں نقش ونگار اور وضع کردہ علامات ہیں جیسے دو سورتوں کے درمیان فصل کی علامات نیز قرآن پاک کے اعشار کو بیان کرنے کی علامات بھی ہیں اور یہ بات مقرر ہے کہ مصاحف عثمانیہ ان سب چیزوں سے خالی تھے نیز نقطوں اور اعراب سے بھی خالی تھے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔

ہاں البتہ مسجد حسینی کے آثار قدیمہ کی الماری میں جو مصحف محفوظ ہے اور اس کی نسبت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف کی گئی ہے وہ خط کوفی میں لکھا ہوا ہے اس کے حروف بھی خالی ہیں اور اس کا حجم بہت زیادہ وسیع ہے۔ اور اس کا رسم بھی مصحف مدنی یا شامی کے موافق ہے اس میں کلمہ ﴿مَنۡ یَّرۡتَدَّ﴾ (المائدہ: ۵۴) دو دالوں کے ساتھ لکھا ہوا ہے یعنی ادغام کے بغیر اور اس میں بھی یہ کلمہ اسی رسم کے مطابق ہے لہٰذا غالب گمان یہ ہے کہ یہ مصحف اپنی بعض رسوم کے مطابق مصحف عثمانیہ سے ہی منقول ہے اسی طرح وہ مصحف جو ان الماریوں میں محفوظ ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ نے انھیں اپنے خط میں لکھا تھا جس میں ملاحظہ کیا جاتا ہے کہ وہ خط کوفی قدیم کے ساتھ لکھا ہوا ہے مگر یہ کہ اس کا حجم چھوٹا ہے اور اس کا خط پہلے نسخے کم خالی اور اس کا رسم مصاحف عثمانیہ میں سے مدنی اور شامی مصاحف کے علاوہ دیگر کے موافق ہے کیونکہ ان میں گزشتہ بالا کلمہ ﴿مَنۡ یَّرۡتَدَّ﴾ ایک دال کے ساتھ یعنی ادغام کے ساتھ لکھا ہوا ہے اور یہ ان دو کے علاوہ دیگر مصاحف میں اسی طرح لکھا ہوا ہے ہوسکتا ہے کہ اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہی لکھا ہو یا کوفہ میں اس کی کتابت کا حکم دیا ہو۔

پھر مصاحف عثمانیہ میں سے کسی کا باقی نہ رہنا، ہمیں بالکل مضر نہیں جب تک کہ معتمد علیہ نقل اور تلقی ثقہ عن ثقہ اور تلقی امام عن امام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک ہو اور یہ قرآن پاک میں اعلیٰ درجہ کا مشہور و متواتر ہے جو اب تک ہے۔

کیونکہ مصاحف عثمانیہ کے طریقے پر ہر زمانے اور ہر شہر میں ہزاروں نسخے لکھے گئے ہیں اور ان میں رسم عثمانی کی محافظت بھی کی گئی ہے جیسا کہ عنقریب آرہا ہے انشاء اللہ تعالیٰ لہٰذا آپ اسی پر صبر کیجئے:

﴿وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ (النحل: ۱۲۷)

"آپ کا صبر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔"

تجوید وتحسین کے دور میں مصاحف

مصاحف عثمانیہ آسمان سے نازل ہونے والے اس پانی کے مشابہ ہیں جو کسی اچھی اور زرخیز زمین میں نازل ہوئی لیکن وہ زمین خشک اور پیاسی ہو پھر جیسے ہی اس کو پانی ملا تو وہ تر و تازہ ہو کر ابھر آئی اور اس نے ہر طرح کے پُر رونق نباتات اگائے۔

اسی طرح مصاحف شریف ہیں کہ جیسے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں اسلامی ممالک کی طرف بھیجا تو ان کی طرف امت ہر طرف اور ہر قسم کی زمین سے متوجہ ہوئے حتی کہ مشرق ومغرب میں ان کا کلمہ مجتمع ہو گیا اور اس کے مطابق ہر قوم اور ہر نسل میں ہزاروں مصاحف مقدسہ لکھے گئے۔

نظریں جن چیزوں کی طرف متوجہ ہوتی ہیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ تجوید وتحسین اور آراستگی کے ہاتھ نے مصاحف کو مختلف رنگوں اور مختلف اقسام کے ساتھ لینا شروع کر دیا کہیں مادی تحسینات ہیں اور کہیں صورتی تحسینات ہیں جو نسخوں، طبیعت، حجم، ورق اور تجلید وتذہیب کی طرف لوٹتی ہیں اس میں ہم نے اپنے آپ کو زیادہ تھکایا نہیں اس لیے کہ اس کا معاملہ آسان ہے اگرچہ ان میں کچھ آسان اور قرآن کریم کی طرف شوق دلاتا ہے۔

اور پھر اس مقام پر تحسینات معنویہ یا جوہریہ ہیں جن کا مرجع نطق حروف، تمیز کلمات، اور تشابہات کے درمیان فرق کی تحقیق بطریق اعجام (یعنی نقطے لگانے) وشکل (یعنی اعراب لگانے سے) ہوتا ہے۔ انھی کے بارے میں ہم کچھ کلام کریں گے۔

اعجام

"اعجام الکتاب" کتاب کو نقطے لگانا قاموس میں ہے کہ "أَعْجَمَ فُلَانُ الْكَلَامَ" (اسے عجمی بنا دینا) "وَالْكِتَابَ" (اسے نقطے لگانا) اسی طرح "عَجَّمَهٗ" اور "مُعَجَّمَهٗ" کا معنی بھی یہی ہے۔

اور یہ بات مشہور ومعروف ہے کہ مصحف عثمانی پر نقطے نہیں تھے جس کی وجہ وہی مقصد ہے جسے ہم نے پیچھے ذکر کیا اور وہ مقصد کلمہ محتملہ کو اس طرح باقی رکھنا ہے کہ اس میں حتی الامکان قراءات کی وجوہ پڑھی جاسکیں مگر مورخین نے اختلاف کیا کسی نے کہا کہ نقطے لگانا اسلام سے پہلے بھی معروف تھا لیکن مصاحف میں انھوں نے اسی گزشتہ بالا مقصد کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ بعض نے کہا کہ نقطے بعد میں ابو الاسود دؤلی کے ہاتھ سے معروف ہوئے۔

جو بھی ہو بہر صورت نقطے لگانا عبد الملک بن مروان کے زمانے میں مشہور ہوا جب انھوں نے دیکھا کہ اسلام کا رقعہ پھیل چکا اور عرب نقطوں میں بھی اختلاف کرنے لگے قریب تھا کہ یہ اختلاف لغت کی سلامتی کو بھی چھو جاتا اور قرأت مصاحف میں اشکال والتباس واقع ہو جاتا جو لوگوں کے ساتھ اڑا رہتا حتی کہ ان کے غیر منقوط ہونے کی صورت میں ان کی کسی جماعت کو مصحف کے حروف اور کلمات کے درمیان تمیز کرنا ہی مشکل ہو جاتا اس موقع پر عبد الملک بن مروان نے اس پریشانی سے نجات دلانے کے لیے گہری نظر سے سوچا اور حجاج کو حکم دیا کہ وہ اس جلیل القدر کام کا اہتمام کرے حجاج نے (امیر کی اطاعت کرتے ہوئے) دو آدمیوں کو آمادہ کیا کہ وہ اس مشکل کا ازالہ کریں وہ دو آدمی نصر بن عاصم لیثی اور یحییٰ بن یعمر عدوانی تھے اور یہ دونوں ایسے تھے کہ جس کام کے لیے انھیں چنا

گیا وہ اسی کے لائق تھے اس لیے کہ یہ دونوں علم وعمل اور صلاح وورع کے جامع تھے نیز اصول لغت اور وجوہ قرأت کو بھی خوب جانتے تھے اور ابوالاسود دؤلی کی شاگردی اور اس سے علم حاصل کرنے میں بھی مشترک تھے۔

ان دونوں بزرگوں پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے کہ انھوں نے اس کوشش میں کامیابی پائی اور مصحف شریف کو پہلی مرتبہ نقطے لگوائے اور تمام متشابہ حروف پر نقطے لگوائے اور انھوں نے اس چیز کا بھی التزام کیا کہ کسی بھی حرف میں نقطے تین سے تجاوز نہ کریں اس کے بعد یہ نقطے لوگوں میں پھیل گئے اور مصحف شریف سے اشکال والتباس زائل کرنے میں اس کا بڑا اثر ہے۔

بعض نے کہا کہ مصحف میں سب سے پہلے ابوالاسود دؤلی نے نقطے لگوائے اور ابن سیرین کا مصحف بھی نقطوں والا تھا لیکن صفت فردی کے ساتھ تھا اسے یحییٰ بن یعمر نے نقطے لگائے۔

ان اقوال کے درمیان تطبیق اس طرح ممکن ہے کہ سب سے پہلے مصحف کو نقطے لگانے والا ابوالاسود دؤلی تھا لیکن اس نے یہ نقطے صفت فردیہ کے ساتھ لگائے اس کے بعد ابن سیرین رحمہ اللہ ان کے پیچھے چلے اور عبدالملک بن مروان بھی پہلا وہ شخص ہے جس نے مصحف میں نقطے لگائے لیکن صفت رسمیہ عامہ کے ساتھ جو لوگوں کے درمیان پھیل گئے تاکہ قرآن پاک پڑھنے میں لوگوں سے التباس واشکال دور کر دیا جائے۔

مصاحف کی تشکیل

تشکیل کتاب لغت میں "اعجام" کے ہی ہم معنی ہے اور آپ جان چکے ہیں کہ "اِعْجَامٌ" کا معنی نقطے لگانا ہے صاحب قاموس نے کہا کہ "والکتاب" (وشَکَّلَ الکِتَابَ) یعنی اس نے کتاب کو نقطے لگائے جیسا کہ "اَشْکَلَهٗ" کا معنی ہے۔ گویا کہ اس نے اس کا اشکال دور کر دیا۔" پھر اشکل کا استعمال حروف کے خصوصی عوارض یعنی حرکت یا سکون میں ہونے لگا۔

ان دونوں معانی کے درمیان مناسبت ظاہر ہے اس لیے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک میں حروف کے اشکال کو دور کرنا اور ان سے التباس ختم کرنا ہے۔

مؤرخین کا اتفاق ہے کہ عرب اپنے پہلے زمانے میں حروف کی شکل اور کلمات سے ناواقف تھے چہ جائیکہ وہ ان پر اعراب لگاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی لغت کی سلامتی، ان کے سلیقوں کا نکھار اور ان کی زبانوں کی فصاحت یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو انھیں اعراب سے مستغنی کر دیتی ہیں لیکن جب اسلام امم جدیدہ میں داخل ہو گیا جن میں بعض لوگ عجمی بھی تھے جو عربی نہیں جانتے تھے تو اس اعراب کے نہ ہونے نے لغت قرآن پر ظلم کرنا شروع کر دیا۔ بلکہ کہتے ہیں کہ ابوالاسود دؤلی رحمہ اللہ نے ایک قاری کو سنا جو اللہ تعالیٰ کا قول ﴿اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ (التوبہ: ۳) پڑھ رہا تھا اس نے "ورسوله" کے لام کو جر کے ساتھ پڑھا۔

اس بدترین غلطی نے ابوالاسود رحمہ اللہ کو چونکا دیا انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے مبرا ہے کہ وہ اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے بری ہو جائے اس کے بعد وہ بصرہ کے والی زیاد کے پاس گئے اور انھیں فرمایا کہ آپ نے جو سوال کیا میں اس کے جواب کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ زیاد نے ان سے سوال کیا تھا کہ وہ لوگوں کے لیے کچھ علامات بنائیں جن کے ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو پہچانیں چنانچہ انھوں نے جواب میں دیر کر دی حتیٰ کہ اس حادثہ نے انھیں گھبراہٹ میں ڈال دیا یہاں ان کی بزرگی چمک اٹھی اور ان کا اجتہاد یہاں تک پہنچا کہ انھوں نے فتحہ (زبر) کی علامت حرف کے اوپر نقطہ کو بنا دیا اور کسرہ (زیر) کی علامت حرف کے

نیچے نقطہ اور ضمہ کی علامت حرف کے اجزاء کے درمیان نقطہ کو بنادیا اور سکون کی علامت دو نقطے کو بنادیا۔

لوگوں نے ان کے طریقے پر چلنا شروع کر دیا پھر زمانہ گزرتا گیا اور لوگ زیادہ ہونے اور آگے بڑھنے لگے تو انھوں نے مشدد کے لیے قوس کی علامت کو وضع کرلیا اور الف وصل کے لیے ایک چھوٹی سی لکیر جو اس کے اوپر، نیچے یا درمیان میں لگائی جاتی تھی جیسا کہ اس سے پہلے فتحہ، کسرہ یا ضمہ ہوتا تھا اسی طرح ہوتا رہا کہ عبدالملک بن مروان آیا اس نے اپنی گہری بصیرت سے سوچا کہ وہ حروف کو ایک دوسرے سے ممتاز کرے اور اس کے لیے اعراب اور نقطوں کا راستہ اپنائے جیسا کہ سابقہ عنوان کے تحت گزرا اور اس موقع پر یہ بھی ضرورت پیش آئی کہ پہلے اعراب جو نقطوں کی صورت میں تھے انھیں ایک نئی شکل میں تبدیل کیا جائے جنھیں آج کل ہم فتحہ کسرہ، ضمہ اور سکون کی علامات کے نام سے جانتے ہیں اس تبدیلی کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اگر ان علامات کو اپنی پہلی حالت یعنی نقطوں کی صورت میں چھوڑ دیا جائے پھر ان کے بعد دوسرے نقطے بھی آجائیں تو ان دونوں میں مشابہت ہو جائے اور معاملہ مشتبہ ہو جائے گا اس لیے ان دونوں چیزوں میں اس طریقے سے فرق کیا گیا اور کیا ہی اچھا کام کیا!۔

مصحف کے نقطوں اور اعراب کا حکم

پہلی صدی میں علماء کرام مصحف کے اعراب اور نقطوں کو ناپسند سمجھتے تھے یہ ان کی طرف سے مصحف کے رسم کے مطابق ادائے قرآن پر محافظت میں مبالغہ تھا نیز انھیں خوف تھا کہ کہیں اس کے ذریعے اس میں تغییر واقع نہ ہو جائے۔

اس بناء پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ قرآن پاک کو خالی چھوڑ دو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو خلط ملط نہ کرو۔ نیز حضرت ابن سیرین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے نقطوں اور ابتداء اور انتہا وغیرہ کے نشانات کو ناپسند کیا۔

لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ زمانہ بدلتا چلا گیا اور مسلمانوں کو مصحف کے اعراب اور نقطوں کی ضرورت پیش آتی رہی اور اس کا سبب وہی یعنی مصحف کے رسم کے مطابق قرآن کے اداء پر محافظت تھا اور یہ بھی خوف تھا کہ نقطوں اور اعراب سے خالی ہونا اس میں تغییر کا باعث نہ بن جائے۔

اس صورت حال میں قابل اعتماد یہی تھا کہ ان لوگوں کی نقطوں اور اعراب کی کراہت زائل ہو جائے اور اس کی جگہ ان کے وجوب یا استحباب کے قول کو لیا جائے اس لیے کہ یہ بات طے ہے کہ حکم اپنے وجود یا عدم میں علت پر دائر ہوتا ہے نووی نے اپنی کتاب "التبیان" میں فرمایا کہ آج اطمینان ہو گیا کہ اس کے بدعت ہونے کی وجہ سے اس سے منع نہیں کیا جائے گا کیونکہ بدعت حسنہ ہے لہٰذا اس سے منع نہیں کیا جائے گا جیسا کہ اس کی نظیر میں مثلاً علم کا تصنیف ہونا مدارس اور خانقاہوں کا بنایا جانا وغیرہ۔ واللہ اعلم۔

قرآن پاک کے پارے

مصاحف عثمانیہ جیسے نقطوں اور اعراب سے خالی تھے اسی طرح وہ ان پاروں سے بھی تھے جن کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں۔ جب زمانہ گزرتا چلا گیا تو لوگ مصاحف میں گوناگوں ہو گئے اور انھوں نے مختلف اعتبارات سے اس کے کئی حصے کر لیے ان میں سے بعض نے قرآن پاک کو تیس حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصے پر اس کے جزء کا نام رکھ دیا حتیٰ کہ جب اس کا اطلاق کیا جاتا تھا تو دوسرے کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا حتیٰ کہ جب کوئی کہتا کہ کیا آپ نے قرآن پاک کا پارہ پڑھ لیا؟ تو ذہن فوراً اسی طرف جاتا تھا کہ اس نے مصحف کے تیس پاروں میں سے کوئی پارہ پڑھا اس طریقے پر "اصحاب الربعات" (پاروں والے) چلے اس لیے کہ انھوں نے اس کے ہر جزء کو ایک مستقل نسخہ میں طبع کر دیا اور نسخوں

کو مجموعہ جو پورے قرآن کو جامع ہوتا ہے اسے سب لوگ ربعہ کہنے لگے اس قبیل سے مستقل پارے طبع شدہ مل جاتے ہیں جو مدارس میں چھوٹے چھوٹے طالب علموں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔

بعض لوگوں نے پاروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور بعض نے چار میں اور ان میں ہر ایک کو "ربع" کا نام دیا۔

بعض لوگوں نے سورۃ کی پانچ آیات پوری ہونے پر "خمس" کا کلمہ وضع کیا اور دس آیات کے اختتام پر عشر کا کلمہ وضع کیا جب عشر کے بعد پانچ آیات اور ہو جاتی ہیں تو خمس کا کلمہ دوبارہ لوٹ آتا ہے اور جب یہ پانچ دس ہو جاتی ہیں تو دس کا کلمہ دوبارہ دہراتے ہیں اسی طرح سورت کے آخر تک معاملہ چلتا رہتا ہے۔ بعض لوگ اخماس کی جگہ پر خمس لکھنے کی بجائے خاء کا سرا لکھ دیتے ہیں اور اعشار کی جگہ پر عشر لکھنے کی بجائے عین کا سرا لکھ دیتے ہیں اور بعض لوگ آیت کے اختتام پر بطور اشارہ سورۃ کا آیت نمبر یا اس کے علاوہ کوئی اور نشان لگا دیتے ہیں اور بعض لوگ سورتوں کے شروع کو ایسے عنوان کی طرح لکھتے ہیں جو سورت کے نام اور اس میں آنے والی مکی یا مدنی آیات کی وضاحت کرتے ہیں۔

اس بارے میں علماء کا طویل کلام ہے جو کراہت کے ساتھ جواز اور بلا کراہت کے ساتھ جواز پر مشتمل ہے لیکن ہر حال میں گفتگو آسان ہے کہ جب تک غرض ہو اور وہ تیسیر و تسہیل ہے اور جب تک کہ معاملہ التباس، زیادتی اور غیر لفظ کے اس میں میں داخل ہونے سے بعید ہو۔

﴿وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ﴾ (النحل:۹)

"اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ۔"

مصحف کا احترام

ہمارے دیکھنے سننے میں کوئی کتاب ایسی نہیں آئی جو قرآن کریم کی طرح اجلال و تقدیس پر محیط ہو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا وصف اس طرح بیان کیا کہ وہ ایک پوشیدہ کتاب ہے اور اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اسے صرف پاکیزہ لوگ ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں اور اس پر قسم کھائی کہ:

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (الواقعہ:۷۵-۸۰)

"میں ان جگہوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں جہاں ستارے گرتے ہیں اگر تم سمجھو تو یہ ایک بڑی قسم ہے بے شک وہ ایک معزز قرآن ہے جو ایک چھپی ہوئی کتاب میں ہے اسے وہی لوگ ہاتھ لگا سکتے ہیں جو پاکیزہ ہیں یہ سب رب العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔"

حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے لے کر دشمن کی زمین کی طرف جانے سے بھی منع فرمایا جب مصحف ان کے ہاتھوں میں جانے کا خوف ہو اور حدیث صحیحین میں مروی ہے۔ ①

اور یہاں تک کہ علماء نے اس شخص کے کفر کا فتویٰ دیا ہے جس نے اسے گندگی میں پھینک دیا ہو اور کافر کے ہاتھ فروخت

① بخاری کتاب الجہاد باب ۱۲۹، مسلم کتاب الامارات ۹۲

کرنے کے حرام ہونے کا بھی فتوی دیا ہے اور اس کو چھونے اور اٹھانے کے لیے طہارت کے واجب ہونے کا بھی فتویٰ دیا ہے اسی طرح جو چیز قرآن پاک کے ساتھ متصل ہو یعنی کپڑا، غلاف اور صندوق وغیرہ صحیح قول کے مطابق انھیں بھی چھونے کے لیے بھی طہارت کے وجوب کا حکم دیا ہے۔

اور اس کی کتابت خوبصورت اور واضح کرنے اور ان کے حروف کو صاف رکھنے کو مستحب قرار دیا ہے۔ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مصحف کے لیے کھڑا ہونا مستحب ہے جب وہ سامنے پیش کیا جائے اس لیے کہ علماء اور خواص کے لیے قیام مستحب ہے تو مصحف کے لیے بدرجہ اولی ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا اپنی کتاب کا اور اپنے تمام برگزیدہ بندوں کا ادب کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بحث ⑪

قراءاتِ، قراء اور ان پر ہونے والے شبہات کے بیان میں

"قراءات" "قراءة" کی جمع ہے اور لغت میں یہ "قراءٔ" سے مصدر سماعی ہے اور اصطلاح میں "ائمہ قراء میں سے کسی امام کا مذہب جس کے ذریعے وہ قرآن کریم کے تلفظ میں دوسرے ائمہ کی مخالفت کرتا ہو اور اس امام سے روایات اور طرق میں بھی اتفاق ہو خواہ یہ مخالفت حروف کے بولنے میں ہو یا اس کی ہیئات کے بولنے میں ہو۔"

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے سند کے عالی یا نازل ہونے کی تقسیم پر کلام کرتے ہوئے فرمایا کہ "علماء حدیث کی اس تقسیم کی مشابہت ایسے ہے جسے قراء نے سند کے احوال کو قرأت، روایت طریق اور وجہ کی طرف تقسیم کیا ہے چنانچہ اگر اختلاف ائمہ سبعہ یا عشرہ وغیرہ کا ہو اور اس کے بارے میں ان کی طرف سے روایات وطرق میں اتفاق ہو تو وہ قرأت ہے اور اگر اس سے روایت کرنے والے کا اختلاف ہو تو وہ "روایت" ہے اور اگر بعد والوں میں سے کسی کا اختلاف ہو تو اگر وہ نازل ہو تو "طریق" ورنہ اگر وہ ان صفات کے مطابق نہ ہوں یعنی وہ اس طرف راجع ہوں کہ پڑھنے والے کو اس میں اختیار ہے تو وہ "وجہ" ہے۔.... الخ۔

ابن جوزی کی "منجد المقرئین" میں ہے کہ "قراءت قرآن پاک کے کلمات کے ادا کی کیفیات اور ان کے اختلاف کو جاننا نقل کرنے والوں کے انتساب کے ساتھ اور مقری اس کو جاننے والا جس نے اسے مشافہۃً روایت کیا ہو اگر اسے یاد ہو تو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اسے پڑھائے اگر اس نے اس شخص سے مشافہۃً نہ کیا ہو جس کا وہ مسلسل مشافہۃً بیان کر رہا ہے اس لیے کہ قراءات میں کچھ اشیاء ہیں جو سماع اور مشافہہ کے بغیر محکم نہیں ہو سکتیں۔ اور قاری مبتدی وہ ہے جو افراد میں شروع کرے اور تین قراءتوں کا افراد کرے اور منتہی وہ شخص ہے جو قراءات میں سے اکثر اور مشہور قراءتوں کو نقل کرے۔

علم قراءات کا ارتقاء ہم نے بارہا کہا کہ قرآن کریم میں معتمد علیہ ایک دوسرے سے حاصل کرنا اور لینا ہے کہ ایک ثقہ دوسرے ثقہ سے اور ایک امام دوسرے امام سے حاصل کرے اور یہ سلسلہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے اور مصحف اس باب میں عمدہ نہ تھے یہ تو صرف ماخذ اور مرجع تھے جو مسلمانوں کو رب کی کتاب پر جمع کرنے والے تھے لیکن اسی حدود میں جس پر یہ دلالت کرتے اور جس کی تعیین کرتے تھے نہ کہ جس پر یہ دلالت نہ کرتے ہوں اور جن کی یہ تعیین نہ کرتے ہوں۔

اور آپ جانتے ہیں کہ مصاحف پر نہ نقطے تھے اور نہ ہی اعراب تھے اور ان میں کلمہ کی صورت میں مختلف قراءات کی ہر ممکن وجوہ کا احتمال تھا اور جب احتمال نہ ہوتا تو مصحف میں کلمہ کو کسی وجہ کے مطابق لکھا جاتا اور پھر دوسرے مصحف میں دوسری وجہ کے مطابق اسی طرح آخر تک۔ اب کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اعتماد اور بھروسہ روایت اور تلقی پر ہو جو کہ قراءات اور قرآن میں عمدہ ہیں۔

پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھنے میں بھی اختلاف ہو جاتا کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن ایک حرف پر سیکھتا کوئی دو

حروف پر سیکھتا اور کوئی اس سے بھی زیادہ حروف پر سیکھتا پھر وہ مختلف علاقوں میں اسی حال پر پھیل جاتے اسی وجہ سے ان سے تابعین کے سیکھنے میں بھی اختلاف ہوتا اور پھر تبع تابعین کا تابعین سے سیکھنے میں بھی اسی طرح اختلاف ہوتا اور یہ اختلاف اسی طرح چلتا جاتا حتیٰ کہ معاملہ اسی طریقہ پر ان مشہور قراء تک پہنچ جاتا ہے جو قراءات کے لیے مختص ہوئے وہ انھیں ضبط کرتے اور انھیں مختلف عنوان یا نسبت دے کر ان کی اشاعت کرتے جیسا کہ آرہا ہے۔

یہ علم قراءات اور اس کے اختلاف کا منشا ہے اگر کثیر اتفاقی مقامات کو دیکھا جائے تو یہ اختلاف اگرچہ درحقیقت تھوڑے سے امور کی طرف لوٹتا ہے لیکن پھر بھی (ہر حال میں) یہ اختلاف ان حروف سبعہ کے دائرے میں ہی رہتا ہے جن پر قرآن پاک نازل ہوا اور وہ پورا کا پورا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے نہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہے اور نہ ہی کسی قاری وغیرہ کی طرف سے ہے۔

نویری رحمہ اللہ کی ایک کتاب ہے جو مصر کے دارالکتب میں لکھی گئی انھوں نے اسے "الطیبۃ فی القراءات العشر" کی شرح کے طور پر وضع کیا تھا میں پسند کرتا ہوں کہ اس موقع پر اس میں سے مندرجہ ذیل کلمات نقل کر کے آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

"نقل قرآن میں اعتماد حفاظ پر ہے اسی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہر مصحف کے ساتھ کوئی ایسا قاری بھی بھیجا جس کی قرأت اکثر طور پر اس کے ساتھ ملتی ہو اور لازم نہ ہو۔ ہر شہر نے انھی الفاظ کے ذریعے پڑھا جو ان کے مصحف میں تھے اور سیکھا وہی کچھ جو انھوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے سیکھا اور انھوں نے نبی کریم ﷺ سے سیکھا پھر ان لوگوں سے سیکھنے کے لیے ایک ایسی قوم نے اپنے آپ کو ہمہ تن اس میں لگا دیا جو اسے ضبط کرنے کے لیے راتوں کو جاگی اور اسے نقل کرنے کی خاطر اپنی دن رات کی محنت لگادی حتیٰ کہ وہ اس میں اقتداء کے قابل امام اور ہدایت کے ستارے بن گئے اور ان کے علاقوں والے ان کی قرأت قبول کرنے پر متفق ہو گئے اور ان کی روایت ودرایت صحیح ہونے میں کسی دو نے بھی آپس میں اختلاف نہیں کیا چونکہ انھوں نے قرأت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا اس لیے قراءت ان کی طرف منسوب ہوئی اور اس بارے میں اعتماد انھی لوگوں پر ہونے لگا۔

پھر ان کے بعد قراء بہت زیادہ ہو گئے اور شہروں میں پھیل گئے اور امتوں کے بعد امتیں آئیں اور انھوں نے ان کے طبقات کو جانا اور ان کی صفات مختلف ہو گئیں بعض تو روایت ودرایت میں مشہور تلاوت کے ماہر ہو گئے اور بعض کسی ایک وصف کو جمع کرنے والے اور بعض ایک سے زیادہ کو حاصل کرنے والے بن گئے اس وجہ سے ان کے درمیان خوب اختلاف ہو گیا اور اتفاق کم ہو گیا۔

اس وقت امت کے ماہر اور مضبوط لوگ اٹھے اور انھوں نے حتی الامکان بھرپور اجتہاد کیا اور صحیح وباطل کے درمیان تمیز کی اور حروف وقراءت کو جمع کیا، وجوہ وروایات کو مستند کیا، صحیح وشاذ کی اور کثیر ومنفرد کی وضاحت کی ایسے اصولوں کے ساتھ جنھیں انھوں نے قاعدہ اور بنیاد قرار دیا اور ایسے ارکان کے ساتھ جنھیں انھوں نے راجح قرار دیا۔

پہلے حفاظ مقرئین کے طبقات

اُمت کے تمام طبقوں میں ایک جماعت قرآن پاک کی حفاظت اور اسے پڑھانے میں مشہور ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے قرآن پاک پڑھانے میں جو حضرات مشہور تھے وہ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو الدرداء، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم اور وہ تمام حضرات ہیں جنھیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بلاد اسلامیہ کی طرف مصاحف دے کر بھیجا۔

اور تابعین میں سے حضرت سعید بن المسیب، حضرت عروہ، حضرت سالم، حضرت عمر بن عبدالعزیز، حضرت سلیمان بن یسار اور ان کے بھائی حضرت عطاء، حضرت زید بن سالم، حضرت مسلم بن جندب، حضرت ابن شہاب زہری، حضرت عبدالرحمٰن بن ہرمز اور حضرت معاذ بن الحارث جو معاذ قاری کے نام سے مشہور تھے (اور یہ سب حضرات مدینہ میں تھے) (رحمہم اللہ) اور حضرت عطاء، حضرت مجاہد، حضرت طاؤس، حضرت عکرمہ، حضرت ابن ابی ملیکہ، حضرت عبید بن عمیر وغیرہ (رحمہم اللہ) تھے (اور یہ حضرات مکہ میں تھے)

اور حضرت عامر بن عبدالقیس، ابو العالیہ، حضرت ابو رجاء، حضرت نصر بن عاصم، حضرت یحییٰ بن یعمر، حضرت جابر بن زید، حضرت حسن، حضرت ابن سیرین، حضرت قتادہ وغیرہ تھے (رحمہم اللہ) (یہ سب حضرات بصرہ میں تھے)

اور حضرت علقمہ، حضرت اسود، حضرت مسروق، حضرت عبیدہ، حضرت ربیع بن خثیم، حضرت حارث بن قیس، حضرت عمر بن شرحبیل، حضرت عمرو بن میمون، حضرت ابو عبدالرحمٰن سلمی، حضرت زر بن حبیش، حضرت عبید بن فضلہ، حضرت ابو زرعہ بن عمرو، حضرت سعید بن جبیر، حضرت نخعی، حضرت شعبی (رحمہم اللہ) تھے (اور یہ سب حضرات بصرہ میں تھے)۔

اور حضرت مغیرہ بن ابوشہاب مخزومی جو مصحف عثمانی والے تھے حضرت خلید بن سعید جو حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے وغیرہ (رحمہم اللہ) یہ سب حضرات شام میں تھے۔

اس کے بعد ایک قوم قرأت کو ضبط کرنے اور انھیں عنوان دینے میں مشغول ہوگئی چنانچہ مدینہ میں حضرت یزید بن قعقاع رحمہ اللہ تھے پھر حضرت شیبہ بن نصاح رحمہ اللہ تھے اس کے بعد حضرت نافع بن ابونعیم رحمہ اللہ تھے۔

اور مکہ میں حضرت عبداللہ بن کثیر رحمہ اللہ، حضرت حمید بن قیس اعرج اور محمد بن محیصن رحمہ اللہ تھے اور کوفہ میں حضرت یحییٰ بن وثاب، حضرت عاصم بن ابوالنجود، حضرت سلیمان اعمش تھے اس کے بعد حمزہ رحمہ اللہ اور پھر کسائی رحمہ اللہ تھے۔

اور بصرہ میں حضرت عبداللہ بن ابواسحاق، حضرت عیسیٰ بن عمرو، حضرت ابوعمرو بن العلاء، حضرت عاصم جحدری تھے ان کے بعد حضرت یعقوب حضرمی رحمہ اللہ تھے۔

اور شام میں حضرت عبداللہ بن عامر، حضرت عطیہ بن قیس کلابی، حضرت اسماعیل بن عبداللہ بن المہاجر تھے پھر یحییٰ بن حارث ذماری اور ان کے بعد شریح بن یزید حضرمی تھے۔

ان قراء کے آسمان میں بہت سے ستارے روشن ہوئے جنھوں نے قرأت اور ضبط میں مہارت حاصل کی حتیٰ کہ وہ اس

باب میں ائمہ بن گئے ان کی طرف سفر ہونے لگے اور ان سے سیکھا جانے گا۔

قراءتوں کی تعداد پھر کچھ عبارات مشہور ہوگئیں جو قراءات کی تعداد کی حامل تھیں کسی نے کہا قراءت سبع (۷)، کسی نے کہا قراءات العشر (۱۰) اور کسی نے کہا قراءات الاربع عشرہ (۱۴)۔

اور سب نے قراءات سبع (سات) کو اس کی شہرت اور رفعت شان کی وجہ سے ترجیح دی۔ یہی وہ قراءات ہیں جو معروف ائمہ سبعہ کی طرف منسوب ہیں اور وہ ائمہ سابعہ مندرجہ ذیل ہیں۔

① نافع رحمۃ اللہ علیہ ② عاصم رحمۃ اللہ علیہ ③ حمزہ رحمۃ اللہ علیہ ④ عبداللہ بن عامر رحمۃ اللہ علیہ

⑤ عبداللہ بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ⑥ ابوعمر بن العلاء رحمۃ اللہ علیہ ⑦ علی الکسائی رحمۃ اللہ علیہ

اور قراءاتِ عشر میں یہی سات ہیں اور مزید تین یہ ہیں: ① ابوجعفر رحمۃ اللہ علیہ ② یعقوب رحمۃ اللہ علیہ ③ خلف رحمۃ اللہ علیہ

علم قراءت پر ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ وہ کوئی ذکر کی جانے والی چیز ہی نہ تھی پھر تدوین کا زمانہ آیا لیکن ان سات کے لیے یہ عنوان نہیں تھا بلکہ قراءات میں سب سے پہلے ابوعبید قاسم بن سلام، ابو حاتم سجستانی، ابوجعفر طبری اور اسماعیل قاضی رحمہم اللہ جیسے حضرات نے کتابیں تصنیف کیں اور قراءات میں بہت کچھ ذکر کیا اور ایسی روایات پیش کیں جو ان سات قرأتوں کے کئی گنا سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اس کے بعد دوصدیوں کے آخر میں بلاد اسلامیہ میں یہ سات قرأتیں مشہور ہوئیں لوگ بصرہ میں ابوعمرو اور یعقوب کی قرأت پڑھنے لگے، کوفہ میں حمزہ اور عاصم کی قرأت، شام میں ابن عامر کی قرأت، مکہ میں ابن کثیر کی قرأت اور مدینہ میں نافع کی قرأت پڑھنے لگے۔

یہ سات قراءتیں اسی حال میں رہیں لیکن ان کی جگہ کوئی تدوین نہ پکڑ سکی حتی کہ تیسری صدی ختم ہونے کو تھی کہ بغداد میں ابن مجاہد احمد بن موسیٰ بن عباس رحمۃ اللہ علیہ اٹھے اور انھوں نے ان ائمہ سبعہ کی قراءات کو جمع کیا لیکن انھوں نے کسائی کا نام ثابت رکھا اور یعقوب کا نام حذف کر دیا۔

ان قراء سبعہ پر اقتصار اچانک اور اتفاقاً ہوگیا اس میں قصد وعمل کا کوئی دخل نہیں اس لیے کہ ہر شخص نے اپنے اوپر لازم کرلیا کہ وہ کسی سے روایت کرے گا تو صرف اس سے کرے گا جو ضبط وامانت اور قراءت کو لازم پکڑنے میں طول العمر ہوگا اور اس سے سیکھنے اور علم حاصل کرنے میں آراء متفق ہوں اب ان کا ارادہ صرف ان سات قاریوں پر پورا ہوا۔ ورنہ ائمہ قراء کی کثرت اتنی ہے کہ انھیں شمار نہیں کیا جا سکتا اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی قدرت اور عظمت شان میں ان سے بھی بڑھ کر ہیں۔

لہٰذا ابن مجاہد کا ان سات قاریوں پر اقتصار کرنا اس لیے نہیں کہ قراء انھی میں منحصر ہیں اور کسی کے لیے یہ بھی لازم نہیں کہ وہ انھی کی قراءات کی حدود پر رک جائے بلکہ جس قراءات میں بھی مشہور ضابطے کے ارکان ثلاثہ پائے جائیں انھیں قبول کرنا واجب ہے۔

اس بناء پر قراءات عشرہ ان سات قرأتوں پر قرأت یعقوب، قرأت ابوجعفر اور قرأت کے اضافے پر مشتمل ہوگی۔

اور قرأت اربعہ عشرہ ان دس قرأتوں پر قرأت حسن بصری، قرأت ابن محیصن، قرأت یحییٰ یزیدی اور قرأت شنبوذی کے ساتھ ہوگی۔

اختلاف قراءات کے فوائد ❁ یہ نقطہ ہم نے "مبحث نزول القران علی سبعة احرف" میں پوری طرح بیان کر دیا ہے۔

اختلاف قراءات کے انواع ❁ اس موضوع پر بھی ہم "مبحث نزول القران علی سبعة احرف" پر کلام کر دیا ہے۔

قبول قراءات کا ضابطہ ✿ علماء قراءات کا مشہور ضابطہ ہے جس کے ذریعے وہ قراءات میں وارد ہونے والی روایات کو پرکھتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ وہ قرأت جو مصاحف عثمانیہ میں سے کسی ایک کے بھی موافق ہو خواہ تقدیرًا ہی کیوں نہ ہو اور کسی بھی وجہ میں عربیت کے بھی موافق ہو اور اس کی سند صحیح ہو اگرچہ قراء عشرہ سے اوپر ہی کیوں نہ ہو تو وہ قرأت صحیحہ ہے اسے رد کرنا جائز نہیں اور اس کا انکار حلال نہیں بلکہ یہ انھی حروف سبعہ میں سے ہے جن پر قرآن نازل ہوا۔

اس ضابطے کو صاحب "الطیبہ" نے شعر کی صورت میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

کل ما وافق وجه النحو وکان للرسم احتمالا یحوی

"ہر وہ قرأت جو نحو کی کسی بھی وجہ کے موافق ہو۔ اور رسم عثمانی میں بھی کوئی احتمال ہو جو اس پر مشتمل ہو۔"

وصح اسنادا هو القران فهذه الثلاثة الارکان

"اور اس کی سند صحیح ہو تو وہ قرآن ہے۔ اور یہی تین ارکان ہیں۔"

وحیثما یختل رکن اثبت شذوذه لوانه فی السبعة

"جہاں بھی کوئی رکن کم ہو۔ وہ اس کے شذوذ کو ثابت کرے گا اگرچہ وہ قراءات سبعہ میں ہی کیوں نہ ہو۔"

"مصاحف عثمانیہ میں سے کسی ایک کے موافق ہونے" سے مراد یہ ہے کہ وہ ثابت ہوا اگرچہ بعض میں ہوا اور بعض میں نہ ہو جیسے ابن عمر کی قرأت ﴿وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ (البقرۃ:۱۱۶) بغیر واؤ اور انھی کی قرأت ﴿وَ الزُّبُرِ وَ الْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ ۝﴾ (آل عمران:۱۸۴) میں دونوں اسماء میں "باء" کی زیادتی۔ یہ مصحف شامی میں ثابت ہے۔

اسی طرح ابن کثیر کی قرأت میں ﴿جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (التوبۃ:۸۹) جو سورۃ التوبۃ کے آخر میں واقع ہوا ہے اس میں "من" کی زیادتی مصحف مکی میں ثابت ہے۔

اور "اگرچہ تقدیری ہی کیوں نہ ہو" سے مراد یہ ہے کہ روایت میں مصحف کی رسم کے موافق ہونا ہی کافی ہے اگرچہ یہ موافقت صراحتًا نہ ہو جیسے ﴿مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝﴾ (الفاتحۃ:۳) یہ تمام مصاحف میں ﴿مٰلِكِ﴾ کلمہ میں "الف" کے حذف کے ساتھ ہے اب حذف والی قرأت تو اس کے موافق حقیقتًا ہے جیسا کہ (سورۃ الناس آیت ۲ میں) ﴿مَلِكِ النَّاسِ ۝﴾ لکھا ہوا ہے اور الف والی قرأت تقدیرًا اس کا احتمال رکھتی ہے جیسا کہ ﴿مٰلِكَ الْمُلْكِ﴾ (آل عمران:۲۶) میں لکھا ہوا ہے اس میں الف کو اختصار کی بنا پر حذف کیا گیا ہے جیسا کہ بہت سے حالات حذف کر دیا جاتا ہے جس کی طرف پیچھے قواعد رسم عثمانی میں ہم نے اشارہ کر دیا ہے جبکہ صریح موافقت کثرت کے ساتھ ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ﴿وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا﴾ (البقرۃ:۲۵۹) کو مصحف میں بغیر نقطوں کے لکھا گیا اور یہ ﴿نُنْشِزُهَا﴾ یعنی "زاء کے ساتھ" اور قرأت ﴿نُنْشِرُهَا﴾ "راء کے ساتھ" دونوں کے موافق ہے۔

اس کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسم مصحف میں غور کیا تو جو کلمہ اصل کے موافق بھی مروی ہو اور خلاف اصل بھی مروی ہو تو اسے اسی حرف کے مطابق لکھتے جو اصل کے خلاف ہوتا کہ جو کلمہ دونوں قرأتوں پر صورت واحدہ کی دلالت میں نہیں لکھا گیا وہ اصل کے مساوی ہو جائے اس لیے کہ وہ ایک قرأت پر حرف کے ذریعے دلالت کر رہا ہے اور دوسری قرأت پر اصل کے ذریعے پر دلالت کر رہا ہے جیسے کلمہ "الصراط" اور "المصیطرون" جو صاد کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور یہ صاد سین سے بدل کر آیا ہے انھوں نے اسے "صاد"

کے ساتھ لکھا اور اس کی اصل یعنی سین سے روگردانی کی تا کہ "سین" والی قرأت اگرچہ رسم کے مخالف ہے لیکن اصل کے مطابق آئی ہے لہٰذا یہ دونوں مساوی ہو گئے اور اس میں اشمام والی قرأت کا بھی احتمال ہے اگر اسے اس کی اصل یعنی "سین" کے ساتھ لکھا جاتا تو یہ احتمال فوت ہو جاتا اور "سین" کے علاوہ والی قرأت رسم اور اصل دونوں کے مخالف ہوتی اسی وجہ سے "بصطة" (جو سورۃ الاعراف میں ہے) میں اختلاف مشہور ہے جبکہ سورۃ البقرۃ کے "بسطة" میں نہیں اس لیے کہ سورۃ البقرۃ کا حرف "سین" کے ساتھ لکھا گیا ہے اور اعراف کا حرف "صاد" کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

علامہ نویری رحمۃ اللہ علیہ کا "الطیبہ" پر اس موضوع پر بڑا نفیس جملہ ہے جس کی عبارت مندرجہ ذیل ہے۔

"جاننا چاہیے کہ رسم سے مراد" کلمہ کی صورت کو اس کے حروف ہجاء کے ساتھ اس طرح پیش کرنا کہ اس کی ابتداء اور انتہاء کی تعیین بھی ہو جائے۔" اور عثمانی سے مراد وہ رسم ہے جو مصاحف عثمانیہ میں مرسوم ہے۔ اس کی تقسیم قیاسی کی طرف ہوتی ہے اور قیاسی وہ رسم ہے جو لفظ کے موافق ہو اور "تحقیقا" کا یہی معنی ہے اور سماعی کی طرف ہوتی ہے یہ وہ رسم ہے جو لفظ کے مخالف ہو اور "تقدیرًا" کا بھی یہی معنی ہے اور احتمالی کی طرف جس کا بیان آرہا ہے۔

رسم کا لفظ کی مخالفت کرنا پانچ اقسام میں منحصر ہے۔ ① بدل پر دلالت جیسے "اَلصِّرَاط"

② زیادتی پر دلالت جیسے: "ملك" ③ حذف پر دلالت جیسے: "لکناهو"

④ فصل پر دلالت جیسے: "فمال هؤلاء" ⑤ اصل پر دلالت جیسے: "اَلَّا یَسْجُدُوا"

اب صاد، حذف، اثابت فصل اور وصل والی پانچوں قرأتیں، رسم کے موافق ہے تحقیقا اور ان کے علاوہ کے موافق ہے۔ تقدیرًا۔ اس لیے کہ "سین" کو "صاد" سے بدل دیا جاتا ہے۔ چار حروف سے پہلے اور ان میں سے ایک طاء بھی ہے جیسا کہ عنقریب آرہا ہے اور "مالك" کا الف مثبت کے نزدیک زائد ہے اور "لکنا" کی اصل اثبات ہے اور "فمال" کی اصل فصل ہے اور "اَلَّا یَسْیُجُدُوا" کی اصل وصل ہے اس لیے بدل مبدل منہ کے حکم میں ہوگا اسی طرح باقی کلمات بھی ہیں یہ اس لیے ہے کہ تقدیری موافقت متحقق ہو جائے اس لیے کہ دو قرأتوں کا اختلاف جب متغایر ہو لیکن تضاد و تناقض نہ ہو تو یہ بھی موافق کے حکم میں ہے اور اگر تضاد یا تناقض ہو تو مخالف کے حکم میں ہے جبکہ واضح فقط اول ہے اور وہ یہ ہے دو وجوہ میں سے کسی ایک کے صحیح ہونے سے دوسری کا بطلان لازم نہ آئے۔

اس کی تحقیق یہ ہے کہ کبھی لفظ کی ایک جہت ہوتی ہے تو اس کی رسم بھی اس کے موافق ہو گی اس صورت میں رسم لفظ کی جہت پر منحصر ہوگا اور اس کا مخالف مناقض ہوگا اور کبھی اس کی کئی جہات ہوں گی اس صورت میں اس کی رسم کسی ایک جہت پر ہو گی اور لفظ کی جہت میں منحصر نہیں ہو گی اب۔ اس کو پڑھنے والا تحقیقا اس کے موافق ہے اور تقدیرًا کسی اور کے موافق ہے اس لیے کہ بدل مبدل منہ کے حکم میں ہوتا ہے اسی طرح باقی پانچ کو بھی سمجھو۔

اور قسم ثالث وہ ہے جو احتمالاً رسم کے موافق ہو اس میں وہ بھی مندرج ہیں جن میں حرکت یا سکون کا اختلاف ہوا ہو جیسے "القدُس" یا تخفیف تشدید کا اختلاف ہوا ہو جیسے سورۃ یونس میں "ینشر کم" ہے یا قطع و وصل کا اختلاف ہوا ہو جسے شکل کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسے سورۃ غافر میں "ادخلوا" ہے یا نقطوں کا اختلاف ہوا ہو جیسے "یعلمون" (سورۃ الفتح) یا اعجام واہمال کا اختلاف

ہوا ہو جیسے ﴿نُنْشِزُهَا﴾ اسی طرح جن کے الفاظ میں اختلاف ہو جیسے مدعم، مسّهل، مُمال، مرقّق اور مدور مصاحف عثمانیہ اسی طرح تمام کے تمام اس لیے کہ یہ اوصاف سے خالی ہیں۔

اب نظم والے (یعنی شاعر) کا قول "وکان للرسم احتمالا" (اور رسم میں اس کا احتمال بھی ہو) اس میں وہ قرأت بطریق اولی داخل ہوگی جو رسم کے تحقیقا موافق ہو خواہ تمام مصاحف کے موافق ہو یا بعض کے جیسے "قالو اتخذا الله ولدًا" اور "وبالزبر وبالکتاب" میں ابن عامر کی قرأت یہ مصحف شامی میں ثابت ہے اور جیسے ابن کثیر کی قرأت جو سورۃ التوبہ میں ﴿جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (التوبہ:۸۹) میں ہے یہ مصحف کوفی میں ثابت ہے۔

شاعر کا قول "احتمالًا" میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ "تحقیقی" کے مقابل ہو اس صورت میں ان کے نزدیک تقسیم ثنائی ہوگی یعنی تحقیقی اور احتمالی اور تقدیری کو احتمالی میں داخل کر دیا جائے گا اور "النشر" والے نے اسی طرح کیا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ تین قسمیں بنالی جائیں اور پہلی دو اقسام کا حکم اولویت کے ساتھ ثابت ہو اور اگر رسم کی موافقت کی کوئی صورت نہ ہو تو لازم آئے کہ کل کل کے مخالف ہوں جیسے "السمٰوٰت، الصالحات اور اللیل۔"

پھر بعض الفاظ میں کسی ایک قرأت کی موافقت حقیقی ہوگی اور دوسری کی تقدیری جیسے "ملك" اور بعض میں دو یا دو سے زیادہ قراءات میں موافقت حقیقی ہوگی جیسے: "انصار الله، نادته الملائكة، ويغفر لكم اور هيت لك۔"

جاننا چاہیے کہ کسی حرف مدغم، مبدل، ثابت یا محذوف وغیرہ میں رسم کے صریح مخالف کے ساتھ قرأت ثابت ہو اور مشہور ہو تو اسے مخالف شمار نہیں کیا جائے گا کیا آپ نہیں دیکھتے کہ یاءات زوائد کو ثابت رکھنا اور "تسألنی" (سورۃ الکہف) میں یاء کو حذف کرنا، اسی طرح ﴿وَاَكُوْنَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ کی قرأت وغیرہ رسم کے مخالف ہیں لیکن پھر بھی نہیں رد نہیں کیا جاتا اس لیے کہ یہ ایک معنیٰ کی طرف لوٹتا ہے اور قرأت کی صحت اور شہرت کے ساتھ جاری وساری ہے۔ بخلاف کلمہ کی زیادتی اور نقصان کے یا تقدیم وتاخیر کے حتیٰ کہ اگر چہ ایک حرف میں ہی کیوں نہ ہو اس لیے کہ یہ بھی کلمہ کے حکم میں ہے اور اس میں بھی رسم کی مخالفت جائز نہیں۔

یہی حد فاصل ہے جو رسم کی اتباع یا مخالفت کی حقیقت میں ہے۔

ضابطہ مذکورہ میں ان کا کہنا کہ: "وافق العربية ولو بوجه" (کسی بھی وجہ میں عربیت کے موافق ہو۔)

اس سے مراد لغت کے قواعد کی وجوہ سے کوئی بھی وجہ ہو خواہ وہ لغت فصیح ہو یا غیر فصیح ہو اور خواہ اس پر اتفاق ہو یا اختلاف اس کے لیے مضر نہیں ہے بشرطیکہ قرأت شائع ذائع ہو اور ائمہ نے صحیح سند کے ساتھ اسے حاصل کیا ہو۔

موافقت عربیہ کے رکن میں مختار یہی ہے۔

یہ حافظ ابوعمرو دانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو اپنی کتاب "جامع البیان" میں جب ذکر کرتے ہیں کہ ابوعمرو کی قرأت میں "بَارِئْكُمْ" اور "يَأْمُرْكُمْ" میں اسکان ہے اور اس کے بعد حکایت ذکر کرتے ہیں کہ سیبویہ نے اس کا انکار کیا اس کے بعد فرماتے ہیں کہ "نقل اور اکثر اداء میں اسکان اصح ہے انھوں نے اسی کو اختیار کیا اور اسی کو لیا ہے.... آگے فرماتے ہیں کہ.... ائمہ قراء قرآن کے کسی بھی حرف میں لغت میں پھیلے ہوئے یا لغت کے موافق پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ جو اثر میں ثابت ہو اور نقل میں اصح ہو اسی پر اعتماد کرتے ہیں اور جب روایت ان کے نزدیک ثابت ہو تو قیاس عربیہ بھی اس کی تردید نہیں کرتا اور لغت میں پھیلنا بھی اسے رد نہ کرے گا اس لیے کہ

قرأت ایک قابل اتباع سنت ہے جسے قبول کرنا اور اس کی طرف رخ کرنا لازم ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ ایک عالی شان کلام ہے کیونکہ علماء نحو نے اپنے قواعد کلام اللہ، کلام رسول اور کلام عرب سے حاصل کیے ہیں جب روایات مقبولہ سے قرآن پاک کی قرآنیت ثابت ہوگئی تو قرآن علماء نحو اور ان کے قواعد پر ثالث ہو گیا اور ان پر واجب ہو گیا کہ اپنے قواعد کے لیے ان کی طرف رجوع کریں یہ نہیں کہ ہم قرآن کے لیے ان کے مخالف قواعد کی طرف رجوع کریں اور اس میں انھیں ثالث بنائیں ورنہ آیت کا عکس لازم آئے گا اور رعایت کے وجوب میں اصل کو مہمل چھوڑنا لازم آئے گا۔

اس ضابطہ میں ان کا قول "وصح اسنادہ" (اور اس کی سند صحیح ہو) اس سے مراد یہ ہے کہ اس قرأت کو عادل کامل الضبط اپنے جیسے سے روایت کرے اور یہ سلسلہ اسی طرح رسول اللہ ﷺ تک پہنچے اور اس میں کسی قسم کی علت قادحہ یا شذوذ بھی نہ پایا جائے بلکہ انھوں نے اس سے بڑھ کر شرط رکھی ہے کہ وہ روایت اس طرح کے ائمہ جو انھیں محفوظ بھی کرنے والے ہوں کے ہاں مشہور ہو۔ یہ ان کے ہاں غلط یا شاذ شمار نہیں ہوگی۔

محقق بن جزری تواتر کی شرط بھی لگاتے ہیں اور اس ضابطہ میں اس کی تصریح کرتے ہیں اور یہ بھی اعتبار کرتے ہیں کہ جو روایت مشہور و مستفیض ہو اور رسم و عربیت کے موافق بھی ہو تو وہ بھی قرآنیت کی قطعیت میں متواتر کی قوت میں ہے اگرچہ متواتر نہ ہو۔

اس ضابطے کا منطوق و مفہوم

یہ ضابطہ اپنے منطوق کے ساتھ دلالت کرتا ہے کہ ہر قرأت جس میں یہ ارکان ثلاثہ جمع ہو جائیں تو اس کے قبول کا حکم لگایا جائے گا بلکہ اس کے انکار کرنے والے پر کفر کا حکم لگایا جائے گا خواہ وہ قرأت ائمہ سبعہ سے مروی ہو یا عشرہ یا ان کے علاوہ ائمہ مقبولین میں سے کسی سے بھی مروی ہو یہ ضابطہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے دلالت کرتا ہے کہ جس قرأت میں یہ ارکان ثلاثہ پورے نہ ہوں تو ان کے عدم قبول کا حکم لگایا جائے گا اور جو اس کا انکار کرے اس کے عدم کفر کا حکم لگائے جائے گا۔ خواہ یہ قرأت ائمہ سبعہ سے مروی ہو یا ان کے علاوہ سے مروی ہو اگرچہ اس کا مقام ان سے بڑا ہو اور اس کی شان ان سے عظیم ہو۔

ائمہ سلف و خلف کے نزدیک یہی صحیح ہے جیسا کہ دانی، مکی، مہدوی، اور ابو شامہ نے اس کی تصریح کی ہے اور آپ کے لیے یہی کافی ہے کہ یہ حضرات قرآن کی قراءات میں علوم اور امام تھے۔

ابو شامہ نے اپنی کتاب "المرشد الوجیز" میں فرمایا کہ "اس سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے کہ ہر وہ قرأت جو ان ائمہ سبعہ میں سے کسی کی طرف منسوب ہو اور اس پر لفظ صحت کا اطلاق ہو اور یہ کہا جائے کہ یہ اسی طرح نازل ہوئی مگر جبکہ اس میں کوئی ضابطہ داخل ہو اس صورت میں مصنف اسے نقل کرنے میں منفرد نہ ہو اور اسے ان سے نقل کرنے میں یہ مختص نہ ہو بلکہ اگر وہ دوسرے قراء سے منقول ہو تو یہ اسے صحت سے نہیں نکالے گا کیونکہ ان اوصاف کے جمع ہونے پر اعتماد ہوگا ان پر نہیں جن کی طرف یہ منسوب ہو۔ اور جو قراءات قراء سبعہ کی طرف منسوب ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک جس پر اجماع ہو اور دوسری شاذ۔ البتہ یہ سات قراء اپنی شہرت اور صحیح مجمع علیہ قراءات کی وجہ سے ایسے ہیں کہ دل اسی طرف مائل ہوتا ہے کہ جو کچھ ان سے منقول ہو وہ دوسروں سے فائق ہے۔"

لیکن ابو شامہ وغیرہ کی رائے قراءات سبعہ میں درست نہیں جیسا کہ عنقریب آ رہا ہے۔

پھر اس ضابطے کا مفہوم جو محکوم علیہ ہے اپنے تحت بہت سی ایسی صورتوں کو لیے ہوئے ہے جو تفصیلی طور پر ایک دوسرے کے

مخالف ہیں اگرچہ حکم کے اعتبار سے یہ سب ایسی ہیں کہ اجمالاً ان پر حکم عدم قبول کا لگایا جائے گا جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

وہ یہ ہے کہ ضابطہ مذکورہ کا مفہوم ارکان ثلاثہ کی نفی کے ساتھ صادق آتا ہے اور ان میں سے ایک یا دو کی نفی کے ساتھ بھی صادق آتا ہے اور ہر حالت کے لیے خاص حکم ہے جسے آپ امام مکی کی عبارت سے جانیں گے جسے ہم بیان کر رہے ہیں "اگر کوئی سوال کرنے والا سوال کرے کہ اس وقت کون سی قرأت ہے جسے اس وقت قبول کیا جاتا ہے اور پڑھا جاتا ہے؟ اور کونسی قراءت ہے جسے قبول کیا جائے گا اور پڑھا نہیں جائے گا؟ اور کونسی قراءت ہے جسے قبول کیا جائے گا اور نہ پڑھا جائے گا؟"

تو جواب یہ ہے کہ جتنی بھی قرائتیں مروی ہیں اس کی کئی اقسام ہیں ایک وہ قسم ہے جسے آج پڑھا جاتا ہے یہ وہ قرائتیں ہے جس میں تین چیزیں جمع ہوں ایک یہ کہ وہ ثقہ راویوں کے ذریعے نبی کریم ﷺ سے منقول ہو دوسرے یہ کہ اس کی وجہ اس عربی میں ہو جس کے ساتھ سارا قرآن خوشگواری کے ساتھ نازل ہوا ہے تیسرے یہ کہ وہ مصحف کے خط کے موافق ہو۔

جب یہ تین چیزیں جمع ہو جائیں تو اسے پڑھا جائے گا اور اس کے تعین، صحت اور صدق کی قطعیت ہو جائے گی کیونکہ مصحف کے خط کے موافق ہونے کی وجہ سے اجماع سے ماخوذ ہے اور اس کے انکار کرنے والے کو کفار کہا جائے گا فرمایا: اور قسم ثانی: وہ قسم ہے جس کا نقل اخبار آحاد سے صحیح ہو اور عربیت میں اس کی وجہ صحیح نہ ہو اور اس کے الفاظ مصحف کے خط کے مخالف ہوں اسے قبول کیا جائے گا اور پڑھا نہیں جائے گا دو علتوں کی وجہ سے ایک یہ کہ یہ اجماع سے ماخوذ نہیں ہے بلکہ اخبار آحاد سے ماخوذ ہے اور خبر واحد سے وہ قرآن ثابت نہیں ہو سکتا جسے پڑھا جاتا ہے دوسری علت یہ ہے کہ وہ اجماع کے مخالف ہے اس لیے اس کی تعیین وصحت قطعی نہ ہو گی اور جس کی صحت قطعی نہ ہو اس کی قرأت جائز نہیں اور اس کا انکار کرنے والے کو کافر نہیں کہا جائے گا۔

فرمایا: تیسری قسم: "جسے کوئی غیر ثقہ نقل کرے یا کوئی ثقہ نقل کرے لیکن عربیت میں اس کی وجہ نہ ہو اسے قبول نہیں کیا جائے گا اگرچہ مصحف کے موافق ہو ان اقسام میں سے ہر ایک کی مثالیں ہیں لیکن ہم نے انھیں اختصار کی بناء پر چھوڑ دیا۔"

پھر محقق ابن جزری ان مثالوں کو ذکر کرنے میدان میں اتر آئے جنھیں مکی رحمہ اللہ نے اختصار کی بناء پر چھوڑ دیا تھا چنانچہ فرمایا کہ:

قسم اوّل کی مثال ◉ "ملك" اور "مالك، يخدعون" اور "يخادعون، اوصى" اور "وصى، يطوّع تطوّع" وغیرہ جو قراءات مشہورہ میں سے ہیں۔

ثانی کی مثال ◉ اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ﴾ (الليل: ۳) میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ﴿الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ﴾ یعنی "ما خلق" کے حذف کے ساتھ اور ﴿وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا﴾ (الکہف: ۷۹) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت جس میں "وراء" کی بجائے "امام" ہے اور "صالحة" کے لفظ کا اضافہ ہے اور ﴿وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ كَافِرًا﴾ (الکہف: ۸۰) میں "کافرا" کے اضافے کے ساتھ اور اس جیسی اور بہت سی مثالیں ہیں جن میں ثقہ راویوں کی روایت ثابت ہے۔

قسم ثالث کی مثال ◉ جسے غیر ثقہ نقل کرے اس کی مثالیں تو بہت زیادہ ہیں جو کتب شواذ میں پائی جاتی ہیں ران کی سندیں اکثر ضعیف ہوتی ہیں جیسے ابن سمیفع اور ابو السمال وغیرہ کی قرات ہو میں ﴿نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ﴾ (یونس: ۹۲) جیم مہملہ کے ساتھ اسی طرح لِمَنْ خَلَفَكَ آيَةً "لام کے فتحہ کے ساتھ۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف منسوب قرأت اور وہ قرأت جسے ابو الفضل محمد بن

خزاعی نے جمع کیا اور ابوالقاسم ہذلی وغیرہ نے اسے نقل کیا: "انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء" ہاء کے رفع اور ہمزہ کے نصب کے ساتھ یعنی لفظ جلالہ کے رفع اور العلماء کے نصب کے ساتھ۔

25 اس نے اسے اکثر مفسرین تک پہنچا دیا اور اس کی نسبت امام صاحب کی طرف کی اور اس کی توجیہ میں تکلف کیا حالانکہ اس کی کوئی اصل نہیں اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس سے بری ہیں۔

جسے ثقہ نے نقل کیا ہو اور عربیت میں اس کی کوئی وجہ نہ ہو اس کی مثال: یہ جب بھی صادر ہوتا ہے یا تو سہو کی وجہ سے صادر ہوتا ہے یا غلطی کی وجہ سے یا عدم ضبط کی بناء پر اسے ائمہ محققین حفاظ جو کامل الضبط ہوتے ہیں وہی جانتے ہیں یہ بہت ہی کم ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

بعض حضرات نے اس کی مثال میں "مَعَایِش" کو ہمزہ کے ساتھ پڑھنے کو پیش کیا ہے جسے خارجہ کی روایت نافع سے بتلایا ہے۔ پھر فرمایا کہ ان دو قسموں میں وہ بھی داخل ہیں جو شاطبیہ کے بعض متاخرین شراح نے حمزہ کے وقف میں ذکر کیا ہے جیسے "أَسْمَآءِهِمْ" اور "وَاُولٰئِكَ" کو یائے خالص کے ساتھ پڑھنا اسی طرح "شُرَكَآءُهُمْ" اور "أَحِبَّاءُهُمْ" کو واؤ خالص کے ساتھ پڑھنا اور "جَآءَكُمْ" اور "أَخَاهُ" کو الف خالص کے ساتھ پڑھنا اور "رَأٰى" کو "را"، "تَرَائِى" کو "تَرَى"، "وَاشْمَأَزَّتْ" کو "وَاشْمَزَّتْ" "فَادّٰرَأْتُمْ" کو "فَادَّارَتُمْ" پڑھنا ان سب کو ہمزہ کے حذف کے ساتھ پڑھنا جسے وہ تخفیف رسمی کا نام دیتے ہیں حالانکہ عربیت کی وجوہ میں سے کسی بھی وجہ میں یہ جائز نہیں یا تو یہ کسی ثقہ سے منقول ہیں (حالانکہ ایسا نہیں ہو سکتا) تو یہ غیر مقبول ہیں اس لیے کہ ان کی کوئی وجہ نہیں یا غیر ثقہ سے منقول ہیں تو اس کا منع زیادہ مناسب اور اسے رد کرنا زیادہ اولیٰ ہے۔ اور یہ بات بھی ہے کہ میں نے اس کی خوب چھان بین کی لیکن میں نے اسے حمزہ سے منصوص نہیں پایا نہ کسی صحیح سند سے اور نہ ہی ضعیف سے۔

پھر فرمایا کہ: پھر ایک مردود قسم بھی باقی رہ جاتی ہے وہ یہ کہ عربیت کے بھی موافق ہو اور رسم کے بھی موافق ہو لیکن کہیں بھی منقول نہ ہو اسے رد کرنے کا حق ہے اور اس کی ممانعت میں سختی کی جائے گی اور اس کا ارتکاب کرنے والا عظیم کبائر کا ارتکاب کرنے والا ہے۔ محمد بن حسن بن مقسم بغدادی مقری نحوی سے اس کا جواز بھی مذکور ہے اور یہ تین صدیوں بعد آئے۔

امام ابو طاہر بن ابو ہاشم نے اپنی کتاب "البیان" میں فرمایا کہ ہمارے زمانے میں بھی کسی سر نکالنے والے نے سر نکالا اور اس نے یہ بات بنادی کہ "اس کے نزدیک قرآن پاک کے کسی حرف کی کوئی وجہ عربیت میں صحیح ہو اور مصحف کے موافق ہو تو اس کی قرأت نماز وغیرہ میں جائز ہے۔" اس نے یہ ایک نئی بدعت بنا ڈالی اور اس کے ذریعے سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔

میں نے کہا اس کی وجہ سے بغداد میں ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں فقہاء اور قراء حاضر ہوئے اور انھوں نے اس کے منع پر اجماع کیا وہ آئندہ کے لیے اس سے باز آگیا اور اس نے رجوع کر لیا اور اس کی موجودگی میں لکھت پڑھت ہو گئی۔ جیسا کہ اسے حافظ ابوبکر خطیب نے تاریخ بغداد میں لکھا اور "الطبقات" میں بھی ہم نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

تنبیہ ● قراء نے قرأت کے مشہور ضابطہ میں صرف صحت اسناد اور اس کے ساتھ دوسرے دو رکن پر اکتفاء کیا لیکن تواتر کی شرط نہیں لگائی حالانکہ قرآنیت کے تحقق میں اس کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے تین اسباب ہیں:

① یہ ضابطہ ہے تعریف نہیں اور تواتر کا لحاظ قرآن کی تعریف میں کیا گیا ہے اس بناء پر وہ رکن ہے یا کم از کم شرط ہے۔ اور ضابطہ میں

ملحوظ نہیں ہے اس لیے کہ ضابطہ میں وہ چیزیں معاف ہوتی ہیں جو تعریف میں معاف نہیں ہوتیں۔ اور ضابطوں میں ماہیت اور حقیقت کا بیان نہیں ہوتا۔

② طالب علم کے لیے قراءات مقبولہ کی غیر مقبولہ سے تمیز میں آسانی صرف اس ضابطے کی رعایت سے ہوتی ہے کیونکہ اگر تواتر بھی مشروط ہو تو یہ تمیز مشکل ہو جائے گی اس لیے کہ وہ اس کے حصول میں کسی ایسی جماعت تک پہنچنے پر مجبور ہو جائے گا جس کا روایت کے ہر طبقہ میں جھوٹ پر جمع ہونے سے اطمینان ہو اور اس کا میسر ہونا ناممکن ہے۔

③ یہ ارکان ثلاثہ بھی قراءات مقبولہ کے قطعی علم کا فائدہ دینے میں تقریباً تواتر کے برابر ہیں اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ مصحف کے دوگتوں کے درمیان جو کچھ ہے وہ متواتر ہے اور سب سے افضل زمانے یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے میں اس پر امت کا اجماع ہو چکا ہے پھر جب قرأت کی سند صحیح ہو گئی اور لغت کے قواعد کے مطابق بھی ہو گئی پھر اس متواتر مصحف کے خط کی موافقت بھی ہو گئی تو یہ موافقت قرینہ ہے کہ یہ روایت علم قطعی کا فائدہ دے رہی ہے اگرچہ خبر واحد ہے۔

اور آپ کو بھولنا نہیں چاہیے کہ علم اثر میں ثابت ہے کہ خبر آحاد جب محتف بالقرینہ ہو تو وہ علم قطعی کا فائدہ دیتی ہے۔ گویا کہ مصحف کے متواتر باوثوق بننے سے پہلے تواتر کا حصول بھی سند میں مطلوب تھا پھر جب یہ اجماعی مصحف وجود میں آ گیا تو روایت میں اس کا صحیح ہونا اور مشہور ہونا ہی کافی سمجھا جائے گا بشرطیکہ وہ اس مصحف کی رسم اور لسان عرب کے موافق ہو۔

صاحب کوکب الدریہ محقق ابن جزری سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ہمارا قول: "اور اس کی سند صحیح ہو" اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس قرأت کو عادل کامل الضبط اپنے جیسے سے نقل کرے اور اسی طرح سند پوری ہو نیز وہ قرأت اس قسم کے ائمہ کے نزدیک مشہور بھی ہو اور ان کے نزدیک غلطی میں شمار نہ ہو اور نہ ہی بعض کے شدوذ میں شمار ہو۔

بعض متاخرین نے اس رکن میں تواتر کی شرط لگائی ہے اور سند کے صحیح ہونے پر اکتفاء نہیں کیا اور انھوں نے دعویٰ کیا کہ قرآن تواتر کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا اور اخبار آحاد کا آنا قرآن کو ثابت نہیں کرتا۔ اس میں جو تذبذب ہے وہ بالکل ظاہر ہے اس لیے کہ جب تواتر ثابت ہو گیا تو اس میں آخری دو رکنوں یعنی موافقت رسم وغیرہ کی ضرورت نہیں جب اختلافی حروف تواتر کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہو گئے تو انھیں قبول کرنا واجب ہو گیا اور ان کا قرآن ہونا قطعی ہو گیا خواہ وہ رسم کے موافق ہو یا مخالف۔

اس توجیہ سے جس کے ذریعے ہم نے ضابطہ مذکورہ کی توجیہ کی علامہ نویری کا اعتراض ختم ہو جاتا ہے جو انھوں نے "الطیبہ" کی شرح میں کیا وہ فرماتے ہیں کہ "وقوله وصح اسنادًا" (اور اس کی سند صحیح ہو) اس کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک کے ثبوت میں دو گزشتہ شرطوں کے ساتھ صحت سند کافی ہے تواتر کی ضرورت نہیں یہ نیا قول ہے اور محدثین وغیرہ کے اجماع کے خلاف ہے جیسا کہ عنقریب انشاء اللہ تعالیٰ آپ دیکھ لیں گے اس قول کی وجہ سے ایک قوم گمراہ ہو گئی وہ قرآن پاک کے ایسے حروف پڑھتے تھے جس کی سند اصلاً ہی صحیح نہیں تھی اور وہ کہتے تھے کہ تواتر شرط نہیں جہاں سے صحیح سند کا مطالبہ کیا گیا تو وہ نہ دے سکے اس مسئلہ کے لیے کچھ تفصیل ضروری ہے اسی وجہ سے میں نے اس میں قراء مشہور فقہاء اربعہ کے مذاہب اور اصولیین و مفسرین کے ذکر کردہ کا خلاصہ ذکر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو اور اس کے بارے میں میں نے اس پر ایک اہم حاشیہ بھی ذکر کر دیا اس لیے کہ اس میں تطویل کا احتمال نہیں ہے۔ چنانچہ میں کہتا ہوں کہ: جمہور یعنی ائمہ اربعہ جن میں سے غزالی، صدر الشریعت، موفق الدین مقدسی، ابن

مفلح اور طوفی کے نزدیک قرآن "وہ ہے جو مصحف کے دوگتوں میں تواتر کے ساتھ منقول ہو۔" دیگر حضرات نے کہا کہ یہ کلام ہے جو رسول اللہ ﷺ پر اس سورت کے اعجاز کے لیے نازل ہوا۔ جس نے بھی اس تعریف کا قول کیا اس نے تواتر کی شرط لگائی جیسا کہ ابن حاجب نے فرمایا اس لیے کہ یہ بات قطعی ہے کہ اس جیسوں کی تفاصیل میں عادت تواتر کا تقاضا کرتی ہے اور پہلے قول کے قائلین عادت کے محتاج نہیں ہیں اس لیے کہ ان کے نزدیک تواتر تعریف کا جزء ہے لہٰذا اس کے بغیر قرآن پاک کی ماہیت متصور نہ ہوگی اس صورت میں مذاہب اربعہ کے ائمہ کے نزدیک تواتر ضروری ہے اور ان میں سے سبکی رحمہ اللہ نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا جیسا کہ آپ کو تھوڑی سی تحقیق کے بعد علم ہو جائے گا اور بے شمار جماعتوں نے اس کی تصریح کی ہے جیسے ابن عبدالبر، ابن عطیہ، ابن تیمیہ، تونسی نے اپنی تفسیر میں، نووی، سبکی، اسنوی، اذرعی، زرکشی، دمیری، ابن حاجب، شیخ خلیل اور ابن عرفہ وغیرہ رحمہم اللہ۔

جبکہ قراء کا بھی اوّل زمانہ میں اس پر اجماع تھا اسی طرح آخری زمانہ میں بھی متاخرین میں سے کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی سوائے ابو محمد مکی کے اور بعض متاخرین بھی ان کے پیچھے چلے۔ یہ ان کا کلام ہے .... الخ۔

اس کے بعد بہت سی منقولات کو پیش کیا جنھیں ان کی طرف منسوب کیا یہ مقام ان کو پیش کرنے سے قاصر ہے بس جو ہم نے ذکر کر دیا کافی ہے۔

یہ توجیہ جس کے ذریعے ہم نے گزشتہ بالا ضابطہ کی توجیہ کی ہے اس سے اختلاف گویا کہ لفظی بن جاتا ہے اور قراء کی جماعتوں کو قرآن کے تواتر میں ہموار راستے پر چلا دیتی ہے۔ "جو ہموار راستے پر چلتا ہے ٹھوکر سے بچ جاتا ہے۔"

سند کے اعتبار سے قراءات کی انواع ✿ سیوطی رحمہ اللہ ابن جزری سے نقل کرتے ہیں کہ قراءات کی انواع چھ ہیں۔

① **متواتر** ✿ جسے ایک جماعت دوسری جماعت سے روایت کرے اور ان جیسی جماعتوں کا جھوٹ پر جمع ہونا ممکن نہ ہو۔

مثال ✿ وہ قراءت جس کے طرق قراء سبعہ سے نقل کرنے میں متفق ہوں اور قراءات میں یہی غالب ہے۔

② **مشہور** ✿ جس کی سند صحیح ہو کہ عادل کامل الضبط لوگ اسے اپنے جیسوں سے روایت کریں اور اسی طرح سند تام ہو اور عربیت کے بھی موافق ہو اور مصاحف عثمانیہ میں سے بھی کسی کے موافق ہو خواہ ائمہ سبعہ سے ہو یا ائمہ عشرہ سے یا ان کے علاوہ ائمہ مقبولین میں سے کسی سے مروی ہو اور قراء کے نزدیک مشہور بھی ہو اور انھوں نے اسے غلط یا شذوذ میں شمار نہ کیا ہو مگر تواتر کے درجہ کو نہ پہنچی ہو۔

مثال ✿ وہ قراءت جس کی سندیں قراء سبعہ سے نقل ہونے میں مختلف ہوں اور بعض روای ان سے روایت کریں اور بعض نہ کریں۔

ان دو انواع میں مشہور ترین تصنیفات میں سے "التیسیر للدانی، شاطبیہ" اور "طیبة النشر فی القراءات العشر" ہیں یہ دونوں انواع ہیں جنھیں اعتقاد کے وجوب کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور ان میں سے کسی کا انکار بھی جائز نہیں۔

③ جس کی سند صحیح ہو اور رسم یا عربیت کے مخالف ہو اور مذکورہ بالا طریقے سے مشہور نہ ہوئی ہو اس نوع کو پڑھا نہیں جاتا اور نہ ہی اس کا اعتقاد واجب ہے۔

اس کی مثال مستدرک للحاکم ص ۲۵۰ پر عاصم جحدری عن ابی بکرۃ کی سند سے ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ﴿مُتَّكِـِٔيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ۝﴾ (الرحمن: ۷۶) پڑھا اسی قبیل سے ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفَسِكُمْ﴾ (التوبہ: ۱۲۸) بھی ہے یعنی فاء کے فتحہ کے ساتھ۔

④ **شاذ** ۞ جس کی سند صحیح نہ ہو جیسے ابن السمیقع کی قرأت ﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ﴾ (یعنی حاء کے ساتھ) ﴿لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً﴾ (یونس: ۹۲) (خلفك میں لام کے فتحہ کے ساتھ)

⑤ **موضوع** ۞ جو اس کے قائل کی طرف بغیر دلیل کے منسوب ہو۔

مثال ۞ وہ قراءات جنہیں محمد بن جعفر خزاعی نے جمع کیا اور اسے امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب کیا ضابطہ کی شرح میں اس پر کلام ابھی گزر چکا ہے۔

⑥ جو حدیث کی انواع میں سے مدرج کے مشابہ ہو یہ وہ کلمات ہیں جو قراءات میں علی وجہ التفسیر زیادہ ہو گئے ہوں جیسے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی قراءت ﴿وَلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ﴾ (النساء: ۱۲) میں ﴿مِنْ اُمٍّ﴾ کی زیادتی کے ساتھ، اور اسی طرح ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (البقرۃ: ۱۹۸) میں "فِي مَوَاسِمِ الْحَجِّ" کی زیادتی والی قرأت اور قرأت زبیر ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران: ۱۰۴) میں ﴿وَيَسْتَعِيْنُوْنَ بِاللّٰهِ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ﴾ کے الفاظ کی زیادتی۔

یہ محض مشابہت ہے مدرج نہیں ہے، کیونکہ اس میں اختلاف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے نہیں معلوم یہ ان کی قرأت ہے (یعنی زبیر رضی اللہ عنہ کی) یا انھوں نے تفسیر کی ہے اسے حضرت سعید بن منصور رحمۃ اللہ علیہ اور ابن الانباری نے نقل فرمایا اور قطعی قرار دیا کہ یہ تفسیر ہے۔ اور حضرت حسن پڑھا کرتے تھے "وان منکم الاواردھا" اَلْوُرُوْدُ : اَلدُّخُوْلُ (مریم: ۷۱) ابن الانباری نے فرمایا کہ الورود: الدخل حضرت حسن کی طرف سے تفسیر ہے بعض راویوں نے اس میں غلطی کر کے اسے قرآن میں داخل کر دیا۔

ابن جزری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کلام کے آخر میں فرمایا کہ: "بعض اوقات کلام میں اس کی وضاحت کے لیے تفسیر کو داخل کر دیتے تھے اس لیے کہ انھیں تحقیق تھی کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کونسا قرآن سیکھا ہے اس لیے وہ التباس سے مامون تھے۔" ابن الجزری کا کلام تھوڑے سے تصرف کے ساتھ پورا ہوا اس میں ہم نے صاحب الکواکب الدریہ کی اتباع کی۔

قرآن پاک کا تواتر

اس موضوع میں اتنا کافی ہے کہ میں آپ کی خدمت میں تین نقول اور پیش کروں جو ان سے زائد ہیں جو اس سے پہلے علامہ نویری سے نقل کیے گئے۔

① امام غزالی "المستصفی" میں فرماتے ہیں کہ "حَدُّ الْكِتَابِ" (کتاب کی تعریف) "جو ہماری طرف مصحف کے دو گتوں کے درمیان سات حروف پر تواتر کے ساتھ منقول ہو۔" کتاب سے ہماری مراد "قرآن منزل" ہے اور ہم نے اسے مصحف کے ساتھ مقید کیا اس لیے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کی نقل میں خوب احتیاط سے کام لیا حتیٰ کہ انھوں نے تعاشیر (یعنی ہر دس آیات پر علامت لگانا) اور نقطوں کو ناپسند کیا اور انھیں خالی رکھنے کا حکم دیا تا کہ قرآن غیر قرآن کے ساتھ خلط نہ ہو جائے۔ اور ہماری طرف تواتر کے ساتھ نقل ہوا لہٰذا ہمیں معلوم ہوا کہ مصحف میں جو لکھا ہوا ہے وہ متفق علیہ ہے اور وہی قرآن ہے اور اس سے خارج قرآن نہیں ہے اس لیے کہ عرف و عادت میں محال ہے کہ اس کی حفاظت کے بھرپور اسباب ہونے کے باوجود اس کا کچھ حصہ چھوٹ جائے اور نقل نہ ہو یا اس کا غیر اس سے خلط ملط ہو جائے۔ پھر فرمایا کہ: اگر کوئی کہے کہ تم نے تواتر کی شرط کیوں لگائی؟

ہم جواب دیں گے کہ اس لیے کہ اس کا علم حاصل ہو جائے اس لیے کہ غیر معلوم کا حکم جہل ہوتا ہے اور کسی چیز کا کلام اللہ ہونا

ایک حقیقی امر ہے وضعی نہیں کہ اس کا تعلق ہمارے ظن کے ساتھ ہو اور کہا جائے کہ جب تم نے یہ یہ گمان کر لیا تو ہم نے تم پر ایک فعل حرام کر دیا یا اسے تمہارے لیے حلال کر دیا اس طرح تحریم ہم سے معلوم ہوگی اور ہمارا ظن علامت ہوگا اس کے ساتھ حرمت کا تعلق ہے... حد کلام سے دو مسئلے وجود میں آتے ہیں۔

کفارہ یمین کے روزوں میں تتابع کا مسئلہ ۞ ایک قول کے مطابق یہ واجب نہیں ہے اگرچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ﴿فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ﴾ (المائدہ:۸۹) متتابعات پڑھا ہے اس لیے کہ یہ زیادتی متواتر نہیں ہے اس لیے قرآن کا حصہ نہیں ہے اس لیے اسے اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ انھوں نے اس معرض بیان میں ذکر کیا کہ انھوں نے اپنے مذہب میں کس چیز کا اعتقاد رکھا، ہوسکتا ہے کہ انھوں نے تتابع کا اعتقاد اس مطلق کو ظہار میں تتابع کے ساتھ مقید پر محمول کرتے ہوئے رکھا ہو۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تتابع واجب ہے اس لیے کہ اس کا قرآن ہونا اگرچہ ثابت نہیں لیکن کم از کم یہ خبر ضرور ہے اور خبر واحد پر عمل کرنا واجب ہے اور یہ ضعیف ہے اس لیے کہ خبر واحد کے کذب پر کوئی دلیل نہیں ہے وہ یہ کہ اسے قرآن قرار دینا قطعی خطاء ہے اس لیے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب ہے کہ وہ اسے اپنی امت کی ایک ایسی جماعت تک پہنچائیں جن کا قول حجت ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جائز نہیں کہ اس کے ذریعے کسی ایک سے سرگوشی کریں اور اگر اسے قرآن سے نہ بنائیں تو یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ان کا مذہب ہو کسی ایسی دلیل کی وجہ سے جو اس پر دلالت کرتی ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ خبر ہو اور جو چیز خبر ہونے یا نہ ہونے میں متردد ہو اس پر عمل کرنا جائز نہیں بلکہ عمل اس پر جائز ہوتا ہے جس کے بارے میں راوی تصریح کر دے کہ یہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔

② بسملہ، قرآن پاک کی آیت ہے لیکن کیا ہر سورۃ کے شروع میں ایک آیت ہے؟ اس میں اختلاف ہے امام شافعی رحمہ اللہ کا میلان اس طرف ہے کہ یہ سورۃ الحمد اور باقی تمام سورتوں کی آیت ہے، لیکن یہ ہر سورۃ کے شروع میں مستقل آیت ہے یا یہ تمام سورتوں کی پہلی آیت کے ساتھ مل کر ایک آیت ہے امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انھوں نے اس میں تردد کیا اور یہی اصح ہے بنسبت اس شخص کے قول کے جس نے امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کے تردد کو اس بات پر محمول کیا کہ کیا یہ ہر سورت کے شروع میں قرآن ہے؟ بلکہ صحیح یہ ہے کہ چونکہ یہ قرآن کے ساتھ قرآن کے خط میں لکھی گئی ہے اس لیے قرآن ہے۔

(یہ ہم نے ان سے نقل کرنے کا ارادہ کیا معمولی تصرف کے ساتھ)

② صاحب مسلم الثبوت اور اس کے شارح فرماتے ہیں کہ جو آحاد منقول ہیں وہ قطعاً قرآن نہیں ہیں اور اس میں کسی بھی مذہب کا اختلاف نہیں جانا گیا اس پر دلیل یہ دی کہ قرآن کے نقل کے بھرپور اسباب ہیں اس لیے کہ الفاظ اور معنی کے اعتبار سے تحدی کو متضمن ہے اور احکام کی بنیاد ہے یہاں تک کہ اس کے نظم کے ساتھ بہت زیادہ احکام متضمن ہیں نیز یہ کہ ہر زمانے میں اس کی قرأت اور کتابت کے ساتھ تبرک حاصل کیا جاتا ہے اسی لیے معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کی حفاظت میں تواتر قطعی کی کوشش کی اور ہر وہ چیز جس کے نقل کے دواعی بہت ہوں اور عادتاً وہ متواتر منقول ہو تو اس کا وجود عادتاً ہر ایک کے نزدیک تواتر کو ملزوم ہوتا ہے جب لازم یعنی تواتر منتفی ہوگیا تو ملزوم بھی قطعی طور پر منتفی ہوگیا اور منقول آحاد متواتر نہیں ہیں لہٰذا وہ قرآن نہیں ہیں۔

③ حافظ جلال الدین "الاتقان" میں فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ "قرآن سے کچھ بھی ہو اس کا اصل میں بھی اور اجزاء میں بھی متواتر ہونا ضروری ہے جبکہ محل، وضع اور ترتیب میں بھی اہل سنت کے نزدیک اسی طرح ہے اس لیے کہ اس طرح کی

چیزوں کی تفصیل میں عادت تواتر کا تقاضا کرتی ہے اس لیے کہ یہ ایک بہت بڑا معجزہ ہے اور وہ معجزہ ہے جو دین قویم اور صراط مستقیم کی بنیاد ہے جس کے اجمالی اور تفصیلی نقل پر بھرپور اسباب ہیں اب جو چیز آحاد کے ساتھ منقول ہو اور متواتر نہ ہو تو اس کے بارے میں قطعی فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ قرآن نہیں ہے اکثر اصولیین کا مذہب یہ ہے کہ تواتر قرآن کے ثبوت میں اصلاً شرط ہے لیکن اپنے محل، وضع اور ترتیب میں شرط نہیں ہے بلکہ اس میں نقل آحاد اکثر ہے۔ بعض نے کہا کہ یہی وہ چیز ہے جس کا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بسم اللہ کا ہر سورت کے شروع میں ثابت کرنے والے طریقہ کار نے تقاضا کیا۔ اس مذہب کی تردید اس طرح ہے دلیل سابق تمام چیزوں میں تواتر کا تقاضا کرتی ہے نیز یہ کہ اگر وہ شرط نہ ہو تو مکرر قرآن کا بہت کثیر حصہ ساقط ہونا اور بہت سے غیر قرآن کا قرآن ثابت ہونا جائز ہوتا ہے۔ اوّل اس لیے کہ اگر ہم محل میں تواتر کی شرط نہ رکھیں تو قرآن میں واقع ہونے والے کثیر مکررات کا متواتر نہ ہونا جائز ہوتا جیسے ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝﴾ (الرحمٰن: ۱۳) دوسرا اس لیے کہ جب قرآن کا بعض حصہ اپنے محل کے اعتبار سے متواتر نہ ہو اس بعض کا اثبات اپنے محل میں آحاد کے نقل کے ساتھ بھی جائز ہوتا قاضی ابو بکر رحمۃ اللہ علیہ نے "الانتصار" میں فرمایا کہ "فقہاء و متکلمین میں سے ایک قوم کا مذہب یہ ہے کہ خبر واحد سے قرآن پاک کا ثبوت حکماً ہوگا علماً نہیں اور خبر مستفیض سے ایسا نہیں۔

علماء حق نے اس کا انکار کیا اور اسے ناپسند کیا اور اس کے قائلین کو خطاء پر قرار دیا۔

جبکہ مالکیہ وغیرہ میں سے جنھوں نے بسملہ کے انکار کا قول کیا انھوں نے اپنے قول کی بنیاد اسی اصل پر رکھی اور یہ طے کیا کہ یہ سورتوں کے شروع میں متواتر نہیں ہیں اور جو چیز متواتر نہ ہو وہ قرآن نہیں ہوتا۔

ہم سے پہلے اس کا جواب دیا گیا کہ ان کا متواتر نہ ہونا ممنوع ہے کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک قوم کے نزدیک متواتر ہوتی ہیں اور دوسری قوم کے نزدیک متواتر نہیں ہوتیں اور ایک وقت میں متواتر ہوتی ہیں دوسرے وقت میں نہیں ہوتیں ان کے تواتر میں اتنا کافی ہے کہ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد والوں کے مصاحف میں خط مصحف کے ساتھ ثابت ہیں حالانکہ انھوں نے مصحف میں غیر قرآن کو لکھنے سے منع کیا تھا جیسا کہ سورتوں کے نام آمین اور اعشار وغیرہ اگر یہ قرآن نہ ہوتا تو یہ حضرات اسے قرآن کے خط میں بغیر کسی تمیز کے اسے ثابت رکھنا جائز نہ سمجھتے اس لیے کہ یہ اس کے قرآن ہونے کے اعتقاد پر محمول کرتا ہے اس صورت میں وہ مسلمانوں کو دھوکہ دینے والے اور انھیں غیر قرآن کے قرآن ہونے کے اعتقاد پر ابھارنے والے بن جائیں گے حالانکہ یہ ایسی چیز ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اس کا اعتقاد جائز نہیں۔

اگر کہا جائے کہ شاید انھوں نے اسے سورتوں کے درمیان فصل کے لیے ثابت رکھا ہو تو جواب یہ ہوگا کہ اس میں تغییر ہے اور محض فصل کے لیے اس کا ارتکاب جائز نہیں اگر اس کے لیے جائز ہوتا تو سورۃ الانفال اور برأت کے درمیان بھی لکھی جاتی۔ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام ختم ہوا۔

یہ تین نقول اس موضوع میں کافی ہیں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ "المستصفی" اور "مسلم الثبوت" کی عبارتیں واضح طور پر دلائل قائم کرتی ہیں کہ قرآن متواتر ہے اگرچہ ان کا طریقہ استدلال مختلف ہے۔

اور سیوطی کی عبارت اصل اور غیر اصل میں اس تواتر کے عموم میں اختلاف کو ذکر کرتی ہے اور اس عموم کی تائید کرتی ہے اور

جس نے محل وضع اور ترتیب کو چھوڑ کر صرف اصل قرآن پر اقتصار کیا اس کی تردید کرتی ہے۔

قراءاتِ سبع میں آراء

اس مقام پر تحقیق تفتیش کرنے والا اپنے آپ کو ایک ایسے میدان میں پائے گا جو کثرت اختلافات، اضطراب نقول اور دو اختلاف کرنے والوں کے درمیان بہت زیادہ جبکہ حد سے زیادہ مسافت سے بھرا ہوا ہے۔ آپ کی خدمت میں ایک چھوٹی سی صورت پیش کی جاتی ہے جس میں آراء و افکار کا اختلاف موجود ہے جو کاتبین کے درمیان اس موضوع کی زینت بنا ہوا ہے۔

بعض لوگ قراءت سبعہ کی شان بڑھاتے ہوئے مبالغہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: "جس نے خیال کیا کہ قراءت سبعہ میں تواتر لازم نہیں تو اس کا یہ قول کفر ہے اس لیے کہ یہ تمام قرآن کے عدم تواتر کا سبب ہے اور یہ رائے بلادِ اندلسیہ کے مفتی استاد ابوسعید فرج بن لب کی طرف منسوب ہے انھوں نے اپنی اس رائے میں بہت زیادہ سختی کی اور اپنے مذہب کی تائید اور اس کی تردید کرنے والوں کے رد میں ایک بہت بڑا رسالہ تالیف کیا۔

لیکن ان کی یہ دلیل جس کا انھوں نے سہارا لیا مسلم نہیں اس لیے کہ قراءت سبعہ کے عدم تواتر کا قول قرآن کے عدم تواتر کو مستلزم نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ قراءت سبعہ اور قرآن میں فرق ہے کیونکہ قرآن پاک کا قراءات سبعہ کے علاوہ میں بھی تواتر کے ساتھ ہونا صحیح ہے یا اس مقدار کے اندر جس پر تمام قراء متفق ہو یا اس مقدار میں جس پر اتنی تعداد متفق ہو جن کے جھوٹ پر جمع ہونے سے ہر طبقہ میں امن ہو اگرچہ یہ احتمال ہے واقع جس کی نفی کرتا ہے جیسا کہ آئندہ آنے والی تحقیق اس کی نفی کرتی ہیں۔

② بعض لوگ قراءت سبعہ کی توہین اور اس کی شان گھٹانے میں مبالغہ کرتے ہوئے دعویٰ کرتے ہیں کہ ان میں اور باقی قراءات میں کوئی فرق نہیں۔ وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ تمام روایات اخبار آحاد ہیں وہ اس پر دلیل یہ دیتے ہیں کہ ان کے تواتر کا قول ایک منکر امر ہے جو اس میں سے کسی چیز میں بھی طعن کرنے والے کی تکفیر کا باعث ہے حالانکہ بعض علماء اور نمایاں شخصیات نے اس پر طعن کیا ہے۔

اس دلیل کا معارضہ اس طرح ہوگا کہ ہم نہیں تسلیم کرتے کہ قراءات میں سے کسی کا انکار اس کے تواتر کے قول کی بناء پر تکفیر کا مقتضی ہے تکفیر کا حکم تو اس کے لیے ہوگا جو اس کے تواتر کو جانتا ہو پھر اس کا انکار کرے اور ایک چیز بعض اوقات ایک قوم کے نزدیک متواتر ہوتی ہے اور دوسری قوم کے نزدیک نہیں ہوتی اور کبھی ایک وقت میں متواتر ہوتی ہے اور ایک وقت میں نہیں ہوتی چنانچہ اس میں جن لوگوں نے طعن کیا اسے اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ انھیں اس کے تواتر کا علم نہیں تھا یہ ان لوگوں کے تواتر کی نفی نہیں کرتا جو اسے جانتے ہیں۔

﴿وَ فَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ ۝﴾ (یوسف: ۷۶)

"ہر علم والے کے اوپر بھی ایک علم والا ہوتا ہے۔"

اس دلیل کا معارضہ یوں بھی ہوسکتا ہے کہ طاعنین کا طعن صرف ان چیزوں میں ہے جن میں اختلاف ہے اور وہ ادا کی قبیل سے ہیں اور جو متفق علیہ ہیں وہ طعن کا محل نہیں ہیں اور ہم جس تواتر کے قائل ہیں وہ متفق علیہ ہے وہ تواتر جو مختلف فیہ ہے ہم اس کے قائل نہیں ہیں۔

③ ابن السبکی رحمہ اللہ جمع الجوامع میں اور ان کے شارح اور محشی بھی فرماتے ہیں کہ "قراءات سبعہ متواتر تواتر تام ہیں یعنی انھیں نبی کریم ﷺ سے ایک ایسی جماعت نے نقل کیا جن کا جھوٹ پر جمع ہونا عادتاً ممتنع ہے اور اسی طرح سلسلہ چلتا گیا۔

اور قراء کی اسانید کا آحاد ہونا مضر نہیں اس لیے کہ اس کا کسی جماعت کے ساتھ مختص ہونا دوسروں سے قراءت کے آنے سے مانع نہیں بلکہ واقع ہے۔ تحقیق اسے ہر شہر والوں سے ان کے امام کی قرأت کے ساتھ ایک بہت بڑی جماعت نے اپنے جیسوں سے حاصل کیا اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہا اور اس کی نسبت ائمہ مذکورین اور مذکورہ راویوں کی طرف ان کی سندوں میں کی گئی اس لیے کہ وہ لوگ ان کے حروف کے ضبط اور اپنے کامل شیوخ کے حفظ کے درپے لگے ہوئے تھے۔

اس کا معارضہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ اگر سب کی سب قراءتیں متواتر ہوں تو قراء اس میں بالکل بھی اختلاف نہ کرتے حالانکہ انھوں نے اختلاف کیا اس لیے ان تمام کا متواتر ہونا مسلم نہیں۔

اس کا جواب یوں دیا جاتا ہے کہ اختلاف سے تواتر کی بھی نفی نہیں ہوتی بلکہ کل کا کل بھی متواتر ہو تو بھی اس میں اختلاف ہو سکتا ہے اس لیے کہ حروف سبعہ میں سے ہر ہر حرف جس کے ساتھ قرآن نازل ہوا ہے انھیں رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسی جماعت کو پہنچا دیا جن کا جھوٹ پر جمع ہونے سے اطمینان ہے تاکہ اس کتاب کی حفاظت ہو جائے اور انھوں نے اسے اپنے جیسوں کی طرف پہنچا دیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حروف ایک دوسرے کے مخالف ہیں تو یقینی بات ہے کہ جس نے جو حرف لیا اس کے نزدیک ہر حرف کا تواتر یقینی ہے اگرچہ دوسرے نے اسے نہ جانا ہو اور نہ ہی لیا ہو۔ اس موقع پر تواتر اور تخالف جمع ہو جاتے ہیں اور اس مقام پر قراءت سبع بلکہ قراءات عشر کے تواتر کا قول سیدھا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ عنقریب آ رہا ہے۔

④ ابن الحاجب رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ قراءات سبع متواتر ہیں لیکن انھوں نے ان چیزوں کو مستثنیٰ کیا ہے جو ادا کی قبیل سے ہیں جیسے مد، امالہ اور ہمزہ کی تخفیف کرنا۔

بنانی رحمہ اللہ نے "جمع الجوامع" کے حاشیہ پر لکھا کہ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ جو چیزیں ادا کی قبیل سے ہوں بایں طور کہ وہ لفظ کی ہیئت ہوں اور لفظ ان کے بغیر متحقق ہو جائے جیسے مد کی اپنی اصل پر زیادتی اور اس کے بعد والی مثالیں جو اس قبیل سے ہیں کہ سامع انھیں عادتاً ضبط نہیں کر سکتا اس لیے کہ یہ زیادتی اور نقصان کو قبول کرتے ہیں بلکہ یہ ایک اجتہادی امر ہے اور تواتر میں شرط ہے کہ وہ اصل میں اجتہاد سے نہ ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ضبط طبقہ اولیٰ میں پایا جاتا تھا اس لیے کہ یہ معلوم ہو کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ سے جو کچھ سنا اسے اسی طرح ضبط کر لیا ہو اور اس میں کوئی تفاوت نہ ہو اس وجہ سے کہ انھوں نے آپ ﷺ سے جو سنا ہو اسے بار بار پیش کیا ہو۔

ہم جواب دیتے ہیں کہ اگر اس کا وقوع مان لیا جائے تو بھی مفید نہیں اس لیے کہ باقی طبقات میں اس کی نظیر نہیں۔ کیونکہ طبقہ اولیٰ عادتاً قطعی طور پر اس پر قادر نہیں کہ دوسرے طبقہ نے جو حاصل کیا وہ بھی اسی طریقے پر جاری ہوں جس کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے اسے پڑھا ہو۔ اور گزشتہ بالا تقریر سے معلوم ہو گیا کہ کلام مد اور اس کے مابعد والی مثالوں پر اضافے کے بارے میں ہے اصل کے بارے میں نہیں کیونکہ یہ متواتر ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جو چیزیں اداء کی قبیل سے ہیں اگر ان کے تواتر سے مراد ان کی اصل کے اعتبار سے تواتر ہے جیسے مد کا تواتر

اس کی مقدار سے قطع نظر کرتے ہوئے اسی طرح امالہ کا تواتر تو توجیہ ابن حاجب کے قول کے خلاف ہو گی اس لیے کہ اس کے تواتر کا علم ہے اور اگر اصل سے زائد خصوصیات کا تواتر ہو تو توجیہ ابن حاجب کے قول کے مطابق ہو گی۔ یہ ابن قاسم نے فرمایا.... الخ (تھوڑے سے تصرف کے ساتھ)

لیکن جب ہم نے ابن حاجب کی عبارت کی طرف رجوع کیا تو ہمیں اسی طرح ملا جیسے انھوں نے اپنی کتاب "مختصر الاصول" میں فرمایا کہ "قراءات سبع متواتر ہیں ان چیزوں میں جو ادا کی قبیل سے نہ ہوں جیسے مد، امالہ اور تخفیف ہمزہ وغیرہ اور یہ ان کا صریح دعویٰ ہے کہ مد، امالہ اور ہمزہ کی تخفیف وغیرہ ادا کی قبیل سے ہیں اور یہ غیر متواتر ہیں اور یہ غیر صریح ہے جیسا کہ آپ کے پاس ان کی بات آرہی ہے جو انھوں نے ابن جزری کے ساتھ طویل مناقشہ میں کہی۔

⑤ ابو شامہ کا مذہب یہ ہے کہ قراءات سبعہ متواتر ہیں ان چیزوں میں جن کے قراء سے منقول ہونے پر طرق متفق ہیں اور جن کے منقول ہونے میں طرق مختلف ہیں وہ متواتر نہیں ہیں خواہ اختلاف کلمہ کے ادا میں ہو جیسا کہ ابن حاجب کا مذہب ہے اور خواہ لفظ میں ہو چنانچہ اس موقع پر استثناء ابن حاجب کے استثناء سے عام ہے ابو شامہ کی عبارت ان کی کتاب "المرشد الوجیز" میں ہے جس کی تصریح مندرجہ ذیل ہے۔

"متاخرین قراء کی جماعت کی زبانوں پر جو چھایا ہوا ہے کہ قراءات سبعہ متواتر ہیں ان کے بارے میں میں کہتا ہوں کہ یہ وہ ہیں جن کے قراء سبعہ سے نقل ہونے پر طرق متفق ہیں مختلف نہیں ہیں مطلب یہ ہے کہ بعض طرق میں ان کی نسبت کی نفی کی گئی ہو اور یہ کتب قراءات میں موجود ہے خصوصاً کتب المغاربہ اور مشارقہ میں کہ ان کے درمیان اکثر جگہوں پر تباین ہے۔"

خلاصہ یہ کہ ہم تواتر کا التزام نہیں کرتے ان تمام الفاظ میں جن میں قراء کے مابین اختلاف ہوا بلکہ ان میں سے کچھ متواتر ہیں اور متواتر وہ ہیں جن کے قراء سے منقول ہونے میں تمام طرق متفق ہوں اور کچھ غیر متواتر ہیں اور غیر متواتر وہ ہیں جن میں معنی سابقہ کے اعتبار سے اختلاف ہوا ہو اور بظاہر یہ ان کو بھی شامل ہو جائے گا جو قبیل اداء سے نہ ہوں اور ان کو بھی شامل ہو جائے گا جو قبیل ادا سے ہوں.... الخ" یہ "شرح جمع الجوامع" میں جلال الدین محلی سے اس کے حاشیہ میں منقول ہے۔

ابو شامہ کی اس رائے کے بارے میں میں طبعہ اولی میں کہا کرتا تھا کہ یہ میرے خیال میں سب سے بہتر رائے ہے اور یہ چار امور کی وجہ سے ہے۔

① یہ رائے ان توہینوں سے پاک ہے جن کے ذریعے سابقہ آراء کے ساتھ مناقشہ کیا گیا۔

② یہ اپنے دعویٰ اور دلیل میں واقع کی طرف منسوب ہے وہ یہ کہ قراءات سبعہ کے بعض حصوں میں کسی جگہ کلمات کے الفاظ کے تلفظ میں حقیقی اختلاف واقع ہوا ہے اور بعض جگہ ان الفاظ کی اداء میں اختلاف واقع ہوا ہے اسی وجہ سے دعویٰ واقع کے مطابق ہے پھر اس کی دلیل بھی واقع پر قائم ہوتی ہے کہ بعض روایات جو اپنی ائمہ قراء کی طرف نسبت میں مضطرب ہیں بعض نے ان کی نفی کی ہے اور بعض نے ان کا اثبات کیا ہے یہی تواتر کے انتفاء کی علامت ہے اس لیے کہ ایسی جماعت کا اتفاق جن کا جھوٹ پر جمع ہونے سے اطمینان ہو ہر طبقہ میں ہونا تواتر کے لازمات میں سے ایک لازم ہے اور یہ اتفاق منتفی ہو گیا لہٰذا تواتر منتفی ہو گیا اس لیے کہ یہ معلوم ہے کہ جب لازم منتفی ہو جائے تو ملزوم بھی منتفی ہو جاتا ہے۔

③ یہ رائے علوم القرآن میں خوب ماہر اور متخصص وکامل شخصیت سے صادر ہوئی ہے اور وہ ابوشامہ ہیں اور "گھر والا ہی اچھی طرح جانتا ہے کہ اس میں کیا ہے۔"

④ یہ رائے محققین کے نزدیک مقرر شدہ قاعدے کے ساتھ بھی متحقق ہوتی ہے کہ قراءات کے اندر ارکان ثلاثہ مذکورہ پورے ہوتے ہیں جو کہ اس مشہور قاعدہ میں ہے اور یہ ارکان ثلاثہ تمام کے تمام یا بعض منتفی ہیں اس میں قراءات سبعہ یا غیر سبعہ وغیرہ کا کوئی فرق نہیں جیسا کہ گزر چکا۔ اور گزشتہ بالا سند کے اعتبار سے قرأت کی چھ اقسام کی تصریح کی ہے یہ رائے ان کے ساتھ بھی متفق ہو جاتی ہے۔

استدراک ○ لیکن میرے بار بار بحث ونظر کرنے اور اس بارے میں اہل تحقیق کی مکتوبات میں میرے آگاہ ہونے کا دائرہ وسیع ہونے کے بعد مجھے واضح ہوا کہ ابوشامہ بھی درستگی سے غلطی کھا گئے جیسے غلطی کھانے والے کھا جاتے ہیں اور میں نے بھی اس کی اشاعت اور تائید میں غلطی کی۔

میں مجبور ہوں کہ حق کے انصاف کے طور پر ان وجوہ کو لوٹاؤں جن کی میں نے آپ کے سامنے تائید کی اب میں انھیں ایک ایک وجہ کر کے توڑوں گا "اور حق کی طرف رجوع فضیلت ہے۔"

① ابوشامہ کی رائے جو لکھی گئی ہے مسلم نہیں کہ یہ ان توہینات میں سے ہے جن کے ذریعے سابقہ آراء کا مناقشہ کیا گیا عنقریب آپ دیکھیں گے کہ ابن جزری کے کلام میں حساب کے ساتھ ان کا شدید مناقشہ ہے۔

② پھر یہ پردہ بھی کھل گیا کہ قراءت سبعہ بلکہ قراءات عشرہ واقع میں سب کی سب متواتر ہیں اور ان میں اختلاف سے تواتر کی نفی نہیں ہوتی بلکہ تواتر اور تخالف جمع ہو جاتے ہیں جیسا کہ ابن سبکی کی رائے کو پیش کرتے ہوئے ہم نے اس کی وضاحت کی۔ اور جیسا کہ آئندہ آنے والی ابن جزری کی تحقیق میں آپ کو بھی واضح ہو جائے گا۔

③ باقی رہی یہ بات کہ ابوشامہ ایک ماہر فن اور متخصص وکامل ہیں تو پاک ہے وہ ذات جو معصوم ہے اور کمال صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اس لیے کہ جنھوں نے ان کی تردید کی ہے اور ہم نے ان کی رائے کو اختیار کیا ہے (یعنی ابن الجزری) وہ بھی ماہر فن اور متخصص وکامل ہیں اور اس فن کی مہارت ان پر تام ہوتی ہے حتیٰ کہ جب محقق کا لقب مطلق بولا جائے تو انھی کی طرف لوٹتا ہے۔

"اور کتنے اوّل ہیں جن کو بعد والوں کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا ہے۔"

④ اور محققین نے قراءات کی جو تقسیم کی ہے کہ وہ متواتر ہے اور غیر متواتر۔ یہ ایسی تقسیم ہے کہ ابوشامہ کو اپنی اس رائے میں اس سے کوئی بھی فائدہ نہیں ہوگا اس لیے کہ وہاں ان کا کلام مطلق قراءات کے بارے میں ہے اور جبکہ ہمارا اور ابوشامہ کا کلام خاص قراءات سبعہ کے بارے میں ہے:

﴿بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ﴾ (الرحمٰن: ۲۰)

"ان دونوں کے درمیان پردہ ہے وہ آگے نہیں بڑھتے۔"

تین قرأتوں کے بارے میں آراء جو دس کو پورا کرنے والی ہیں۔

گزشتہ بالا میں آپ جان چکے کہ قرأت سبعہ کے بارے میں کیا کہا گیا؟ آیا کہ وہ متواتر ہیں یا غیر متواتر؟ جبکہ تین قراءات جو دس کو پورا کرنے والی ہیں بعض نے ان کے بھی تواتر کا قول کیا اور یہ قول ابن سبکی کی طرف منسوب ہے بعض نے فقط ان کے صحیح ہونے کا قول کیا، یہ جلال الدین محلی کی طرف منسوب ہے بعض نے شاذ کہا اور یہ قول ان فقہاء کی طرف منسوب ہے جو قراءات سبعہ کے علاوہ تمام قرأتوں کو شاذ شمار کرتے ہیں۔

قراءات عشر کے تواتر کی تحقیق

جس کی تائید دلیل سے ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قراءات عشر سب کی سب متواتر ہیں اور یہ رائے محقق اصولیین اور قراء کی ہے جیسے ابن السبکی، ابن الجزری اور اورنویری وغیرہ بلکہ آخری نقل میں ابوشامہ کی بھی رائے یہی ہے ان سے نقل کرنے والوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور جائز قرار دیا ہے کہ یہ رائے ان پر چھپائی گئی ہو یا انھوں نے پہلے یہ کہا ہو اور بعد میں اس سے رجوع کرلیا ہو۔

ہوسکتا ہے کہ درستگی اور حکمت یہ ہو کہ اس موقع پر میں کلام کو محقق ابن الجزری کے لیے چھوڑ دوں وہی اس میں کودتے اور پھرتے رہیں بولتے اور جھومتے رہیں اپنے نصاب میں حق کو وضع کریں خطا اور ان کے شبہات کو دور کریں۔ اب آپ اسے پڑھیں اور ان کی کثرت کلامی اور تطویل پر صبر کریں اس لیے کہ مقام دقیق وجلیل ہے۔ ﴿وَ لَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ۝﴾ (فاطر:۱۴) (خبر رکھنے والے کی طرح تمہیں کوئی نہیں بتلا سکتا)

انھوں نے پچھتر واں صفحہ شروع کرتے ہوئے فرمایا رحمۃ اللہ علیہ۔

فصل ثانی ۞ اس بارے میں ہے کہ قراءات عشر اصول وفروع اور اجتماع وافتراق ہر اعتبار سے متواتر ہے۔

اس مشکل کا حل ۞ جاننا چاہیے کہ علماء نے نفی اور اثبات ہر پہلو سے اس میں مبالغہ کیا ہے اور میں سب کے اقوال ذکر کرنے کے بعد آپ کے سامنے حق کو بیان کروں گا۔

جس نے کہا کہ یہ جزءیات میں متواتر ہے اصول میں نہیں وہ ابن حاجب ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب "مختصر الاصول" میں فرمایا کہ قراءات سبع ان چیزوں میں متواتر ہیں جو اداء کی قبیل سے نہ ہوں جیسے مد، امالہ اور ہمزہ کی تخفیف وغیرہ... الخ"

انھوں نے دعویٰ کیا کہ مد اور امالہ اور اس جیسے اصول جیسے ادغام، راءات کی ترقیق اور لامات کی تفخیم، حرکت کا نقل اور ہمزہ کی تسہیل وغیرہ کی قبیل سے ہیں اور غیر متواتر ہیں یہ قول غیر صحیح ہے جیسا کہ عنقریب ہم اسے بیان کریں گے۔ انھوں نے مد کو مطلق ذکر کیا حالانکہ اس کے تحت بھی ایسی چیزیں ہیں جو آنسو بہاتی ہیں کیونکہ مد، یا تو طبعی ہوگی یا عرضی طبعی وہ ہے جس کے بغیر حروف مد قائم ہی نہ ہوسکیں جیسے قال کا الف، "يَقُوْلُ" کی واؤ اور قیل کی یاء اس کے عدم تواتر کا قول بھی مسلمان نہیں کرسکتا اس لیے کہ اس کے بغیر قراءت ممکن ہی نہیں۔ جبکہ مدِ عرضی وہ ہے جو مد طبعی پر زیادتی کو عارض کرتی ہے اور اس کا کوئی سبب ہوتا ہے یا تو سکون ہوگا یا ہمزہ ہوگا سکون کبھی لازم ہوگا جیسا کہ سورتوں کے شروع میں اور مشدد ہوگا جیسے ﴿الٓمّٓ. قٓ. نٓ.﴾ اور ﴿وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ وغیرہ یہ بھی طبعی کے ساتھ ملحق ہے اس میں قصر جائز نہیں اس لیے کہ مد بھی ایک حرف کے قائم مقام ہوگئی نطق کو ساکن سے ملانے کی غرض سے محقق لوگوں نے اس کی مد پر مقدار کے اعتبار سے اجماع کیا ہے کہ وہ برابر ہوگی جبکہ ہمزہ کی دو اقسام ہیں۔

① یا تو حرف مد ایک کلمہ میں ہوگا اور ہمزہ دوسرے میں، قراء اسے منفصل کا نام دیتے ہیں اور اس کے مد اور قصر میں اختلاف کرتے

ہیں اکثر مد کا قول کرتے ہیں اس کا دعویٰ کہ اس میں عدم تواتر ہے یہ ترجیح بلا مرجح ہے اور اگر اس کے برعکس کہتے تو زیادہ ظاہر ہوتا اس کے شبہ کی وجہ سے اس لیے کہ اکثر قراء مد پر ہیں۔

② مد اور ہمزہ ایک کلمہ میں ہوں اسے متصل کہتے ہیں قراء نے اس کی مد پر اجماع کیا ہے پچھلوں نے بھی اگلوں نے بھی چھوٹوں نے بھی اور بڑوں نے بھی شرفاء نے بھی حقیروں نے بھی اس میں کوئی اختلاف نہیں سوائے اس روایت کے جو بعض سے منقول ہے جس پر بھروسہ نہیں کیا جاتا وہ شاذ سند کے ساتھ ہے اس کے ساتھ قرأت بھی جائز نہیں حتیٰ کہ امام الروایت ابو القاسم ہذلی نے جو کہ مشرق ومغرب میں داخل ہوئے اور انھوں نے تین سو پینسٹھ (۳۶۵) اساتذہ سے علم حاصل کیا وہ فرماتے ہیں کہ میں نے مغرب کے آخر سے فرغانہ کی طرف سفر کیا دائیں، بائیں پہاڑ سمندر سب کا سفر کیا اور اپنی کتاب "الکامل" تالیف کی اس میں انھوں نے صحیح، شاذ مشہور اور منکر سب کو جمع کیا۔ مد کے باب میں فرمایا کہ "فی فصل المتصل" اس فصل میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ ایک طریقہ پر مد ہے اس میں قراء کا ایک ہی طریقہ ہے انھوں نے اس کی مقدار تین الف رکھی ہے ....اور عراقی نے ذکر کیا کہ ایک کلمہ کی مد میں اختلاف ایسے ہی ہے جیسے دو کلموں کی مد میں اختلاف ہوتا ہے اور یہ میں نے اس کے علاوہ کے لیے نہیں سنا۔ بڑے عرصہ تک دانشور اور علماء اس میں محنت کرتے رہے لیکن میں نے کوئی شخص ایسا نہیں پایا جو ایک کلمہ کی مد کو دو کلمہ کی مد کی طرح بنادے سوائے عراقی کے۔

میں کہتا ہوں کہ عراقی منصور بن احمد رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو خراسان کے مقری ہیں انھوں نے اس میں خطا کی ان کے اساتذہ جن کے پاس انھوں نے پڑھا ہم انھیں جانتے ہیں امام ابو بکر بن مہران، ابوافرج شنبوذی اور ابراہیم بن احمد مروزی انھوں نے ان سے کیا کسی بھی سند سے کچھ بھی روایت نہیں کیا۔

جب ایسا ہے تو ابن حاجب یا ان سے کوئی بڑا ایسی چیز پر اقدام کرنے کی جسارت کرتا ہے جس پر اجماع ہو چکا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "وہ غیر متواتر ہے چنانچہ یہ مد عرضی کی اقسام بھی متواتر ہیں اس میں وہی شخص شک کرسکتا ہے جو جاہل ہے اور مد کیسے غیر متواتر ہوسکتی ہے حالانکہ اس پر پچھلوں اور اگلوں نے اجماع کرلیا ہے۔

اگر کہا جائے کہ ہم نے بعض کتب جیسے "التیسیر للدانی" وغیرہ میں قراء کو پایا کہ انھوں نے ہمزہ کی وجہ سے ہونے والی مد کے اشباع وتوسط اور اس سے اوپر نیچے کے اعتبار سے مراتب بنائے۔ یہ منضبط نہیں اس لیے کہ مد کی حد نہیں اور جو چیز منضبط ہی نہ ہو وہ متواتر کیونکر بن سکتی ہے؟

میں کہتا ہوں کہ ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ اس کے مراتب ہی متواتر ہیں اگرچہ قراء اور اصولیین میں سے ایک جماعت نے اس کا دعویٰ کیا ہے بلکہ ہم کہتے ہیں کہ مد عرضی متواتر ہونے کی حیثیت سے قطعی ہے نبی کریم ﷺ نے اسے پڑھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اسی پر نازل کیا اور قدر مشترک پر جنھوں نے اضافہ کیا جیسے عاصم، حمزہ اور ورش وہ اگرچہ متواتر نہیں ہے پھر بھی صحیح اور مشہور ہے قبولیت کے ساتھ لی جائے گی اور جس نے قدر مشترک پر زائد کے تواتر کا دعویٰ کیا اس کو چاہیے کہ وہ بیان کرے۔

امالہ ● اس کی دو انواع ہیں یہ اور اس کی ضد دو لغتیں ہیں جو سبع احرف میں سے پھیل گئی ہیں سبع احرف جن کے ساتھ قرآن نازل ہوا یہ مصاحف میں لکھی گئی ہیں اور متواتر ہیں کیا کوئی کسی ایسی لغت میں بات کرسکتا ہے جس کی مصاحف میں کتابت پر صحابہ اور مسلمانوں

نے اجماع کرلیا ہے کہ یہ اداء کی قبیل سے ہیں؟

حافظ الحجۃ ابوعمرو دانی اپنی کتاب "ایجاز البیان" میں لکھتے ہیں کہ "اجماع ہے اس بات پر کہ امالہ عرب قبائل کی ایک لغت ہے خفت کی طلب نے انھیں اس کی طرف بلایا ہے۔

امام ابوالقاسم ہذلی نے اپنی کتاب "الکامل" میں فرمایا کہ امالہ اور تفخیم دو لغتیں ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی دوسرے سے مقدم نہیں بلکہ قرآن پاک ان دونوں کے ساتھ نازل ہوا.... (آگے فرماتے ہیں کہ) تطویل کے بعد خلاصہ یہ ہے کہ جس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو امالہ کے ساتھ نازل نہیں کیا اس نے غلطی کی اور اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ان کے تقویٰ اور پرہیزگاری کے خلاف گمان کیا۔

گویا کہ وہ اشارہ کرتے ہیں کہ انھوں نے مصاحف میں امالہ کو لکھا جیسے: "یحییٰ، موسی، ھدی، یسعی، والھدی، ویغشٰہا، وجلّٰہا، وَاٰسٰی واٰتینکم" وغیرہ جسے انھوں نے امالہ کی لغت پر لکھا اور اس کے تشبہ کی مواضع کو فتح کی لغت کے مطابق الف کے ساتھ لکھا اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول سورۃ ابراہیم آیت ۳۶ میں ﴿ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ ﴾ ہے حتیٰ کہ انھوں نے ﴿ تَعْرِفُھُمْ بِسِیْمٰھُمْ ﴾ (البقرۃ: ۲۷۳) میں یاء کے ساتھ لکھا جبکہ ﴿ سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ ﴾ (الفتح: ۲۹) کو الف سے لکھا۔

اس سے بڑھ کر کون سی دلیل ہے؟

ہذلی نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آج کے دن تک امت کا اجماع ہے کہ قرأت اور قراء میں امالہ اور تخفیف کو لیا جائے گا۔ اور کچھ چیزوں کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ "کوئی بھی قاری ایسا نہیں جس سے میں نے امالہ کو روایت نہ کیا ہو خواہ کم ہوں یا زیادہ ... آگے فرماتے ہیں... اور یہ یعنی امالہ ہوازن بکر بن وائل اور سعد بن بکر کی لغت ہے۔

ہمزہ کی تخفیف

اسی طرح نقل، ادغام، راءات کی ترقیق، لامات کی تفخیم بھی ہے جو قطعی متواتر ہے اور معلوم ہے کہ یہ سبعۃ احرف میں نازل ہیں اور عرب کی لغات میں سے بھی ہیں جن کے علاوہ کوئی قرآن پاک کو اچھا نہیں پڑھ سکتا اور یہ متواتر یا از قبیل اداء کیسے ہو سکتے ہیں حالانکہ قراء نے بہت سی جگہوں میں "مد کر، اثقلت، دعوی اللہ ربھما، مالك لاتامنا علی یوسف" وغیرہ جیسی مثالوں میں ادغام پر اجماع کیا۔

اسی طرح قراء نے بہت سی جگہوں پر ہمزہ کی تخفیف پر اجماع کیا جیسے "الان، اللّٰہ، الذّٰکرین" جو استفہام میں ہیں اور بہت سی جگہوں پر ہے جیسے "فِرْعَوْن" اور "مِرْیَۃ" راءات کی ترقیق پر اجماع کیا اور اسم جلالہ (اللہ) جب ضمہ یا فتحہ کے بعد آئے تو اس جیسی جگہوں پر لام کی تفخیم پر اجماع کیا۔

اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا سورۃ آل عمران آیت نمبر ۱۵ میں ﴿ اَؤُنَبِّئُكُمْ ﴾ میں دوسرے ہمزہ کی کتابت پر اجماع ہے ابوعمرو دانی رحمہ اللہ وغیرہ نے فرمایا کہ انھوں نے اسے ہمزہ کی تسہیل بین بین کے ارادے سے لکھا.... الخ۔

جس پر قراء نے امت درامت اجماع کرلیا وہ غیر متواتر کیسے ہوسکتا ہے؟ اور جب مد، تخفیف ہمزہ اور ادغام علی الاطلاق غیر متواتر ہوں تو پھر متواتر کیا رہ جائے گا؟ کیا ﴿ الٓمّٓ . دَآبَّةٍ ﴾ اور ﴿ اُولٰٓئِكَ ﴾ میں قصر ہوسکتا ہے جسے کسی نے بھی قصر کے ساتھ نہیں پڑھا؟ کیا "الذّٰکرین اللہ" کے ہمزہ میں تخفیف کرنا جس کے ناجائز ہونے اور غلط ہونے پر اجماع ہے کیا جائز ہے؟ کیا "مدّکر" جس کی

ادغام کے ساتھ کتابت اور تلاوت پر اجماع ہے اسے اظہار کے ساتھ پڑھنا جائز ہے؟ ہائے کاش کہ مجھے پتا ہوتا کہ اس سے پہلے کون تھا جس نے اس قوم پر اقدام کیا اس کے نشان مٹا دیے جاتے۔ بظاہر یہ ہے کہ جب اس نے لوگوں کو کہتے سنا کہ "تواتر ان چیزوں میں سے ہے جو ادا کی قبیل سے نہ ہوں۔" تو اس سے سمجھا کہ مد، امالہ اور ہمزہ کی تخفیف وغیرہ ادا کی قبیل سے ہیں اور اس میں بغیر سوچے سمجھے بول پڑا۔ ورنہ شیخ ابوعمر اگر اس میں سوچ فکر کرتا تو کبھی بھی اس پر اقدام نہ کرتا یا گروہ امام الاصولیین قاضی ابوبکر بن طیب باقلانی کے کلام پر واقف ہوتا جو انھوں نے "الانتصار" کتاب میں فرمایا کہ "جتنے بھی علاقوں کے قاریوں نے جو کچھ بھی ایسا پڑھا جو ان کے ہاں مشہور ہوا اور پھیل گیا اور انھوں نے اسے شذوذ میں داخل نہیں کیا بلکہ خوشگوار اور جائز سمجھا جیسے ہمزہ، ادغام، مد تشدید، حذف اور امالہ وغیرہ یا ان سب کو چھوڑ دیا یا ان میں سے بعض کو چھوڑ دیا یا تقدیم و تاخر کر دی تو یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہیں اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کی صحت پر صحابہ رضی اللہ عنہم واقف تھے اور انھیں ان کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح پڑھنے پر سب کو درست قرار دیا اگر ہم کسی قاری کو کوئی ایسا امالہ کرنے پر درست قرار دیں جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا ہو اور نہ ہی کسی صحابی نے کیا ہو تو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام قرأت کے باوجود انھیں درست قرار دیا۔۔۔ اس کے بعد انھوں نے اس تقریر پر کلام طویل کرنے کے بعد یہ جائز قرار دیا کہ ہوسکتا ہے کہ ایک کو قرآن کا ایک حصہ ایک حرف پر پڑھایا ہو اور دوسرا حصہ دوسرے حرف پر پڑھایا ہو یعنی جو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھنے والے کے لیے آسان سمجھا ہو۔۔۔۔ الخ۔"

میں کہتا ہوں کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قراء کا کسی چیز میں اختلاف کرنا حالانکہ ان کا اختلاف کئی جگہوں پر ہے اسے صحابی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اسی طرح حاصل کیا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اسی طرح پڑھایا ہو اور چلتے چلتے قراء تک پہنچا ہو جیسے حفص رحمہ اللہ کا حرف مَجْرٖھَا کو امالہ کے ساتھ پڑھنا اور اس کے علاوہ قرآن میں کہیں بھی امالہ نہ کرنا، اسی طرح ابن عامر کا کئی متعدد جگہوں پر "اِبْرٰھَام" پڑھنا اور ابوجعفر کی "یحزنھم" (سورۃ الانبیاء: ۱۰۳) فقط اس جگہ "یاء" کے ضمہ اور زاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھنا اور باقی قرآن میں "یاء" کے فتحہ اور زاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھنا اور نافع کا اس کے برعکس پڑھنا یعنی پورے قرآن میں "یاء" کے ضمہ اور زا کے کسرہ کے ساتھ پڑھنا اور سورۃ الانبیاء میں "یاء" کے فتحہ اور زاء کے ضمہ کے ساتھ اور اس کے مشابہ جن کے قراء قائل ہیں انھوں نے دو لغتوں کو جمع کیا۔

کاش کہ امام ابن حاجب اپنی کتاب کو قراءات اور ان کے تواتر سے خالی کرتے جیسا کہ ان کے علاوہ نے اپنی کتابوں کو ان سے خالی رکھا۔ جب انھوں نے ذکر کر دیا تو کاش وہ ان چیزوں کے پیچھے نہ پڑتے جو ادا کی قبیل سے ہیں اور جب انھوں نے تعرض کرلیا تو کاش وہ مثالوں سے رک جاتے کیونکہ جب ثابت ہو جائے کہ قراءات میں سے کچھ ادا کی قبیل سے ہے متواتر نہیں ہے جیسے حمزہ اور ہشام کے وقف کی تقسیم اور ان کے تسہیل کی انواع۔ اس لیے کہ وقف میں اگرچہ ہمزہ کی تخفیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر ہے لیکن یہ متواتر نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جگہ پر پچاس وجوہ سے وقف کیا ہو اور نہ ہی بیس وجوہ سے اور نہ ہی اس طرح کی متعدد وجوہ سے اور اگر ان میں سے کچھ صحیح ثابت ہو بھی جائے تو بھی ایک وجہ ہوگی اور باقی میں شک نہیں ہے کہ وہ از قبیل ادا ہوں۔

جب ابن السبکی نے اپنی کتاب "جمع الجوامع" میں یہ کہا کہ "السبع متواترۃ.... الخ" (اور سات قرأتیں متواتر ہیں) بعض نے کہا کہ وہ اداء کی قبیل سے نہ ہوں جیسے مد، امالہ اور ہمزہ کی تخفیف وغیرہ ان سے سوال کیا گیا کہ آپ نے ابن حاجب پر زیادتی کی

کسی نے کہا کہ ان کے اختیار کا مقتضی یہ ہے کہ جو اداء کی قبیل سے ہیں جیسے مد اور امالہ... الخ متواتر ہیں انھوں نے (ﷺ) اپنی کتاب "منع الموانع" میں جواب دیا کہ: جان لو کہ سات متواتر ہیں اور مد متواتر ہے امالہ متواتر ہے یہ سب واضح ہیں ان میں کوئی شک نہیں اور ابن حاجب کا قول کہ "جو ادا کی قبیل سے نہ ہوں" صحیح ہے اگر اس میں یہ نہ ہو "جیسے مد اور امالہ" لیکن ان کی تمثیل نے ان کے فساد کو واجب کر دیا جیسا کہ بعد میں عنقریب ہم اس کی وضاحت کریں گے اسی وجہ سے ہم نے "قبیل" کہا تا کہ واضح ہو جائے کہ مد، امالہ اور تخفیف کے غیر متواتر ہونے کا قول ہمارے نزدیک ضعیف ہے۔ بلکہ یہ متواتر ہیں اس کے بعد وہ مد امالہ اور تخفیف کا ذکر کرتے ہوئے یہاں تک پہنچتے ہیں کہ جب آپ نے یہ جان لیا کہ ہمارا کلام سبع کے تواتر کا فیصلہ کرتا ہے اور مطلق مد، امالہ اور ہمزہ کی تخفیف بھی بے شک سبع میں سے ہیں۔

اور جنھوں نے کہا کہ قراءات متواتر ہیں یہ قراء کے اجتماع کی صورت میں ہے افتراق کی صورت میں نہیں چنانچہ ابو شامہ نے "المرشد الوجیز" کے پانچویں باب میں فرمایا کہ "بے شک وہ قراءات جو قراء سبعہ میں سے ہر قاری کی طرف منسوب ہیں اور ان کے علاوہ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس پر اجماع ہے اور دوسری شاذ لیکن یہ قراء سبعہ اپنی شہرت اور اپنی قرأت میں کثرت صحیح کی بناء پر دل اس طرف مائل ہوتا ہے کہ جو کچھ ان سے منقول ہے وہ دوسروں سے فائق ہے اب جو چیزیں ان کی طرف منسوب ہیں اور ان میں اہل لغت وغیرہ کا انکار ہے وہ بزی کا تاءات میں دو ساکنوں کو جمع کرنا اور ابو عمرو کا ادغام ہے نیز "فما استطاعوا" میں حمزہ کی قرأت اور کسی کا "بارئکم" کے ہمزہ کو سکون سے پڑھنا اور "سبأ، یاہنی اور مکر السیء" بھی اسی طرح اور یرتقی اور یتقی کے یاء میں اشباع کرنا اس طرح "یبصر اور افئدۃ من الناس" میں اشباع کرنا اور "ملائکۃ" کو ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھنا اسی طرح "والارحام" جو سورۃ النساء کے شروع میں ہے اسے زیر کے ساتھ پڑھنا اور کن فیکون کے نصب کے ساتھ پڑھنا اور سورۃ الانعام وغیرہ میں دو متضایف کے درمیان فصل کرنا وغیرہ... آگے فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ راویوں کی قلت ضبط پر محمول ہے پھر فرمایا کہ اگر اس میں نقل صحیح ہو تو یہ سبعۃ احرف کے ان بقایا جات میں ہے جن پر قرأت جائز تھی جیسا کہ یہ عربیت میں جائز ہیں خواہ وہ عربی فصیح ہو، یا غیر فصیح جبکہ مصاحف کی لفظ منزل پر کتابت کے بعد ان الفاظ کی قرأت مناسب نہیں سوائے ان الفاظ کے جو قریش کی لغت میں سے فصیح ترین لغت یا ان کی طرف منسوب لغت کے مطابق ہیں۔ اس لیے کہ انھیں نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے بڑے بڑے صحابہ جو اس کے لائق ہیں ان کی قرأت پر محمول کیا جائے گا اس لیے کہ انھوں نے اسے قریش کی لغت میں لکھا اسی طرح ان کا اس قرأت میں پڑھنا۔ فرمایا: متاخرین وغیرہ مقلدین میں سے مقرئین کی جماعت کی زبانوں پر شائع ہے کہ قراءت سبعہ سب کی سب متواتر ہیں یعنی ہر ہر فرد میں جنھوں نے ان سات سے روایت کیا۔ فرمایا کہ: اور قطعی ہے کہ ان کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونا واجب ہے۔ فرمایا کہ: ہم بھی اسی کے قائل ہیں لیکن ان سے نقل کرنے میں جن میں ان سے طرق مجتمع ہیں اور اس پر جماعتیں متفق ہیں کسی کو کوئی انکار نہیں اور وہ شائع اور مشہور و معروف ہیں، کم سے کم یہ شرط ہیں۔ جب کہ ان کے بعض میں تواتر متفق نہ ہو۔

اب اے بھائی! اس گرے ہوئے کلام میں غور کر جو بغیر کسی سوچ فکر کے صادر ہو گیا ہے ان تھوڑے سے کلمات میں کتنی جگہ تناقض ہے۔ میں نے اپنے شیخ امام ابو محمد بن محمد بن محمد حجالی کو اس کے بارے میں آگاہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ: "اس کتاب کے وجود کو ختم کر دینا چاہیے یہ بالکل ظاہر بھی نہ ہو یہ تو دین میں طعن ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ شاہد ہے کہ ہمارا مقصود امام ابو شامہ کا مرتبہ گرانا نہیں اس لیے کہ بعض اوقات عمدہ گھوڑا بھی پھسل جاتا ہے اور اس کی قدر مجہول نہیں ہوتی بلکہ حق اس بات کے لائق ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔ بلکہ ہمارا مقصود اس لغزش اور پھسلن پر تنبیہ کرنا ہے تاکہ جو شخص لوگوں کے اقوال نہ جانتا ہو اور اسے ائمہ کے احوال معلوم نہ ہوں وہ ان سے بچے۔

اور یہ قول کہ یہ جو ان کی طرف منسوب ہیں اور ان میں اہل لغت کا انکار ہے۔" ان جیسی چیزیں اس لائق نہیں کہ انھوں نے جو ذکر کیا اسے اہل لغت کے نزدیک منکر بنایا جائے اور علماء لغت و اعراب جن پر پہلے بھی اور بعد میں بھی اعتماد تھا وہ ان کی توجیہ کرتے ہیں اور ان سے استدلال کرتے ہیں تو کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ ایک ایسی قرأت کا انکار کریں جو متواتر ہے یا رسول اللہ ﷺ سے عام چلی آرہی ہے سوائے چند معمولی سے لوگوں کے جن کا کوئی اعتبار نہیں اور انھیں قراءات و آثار کی کوئی پہچان نہیں وہ صرف ان قیاسات پر اڑے ہوئے ہیں۔ جو انھوں نے جانے اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے عرب کی تمام لغتوں کا احاطہ کیا ہوا ہے خواہ وہ فصیح ہوں یا غیر فصیح حتیٰ کہ اگر ان میں سے کسی کو قرآن کی کوئی چیز کہی جائے جو اس طریقے پر نہ ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اس کے نزدیک ظاہری قیاس کے موافق ہو لیکن کسی نے اس طرح پڑھا نہ ہو تو وہ اس کے صحیح ہونے کا قطعی فیصلہ کرتے ہیں اسی طرح اگر قرأت متواترہ کے بارے میں سوال کیا جائے جو قیاس کے موافق نہ ہو تو وہ اس کا انکار کرتے ہیں اور ان کے شذوذ ہونے کا قطعی فیصلہ کرتے ہیں حتیٰ کہ ان میں سے بعض نے تو اللہ تعالیٰ کے قول ﴿مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا﴾ (یوسف:۱۱) کے بارے میں قطعی فیصلہ کیا کہ ادغام جس پر صحابہ ﷡ جمع ہیں اور مسلمانوں کا اجماع ہے یہ لحن ہے اور عربوں کے نزدیک جائز نہیں اس لیے کہ فعل "لَا تَأْمَنُ" ہے جو مرفوع ہے اس کے سکون کی کوئی وجہ نہیں کہ اسے دوسرے نون میں مدغم کر دیا جائے۔

اب اے بھائی غور کر! ان کی اللہ تعالیٰ سے کم حیا کا کہ جو انھیں قیاس سے معلوم ہوتا ہے اسے اصل قرار دیتے ہیں اور قرآن عظیم کو فرع۔ ائمہ لغت و اعراب علماء جو مقتداء ہیں وہ اس سے بالکل بری ہیں بلکہ وہ گزشتہ بالا وغیرہ حروف کی توجیہ اور اس کا انکار کرنے والوں کا انکار کرنے میں اس حد تک مبالغہ کرتے ہیں کہ لغت ونحو کے امام ابو عبداللہ محمد بن مالک نے اپنی نظم "الکافیہ الشافیۃ" میں "الفصل بین المتضایفین" میں فرمایا:

وعمدتی قراءة ابن عامر فکم لها من عاضد و ناصر

"میرے نزدیک قابل اعتماد ابن عامر کی قرأت ہے۔ اس کے کتنے مؤید اور مددگار ہیں۔"

اگر تطویل کا خوف نہ ہوتا اور کتاب کا اپنے مقصد سے نکل جانے کا خوف نہ ہوتا تو میں ان چیزوں کو وارد کرتا جن کا ان کے خیال کے مطابق اہل لغت نے انکار کیا اور اس میں ان کے اقوال ذکر کرتا لیکن اگر زندگی نے ساتھ دیا تو میں اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھوں گا جو دل کو شفا دے گی اور سینے کو کشادہ کرے گی اس میں میں ان تمام چیزوں کو ذکر کروں گا جن کا ان لوگوں نے انکار کیا جنھیں قراءت سبعہ یا عشرہ سے کوئی سروکار نہیں۔

اللہ ہی کے لیے امام ابو نصر شیرازی کی خوبی جنھوں نے اپنی تفسیر میں اللہ تعالیٰ کے قول ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ﴾ (النساء:۱) کی تفسیر میں قرأت حفص کی تضعیف میں زجاجی کا کلام نقل کیا اور پھر فرمایا کہ "اس طرح کا کلام ائمہ دین کے نزدیک مردود ہے اس لیے کہ وہ قرأت جنھیں ائمہ قراء نے پڑھا وہ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہیں جس نے ان کی تردید کی اس نے نبی

کریم ﷺ کی تردید کی اور آپ ﷺ کے خواندہ کو برا سمجھا اور یہ ممنوع مقام ہے اس میں ائمہ لغت یا نحو کی تقلید نہیں کی جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ یہ صحیح اور فصیح ہے اگرچہ اس کے علاوہ افصح ہو اس لیے کہ ہمارا دعویٰ نہیں کہ قراءات میں جو کچھ ہے وہ فصاحت کے اعلیٰ درجات پر ہے۔ 26

امام حافظ ابو عمرو دانی نے اپنی کتاب "جامع البیان" میں ابو عمرو بن علاء کا "بارئکم" اور "یامرکم" کو سکون دینے کے ذکر میں فرمایا کہ: "ائمہ قراء قرآن کے حروف میں لغت میں شائع اور عربیت کے موافق ہونے پر بالکل بھی عمل نہیں کرتے بلکہ اثر میں جو زیادہ ثابت ہو اور نقل میں زیادہ صحیح ہو اس پر عمل کرتے ہیں اور جب روایت ان کے نزدیک ثابت ہو جائے تو قیاس عربیت اور عموم لغت اسے رد نہیں کرتے اس لیے کہ قراءت ایک سنت ہے جس کی اتباع کی جاتی ہے۔ اس لیے اسے قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

میں کہتا ہوں کہ امام ابو شامہ نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ فرمایا کہ "یہ سب (یعنی گزشتہ بالا) راویوں کے قلت ضبط پر محمول ہیں" نہیں، بلکہ اللہ کی قسم یہ سب اس شخص کی کثرت جہالت پر محمول ہیں جو ان کی وجوہ کو نہ جانتا ہو اور ان شواہد صحیحہ کو بھی نہ جانتا ہو ان پر منطبق ہوتی ہیں جیسا کہ عنقریب ہم اسے اس کتاب میں بیان کریں گے جس کا ابھی ہم نے آپ سے وعدہ کیا ہے اس لیے کہ یہ ثابت اور مشہور ہیں اور ان کے راوی ائمہ ثقہ ہیں اور اگر یہ ان کے قلت ضبط پر محمول ہوں تو ہائے کیا ہوگا کیا دین دین والے پر کمزور ہو گیا کہ ایک آدمی اس زمانے میں آتا ہے اپنی قلت ضبط کی وجہ سے قراءت میں وہ چیز داخل کر دیتا ہے جو اس میں نہیں ہے اب یہ چیز سنی جاتی ہے اور اسے لیا جاتا ہے اور اسے نماز وغیرہ میں پڑھا جاتا ہے اور ائمہ اپنی کتب میں اسے ذکر کرتے ہیں اور پڑھتے ہیں اور یہ مشہور ہو جاتی ہے اور چلتے چلتے ہمارے زمانے تک پہنچ جاتی ہے ائمہ دین میں سے کوئی بھی اس قراءت کو منع نہیں کرتا حالانکہ قرآن میں کسی حرف یا حرکت کی کمی بیشی اپنے پاس سے کرنے اور اس پر اصرار کرنے والے کے کفر پر اجماع ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔

﴿لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ﴾ (فصلت: ۴۲)

"باطل نہ اس کے سامنے سے آتا ہے نہ پیچھے سے۔"

اس سے بھی بڑھ کر تنزل کرتے ہوئے فرمایا کہ: "ان کے صحیح ہونے اور سبعہ احرف میں ہونے کی صورت میں بھی ان کی قراءت مناسب نہیں اس لیے کہ نبی کریم ﷺ اور ان کے صحابہ قاریوں کو ان کے لائق پر محمول کیا جائے گا۔"

جب نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کے مطابق نہیں پڑھا حالانکہ ان کی صحت اور ان کا سبعۃ احرف میں ہونا بھی مسلم ہو تو ان لوگوں تک کسی نے پہنچایا جنھوں نے اس کے مطابق پڑھا۔

پھر کہتے ہیں کہ: "فلا اقل من اشتراط ذلک" (کم از کم یہ شرط ہیں) یعنی شہرت و استفاضہ۔

میں کہتا ہوں کہ کیا تم اس قول کو نہیں دیکھتے؟ پھر کیا دنیا میں کوئی شخص ہے جو کہتا ہو کہ ابن عامر، حمزہ اور ابن عمرو کی قراءت اور اس پر اجماع کرنے والے اہل حرمین و شام یعنی ابو جعفر، نافع، ابن کثیر اور ابن عامر نیز بزی قنبل اور ہشام کی قراءت یہ سب کی سب غیر مشہور ہیں اگرچہ متواتر نہیں ہیں؟ یہ اس شخص کا کلام ہے جو نہیں جانتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ امام ابو شامہ اس سے بالکل بری ہیں

اور میں کیونکہ ان سے اس بارے میں خوب اعتقاد رکھتا ہوں تو قریب ہے کہ میں یہ قطعی فیصلہ کردوں کہ یہ ان کا کلام قطعاً نہیں ہے بسا اوقات بعض متعصبین جہلاء ان کی کتاب کے ساتھ اسی طرح کی چیزیں ملا دیتے ہیں یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انھوں نے یہ کتاب شروع میں تصنیف کی ہو جیسا کہ اکثر مصنفین سے ایسا ہو جاتا ہے ورنہ وہ اپنی دیگر تصنیفات میں اپنی شرح شاطبیہ کی طرح ہیں کہ انھوں نے "والارحام" میں زیر کے ساتھ اور فصل بین المتضایفین میں قراءت حمزہ کی تائید و توجیہ میں مبالغہ کیا اور پھر فصل میں فرمایا کہ: "اس شخص کے قول کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا جس نے کہا کہ کلام میں اس طرح کا نہیں آتا اس لیے کہ وہ کلام نافی ہے اور جس نے اس قرأت کی سند بیان کی وہ مثبت ہے اور اثبات نافی سے بالا جماع مرجح ہوتا ہے۔ فرمایا کہ اس خیال والے کی طرف یہ نقل کیا جائے کہ بعض عربوں نے اسے نثر میں بھی استعمال کیا ہے تو وہ اپنے اس قول سے رجوع کرے گا کہ اس کو کیا ہو گیا کہ قرأت کو تابعین کے ذریعے صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کرنے والوں پر اکتفاء نہیں کرتا پھر اس کی تثبیت کی کوشش کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ کلام بھی مباین ہے گزشتہ بالا کی بناء پر اور ان کا اس کے ساتھ ذرا بھی سروکار نہیں وہ تو اپنے جیسوں سے بھی بڑھ کر لائی ہیں۔

اس کے بعد ابوشامہ نے اس قول کے بعد "المرشد" میں فرمایا کہ: "خلاصہ یہ کہ ہم تمام اختلافی الفاظ میں تواتر کا التزام نہیں کرتے۔" میں کہتا ہوں کہ ہم بھی اس طرح ہیں لیکن قلیل میں جیسا کہ باب ثانی میں گزر چکا فرمایا: کہ مشہور کے تواتر کا مدعی جو ظاہر کر رہا ہے جیسے ابوعمرو کا ادغام، ورش کا حرکت کو نقل کرنا اور ابن کثیر کا میم جمع اور ہائے کنایہ کا وصل یہ زیادہ سے زیادہ اس امام سے متواتر ہے جس کی طرف اس قرأت کی نسبت کی گئی ہے۔ طرفین کی برابری اور واسطہ میں اپنے آپ کو کھپانے کے بعد اس کے پاس اس امام سے نبی کریم ﷺ تک ہر ہر فرد میں تواتر رہ جاتا ہے جس کی وجہ سے آنسو بہنے لگتے ہیں کیونکہ انھیں اس بناء پر آحاد ہی نقل کرتے ہیں سوائے ان میں سے کچھ لوگوں کے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی گزشتہ بالا کلام کی جنس میں سے ہے میں نے اپنے شیخ امام اپنے زمانہ کے یکتا شمس الدین محمد بن احمد شافعی جو خطیب ہیں ان کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ابوشامہ معذور ہیں کیونکہ قراءات حدیث کی طرح ہیں ان کا مخرج بھی ان کے مخرج کی طرح ہے اگر ان کا مدار آحاد پر ہو تو وہ آحادی ہوتی ہیں اور ان پر مخفی ہے ان کی نسبت اس امام کی طرف اصطلاحا کی گئی ہے ورنہ شہر کے تمام لوگ اسے پڑھتے تھے اور امت در امت اسے لیتے تھے اگر ان میں سے کوئی ایک بھی اپنی قرأت میں منفرد ہوتا اور اس کے شہر والے اس کے خلاف ہوتے تو اس پر کوئی بھی اس کے موافق نہ ہوتا بلکہ وہ لوگ اس سے بچتے اور بچنے کا حکم کرتے۔

میں کہتا ہوں کہ انھوں نے سچ کہا اس پر دلیل ابن مجاہد کا قول ہے کہ مجھے قنبل نے کہا کہ سنہ ۲۳۷ھ میں قو اس نے کہا کہ اس آدمی (یعنی بزی) کو ملو اور اسے کہو کہ "یہ حرف ہماری قرأت میں نہیں ہے یعنی "وما ھو بمیت" تخفیف کے ساتھ اسے مخفف وہی کرسکتا ہے جو مر گیا ہو اور جو نہیں مرا وہ مشدد پڑھتا ہے۔ میں بزی سے ملا اور انھیں بتلایا انھوں نے فرمایا کہ میں نے رجوع کر لیا۔

اور محمد بن صالح نے کہا کہ میں نے ایک آدمی کو سنا وہ ابوعمرو سے سمجھ رہا تھا کہ آپ ﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ ۝ وَّ لَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌ ۝﴾ (الفجر: ۲۵، ۲۶) کو کیسے پڑھتے ہو؟ انھوں نے فرمایا کہ "لایعذب" کسرہ کے ساتھ اس آدمی نے کہا کہ کیسے؟

نبی کریم ﷺ سے "لا یعذب" فتحہ کے ساتھ منقول ہے۔ اس پر ابوعمرو نے کہا کہ اگر میں اس شخص کو بھی سن لوں جو کہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا تو بھی میں اسے اس سے نہ لوں۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لیے کہ میں ایک کو شاذ سے متہم کرتا ہوں جبکہ وہ عام لوگوں کے خلاف پر ہو۔ شیخ ابوالحسن سخاوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ فتحہ والی قرأت بھی تواتر کے ساتھ ثابت ہے میں نے کہا کہ سچ کہا۔ اس لیے کہ یہ امام کسائی کی قرأت ہے سخاوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بعض اوقات ایک حدیث ایک قوم کے پاس تواتر کے ساتھ پہنچ جاتی ہے اور دوسری قوم کے پاس نہیں پہنچتی ابوعمرو نے اس کا جو انکار کیا وہ اس وجہ سے کہ ان کے پاس یہ روایت تواتر کے ساتھ نہیں پہنچی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ ان کی شان کچھ اسی طرح تھی کہ ان قراء کی تعیین لازم نہیں اگر ان کے علاوہ بھی کوئی متعین ہو جاتا تو بھی جائز تھا اور ان کا متعین ہونا یا تو اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے علاوہ لوگوں کی بنسبت قراءت پڑھانے میں زیادہ لگے یا اس وجہ سے کہ یہ معین حضرات کے اساتذہ تھے جیسا کہ گزرا اسی وجہ سے اسلاف میں سے بعض نے کسی کی طرف قرأت کو منسوب کرنے کو ناپسند کیا۔

ابن ابوداؤد نے حضرت ابراہیم نخعی سے روایت کیا کہ وہ لوگ فلاں کی سند اور فلاں کی قرأت کو ناپسند کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ اس خوف سے کہ جیسا کہ ابوشامہ نے وہم کیا کہ جب قرأت کسی شخص کی طرف منسوب کی گئی تو انھوں نے اس کو خبر واحد سمجھا اور انھیں یہ نہیں معلوم کہ ہر وہ قرأت جو ان میں سے کسی قاری کی طرف منسوب ہوئی اس قرأت کے قاری بھی اس کے زمانے کے قاری تھے اور اس سے اس زمانے کے قاریوں سے بھی زیادہ تھے بلکہ اس سے کئی گنا تھے اگر قراء کا انفراد متواتر نہ ہوتا تو بعض قرآن غیر متواتر ہو جاتا، اس لیے کہ ہمیں قرآن میں کچھ حروف ملتے ہیں جن میں قراء کا اختلاف ہے اور ہر ایک کی قرأت ایسی ہے جو دوسرے کے موافق نہیں ہے جیسے "ارجه" وغیرہ۔ لہٰذا کوئی بھی قرأت متواتر ہوگی نیز "مالك" اور "یخادعون" والی قرأت بھی متواتر نہ ہوگی بلکہ اکثر قرآن غیر متواتر ہوگا اس لیے کہ تواتر ایک یا دو سے ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہی تین سے ثابت ہوتا ہے۔ امام جعبری رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ میں فرمایا کہ ان کی قرأت کی وجوہ میں سے ہر وجہ اسی طرح ہے (یعنی متواتر ہے)، اس لیے کہ یہ اس کی بعض ہے۔ پھر فرمایا: اس سے اس شخص کے قول کا فساد ظاہر ہو گیا جس نے کہا کہ "یہ متواتر ہے وہ نہیں" اس لیے کہ یہ اس کے مجموعہ سے عبارت ہے۔

پھر ابن الجزری نے کہا کہ آپ کو اس بات کی تحقیق کہ ہر شہر والوں کی قرأت ان کی نسبت سے متواتر ہے۔ اس بات سے بھی ہو گی کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے "بسملہ" کو قرآن پاک کا جزء قرار دیا حالانکہ شیخ مالک سے ان کی روایت تقاضا کرتی ہے کہ وہ قرآن پاک کا حصہ نہ ہو، اس لیے کہ اہل مکہ "بسم الله" کو دو سورتوں کے درمیان ثابت مانتے تھے اور اسے سورۃ فاتحہ کے شروع میں ایک آیت شمار کرتے تھے انھوں نے ابن کثیر کی قرأت اسماعیل قسط عن ابن کثیر سے پڑھی اور انھوں نے اپنی روایت عن مالک پر عدم بسملہ میں اعتماد نہیں کیا اس لیے کہ یہ آحاد ہیں اور ابن کثیر کی قرأت پر اعتماد کیا اس لیے کہ یہ متواتر ہے یہ ایک لطیف چیز ہے اس میں غور کر لیجئے مجھے اپنے اصحاب کی کتب میں ملتا تھا کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے عدم "بسلمه" کی حدیث امام مالک سے روایت کی اور اس پر بھروسہ نہیں کیا لہٰذا یہ دلیل ہے کہ اس میں انھیں کوئی علت محسوس ہوئی ورنہ وہ اس پر عمل کو نہ چھوڑتے۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے اپنے اصحاب میں کسی ایک کو نہیں دیکھا جس نے علت بیان کی ہو۔ ایک مرتبہ میں رات کو سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ بالا بات مجھے کھول دی کہ یہ علت ہے (واللہ تعالیٰ اعلم) حالانکہ میں نے قرآن اپنے امام شافعی عن ابن کثیر کی روایت میں پڑھا جیسے روایت

بزی اور روایت قنبل اور جب کبار ائمہ شافعیہ میں سے ہمارے اصحاب میں سے کسی کو معلوم ہوا تو اس نے مجھے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس اس روایت میں قرآن پڑھوں۔

مزید تحقیق کے لیے ابو حاتم سجستانی کا قول ہے انھوں نے فرمایا کہ بصرہ میں سب سے پہلے قراءات کی وجوہ کی چھان بین کرنے والا جس نے ان کی تالیف کی اور ان میں سے شاذ کو تلاش کیا وہ ہارون بن موسیٰ اعور ہیں جو قراء میں سے تھے لوگوں نے اسے ناپسند کیا اور جب انھوں نے اس کی تالیف کی تو لوگوں نے کہا کہ انھوں نے برا کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرأت کو قرون وامت صرف امت کے دہن سے حاصل کرتے ہیں اور اس میں راوی راوی کی لائی ہوئی روایت کی طرف التفات نہیں کرتے۔

حافظ علامہ ابوسعید خلیل کیکلیدی علائی نے اپنی کتاب "المجموع المذہب" میں فرمایا کہ "شیخ شہاب الدین ابوشامہ کا ان کی کتاب "المرشد الوجیز" وغیرہ میں قراءت سبعہ (میں سے متواترہ) اور شاذہ کے درمیان فرق کے بارے میں اور ان کے علاوہ متقدمین قراء کا کلام ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قراءت سبعہ سب کی سب متواتر نہیں ہیں، سب سے اعلیٰ وہ قراءت ہے جس میں صحت سند مصحف امام کے خط کے ساتھ موافقت اور لغت عرب کی فصیح لغت کے ساتھ موافقت ہو اور ان میں شہرت کافی نہیں حالانکہ معاملہ ایسا نہیں جیسے انھوں نے ذکر کیا۔ اور انھیں شبہ ہو گیا حالانکہ اس کی سندیں چند معروف لوگوں پر منحصر ہیں اس لیے انھوں نے انھیں آحاد کے اجتہاد کی طرح سمجھ لیا۔

میں نے کہا کہ میں نے اپنے شیخ امام الائمہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ سے اس مقام کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ایک جماعت میں سندوں کا منحصر ہونا اس سے مانع نہیں کہ قرآن ان کے علاوہ اور لوگوں سے منقول نہ ہوا ہو بلکہ تحقیق یہ ہے کہ ایک شہر والوں نے جن میں سے ایک بڑی جماعت اسے پڑھ رہی تھی اس بڑی جماعت نے اپنے جیسوں سے (یعنی اپنے جیسی بڑی جماعت سے) حاصل کیا اور اسی طرح سلسلہ چلتا گیا اور انھیں تواتر حاصل ہو گیا لیکن وہ ائمہ جو ان حروف کے ضبط کے پیچھے لگ گئے اور انھوں نے اس میں اپنے شیوخ کو محفوظ کیا اور ان کی طرف سند بھی منقول ہوئی اور یہ احادیث حجۃ الوداع کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور ان جیسی احادیث بالکل واضح ہیں اور حجۃ الوداع ہمیشہ سے منقول ہوتا چلا جا رہا ہے۔ لہٰذا جن لوگوں کے ذریعے ہر زمانے میں ان جیسوں سے تواتر حاصل ہوتا ہے لہٰذا یہ بھی اسی طرح ہے۔ اور فرمایا کہ یہ ایک جگہ ہے اس پر متنبہ ہونا ضروری ہے۔

یہ وہ باتیں ہیں جو ابن الجزری نے اس مقام پر اپنی کتاب المنجد میں کہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ اس موقع پر فصل خطاب ہوں اسی وجہ سے ہم نے انھیں آپ کے سامنے نقل کرنے کو ترجیح دی اور کوشش کی ہے کہ اسے خوب اچھے انداز میں اور ضبط کے ساتھ پیش کیا جائے اور حتی الامکان اس پر مختصر حاشیہ بھی لگایا جائے اور میں چاہتا تھا کہ جس نسخہ سے میں نے اسے نقل کیا اس میں میرے دیکھے ہوئے دوسرے نسخوں سے زیادہ تحریر ہو لیکن کیا ہو سکتا تھا؟ یہ پہلا مطبوع تھا جو ازہر شریف کے مغربی برآمدے میں لکھے گئے نسخے سے لیا گیا تھا اور ابتداء کی شان یہی ہوتی ہے کہ اس میں کچھ نقص ہو اور آخر میں وہ کمال کی طرف بڑھتی چلی جائے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

قراء

قراء قاری کی جمع ہے اور وہ لغت میں "قرأ" سے اسم فاعل ہے اور اصطلاح میں اس کا اطلاق "ان ائمہ معروفین میں سے ایک امام پر ہوتا ہے جن کی طرف قراءات سابقہ منسوب ہیں۔" اور ہم نے ان کے اسماء آپ کی خدمت میں تسلسل کے ساتھ پیش کر دیا ہے ہم آپ کی خدمت میں بطور تحفہ ایک چھوٹا سا ٹکڑا پیش کرتے ہیں جو انہیں سے جو مشہور ہیں ان میں سے ہر

ایک اور ان سے روایت کرنے والوں میں سے کچھ پر مشتمل ہوگا تا کہ آپ ایک لحہ ان کی فضیلت پر مطلع ہو جائیں اور اس مکرم جماعت کے ساتھ آپ کا اتصال ہو جائے جن کا ادائے قرآن کریم کی حفاظت میں حیرت انگیز اثر ہے، جو محافظت انھی طرق سے ہوئی جو تمام اطراف اسلامی میں اتنے طویل عرصے تک گونجتے رہے۔

ہم ان کلمات سے ان کی تاریخ کو شمار کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہی ان ادوار کو شمار کرنا چاہتے ہیں جو ان کی قراءات پر گزرے یہ ایک وسیع میدان ہے۔ ایک جماعت نے اس میں تالیفات کرنے کے لیے اپنے آپ کو فارغ کیا جن میں سے ذہبی ہیں اور ابن جزری ہیں جنھوں نے طبقات القراء میں اس موضوع پر کام کیا۔

قراء سبعہ رحمۃ اللہ علیہم

① ابن عامر ان کا نام عبداللہ یحصبی تھا جو یحصب کی طرف نسبت ہے جو حمیر کی ایک شاخ ہے۔ ان کی کنیت ابونعیم اور ابوعمران تھی یہ ایک جلیل تابعی تھے۔ حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ اور نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے ملے اور انھوں نے قراَت مغیرہ بن ابوشہاب مخزومی سے انھوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی بعض نے کہا کہ انھوں نے خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے قرآن پڑھا ۱۱۸ھ کو دمشق میں وفات پائی آپ اپنی قراَت کی روایت میں ہشام اور ابن ذکوان کے ساتھ مشہور ہوئے لیکن اپنے اصحاب کے واسطے سے۔

ہشام ✿ انھوں نے قراَت عراق بن خالد مزی سے اور انھوں نے یحییٰ بن حارث ذماری سے اور انھوں نے ابن عامر سے حاصل کی۔ ہشام ایک قاضی فقیہ محدث ثقہ اور کامل الضبط انسان تھے دمشق میں ۲۴۵ھ کو وفات پائی۔

ابن ذکوان ✿ یہ ابومحمد عبداللہ بن احمد بن بشیر بن ذکوان قرشی دمشقی تھے انھوں نے قراَت ایوب بن تمیم سے انھوں نے یحییٰ بن حارث ذماری سے اور انھوں نے ابن عامر سے حاصل کی ابوزرعہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "یہ حافظ دمشقی تھے ابن ذکوان کے زمانے میں میرے نزدیک ان سب سے بڑا قاری نہ عراق میں تھا نہ حجاز میں، نہ شام میں نہ مصر میں اور نہ ہی خراسان میں۔" آپ نے ۲۴۲ھ کو وفات پائی۔

ابن عامر اور ان کے دونوں راویوں کے بارے میں صاحب شاطبیہ نے کہا:

وَاَمَّا دِمِشْقُ الشَّامِ دَارُ ابْنِ عَامِرٍ   فَتِلْكَ بِعَبْدِ اللهِ طَابَتْ مُحَلَّلًا

"شام کا دمشق ابن عامر کی قیام گاہ تھا۔ پھر یہ عبداللہ کی وجہ سے لوگوں کے آنے جانے کی عمدہ جگہ بن گئی۔"

هِشَامٌ وَعَبْدُ اللهِ وَهُوَ انْتِسَابُهُ   لِذَكْوَانَ بِالْاِسْنَادِ عَنْهُ تَنَقَّلَا

"ہشام اور عبداللہ اور ان کا انتساب۔ ذکوان کی طرف صرف ان کی سند میں ہی منقول ہے۔"

② ابن کثیر وہ ابومحمد اور ابومعبد عبداللہ بن کثیر داری تھے جو مکہ میں قراءت کے اعتبار سے لوگوں کے امام تھے انھیں سکینہ نے ڈھانپا ہوا تھا اور وقار ان پر چھایا ہوا تھا وہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے عبداللہ بن زبیر، ابوایوب انصاری انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے ملے۔

انھوں نے مجاہد عن ابن عباس عن ابی بن کعب عن رسول اللہ ﷺ کی سند سے روایت کی اور حضرت عبداللہ بن سائب مخزومی سے پڑھا اور ان عبداللہ رحمہ اللہ نے حضرت ابی بن کعب اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے پڑھا اور ان دونوں نے رسول اللہ ﷺ سے پڑھا۔ انھوں نے ۱۲۰ھ کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔

ان کی روایت ان کے اصحاب یعنی بزی اور قنبل کے واسطے سے مشہور ہوئی۔

بَزِّی ✿ ابوالحسن احمد بن محمد بن عبداللہ بن قاسم بن نافع بن ابو بزہ تھے، ان کی نسبت بزی اسی بزہ کی طرف ہے جو ان کے جد اعلیٰ ہیں وہ امام کامل الضبط اور ثقہ تھے مکہ میں پڑھانے کا سہرا انھی کے سر ہے انھوں نے عکرمہ بن سلیمان عن شبل بن عباد و اسماعیل بن عبداللہ بن قسطنطین عن ابن کثیر کی سند سے روایت کی۔ وہ مسجد حرام کے امام وہاں مقری مؤذن تھے ۲۵۰ھ میں وفات پائی۔

ابن کثیر اور ان کے دونوں راویوں کے بارے میں صاحب شاطبیہ فرماتے ہیں۔

ومکۃ عبداللہ فیھا مقامہ هو ابن کثیر کاثر القوم معتلا

"مکہ میں عبداللہ کا مقام ہے۔ وہ ابن کثیر ہیں جنھوں نے قوم پر غلبہ حاصل کیا بلند ہو کر۔"

روی احمد البزی لہ ومحمد علی سند وھو الملقب قنبلا

"احمد بزی نے ان سے روایت کیا اور محمد نے۔ سند کے ساتھ اور ان کا لقب قنبل ہے۔"

③ عاصم وہ ابوبکر عاصم بن ابی النجود اسدی ہیں (نَجُودُ نون کے فتحہ اور جیم کے ضمہ کے ساتھ جو نجلت الثیاب سے ماخوذ ہے جس کا معنیٰ ہے کپڑے کے ایک حصے کو دوسرے کے ساتھ سینا)

وہ بڑے ماہر قاری تھے تحریر و اتقان، فصاحت اور قرآت قرآن میں حسن صورت میں قدرت کی ایک نشانی تھے انھوں نے زر بن حبیش رضی اللہ عنہ سے اور انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے قرآن پاک پڑھا نیز انھوں نے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے استاذ ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن حبیب سلمی رضی اللہ عنہ سے بھی قرآن پاک پڑھا مذکورہ عبدالرحمٰن نے امام علی رضی اللہ عنہ سے بھی پڑھا اور امام علی رضی اللہ عنہ نے اپنی قرأت رسول اللہ ﷺ سے پڑھی۔ ۱۲۷ھ میں کوفہ یا سمادہ میں وفات پائی۔

ان سے شعبہ اور حفص رحمہ اللہ نے روایت کیا اور دونوں نے بغیر واسطہ کے روایت کیا۔

شعبہ ✿ یہ ابن عیاش بن سالم اسدی کے نام سے مشہور ہیں بعضوں نے کہا کہ ان کا نام محمد ہے۔ کسی نے کہا کہ مطرق ہے ان کی کنیت ابوبکر تھی اس لیے کہ شعبہ ان کے اور ابو بسطاط شعبہ بن حجاج بصری کے درمیان مشترک تھا وہ امام اور بہت بڑے عالم تھے۔ ۱۹۳ھ میں کوفہ میں وفات پائی۔

حفص ✿ ابوعمر حفص بن سلیمان بن مغیرہ بزاز، یہ عاصم کے ربیب بھی تھے انھوں نے ان کی گود میں پرورش پائی اور ان کے پاس قرآن پاک پڑھا اور ان سے اس طرح پڑھا جیسے کوئی بچہ اپنے استاذ سے پڑھتا ہے اس لیے یقینی بات ہے کہ وہ شعبہ سے زیادہ قابل اور باریک بین تھے۔

عاصم اور ان کے راوی کے بارے میں صاحب الشاطبیہ فرماتے ہیں:

وبالکوفۃ الغراء منھم ثلاثۃ اذاعوا فقد ضاعت شذیً وقرنفلا

"روشن کوفہ میں ان (قراء سبعہ میں سے) تین ہیں جنھوں نے۔ پھیلایا اور پھیل گئی مشک اور لونگ۔"

فامام ابو بکر وعاصم اسمه　　　فشعبة راویه المبرز افضلا

"ان میں سے ابو بکر اور عاصم کا نام ہے۔ پھر ان کے راوی شعبہ ہیں جو آگے بڑھنے والے اور فضیلت والے ہیں۔"

وذاك ابن عیاش ابو بکر الرضا　　　وحفص وبالاتقان کان مفضلا

"اور یہ ابن عیاش ابو بکر رضا ہیں۔ اور حفص ہیں جنھوں نے مہارت میں فضیلت حاصل کی۔"

ابوعمرو ✿ یہ ابوعمرو زبان بن علاء بن عمار بصری ہیں جو قرأت کے سب سے بڑے عالم تھے اور اس کے ساتھ صداقت امانت اور ثقہ فی الدین میں بھی موصوف تھے انھوں نے مجاہد بن جبر وسعید بن جبیر عن ابن عباس عن ابی بن کعب عن رسول اللہ ﷺ کی سند سے روایت کیا اور ایک جماعت کو پڑھایا جن میں سے ابوجعفر، زید بن قعقاع اور حسن بصری ہیں، اور حسن نے علی حطان اور ابوالعالیہ سے پڑھا اور ابوالعالیہ نے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے پڑھا۔ ۱۵۴ھ کو وفات پائی۔

ان کے مشہور راوی دوری اور سوسی ہیں لیکن یزیدی ابومحمد یحییٰ بن مبارک عدوی المتوفی ۲۰۲ھ کے واسطے سے انھیں یزیدی خلیفہ مہدی کے ماموں یزید بن منصور کی نسبت سے کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ اپنے بچے کو ادب سکھاتے تھے۔

اور دوری ابوعمر حفص بن عمر ہیں جو نابینا مقری ہیں انھیں دوری دور کی نسبت سے کہا جاتا ہے اور دور بغداد کے مشرقی جانب ایک جگہ کا نام ہے وہ ایک ثقہ اور کامل الضبط آدمی تھے سب سے پہلے قراءات کو انھوں نے جمع کیا انھوں نے یزیدی سے اور انھوں نے ابوعمرو سے روایت کی ۲۴۶ھ میں وفات پائی۔

اور سوسی، ابوشعیب صالح بن زیاد ہیں، انھوں نے یزیدی سے اور انھوں نے ابوعمرو سے روایت کی یہ بھی ایک ثقہ اور کامل الضبط انسان تھے ۲۶۱ھ میں وفات پائی۔

ابوعمرو اور ان کے راویوں کے بارے میں صاحب شاطبیہ فرماتے ہیں:

واما الامام المازنی صریحهم　　　ابو عمرو البصری فوالده العلا

"اور جبکہ امام مازنی جو ان میں سے خالص النسب ہیں۔ (یعنی) ابوعمرو بصری اور ان کے والد محترم۔"

افاض علی یحییٰ الیزیدی سیبه　　　فاصبح بالعذب الفرات معللا

"انھوں نے اپنی عطا (یعنی علم) کو یحییٰ یزیدی پر بہایا۔ اور وہ بالکل میٹھا (پانی) بن گئے جسے بار بار پیا جاتا ہے۔"

ابو عمرو الدوری وصالحهم ابو　　　شعیب هو السوسی عنه تقبلا

"ابوعمرو دوری اور ان کے صالح۔ ابوشعیب سوسی ہیں جنھوں نے ان سے علم حاصل کیا۔"

حمزہ ✿ ابوعمارہ بن حبیب زیات کوفی جو عکرمہ بن ربیع تیمی کے آزاد کردہ غلام تھے انھوں نے ابومحمد سلیمان بن مہران اعمش سے انھوں نے یحییٰ بن وثاب سے انھوں نے زر بن حبیش سے انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے (رضی اللہ عنہم) اور انھوں نے نبی کریم ﷺ سے پڑھا۔ وہ ایک متقی اور کتاب اللہ عالم تھے قرآن کی تجوید کے بھی عالم تھے اور فرائض وعربیت کو جانتے تھے حافظ الحدیث تھے حلوان میں ۱۵۶ھ میں وفات پائی۔ ان کے مشہور راوی خلف اور خلاد ہیں، لیکن ابوعیسیٰ سلیم

بن عیسیٰ حنفی کوفی التوفی ۱۸۸ھ کے واسطے سے۔

خلف ❁ یہ ابو محمد خلف بن ہشام بن طالب بن بزار ہیں، یہ بہت زاہد اور عابد تھے انھوں نے سلیم بن عیسیٰ حنفی سے اور انھوں نے حمزہ سے روایت کیا۔ ۲۲۹ھ کو وفات پائی۔

خلاد ❁ یہ ابو عیسیٰ خلاد بن خالد احول صیرفی ہیں انھوں نے سلیم بن عیسیٰ سے اور انھوں نے حمزہ سے روایت کیا۔ یہ سلیم کے ساتھیوں میں سے سب سے زیادہ ضبط والے تھے اور تحقیق وعرفان میں ان میں سب سے زیادہ بڑے تھے ۲۲۰ھ کو کوفہ میں وفات پائی۔

اس بارے میں صاحب شاطبیہ فرماتے ہیں کہ:

وَحَمْزَةُ مَآ أَزْكَاهُ مِنْ مُتَوَرِّعٍ   امامًا صبورًا للقران مرتلا

"اور حمزہ کیا ہی پاکیزہ پرہیز گار تھے۔ وہ امام تھے صابر تھے قرآن کو ترتیل سے پڑھنے والے تھے۔"

روى خلف عنه وخلاد الذى   رواه سليم متقنا و محصلا

"ان سے خلف نے روایت کیا اور خلاد نے۔ جن سے سلیم نے روایت کیا جو ماہر اور کامیاب تھے۔"

نافع ❁ یہ ابو رویم نافع بن عبدالرحمٰن بن ابو نعیم مدنی ہیں انھوں نے ابوجعفر قاری سے اور ستر تابعین سے علم حاصل کیا اور انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انھوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے علم حاصل کیا مدینہ منورہ میں پڑھانے کی سرداری ان پر ختم ہو جاتی ہے۔ ۱۶۹ھ میں وفات پائی ان کے مشہور راوی قالون اور ورش ہیں۔

قالون ابو موسیٰ عیسیٰ بن مینا ہیں انھیں قالون کا لقب ان کی قرأت کی عمدگی کی وجہ سے دیا گیا اس لیے کہ قالون کا معنی اپنی اصل وضع میں جید (عمدہ) ہے انھوں نے نافع سے پڑھا اور ان کے ساتھ بہت زیادہ اختصاص حاصل کر لیا اور فرمایا کہ میں نے نافع سے کئی مرتبہ پڑھا اور ان سے لکھا ۲۲۰ھ میں وفات پائی اور ورش کا نام عثمان بن سعید مصری ہے انھیں سعید کی کنیت سے یاد کیا جاتا ہے اور انھیں ورش کا لقب ان کی خوب سفیدی کی وجہ سے ملا۔ انھوں نے مدینہ کی طرف سفر کیا اور ۱۵۵ھ کو نافع کے پاس کئی ختم (یعنی کئی مرتبہ قرآن پاک ختم کیا۔) پڑھے اس کے بعد مصر لوٹ گئے۔ وہاں پڑھانے کی سرداری پر ختم ہے آپ کی آواز خوبصورت اور قرأت عمدہ تھی۔ ۱۹۷ھ میں وفات پائی۔

اس کے بارے میں صاحب الشاطبیہ فرماتے ہیں کہ:

فاما الكريم السرفى الطيب   نافع فذاك الذى اختار المدينة منزلا

"اور خوشبو میں شریف باطن والے۔ نافع ہیں جنھوں نے اپنی قیام گاہ کے لیے مدینہ کو اختیار کیا۔"

وقالون عيسى ثم عثمان ورشهم   بصحبة المجد الرفيع تاثلا

"اور قالون عیسیٰ پھر عثمان ورش نے۔ بزرگی والی ان کی اعلیٰ صحبت سے ترقی کی۔"

⑦ کسائی یہ ابو الحسن علی بن حمزہ کسائی نحوی ہیں ان کا لقب کسائی اس وجہ سے ہے کہ وہ احرام میں کساء (چادر) لپیٹے ہوئے تھے۔ ابو بکر انباری نے فرمایا کہ کسائی میں کئی امور جمع ہیں وہ نحو سب لوگوں سے زیادہ جانتے تھے۔ غریب احادیث جاننے میں یکتا تھے اور قرآن پاک میں منفرد تھے۔ لوگ ان سے بہت زیادہ کثرت کے ساتھ مطالبہ کرتے تھے کہ

انھیں مجبور کیا جاتا کہ وہ کرسی پر بیٹھیں اور اول سے آخر تک قرآن پاک کی تلاوت کریں اور وہ سنتے رہیں اور ان سے ضبط کریں ۱۸۹ھ میں وفات پائی۔

ان کے مشہور راوی ابوالحارث اور دوری ہیں۔

ابوالحارث ● وہ لیث بن خالد مروزی ہیں جو ثقہ اور ضبط میں کسائی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے شاگردوں میں سے تھے۔ انھوں نے ۲۴۲ھ کو وفات پائی۔

دوری ● وہ ابوعمر حفص بن عمر دوری ہیں جن کے بارے میں روایت عن ابی عمرو میں ہم نے آپ کو روشناس کرایا تھا۔ کسائی اور ان کے راویوں کے بارے میں صاحب شاطبیہ فرماتے ہیں:

وَاَمَّا عَلِیٌّ فَالْکِسَائِی نعتہ لِمَا کَانَ فِی اِلْاحْرَامِ فِیْہِ تَسَرْبَلَا

"اور علی جن کا وصف کسائی ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے احرام میں اس کا کرتا پہنا۔"

روی لیثھم عنہ ابو الحارث الرضا وحفص ھو الدوری وفی الذکر قد خلا

"ان سے لیث ابوالحارث رضا نے روایت کیا۔ اور حفص دوری نے جن کا ذکر گزر چکا۔"

قراء عشرہ کا تتمہ ● یہ کچھ کلمات ہیں جو ان تین حضرات کے بارے میں ہیں کہ جب انھیں گزشتہ بالا سات کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے تو دس قاریوں کی تعداد مکمل ہو جاتی ہے جو قراءات عشرہ مشہورہ والے ہیں اور قریب ہی ان کا کلام گزر چکا ہے۔

⑧ ابوجعفر یہ یزید بن قعقاع قاری ہیں ان کی نسبت مدینہ کی ایک بستی کی طرف ہے جس کا نام قارہ ہے اور پیچھے گزر کیا کہ انھوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انھوں نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم حاصل کیا۔ ابوجعفر نے ۱۳۰ھ کو وفات پائی۔

ان کے مشہور راوی ابوموسیٰ عیسیٰ بن وردان حذاء اور ابوالربیع سلیمان بن مسلم بن جماز ہیں۔

ابن وردان ● یہ ابوموسیٰ عیسیٰ بن وردان مدنی حذاء ہیں جو ابوجعفر سے پڑھنے میں نافع کے ساتھیوں میں سے تھے مقری کامل الضبط اور ثقہ تھے ۱۶۰ھ میں وفات پائی۔

اور ابن الجماز ● یہ ابوالربیع سلیمان بن مسلم بن جماز تھے انھوں نے ابوجعفر شیبہ بن نصاحہ اور نافع سے پڑھا ۱۷۰ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

⑨ یعقوب یہ ابومحمد یعقوب بن اسحاق حضرمی ہیں انھوں نے ابوالمنذر سلام بن سلیمان طویل سے پڑھا اور سلام نے عاصم سے اور ابوعمرو سے۔ یعقوب نے ۲۰۵ھ میں وفات پائی۔

آپ کے مشہور راویوں میں سے روح بن عبدالمؤمن اور محمد بن متوکل لؤلؤی الملقب بہ رُویس وغیرہ ہیں۔

روح ● یہ ابوالحسن روح بن عبدالمؤمن بن عبدہ بن مسلم ہذلی نحوی ہیں۔ انھوں نے امام البصرہ ابومحمد بن یعقوب بن اسحاق بن زید بن عبداللہ بن ابو اسحاق حضرمی کے پاس پڑھا اور یہ جلیل القدر امام اور ثقہ تھے ان سے بخاری نے بھی روایت لی ہے ۲۳۴ھ میں وفات پائی۔

رویس ✿ یہ ابوعبداللہ محمد بن متوکل لؤلوی بصری ہیں جو رویس کے لقب سے مشہور ہیں۔ گویا کہ یعقوب کے ماہر ترین شاگردوں میں سے ہیں۔

⑩ خلف یہ ابومحمد خلف بن ہشام بن ثعلب بن خلف بن ثعلب ہیں انھوں نے سلیم کے پاس اور انھوں نے حمزہ سے پڑھا نیز یعقوب بن خلیفہ اعشی کے پاس اور ابوزید سعید بن اوس انصاری کے پاس پڑھا جو "المفضل الصبی" والے ہیں اور ابان کے عطار کے پاس پڑھا اور انھوں نے عاصم سے پڑھا۔ ۲۲۹ھ کو وفات پائی۔ جیسا کہ حمزہ کے حالات میں گزرا۔

ان کے مشہور ترین راوی ابویعقوب اسحاق بن ابراہیم بن عثمان بن عبداللہ مروزی ثم البغدادی ہیں جنھیں وراق بھی کہا جاتا ہے۔ ۲۸۶ھ میں وفات پائی۔

ان کے مشہور ترین راوی ابوالحسن ادریس بن عبدالکریم حداد بغدادی بھی ہیں جو ۲۹۲ء کو وفات پا گئے۔

قراء اربعہ عشر کا تتمہ ✿ یہ چند مختصر کلمات ہیں جو ان چار حضرات کے بارے میں ہیں کہ اگر انھیں گزشتہ بالا دس کے ساتھ ملا دیا جائے تو ان چودہ کی گنتی مکمل ہو جائے جن کی طرف مشہور و معروف چودہ قرائتیں منسوب ہیں۔

⑪ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ یہ سید امام حسن بن ابوالحسن یسار ابوسعید بصری ہیں جو اپنی شہرت کی وجہ سے تعارف کے محتاج نہیں۔

⑫ ابن محیصن یہ محمد بن عبدالرحمٰن سہمی مکی ہیں اہل مکہ کے مقری تھے ابن کثیر بھی ان کے ساتھ تھے ۱۲۳ھ میں وفات پائی۔

⑬ یحییٰ یزیدی یہ یحییٰ بن مبارک بن مغیرہ امام ابومحمد بصری ہیں یزیدی کے ساتھ معروف ہیں۔ ۲۰۲ھ میں وفات پائی۔

⑭ شنبوذی یہ محمد بن احمد بن ابراہیم بن یوسف بن عباس بن میمون ابوالفرج شنبوذی شطوی بغدادی ہیں۔ ۳۸۸ھ میں وفات پائی۔

یہ اور ان جیسے ائمہ نے امت اور ملت کی خدمت کی اور کتاب وسنت کی حفاظت کی ان کے بارے میں سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: "جب جھوٹی اور من گھڑت باتیں پھیل گئیں اور قریب تھا کہ باطل حق کے ساتھ خلط ملط ہو جاتا امت کے ماہرین اٹھے اور انھوں نے انتہا درجہ کی جدوجہد کی اور حروف کلمات کو جمع کیا اور وجوہ روایات کو ان وجوہ در وایات والوں کی طرف منسوب کیا اور صحیح، مشہور اور شاذ کو اپنے تیار کردہ اصولوں اور اپنی تراشی ہوئی بنیادوں سے الگ الگ کیا۔ چنانچہ قرأت میں سب سے پہلے تصنیف ابوعبید قاسم بن سلام نے کی اس کے بعد احمد بن جبیر کوفی نے پھر اسماعیل بن اسحاق مالکی جو قالون کے شاگرد ہیں نے پھر ابوجعفر ابن جریر طبری نے پھر ابوبکر محمد بن احمد بن عمرو دجونی نے پھر ابوبکر مجاہد نے کی اس کے بعد لوگ ان کے اور ان کے بعد کے زمانے میں مختلف قسم کی جامع، مفرد، مختصر اور تفصیلی تالیفات کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور ائمہ قراءات بے شمار ہیں۔

ابوعبداللہ ذہبی نے ان کے طبقات کو تصنیف کیا اس کے بعد حافظ القرآن ابوالخیر جزری نے ان کے طبقات کو تصنیف کیا۔

اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ان سب کو اپنی وسیع رحمتوں میں ڈھانپے اور انھیں اپنی کتاب کی اس خدمت پر

بہترین جزاء عطا فرماتے۔ آمین۔

دس کے علاوہ باقی قرأتوں کا حکم

یہ چار قراءات جو دس پر زائد ہیں اور ان سے چودہ کی تعداد پوری ہو رہی ہے ان کے بارے میں بھی اختلاف ہے بعض نے کہا کہ ان میں سے کچھ متواتر ہیں بعض نے صحیح کہا اور بعض نے انھیں شاذ قرار دیا کہ سب کی سب شاذ ہیں بعض نے کہا کہ مسئلہ اشخاص و تعداد کا نہیں بلکہ یہ قواعد مبادی ہیں لہٰذا جو بھی قرأت ایسی ہو کہ اس میں اس مشہور ضابطہ کے ارکان ثلاثہ پائے جائیں گے وہ مقبول ہیں ورنہ مردود قراء سبعہ، قراء عشر یا قراء اربعہ عشر وغیرہ کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے بلکہ ہر ایک کے لیے ترازو ایک ہے اور حق ہی زیادہ لائق ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔

صاحب "الشافی" نے کہا کہ: "قراءت میں سے قراءات سبعہ کو پکڑنا اور باقی کو چھوڑ دینے میں نہ کوئی اثر منقول ہے اور نہ ہی کوئی حدیث بلکہ یہ تو بعض متاخرین نے جمع کیں اور وہ پھیل گئے اور جس نے کہا کہ ان پر زیادتی جائز نہیں اس نے غلطی کی اور اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔"

کواشی نے فرمایا کہ: "ہر وہ قرأت جس کی سند صحیح ہو۔ اس کی وجہ عربیت کے مطابق ہو اور مصحف امام کے خط کے موافق ہو وہ سبعہ منصوصہ میں سے ہے۔" (ان کی مراد وہ سبع احرف ہیں جو حدیث نبوی میں معروف ہیں) پھر فرمایا کہ اس شان کے ائمہ نے ایسے لوگوں کا سختی کے ساتھ انکار کیا ہے جنھوں نے سمجھا کہ قراءات مشہورہ اس جیسی قرأتوں میں منحصر ہیں جو "التیسیر" اور "شاطبیہ" جیسی کتابوں میں ہیں۔

یہ رائے درستگی کے قریب ہے اگر ان کی نظر آج کے دن کی قراءات پر منحصر نہ ہوتی اور حکم کو منطبق نہ کرتے اور اس کی تفصیل بیان نہ کرتے بلکہ کلام کو عمومی طور پر پیش کرتے جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

تحقیق ابوالخیر بن جزری کا مذہب یہی ہے کہ قراءات عشرہ جو آج ہمارے سامنے ہیں وہ متواتر ہیں ان کے علاوہ نہیں انھوں نے "منجد المقرئین" میں ایک مفید بات کہی کہ جس نے ہمارے زمانے میں ان ارکان ثلاثہ کو جمع کیا (یعنی اس مشہور ضابطہ میں اور اس میں سند کی صحت کی شرط کی بجائے اس کے تواتر کا لحاظ کیا) وہ ائمہ عشرہ کی قرأت ہے جس کے تلقی بالقبول پر لوگوں کا اجماع ہے اسے بعد میں آنے والوں نے پہلے حضرات سے لیا اور چلتے چلتے ہمارے زمانے تک پہنچا۔ اب ان میں سے ایک کی قرأت بھی قطعی ہونے میں باقی ائمہ کی قرأت کی طرح ہے اور جس نے کہا کہ قراءات متواترہ کی حد نہیں۔ اگر اس کی مراد ہمارے زمانے کی مشہور قراءات ہیں تو یہ صحیح نہیں کیونکہ آج قراءات عشرہ کے علاوہ کوئی بھی قرأت متواترہ نہیں پائی جاتی اور اگر اس کی مراد وہ قراءات ہیں جو صدر اول میں تھیں تو اس کا احتمال ہے۔

پھر غیر متواتر قراءات کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم ● جس کی سند صحیح ہو عادل کامل الضبط آخر تک اپنے جیسوں سے نقل کریں اور یہ عربیت اور رسم کے بھی موافق ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

① جس کا نقل مشہور اور امت کی تلقی بالقبول حاصل ہو جیسا کہ اس میں راوی منفرد ہوں یا بعض کتب معتبرہ منفرد ہوں یا جیسے مد وغیرہ

میں قراء کے مراتب یہ صحیح اور قطعی ہیں اللہ کی طرف سے حضور ﷺ پر نازل شدہ ہیں۔ اور سبعۃ احرف میں سے ہیں یہ قسم قراءات متواترہ کے ساتھ ملحق ہوگی اگرچہ اس کے برابر نہ ہوگی اس لیے کہ یہ اخبار آحاد کی قبیل سے ہے جنھیں قرائن نے ڈھانپ لیا ہو اور یہ بھی علم قطعی کا فائدہ دیتی ہیں۔

② جسے امت کی تلقی بالقبول حاصل نہ ہو اور وہ مشہور بھی نہ ہو۔ اس قسم میں علماء کا اختلاف ہے بعض حضرات نے اس کے ساتھ قرأت اور نماز کو جائز قرار دیا اور بعض نے قراءت عشرہ کے علاوہ قراءات کو منع کیا اور منع بھی تحریمی مکروہ نہیں۔ ابن سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے ”جمع الجوامع“ میں فرمایا کہ: ”قراءت شاذہ کے ساتھ قرأت جائز نہیں اور صحیح یہ ہے کہ قراءات عشرہ کے علاوہ سب شاذ ہیں بغوی اور شیخ الامام نے بھی اسی طرح فرمایا:“ شیخ الامام سے مراد ان کے والد زمانے کے مجتہد علی بن عبد الکافی سبکی ہیں۔“

دوسری قسم ✿ وہ قراءت صحیحہ جو عربیت کے بھی موافق ہو اور اس کی سند بھی صحیح ہو لیکن رسم کے مخالف ہو جیسے وہ قراءات جو صحیح سند سے مروی ہو لیکن اس میں کچھ اضافہ یا کمی ہو، یا ایک کلمہ دوسرے سے بدل گیا ہو جیسے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہیں آج کے دن انھیں شاذ کا نام دیا جاتا ہے اس لیے کہ یہ اجماعی مصحف کے رسم سے علیحدہ ہیں اگرچہ ان کی سند صحیح ہو پھر بھی ان کی قرأت جائز نہیں نہ نماز میں نہ نماز کے باہر۔ امام ابو عمر بن عبد البر نے کتاب التمہید میں فرمایا کہ: ” مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جس نے اپنی نماز میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ یا ان کے علاوہ کسی صحابی کی ایسی قرأت پڑھی جو مصحف کے خلاف ہے اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جائے گی۔ علماء مسلمین کا اس پر اجماع ہے سوائے ایک شاذ قوم کے جن پر دھیان نہیں دیا جائے گا۔

ابن عبد البر نے بھی اجماع نقل کیا ہے کہ قراءت شاذہ کے ساتھ قرأت کرنا جائز نہیں۔

ابن الجزری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہمارے اصحاب یعنی شافعیہ وغیرہ نے فرمایا کہ: ”اگر کسی نے نماز میں قرأت شاذہ پڑھی تو اگر وہ عالم ہے تو اس کی نماز باطل ہے اور اگر جاہل ہے تو نماز باطل نہ ہوگی اس قرأت کو شمار نہیں کیا جائے گا۔ بغداد کے علماء متفق ہیں کہ امام شنبوذی کی سرزنش کی جائے اور ان سے توبہ کرائی جائے کہ انھوں نے قراءت شاذہ پڑھی اور پڑھائی۔ یہ سب باتیں اس قرأت کے بارے میں ہیں جس کی نقل اور عربیت صحیح ہو لیکن رسم کے مخالف ہو۔ اور جس کی نقل صحیح نہ ہو تو وہ اس سے بھی کم درجہ ہے کہ جسے شاذ کا نام دیا جائے اگرچہ وہ عربیت اور رسم کے موافق ہو بلکہ یہ ایک جھوٹی قرأت ہے اس کو جان بوجھ کر کرنے والے کی تکفیر کی جائے گی۔

محقق ابن الجزری نے ایک استفتاء نقل کیا جو عجم سے دمشق لے جایا گیا جو چھ سو چالیس کے لگ بھگ میں تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ: ”کیا قراءت شاذہ جائز ہے؟ اور کیا کسی قاری کے لیے جائز ہے کہ وہ دس آیات اس طرح پڑھ کر ہر آیت ایک قرأت اور روایت میں پڑھے؟۔

اس کا جواب دو اماموں نے دیا ایک ابو عمرو بن صلاح نے اور دوسرے ابو عمرو بن حاجب نے۔ ابن صلاح نے فرمایا کہ: ”شرط یہ ہے کہ جو قرأت پڑھی جا رہی ہے وہ رسول اللہ ﷺ سے متواتر منقول ہو اور اس کا نقل بھی اسی طرح مشہور و معروف ہو اور اسے امت کی تلقی بالقبول بھی حاصل ہو جیسے یہ قراءات سبعہ اس لیے کہ اس میں یقین اور قطعیت معتبر ہے جیسا کہ اصول میں مقررہ اور ہے اب جس میں یہ نہیں پایا جائے گا جیسے قراءات سبعہ یا قراءات عشرہ کے علاوہ ان کی قرأت ممنوع ہے اور ممانعت تحریمی ہے

کراہت والی ممانعت نہیں، نماز میں بھی ممنوع اور خارج نماز بھی ممنوع اور جو مصادر و معانی جانتا ہو اسے بھی منع کیا جائے گا اور جو نہیں جانتا اسے بھی اور جو شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قادر ہو اس پر واجب ہے کہ اس کے لیے اٹھ کھڑا ہو علماء میں سے جس نے اسے نقل کیا اس نے اس میں پائے جانے والے فوائد کی وجہ سے نقل کیا جن کا تعلق علم عربیت کے ساتھ ہے علم قرأت کے ساتھ نہیں۔ یہ اس شخص کا راستہ ہے جس کا راستہ سیدھا ہے.... اس کے بعد فرمایا کہ: اور قرأت شاذہ "وہ قرآن ہے جو بغیر تواتر اور شہرت کے منقول ہوا سے امت کی تلقی بالقبول بھی حاصل ہوئی ہو، جیسا کہ اس پر محتسب رحمۃ اللہ علیہ اور ابن جنی وغیرہ کاربند ہیں۔ اور قرأت بالمعنیٰ جو قرآن کے طور پر منقول نہ ہوئی ہو یہ قراءات شاذہ میں سے نہیں ہے اور اس پر جرأت کرنے والا ایک بہت بڑے کام کی جرأت کرنے والا ہے اور بہت دور کا گمراہ ہے اسے تعزیر لگائی جائے گی اور قید وغیرہ میں ڈالا جائے گا اور گمراہ کو نہیں چھوڑا جاتا اور نہ ہی اس پر قادر کے لیے اس میں مہلت دینا جائز ہے قاری کا شاذ سے رکنا واجب ہے اور اسے آگاہ کر کے اسے گنہگار قرار دینا بھی واجب ہے اگر وہ باز نہ آئے تو اس پر شرائط کے مطابق تعزیر ہے۔

جب قاری قرأت کو شروع کرے تو اسے چاہیے کہ ہمیشہ اسی کے ساتھ پڑھے جب تک کہ کلام کا ابتداء کے ساتھ تعلق ہو اور جو اس کے خلاف ہو اس میں سے بعض جائز ہیں اور بعض ممتنع۔ مرض کا عذر مانع ہے کہ میں اس کو کما حقہ بیان کروں اور علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

جبکہ ابن حاجب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قراءات شاذہ کے ساتھ قرأت کرنا جائز نہیں نہ نماز میں اور نہ ہی غیر نماز میں خواہ وہ عربی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، جب اس کے ساتھ قاری پڑھے تو اگر وہ اس کی حرمت سے جاہل ہو تو اسے آگاہ کیا جائے گا اور اسے اس کو چھوڑنے کا حکم دیا جائے گا اور اگر عالم ہو تو اس کی شرائط کے مطابق اس کی سرزنش کی جائے گی اور اگر وہ اس پر اصرار کرے گا تو اسے اس کے اصرار پر تادیب کی جائے گی اور جب تک وہ اس سے باز نہ آ جائے اسے قید کیا جائے گا البتہ "اتنا" کو "اَعْطِنَا" سے بدل دینا اور "سَوَّلَتْ" کو "زَيَّنَتْ" سے بدل دینا وغیرہ یہ شاذ نہیں بلکہ شدید ترین حرام ہیں اور اس پر سرزنش بدرجہ اولیٰ ہوگی اور اس سے منع کرنا بہت زیادہ ضروری ہے۔

بحث کا خلاصہ ✿ اس بحث میں وجوہ اختلاف کی تحقیق کے بعد خلاصہ کے طور پر چند اہم امور وجود میں آتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کی طرف التفات کریں اور خصوصی تنبیہ کریں۔

① قرأت جب تک متواتر نہ ہو تو وہ قرآن نہیں بن سکتی اس لیے کہ قرآن میں تواتر شرط ہے۔

② قراءات عشرہ جو ہمارے زمانے میں شائع ذائع ہے وہ اس وقت کی تحقیق کے مطابق متواتر ہیں اس لیے وہ قرآن ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر قرآن کا اطلاق ہوگا۔

③ قراءات عشرہ کے علاوہ جن کی روایات آحاد صحیح ہیں اور مشہور نہیں ہیں اور انھیں امت کی تلقی بالقبول حاصل نہیں وہ شاذ ہیں قرآن نہیں ہیں اگرچہ رسم مصحف اور قواعد عربیہ کے موافق ہوں۔

④ قرآن کے مشہور ضابطے میں ذکر کردہ رکن یعنی اسناد کا صحیح ہونا، اس میں صحت سے مراد مطلق صحت نہیں بلکہ وہ صحت مراد ہے جو ممتاز ہو اور قرأت کو استفاضہ اور شہرت کی حد تک پہنچا دے اور اسے امت کا تلقی بالقبول بھی حاصل ہو جائے حتیٰ کہ یہ رکن بھی

تواتر کی قوت میں دوسرے دو رکنوں کے برابر ہو جائے کہ تواتر کے بغیر قرآنیت کا تحقق ممکن نہیں ہے جیسا کہ اس سے پہلے ہم نے اس کی تفصیل بیان کر دی۔

⑤ قرأت کبھی ایک قوم کے نزدیک متواتر ہوتی ہے اور دوسری قوم کے نزدیک متواتر نہیں ہوتی اور حکم یہ ہے کہ مسلمان صرف اس قرأت کو پڑھے جو اس کے نزدیک متواتر ہو اور جو اخبارِ آحاد مروی ہیں ان پر اکتفاء نہ کرے اگرچہ ان کی روایت کرنے والے کے نزدیک وہ متواتر ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کو رد کیا اس لیے کہ یہ روایت اس روایت کے مخالف تھی جو ان کے نزدیک متواتر ہے اور اس بارے میں ابن جزری نے جو بھی فرمایا وہ بھی آپ کو بھولنا نہیں چاہیے۔

⑥ وہ روایت جو محض طریق آحاد کے ذریعے روایت کی گئی اور استفاضہ اور شہرت کی حد کو نہیں پہنچی اصل مرض یہی ہیں اور کثیر شبہات اور اختلافات کا منبع ہیں۔ شبہات کے نمونے تو آپ کے سامنے گزر چکے اور اختلافات کا آپ نے اس بحث میں مشاہدہ کر لیا اور کچھ کا آپ مشاہدہ کر لو گے میں آپ کی نظر دو امور کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

① محض طرق آحاد ہی ہیں جنھوں نے قراءات سبعہ میں بعض ائمہ کی بعض روایات کے لیے طعن کا دروازہ کھولا جیسے ابن جریر طبری جنھوں نے اپنی تفسیر میں اس طرح کی کچھ چیزیں ذکر کیں اور قراءات اور ان کی علل میں ایک بہت بڑی کتاب تالیف فرمائی جس کے ضمن میں اس طرح کے کچھ مطاعن کو ذکر کیا۔

② ان روایات کے نادر الوقوع ہونے کے باوجود بعض لوگوں نے آگے بڑھتے ہوئے اور حد سے تجاوز کرتے ہوئے ان کا حکم سب پر چسپاں کر دیا اور فرمایا کہ: "یہ قراءات سبع اور ان کے علاوہ سب قرأتیں آحاد ہیں اور یہ قول انتہائی کم درجہ اور خطرے والا ہے کم درجہ اس وجہ سے کہ یہ بات علی الاطلاق مناسب نہیں کہ قلیل وحقیر کا حکم کثیر وجلیل میں لگا دیا جائے اور خطرناک اس لیے ہے کہ یہ تواتر قرآن کے نقص کا باعث ہے یا یہ اس وقت عدم وجود قرآن کا باعث ہے کہ جب تک قرآن میں تواتر مشروط رہے گا اس وقت تک قرآن کا وجود معدوم ہوگا اور ان کی رائے میں تواتر ہے نہیں۔ اور یہ بات عقل میں نہیں آسکتی جس قرآن میں تواتر مفروض ہو وہ تمام قراءات کے غیر متواتر ہونے کی صورت میں موجود ہو اس لیے کہ بات بدیہی ہے کہ قرآن کی قراءت کی وجوہ کے بغیر متحقق نہیں ہو سکتا۔

یہ باتیں اس موضوع پر نظر ثانی کے بعد ہمیں سمجھ میں آئیں۔ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے اس طرف ہماری رہنمائی کی۔

﴿وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ﴾ (الاعراف: ۴۳)

"اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ دیتے تو ہمیں ہدایت نہ ملتی۔"

اس مقام پر پیدا ہونے والے شبہات کا ازالہ

اس مقام پر کچھ شبہات ہیں جو قراءات کے تعدد اور ان کے اختلاف کے گرد گھوم رہے ہیں، اس کے بعد ان کی صحت اور ان میں سے متواتر کے گرد گھوم رہے ہیں نیز قرآن کریم اس کے تواتر اور اس پر امت کے اجماع کے بارے میں پیدا ہو رہے ہیں۔

ان شبہات میں سے بعض شبہات ایسے ہیں جو "نزول قرآن علی سبعة احرف" کی بحث میں آپ نے دیکھ لیے ہیں اور بعض جمع قرآن میں ذکر ہو چکے ان کی طرف (اگر آپ چاہیں تو) رجوع کر لیں انھیں دہرا کر تطویل کی ضرورت نہیں۔

لیکن ایک روایت جسے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور وہ ان کا معوذتین کی قرآنیت کے انکار پر مشتمل ہے ممکن ہے کہ یہ ایک قوی ترین شبہ ہو اس لیے کہ یہ ایسی اسانید کے ساتھ وارد ہوئی ہے جسے کسی بڑے محدث نے صحیح قرار دیا ہے اور اس کی توجیہ وتمحیص حتیٰ کہ یہ احتمال گزر چکا ہے۔

اس موقع پر اس شبہ کی کمزوری میں مزید چند امور آپ کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

① عاصم رحمہ اللہ جو قراء سبعہ میں سے ایک ہیں انھوں نے پورا قرآن پڑھا اور اس میں معوذتین کو بھی صحیح سندوں کے ساتھ پڑھا۔ بعض سند ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف لوٹتی ہیں۔ یہ اس لیے کہ عاصم رحمہ اللہ نے ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن حبیب ـــ اور ابو مریم زر بن حبیش رحمہ اللہ اسدی سے اور سعید بن عیاش شیبانی سے پڑھا۔

اور ان لوگوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پڑھا اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا۔

② حمزہ رحمہ اللہ بھی قراء سبعہ میں سے ہیں جنھوں نے پورا کا پورا قرآن صحیح سندوں کے ساتھ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پڑھا اور اس میں معوذتین موجود ہیں۔ حمزہ موصوف رحمہ اللہ نے اعمش ابو محمد سلیمان بن مہران سے اور اعمش نے یحییٰ بن وثاب سے اور یحییٰ نے علقمہ اسود، عبید بن نضلہ خزاعی زر بن حبیش اور ابو عبدالرحمٰن سلمی سے اور ان سب نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا۔

حمزہ رحمہ اللہ کی ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ قرأت پڑھنے کی ایک سند اور بھی ہے وہ یہ کہ انھوں نے اسحاق سبیعی، محمد بن عبدالرحمٰن بن ابو لیلی اور امام جعفر صادق سے اور ان حضرات نے علقمہ بن قیس، زر بن حبیش، زید بن وہب اور مسروق سے اور ان سب نے منہال وغیرہ سے اور انھوں نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اور ان دونوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

③ کسائی نے قرآن پڑھا اور اس میں بھی معوذتین ہیں اس کی سند بھی ابن مسعود رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے اس لیے کہ انھوں نے قرآن حمزہ سے پڑھا جن کی سند آپ کے سامنے دو طریقوں سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ تک پہنچ چکی ہے۔

④ خلف بھی قرآن کریم کے ضمن میں معوذتین پڑھتے ہیں ان کی سند بھی ابن مسعود رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے اس لیے کہ انھوں نے قرآن سلیم سے اور انھوں نے حمزہ سے پڑھا۔

یہ قراءات تمام کی تمام صحیح ترین سندوں سے مروی ہیں اور ان پر امت کا اجماع بھی ہے ان میں معوذتین بھی ہیں اور فاتحہ بھی اور ان میں معتبر یہ ہے کہ یہ تینوں سورتیں قرآن پاک کا حصہ ہیں اور اس میں داخل ہیں۔

چنانچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ان سورتوں کی قرآنیت کے انکار پر برقرار رہنے کا قول محض افتراء ہے اور سب معاملہ اسی طرح ہے کہ انھوں نے اپنے مصحف میں سورۃ فاتحہ اس بھروسہ پر نہیں لکھی کہ اس کی شہرت ہے اور اس پر بھولنے کا خوف نہیں ہے اسی طرح معوذتین میں بھی قول ہے۔ بعض نے کہا کہ انھیں پہلے علم نہیں تھا کہ معوذتین قرآن پاک کا حصہ ہے بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک دم ہے جس کے ذریعے آپ ﷺ حسن و حسین کو اللہ کی پناہ میں دیتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے انکار والی روایات نقل ہو گئیں پھر اس کے بعد انھیں ان کی قرآنیت کا علم ہو گیا جس کی وجہ سے ان کے قرآن ہونے والی روایات بھی نقل ہو گئیں جیسا کہ ہم نے آپ کے سامنے قراء سبعہ میں سے چار قاری بیان کر دیئے جن کی سندیں اصح الاسانید ہیں اور تائید کرتی ہیں کہ یہ متواتر و مستفیض ہیں اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ فاتحہ اور معوذتین قرآن کا حصہ ہیں جو خلافت راشدہ سے آج تک چلا آ رہا ہے۔

بہر حال اس تمام بحث کے بعد پہلے شبہ پر ہونے والے اس کلام کو ہم معتبر مانیں جو اس موضوع پر یہاں لکھا گیا ہے۔

دوسرا شبہ وہ کہتے ہیں کہ تمام قرآن میں تواتر کا ہونا غیر مسلم ہے اس لیے کہ اس کے تواتر کی دلیل میں جن اسباب کا تم نے ذکر کیا وہ قرآن کے تمام اجزاء میں پورے نہیں ہوتے اس کی دلیل یہ ہے کہ جو لوگ بسملہ کو قرآن پاک کا حصہ مانتے ہیں ان کی رائے کے مطابق اس میں تحدی جاری نہیں ہوتی اور یہ بھی تحقق نہیں ہوتا کہ یہ احکام کی بنیاد ہے چہ جائیکہ یہ اس کے نقل اور تواتر کے کامل اسباب بن جائیں۔

جواب ① اس میں تحدی اس اعتبار سے جاری ہوتی ہے کہ اسے دوسری دو آیتوں سے ملایا جائے گا تاکہ سب مل کر تین آیات ہو جائیں جن کے ذریعے اعجاز قائم ہو جائے اور یہ بات ان میں اہتمام اور ان کے متواتر نقل ہونے میں کافی ہے۔

② اس کے نظم کے ساتھ یہ احکام معروفہ متعلق ہیں کہ اسے پڑھنے والے کو اجر عظیم ملے گا اگر وہ پاکیزہ (یعنی باوضو ہو) اور اگر وہ جنبی ہو اور اس نے اسے قرآن کے ارادے سے پڑھایا یا چھوایا ہو تو اس کے لیے سخت وعید ہے وغیرہ وغیرہ اور یہ بھی اس کے نقل اور تواتر کے کامل اسباب میں سے ہے۔

تیسرا شبہ وہ کہتے ہیں کہ اگر قرآن متواتر ہے تو "بسملہ" میں بھی تکفیر واقع ہوگی مطلب یہ ہے کہ جو اس کی قرآنیت کا قائل ہوگا وہ اس کا انکار کرنے والے پر کفر کا حکم لگائے گا اور جو اس کی قرآنیت کا قائل نہیں وہ اس کے مثبت پر کفر کا حکم لگائے گا اس بناء پر مسلمان ایک دوسرے کی تکفیر کریں گے۔

جواب سورتوں کے شروع میں "بسملہ" کی قرآنیت اجتہادی اور اختلافی ہے اور جو چیز اس قبیل سے ہو اس کے منکر یا مثبت کو کافر نہیں کہا جا سکتا، ہر اجتہادی معاملے کی شان اسی طرح ہوتی ہے۔ کافر صرف اسے کہا جائے گا جو کسی ایسے متواتر کا انکار کرے جس کا دین سے ہونا ضروری طور پر معلوم ہو جبکہ سورتوں کے شروع میں "بسم اللہ" کی قرآنیت متواتر نہیں ہے اور نہ ہی اس کا دین میں سے ہونا بالضرورت معلوم ہے۔

بہر حال سورۃ النحل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ "بسم اللہ" آئی ہے اس کا منکر قطعی کافر ہے اس لیے کہ اس کی قرآنیت متواتر ہے اور اس کا دین سے ہونا بالضرورت معلوم ہے اس کی قرآنیت میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ ایک دوسرے کو کافر کہا جائے جیسا کہ یہ معترضین خیال کرتے ہیں۔

چوتھا شبہ وہ کہتے ہیں کہ تمہارا تواتر قرآن پر استدلال کرنا اس بات سے کہ اس کے نقل پر بھرپور اسباب موجود ہیں آپ کا یہ استدلال سنت نبویہ سے ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ یہ غیر متواتر ہیں حالانکہ ان کے نقل پر بھی بھرپور اسباب موجود ہیں کیونکہ یہ احکام کی اصل ہیں جیسا کہ قرآن احکام کی اصل ہے۔

جواب اوّل ◘ نقل قرآن کے تواتر پر بھرپور اسباب کا ہونا صرف اس حیثیت سے نہیں کہ یہ احکام کی اصل ہیں بلکہ اس حیثیت سے بھی اور اعجاز، تحدی، اس کی تلاوت بطور عبادت کرنا، ہر زمانے میں اس سے برکت حاصل کرنا اور نماز وغیرہ میں اس کی تلاوت کرنا وغیرہ کی حیثیت سے بھی ہے۔

جبکہ سنت نبویہ میں سب چیزیں جمع نہیں ہیں بلکہ ان میں صرف کچھ پائی جاتی ہیں اور صرف اتنی چیزیں ان کے متواتر منقول ہونے کے بھرپور اسباب ہونے میں کافی نہیں ہیں۔

دوسرا جواب ◘ احکام کی اصالت سے مراد فرد کامل ہے جو صرف قرآن پاک میں ہی پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں احکام کی اصالت الفاظ اور معنی دونوں کی طرف لوٹتی ہے معنی کی طرف لوٹنا تو واضح ہے اور الفاظ کی طرف لوٹنا اس اعتبار سے ہے کہ حکم کا تعلق اس کے اعجاز کے ساتھ بھی ہے اور اس کے پڑھنے والے کے ثواب کے ساتھ بھی ہے اور اسے حفظ کرنے والے کے لیے عمدہ وعدے اور عظیم انعامات اور اس کو حفظ کرنے کے بعد بھلا دینے والے اور اسے جنابت کی حالت میں چھونے یا پڑھنے والے کے لیے شدید وعیدیں وغیرہ کے ساتھ بھی ہے جبکہ سنت نبویہ کے الفاظ کے ساتھ کسی بھی حکم کا تعلق نہیں ہے اسی وجہ سے اس کی روایت بالمعنیٰ جائز ہے جبکہ اس کے معانی کے نقل کرنے پر اگر بھرپور اسباب مہیا ہوں تو اس کا تواتر واجب ہے ورنہ نہیں۔ اسی وجہ سے روافض کی نقل کردہ اس روایت کے جھوٹ ہونے کا قطعی حکم لگایا جائے گا جسے انھوں نے نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کیا کہ آپ ﷺ نے اپنے بعد امامت عظمیٰ کے بارے میں تصریح کی کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد رضی اللہ عنہم میں محصور رہے گی اس کا بیان یہ ہے کہ اگر ان کا یہ دعویٰ صحیح ہوتا تو یہ متواتر منقول ہوتا اس لیے کہ اس کے نقل پر بھرپور اسباب ہیں اس لیے کہ اس کا تعلق ایک ایسے امر کے ساتھ ہے جو مستقبل کے ایک اعلیٰ حکم اور تمام اسلامی ممالک کے لیے اسلام میں ولایت عظمیٰ کے ساتھ ہے۔

پانچواں شبہ وہ کہتے ہیں کہ تواتر اس بات سے بھی ٹوٹ جاتا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں وہ مصحف عثمان کے موافق نہ تھے اس کی دلیل مندرجہ ذیل روایت ہے۔

① حضرت شقیق بن سلمہ فرماتے ہیں کہ ہمیں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ممبر پر خطبہ دیا اور فرمایا کہ: ﴿وَمَنۡ يَّغۡلُلۡ يَاۡتِ بِمَا غَلَّ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ﴾ (آل عمران:۱۶۱) "جو مال غنیمت میں خیانت کرے گا وہ اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو بروز قیامت لائے گا" اپنے مصاحف چھپا دو۔ (یعنی انھیں چھپا دو تا کہ جلائے نہ جائیں) اور تم لوگ کیسے حکم دیتے ہو کہ میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی قرأت پر پڑھوں حالانکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے دہن مبارک سے اس طرح سے سنا ہے۔"①

② خیر بن مالک فرماتے ہیں کہ: "جب مصاحف میں تبدیلی کا حکم ہوا تو یہ بات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو بری لگی انھوں نے فرمایا کہ جو اپنے مصحف کو چھپا سکے چھپالے (یعنی چھپالے تا کہ جلے نہیں) آخر میں فرمایا کہ کیا میں اس قرأت کو چھوڑ دوں جسے

① نسائی، انہ اور ابوداؤد نے روایت کیا۔

میں نے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سنا۔

③ حاکم نے ابومیسرہ کی سند سے روایت کیا کہ: "میں چلا اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، حذیفہ رضی اللہ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس تھا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اللہ کی قسم! میں یہ مصحف نہیں دوں گا مجھے رسول اللہ ﷺ نے پڑھایا۔

جواب: ① یہ روایات کبھی بھی قراءات کے عدم تواتر پر دلالت نہیں کرتیں اور نہ ہی اس چیز کے عدم تواتر پر دلالت کرتی ہیں۔ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف میں آئی ہے زیادہ سے زیادہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ شروع میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے مصحف کو جلانے پر متفق نہیں تھے، اس سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف میں موجود قرآن کا تواتر نہیں ٹوٹتا۔ اس لیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف میں موجود قرآن کے تواتر کی یہ شرط نہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنا مصحف جلائیں یا کوئی بھی اپنا مصحف جلائے بلکہ تواتر کے متحقق ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اسے ہر طبقہ میں ایک ایسی جماعت روایت کرے جس کے جھوٹ پر جمع ہونے سے امن ہو اور یہ مصحف عثمان میں موجود ہے اس لیے کہ انھوں نے اس میں جو روایت کیا اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک بہت بڑی جماعت متفق ہوگئی اس میں جھوٹ محال ہے اور آپ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کا قرآن پاک میں دستور کافی ہے اگر آپ چاہیں تو ان کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

② اگر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف کی مخالفت فرض کر لی جائے تو بھی یہ مخالفت قرآن کے تواتر کو ختم نہیں کرتی اس لیے اس مفروضہ مخالفت کے ہوتے ہوئے بھی مصحف عثمانی میں متواتر کے ارکان متحقق ہیں اور دنیا میں کوئی شخص اس کا قائل نہیں کہ: "تواتر کی شرط یہ ہے کہ اس کا کوئی مخالف نہ ہو۔" اس لیے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مصحف عثمانی کی مخالفت قرآن کے تواتر کو توڑنے والی نہیں ہے۔

③ یہ روایات جو انھوں نے قرآن کے تواتر میں طعن کے طور پر پیش کی ہیں اس پر دلالت نہیں کرتیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قرأت میں بھی مصحف عثمانی کے مخالف تھے بلکہ وہ اسے بھی پڑھتے تھے اور اس روایت کو بھی پڑھتے تھے جو انھوں نے انفرادی طور پر اکیلے نبی کریم ﷺ کے زبان مبارک سے سنی تھی کیا آپ نہیں دیکھتے کہ انھوں نے فرمایا: "رسول اللہ ﷺ نے اپنی مبارک زبان سے اس کی طرح پڑھا۔" چنانچہ کلمہ "مثلہ" (اس کی طرح) اعتراف ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بھی اس کی مثل رسول اللہ ﷺ سے پڑھا اسی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے انفراد کے ساتھ موافقت نہیں کی بخلاف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف کے کہ اس کی موافقت ایک بہت بڑی جماعت نے کی اور اجماع امت بھی ہو گیا اور اس میں صرف وہی لکھا گیا جو آخری زمانے میں ثابت تھا اور اس کی تلاوت منسوخ بھی نہیں ہوئی جیسا کہ مبحث جمع القرآن میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔

④ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مصحف نہ دینا شروع میں تھا پھر بعد میں جب انھیں خبر ملی کہ اصحاب رسول رضی اللہ عنہم نے ان کے مقالہ میں اسے ناپسند کیا تو مصحف کو جلا دیا تھا۔ جیسا کہ حضرت شقیق رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے جسے ابن ابوداؤد نے زہری کے طریق سے روایت کیا۔ اسی وجہ سے ان کی صفیں متحد ہو گئیں اور ان کا کلمہ ایک ہو گیا اور اجماع اُمت کی وجہ سے مصاحف عثمانیہ ہر طرح سے کامیاب ہو گئے حتیٰ کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی اجماع کر لیا۔ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اس کرم اور سخاوت پر وہ تعریفیں جو اس کی نعمتیں پوری کرتی ہیں اور مزید بڑھاتی ہیں اور اس کی رضا کو اتارتی ہیں۔ آمین

بحث ⑫

تفسیر، مفسرین اور ان کے متعلقات

تفسیر تفسیر کا لغوی معنی وضاحت اور بیان ہے اسی سے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا﴾ (الفرقان:۳۳)

"اور وہ آپ کے پاس نہیں لائیں گے کوئی بات مگر ہم آپ کے پاس حق اور بہترین تفسیر لائیں گے۔"

تفسیر کا اصلاحی معنی ایسا علم جس میں بقدر طاقت بشریہ قرآن کریم کے احوال سے بحث کی جائے اللہ تعالیٰ کو مراد پر دلالت کرنے کی حیثیت سے۔

علم سے مراد معارف تصوریہ ہیں۔ عبدالحکیم نے کلام کرتے ہوئے فرمایا کہ: "تفسیر کا علم تصورات کی قبیل سے ہے اس لیے کہ اس سے مقصود اس کے الفاظ کے معانی کا تصور ہے اور یہ تعاریف کی قبیل سے ہے لیکن ان میں سے اکثر بلکہ کل تعاریف لفظیہ کی قبیل سے ہیں۔

سید کا مذہب یہ ہے کہ تفسیر تصدیقات کی قبیل سے ہے اس لیے کہ یہ الفاظ پر حکم کو متضمن ہیں بایں طور کہ یہ ان معانی کو متضمن ہیں جو تفسیر میں ان کے اطراف میں ذکر کیے جاتے ہیں۔

ہمارا قول: "اس میں قرآن کے احوال سے بحث کی جائے۔" اس سے وہ علوم خارج ہو جائیں گے جن میں قرآن کے علاوہ کسی اور کے احوال سے بحث کی جائے۔

ہمارا قول: "اللہ تعالیٰ کی مراد پر بحث کرنے کی حیثیت سے" اس سے وہ علوم نکل جائیں گے جن میں قرآن کے احوال سے بحث کی جائے مگر اس کی دلالت کی حیثیت سے جیسے علم قراءات کہ اس میں قرآن پاک کے احوال سے بحث کی جاتی ہے مگر ان کے الفاظ کے ضبط اور ان کے ادا کی کیفیت سے اور جیسے علم رسم عثمانی اس میں بھی قرآن کریم کے احوال سے بحث کی جاتی ہے مگر اس کے الفاظ کی کتابت کی کیفیت کی حیثیت سے۔

اس حیثیت سے وہ معارف بھی نکل جاتے ہیں جن میں قرآن پاک کے احوال سے بحث کی جاتی ہے مگر مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کی حیثیت سے کیونکہ ان کا تعلق علم کلام کے ساتھ ہے اسی طرح وہ معارف بھی نکل جائیں گے جن میں قرآن کے احوال سے بحث کی جاتی ہے لیکن جنبی وغیرہ ہونے کی حالت میں قرآن پاک کی تلاوت کرنے کی حیثیت سے کہ یہ علم فقہ سے متعلق ہے۔

بقدر طاقت بشریہ کی قید اس وضاحت کے لیے ہے کہ علم تفسیر میں متشابہات کے معانی کا علم نہ ہونا عیب نہیں ہے اور نہ ہی واقع اور نفس الامر میں اللہ تعالیٰ کی مراد کا علم نہ ہونا عیب ہے۔

علم تفسیر کی تعریف یوں بھی کی گئی ہے کہ: "ایسا علم جس میں کتاب عزیز کے احوال سے بحث کی جائے اس کے نزول، سند،

ادا، الفاظ، الفاظ سے متعلقہ معانی اور احکام سے متعلقہ معانی کی جہت سے۔"

نزول سے مراد سبب نزول اور اس کا مکان و زمان ہے۔

سند سے مراد جو اس کے متواتر، آحاد یا شاذ ہونے کو شامل ہو۔

اداء سے مراد جو اس کے ادا کے تمام طرق کو شامل ہو جیسے مد اور ادغام۔

الفاظ سے مراد جس کا تعلق اس کے الفاظ کے ساتھ ہو اس حیثیت سے کہ وہ حقیقت ہیں یا مجاز، مشترک ہیں یا مرادف، صحیح ہیں یا معتل اور معرب ہیں یا مبنی۔

الفاظ سے متعلقہ معانی سے مراد جو فصل وصل کے مشابہ ہوں۔

احکام سے متعلقہ معانی سے مراد جو عموم وخصوص اور احکام ونسخ کی قبیل سے ہوں۔

یہ تعریف جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ علم قراءات، علم اصول، علم قواعد لغت جیسے نحو، صرف، معانی، بیان اور بدیع وغیرہ کے قواعد کے تحت مندرج ہونے والی کثیر جزیات کو شامل ہے۔

علم تفسیر کی ایک تیسری تعریف کی گئی ہے کہ "یہ ایک ایسا علم ہے جس میں الفاظ قرآن کے نطق کی کیفیت، اس کے مدلولات، اس کے احکام افرادیہ اور ترکیبیہ اور اس کے معانی جن پر ترکیب کی حالت میں انھیں محمول کیا جائے گا اور اس کے علاوہ جیسے نسخ، سبب نزول اور جس سے مقام کی وضاحت ہوتی ہے جیسے قصہ اور مثل وغیرہ کی کیفیت سے بحث کی جائے۔"

یہ تعریف دونوں تعریفوں کے درمیان درمیان ہے اور اس کا پہلی تعریف کی طرف لوٹنا سہل ہے اس لیے کہ یہاں جو تفصیلاً ذکر کیا گیا اسے بقدر طاقت بشریہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے اس کی مراد کا کچھ تفصیل کے ساتھ بیان سمجھا جائے گا۔

تاویل ✿ تاویل بھی اپنے مشہور ترین لغوی معنی میں تفسیر کے مرادف ہے۔

صاحب قاموس نے فرمایا کہ: "اَوَّلَ الْكَلَامَ تَأْوِيْلًا وَّ تَأَوَّلَهٗ دَبَّرَهٗ وَقَدَّرَهٗ وَفَسَّرَهٗ۔"

اسی سے متعلق اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ﴾ (آل عمران:۷)

"اور جن کے دلوں میں کھوٹ ہے وہ اس کے متشابہات کے پیچھے لگتے ہیں فتنہ کی تلاش میں اور اس کی تاویل تلاش کرتے ہوئے اس کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سواء کوئی نہیں جانتا۔"

اسی طرح بہت سی آیات آئی ہیں جن میں تاویل کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ان تمام آیات میں اس کا معنیٰ بیان، کشف اور ایضاح ہے۔

جبکہ مفسرین کی اصطلاح میں تاویل کے معنیٰ میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ تفسیر کے مرادف ہے اس بناء پر ان کے درمیان تساوی کی نسبت ہے۔ یہ معنی متقدمین کے ہاں بہت رائج ہے انھی میں سے ایک قول مجاہد کا بھی ہے کہ

بے شک علماء اس کی تاویل جانتے ہیں (یعنی قرآن کی) اور ایک قول ابن جریر کا بھی ہے جو انھوں نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے کہ: "اللہ تعالیٰ کے قول کی تاویل میں ایک قول یہ بھی ہے...." نیز فرماتے ہیں کہ: "اس آیت میں اہل تاویل کا اختلاف ہے۔"

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ تفسیر فقط عموم وخصوص میں تاویل کے مخالف ہے اور وہ تفسیر کو عام مطلق قرار دیتے ہیں شاید ان حضرات کے نزدیک تاویل سے مراد صرف لفظ کے مدلول کا بیان ہے دلیل کی طرف سبقت کیے بغیر اور تفسیر سے مراد لفظ کا مدلول مطلقاً ہے خواہ دلیل کی طرف سبقت ہو یا نہ ہو۔

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ تفسیر تاویل کے متباین ہے تفسیر کہتے ہیں کہ: "قطعی طور پر کہنا کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہی ہے۔" اور تاویل "کسی احتمال کو بغیر قطعیت کے ترجیح دینا" ہے یہ قول ماتریدی کا ہے۔

یا تفسیر کا معنیٰ "لفظ کی وضاحت بطریق روایت" ہے اور تاویل کا معنیٰ "لفظ کی وضاحت بطریق درایت ہے۔" یا تفسیر کا معنیٰ "ان معانی کا بیان جو عبارت کی وضع سے مستفاد ہوتے ہیں" اور تاویل "ان معانی کا بیان ہے جو اشارہ کے طریقے سے مستفاد ہوتے ہیں۔" متاخرین کے نزدیک یہی معنیٰ مشہور ہے جیسا کہ علامہ آلوسی نے اس پر تنبیہ کی ہے انھوں نے اس موضوع کی آراء کو پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ: "ہمارے ذکر کردہ یا ذکر نا کردہ میں جو کچھ بھی کچھ کہا گیا ہے وہ آج کے عرف کے مخالف ہے اس لیے کہ مؤلفین کے نزدیک بغیر کسی انکار کے متعارف ہے کہ تاویل ان معانی قدسیہ اور معارف ربانیہ کو کہتے ہیں جو غیب کے بادلوں سے عارفین کے قلوب پر اترتے ہیں جبکہ تفسیر کچھ اور ہے۔" آپ جانتے ہیں کہ انھوں نے تاویل کو ان چیزوں کے ساتھ خاص کیا جو اشارہ سے ماخوذ ہوتے ہیں جبکہ تفسیر کو تعبیر کے مفہوم کے ساتھ خاص کیا ہے۔

تفسیر کی دو اقسام ✿ تفسیر کی اجمالی دو قسمیں ہیں:

① خشک تفسیر جو الفاظ کے حل، جملوں کے اعراب اور ان نکات بلاغیہ اور اشارات خفیہ کے بیان سے جنھیں نظم قرآن شامل ہے تجاوز نہیں کرتی۔

② وہ تفسیر جو ان حدود سے تجاوز کرتی ہے اس کا سب سے بڑا ہدف قرآن پاک کی ہدایات، قرآن پاک کی تعلیمات اور اس قرآن میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے جو کچھ مشروع کیا ہے اس میں پائی جانے والی حکمتیں ہیں اس طور پر کہ وہ ارواح کو جذب کریں اور دلوں کو کھول دیں اور نفوس کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی طرف متوجہ کریں اور یہی تفسیر کے نام کے لائق ہے اور اسی کے بارے میں گفتگو کی جائے گی جب کہ ہم اس کی فضیلت اور ضرورت کے بارے میں بات کریں گے۔

تفسیر کی فضیلت اور ضرورت

افراد واُمم کی ترقی کبھی بھی تجربہ سے صحیح نہیں ہو سکتی اور نہ ہی نرم اور آسان اور نہ ہی حیران کن اور ہوش رُبا سے بلکہ اگر اس کی ترقی ہو سکتی ہے تو صرف اور صرف قرآن پاک کی تعلیمات اور اس کی پرحکمت نظم سے جس میں نوع بشری کے لیے سعادت کے تمام عناصر ودیعت رکھے ہوئے ہیں اس سے رہنمائی حاصل کرنے کے طریقے سے ہی ممکن ہے اس لیے کہ اسے نوع بشری کے حکیم خالق کا علم محیط ہے اور یہ بات بدیہی ہے کہ ان تعلیمات پر عمل کرنا قرآن کے فہم وتدبر اور اس میں پائی جانے والی نصائح ورشد پر موقوف اور اس کا معجز اور باکمال اسلوب جن زبردست قوتوں کا حامل ہے ان قوتوں کے ذریعے ان کے مبادیات کو جانے بغیر نہیں ہو سکتا اور یہ چیز قرآن پاک کے الفاظ کے

مدلولات کے بیان اور وضاحت سے ہی متحقق ہوسکتی ہے" اور اسی کا نام علم تفسیر ہے۔" خصوصاً اس زمانے میں جس میں عربی بیان کی مہارت ختم ہوگئی اور اس کی خصوصیات و اوصاف ضائع ہو گئے حتیٰ کہ خالص النسب عربوں سے خود بھی ضائع ہو گئے۔

چنانچہ تفسیر ان خزانوں اور ذخائر کی چابی ہے جن پر یہ کتاب مجید مشتمل ہے جو بشر کی اصلاح، لوگوں کی نجات اور عالم کے اعزاز کے لیے نازل ہوئی۔

اور تفسیر کے بغیر ان خزانوں اور ذخائر تک پہنچنا ناممکن ہے جب تک کہ لوگ قرآن پاک کے الفاظ دوہرانے میں مبالغہ کرتے رہیں گے اور ہر روز ہزاروں مرتبہ ان تمام وجوہ کے ساتھ جن پر قرآن نازل ہوا بھرپور قراءت کرتے رہیں گے۔

اس زمانے میں مسلمانوں کے پیچھے رہنے میں... حالانکہ مصاحف بڑی تعداد میں ان کے ہاتھ میں ہیں کروڑوں حفاظ ان کے سامنے موجود ہیں ان کی تعداد بھی کثیر ہے اور ان کے علاقے بھی وسیع ہیں حالانکہ ہمارے اسلاف نے اسی قرآن کے ذریعے حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں وہ تاریخ اور مؤرخین کے لیے تعجب کا مرکز تھے اور ہیں۔ حالانکہ ہمارے اسلاف تعداد میں بھی کم تھے ان کی زمین بھی تنگ تھی زندگی بھی کھردری تھی اور ان کے پاس قرآن کے نسخے اور مصاحف بھی آسانی سے میسر نہ تھے۔ اور ان کے حفاظ بھی اتنی زیادہ کثرت کے ساتھ نہیں تھے۔

ہاں البتہ اس میں راز یہ ہے کہ انھوں نے قرآن پاک پڑھنے اور اس کی ہدایات کے موتی نکالنے میں بھرپور محنت کی۔ وہ اس بلند ثقافت پر اپنی فطری صلاحیتوں، عربی مہارات سلیمہ کے ذریعے مدد طلب کرتے نیز ان چیزوں سے بھی مدد طلب کرتے جنھیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے اقوال، اعمال، اخلاق اور احوال کے ذریعے کھولا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ۝ ﴾ (النحل: ۴۴)

"اور ہم نے آپ کے پاس ذکر کو نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کو واضح کریں کہ ان کی طرف کیا اترا اور شاید وہ غور و فکر کریں۔"

اس وجہ سے ان کا سب سے بڑا غم اور فکر قرآن کریم تھا وہ اسے حفظ کرتے اور حفظ سے پہلے اسے سمجھتے اور اس کی تعلیمات پر باریکی سے عمل کرتے اور جاگتے ہوئے اس کی ہدایت سے ہدایت حاصل کرتے تھے۔

صرف اسی وجہ سے ان کی ارواح صاف ہوگئیں ان کے نفوس پاکیزہ ہو گئے اور ان کے آثار بلند ہو گئے اس لیے کہ اس وجود میں روح انسانی قوی ترین چیز ہے جب وہ صاف اور مہذب ہوگئی اس کی توجیہ اچھی ہوگئی اور وہ متادب ہوگئی تو وہ انتہائی حیرت انگیز چیزیں وجود میں لاتی ہے:

﴿ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝ ﴾ (آل عمران: ۱۹۵)

"اور اللہ تعالیٰ کے پاس عمدہ ثواب ہے۔"

اسی طرح امت محمدیہ بھی ہدایت وارشاد، عالم کی نجات اور اصلاح بشر کے لیے انتہائی حیرت انگریز چیزیں وجود میں لائی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے نصرت، تائید، غلبہ اور کامیابی لکھ دی حتیٰ کہ اس زمانے میں دعوت حق اور اصلاح کے ساتھ دشمنی رکھنے والی دو قوی ترین حکومتوں یعنی مشرق میں فارس اور مغرب میں روم پر بھی۔ اُس کو تو اسی کی سرکشی توڑ کر اور اس کے قبیلوں کو مسلمان کر کے لوح

وجود سے ہی مٹا دیا اور اس کے قبضہ میں جتنے مشرقی ممالک اور بہت سے قبیلے تھے سب چھین لیے پھر دنیا ان کی مطیع بن گئی اور انھوں نے بعض یورپی ممالک پر قبضہ کرلیا اور ان میں انھوں نے مضبوط بنیاد والی عربی حکومت قائم کرلی جو دنیا کی رونق اور زندگی کی زینت بن گئی اور اسی سے یورپی قبیلوں پر نور پھیلا۔

جبکہ آج کے اکثر مسلمان؟ انھوں نے اپنی سوگ کی محفلوں، قبرستانوں اور گھروں میں قرآن پاک کے الفاظ دہرانے اور اس کے سروں کو گانے کے طرز پر اکتفاء کرلیا وہ برکت کے طور پر گھروں میں اٹھا کر مصاحف لے جاتے ہیں یا گھروں میں رکھ دیتے ہیں اور اس بات کو بھول بیٹھے کہ برکت عظمی اس میں تدبر اور غور کرنے اس کی طرف دھیان دینے اور اس کی ہدایت اور آداب سے استفادہ کرنے اور پھر اس کے اوامر و مرضیات پر کاربند رہنے اور اس کے اسباب ناراضگی اور نواہی سے دور رہنے میں مضمر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَ لِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ ﴾ (ص:۲۹)

"یہ ایک بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا تا کہ لوگ اس کے آیات میں تدبر کریں اور سمجھ والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔"

نیز فرمایا کہ:

﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝ ﴾ (محمد:۲۴)

"کیا یہ قرآن پاک میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔"

نیز اللہ جل ذکرہ فرماتا ہے کہ:

﴿ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ ﴾ (القمر:۱۷)

"تحقیق ہم نے قرآن کو آسان کیا نصیحت کے لیے تو کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا۔"

آج کے مسلمان اس پیاسے کی طرح ہیں جو پیاس کی وجہ سے مر رہا ہے حالانکہ پانی اس کے سامنے موجود ہے اس حیوان کی طرح ہیں جو اندھے پن کی وجہ سے مر رہا ہے اور روشنی اس کے سامنے ہے جو اسے راستہ دکھلا رہی ہے۔ بشرطیکہ وہ آنکھ کھولے۔

﴿ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝ ﴾ (الحج:۱۱)

"یہ کھلم کھلا خسارہ ہے۔"

خبردار اس امت کی اصلاح اسی طریقے سے ہوگی جس سے ان کے پہلوں کی اصلاح ہوئی اور وہ یہ کہ یہ کتاب اللہ کی طرف لوٹ آئیں اس سے سیدھے راستے کی رہنمائی طلب کریں اور ہدایت طلب کریں اور اسے اپنے نفوس میں مستحکم کریں اور اپنے سے متعلقہ ہر چیز میں مستحکم کریں جیسے ہمارے پہلے آباء اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے تھے کہ اپنی مجالس، مساجد، محافل اور گھروں میں اس میں غور و فکر کرتے نیز اپنی نفلی فرضی نمازوں میں بھی اس کی تلاوت کرتے نیز جب لوگ سو رہے ہوتے تو وہ لوگ اپنی تہجد میں اس کا

اہتمام کرتے یہاں تک کہ اس کے حیران کن اثرات جلد ہی ان میں ظاہر ہو گئے جس نے ان کے نفوس کو بلند کیا اور انھیں بت پرستی کے گڑھے سے نکال لیا اور ان کی ہمتوں کو بلند کیا، ان کے اخلاق کو مہذب کیا اور عالم وجود کی قوت اور اس کے منافع سے انتفاع کی طرف ان کی رہنمائی کی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انہوں نے علوم وفنون اور صنعتوں میں مہارت حاصل کر لی اسی طرح اخلاق آداب اصلاح اور ارشاد میں بھی وہ لوگ ماہر ہو گئے اور اس انتہاء کو پہنچ گئے کہ انھوں نے اس میں دنیا کی تمام قوموں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حتیٰ کہ کسی مغربی فلسفی نے اپنی کتاب "تطوّر الامم" میں کہا کہ: "بے شک فنون کی مہارت کا کسی بھی امت میں مستحکم ہونا تین مرحلوں کے بغیر ممکن نہیں۔ ① تقلید کا مرحلہ ② درمیانی مرحلہ ③ استقلال کا مرحلہ اور صرف عرب اس سے مستثنیٰ ہیں کہ ان میں فنون کی مہارت صرف ایک طبقہ میں ہی مستحکم ہو گئی۔

سیوطی رحمہ اللہ نے تفسیر کی حاجت کے بیان میں فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: "قرآن صرف عربی زبان میں نازل ہوا اور عربوں کے فصیح ترین زمانے میں نازل ہوا اس لیے وہ لوگ اس کے ظاہر کو بھی جانتے تھے اور اس کے احکام کو بھی جانتے تھے۔

جبکہ اس کے باطنی دقائق بحث ونظر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے بغیر ان پر ظاہر نہیں ہوئے جیسے انھوں نے کہا کہ:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ (الانعام: ۸۲)

"جنھوں نے ایمان قبول کیا اور اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ ملتبس نہیں کیا۔"

اس آیت کے نزول کے وقت سوال کیا کہ: "ہم میں سے کس نے اپنے اوپر ظلم نہیں کیا؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک بتلا کر اس کی تفسیر کر دی اور اس کی دلیل میں آیت ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ (لقمان: ۱۳) (بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے) پڑھی۔

اسی طرح جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

((من نوقش الحساب عذب)).

"جس سے حساب لیا گیا وہ عذاب میں گرفتار ہو گیا۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کے بارے میں سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝ وَّ يَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝﴾ (الانشقاق: ۸، ۹)

"عنقریب اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ اپنے گھر والوں کی طرف خوش وخرم لوٹے گا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ عرض ہو گا۔ اسی طرح خیط الابیض اور خیط الاسود کے بارے میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے اور ہم ان چیزوں کے ان سے بھی بڑھ کر محتاج ہیں بلکہ تفسیر کے سب سے زیادہ محتاج ہیں اس لیے کہ ہم لغت کے مدارک اور اس کے اسرار کو سیکھے بغیر قاصر ہیں۔

گزشتہ بالاتحریر سے واضح ہوتا ہے کہ تفسیر کا فائدہ نصیحت اور عبرت حاصل کرنا اور عقائد، عبادات، معاملات، اور اخلاق، میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو پہچاننا ہے تاکہ افراد اور جماعتیں دنیا وآخرت کی بھلائی پا سکیں۔ (آمین)

اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ علم علوم دینیہ اور علوم عربیہ میں سب سے زیادہ اشرف ہے۔

یہ اس کے بلند موضوع اور عظیم فائدہ کی بناء پر ہے۔

اس کا نام علم تفسیر رکھا گیا اس لیے کہ اس میں وضاحت اور بیان ہے اور اس نام کے ساتھ صرف یہی خاص ہے باقی علوم کو یہ نام نہیں دیا گیا حالانکہ وہ تمام علوم وضاحت و بیان پر مشتمل ہیں۔ اس لیے کہ یہ جلیل القدر ہے اور اس میں زیادہ صلاحیت کی ضرورت ہے اور اس میں مقصود اللہ تعالیٰ کے کلام سے اس کی مراد کی وضاحت ہے گویا کہ تفسیر صرف یہی ایک ہے باقی نہیں۔

تفسیر کی اقسام ✿ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وارد ہے کہ تفسیر کی چار اقسام ہیں:

① حلال وحرام جس کی جہالت کا عذر کسی کی طرف سے قبول نہیں۔

② وہ تفسیر جسے عرب لوگ اپنی زبان سے بیان کریں۔

③ وہ تفسیر جسے علماء بیان کریں۔

④ وہ تفسیر جسے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

زرکشی رحمہ اللہ نے "البرھان" میں فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "یہ تقسیم صحیح ہے" وہ تفسیر جسے عرب اپنی زبان سے بیان کرتے ہیں اس کا تعلق ان کی زبان یعنی لغت اور اعراب کے ساتھ ہے اور لغت سے مراد اس کے معانی کو جاننا اور اس کے اسماء کے مسمیات کو جاننا۔ مفسر پر لازم ہیں قاری پر نہیں پھر اس کے الفاظ جن معانی کو متضمن ہیں اگر وہ عمل کو واجب کرتے ہیں علم کو نہیں تو اس میں ایک یا دو کی خبر بھی کافی ہے اور ایک یا دو شعروں سے استشہاد بھی کافی ہے اور اگر وہ علم (یعنی اعتقاد) کو واجب کرتے ہیں تو اس میں یہ کافی نہیں بلکہ ان الفاظ کا مستفیض ہونا اور اس کے شواہد کے طور پر اشعار کا کثرت سے ہونا ضروری ہے۔ اور اعراب کی بات یہ ہے کہ اگر اعراب کا اختلاف معنی کو بدل دے تو مفسر اور قاری دونوں کے لیے اس کا سیکھنا ضروری ہے تاکہ مفسر اس کے ذریعے حکم کی معرفت تک پہنچ جائے اور قاری غلطی سے بچ جائے اور اگر وہ معنی کو نہ بدلے تو قاری کے لیے اس کا جاننا ضروری ہے تاکہ وہ غلطی سے بچ جائے اور مفسر کے لیے اس کا جاننا ضروری نہیں اس لیے کہ اس کے بغیر بھی وہ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اور تفسیر کی وہ قسم جس کی جہالت کا عذر کسی سے قبول نہ ہوگا اس کے معانی کی وہ معرفت ہے جو ان نصوص سے فوراً مفہوم ہوتی ہے جو نصوص احکام کی شریعت اور توحید کے دلائل کو متضمن ہیں۔ جو لفظ ایک واضح اور جلی معنی پر دلالت کرتا ہے اور اس کے بارے میں واضح معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہی ہے اس قسم کے ساتھ تاویل ملتبس نہیں ہوتی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (محمد: ۱۹) "تو جان کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔" سے ہر شخص توحید کے معنی کا ادراک کرتا ہے کہ الوہیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اگرچہ اسے معلوم نہ ہو کہ "لا" لغت میں نفی کے لیے موضوع ہے اور "الا" اثبات کے لیے وضع کیا گیا ہے اور اس کلام کا مقتضی حصر ہے۔ اسی طرح ہر شخص بدیہی طور پر جانتا ہے کہ ﴿وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (البقرۃ: ۴۳) وغیرہ کا مقتضی مامور بہ کے ایجاب کا طلب کرنا ہے اگرچہ وہ نہ جانتا ہو کہ "اِفْعَلْ" وجوب کے لیے ہوتا ہے۔

اور وہ تفسیر جسے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا وہ چیزیں ہیں جو غیوب کے قائم مقام ہیں جیسے وہ آیات جن میں قیامت یا روح کا ذکر ہے یا حروف مقطعات وغیرہ۔ اور اہل حق کے نزدیک قرآن پاک کے تمام متشابہات ان کی تفسیر میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں اور ان تک رسائی کا طریقہ توقیف کے علاوہ کوئی نہیں وہ توقیف قرآن پاک کی نص ہو یا حدیث کی عبارت یا اس کی تاویل پر

اجماعِ اُمت ہو۔

اور تفسیر جسے علماء جانتے ہیں اور وہ ان کے اجتہاد کی طرف لوٹتی ہے یہ وہ تفسیر ہے جس پر اکثر تاویل کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ احکام کا استنباط، عموم کی تخصیص اور ہر اس لفظ کی تخصیص جو دو یا دو سے زیادہ معانی کا احتمال رکھتا ہے تفسیر کی اس قسم میں اجتہاد کرنا غیر علماء کے لیے جائز نہیں اس لیے کہ اس میں صرف دلائل وشواہد پر اعتماد کیا جائے گا محض رائے پر نہیں ... الخ ہو۔ لیکن انھوں نے اس میں اقسام کی اس ترتیب کا التزام نہیں کیا جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ لیکن اس میں کوئی نقصان والی بات نہیں کیونکہ انھوں نے چار اقسام کی تعداد کو پورا کر دیا ہے۔

بعض حضرات نے تفسیر کو ایک اور اعتبار سے تین اقسام میں منقسم کیا۔

① تفسیر بالروایۃ اسے تفسیر بالماثور بھی کہتے ہیں۔
② تفسیر بالدرایۃ اسے تفسیر بالرائے بھی کہتے ہیں۔
③ تفسیر بالاشارہ اسے تفسیر اشاری بھی کہتے ہیں۔

ہم ان سب کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تفسیر ماثور: کتاب اللہ میں اللہ تعالیٰ کی مراد کو بیان کرنے کے لیے وہ تفسیر جو قرآن، سنت یا صحابہ کے کلام میں آئی ہے۔ جیسے:

① قرآن پاک میں آئی ہوئی تفسیر کی مثال:

﴿وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ (البقرۃ: ۱۸۷)

"کھاؤ اور پیو حتی کہ تمہارے لیے فجر کا سیاہ دھاگا سفید دھاگے سے ظاہر ہو جائے۔"

اس آیت میں ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ کا لفظ اسے قبل آنے والے لفظ ﴿الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ﴾ (سفید دھاگا) کی مراد کے لیے بیان اور شرح ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (الاعراف: ۲۳)

"ان دونوں نے کہا کہ اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اگر آپ نے ہمیں معاف نہ کیا اور آپ نے ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم فساد پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔"

تفسیر کی بعض وجوہ کے مطابق یہ الفاظ اس سے پہلے آنے والے لفظ "کلمات" کے لیے بیان ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل قول میں آئے ہیں۔

﴿فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ (البقرۃ: ۳۷)

"حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھ لیے جس پر اس نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ﴾ (المائدہ:۳)

"اور تمہارے اوپر مراد، خون اور خنزیر کا گوشت حرام کر دیا گیا۔"

یہ اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ﴾ (المائدہ:۱)

"تمہارے لیے جو پاؤں کو حلال کر دیا گیا سوائے ان کے جن کی تمہارے سامنے تلاوت کی گئی۔"

میں ﴿إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ﴾ کا بیان ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَآمَنْتُمْ بِرُسُلِي وَعَزَّرْتُمُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ﴾ (المائدہ:۱۲)

"اگر تم نماز قائم کرو گے زکوٰۃ ادا کرو گے اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی نصرت کرو گے اور اللہ تعالیٰ کو قرضہ حسنہ دو گے تو میں ضرور تمہاری برائیوں کو دور کروں گا۔"

یہ اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ (البقرۃ:۴۰)

"تم میرا معاہدہ پورا کرو میں تمہارا معاہدہ پورا کروں گا۔"

میں پائے جانے والے دو معاہدوں کا بیان ہے۔ اوّل اوّل کے لیے اور ثانی ثانی کے لیے۔

اور اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ ۝ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝﴾ (الطارق:۲،۳)

"آپ کو کیا معلوم کہ رات کو آنے والا کیا ہے؟ چمکتا ہوا ستارہ ہے۔"

اس میں ﴿النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝﴾ اس سے پہلے آنے والے "الطارق" کا بیان ہے اور اس کے علاوہ بہت سی مثالیں ہیں جو قرآن پاک میں تدبر کرنے سے معلوم ہوتی ہیں۔

② **سنت رسول میں قرآن پاک کی شرح آنے والی مثالیں** ● آپ ﷺ نے:

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ ۝﴾ (الانعام:۸۲)

"جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ غلط نہیں کیا یہی لوگ ہیں جن کا ایمان ہے اور یہ لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔"

میں آنے والے لفظ ظلم کی تفسیر شرک کے ساتھ کی اور اپنی اس تفسیر کی تائید اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ۝﴾ (لقمان:۱۳)

"بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔"

سے کی اور جب آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖۙ۝ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًاۙ۝ وَّ یَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًاؕ۝﴾ (الانشقاق:۷،۹)

"جس شخص کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دے دیا گیا تو عنقریب اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ اپنے گھر والوں کی طرف خوشی وخرم ہو کر واپس ہوگا۔"

اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ عرض حساب ہوگا۔ اس میں آپ ﷺ نے "حساب یسیر" کی تفسیر کی۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾ (الانفال:۶۰)

"اور ان کے لیے تیار کرو جہاں تک تم سے ہو سکے قوت سے۔"

میں "قوۃ" کی تفسیر "رمی" (تیر اندازی) سے کی۔ اور صحیح کتب السنۃ میں اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں۔

اور ان دونوں قسموں کے قبول ہونے میں کوئی شک نہیں۔ پہلی قسم تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی مراد کو دوسری کی بنسبت زیادہ جانتا ہے اور سب سے زیادہ سچی ترین بات اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور دوسری قسم اس لیے کہ سب سے بہترین ہدایت سیدنا محمد ﷺ کی ہدایت ہے اور آپ ﷺ کا فرضِ منصبی بیان وشرح ہے۔ نیز ہم آپ ﷺ کی عصمت کا بھی قطعی فیصلہ کرتے ہیں نیز اس باب کا بھی کہ آپ ﷺ کو الہام خداوندی بھی میسر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ﴾ (النحل:۴۴)

"اور ہم نے آپ کی طرف ذکر کو نازل کیا تا کہ آپ لوگوں کو کھول کھول کر بیان کر دیں کہ ان کی طرف کیا نازل ہوا ہے۔"

③ اب تیسری قسم باقی رہ گئی وہ یہ کہ جس تفسیر کا صحابہ رضی اللہ عنہم سے وارد ہونا ثابت ہے مستدرک حاکم میں ہے کہ:

"بے شک صحابی کی تفسیر جس نے وحی کا مشاہدہ کیا قرآن کا مشاہدہ کیا اس کا حکم بھی مرفوع ہے۔"

حاکم نے اسی طرح مطلق فرمایا ہے جبکہ بعض حضرات نے اس میں قید لگائی ہے کہ: جو نزول وغیرہ کے بیان میں ہو اور اس میں رائے کی گنجائش نہ ہو (تو اس کا حکم مرفوع ہوگا) ورنہ وہ موقوف ہوگا۔

اور حاکم اور ان کے موافقین کا نظریہ ہے کہ: "صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وحی کا مشاہدہ کیا اور اسباب نزول کا جاننا اور ان کا معائنہ کیا جو ان کے لیے کتاب اللہ کے معانی سے نقاب کو ہٹا دیتے ہیں اور ان کی فطرت سلیمہ، نفوس کی پاکیزگی، فصاحت وبلاغت میں ان کے مرتبہ کا بلند ہونا یہ ایسی چیزیں ہیں جو انھیں کلام اللہ کے صحیح فہم پر قادر بنا دیتی ہیں اور انھیں اللہ تعالیٰ کے کلام سے اس کی مراد اور اس کی ہدایت پر یقین کرنے والا بنا دیتی ہیں۔

اور جو تفسیر تابعین سے منقول ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے بعض نے اسے بھی تفسیر بالماثور میں شمار کیا ہے اس لیے کہ غالب یہ ہے کہ انھوں نے اسے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہی حاصل کیا اور بعض حضرات نے اسے تفسیر بالرائے میں شمار کیا۔ تفسیر ابن جریر میں

قرآن کریم کے بیان میں صحابہ وتابعین کی نقلیں کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔

لیکن حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: "تفسیر بالماثور راویوں تک اکثر یہود زنادقہ، فارس اور اہل کتاب مسلمانوں کے ذریعے پہنچی ہے۔" کسی نے کہا کہ اس کا بیشتر حصہ انبیاء کرام علیہم السلام کے اپنی قوم کے ساتھ قصے ہیں اور وہ چیزیں ہیں جن کا تعلق ان کی کتابوں اور معجزات کے ساتھ ہے نیز ان کے علاوہ لوگوں کی تاریخ جیسے اصحاب کہف، "ارم ذات العماد" والوں کا شہر، بابل کا جادو، عوج بن عنق وغیرہ اور قیامت کی نشانیوں اور علامات میں اور اس میں اور اس کے بعد پیش آنے والے امور یہ اکثر خرافات اور جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں ہیں ان میں راویوں نے ان کی تصدیق کی حتیٰ کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی ان کی تصدیق کی۔ اسی وجہ سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: "تین چیزوں کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ① تفسیر ② جنگیں ③ مغازی۔

اور ضروری ہے کہ روایات مفیدہ کو ایک مستقل کتابوں میں جمع کیا جائے جیسے حدیث کی بعض کتابیں ہیں اور ان کی سندوں کی قیمت کو بھی۔ پھر تفسیر میں جو صحیح ہیں انھیں بغیر سند کے ذکر کیا جائے جیسا کہ حدیث کو فقہ کی کتابوں میں ذکر کیا جاتا ہے لیکن وہ اپنے ماخذ کی طرف منسوب ہوتی ہیں.... الخ۔

مفسرین صحابہ رضی اللہ عنہم

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "الاتقان" میں فرمایا کہ: "صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تفسیر میں دس صحابہ مشہور ہوئے چار خلفاء اربعہ، ابن مسعود، ابن عباس، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ابوموسیٰ اشعری اور عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہم)

خلفاء اربعہ میں سے سب سے زیادہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے تفسیر مروی ہے اور باقی خلفاء ثلثہ سے بہت ہی کم روایتیں ہیں۔ اس کا سبب ان کی وفات کا تقدم ہے۔

تین حضرات یعنی ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم سے تفسیر کی روایات کم ہونے میں اس سبب کا مطلب یہ ہے کہ یہ حضرات اس ماحول میں تھے کہ اس ماحول والے اکثر کتاب اللہ کے عالم تھے، قرآن پاک کے اسرار کو جانتے تھے اس کے معانی اور احکام کو سمجھتے تھے اور ان میں عربیت کے خصائص کامل تھے جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے بعد زندہ رہے حتیٰ کہ ان کے زمانے میں لوگوں کو کثرت کے ساتھ ضرورت پیش آتی کہ کوئی ان کے لیے قرآن پاک کی تفسیر کرے یہ اسلام کے دائرہ سلطنت کے وسیع ہونے کی وجہ سے ہوا نیز یہ کہ عجمی لوگ اس نئے دین میں داخل ہو گئے قریب تھا کہ ان سے عربیت کے خصائص پگھل جاتے نیز صحابہ کی اولاد میں سے ایک نسل بھی وجود میں آ گئی جنھیں صحابہ رضی اللہ عنہم کے علم کی ضرورت تھی یقیناً جو کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ دوسروں سے زیادہ ہے مزید یہ کہ وہ فکری شادابی، وسعت علم اور اشراق قلب میں بھی ممتاز تھے۔ مزید یہ بھی کہ ان کے ذمہ مشاغل خلافت کے اہم امور اور ان کے تحت حکومت کو چلانا بھی تھا۔

حضرت معمر وہب بن عبداللہ بن ابوالطفیل سے روایت کرتے ہیں کہ: "میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا وہ خطبہ دے رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ مجھ سے پوچھو اللہ کی قسم! تم مجھ سے جو کچھ بھی پوچھو گے میں تمہیں ضرور بتاؤں گا اور مجھ سے کتاب اللہ

کے بارے میں پوچھو اللہ کی قسم! کوئی بھی آیت ہو میں اسے جانتا ہوں کہ وہ رات کو نازل ہوئی یا دن میں اور پھر نرم زمین میں نازل ہوئی یا پہاڑ میں؟

انھی کی ایک روایت میں ہے کہ فرمایا: ”اللہ کی قسم! کوئی بھی آیت نازل نہیں ہوئی مگر میں جانتا ہوں کہ وہ کسی کے بارے میں نازل ہوئی، اور کہاں نازل ہوئی میرے رب نے مجھے عقلمند دل اور سوال کرنے والی زبان عطا کی۔

اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی کثرت کے ساتھ روایات مروی ہیں آپ کو ان کا مرتبہ اور ان کی جلالت قدر پہچاننے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ابونعیم نے ابوالبختری سے روایت کیا کہ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہمیں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں بتلایئے انھوں نے فرمایا کہ اس نے قرآن وسنت کا علم حاصل کیا پھر اس میں کمال حاصل کرلیا اور یہ شخص علم کے اعتبار سے کافی ہے۔

جبکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ قرآن پاک کے ترجمان ہیں جس کی شہادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی چنانچہ حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت ان عباس رضی اللہ عنہ نے مجھے فرمایا کہ: ”قرآن کے بہترین ترجمان تم ہو۔“ نیز بیہقی نے ”الدلائل“ میں حضرات ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ: ”قرآن پاک کا سب سے اچھا ترجمان عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہیں۔“ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول کے ذریعے انھیں دعا دی۔

((اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيْلَ)).

”اے اللہ! اسے دین میں تفقہ اور تاویل کا علم سکھا۔“

اور روایت ہے کہ ایک آدمی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور وہ آسمان وزمین کے بارے میں سوال کرنے لگا کہ وہ پہلے بند تھے پھر ہم نے انھیں کھول دیا یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿اَوَ لَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا﴾ (الانبیاء: ۳۰)

”کیا انھوں نے نہیں دیکھ کہ زمین وآسمان بند تھے پھر ہم نے انھیں کھول دیا۔“

کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس چلے جاؤ پھر آ کر مجھے بتلاؤ! وہ گیا اور ان سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ: ”آسمان بند تھے بارش نہیں برساتے تھے اور زمین بند تھی یعنی اگاتی نہیں تھی یہ بارش کے ساتھ پھٹا اور یہ اگانے کے ساتھ پھٹی۔“ وہ شخص واپس حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف لوٹا اور انھیں بتلایا تو انھوں نے فرمایا کہ میں کہا کرتا تھا کہ مجھے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی قرآن کی تفسیر پر جرأت اچھی نہیں لگتی تھی لیکن مجھے اب پتہ چلا کہ وہ علم دیے گئے ہیں۔

لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف جو تفسیر منسوب ہو اس کا احاطہ بہت ضروری ہے اس لیے کہ اس میں بہت سی ملاوٹ ہو چکی ہے اور بہت سی من گھڑت چیزیں اس میں مل گئی ہیں۔

اسی طرح حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بن قیس انصاری ہیں جو کاتبین وحی میں سے ایک ہیں یہ کثرت سے تفسیر بیان کرتے اور خوب نمایاں اور ممتاز تھے جیسا کہ قرأت میں مشہور وممتاز تھے تفسیر میں ابوجعفر رازی نے ربیع بن انس سے اور انھوں نے ابوالعالیہ

سے دور انھوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا اور اس کی سند بھی صحیح ہے۔

اور دس میں سے باقی حضرات، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہیں لیکن یہ حضرات تفسیر میں مشہور ہونے کے باوجود پہلے چار سے کم تھے۔

ان دس کے علاوہ بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت سے کچھ تفسیر منقول ہے لیکن وہ کم ہے ان میں سے حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت جابر رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، اور اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔

⑤ تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ

ان سے روایت لینا اور اس میں راویوں کا اختلاف ❁ تفسیر کے اعتبار سے سب سے زیادہ ابن عباس رضی اللہ عنہ ہیں اس لیے کہ آپ جان چکے کہ وہ ترجمان القرآن ہیں نیز ان کا زمانہ بھی موخر تھے یہاں تک کہ جب اسلام پھیل گیا لوگوں کو ان سے تفسیر حاصل کرنے کی شدید ضرورت پیش آئی نیز یہ وجہ بھی تھی کہ وہ نشر واشاعت دعوت اور تبلیغ کے لیے فارغ اور الگ تھلگ تھے۔ انھیں خلافت کا مسئلہ درپیش نہ تھا اور نہ ہی سیاسی تصرف اور رعایا کے احوال کی تدبیر کی مشغولیت تھی لیکن ان کی روایت کے مختلف درجات ہیں۔

سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "الاتقان" میں فرمایا کہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اتنی تفسیریں منقول ہیں جنھیں شمار نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ ان کی روایات کثرت کے ساتھ ہیں اور ان کی سندیں مختلف ہیں، سب سے عمدہ سند علی بن ابو طلحہ ہاشمی کی سند ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: "مصر میں ایک صحیفہ تھا جس کا تعلق تفسیر کے ساتھ تھا اسے علی بن ابو طلحہ نے روایت کیا کہ اگر کوئی شخص اس کا قصد کر کے مصر کا سفر کرتا تو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔" اسے ابو جعفر نحاس نے سند کے ساتھ بیان کیا۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ نسخہ لیث کے کاتب ابو صالح کے پاس تھا جسے انھوں نے معاویہ بن ابو صالح سے روایت کیا انھوں نے علی بن ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے اور انھوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے۔ امام بخاری نے بھی اپنی صحیح میں اس پر کثرت کے ساتھ اعتماد کیا جبکہ وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کر کے تشریح کرتے ہیں۔ ایک قوم نے کہا کہ ابن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے تفسیر نہیں سنی بلکہ انھوں نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یا حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی۔ اس کے بعد ابن جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب واسطہ معلوم ہو گیا اور وہ ثقہ ہیں تو اس میں کوئی نقصان نہیں۔

ابن جریر طبری، ابن ابی حاتم اور ابن المنذر نے بھی اس سے بہت کچھ نقل کیا ہے لیکن ان کے اور ابو صالح کے درمیان کئی واسطے ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی عمدہ ترین سندوں میں سے قیس عن عطاء بن السائب عن سعید بن جبیر عن ابن عباس کی سند بھی ہے اور یہ سند شیخین کی شرائط کے مطابق صحیح ہے اسی طرح ابن اسحاق عن محمد بن ابی محمد مولی آل زید بن ثابت عن عکرمہ اور سعید بن جبیر عن ابن عباس سے بھی ہے اسی طرح اس کی سند حسن ہے اور اس میں ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بہت کچھ نقل کیا ہے۔

سب سے ضعیف ترین سند کلبی عن ابی صالح عن ابن عباس ہے اسی طرح مقاتل بن سلیمان کی سند ہے اور ضحاک بن مزاحم

کی سند بھی ہے جو کہ منقطع ہے کیونکہ ضحاک کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں ہے بالجملہ امام شافعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے تقریباً سو احادیث کے علاوہ کچھ بھی ثابت نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے علاوہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایت ● ہم آپ کو تفسیر کے بارے میں تین بڑے بڑے علماء کے بارے میں بتلاتے ہیں جو ابن عباس رضی اللہ عنہ کے علاوہ ہیں۔

① **حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ** ● یہ روئے زمین پر ہونے والے اپنے علاوہ چھ مسلمانوں میں سے چھٹے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جوتے پہناتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور آگے آگے چلتے تھے۔

اسی وجہ سے انہیں صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ان علماء میں شمار کیا گیا جو کتاب اللہ، اس کے محکم، متشابہ، حلال وحرام کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔

"الاتقان" میں فرمایا کہ: "ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے تفسیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ روایات مروی ہیں۔

ابن جریر وغیرہ نے نقل کیا کہ انھوں نے فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں اللہ تعالیٰ کی کوئی بھی آیت نازل نہیں ہوئی جسے میں نہ جانتا ہوں کہ وہ کس کے بارے میں اور کہاں نازل ہوئی؟ اگر مجھے پتا چل جاتا کہ کوئی شخص کتاب اللہ مجھ سے زیادہ جانتا ہے اور اس تک سفر کر کے جایا جا سکتا ہے تو میں اس کے مکان پر پہنچ جاتا۔ ان سے بہت لوگوں نے روایت کیا لیکن علماء نے نقد وجرح کر کے ان کی چھان بین کی ہے۔

② **حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ** ● رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کے واسطے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد بھی ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چوتھے خلیفہ بھی ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے کچھ بڑے ہوئے اور اسلام میں داخل ہو گئے کبھی بھی کسی بت کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوئے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گہرے تعلق کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن دماغی، وسعت مادہ اور وسعت علمی میں گہرا اثر تھا اور اس فطرت صافیہ، ذکاوتِ نادرہ اور عقل موہوبہ کے کیا کہنے حتی کہ حل المشکلات میں وہ ضرب المثل تھے" کسی نے کہا کہ کوئی قضیہ ہو اور اس کے لیے کوئی ابوحسن نہ ہو؟" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: "میں نے قرآن کی تفسیر جو بھی حاصل کی وہ علی بن طالب سے حاصل کی۔" آپ کے لیے ترجمان القرآن کی یہ شہادت کافی ہے۔

لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شیعوں کی وجہ سے ابتلاء ہوا انھوں نے ان کی محبت میں اسراف اور اس کی تعیین میں حد سے تجاوز کر گئے اور انھوں نے ان کی طرف ایسی ایسی باتیں منسوب کر دیں جن سے وہ بری تھے اور ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کیں جو انھوں نے نہیں کہیں اسی وجہ سے یہ لحاظ کیا جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مرویات میں بہت سی ملاوٹیں ہیں روایات کی جانچ پڑتال کرنے والے ماہرین نے ان کا تعاقب کیا اور صحیح اور غیر صحیح کو علیحدہ علیحدہ کر دیا۔

﴿وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ ﴿١٤﴾﴾ (الفاطر: ۱۴)

"خبر رکھنے والے کی طرح آپ کو کوئی بھی نہیں بتلائے گا۔"

③ **حضرت اُبی بن کعب انصاری رضی اللہ عنہ** ● یہ بڑے بڑے قراء اور کاتبین وحی میں سے تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جو بدر

میں حاضر ہوئے ان کے بارے میں وارد ہوا کہ کتاب اللہ کے سب سے بڑے قاری حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ تھے۔" ابوجعفر رازی نے ربیع بن انس سے انھوں نے ابو العالیہ سے اور انھوں نے ابی بن کعب سے تفسیر کا ایک بہت بڑا نسخہ روایت کیا۔ ابن جریر اور ابن حاتم رحمہما اللہ نے اس میں سے بہت کچھ نقل کیا اسی طرح حاکم نے مستدرک میں اور امام احمد نے مسند میں بھی بہت کچھ نقل کیا ہے۔

⑦ تابعین میں سے مفسرین کے طبقات اور ان کی روایات پر نقد و جرح

ہم تابعین کو تین طبقات پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ ① طبقہ اہل مکہ ② طبقہ اہل مدینہ ③ طبقہ اہل عراق۔

① طبقہ اہل مکہ تابعین میں سے اہل مکہ کا طبقہ تفسیر کو سب سے زیادہ جاننے والا تھا سیوطی رحمہ اللہ نے ابن تیمیہ سے نقل کیا کہ:

"سب سے زیادہ تفسیر جاننے والے اہل مکہ تھے اس لیے کہ وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے جیسے مجاہد، عطاء ابن رباح، عکرمہ مولی ابن عباس، سعید بن جبیر اور طاؤس رحمہم اللہ۔"

مجاہد یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے راویوں میں سے سب سے زیادہ ثقہ تھے اسی وجہ سے ان کی تفسیر پر امام شافعی اور بخاری وغیرہ جیسے اقطاب العلم اور ائمہ دین نے ان کی تفسیر پر اعتماد کیا۔ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: "جب آپ کے پاس مجاہد سے تفسیر آ جائے تو آپ کو یہی کافی ہے۔" فضیل بن میمون نے فرمایا کہ میں نے مجاہد کو فرماتے سنا کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے قرآن کو تیس مرتبہ پیش کیا۔ اور انھی سے روایت ہے کہ میں نے مصحف کو ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے تین مرتبہ پیش کیا اس کی ہر آیت پر توقف کرتا اور اس کے بارے میں سوال کرتا کہ کس کے بارے میں نازل ہوئی اور کیسے تھی۔

ان دونوں روایتوں میں تعارض نہیں ہے کیونکہ قلیل کی خبر کثیر کی خبر کے منافی نہیں ہے یہ بھی احتمال ہے کہ تیس مرتبہ پیش کرنا اس کے ضبط، تجوید اور حسن اداء کے لیے ہوا اور تین مرتبہ اس کی تفسیر معرفت اسرار و حکم اور اس کے احکام طلب کرنے کے لیے پیش کیا ہو۔ جیسا کہ اس پر ان کا قول: "اس کی ہر آیت پر توقف کرتا اور اس کے بارے میں سوال کرتا کہ کسی کے بارے میں اور کیسے نازل ہوئی۔" دلالت کرتا ہے۔

عطاء رحمہ اللہ اور سعید رحمہ اللہ ❁ ان میں سے ہر ایک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے میں ثقہ اور ثبت تھا سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: "تفسیر چار اشخاص سے حاصل کرو! سعید بن جبیر، مجاہد، عکرمہ، اور ضحاک۔ قتادہ نے فرمایا کہ: "تابعین میں سب سے زیادہ علم والے چار لوگ تھے عطاء بن ابی رباح سب سے زیادہ مناسک کو جانتے تھے، سعید بن جبیر سب سے زیادہ تفسیر جانتے تھے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے عطاء سے افضل کسی آدمی سے ملاقات نہیں کی۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کے مولیٰ عکرمہ ❁ ان کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: "عکرمہ سے بڑھ کر کتاب اللہ کو جاننے والا کوئی بھی نہیں بچا۔ اور عکرمہ نے فرمایا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتے اور مجھے قرآن و سنت سکھاتے تھے اور فرماتے تھے میں نے دو گتوں کے درمیان جو کچھ ہے سب کی تفسیر کی۔ (شاید ان کی مراد مصحف کے دو گتوں کے درمیان تھا) اور میں

تمہیں قرآن کے بارے میں کچھ بھی کہوں وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہوگا۔

طاؤس بن کیسان یمانی ● یہ علم وعمل والے افراد میں سے ہیں اور انھوں نے نبی کریم ﷺ کے تقریباً پچاس صحابہ رضی اللہ عنہم کو پایا۔ اور وارد ہوا ہے کہ انھوں نے بیت اللہ شریف کا حج چالیس مرتبہ کیا۔ آپ مستجاب الدعوات تھے۔

ان کے بارے میں ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: "میں طاؤس کو جنتی سمجھتا ہوں۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

② طبقہ اہل مدینہ

ان میں سے ایک زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ ہیں ان سے ان کے بیٹے عبدالرحمٰن اور دارالہجرت کا امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ نے علم حاصل کیا۔

نیز ان میں سے ایک ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں ان سے ربیع بن انس رضی اللہ عنہ نے علم حاصل کیا۔ اور ان میں سے ایک محمد بن کعب قرظی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں جن کے بارے میں ابن عون نے فرمایا کہ میں نے قرظی سے بڑھ کر قرآن پاک کی تاویل جاننے والا عالم کوئی نہیں دیکھا۔

③ طبقہ اہل عراق

مسروق بن اجدع یہ بہت پرہیزگار اور زاہد تھے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے صحبت یافتہ تھے ان کے بارے میں ابن معین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: "یہ ثقہ ہیں ان کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔"

قاضی شریح مشکل مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔

ان کی صدق روایت اور امانت کی وجہ سے شعبی اور ابو وائل وغیرہ ان سے روایت کرتے تھے۔

قتادہ بن دعامہ ● یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے راویوں میں سے ہیں ان کے ضبط اور حفظ کی شہادت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے دی۔ ابن المسیب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں فرمایا میں نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی بھی عراقی حافظے والا نہیں پایا۔ لیکن وہ قضاء وقدر میں بحث کرتے تھے اس لیے بعض لوگ ان سے روایت لینے میں تنگی محسوس کرتے تھے۔ کتب صحیحہ والے حضرات نے انھیں حجت مانا ہے۔

ابوسعید حسن بصری ● ابن سعد نے ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ ثقہ تھے مامون تھے عالم تھے اور جلیل القدر تھے نیز فصیح وجمیل، متقی و پرہیزگار تھے حتیٰ کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سید التابعین تھے۔

عطاء بن ابو مسلم خراسانی ● ان کی اصل بصرہ سے ہے لیکن انھوں نے خراسان میں داخل ہونے کے بعد وہیں قیام کر لیا اسی وجہ سے اس کی طرف منسوب ہوئے جلیل القدر علماء میں سے تھے لیکن انھیں حافظہ کی کمزوری کی شکایت تھی۔ اس لیے ان کی توثیق میں اختلاف ہے۔

مرہ ہمدانی کوفی ● ان کی کثرت عبادت کی وجہ سے انھیں "مرۃ الطیب" اور "مرۃ الخیر" کہا جاتا تھا انھوں نے حضرت ابی بن کعب اور حضرت عمر بن الخطاب وغیرہ صحابہ سے علم حاصل کیا اور ان سے شعبی نے روایت کی۔

یہ تابعین میں سے بڑے بڑے مفسرین ہیں ان کی آراء اور علوم سے قوت حاصل کی گئی ہے اس لیے کہ انھوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا۔

اور ان سے تبع تابعین نے علم حاصل کیا اور اسی طرح سلسلہ چلتے چلتے اللہ تعالیٰ کا دین، اس کی کتاب، اس کے علوم،

معارف سلیمہ کاملہ بطریق تلقی وتلقین نسل در نسل ہم تک پہنچے جو اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝﴾ (الحجر:۹)

"بے شک ہم نے ہی قرآن پاک کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔"

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس علم کو بعد میں آنے والے تمام لوگوں میں سے ان کے عادل لوگ نقل کریں گے۔ وہ غلو کرنے والوں کی تحریف اہلِ باطل کے طریقے اور جاہلین کی تاویل اس سے دور کریں گے۔

تابعین کی مرویات کی چھان بین ۞ تابعین سے مرویات ہیں چند اہم اعتبارات ملحوظ ہوتی ہیں جو اس میں طعن کو بھڑکاتی ہیں اور ان کی چھان بین کا تقاضا کرتی ہیں۔

① انھوں نے نبوت کا دور نہیں دیکھا اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کے انوار سے متشرف ہوئے ہیں لہٰذا ظن غالب یہ ہے کہ ان سے قرآن کی جو تفسیر مروی ہے وہ ان کی اپنی رائے سے ہی ہوگی اس لیے ان میں مرفوع کی قوت نہیں ہوگی۔

② ان میں صحیح اسناد نادر ہیں۔

③ ان کا اسرائیلیات اور ایسی خرافات پر مشتمل ہونا بعض اوقات ایرانی زنادقہ کی طرف سے شامل ہو جاتی ہیں یا بعض اہل کتاب میں سے ہونے والے مسلمانوں کی طرف سے آجاتی ہیں خواہ ان میں حسن نیت ہو یا سوء نیت ہو۔

روایت بالماثور کا ضعف اور اس کے اسباب

ہم جان چکے کہ روایت بالماثور تفسیر قرآن بالقرآن، تفسیر قرآن بالسنۃ اور تفسیر قرآن بالوقوف علی الصحابہ اور ایک روایت کے مطابق تفسیر قرآن بالموقوف علی التابعین پر مشتمل ہوتی ہے۔

تفسیر (یعنی قرآن کے ایک حصہ کی دوسرے حصے سے تفسیر کرنا) بعض القرآن ببعض اور تفسیر القرآن (قرآن پاک کی تفسیر سنت صحیحہ کے ساتھ جو نبی کریم ﷺ تک مرفوع ہو) بالسنۃ الصحیحہ المرفوعۃ الی النبی ﷺ کی وجاہت اور قبول ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے اور قرآن پاک کی تفسیر ایسی چیز سے کرنا جو صحابہ اور تابعین کی طرف منسوب ہوں اگر ان میں ضعف پیدا ہو جائے تو اس کی کئی اقسام ہیں۔

① اعدائے اسلام جیسے یہود اور ایرانیوں میں زندیقوں کی (اس میں) ملاوٹ ہے۔ اس لیے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ملاوٹ اور خود ساختگی کے ذریعے اس دین متین کو گرا دیں کیونکہ لڑائی اور طاقت کے ذریعے انتقام لینے کے حیلے کر کے تھک چکے تھے نیز دلیل وحجت سے بھی تنگ آچکے تھے۔

② حد سے تجاوز کرنے والوں نے اپنے تجاوز کی ترویج کے لیے اس میں جو چیزیں ملا دی ہیں جیسے شیعان علی جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف ایسی چیزیں منسوب کر دی ہیں کہ وہ ان سے بری ہیں اسی طرح وہ طفیلی جنھوں نے عباسیوں کی رسی میں آگ لگائی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دیں جن کی نسبت ان کی طرف صحیح نہیں

اس کی وجہ ان کی چاپلوسی اور دنیا کی خواہش تھی۔

③ صحیح کا غیر صحیح کے ساتھ خلط ہو جانا: بہت سے اقوال ہیں جو صحابہ یا تابعین کی طرف بغیر سند اور بغیر تحری کے منسوب ہو گئی ہیں۔ جو حق کے باطل کے ساتھ التباس کا باعث ہو سکتی ہیں۔ مزید یہ کہ جو رائے رکھتا ہو وہ ان پر سند کے ذکر کے بغیر ہی اعتماد کر لیتے تھے پھر ان کے بعد والے انھیں اس اعتبار پر نقل کر دیتے کہ اس کی کوئی دلیل ہے اور وہ اصل روایت کی تلاش میں اپنے آپ کو تکلیف نہیں دیتے تھے اور نہ ہی اس شخص کی بحث کرتے تھے جن کی طرف یہ قول منسوب ہے۔

④ یہ روایات اسرائیلیات سے بھری پڑی ہیں اور اکثر وہ خرافات ہیں جن کے بطلان پر دلیل قائم ہے اور ان میں سے بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن کا تعلق عقائد کے ساتھ ہے جن میں ظن سے کچھ لینا جائز نہیں اور نہ ہی ان میں اخبار آحاد کی روایت سے کچھ لینا جائز ہے۔ بلکہ ان میں قطعی دلیل کا ہونا ضروری ہے جیسا کہ وہ روایات جو قیامت کی علامات، اس کی ہولنا کی اور آخرت کے احوال کے بارے میں رونما ہوئی ہیں جو یہ بتلاتی ہیں کہ یہ اسلام کے عقائد ہیں۔

⑤ وہ امور جو اہل کتاب کے پاس موجود کتب سابقہ سے صحیح طور پر منقول ہوئی ہیں جیسے تورات اور انجیل۔ رسول اللہ ﷺ نے ان میں توقف کا حکم دیا کہ ہم ان کی تصدیق نہ کریں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ان کتابوں میں تحریف کر دی ہو اور ان کی تکذیب بھی نہ کریں۔ اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اسے محفوظ رکھا ہو۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ﴿اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ (آل عمران: ۲۳) "جنھیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا۔"

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: "تفسیر میں اختلاف کی دو اقسام ہیں ایک وہ ہے جن کی بنیاد محض نقل ہے اور دوسری وہ قسم ہے جو اس کے علاوہ کسی اور ذریعے سے معلوم ہو اور منقول یا تو معصوم سے منقول ہو گا یا غیر معصوم سے نیز بعض وہ ہیں جن کے صحیح اور غیر صحیح کی معرفت ممکن ہو گی اور بعض وہ ہیں جن کے صحیح یا غیر صحیح کی معرفت ناممکن ہو گی اور یہ قسم (یعنی جس کے صحیح اور ضعیف کو پہچاننا ناممکن ہو) اس میں عمومی طور پر کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور ان کی معرفت کی بھی ہمیں ضرورت نہیں اس کی مثال جیسے اصحاب کہف کے کتے کے رنگ میں اختلاف اور اس کے نام میں اختلاف، گائے کے اس حصے میں اختلاف جس پر مقتول کو مارا گیا اور حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی مقدار اور اس کی لکڑی میں اختلاف، اس لڑکے کے نام میں اختلاف جسے حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا وغیرہ وغیرہ ان امور کے علم کا طریقہ صرف نقل ہے اب ان میں سے جو چیزیں نبی کریم ﷺ ہم سے نقل صحیح کے ساتھ منقول ہوں انھیں قبول کیا جائے گا اور جو ایسی نہ ہوں بلکہ اہل کتاب جیسے کعب اور وہب وغیرہ ان میں توقف کیا جائے گا نہ تصدیق کی جائے گی نہ تکذیب۔ اس لیے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "جب تمھیں اہل کتاب کوئی حدیث بیان کریں تو نہ ان کی تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب" اسی طرح جو بعض تابعین سے جو منقول ہے اگرچہ وہ ذکر نہ کریں کہ انھوں نے اسے اہل کتاب سے لیا ہے۔ اور جب تابعین میں اختلاف ہو جائے تو ان کے اقوال ایک دوسرے پر حجت نہیں ہو سکتے۔ اور جو چیزیں صحابہ رضی اللہ عنہم سے صحیح طور پر منقول ہیں ان کی طرف دل بنسبت ان کے جو تابعین سے منقول ہیں مطمئن ہوتا ہے اس لیے کہ ان کے بارے میں احتمال ہے کہ انھوں نے اسے نبی کریم ﷺ سے یا کسی ایسی شخص سے سنا ہو گا جس نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہو۔ نیز اس لیے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا اہل کتاب سے نقل کرنا بنسبت تابعین کے کم ہے اور جب صحابی اسے قطعی طور پر کہہ رہا ہو تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اہل کتاب سے لیا حالانکہ ان کی تصدیق

سے انھیں منع کیا گیا۔ اور وہ قسم جس کے صحیح کی معرفت ممکن ہو وہ بہت زیادہ ہیں وللہ الحمد۔ اگرچہ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: "تین چیزوں کی کوئی اصل نہیں "تفسیر، جنگیں اور غزوات" اس لیے کہ ان میں اکثر مرسل روایتیں ہوتی ہیں۔" اور وہ قسم جس کو استدلال سے معلوم کیا جاسکتا ہے نقل سے نہیں اس میں خطا اکثر دو وجہ سے ہوتی ہے اور یہ دو وجہیں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی تفسیر کے بعد پیدا ہوتی ہیں... اس کے بعد علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ان جہتوں کو ذکر کیا جو خطا کا باعث بنتی ہیں۔

① قرآن پاک کے الفاظ کو ایسے معانی پر محمول کرنا جن کا وہ اعتقاد رکھتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے وہ ان کی تائید کریں۔

② محض لغت عربیہ کی دلالت کے ساتھ تفسیر کرنا اور اس میں قرآن کے متکلم یعنی اللہ تعالیٰ کی رعایت نہ کرنا اور نہ ہی جس پر نازل ہوا ہے اس کی اور نہ ہی اس کے مخاطبین کی رعایت کرنا۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ: "ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا کلام امام احمد کے قول کو نہیں توڑتا اس لیے کہ ان کی مراد یہ نہیں تھی کہ ان تین چیزوں میں صحیح روایت بالکل بھی نہیں ہوتی بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ ان میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ صحیح متصل سند ثابت نہیں ہوتی اور جن کی سند کسی صحابی تک ثابت ہوتی بھی ہے تو بھی مرفوع سند بہت ہی کم ہوتی کہ اس سے استدلال کیا جاسکے۔

آگے فرماتے ہیں کہ: "پھر تفسیر ماثور میں اکثر روایات قرآن کے لیے رکاوٹ ہیں اور مشغول کرنے والی ہیں تاکہ یہ اس کے بلند مقاصد جو نفوس کا تزکیہ کرنے والے اور دونوں کو منور کرنے والے ہیں سے غافل کر کے دوسری طرف مشغول کر دیں کیونکہ تفسیر ماثور والوں کو کثرت روایات جن کی سند یا موضوع کے اعتبار سے کوئی قیمت نہیں ہوتی مقاصد قرآن سے مشغول کر دیتی ہیں... الخ

اس موضوع میں انصاف کے کلمات یہ ہیں کہ تفسیر ماثور کی دو اقسام ہیں:

① جس کی صحت اور مقبولیت پر بھرپور دلائل ہیں اسے رد کرنا کسی کے لیے مناسب نہیں اور اس کی طرف بے توجہی اور اس سے غفلت کرنا بھی جائز نہیں اور یہ اچھا نہیں لگتا کہ ہم اسے قرآن کی ہدایت سے ہٹانے والی چیزوں میں شمار کریں بلکہ اس کے برعکس یہ قرآن سے ہدایت پانے میں قوی ترین عامل ہے۔

② جو صحیح نہ ہو گزشتہ بالا اسباب وغیرہ کی وجہ سے اسے رد کرنا واجب ہے اور اسے قبول کرنا اور اس میں مشغول ہونا جائز نہیں۔ سوائے اس کے کہ اس کی جانچ پڑتال ہو جائے اور اس کی بے راہ روی اور غلطی کی وضاحت کر دی جائے تاکہ اس سے کوئی دھوکہ نہ کھاسکے ہوشیار مفسرین کا ہمیشہ سے طریقہ اسی طرح چلا آرہا ہے کہ وہ جو کچھ نقل کرتے ہیں اس کی صحت کی جانچ پڑتال کرتے ہیں اور اس میں سے باطل یا ضعیف کی وضاحت کرتے ہیں اور اس میں کسی قسم کا کوئی خوف یا ڈر نہیں کرتے۔ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے تفسیر ماثور کے رد میں اپنے قول کو مطلق اس لیے ذکر کیا ہو کہ اس سے ان کا ارادہ مبالغہ ہو جیسا کہ آپ نے امام احمد بن حنبل کے الفاظ کی توجیہ میں جان لیا۔ اور ان لوگوں کا یہ عذر بھی جان لیا کہ اس میں سے صحیح بہت ہی قلیل نادر اور بہت ہی تھوڑا ہے یہاں تک کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے تفسیر میں تقریباً سو آیات کے علاوہ کچھ بھی ثابت نہیں۔" حالانکہ ان سے روایات کثرت کے ساتھ ہیں۔

اور ابن خلدون نے اشارہ کیا کہ عرب کتاب وعلم والے نہیں تھے بلکہ ان پر بدویت غالب تھی جب انھیں اسباب مکونہ، مخلوق کی آفرینش اور موجودات کے اسرار میں کسی ایسی چیز کی معرفت کی رغبت ہوتی جس کی نفوس بشریہ رغبت کرتے ہیں تو وہ اس کے

بارے میں اپنے سے پہلے والے اہل کتاب سے جا کر پوچھتے اور ان سے استفادہ کرتے تھے... آگے فرماتے ہیں ان کی مثال کعب الاحبار، وہب بن منبہ اور عبداللہ بن سلام ہیں ان کی منقولات سے تفسیریں بھری پڑی ہیں اور انھیں تلقی بالقبول بھی حاصل ہے اس لیے کہ ان کا ایک اعلیٰ مقام ہے لیکن راسخین فی العلم نے صحت کی چھان بین کی اور جن کی صحت کے دلائل پورے نہیں ہوئے ان کی نشاندہی کی۔

تنبیہ ابن خلدون اور ابن تیمیہ وغیرہ کی عبارت سے کوئی ایسی چیز نہ سمجھ بیٹھنا جس سے آپ ان تین بڑے بڑے علماء کے بارے میں چہ می گوئیاں کرنے لگ جائیں بہت سے علاقوں والے اور اس زمانے کے بڑے بڑے لکھاری اس گمان کی وجہ سے پھسل گئے حتیٰ کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو ایک جلیل القدر صحابی ہیں کو عبداللہ بن سبا یہودی خبیث کی لڑی میں پرو دیا جس نے اسلام کا اظہار کیا اور پھر اسلام کے خلاف بدترین مکروفریب اور سازش کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گروہ میں شامل ہو گیا اور دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ میں حلول کر لیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو برا کہا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے یہ تینوں حضرات عادل اور ثقہ تھے۔

ابن سلام رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو آپ کو اتنی بات کافی ہے کہ وہ صحابی ہیں بلکہ بہترین صحابہ میں سے ہیں اور ان صحابہ میں سے ہیں جنھیں جنت کی خوشخبری دی گئی۔

ترمذی میں روایت ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ وہ جنت میں داخل ہونے والوں میں سے دسویں ہوں گے۔ اور انھی کے بارے میں آیت

﴿ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۡ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ عَلٰی مِثۡلِهٖ ﴾ (الاحقاف:۱۰)

"اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے ساری طرح کی کتاب کے بارے میں گواہی دی۔"

انھی کے بارے میں نازل ہوئی نیز آیت:

﴿ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ ﴾ (الرعد:۴۳)

"اور جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔"

جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے۔

جبکہ حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ ایک ثقہ تابعی اور وسیع العلم تھے انھوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بہت زیادہ روایتیں نقل کی ہیں وہ اپنی عبادت گزاری اور نیکی میں اس درجہ تک تھے کہ انھوں نے بیس سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو۔

اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر تابعی تھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں مسلمان ہوئے آپ کے لیے اتنا کافی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان سے علم حاصل کیا اور اسی طرح انھوں نے بھی صحابہ رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا تابعین کی ایک جماعت نے بھی ان سے مرسل روایتیں لی ہیں۔ بخاری میں بھی ان کی کچھ روایات ہیں۔

لیکن اس مقام پر انتہائی ضروری ہے کہ ہم فرق کریں کہ ان کے بارے میں کیا کہنا صحیح ہے اور ان سے نقل ہونے والی کون

سی روایات صحیح ہیں ان کے بارے میں جو کہنا صحیح ہے وہ "ثقہ" ہے اور اس کا پیمانہ وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا اور ان سے نقل ہونے والی روایات بعض صحیح ہیں اور بعض غیر صحیح ہیں لیکن جو صحیح نہیں ہیں ان کی عدم صحت کی علت یہ نہ بیان کی جائے کہ وہ متہم ہیں یا مجروح ہیں کیونکہ آپ جان چکے ہیں کہ وہ کون ہیں؟ علت دو امور میں سے ایک ہوگی۔

① ان سے نقل کرنے والے راویوں کی سند میں کچھ راوی ایسے ہوتے ہیں جن کی عدالت یا ضبط میں کوئی خرابی ہوتی ہے اس لیے ان سے نقل کرنے والے راویوں کے سلسلے کے ایک ایک شخص کے بارے میں غور وفکر کرنا ضروری ہے اور ہماری بھی جرح وتعدیل میں ایک کتاب ہے جو اس مقصود کو پورا کر سکتی ہے صرف اتنا اعتماد کافی نہیں ہوگا کہ اس کا ذکر بڑی کتاب میں آ گیا ہے جیسے تفسیر ابن جریر وغیرہ کیونکہ ابن جریر وغیرہ بھی غیر صحیح چیزیں ذکر کر دیتے ہیں اور ان کی سندیں بیان کر دیتے ہیں پھر سند کے راویوں میں سے مجروح یا عادل راویوں کی نشاندہی نہیں کرتے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس زمانے کے لوگوں کو راویوں کے احوال معلوم ہوتے تھے وہ اس معرفت کی روشنی میں فیصلہ کر سکتے تھے کہ خبر کو رد کیا جائے گا یا نہیں جبکہ اس زمانے میں ہم نے اس ترازو کو چھوڑ دیا اور ہم اسانید اور رجال کے احوال جاننے کا اہتمام نہیں کرتے۔

لہٰذا ملامت ہمیں ہونی چاہیے انھیں نہیں جو بڑے بڑے علماء ہیں ہمیں یہ گنجائش نہیں کہ اس مقام پر جرح وتعدیل والی کتابوں سے رہنمائی نہ لیں۔

② یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے کوئی چیز روایت کی ہو اس بناء پر کہ یہ اسرائیلیات میں سے ہیں اور ان کے شاگردوں نے اسے اسلامیات میں سے سمجھ کر قبول کر لیا ہو اس لیے ان روایات میں غور وفکر کرنا ضروری ہے اگر یہ اسلام ان کی تائید کرتا ہو تو ہم انھیں قبول کریں گے اور اگر اسلام ان کی تردید کرتا ہو تو ہم بھی ان کی تردید کریں گے اور اگر اسلام ان پر سکوت کرتا ہو تو ہم بھی ان پر سکوت کریں گے اس لیے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

"جب تمہیں اہل کتاب کوئی حدیث بیان کریں تو نہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب۔"

بخاری میں اس طرح ہے اور مسند اور بزار میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ اہل کتاب سے کوئی چیز نہ پوچھو کیونکہ وہ تمہاری رہنمائی ہرگز نہ کریں گے تحقیق وہ گمراہ ہو چکے ہیں اور تم یا تو حق کی تکذیب کرو گے یا باطل کی تصدیق۔ اللہ کی قسم! "اگر موسیٰ علیہ السلام تمہارے درمیان ہوتے تو بھی ان کے لیے میری اتباع کے علاوہ کچھ بھی جائز نہ ہوتا۔"

اس حدیث کا سبب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہود سے تورات کی کوئی چیز لکھی اس پر آپ ﷺ ناراض ہوئے اور یہ بات ارشاد فرمائی۔

تفسیر ماثور کی تدوین اور اس میں تالیف کی گئی کتابوں کی خصوصیات

تبع تابعین کا دور آیا اور اس میں کئی تفاسیر لکھی گئیں صحابہ اور تابعین کے اقوال جمع کیے گئے جیسے تفسیر سفیان بن عیینہ، وکیع بن الجراح، شعبہ بن الحجاج، یزید بن ہارون، عبدالرزاق، آدم بن ابی ایاس، اسحاق بن راہویہ، روح بن عبادہ، عبد بن حمید، ابو بکر بن

ابی شیبہ، علی بن ابی طلحہ بخاری اور دیگر حضرات۔

ان کے بعد ابن جریر طبری نے اپنی مشہور کتاب تالیف کی جو تفاسیر میں سب سے زیادہ جلیل القدر ہے اس کے بعد ابن ابی حاتم، ابن ماجہ، حاکم، ابن مردویہ اور ابن حبان وغیرہ نے تفسیریں لکھیں۔

ان حضرات کی تفاسیر میں صرف وہی کچھ تھا جو صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی طرف مستند تھا سوائے ابن جریر کے کہ انھوں نے اقوال کی اور توجیہ اور ترجیح یعنی ایک کو دوسرے پر ترجیح وغیرہ دینے اور اعراب کا ذکر اور استنباط کرنے میں سرگرم ہو گئے۔

تفسیر ابن جریر ✿ ابن جریر، ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید طبری ہیں جو ۲۲۴ھ کو پیدا ہوئے اور انھوں نے ۳۱۰ھ کو وفات پائی وہ علم و عمل میں اپنے زمانے کے یکتا اپنے وقت کے منفرد علم و عمل، کتاب اللہ کا حفظ، اس کے معانی کی حقیقت تک رسائی، ناسخ و منسوخ آیات، روایت کی صحیح اور کمزور سندوں اور صحابہ و تابعین کے احوال کا احاطہ کرنے میں اپنے زمانے میں منفرد اور اپنے وقت میں یکتا تھے۔

اسی وجہ سے ان کی تفسیر تفاسیر بالماثور میں سب سے زیادہ جلیل القدر سب سے صحیح اور سب سے جامع تفسیر تھی اس لیے کہ اس میں صحابہ اور تابعین کے اقوال وارد ہوئے ہیں۔ نیز اس میں انھوں نے اقوال کی ترجیح بیان کی اور ایک دوسرے کو ترجیح دی اور اس میں بہت زیادہ اعراب اور بہت زیادہ احکام کا استنباط ذکر کیا۔ عارفین اس کے شاہد ہیں کہ تفاسیر میں اس کی مثال کوئی بھی نہیں ہے۔

نووی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "التھذیب" میں فرمایا کہ: "تفسیر میں ابن جریر کی طرح کسی نے بھی کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ابو حامد اسفرائینی جو امام شافعی کے استاد ہیں فرماتے ہیں کہ: "اگر کوئی آدمی تفسیر ابن جریر کو حاصل کرنے کے لیے چین کا سفر بھی کرے تو کوئی بڑی بات نہیں۔ ان کی فوقیت یہ ہے کہ انھوں نے سندوں کو واضح کیا، بعید کو قریب کیا اور ایسی چیزیں جمع کی ہیں جو کسی اور نے نہیں کیں لیکن بعض اوقات وہ غیر صحیح سندوں کے ساتھ احادیث بیان کرتے ہیں ان کی عدم صحت پر تنبیہ نہیں کرتے ہیں اور ہم نے کہا کہ اس میں ان کا عذر یہ تھا کہ انھوں نے ان سندوں کو ایک ایسے زمانے میں ذکر کیا جس میں لوگ تنبیہ کیے بغیر ہی سند کا حال بخوبی جانتے تھے اور یہ تفسیر آج بھی موجود ہے اور مطبوع و منشور ہے اور اکثر مفسرین کی بنیاد یہی تفسیر ہے۔

تفسیر ابو اللیث سمرقندی یہ بھی تفسیر بالماثور ہے اس میں انھوں نے صحابہ اور تابعین کے بہت زیادہ اقوال ذکر کیے ہیں لیکن سندوں کو ذکر نہیں کیا یہ دو جلدوں میں لکھی ہوئی ہے اور مکتبہ الازہر میں موجود ہے۔

الدر المنثور فی التفسیر بالماثور یہ امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کی تفسیر ہے وہ اس کے مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ انھوں نے اسے کتاب "ترجمان القرآن" سے ملخص کیا ہے اور اس تفسیر کی سند رسول اللہ ﷺ تک ہے اور یہ مصر میں مطبوع ہے انھوں نے اپنی کتاب "الاتقان" میں ذکر کیا کہ انھوں نے ایک ایسی تفسیر کو شروع کیا جو ان تمام چیزوں کو جامع ہو جن کی ضرورت ہوتی ہے یعنی تفاسیر منقولہ، اقوال معقولہ، استنباط، اشارات، اعاریب، لغات، بلاغت کے نکات اور بدیع کے محاسن کو جامع ہو۔

اور اس کا نام "مجمع البحرین و مطلع البدرین" رکھا اور ذکر کیا کہ انھوں نے "الاتقان" کو اس کے مقدمہ کے طور پر ذکر کیا اور کتاب "الاتقان" کے آخر میں تفسیر ماثور کا ایک اچھا سا حصہ ذکر کیا جو سورۃ الفاتحہ کے شروع سے سورۃ الناس کے آخر تک نبی کریم ﷺ

تک مرفوع ہے۔

تفسیر ابن کثیر

ابن کثیر عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن الخطیب ابو الحفص عمر رحمۃ اللہ علیہ قرشی دمشقی ہیں جو ۷۰۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۷۴ھ کو وفات پائی۔ ان کی یہ تفسیر تفاسیر بالماثور میں صحیح ترین تفسیر ہے اگرچہ سب سے زیادہ اصح نہیں ہے اس میں انھوں نے نبی کریم ﷺ کبار صحابہ اور تابعین سے نقل کیا اور مطبعۃ المنار (مصر) نے اسے نو حصوں میں نقل کیا۔ اس کے ساتھ ذیل کے صفحات میں تفسیر بغوی ہے جس کا ذکر آرہا ہے اور آخر میں کتاب فضائل القرآن ہے جسے اس کا تتمہ سمجھا جاتا ہے۔

تفسیر بقی بن مخلد

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے مفسرین کے طبقات میں ذکر کیا کہ بقی بن مخلد بن یزید بن عبدالرحمٰن اندلسی قرطبی ایک بڑے عالم اور تفسیر وسند والے تھے، انھوں نے یحییٰ بن یحییٰ لیثی سے علم حاصل کیا اور مشرق کی طرف سفر کیا اور حجاز میں، مصر اور بغداد میں بڑے بڑے اکابرین سے ملے اور امام احمد بن حنبل سے بھی سماع کیا اور کوفہ میں ابو بکر بن ابی شیبہ سے بھی سماع کیا اور مصر میں یحییٰ بن بکیر سے اور حجاز میں ابومصعب زہری سے اور دمشق میں ہشام بن عمار سے سماع کیا آپ کے ۲۸۴ شاگرد تھے۔ آپ امام، زاہد، روزے رکھنے والے، سچے، مستجاب الدعوات، قلیل المثل اور علم کے سمندر تھے ان جیسی سند کسی کی بھی نہیں تھی نہ حدیث میں اور نہ ہی تفسیر میں۔

ابن حزم نے فرمایا کہ یہ بات قطعی ہے کہ اسلام میں ان جیسی تفسیر نہیں لکھی گئی نہ ابن جریر نے نہ کسی اور نے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ ۲۰۴ھ کو پیدا ہوئے ان کی تفسیر کے بارے میں بڑا افسوس ہے کہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ لکھی ہوئی باقی نہ رہی اور جیسے تفسیر ابن جریر نے دائمی کامیابی حاصل کی یہ کامیابی حاصل نہ کرسکی۔

وکم فی الخدر ابھی من عروس   ولکن للعروس الدھر ساعد

"کتنی ہیں جو پردہ میں ہیں اور دلہن سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔ لیکن دلہن کی زمانہ تائید کرتا ہے۔

⑦ اسباب النزول للواحدی

یہ ابو الحسن علی بن احمد واحدی نیساپوری ہیں انھوں نے اپنی تفسیر میں تفسیر ماثور کے اسباب نزول پر اکتفاء کیا اور تفسیر کی یہ نوع ایسی ہے کہ اس میں تاویل کی گنجائش نہیں اور یہ اس موضوع میں سب سے بڑی تفسیر ہے اگرچہ اس کا حجم متوسط ہے۔

⑧ الناسخ والمنسوخ لابی جعفر النحاس

یہ ایک نفیس کتاب ہے اس میں اس کے مؤلف نے ناسخ ومنسوخ کے بارے میں بات کی اور اس میں انھوں نے علماء کے اقوال سند کے ساتھ ذکر کیے اور نسخ میں جو بھی کہا گیا سب کو پوری طرح ذکر کیا اگرچہ وہ ان کے نزدیک صحیح نہ بھی ہوں اور اس نوع میں بھی رائے کی گنجائش نہیں بلکہ اس کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ روایت ہے اور اسے اس موقع پر تفسیر ماثور میں شمار کیا جس میں کئی طرح کا توسع ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

قرنِ اوّل کے بعد مفسرین کی سندیں

تفسیر بالماثور کی کتابوں کا ایک بہت بڑا مجموعہ تھا جن کا احاطہ کرنا ہمارے بس میں نہیں اور نہ ہی ہم ان تمام تالیفات کے ناموں کا

احاطہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس میں لکھی گئی تالیفات کے طریقے کا احاطہ کر سکتے ہیں صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ قرن اولی کے بعد مفسرین کی سندوں کے بارے میں اجمالی قول کو ذکر کر سکتے ہیں۔

پہلی صدی میں جن لوگوں نے تفسیر بالماثور میں کتابیں تالیف کیں اور تمام سندوں کو پورا ذکر کرنے کا التزام کیا ان لوگوں کے زمانے کے بعد ایک قوم آئی اور انھوں نے تفسیر میں تصنیف کی اور سندوں کو مختصر کیا اور اقوال کو ان کے قائلین کی طرف منسوب نہیں کیا جس کی وجہ سے صحیح اور غیر صحیح میں التباس واقع ہو گیا ان کتب میں نظر ڈالنے والا یہ سمجھتا تھا کہ یہ سب کی سب صحیح ہیں اس وقت یہ اسرائیلیات اور قصص سے اتنی بھری ہوئی تھیں کہ ان میں تمیز نہیں ہو سکتی تھی گویا کہ ان سب کو حق سمجھا جاتا تھا اسی وجہ سے ان کی روایات جرح وتعدیل کا نشانہ بنیں اگر ہر زمانے میں محققین حق کے احقاق اور باطل کے کر توڑنے کے لیے کمربستہ نہ ہوتے تو نشانات مٹ جاتے اور جاہل قائل ایک ہو جاتے۔ اور یہ اسلام اور مسلمانوں پر طعن کا بے حساب سبب بن جاتے انھوں نے قصص الانبیاء، مخلوق کی آفرینش، زلزلوں، یاجوج ماجوج، کنووں میں گرمیوں میں پانی ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم ہونے کے بارے میں ایسی باتیں ذکر کیں کہ شرم کی وجہ سے پیشانی شرابور ہو جائے۔ اور ایسی چیزیں کہ جن کے ساتھ علمی حقائق کبھی بھی متفق نہیں ہو سکتے کاش کہ یہ حضرات ان کی من گھڑت چیزوں پر متنبہ کر دیتے اگر وہ کر دیتے تو معاملہ آسان ہو جاتا لیکن انھوں نے سند کو ذکر نہیں کیا جیسا کہ پہلے لوگوں نے ذکر کیا کہ اس پر مطلع ہونے والا جرح وتعدیل کی کتب کی طرف رجوع کر کے ان کی جانچ پڑتال کر سکتے پھر انھوں نے اپنے آپ کو سند پر حکم لگانے کا مکلف ہی نہیں بنایا اس لیے کہ ان کا کام کتب جرح وتعدیل میں ہو چکا۔

بعض محققین نے مختلف اقوال کا سلسلہ جاری رکھنے کا اہتمام کیا حتی کہ انھوں نے ﴿غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝ آمین﴾ (الفاتحۃ: ۷) کے بارے میں تقریباً دس اقوال ذکر کیے ہیں لیکن کثرت نقول کے شوق نے انھیں تفسیر مقبول پر اقتصار کرنے سے دور کر دیا۔

اسی وجہ سے ہم ملاحظہ کرتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو کسی فن میں ماہر ہوتا ہے وہ اکثر اپنی تفسیر میں اسی فن پر اکتفاء کرتا ہے جس میں وہ ماہر ہوتا ہے چنانچہ علوم عقلیہ کے ماہر جیسے فخر رازی نے اپنی تفسیر میں حکماء اور فلاسفہ کے اقوال پر بحث مباحثہ کرنے اور ان کے شبہات اور ان کی تردید کو اپنے ذمے لیا اور فقہ کے ماہر جیسے قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے فروع فقہیہ کے دلائل کی پختگی اور مخالفین کے رد کا شوق ظاہر کیا اور نحو کے ماہر جیسے زجاج اور واحدی نے "البسیط" میں اور ابو حیان نے "البحر" میں اعراب اور ان کی وجوہ کا بہت بڑا اہتمام کیا اور نحو اور اس کی فروع کے قواعد نقل کیے۔

اور باطل مذاہب والے اور گمراہ مسالک والے آیات کی تاویل کا ایسا قصد کرتے ہیں جو گمراہی اور بغاوت میں ان کے مذاہب کی ترویج کرتے ہیں۔

اور اخباری اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ سلف سے قصے اور خبروں کو شمار کریں خواہ وہ صحیح ہوں یا باطل۔

اور علم الاشارہ والے اور ارباب تصوف کو ترغیب وترہیب، زہد وقناعت اور رضا والے شعبے کا ہی غم سوار ہوتا ہے۔ وہ قرآن پاک کی تفسیر ایسی چیزوں سے کرتے ہیں جو ان کے مشارب اور اذواق کے موافق ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ہم کسی بھی فن کے ماہر کو دیکھتے ہیں یا کسی مذہب یا نظریہ کے داعی کو دیکھتے ہیں تو وہ آیات کی تفسیر میں اس چیز کی

خوب محنت کرتا ہے جو اس کے فن کے موافق ہو اور اس کے مسلک ومشرب کے بھی موافق ہو اور اس کے مذہب کی نصرت بھی کر رہا ہو اگرچہ وہ اس مقصد سے بعید ہو جس کے لیے قرآن نازل ہوا بعض نے مزید غلو کیا اور قرآن کو علوم کونیہ جیسے طبعیات، کیمیا، حساب، الجبرا وغیرہ پر مشتمل بنا دیا اور پیچھے گزر چکا کہ پہلی بحث میں ہم نے اس کی پوری تحقیق بیان کر دی اگر آپ چاہیں تو وہاں رجوع کر سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ مفسر پر واجب ہے کہ وہ اس بات کا لحاظ کرے کہ قرآن پاک کتاب ہدایت واعجاز ہے اور اس کا ہدف اعلیٰ اور مقصد علمی اللہ تعالیٰ کے کلام سے اس کی ہدایت کا اظہار اور اس کی کتاب میں اس کے اعجاز کی وجوہ کا بیان ہے۔

﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ (الانفال:۴۲)

"تاکہ دلیل کی وجہ سے جس نے مرنا ہو وہ مر جائے اور جس نے دلیل کی وجہ سے زندہ رہنا ہو وہ زندہ رہے بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔"

تفسیر محمود اور تفسیر مذموم

صحابہ اور تابعین کی تفسیر اور صحابہ وتابعین کے اقوال پر اعتماد کرنے والوں کی تفسیر جو صحیح سند کے ساتھ ہو اور ان اہل رائے کی تفسیر جنھیں توفیق دی گئی اور انھوں نے ماثور صحیح کو ان کی سندیں حذف کر کے اپنی علمی اور متعدل آراء کے ساتھ جمع کیا یہ تینوں قسم کی تفسیریں تفاسیر محمود ہیں۔ اور ہمارے زمانے میں اکثر یہی تیسری نوع ہے اس لیے کہ جو تفاسیر ہمارے ہاں ہیں وہ معانی ماثورہ اور ان معانی کے درمیان تطبیق کرتے ہیں جن کے ذکر میں رائے کے طریق اور علم واعتدال پر اعتماد کرنے والے اجتہاد میں توسع ہے۔

ایک چوتھی قسم بھی ہے: یہ اہل ہوا اور بدعتیوں کی تفسیر ہے اس کا حکم یہ ہے کہ یہ مذموم ہے۔ کہتے ہیں کہ اس گمراہی میں غرق ہونے والے سب سے مشہور رمانی، جبائی اور قاضی عبدالجبار ہیں۔ پھر زمخشری کے بارے میں اختلاف ہے بعض حضرات نے ان کی تفسیر کو اسی قسم میں شمار کیا ہے اس لیے کہ اس میں اعتزال کی طرف پھسلانے والی چیزیں ہیں۔ کسی نے کہا کہ: "بے شک اس میں اہم ترین فوائد ہیں۔" اس بات سے اس کا مقصود ان کا عذر تلاش کرنا اور اس میں پائے جانے والے فوائد کی جانب کو اس میں پائی جانے والی جانب اعتزال پر ترجیح دینا ہے لیکن احکام کی عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم تمام تفاسیر کو ایک برابر رکھیں اور ان کا فیصلہ ایک جگہ پر کریں جو درستگی کے موافق ہو اور بدعات اور خواہشات سے دور ہو وہ محمود اور جو خطا میں پڑ رہی ہو اور بدعت وخواہش میں ہاتھ مار رہی ہو وہ مذموم ہے نہ اس میں زمخشری یا غیر زمخشری کا فرق ہے اور نہ ہی معتزلی اور غیر معتزلی کا فرق ہے۔

مدح وذم کا پیمانہ

پھر اس موقع پر ایک میزان ہے جس کے ذریعے تفسیر کو مذموم یا محمود کہا جا سکتا ہے اور یہی ایک فیصل ہے جسے فیصل بنانا ضروری ہے اور اس کے ذریعے ہم ہر تفسیر کا وزن کر سکتے ہیں اس ترازو میں جو راجح ہو گی اسے ہم قبول کریں گے اور اس کی تعریف کریں گے اور جو غلط ہو گی اسے ہم چھوڑ دیں گے اور برا سمجھیں گے اور مدح وذم کے درجات ہیں جو تفسیر کے مدح وذم کی وجوہ یا تھوڑی زیادہ کمی کے استیفاء کی بناء پر ایک دوسرے کے اوپر نیچے ہیں۔ اب ہم آپ کے سامنے اس میدان کو "منہج المفسرین بالرأی" (تفسیر بالرائے والوں کا طور طریقے) کے عنوان کے تحت رکھیں گے آپ تھوڑی دیر اس کا انتظار فرمائیں)

مگر اس موقع پر ہم آپ کی توجہ اہل بدعت وہوا کے کلمات کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ کسی

بھی جماعت یا شخص کے بارے میں بدعت یا ہوا کا فیصلہ کرنے میں درست توفیق دیے گئے ہو ورنہ آپ پر اندیشہ ہے کہ آپ بھی اپنا فیصلہ کرنے میں بدعت یا ہوا والے نہ بن جائیں۔

﴿وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ۠﴾ (ص:۲۶)

"اور خواہش کی پیروی مت کیجئے ورنہ اللہ کے راستے سے بہک جاؤ گے بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے سے بہک جاتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اس لیے کہ انھوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا۔

رائے کی طرف داری والی غلطی

جاننا چاہیے کہ اس موقع پر کچھ افراد ایسے ہیں جو اپنی رائے اور مذاہب کی طرف داری کرتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ جو شخص بھی ان مذاہب آراء کی مخالفت کرتا ہے وہ بدعتی اور خواہش کے پیچھے چلنے والا ہے اگر وہ کوئی اچھی تاویل کر لیتا ہے تو اس کے لیے دلیل و برہان کی گنجائش ہے ان کی رائے اور مذہب ہی ایک میزان اور کسوٹی ہے یا یوں کہیے کہ کتاب وسنت یا اسلام یہی ہے ان لوگوں کو شیطان نے اسی طرح پھسلایا اور غرور نے انھیں اندھا کر دیا۔

اس بدترین غلطی سے یہ ہوا کہ مسلمان بہت سے گروہوں اور جماعتوں میں بٹ گئے اور ایک دوسرے کے دشمن بن گئے اور ان سے یہ بات غائب ہوگئی کہ کتاب وسنت اور اسلام ان کے مذاہب اور آراء سے زیادہ وسیع ہیں اور ان کے مذاہب اور آراء، قرآن وسنت اور اسلام سے تنگ ہیں اور نرمی اور سہولت والا دینِ حنیف افکار کی حریت اور انظار کے اختلاف کے لیے متسع ہے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہیں پھر ان سے یہ بات غائب ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ فرمایا ہے کہ:

﴿وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ﴾ (آل عمران:۱۰۳)

"اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو اور اپنے اوپر ہونے والی اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو کہ جب تم دشمن تھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں محبت ڈالی اور تم لوگ اس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے۔"

اور اللہ تعالیٰ عزوجل فرماتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ﴾ (الانعام:۱۵۹)

"بے شک جن لوگوں نے اپنے دل میں تفرقہ ڈال دیا اور گروہ گروہ ہو گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔"

اور اللہ تعالیٰ تقرت اسماءہ فرماتا ہے کہ:

﴿وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (آل عمران:۱۰۵)

"اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے تفرقہ ڈالا اور اختلاف کیا بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آ گئیں ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ جس دن چہرے سفید ہوں گے اور سیاہ ہوں گے۔"

انھی وجوہ کی بناء پر میں اپنے آپ کو بھی اور آپ کو بھی دور کرتا ہوں کہ کسی مسلمان پر کفر، بدعت یا خواہش کی تہمت لگائیں صرف اس وجہ سے کہ اس نے اسلامی نظریاتی رائے میں ہماری مخالفت کی کیونکہ کسی پر کفر یا بدعت کی تہمت لگانا بدترین امور میں سے ہے اور علماء نے ثابت کیا ہے کہ جب کسی کلمہ میں ننانوے احتمالات کفر کے ہوں اور ایک احتمال ایمان کا ہو تو اسے احسن المحامل یعنی ایمان پر محمول کریں گے یہ موضوع مکمل ہوا اور اس کی دلیل بھی پوری ہو چکی۔ لیکن ہمارے مسلمان بھائیوں کی اس اسلامی ادب سے غفلت ہماری طاقت کا شیرازہ بکھیرتی ہے یہ اسلامی ادب وحدت کی حفاظت کرتا ہے اور بھائی چارگی کا بچاؤ کرتا ہے اور اسلام کو اس کی خوبصورت شکل اور خوبرو چہرے کے ساتھ نرمی اور لطافت کے ساتھ اور ہر قسم کے فکری اختلافات مذہبی جھگڑوں کی وسعت اور مصالح بشریہ کے ساتھ ظاہر کرتا ہے جب تک کہ کتاب وسنت کو پکڑے رہیں گے اس طریقے پر کہ جو ان وجوہ صحیحہ میں سے ہے جن کی درست سوچ اور سیدھی راہ والی تاویل احتمال رکھتے ہیں اس طرح کا اختلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے مابین ظاہر ہوا لیکن وہ اس اختلاف کی وجہ سے آپس میں گتھم گتھا نہیں ہوئے بلکہ ایک نے اپنی رائے کو لیا اور دوسرا اس کی رائے کا احترام کرتا رہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اس پر برقرار رکھا اور کسی کو بھی عیب والا نہیں بتلایا حالانکہ اس طرح کے اختلافات پیش آتے رہے کہ بعض حضرات نے اپنے اجتہاد سے نماز کو اپنے وقت سے چھوڑ دیا جب کسی دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک جماعت کو فرمایا کہ:

"تم میں سے کوئی بھی بنی قریظہ میں پہنچے بغیر نماز نہ پڑھے۔"

انھوں نے سفر کیا اور خوب کوشش کی لیکن سورج غروب ہونے کو تھا وہ زمین پر مسلسل چلتے رہے لیکن ابھی تک نہیں پہنچے اب انھوں نے اجتہاد کیا کسی نے ظاہری دلیل پر عمل کیا اور بنو قریظہ پہنچنے تک عصر کی نما کو چھوڑ دیا۔ حتیٰ کہ اس کا وقت نکل گیا اور بعض نے نص میں تاویل کی اور اسے جلدی چلنے کے کنایہ پر محمول کیا اور جب بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے وقت کا خوف ہوا تو نماز پڑھ لی۔

ہم کہتے ہیں کہ اس طرح کے اختلافات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی رونما ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں برقرار رکھا تاکہ مسلمانوں پر آسانی ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ اسلام کامل دین ہے جو ہر زمانے میں اور ہر حال میں تمام مسلمانوں کے لیے وسعت رکھتا ہے اور اس کے بعد والے مبارک زمانے اس پر شاہد ہیں کہ ان میں ائمہ دین میں کثیر اختلاف ہوا لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کا خوب اکرام کرتے، ایک دوسرے کے ساتھ خوب تعاون کرتے اور ایک دوسرے پر بہت زیادہ رحم کرتے۔

اگر آپ کو شک ہے تو تاریخ سے پوچھیے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ کا کیسے اکرام کیا اور امام شافعی رحمہ اللہ نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا کیسے اکرام کیا یہاں تک کہ ان کی قمیص کے دھوون سے برکت حاصل کرتے یعنی استاذ امام اپنے ایسے شاگرد کی قمیص سے برکت حاصل کرتے ہیں جو رائے اور اجتہاد میں ان کے مخالف ہے۔ اور پھر تاریخ سے سوال کیجیے کہ ایک امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد نے امام شافعی رحمہ اللہ کے ساتھ کیسے تعاون کیا اور انھیں کرم حسن ضیافت اور صدق محبت میں اپنی کتابیں دے دیں۔

اور آپ کو امام مالک رحمہ اللہ کا رشید کو انکار کرنا بھی نہ بھولنا چاہیے کہ وہ بلاد اسلامیہ کے تمام لوگوں کو ان کی موطا اور ان کے

مذہب پر ابھار رہا تھا اور امام مالک ان سے عذر کر رہے تھے کہ اسلام ان کے مذہب اور ان کی موطا سے زیادہ وسیع ہے اور رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کئی علاقوں میں پھیل گئے اور ہر ایک کی اپنی توجیہ ہے۔

کیا آپ نے یہ سمجھداری اور پاکیزگی دیکھی؟ ہاں! لیکن آپ کو بہت افسوس ہوگا جب آپ ایک طرف مسلمانوں کی جماعتوں کو دیکھیں گے کہ وہ ایک دوسرے پر کفر کے تیر برسا رہے ہوتے ہیں اور شرک کا بہتان لگا رہے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر بدعت اور ہوائے نفس کے پتھر پھینک رہ ہوتے ہیں اس کی وجہ صرف تاویل ہوتی ہے جسے نظر وفکر خوشگوار سمجھ رہی ہوتی ہے۔

حالانکہ صدر استدلال میں اس کی وسعت ہوتی ہے پھر بعض حالات میں پیوند لگانے والے پر پھٹن مزید بڑھتی ہے حتیٰ کہ صفوں کے درمیان شدید قسم کی لڑائیاں دائر ہو جاتی ہیں اور وہ سب مسلمان ہوتے ہیں اور پاکیزہ خون بہہ پڑتے ہیں اور وہ خون بھی سب کے سب اسلامی ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہم اس قسم کی لڑائیاں دیکھتے چلے آرہے ہیں جو زبانی کلامی لڑائیوں پر قائم ہوتی ہیں جن کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں تھی اور ان سے بچ کر رہنا ہی ہمارے لیے مناسب تھا خصوصاً جب ہم نے آیات کو سن لیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کے اختلافات کو باقی رکھا اور ایک حدیث میں آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا کہ:

((ھلك المتنطعون)).

"بہت زیادہ بولنے والے اور سوال و جواب میں غلو کرنے والے ہلاک ہو گئے۔"

یہ ایک چھوٹا سا کلمہ ہے۔ لیکن بہت بڑا ہے جو مختلف صورتوں سے لوگوں کی جانوں، عزتوں اور اموال کے بارے میں بہت زیادہ غلو اور تکلف کرنے والوں کی ہلاکت کے تصور سے ڈراتے اور بچاتے ہیں۔ اس میں جماعت اور افراد برابر ہیں۔

میں اس موضوع پر بات لمبی کرنا نہیں چاہتا بلکہ پختہ اور پکی کرنا چاہتا ہوں کہ کسی بھی جماعت پر بدعت یا ہوائے نفس کا حکم لگانا جائز نہیں ہے اگر وہ بدعت اور ہوائے نفس پر نہ ہوں۔

اور اس قسم کا تعصب اور خواہش پرستی دیکھتے ہیں کہ کسی غالی معتزلی نے اپنے اہل سنت بھائیوں پر یہ بات ماردی کہ وہ اپنی جہالت میں گدھے ہیں اور اپنے عقیدے میں خواہش پرست ہیں۔

بلکہ وہ صرف نثر میں اسے کہنے پر نہیں رکا بلکہ اس نے ان پر شعر بھی کسے (اللہ تعالیٰ انھیں معاف کرے) چنانچہ وہ شعر میں کہتا ہے:

لجماعة سموا هواهم سنة وجماعة حمر لعمري موكفة

ایک جماعت ہے جس نے اپنی خواہشات کا نام سنت رکھ دیا اور ایک ایسی جماعت ہے۔ جو گدھے ہیں میری زندگی کی قسم۔ ان پر پالان ڈالا گیا ہے۔ اس طرح کے تعصب اور خواہش پرستی کی ایک مثال ہم دیکھتے ہیں کہ ایک غالی اہل سنت اپنے معتزلی بھائی پر شرک اور ثنویت کا الزام لگاتا ہے اس لیے کہ ان کا اعتقاد ہے کہ بندہ اپنے افعال اختیاری کا خالق ہے۔

ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ دونوں جماعتیں اگر اطمینان و انصاف کے ساتھ اپنے مقابل کے نقطہ نظر پر سکوت کرتے تو اسی انسانیت پر مجتمع ہو جاتے جو سب کو جمع کرتی ہے اور اسلام پر جمع ہو جاتے جو سب کے درمیان محبت پیدا کرتا ہے۔ اور اس احترام پر جمع ہو جاتے جس کا سب پر چھایا ہوا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ اسلام کی حدود میں ہر ایک کا طریقہ اور ڈھنگ ہے۔

ہمیں اس مثال کے ایک پہلو پر بھی آگاہ ہونا چاہیے وہ افعال کے خلق کی مثال ہے تاکہ حال واضح ہو جائے اور جب

اختلاف واشتباہ ہوتو ہم اس پر اس کی نظائر اور اشباہ کو قیاس کر لیں ہمیں جاننا چاہیے کہ اس میں مخالفین اپنے اختلاف کے باوجود ہمیشہ سے مسلمانوں کے بھائی رہے ہیں انھیں قرآن کے جھنڈے نے سایہ دیا ہوا ہے اور اسلام کا جھنڈا بھی ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

قرآن پاک اور سنت نبویہ ﷺ میں بہت سی نصوص ہیں جو دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر چیز میں رجوع صرف اس کی طرف ہے اور مخلوق کی ہدایت اور گمراہی اسی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (الرعد:۱۶)

"اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے۔"

﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ﴾ (فاطر:۳)

"کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی کوئی خالق ہے جو تمہیں آسمان وزمین سے رزق دے۔"

﴿وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَ مَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (الصافات:۹۶)

"اللہ تعالیٰ نے ہی تمہیں بھی پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو بھی۔"

﴿وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ﴾ (ہود:۱۲۳)

"اور تمام امور اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔"

﴿مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَ مَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (الانعام:۳۸،۳۹)

"وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر چلاتا ہے۔"

﴿وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ﴾ (الانعام:۱۱۲)

"اگر تیرا رب چاہے تو وہ اسے نہ کرسکیں۔"

﴿وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ (ہود:۱۱۸)

"اگر اللہ چاہے تو لوگوں کا ایک جماعت بنادے۔"

﴿وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا﴾ (یونس:۹۹)

"اگر تیرا رب چاہے تو تمام زمین والے ایمان لے آئیں۔"

﴿وَ لَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَ كَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ حَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (الانعام:۱۱۱)

"اگر ہم چاہیں تو ان کے اوپر فرشتے نازل کر دیں اور ان سے مردے باتیں کرنے لگیں اور ان کے سامنے ہر چیز جمع کر دے تو بھی وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے ان کے جنھیں اللہ چاہ لے۔"

﴿اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا﴾ (کہف:۵۷)

”بے شک ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے کہ وہ اسے سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ ڈال دیے۔“

﴿وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ۝﴾ (یٰس:۹)

”اور ہم نے ان کے سامنے اور پیچھے دیوار بنا کر انھیں اندھا کر دیا اور وہ دیکھ نہیں سکتے۔“

﴿وَ سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۝﴾ (یٰس:۱۰)

”اور آپ انھیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ان کے لیے برابر ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔“

﴿كَذٰلِكَ زَیَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ﴾ (الانعام:۱۰۸)

”اسی طرح ہم نے ہر امت کے لیے ان کے اعمال مزین کر دیے۔“

﴿فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَ مَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّهٗ یَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ﴾ (الانعام:۱۲۵)

”اللہ تعالیٰ جس کا سینہ اسلام کے لیے کھولنا چاہے کھول دیتا ہے اور جس کا چاہے سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا کہ وہ آسمان کی طرف چڑھ رہا ہے۔“

﴿لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ﴾ (آل عمران:۱۲۸)

”آپ کو اس میں کوئی اختیار نہیں۔“

﴿وَ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی﴾ (الانفال:۱۷)

”جب آپ نے پھینکا آپ نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکا۔“

اسی طرح نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ: ”اگر تمھیں کچھ پہنچے تو یوں نہ کہو اگر میں ایسے کر لیتا تو ایسے ہو جاتا بلکہ یوں کہو کہ اللہ تعالیٰ نے مقدر میں لکھ دیا تھا اس نے جو چاہا وہی ہوا۔“ ①

اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ”ایمان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اس کے فرشتوں پر ایمان لاؤ اس کی کتابوں پر ایمان لاؤ۔ آخرت کے دن پر اور اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لاؤ۔“ ②

اور فرماتے ہیں کہ: ((یا مقلب القلوب والابصار ثبت قلبی علی دینك)). ③

”اے دلوں اور آنکھوں کو پلٹنے والے میرے دل کو دین پر ثابت قدم رکھ۔“

---

① مسلم کتاب القدر حدیث ۳۴، ابن ماجہ مقدمہ باب ۱۰ حدیث ۷۹، امام احمد ۲/۳۶۶

② مسلم کتاب الایمان ۱، ۷ السنۃ لابی داؤد ۱۶، ترمذی کتاب القدر ۱۰، الایمان ۴، نسائی کتاب الایمان ۵، ۶، ابن ماجہ مقدمہ ۹، ۱۰، مسند احمد ۱/ ۲۷، ۲۸

③ ترمذی کتاب الدعاء باب ۲، مسند احمد ۴/ ۱۸۲

اور اس جیسی نصوص میں جب بندہ غور کرتا ہے تو اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ بندہ تمام امور کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے اس لیے کہ اس کا عقیدہ ہے کہ وہ اکیلا اور واحد ہے نہ اس کے ملک میں کوئی شریک ہے اور نہ ہی اس کے ملک کے کسی گوشہ میں اور
2 تکلیف کے افعال اس کے بندوں کی طرف سے ہیں یعنی افعال کی نسبت بندوں کی طرف یہ ایک دوسری چیز ہے جو محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہے جیسا کہ ابن عطاء اللہ نے فرمایا کہ:

"تجھ پر اس کا فضل اور کرم ہے کہ عمل کا خلق اس نے کیا اور منسوب تیری طرف کر دیا۔"

یہ نقلی دلائل کچھ اور عقلی دلائل کا اظہار بھی کر رہے ہیں جو بول رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہر چیز میں ہے اور بندہ اپنے افعال اختیاریہ کا خالق ہو عقل میں نہیں آ سکتا اس لیے کہ اگر وہ ان کا خالق ہوتا تو ان کی تفاصیل کو بھی جانتا ہوتا جبکہ وہ خود شعور رکھتا ہے کہ اس سے بہت سی اشیاء صادر ہوتی ہیں جن کا تعلق ان کے افعال اختیاریہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن وہ ان کی تفاصیل کو نہیں جانتا جیسے چلنے میں قدم، کھانے میں چبانے کی حرکات وغیرہ اگر ایسا ہے تو وہ اپنے افعال کا خالق نہ ہوا۔

﴿اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ﴾ (الملک: ۱۴)

"کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا؟"

اس بارے میں بھی کتاب وسنت سے بہت سی نصوص ملتی ہیں جن میں بندوں کے اعمال کی نسبت ان کی طرف کی جاتی ہے اور یہ نصوص دلالت کرتی ہیں کہ ان اعمال میں اچھائی کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی محبت ہے اسی طرح یہ بھی دلالت کرتی ہیں کہ اس کا غضب بعض بُرے اعمال کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِہٖ وَ مَنۡ اَسَآءَ فَعَلَیۡہَا ؕ﴾ (فصلت: ۴۶)

"جس نے اچھا عمل کیا اپنے لیے کیا اور جس نے برا کیا وہ اس پر (وبال) ہوگا۔"

﴿اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ ۟ وَ اِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَہَا ؕ﴾ (الاسراء: ۷)

"اگر تم اچھائی کرو گے تو اچھائی اپنے لیے کرو گے اور اگر برائی کرو گے تو بھی اپنے لیے۔"

﴿اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ اَنۡ یَّسۡبِقُوۡنَا ؕ﴾ (العنکبوت: ۴)

"کیا برے اعمال کرنے والے سمجھتے ہیں کہ وہ ہم سے نکل جائیں گے؟"

﴿اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَہُمۡ کَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحۡیَاہُمۡ وَ مَمَاتُہُمۡ ؕ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ (الجاثیہ: ۲۱)

"کیا جن لوگوں نے برے کام کیے کیا انھوں نے سمجھ لیا ہے کہ ہم انھیں ایسے کر دیں گے جیسے ایمان اور اچھے اعمال والے ہیں ان کا جینا اور مرنا برابر ہے؟ وہ بہت برا فیصلہ کر رہے ہیں۔"

﴿ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۟ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ۭ ﴾ (الزمر:۷)

”اگر تم کفر کرو تو اللہ تعالیٰ تم سے غنی ہے اور وہ اپنے بندوں سے کفر کو پسند نہیں کرتا اور تم شکر کرو تم سے راضی ہوگا۔“

﴿ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْۗـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ؀ ﴾ (یونس:۴۱)

”اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو آپ فرما دیجیے کہ میرے لیے میرا عمل اور تمہارے لیے تمہارا عمل تم میرے عمل سے بری اور میں تمہارے عملوں سے بری ہوں۔“

﴿ قُلْ لَّا تُسْـَٔــلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔــلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ؀ ﴾ (السبا:۲۵)

”آپ فرما دیجیے کہ جو ہم نے جرم کیا اس کے بارے میں تم سے نہیں پوچھا جائے گا اور جو تم نے اعمال کیے اس کے بارے میں ہم سے سوال نہیں ہوگا۔“

﴿ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ؀ ﴾ (الانعام:۱۳۵)

”آپ فرما دیجیے کہ تم لوگ اپنی جگہ عمل کرتے رہو میں بھی عمل کرتا ہوں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ آخرت کا گھر کس کے لیے ہے بے شک ظالم لوگ کامیاب نہیں ہوں گے۔“

﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰي بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ؀ ﴾ (ھود:۱۱۷)

”اور تیرا رب ایسا نہیں کرے گا کہ کسی بستی کو ظلم سے ہلاک کر دے اور اس کے باشندے نیک ہوں۔“

﴿ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؀ۚ ﴾ (التوبہ:۱۰۵)

”اور آپ فرما دیجیے کہ آپ عمل کرو عنقریب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ تمہارے عمل کو دیکھیں گے اور عنقریب تم اس ذات کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو ظاہر اور پوشیدہ سب جاننے والا ہے پھر وہ تمہیں تمہارے اعمال کے بارے میں بتلا دے گا۔“

﴿ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؀ ﴾ (الزخرف:۷۲)

”اور یہ جنت ہے جس کا تمہیں وارث بنایا گیا ان اعمال کی وجہ سے جو تم کرتے تھے۔“

اسی طرح ہم سنت نبویہ میں پڑھتے ہیں کہ: ”عمل کرتے رہو ہر شخص کے لیے وہ اعمال آسان کر دیے گئے جن کے لیے اسے پیدا کیا گیا۔“ ①

---

① بخاری کتاب الادب ۱۲۰، کتاب القدر ۴، مسلم کتاب القدر ”السنۃ“ ابی داؤد ۱۶، ترمذی کتاب القدر ۳، ابن ماجہ المقدمۃ ۱۰، مسند احمد ۱/ ۸۲،۶

"اعمال میں جلدی کرو ان فتنوں سے پہلے جو اندھیری رات کے حصے کی طرح آئیں گے۔" ①

"سمجھدار وہ ہے جو اپنے آپ کا محاسبہ کرے اور مرنے کے بعد (کی زندگی) کے لیے اعمال کرے۔" ②

"اے عباس بن عبدالمطلب! عمل کیجئے میں آپ کو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا اور اے فاطمہ بنت محمد عمل کر کیونکہ میں اللہ کے مقابلے میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔" وغیرہ وغیرہ۔

ان نصوص میں جب بندہ غور کرتا ہے تو اسے گنجائش نہیں رہتی کہ وہ بندوں کے اعمال اختیاریہ کو ان کی طرف لوٹائے۔ اس عقیدہ کی بناء پر کہ اگر وہ اچھے اعمال کریں گے تو ثواب کے مستحق ہوں گے اور اگر برے اعمال کریں گے تو عقاب کے مستحق ہوں گے۔

اور یہ نقلی دلائل کچھ عقلی دلائل بھی ظاہر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عدالت اور حکمت پر شاہد ہیں اس لیے کہ بندہ اگر موجد نہ ہوتا تو اپنے اعمال کو اختیار نہ کرتا اس لیے کہ اس موقع پر اس کے ثواب یا عقاب کی وجہ ہے اور ثواب یا عقاب ان اعمال پر کیسے ہوسکتا ہے جو اس کے نہ ہوں اور اس سے صادر نہ ہوئے ہوں۔

غَيْرِيْ جَنٰى وَاَنَا الْمُعَذَّبُ فِيْكُمْ فَكَاَنَّنِيْ سَبَّابَةُ الْمُتَنَدِّمِ

"گناہ کسی اور نے کیا اور تمہارے سامنے عذاب مجھے دیا جا رہا ہے۔ گویا کہ میں پچھتانے والے کی شہادت کی انگلی ہوں۔"

اہل سنت کو پہلی نصوص نے حیران پریشان کر دیا پھر ان کے ساتھ عقلی دلائل نے بھی تھکا دیا چنانچہ انھوں نے انھیں ترجیح دی اور فرمایا کہ: "بندہ اپنے افعال اختیاریہ کا خالق نہیں ہے بلکہ خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور جب انھیں کہا گیا کہ آدمی کو ان اعمال پر ثواب یا عقاب کیوں دیا جاتا ہے جن کو اس نے ایجاد نہیں کیا؟ یہ اور اللہ تعالیٰ کی عدالت اور اس کی حکمت مخلوق کو مکلف بنانے میں کیسے جمع ہوسکتی ہیں؟ تو انھوں نے کہا کہ بندے (اگرچہ اپنے اعمال کے خالق نہیں پھر بھی) کاسب ہیں اور کسب ہی تکلیف کی علت اور ثواب وعقاب کا مدار ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا عدل اور حکمت متحقق ہوتی ہے اس شریعت میں جسے اللہ تعالیٰ نے مکلفین کے لیے مقرر کیا ہے۔

اسی طرح انھوں نے پہلی نصوص کو خلق پر محمول کیا اور دوسری نصوص کو کسب پر تاکہ دونوں قسم کے ادلہ کو جمع کیا جائے پھر جب انھیں کہا گیا کہ یہ کسب کیا ہے کہ اس کی تحدید میں اشعری اور ماتریدی کا اختلاف ہے؟ کیا یہ قدرت قدیمہ للحادث کے مقارن یا عزم مصمم ہے ہر توجیہ پر نظر ہے اس کی شرح اور توجیہ لمبی ہے۔

جبکہ معتزلہ کو دوسری قسم کی نصوص اور ان کا اظہار کرنے والے دلائل نقلیہ نے تھکا کر رکھ دیا انھوں نے انھیں ترجیح دی اور کہا کہ بندہ اپنے افعال اختیاریہ کا خالق ہوتا ہے۔ جب انھیں کہا گیا کہ کیا اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق نہیں ہے اور بندوں کے اعمال اسی کی طرف سے نہیں ہیں؟ تو انھوں نے کہا کہ کیوں نہیں وہ ہر چیز کا خالق ہے حتیٰ کہ بندوں کے افعال اختیاریہ کا بھی وہ خالق ہے لیکن اس نے بعض اشیاء کا بغیر واسطہ کے خلق کیا اور بعض کا واسطہ کے ساتھ بندوں کے اعمال از قبیل ثانی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسے واسطے

① مسلم کتاب الایمان حدیث ۱۸۶، ابوداؤد کتاب الفتن باب ۲، ترمذی کتاب الفتن باب ۳۰، ابن ماج کتاب الفتن باب ۱۰، مسند احمد ۱/ ۱۸۹

② ترمذی کتاب القیامۃ باب ۲۵، ابن ماجہ کتاب الزہد ۳۱، مسند احمد ۴/ ۱۲۴

سے پیدا کیا جن کے آلات انھی میں ہیں اور ان کے آلات تقدیر کلی اور ارادہ کلی ہیں۔ جو طرفین میں سے ہر ایک کے ساتھ تعلق کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ہمیں کوئی قوت اور طاقت نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم نے انھیں دو وجوہ میں سے ایک وجہ پر استعمال کیا یا تو حسن اختیار پر یا سوء اختیار پر پھر ہمارے نزدیک کوئی قول مانع نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے افعال کا خالق ہے لیکن علی سبیل المجاز اس اعتبار سے کہ وہ ان کے اسباب اور وسائل کا خالق ہے۔

جب انھیں کہا گیا کہ تمہارے مذہب سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فعل میں اس کے بہت سے شرکاء ہوں اور وہ اس کے مکلف بندے ہیں اور یہ عقیدۂ توحید اور برہان وحدانیت کے منافی ہے انھوں نے کہا کہ ہم اسے تسلیم نہیں کرتے اور نہ ہی اس کے قائل ہیں کیونکہ وحدانیت کا معنیٰ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے علاوہ کی ذات، صفات یا افعال کی نفی کی جائے بلکہ اس کا معنی یہ ہے اللہ کے غیر کی ذات، صفات یا افعال میں اس کے مشابہ ہونے کی نفی کی جائے اور اے اہلسنت تم ایسی ذوات کے وجود کو منع نہیں کرتے جو اس کی ذات کے مشابہ نہ ہوں اور نہ ایسی صفات کے وجود کو منع کرتے ہو جو اس کی صفات کے مشابہ ہوں تو پھر ایسے افعال کے وجود کو منع کیوں کرتے ہو جو اس کے مشابہ نہ ہوں؟ اور یہ ہی ہمارا قول ہے کہ بندے اپنے افعال کے خالق ہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے افعال کے مشابہ نہیں ہیں۔

اسی طرح دونوں جماعتوں کے لیے قوی دلائل اور عمدہ تاویل ہیں جن کے ذریعے وہ ان نصوص کی تاویل کرتے ہیں جو ان نصوص کے مقابلے میں ہیں جنھوں نے انھیں تھکا دیا اور انھوں نے انھیں ترجیح دی اور ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ یہ دونوں جماعتیں کسی ایسی ممنوع چیز کا التزام نہیں کرتیں کہ دوسری جماعت اسے اس کے ساتھ لازم کر کے اسے باہمی نزاع و اختلاف کے مقابلے میں لا کھڑا کرے بلکہ وہ اپنی رائے کی ایسی توجیہ کرتی ہے جس کے ذریعے وہ ممنوع کا ارتکاب کرنے سے دور ہو جائے۔ پھر ہمیں یہ بات بھی ملتی ہے کہ دونوں جماعتیں لمبا گھوم گھما کر آخر میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی حکمت کے درست اعتقاد کے نقطے پر جمع ہو جاتی ہیں لیکن اس توجیہ کی بناء پر جو اس کے سامنے واضح ہوئی اور اس کے ہاں رائج ہوئی۔

پھر منصف کیسے راضی ہو سکتا ہے کہ ایک پر جرح کرے اور اس پر بدترین تہمت یعنی کفر اور شرک یا ہوائے نفس کی تہمت لگائے؟ اور ہم پر کونسا پہاڑ گر جائے گا کہ ہم دوسرے کو رسوا کیے بغیر جس کو چاہیں ترجیح دیں بلکہ اگر ہم خاموشی کی آڑ میں محفوظ ہو جائیں اور سکوت کی پناہ لیں اور اس طرح کی باریک اور دشوار چیزوں اور پُر پیچ بعید مسالک میں نہ پڑیں تو ہم پر کونسا پہاڑ گر جائے گا خاص کر کہ رحمٰن و رحیم نے ہمیں اس کا مکلف بنایا ہی نہیں اور نہ ہی اسے ہم پر فرض کیا ہے۔

ہمارے سلف صالحین اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے عدل پر ایمان رکھتے تھے اس کی تقدیر اور حکم پر ایمان رکھتے تھے اور ان نصوص پر بھی ایمان رکھتے تھے اور اس بات پر بھی ایمان رکھتے تھے کہ بندہ اپنے اعمال کو کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے اور اس بات پر بھی ایمان رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت میں مغلوب یا عاجز آنے سے پاک ہے اور اس بات سے بھی پاک ہے کہ وہ ظالم ہو یا عبث کرنے والا ہو پھر اس کے بعد وہ خاموش ہو جاتے تھے اور اس میں نہیں پڑتے تھے کہ انسان کے اعمال اختیاریہ میں کتنا حصہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ہے اور کتنا حصہ بندے کی قدرت کا ہے اور وہ کسی ایسے بیان کے پیچھے نہیں پڑتے تھے کہ جس سے اللہ تعالیٰ کی قدر میں اس کی مسافت کی حد بندی ہو جائے اور نہ ہی کسی ایسے بیان کے پیچھے پڑتے جس میں ایسی مسافت کی وضاحت

ہو جائے کہ جو بندے کو اس کے حکم کی فرماں برداری تک پہنچا دے یہ ایسی چیز ہے جسے نہ وہ جانتے تھے اور نہ ہی اس کی کوشش کرتے تھے اس لیے کہ وہ اس کے مکلف ہی نہیں بنے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر اس سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے کہ انھیں اس کا مکلف بنائے اس لیے کہ یہ اس کی تقدیر کے اسرار ہیں یا اس کے قریب ہیں اور انسانی عقل کی سوچ بھی محدود ہے اور استعداد بھی ضعیف ہے۔ اور عقلوں کی حرص ہوتی ہے کہ وہ ایسی چیز کو طلب کرتی ہیں جس کی طرف ان کو کوئی راہ نہیں ہوتی۔

﴿وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾ (الاسراء: ۸۵)

"اور تمھیں بہت ہی کم علم دیا گیا۔"

ہمیں ایسا نہیں آزمایا کہ جس سے عقلیں تھک جائیں ہم پر حرص کرتے ہوئے نہ ہم نے کوئی شک کیا نہ وہم۔ ان اختلافات کے ہوتے ہوئے ہم پر کیا واجب ہے:

میرا یہ کام نہیں کہ میں اس مسئلہ میں یا اس جیسے مسئلہ میں قول کی تفصیل کروں اس لیے کہ اس کی تفصیل کے لیے ایک اور علم ہے یہ تو ایک مثال ہے جس میں قلیل پر اکتفاء کرتے ہیں اور ایک اہم نصیحت کے ساتھ اس سے باہر نکلتے ہیں۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ مختلف فرقوں اور گروہوں میں بٹ جائیں اور ایسے امر کی وجہ سے جو دین میں سے نہیں چہ جائیکہ وہ دین کے اصول سے ہو اور جب ہم نے اس میں گھسنے والوں کے لیے عذر تلاش کر لیا کہ وہ مشتبہین کے شبہات سے یا گمراہ کرنے والوں کی گمراہی میں دور کرنے کے لیے اس میں گھسے جبکہ ہم کبھی بھی کسی ایک شخص کے لیے بھی کوئی عذر تلاش نہیں کر سکتے جس نے ان کے اور ان کے دینی بھائیوں کے درمیان پھیلنے والی لڑائی کو بھڑکایا اور ان کے لیے مناسب نہیں تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کے دشمن بن کر اور انھیں بے یار و مدد گار چھوڑ کر اس بحث سے نکلتے حالانکہ کل تک وہ آپس میں بھائی بھائی تھے ایک دوسرے کی بات سمجھتے تھے اور ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔

اس صورت میں ہمیں مضبوط کڑا پکڑ لینا چاہیے اور اپنے اختلافات کے لیے سینوں کو کشادہ کرنا چاہیے اس لیے کہ صدر اسلام اس کی وسعت رکھتا ہے اور جاننا چاہیے کہ اسلام تمام مذاہب اور آراء سے وسیع تر ہے اگر آج آپ کا ظرف اپنے بھائی کے لیے تنگ ہے تو کل آپ کو بھی صرف اسی کی رائے نظر آئے گی۔ جب آپ اس کے نقطہ نظر پر اکتفاء کریں گے تحقیق بڑے بڑے علماء نے اپنی رائے سے رجوع کیا بلکہ اپنے مذاہب سے رجوع کیا۔ اور شاید آپ جانتے ہوگے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک مذہب قدیم تھا اور ایک مذہب جدید ہے اور عقائد و اصول میں اختلاف کے بارے میں شبہات زیادہ ہیں بنسبت احکام و فروع کے اختلاف کے۔

ان تمام وجوہات کی بنا پر آپ مجھے دیکھ رہے ہے کہ اہل سنت والجماعت کو جاہل قرار دینے اور ان کی تحقیر میں اور ان پر جہالت، جمود اور ہوائے نفس کا الزام لگانے میں جیسے لوگ چل رہے ہیں میں ان کے ساتھ نہیں چلتا۔

﴿وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ (النور: ۱۶۔۱۸)

"اور جب تم نے اسے سنا تو کیوں نہ کہہ دیا کہ ہمیں شایاں نہیں کہ ایسی بات زبان پر لائیں (پروردگار) تو پاک ہے یہ تو

(بہت) بڑا بہتان ہے۔ خدا تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر مومن ہو تو پھر کبھی ایسا (کام) نہ کرنا۔ اور خدا تمہارے (سمجھانے کے لئے) اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔"

تنبیہ ⚙ میں چاہتا ہوں کہ قاری یہ نہ سمجھے کہ میں قرآن میں تاویل کرنے والے، اس کی نصوص سے کھیل کود کرنے والے دین کی تعلیمات سے کھیلنے والے ہر شخص کے بارے میں بے ضابطگی چاہتا ہوں بلکہ اس سے میری مراد اور امید یہ ہے کہ ہم مختلف تاویل کرنے والے لوگوں میں فرق کریں اور پھر غور کریں کہ کیا یہ تاویل درست ہے یا نہیں۔ یعنی لغت عربیہ کے قوانین اور اسلام میں طے شدہ قطعی باتیں جن کا دین سے ہونا ضروری ہے اور عقلی نقلی دلائل اس کی تائید کرتے ہیں یا نہیں؟

جو درست ہو اسے ہم قبول کریں گے اور مرحبا کہیں گے اگرچہ وہ ہماری رائے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور جو درست نہ ہو اس کو بغیر کسی تردد کے رد کر دیں گے اور بغیر کسی نرمی کے اس سے جنگ کریں گے اس لیے کہ تاریخ اسلامی کسی بھی ایسے دشمن کی گواہی نہیں دیتی جو ان بے کار لوگوں سے بڑھ کر اسلام کے لیے خطرناک ہوں جنھوں نے اس کی نصوص کے ساتھ کھیل کیا اور اس کی طے شدہ باتوں سے کو بے کار سمجھا۔ خواہ ماضی نے انھیں ختم کر دیا ہو جیسے باطنیہ یا حال نے انھیں مضبوط کیا ہو جیسے بہائیہ اس میں سب برابر ہیں۔ اور عنقریب آپ ان کی کچھ مثالیں سنیں گے۔

اسلام کی فراخ دلی اور اس کی تعلیمات کی آسانی

جیسا کہ ہم نے آپ کے سامنے ذکر کر دیا کہ اسلام ایک فراخ دل مذہب ہے اور اللہ تعالیٰ نے مخلوق میں سے کسی کو مکلف بنایا ہے تو صرف ان تعلیمات کا مکلف بنایا ہے جنھیں اس کی کتاب لے کر آئی ہے اور ان کی شرح اس کے نبی کریم ﷺ نے کی ہے اُس واضح اور آسان طریقے پر جو فلسفی باریکیوں اور فنی گرہوں سے بعید ہے۔

شاید اس اہم موضوع پر بطور اتمام فائدہ آپ کے سامنے کچھ کلمات کا خلاصہ پیش کریں جنھیں حجۃ الاسلام امام غزالی نے "الاحیاء" میں کہا جب لوگوں نے علوم کے الفاظ کو تبدیل کر دیا تو انھوں نے بیان کرتے ہوئے کہا (اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمت سے ڈھانپے) کہ:

لفظِ ثالث یعنی وہ اسماء محمودہ جو اغراض فاسدہ کے لیے نقل کیے گئے ہیں اور ان سے ایسے معانی مراد لیے گئے ہیں جو سلف صالحین اور قرن اولیٰ نے مراد نہیں لیے۔

توحید اس وقت اسے صناعت کلام جھگڑے کے طریقے جاننا، جھگڑوں کے اعتراضات فسادات کے طرق کا احاطہ کرنا، زیادہ سوالات کر کے اس میں زور شور پر قدرت، شبہات پیدا کرنا، الزامات کو اکٹھا کرنا وغیرہ کے معانی میں استعمال کیا جاتا ہے حتیٰ کہ ایک جماعت نے اپنا لقب ہی اہل العدل والتوحید رکھ لیا ہے اور متکلمین نے اپنا نام علماء توحید رکھ لیا ہے حالانکہ اس فن کی جتنی بھی خاصیات ہیں وہ پہلے زمانے میں معروف بھی نہیں تھیں بلکہ جو شخص جدل اور لڑائی کا دروازہ کھولتا اس پر شدید انکار ہوا کرتا تھا البتہ قرآن کی وہ ادلہ ظاہرہ جن کی طرف اول سماع میں ذہن قبولیت کی طرف سبقت کرتا ہے وہ ہر ایک کو معلوم ہیں اور قرآن پاک کا علم ہی مکمل ہے اور توحید علماء کے نزدیک ایک اور امر کا نام ہے جسے اکثر متکلمین سمجھتے ہی نہیں اور اگر سمجھتے بھی ہیں تو اس سے متصف نہیں ہوتے اور وہ معنی یہ ہے کہ: "تمام امور کے بارے میں یقین کرے کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور اس طرح یقین

کرے کہ اسباب اور وسائط سے توجہ بالکل ختم ہو جائے اور کسی بھی خیر یا شر کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی طرف سے نہ سمجھے۔"... آگے فرماتے ہیں کہ:

توحید ایک جوہرِ نفیس ہے اس کے دو چھلکے ہیں ایک چھلکا دوسرے کی بنسبت گودے سے دور ہے اور لوگوں نے چھلکے کے نام کو خاص کر لیا اور صنعت حراست کو دوسرے چھلکے کے لیے خاص کر لیا اور گودے کو بالکل چھوڑ دیا پہلا چھلکا "لا الٰہ الا اللہ" کہنا ہے اسے توحید کا نام بھی دیا جاتا ہے جو نصاریٰ کی تثلیث کے مناقض ہے مگر بعض اوقات اس سے بھی صادر ہو جاتا ہے جو اپنے باطن کو ظاہر کے خلاف رکھتا ہے اور دوسرا چھلکا یہ ہے کہ دل میں اس قول کے مفہوم کا انکار نہ آئے بلکہ ان کا ظاہر اس کے اعتقاد اور تصدیق پر مشتمل رہے یہ عام لوگوں کی توحید ہے جبکہ متکلمین جیسا کہ پیچھے گزرا کہ اس چھلکے کے محافظ ہیں جو بدعیتوں کی گڑبڑ سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ تیسرا گودا ہے گودا یہ ہے کہ یقین رکھے کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور ایسا یقین کہ وہ وسائط سے بالکل کاٹ دے، اور اسی کی عبادت کرے اور عبادت میں اسی اکیلے کو معبود بنائے اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرے اس توحید سے اتباع ہوئی نکل جاتا ہے اور جس نے بھی خواہش کی اتباع کی اس نے اپنا معبود خواہش کو بنا لیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿ اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـہَہٗ ہَوٰىہُ ﴾ (الفرقان: ۴۳)

"کیا آپ نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنا معبود اپنی خواہش کو بنا لیا۔"

اور فرمایا کہ: "زمین میں جتنے بھی معبود ہیں ان میں سب سے زیادہ ناپسند اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہوئی ہے۔"

اور حقیقت میں جو بھی شخص غور کرے گا کہ تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ بتوں کا بچاری حقیقت میں بتوں کا بچاری نہیں بلکہ اپنی ہوئی کا بچاری ہے اس لیے کہ اس کا دل اس کے آباء کے دین کی طرف مائل اور وہ اس میلان کی اتباع کر رہا ہے اور دل کا کسی ایسی چیز کی طرف مائل ہونا یہ بھی ان معانی میں سے ہے جنھیں ہوئی کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے اس توحید سے مخلوق پر غصہ کرنا کہ اور ان کی طرف التفات کرنا بھی نکل جاتا ہے اس لیے کہ جس شخص کو یقین ہو کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں تو وہ غیر اللہ پر کیونکر غصے ہوگا؟ چنانچہ توحید کا معنیٰ یہ مقام ہوگا اور یہ مقام صدیقین کا مقام ہے۔ اب آپ دیکھیں کہ کونسا چھلکا ہے جس سے اس کو ہٹا کر مطمئن کیا گیا اور کیسے اپنی مدح اور تفاخر میں اس ذات کی پناہ لیتے ہوئے اسے پکڑے ہوئے ہے جس کا نام محمود ہے حالانکہ وہ شخص اس معنی سے خالی ہے جس کی وجہ سے وہ حمد حقیقی کا مستحق ہے یہ اس شخص کے افلاس کی طرح ہے جو صبح کو اٹھ کر قبلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ:

﴿ اِنِّیۡ وَجَّہۡتُ وَجۡہِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا ﴾ (الانعام: ۷۹)

"میں نے یکسو ہو کر اپنا چہرہ اس ذات کی طرف پھیرا جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔"

یہ پہلا جھوٹ ہے۔ جس کے ذریعے وہ روز اللہ تعالیٰ سے بات کرتا ہے اس نے اپنا دل خاص کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں پھیرا کیونکہ اگر اس کے چہرے سے مراد ظاہری چہرہ ہے تو اس کا چہرہ کعبہ کی طرف ہی ہو سکتا ہے اور اس کا پھرنا باقی جہات سے پھیرنا ہی ہو سکتا ہے اور کعبہ اس کی جہت نہیں ہے جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا کہ اس کی طرف منہ پھیرنا اللہ کی طرف پھیرنا ہو جائے

کیونکہ اس سے اُس کے لیے جہت اور سمت کی حد بندی ہو جائے گی اور اگر اس سے مراد دل کا رخ ہے تو اس کی عبادت یہی مطلوب ہے پھر اس کے قول میں یہ کیسے صادق آ سکتا ہے حالانکہ اس کا قول اپنی ضروریات اور حاجات میں لگا ہوا ہے اور مال جاہ اور اسباب کی کثرت کو جمع کرنے میں مصروف ہوتا ہے اور پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو پھر کیسے اس نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف متوجہ کر لیا ہے جس نے آسمان وزمین کو پیدا کیا اور یہ کلمہ توحید کی حقیقت کی خبر ہے چنانچہ موحدہ ہے جو واحد کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھتا اور اس کے علاوہ کسی کی طرف رخ نہیں کرتا اور یہ اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ﴾ (الانعام:۹۱)

"آپ فرما دیجئے کہ وہ اللہ ہے، اور پھر انھیں ان کی بیہودہ باتوں میں چھوڑ دو تا کہ وہ ان میں کھیلتے پھیریں۔"

اس سے مراد زبان کا قول نہیں بلکہ زبان ترجمان ہے جو ایک مرتبہ بولتی اور دوسری مرتبہ جھوٹ بولتی ہے اللہ تعالیٰ کا مقصد وہ ہے جس سے ترجمانی کی جاتی ہے۔ یعنی دل یہی توحید کا سرچشمہ اور بنیاد ہے۔

اس سے آپ نے توحید کے علم سے چشم پوشی نہ سمجھ لینا خصوصاً جب آپ کے سامنے اس مقام پر تصریح ہوگئی کہ یہ بدعتیوں کی گڑ بڑ سے توحید کے عقیدے کے چھلکے کی حفاظت کرتی ہے لیکن اس کی تنقید چھلکوں میں اسراف اور گودے کو چھوڑ دینے پر ہوتی ہے۔ جیسا کہ آپ نے سن لیا۔

استاد امام کی تحقیق: استاد امام شیخ عبدہ نے بھی اس مسئلہ میں "العقائد العضدیہ" کتاب کے حاشیہ پر کلام کیا ہے انھوں نے اس میں فرق مخالفہ کے ساتھ بہت زیادہ وسعت کی ہے۔ چنانچہ جب ان کے سامنے ترمذی کی حدیث پڑھی گئی کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے اور وہ سب کے سب آگ میں جائیں گے سوائے ایک کے کسی نے پوچھا کہ وہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ اس دین پر ہوں گے جس پر میں اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم ہوں گے۔" پھر شیخ نے اپنی بحث کو ختم کرتے ہوئے فرمایا کہ: "حق جس کی طرف عقل اور شریعت رہنمائی کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ناظر متدین جو صانع واجب الوجوب کے اثبات کے دلائل صحیحہ قائم کرنے کو اختیار کرے اس کے بعد نبوات کے اثبات کو اختیار کرلے پھر نبوت جو کچھ بھی لے کر آئی اسے تصدیق وتسلیم کے ساتھ لے اور اس میں الفاظ کی گہرائی کی تحقیق تفتیش نہ کرے بلکہ اپنی طاقت کے بقدر ان چیزوں کا تحقیق کرے جن کا تعلق اعمال کے ساتھ ہے۔ پھر اپنے تمام عقائد کی بنیاد میں دلائل صحیحہ کے ساتھ تحقیق کا راستہ اپنائے تو جہاں تک بھی پہنچ پائے لیکن انتہائی تحری اور اجتہاد کے ساتھ۔

پھر اس کی فکر جب اس بات کی طرف پہنچ جائے جو اس کے رب کی طرف سے آئی ہے اور ظاہر طور پر وہ اسے اپنی تحقیق کے موافق بھی پائے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے ورنہ تاویل سے روگردانی کرے اور کہے کہ:

((امنا به كل من عند ربنا)).

"ہم اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔"

کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی ﷺ کی مراد اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی جانتے ہیں اسی طریقہ پر وہ چلے گا تو وہ اللہ تعالیٰ

کی طرف سے اس کی رضا لے کر لوٹے گا۔ کیونکہ اس نے اپنے عقائد کی بنیاد درست دلائل پر رکھی اور اخبار الٰہیہ کو قبول و تسلیم کے ساتھ لیا اور انھیں قلب سلیم کے ساتھ لیا۔

اور اگر وہ کسی غرض کی وجہ سے تاویل کرنا چاہے جیسے مخالف کا رد یا انکار کرنے والے کو مطمئن کرنا تو اس پر کوئی حرج نہیں جب کہ وہ اس کے دلائل کو تقلید و تشویش سے ہٹ کر تسلیم کرے اور یہی طریقہ ہمارے مشائخ کا ہے جیسے شیخ اشعری رحمہ اللہ اور شیخ ابو منصور رحمہ اللہ وغیرہ۔ کوئی بھی قول اس وقت تک نہیں لیتے تھے جب تک کہ اپنی طاقت کے بقدر اس کی براہین قویہ کے ساتھ درستگی نہیں کر لیتے تھے اور ابن السنی، صوفی اور حکیم نے بھی اس کو ترجیح دی ہے اور جو بھی تفرقہ باز اور جھگڑالو ہے وہ ضد کا طالب ہے اور کلمہ کو بکھیرنا چاہتا ہے وہ آگ میں جائے گا اور جو شخص بھی کمی کرے گا اسی پر عار اور رسوائی ہوگی۔ اس لیے سیدھے راستے پر چلیے اور ڈریے کیونکہ ان کے بعد بھی بہت سے لوگ آئے۔

کمال نجات اور سعادت ابدیہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے ساتھ رذائل سے پاکی اور اخلاق کاملہ اور اعمال فاضلہ سے آراستہ ہونے کو بھی ملائیں ان اخلاق اور اعمال میں سے قوت نظریہ کی تکمیل اور ہر چیز میں عدل والے راستے کو اختیار کرنا بھی ہیں اس لیے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو بھی ان چیزوں کی مخالفت کرے گا جن پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں" ہمت، سداد، عدل اور انصاف اور تمام اخلاق و اعمال میں استقامت کے طریقے پر چلنا اور لینے دینے میں نور بصیرت" وہ دوزخ کی آگ میں ہوگا اور جو شخص اس طریقے پر ہوگا جن پر یہ حضرات (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) ہیں تو وہ جنت کے اعلیٰ درجوں پر ہوگا۔

اس طریقے پر چلنے والا یا تو اس کا چلنا قرآن وسنت کے مفہوم اور نئے پرانے اولو الفضل راشدین کے کلام میں غور کرنے کی وجہ سے ہوگا تو یہ اعلیٰ درجے کا حکیم اور متوسط مؤمن ہے یا وہ اس کے ساتھ اپنے آپ کو مدارج انوار پر چلائے گا اور اس میں پائے جانے والے اسرار کی باریکیوں پر آگاہ ہوگا حتیٰ کہ وہ اسی زندگی میں اعلیٰ مرتبہ پائے گا۔ تو یہ صوفی ہے اور اونچے مقصد اور اعلیٰ مطلوب والا ہے اور ان مراتب کو گنا نہیں جا سکتا اور ان ترقیوں کو پہنچا نہیں جا سکتا۔ یہ اور اس کے ماقبل دونوں کو "مومن صادق" کا نام شامل ہے لہٰذا جس میں یہ نور متحقق ہوگا اس کے لیے نجات اور سرور ہے خواہ وہ کوئی بھی ہو اس لیے کہ اس میں وہ چیز پائی جاتی ہیں جن پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ اب ہمیں قلم روک دینا چاہیے کیونکہ مقصود اختصار ہے واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب فَأَسئلك لنفسك طريق السداد وانظر فيما يكون لك بعين الرشاد۔

اب میں اس موقع پر قلم کو روکتا ہوں یہ امید کرتے ہوئے کہ میں نے اس اہم مقام کا حق ادا کر دیا اور میں نے مبادی اسلامیہ رشیدہ کے اصول میں کامیابی حاصل کر لی جبکہ نظریاتی وجوہ میں اختلاف اور افکار کے نزاعات میں تباین تھا اللہ تعالیٰ ہمیں عناد، غرور اور فتنہ کے شر سے بچائے۔ اور ساری امت کو کتاب وسنت کے حقائق پر جمع کرے۔ آمین

تفسیر بالرائے میں سے کونسی جائز اور کونسی ناجائز ہے

اس مقام پر رائے سے مراد اجتہاد ہے اگر اجتہاد موفق ہو یعنی مستند ہو ایسی چیز کی طرف جو جہالت اور ضلالت سے بعید ہو اس کے ساتھ تفسیر محمود ہے۔ ورنہ مذموم ہے اور وہ امور جن کی طرف تفسیر میں رائے کا استناد واجب ہے انھیں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "الاتقان" میں زرکشی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

قرآن میں غور کرنے والے کے لیے تفسیر کی طلب میں بہت سے مآخذ ہیں جن کی بنیاد چار چیزیں ہیں۔

① رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل اور اس میں ضعیف اور موضوع سے احتراز کیا جائے۔

② صحابی کا قول لیا جائے لیکن بعض نے کہا کہ یہ بھی مطلقاً مرفوع کے حکم میں ہے اور بعض حضرات نے اسے اسباب نزول وغیرہ کے ساتھ خاص کیا ہے جن میں رائے کی گنجائش نہیں۔

③ لغت کو مطلقاً لینا اور اس میں آیات کو پھیرنے سے احتراز ہو سوائے اس کے کہ اس پر کلام عرب کثرت کے ساتھ دلالت کرتا ہو۔

④ کلام جس کا تقاضا کرتا ہو اور قانون شرعی اس پر دلالت کرتا ہو۔ اور یہ چوتھی نوع ہی ہے جس کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو دعا دی کہ:

((اللهم فقهه في الدين وعلمه التأويل)).

"اے اللہ اسے دین میں تفقہ اور تاویل کا علم عطا فرما"

چنانچہ جس نے اپنی رائے سے قرآن پاک کی تفسیر کی یعنی اپنے اجتہاد پر جو ان مآخذ معتمدہ پر آگاہی کو لازم ہوں جنھیں وہ کتاب اللہ کے معانی سمجھتا ہے تو اس کی تفسیر درست اور جائز ہوگی اور اس لائق ہوگی کہ اسے تفسیر جائز یا تفسیر محمود کہا جائے اور جو شخص ان اصول سے ہٹ کر قرآن پاک کی تفسیر کرے گا اس پر اعتماد نہیں کیا جائے گا اس کی تفسیر ساقط اور نچلے درجہ کی ہوگی اور اس قابل ہوگی کہ اسے تفسیر غیر جائز یا تفسیر مذموم کہا جائے۔

چنانچہ تفسیر بالرائے جائز میں ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقولات پر اعتماد کا لحاظ کیا جائے یہی وہ چیز ہے جو مفسر بالرائے کے لیے راستہ منور کرتی ہے۔ اور اسے قوانین لغت کو جاننے والا اور ان کے اسلوب کو پہچاننے والا ہونا چاہیے اور قانون شریعت کی بصیرت رکھنے والا حتیٰ کہ وہ کلام اللہ کو اسی شریعت پر رکھے جو معروف ہے۔

اور وہ امور جن سے تفسیر بالرائے میں بچنا چاہیے ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ لغت اور شریعت کے قوانین سے جاہل ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے کلام سے اس کی مراد پر جھڑپ پڑنا اور ایک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو مذاہب فاسدہ پر محمول کرنا اور ایک یہ کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص کر لیا ان میں گھسنا اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بغیر دلیل کے قطعی فیصلہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہی ہے اور ایک یہ بھی ہے کہ خواہش اور استحسان کے ساتھ چلنا۔

ان پانچ امور کا خلاصہ دو کلمات میں ہو سکتا ہے: ① جہالت ② ضلالت

جاننا چاہیے کہ قرآن کے علوم کی تین اقسام ہیں۔

① ایک وہ علم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو مطلع نہیں فرمایا بلکہ صرف اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے جیسے اس کی ذات صفات کی حقیقت کا علم، اور وہ غیوبات جنھیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور اس پر اجماع ہے کہ اس نوع کے بارے میں کلام کرنا کسی کے لیے جائز نہیں۔

② وہ علوم جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کیا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہیں اس کے بارے میں کلام کرنا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں۔ بعض نے کہا کہ سورتوں کے اوائل بھی اسی نوع میں سے ہیں۔

③ وہ علم جس کے بارے میں کلام کرنا بطریق سماع ہی جائز ہے جیسے ناسخ منسوخ، قراءات، امم ماضیہ کے قصے، اسباب نزول اور حشر، نشر اور معاد کی خبریں۔

④ وہ علوم جو بطریق نظر و استدلال معلوم ہو جاتے ہیں ان میں سے بعض کے جواز میں اختلاف ہے اور وہ آیات متشابہات سے متعلقہ علم ہے اور بعض وہ ہیں جس کے جواز پر اتفاق ہے یہ وہ علم ہے جس کا تعلق احکام، مواعظ، امثال اور حکم وغیرہ والی آیات کے ساتھ ہے۔ اور یہ اس کے لیے جائز ہے جس میں اجتہاد کی اہلیت ہو۔

وہ علوم جن کی مفسر کو ضرورت ہوتی ہے

علماء کرام نے علوم کی ان انواع کو بیان کر دیا ہے جن کا مفسر میں ہونا ضروری ہے چنانچہ انھوں نے فرمایا کہ وہ لغت، نحو، صرف، علوم البلاغت، علم اصول فقہ، علم توحید، اسباب نزول کی معرفت، قصص، ناسخ، منسوخ، مجمل اور مبہم کی وضاحت کرنے والی احادیث، علم وہبی اور یہ علم اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو عطا کرتا ہے جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں اور جس کے دل میں بدعت، تکبر، دنیا کی محبت، یا گناہوں کی طرف میلان ہوتا ہے اللہ تعالیٰ یہ علم انھیں عطا نہیں فرماتا۔

﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (الاعراف:۱۴۶)

"میں عنقریب اپنی آیات سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں۔"

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ:

شکوت الی وکیع سوء حفظی فارشدنی الی ترك المعاصی

"میں نے وکیع سے اپنے کمزور حافظہ کی شکایت کی۔ انھوں نے میری گناہ چھوڑنے کی طرف رہنمائی کی۔"

واخبرنی بأن العلم نور ونور الله لا یعطی لعاصی

"اور مجھے بتلایا کہ علم ایک نور ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا نور گنہگار کو نہیں دیا جاتا۔"

تنبیہ ○ یہ شرائط جنھیں ہم نے ذکر کیا یہ تمام علوم تفسیر کے اعلیٰ مراتب کی تحقیق کے لیے ہیں۔ اور ان میں ان اہم اعتبارات کا بھی اضافہ ہوگا جو آنے والے قیمتی کلمات میں لکھے گئے ہیں۔ بہرحال وہ معانی جن کے ذریعے آدمی اپنے مولد کی عظمت کو سمجھتا ہے اور وہ

معانی جنھیں انسان لفظ کریم کے اطلاق کے وقت سمجھتا ہے وہ مقدار ہے جو عام لوگوں کے درمیان مشترک ہے اور یہ وہ ہے جس کا تدبر وتذکر کے لیے حکم دیا گیا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے آسان اور سہل بنا دیا ہے اور یہ تفسیر کا ادنی مرتبہ ہے۔

علامہ مرحوم شیخ محمد عبدہ نے فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

تفسیر کے کئی مراتب ہیں سب سے ادنی یہ ہے کہ اجمالی طور پر واضح ہو جائے جو دل کو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی پاکی سے سیراب کر دے اور نفس کو شر سے پھیر کر کہ خیر کی طرف کھینچ لے جائے۔ یہی وہ تفسیر ہے جس کے بارے میں ہم نے کہا کہ یہ ہر ایک کے لیے آسان ہے۔

﴿وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝﴾ (القمر: ۱۷)

"اور تحقیق ہم نے قرآن پاک کو آسان کیا نصیحت حاصل کرنے کے لیے تو کوئی ہے جو نصیحت قبول کرنے والا ہو۔"

اور سب سے اونچا مرتبہ جو مندرجہ ذیل امور کے بغیر تام نہیں ہو سکتا۔

① قرآن کے الفاظ مفردہ کے حقائق کا فہم وہ اس طرح کہ مفسر اہل لغت کے استعمالات کی تحقیق کرے گا صرف اس پر اکتفا نہیں کرے گا کہ فلاں نے کہا اور فلاں نے سمجھا کیونکہ بہت سے الفاظ قرآن کے نزول کے وقت ایک معنی میں استعمال ہوتے تھے پھر زمانہ قریب یا بعید میں ان کا استعمال دوسرے معانی میں ہونے لگ گیا۔ اسی سے تاویل کا لفظ ہے کہ یہ مطلقاً تفسیر یا خاص تفسیر کے معنی میں مشہور ہو گیا جبکہ قرآن پاک میں اس کا استعمال دوسرے معنی کے لیے ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ﴾ (الاعراف: ۵۳)

"کیا وہ لوگ کسی انجام کا انتظار کر رہے ہیں جس دن ان کا انجام آ جائے گا تو جو لوگ پہلے سے اس انجام کو بھلا چکے تھے وہ کہیں گے کہ ہمارے اب کے رسول واقعی حق لے کر آئے تھے۔"

اس سے مراد انجام ہے اور وہ مراد ہے جو قرآن پاک میں ثواب یا عقاب میں شمار ہوتا ہے یعنی وہ چیز جو اس کے وعدے اور وعید کا سبب بنتی ہے چنانچہ محقق مدقق یہ ہے کہ قرآن پاک کی تفسیر ان معانی کے مطابق کرنی چاہیے جو اس کے نزول کے وقت مستعمل تھے سب سے بہتر یہ ہے کہ قرآن پاک کے الفاظ خود مفہوم ہو جائیں وہ اس طرح کہ اس کے جو الفاظ کئی جگہ بار بار آئے ہیں ان کو جمع کر کے ان میں غور کرے بعض اوقات وہ مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے لفظ "ہدایت" وغیرہ اور تحقیق کرے کہ اس کا معنی آیت کے جملہ میں کیسے متفق ہوتا ہے پھر اس کے معانی کے بیچ سے معنی مطلوب کو پہچانے۔ علماء نے فرمایا کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے کی تفسیر کرتا ہے سب سے افضل قرینہ جو لفظ کے معنیٰ کی حقیقت کے ساتھ قائم ہوتا ہے وہ اس کا گزشتہ قول کے موافق ہونا اور اس کا جملہ معنیٰ کے ساتھ متفق ہونا اور اس مقصد کے موافق ہونا ہے جس کے ساتھ قرآن اس کا جملہ لے کر آیا ہے۔

② **اسالیب:** اس کے پاس ایسا علم ہونا چاہیے جس کے ذریعے وہ ان اعلیٰ اسالیب کو پہچان سکے۔ اور یہ کلام بلیغ کی خوب مشق کرنے اور اس میں لگے رہنے سے حاصل ہوتا ہے اور اس کے علاوہ اس کے نکات اور محاسن کو سمجھنا اور متکلم کی مراد سے آگاہ ہونا بھی

ضروری ہے۔ ہاں البتہ ہم اللہ تعالیٰ کی مراد علی وجہ الکمال والتمام سمجھنے کا دعویٰ نہیں کرتے لیکن ہمارے لیے ممکن ہے کہ اس سے بقدر طاقت ہدایت حاصل کریں۔ اس میں ہمیں علم اعراب کی ضرورت ہوگی اور علم الاسالیب (یعنی علم المعانی) لیکن ان فنون کا محض علم، ان کے مسائل کو سمجھنا اور ان کے احکام کو یاد کرنا مطلوب کے لیے مفید نہیں ہے۔ آپ کتب عربیہ میں دیکھتے ہیں کہ عرب بڑا عمدہ کلام کرتے تھے اور بات اس طرح کرتے تھے کہ ان کی بات قواعد وضع ہونے سے پہلے ہی قواعد کے موافق ہوتی تھی آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے لیے طبعی تھا؟ نہیں بلکہ یہ ایک ملکہ تھا جو سماع اور ایک دوسرے کی نقل اتارنے سے حاصل ہوتا ہے اسی وجہ سے عربوں کی اولاد جب عجمیوں کے ساتھ خلط ملط ہوگئی تو وہ ان سے بھی بڑھ کر عجمی ہوگئی اگر یہ چیز طبعی اور ان کی ذاتی ہوتی تو ہجرت کے بعد کے پچاس سالوں میں یہ مفقود نہ ہوتی۔

③ **انسانوں کے احوال کا علم:** اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو نازل کیا اور اسے آخری کتاب قرار دیا اور اس میں وہ چیزیں بیان کیں جو کسی اور میں نہیں کیں اور اس میں مخلوق کے بہت سے احوال طبیعتیں اور انسانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا طرز عمل بیان کیا اور ہمارے سامنے امم ماضیہ کے عمدہ عمدہ قصے اور ان کی سیرت جو ان میں اللہ تعالیٰ کی سنت کے موافق تھی بیان کی اس لیے اس کتاب میں غور کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسانوں کے احوال میں غور کرے یعنی ان کے طور طریقے، ان کے ادوار ان کے احوال یعنی قوتِ عزت وذلت، علم جہل اور ایمان اور کفر میں ان کے منشائے اختلاف میں غور کرے اور عالم کبیر کے احوال یعنی اس کے علو وسفل کو بھی جاننا ضروری ہے اس میں کئی فنون کی ضرورت ہے سب سے اہم تاریخ اس کی انواع سمیت ہے۔

قرآن پاک نے سابقہ اقوام، سنن الٰہیہ اور آسمان وزمین میں اور سارے جہان اور نفوس میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے بارے میں اجمالاً کلام کیا یہ ایک اجمال ہے جو اس ذات سے صادر ہوا ہے جس کا علم ہر چیز پر محیط ہے اور اس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم غور وفکر کریں اور زمین میں سیر کریں تاکہ اس کے اجمال کو تفصیل کے ساتھ جانیں جس کی وجہ سے ہماری ترقی اور کمال بڑھے گا اور اگر ہم نے بنظر ظاہر علمِ کائنات پر اکتفاء کرلیا تو ہم اس شخص کی طرح ہوجائیں گے جس نے کتاب کی جلد کے رنگ کو کتاب سمجھ لیا اس علم وحکمت کو نہیں جسے کتاب گھیرے ہوئے ہے۔

④ **قرآن کے ذریعے تمام انسانوں کی ہدایت کے طریقے کو جاننا:** اس فرض کفایہ پر کمربستہ مفسر کے لیے جاننا بھی ضروری ہے کہ دور نبوت میں لوگ یعنی عرب وعجم کس طریقے پر تھے اس لیے کہ قرآن آواز دیتا ہے کہ لوگ سب کے سب بدبختی اور گمراہی میں تھے اور نبی کریم ﷺ ان کی ہدایت اور سعادت مندی کے لیے مبعوث ہوئے۔

اور مفسر جب تک ان کے احوال واطوار کو نہ جانتا ہو تو ان کی ان عادات کو علیٰ وجہ الحقیقت یا حقیقت کے قریب کیسے سمجھ سکتا ہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ:

"جاہلیت کے احوال کا سب سے بڑا جاہل وہ شخص ہے جو اس بات سے ڈرتا ہو کہ اسلام کا کڑا ایک ایک کر کے ٹوٹ جائے گا۔"

مطلب یہ ہے کہ جو شخص اسلام میں پلا اور اپنے سے پہلے لوگوں کا حال نہ جانتا ہو تو وہ انسانوں کے احوال کو بدلنے والی اور انھیں ظلمات سے نور کی طرف نکالنے والی اللہ تعالیٰ کی عنایت اور ہدایت کی تاثیر سے بھی جاہل ہوگا۔

اور جو شخص اس سے جاہل ہوگا وہ سمجھے گا کہ اسلام ایک امر عادی ہے جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ نعمتوں اور نزاکتوں میں پلتے ہیں وہ نظافت اور مسواک میں شدت کو از قبیل لغو شمار کرتے ہیں اس لیے کہ یہ ان کے نزدیک زندگی کی ضروریات میں سے ہیں اگر وہ اپنے علاوہ لوگوں کے طبقات کو جانیں تو وہ ان اوامر میں اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو ضرور جان لیں گے اور یہ بھی جان لیں گے کہ یہ آداب کہاں سے آئے۔

⑤ نبی کریم ﷺ اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرت کا علم اور اس علم و عمل اور ان کی دنیوی و اخروی حالات میں تصرف کا علم جس پر وہ تھے۔ (تفسیر المنار تبصرف قلیل)

تفسیر بالرائے کے جواز میں اختلاف

تفسیر بالرائے میں علماء کرام کا اختلاف ہے کچھ لوگ جائز قرار دیتے ہیں اور کچھ منع کرتے ہیں جبکہ تحقیق وہی ہے جو ہم نے پہلے ذکر کر دی کہ یہ اپنی شرائط کے ساتھ جائز ہے اور جب شرائط نہ پائی جائیں تو ممنوع ہے اور یہ تفسیر کے ادنیٰ مرتبہ کے علاوہ کا حکم ہے اور یہ ادنیٰ مرتبہ اس میں ان شرائط کا اعتبار نہ بھی کریں تو جائز ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے آسان کیا حتیٰ کہ عام لوگوں کے لیے بھی آسان کیا جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا۔ اور ہم آپ کی خدمت میں منع کرنے والوں اور اجازت دینے والوں میں سے ہر ایک کے دلائل پیش کرتے ہیں تا کہ اس موضوع میں آپ کی بصیرت اور نور اور زیادہ بڑھ جائے۔

مانعین کے دلائل

دلیل اوّل ✿ تفسیر بالرائے بغیر دلیل کے اللہ تعالیٰ پر ایک قول ہے اور بغیر علم کے اللہ تعالیٰ پر قول کرنا ممنوع ہے لہٰذا تفسیر بالرائے ممنوع ہے۔

صغریٰ کی دلیل یہ ہے کہ رائے سے تفسیر کرنے والے کے بارے میں یقین نہیں کہ وہ مصیب ہے، زیادہ سے زیادہ اس کا ظن ہے اور ظن سے بولنے والا اللہ تعالیٰ پر بغیر علم کے بولنے والا ہوا۔

اور کبریٰ کی دلیل اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ:۱۶۹)

"اور یہ کہ تم اللہ تعالیٰ پر بغیر علم کے بات کہو۔"

اس کا عطف ماقبل آیت میں بیان کردہ محرمات پر ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (الاعراف:۳۳)

"کہہ دو کہ میرے پروردگار نے تو بے حیائی کی باتوں کو ظاہر یا پوشیدہ اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کرنے کو حرام کیا ہے اور اس کو بھی کہ تم کسی کو خدا کا شریک بناؤ جس کی اس نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ اور اس کو بھی کہ خدا کے بارے میں ایسی باتیں

کہو جن کا تمہیں کچھ علم نہیں۔"

لیکن جائز قرار دینے والے اس دلیل کا جواب دیتے ہیں کہ کبریٰ ممنوع ہے اس لیے کہ جن چیزوں میں کوئی قطعی دلیل نہیں پائی جاتی اور نہ ہی کوئی عقلی دلیل پائی جاتی ہے اس میں ظن سے بات کرنے والا اپنی بات کو اللہ تعالیٰ کے علم کی طرف منسوب کرتا ہے یعنی یعنی اس ظن پر عمل کے صحیح ہونے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلیل قطعی کی طرف منسوب کرتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرة:۲۸۶)

"اللہ تعالیٰ کسی بھی نفس کو اس کی وسعت سے بڑھ کر مکلف نہیں بناتا۔"

اسی طرح آپ ﷺ کا ایک فرمان بھی اسی معنی میں ہے:

((من اجتهد واخطأ فله اجر وان اصاب فله اجران)).[1]

"جس نے اجتہاد کیا اور اس سے خطا ہو گئی تو اسے ایک اجر ملے گا اور جس نے درستگی کو پا لیا اس کو دوہرا اجر ملے گا۔"

دلیل ثانی ✿ مندرجہ ذیل دو حدیثیں:

① ترمذی[2] میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ: "مجھ پر بغیر علم کے بات کہنے سے ڈرو! اس لیے کہ جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے اور جس شخص نے قرآن پاک میں اپنی رائے سے کچھ کہا اس کو چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔"

② ابوداؤد[3] میں حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے قرآن پاک میں اپنی رائے سے کچھ کہا اور وہ درستگی کو پہنچ بھی گیا تب بھی اس نے غلطی کی۔"

ان دونوں احادیث کے بارے میں تین جواب دیے گئے ہیں۔

① یہ دونوں احادیث اس بات پر محمول ہیں کہ جس نے قرآن پاک کے مشکلات اور متشابہات کے بارے میں کہا جنھیں نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقل کے راستے کے علاوہ نہیں جانا جا سکتا۔

② یہ دونوں احادیث اس بات پر محمول ہیں کہ جس نے قرآن کے بارے میں کوئی ایسی بات کہی کہ وہ جانتا ہے کہ حق اس کے خلاف ہے جیسے اصحاب مذاہب فاسدہ کہ وہ قرآن پاک کی تاویل اپنی خواہشات کے مطابق کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے وہ اپنی فاسد آراء پر استدلال کریں۔

③ یہ دونوں احادیث اس شخص کے قول پر محمول ہیں جو کلام کے ظاہر کو لیتا ہے اور اسے کسی نقل کی طرف منسوب نہیں کرتا یا اپنے آپ کو قرآن پاک کے مبہمات اور اس میں پائے جانے والے حذف، اضمار، تقدیم و تاخیر وغیرہ میں بحث کرنے کا مکلف بنائے کیونکہ ہر مفسر کے لیے نقل ضروری ہے تاکہ وہ خطا میں نہ پڑے بہر حال صحیح آراء کے استنباط و فہم میں توسع یہ نقل کے بعد ایک

---

① بخاری: کتاب الاعتصام باب ۲۱، مسلم کتاب الاقضیہ حدیث ۱۵، ابوداؤد کتاب الاقضیہ باب ۲، ترمذی ابواب الاحکام، نسائی القضاۃ ۳، ابن ماجہ الاحکام ۳، مسند احمد ۴/ ۱۹۸

② کتاب التفسیر باب القرآن ۱۷ اور ابواب المناقب ۱۹۔ ③ کتاب العلم باب ۵

اور مرتبہ ہے اس لیے کہ عربیت کے صرف ظاہر کو لینا کافی اور درست نہیں ہے آپ اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا﴾ (الاسراء:۵۹)

"اور ہم نے ثمود کو اونٹنی دی بصیرت کے طور پر پس انہوں نے اس پر ظلم کیا۔"

اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم نے قوم ثمود کو واضح معجزہ کے طور پر اونٹنی دی جوان کے لیے مبینہ طور پر ظاہر اور نمایاں تھی اور حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے دین کی صداقت پر دلیل تھی انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ کر اپنے اوپر ظلم کیا۔

لغت عربیہ کو ظاہر طور پر جاننے والا سمجھتا ہے کہ ابصار سے مراد آنکھ کا دیکھنا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ انھوں نے کیا ظلم کیا؟ کس نے ظلم کیا؟ اپنے اوپر ظلم کیا یا کسی اور پر ظلم کیا؟

دونوں حدیثوں میں یہ احتمالات ہیں اور جب کسی دلیل میں احتمال آ جائے تو اس سے استدلال ساقط ہو جاتا ہے۔ نیز حدیث جندب کا مزید جواب یہ بھی ہے کہ اس حدیث کی صحت بھی ثابت نہیں اور اگر صحیح مان لیا جائے تو بھی احتمال ہے کہ اس کا معنیٰ یہ ہو کہ: "اس نے معنیٰ تلاش کرنے کے طریقے میں خطا کی۔" اس لیے کہ قرآن پاک کے الفاظ کی معرفت کا راستہ صرف لغت اور اس کے علوم ہیں اور اس کے نزول کے اسباب اور اس کے ناسخ و منسوخ وغیرہ کی تمیز کا راستہ صرف نقل صحیح ہے اور اللہ تعالیٰ کی قطعی مراد کا راستہ صرف وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وارد ہوا ہے اور اگر وارد ہونے والے راستے پر کامیابی نہ ہو تو قیاس و اجتہاد کرنے اور وارد کے ساتھ غیر وارد پر استدلال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

تیسری دلیل ✿ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سے وارد ہے کہ وہ حضرات قرآن پاک میں اپنی رائے سے بات کرنے سے بچتے تھے چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "کونسا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اور کونسی زمین مجھے ٹھکانہ دے گی جب میں قرآن میں اپنی رائے سے بات کروں گا یا بغیر علم کے بات کروں گا؟"

نیز حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ سے وارد ہے کہ جب ان سے قرآن پاک کی کسی آیت کی تفسیر کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ: "میں قرآن پاک کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

اور شعبی سے منقول ہے کہ: "تین چیزوں کے بارے میں میں مرنے تک بھی کچھ نہیں کہہ سکتا: ① قرآن ② روح ③ خواب۔

اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں جو دلالت کرتی ہیں کہ وہ حضرات قرآن پاک میں اپنی آراء سے بات کرنے سے رکے رہے۔

جواب ✿ ① ان کا قرآن میں نہ بولنا بطور تقویٰ تھا کہ کہیں عین یقین تک نہ پہنچیں اور تقویٰ کا معنیٰ ہے: "جائز چیزوں کو اس خوف سے چھوڑ دینا کہ کہیں ناجائز چیزوں میں نہ پڑ جائیں۔"

② ان کے رکنے میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ان چیزوں کے ساتھ مقید ہو جن میں وہ وجہ صواب کو نہ جانتے ہوں اور جن میں وہ وجہ صواب کو جانتے ہوں ان میں وہ نہ رکتے ہوں اگر چہ وجہ صواب ظنی ہو قطعی نہ ہو۔ ادھر ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کو دیکھ لیں کہ جب ان سے "کلالۃ" کے بارے میں پوچھا گیا جو اس آیت کریمہ میں ہے:

﴿يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ﴾ (النساء:۱۷۶)

"اور وہ آپ سے سوال کرتے ہیں کلالہ کے بارے میں آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے کہ۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"اس میں میں اپنی رائے سے بتلاتا ہوں اگر درست ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اگر غلط ہو تو میری طرف سے یا شیطان کی طرف سے۔ ﴿الْكَلٰلَةَ﴾ فلاں فلاں چیز کو کہتے ہیں۔ اسی طرح کی گفتگو حضرت علی، ابن عباس وغیرہ جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم کی طرف سے وارد ہوئی ہے۔

③ ان کے رکنے میں یہ بھی احتمال ہے کہ جن چیزوں کے بارے میں قطعی دلیل قائم نہیں ہوئی ان میں قطعیت کے طور پر بولنا۔

④ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اس صورت کے ساتھ مقید ہو جب ان کی طرف سے کوئی اور لوگ قرآن پاک کی تفسیر اور بیان کے واجب درجہ کو انجام دینے کے لیے قائم ہوں اور جب سوال انھی پر منحصر ہو تو معقول ہے کہ اس صورت میں وہ نہ رکے ہوں ورنہ علم کو چھپانے والے گنہگار ہوں گے جب کہ یہ حضرات اس سے بالکل بری ہیں اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے اور ان کو بہتر جزاء عطا فرمائے اور ان کا ٹھکانہ عمدہ کرے۔

تفسیر بالرائے کو جائز قرار دینے والوں کے دلائل

تفسیر بالرائے کو جائز قرار دینے والوں کے کئی دلائل ہیں۔

① اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ (محمد: ۲۴)

"کیا وہ قرآن پاک میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (ص: ۲۹)

"یہ کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا تاکہ وہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں اور سمجھ دار لوگ نصیحت حاصل کریں۔"

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

﴿وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾ (النساء: ۸۳)

"اگر وہ لوگ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اولوالام کی طرف لوٹاتے تو تحقیق کرنے والے ضرور اس کی تہ کو پہنچ جاتے۔"

وجہ استدلال

اللہ تعالیٰ نے تدبر قرآن اور اس کی آیات میں غور وفکر کرنے اور اس کی نصیحتوں سے نصیحت حاصل کرنے پر ابھارا ہے لہٰذا یہ دلیل ہے کہ عقل مندوں کو جو عقل سلیم اور پاکیزہ دماغ دیا گیا ہے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان چیزوں کی تاویل کریں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص نہیں کیا اس لیے کہ تدبر اور نصیحت حاصل کرنا کتاب اللہ میں تفقہ اور فہم کی فرع ہے اور آیت کریمہ دلالت کرتی ہے کہ قرآن پاک میں وہ چیزیں بھی ہیں جنھیں اولوالالباب اور فہم ثاقب والے مستنبط کرتے یعنی ان کا استخراج کرتے ہیں۔

② رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے لیے اپنی دعا میں فرمایا کہ:
"اے اللہ اسے دین کا تفقہ اور تاویل کا علم عطا فرما۔" اگر تاویل قرآن پاک کے الفاظ کے سماع اور نقل پر موقوف ہوتی تو اس کی تخصیص کا فائدہ نہ ہوتا لہٰذا یہ دلیل ہے کہ تاویل نقل کے خلاف ہے اور اس صورت میں یہ اجتہاد اور رائے کے ساتھ تفسیر ہوگی۔"

③ اگر تفسیر بالرائے ناجائز ہوتی تو بہت سے احکام معطل ہو جاتے اور لازم باطل ہے اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے ہر آیت کی تفسیر نہیں کی اور مجتہد اگر خطا بھی کرے تو بھی اسے اجر ملے گا جب تک کہ وہ اپنی کوشش پوری کرے اور اجتہاد میں واجب وسائل کو نہ چھوڑے اور اس کی غرض حق اور صواب تک پہنچنا ہو۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ اختلاف لفظی ہو کہ مجوزین کے کلام کو اس تفسیر بالرائے پر محمول کیا جائے جس میں اس کی گزشتہ بالا شرائط پوری ہوں کیونکہ اس صورت میں وہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور کلام عرب کے موافق ہوگی اور یہ جائز ہے نہ اس میں کوئی برائی اور نہ ہی اس سے ممانعت ہے۔

اور مانعین کے کلام کو اس تفسیر بالرائے پر محمول کیا جائے جس میں گزشتہ بالا شرائط مفقود ہوں کیونکہ اس صورت میں وہ ادلہ شرعیہ اور لغت عربیہ کے مخالف ہوگا اور یہ جائز نہیں بلکہ منہی عنہ اور مذموم ہوگی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا کلام بھی اس پر محمول ہوگا کہ انھوں نے فرمایا کہ: "عنقریب کچھ قومیں ایسی آئیں گی جو تمھیں کتاب اللہ کی طرف دعوت دیں گی حالانکہ انھوں نے اسے اپنی پیٹھ پیچھے پھینک دیا ہوگا اس لیے تم علم کو لازم پکڑو اور بدعت اور تنطع (بہت زیادہ غلو اور بار بار گہرائی سے سوال جواب کرنا) سے بچو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول بھی اسی طرح محمول کیا جائے گا کہ مجھے تم پر دو قسم کے لوگوں کا خوف ہے ایک وہ شخص جو بغیر تاویل کے قرآن کی تاویل کرے اور دوسرا وہ شخص جو اپنے بھائی کے مقابلے میں حکومت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول یہ بھی ہے کہ مجھے اس امت پر کسی مومن کا خوف نہیں ہے کہ جس کا ایمان اسے روک دے اور نہ ہی کسی ایسے فاسق کا خوف ہے جس کا فسق واضح ہو بلکہ مجھے ایسے آدمی کا خوف ہے جس نے قرآن پاک پڑھا ہو اور اس میں اس کی زبان خوب چلے (یعنی روانگی سے پڑھے) لیکن وہ اس کی غلط تاویل کرے۔

یہ سب چیزیں اس تفسیر پر محمول ہیں جو ادلہ شرعیہ اور لغت عربیہ کے موافق نہ ہو اور جو یہ بات بالکل واضح ہے کہ قرآن میں اپنی رائے سے بات کرنا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام سے یہ مراد لیا ہے اور یہ معاملہ بہت زیادہ خطرناک ہے اور اس کی بہت بڑی ذمہ داری ہے اللہ تعالیٰ سے ہم سلامتی کا سوال کرتے ہیں۔

مفسرین بالرائے کا طریقہ کار

گزشتہ بالا کا خلاصہ یہ ہوا کہ جو شخص تفسیر کے اعلیٰ مراتب کی کوشش کرے تو اس پر ضروری ہے کہ وہ تقویٰ کو اختیار کر لے اور ان تمام علوم کو ذریعہ بنائے جنھیں ہم نے آپ کے سامنے واضح کیا تاکہ مراد کو درست یا درستگی کے قریب پالے اور اس پر ضروری

ہے کہ وہ درست اور صواب کے طریقے پر چلے اور مندرجہ ذیل امور کی اتباع کرے۔

① قرآن پاک سے معنیٰ کو طلب کرے اگر قرآن پاک سے نہ ملے تو سنت سے تلاش کرے اس لیے کہ یہ قرآن پاک کی شارح ہے اور اگر اس سے تھک جائے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کی طرف رجوع کرے کیونکہ وہ قرآن پاک اس کے حالات اور اس کے سبب نزول کو زیادہ جانتے ہیں جب وہ نازل ہوا انھوں نے اس کا مشاہدہ کیا یہ چیزیں ان کے امتیازات یعنی علم وعمل سے بھی بڑھ کر ہیں اور سب سے بہترین تفسیر وہ ہے جو بالنقل ہوں۔ اگر وہ کتاب وسنت اور ماثورات صحابہ سے بھی معنی نہ پاسکے تو اس پر ضروری ہے کہ وہ اپنی طاقت کے بقدر اجتہاد کرے اور مندرجہ ذیل امور کی اتباع کرے۔

① الفاظ مفردہ سے تعلق رکھنے والی چیزوں یعنی لغت، صَرف اور اشتقاق سے ابتداء کرے اور ان معانی کا لحاظ رکھے جو قرآن کریم کے نزول کے وقت مستعمل تھے۔

② اس کے بعد کلام کو اعراب وبلاغت کی جہت سے تراکیب کے پیچھے لگائے تاکہ اس کے حاسہ بیانیہ میں اس کا ذائقہ محسوس ہو۔

③ معنی حقیقی کو معنی مجازی پر مقدم کرے بایں طور کہ جب تک معنیٰ حقیقی متعذر نہ ہو تو معنی مجازی کی طرف نہ جائے۔

④ اسباب نزول کا لحاظ رکھے کیونکہ سبب نزول کا معنی مرادی کے بیان میں بڑا دخل ہوتا ہے جیسا کہ اس کی تحقیق "مبحث اسباب النزول" میں گزر چکی ہے۔

⑤ ایک آیت کے جملوں اور کئی آیات میں سابق ولاحق کی رعایت رکھنا۔

⑥ سیاق کلام سے مقصود کی رعایت رکھنا۔

⑦ تفسیر کی مفسَّر کے ساتھ مطابقت، نہ کمی ہو نہ زیادتی۔

⑧ تفسیر کا ان معروف چیزوں کے موافق ہونا یعنی علوم کونیہ، سنن اجتماع، بشر عام کی تاریخ اور نزول قرآن کے وقت خاص عربوں کی تاریخ۔

⑨ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سنت اور سیرت میں جن اعمال پر تھے تفسیر کا ان کے بھی موافق ہونا اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سنت کے ذریعے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال، شمائل اور تقریرات کو جامع تھی قرآن کی تفسیر کرنے میں معصوم تھے۔

⑩ بات کو معنیٰ مراد اور اس سے لغت شریعت اور قوانین کو ان کی حدود میں مستنبط ہونے والے احکام اور معنیٰ مراد کے بیان پر ختم کرے۔

⑪ احتمال کے وقت ترجیح کے مندرجہ ذیل قانون کی رعایت کرے:

احتمال کے وقت ترجیح کا قانون

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی "الاتقان" میں فرمایا کہ ہر وہ لفظ جس میں کئی معانی کا احتمال ہو تو غیر علماء کو اس میں اجتہاد کرنا جائز نہیں اور ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ دلائل پر اعتماد کریں محض رائے پر نہیں۔

اگر ان معانی میں سے کوئی ایک معنی زیادہ واضح ہو تو اس پر محمول کرنا واجب ہے سوائے اس کے کہ دلیل اس کے علاوہ کسی اور کو مراد لینے پر قائم ہو جائے۔

اور جب دونوں برابر ہوں اور دونوں میں استعمال بطور حقیقت ہو لیکن ایک میں لغوی ہو یا عرفی ہو اور دوسرے میں شرعی تو شرعی پر محمول کرنا اولیٰ ہوگا سوائے اس کے کہ کوئی دلیل لغوی معنیٰ کے مراد ہونے پر دلالت کرے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَوٰتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۗ﴾ (التوبہ:۱۰۳)

"ان کے حق میں دعا کرو! اس لیے کہ تمہاری دعا کرنا ان کے لیے تسکین کا باعث ہوگی۔"

اور اگر ایک میں عرفی اور دوسرے میں لغوی تو عرفی پر محمول کرنا بہتر ہوگا۔

اور اگر اس میں بھی دونوں برابر ہوں تو اگر ان دونوں کا اجتماع ایک دوسرے کے منافی ہو اور ایک لفظ سے دونوں کو مراد لینا ممکن نہ ہو جیسے حیض اور طہر۔ ان دونوں کی مراد میں ان پر دلالت کرنے والے دلائل کے ذریعے خوب اجتہاد کرے پھر جو اس کا گمان ہوگا وہی اللہ تعالیٰ کی حقیقی مراد ہوگی۔

اور اگر اس کا کسی پر بھی شرح صدر نہ ہو تو پھر کیا اسے اختیار ہوگا کہ وہ سخت یا نرم کو اختیار کرے؟ اس میں کئی اقوال ہیں محققین کے نزدیک اگر وہ ایک دوسرے کے منافی نہ ہوں تو ان دونوں پر محمول کرنا واجب ہوگا اور یہ اعجاز وفصاحت میں سب سے بڑھ کر ہے۔ سوائے اس کے کہ کوئی دلیل ان دونوں میں سے کسی ایک کو مراد لینے پر دلالت کرے۔

سنت کا قرآن کے لیے بیان ہونے کی وجوہ

پیچھے کئی مرتبہ گزر چکا کہ سنت قرآن پاک کی شارح ہے اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا مشغلہ تبلیغ و بیان تھا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (النحل:۴۴)

"اور ہم نے آپ پر ذکر یعنی قرآن پاک کو نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے واضح کر دیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا۔"

اسی طرح آپ نے فرمایا کہ:

"خبردار مجھے کتاب دی گئی اور اس کے ساتھ اس کی طرح کا بھی۔ سن لو کہ عنقریب ایک پیٹ بھرا ہوا آدمی آئے گا جو اپنی چارپائی پر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھا ہوگا وہ کہے گا کہ اس قرآن کو پکڑو اس میں جو حلال ہے اس کو حلال سمجھو اور اس میں جو حلال پاؤ اسے حلال سمجھو... الخ۔ ①

آپ ﷺ کے قول: "مجھے کتاب بھی دی گئی اور اس کے ساتھ اس جیسا" اس کا معنیٰ یہ ہے کہ مجھے وحی متلو اور وحی غیر متلو دونوں

دیے گئے تا کہ اسے اچھی طرح واضح کیا جائے اور کھول دیا جائے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ (النجم: ۳،۴)

"آپ ﷺ اپنی خواہش سے نہیں بولتے بلکہ یہ تو ایک وحی ہے جو آپ کی طرف کی گئی۔"

اور اس حدیث میں آپ ﷺ کا فرمان کہ عنقریب ایک آدمی آئے گا... الخ۔ یہ دلالت کرتا ہے کہ عنقریب ایک قوم آئے گی جو قرآن کے ظاہر کو پکڑے گی جیسے روافض اور خوارج اور وہ قرآن کی وضاحت کرنے والی سنت کو چھوڑ دیں گے وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو گمراہ کریں گے۔

چارپائی پر ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ نعمتوں کی وجہ سے سرکش ہو چکے ہوں گے اور علم کی طلب اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی تفتیش سے غافل ہو چکے ہوں گے۔

یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ جس چیز کا ثبوت نبی کریم ﷺ سے صحیح ثابت ہو خواہ وہ قول ہو یا فعل قرآن کی طرح وہ بھی حجت ہے۔

پھر سنت کا بیان کئی وجوہ پر ہے۔

① قرآن میں مجمل کا بیان جیسے پانچ نمازوں کے اوقات کا بیان، ان کی تعداد کا بیان، ان کے رکوع وسجود وغیرہ کی کیفیت کا بیان اور زکوٰۃ کی مقدار، اس کے اوقات اور انواع کا بیان اور اسی طرح حج کے مناسک کا بیان وغیرہ جو قرآن میں مجمل بیان ہوئے اور انھیں سنت نے واضح کیا۔ اسی وجہ سے فرمایا کہ: "مجھ سے مناسک حاصل کرو۔" اور فرمایا کہ: "ایسے نماز پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتا دیکھتے ہو۔" ①

امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: "سنت کتاب کی تفسیر اور بیان کرتی ہے۔"

② قرآن پاک کے احکام پر مزید احکام کا بیان جیسے عورت کا اس کی پھوپھی یا خالہ کے ہوتے ہوئے نکاح کی حرمت اور گھریلو گدھے کی حرمت اور ہر کچلی والے درندے کا حرام ہونا اور قسم اور شاہد کے ذریعے فیصلہ کرنا وغیرہ جو اصول فقہ اور فقہ میں موجود ہیں۔

③ لفظ یا اس کے متعلق کے معنی کا بیان جیسے "مغضوب علیہم" کی تفسیر یہود کے ساتھ اور "الضالین" کی تفسیر نصاریٰ کے ساتھ کرنا اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ (البقرۃ: ۲۵) کی تفسیر یہ کرنا کہ وہ حیض، پاخانہ، رینٹھ اور تھوک سے پاک ہوں۔ اور

﴿فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ﴾ (البقرۃ: ۵۹)

"ظلم کرنے والوں نے اس بات کو دوسرے لفظ سے بدل دیا جو ان سے نہیں کہا گیا۔"

کی تفسیر کہ: "وہ اپنی سرینوں کے بل رینگ رہے تھے اور کہہ رہتے تھے کہ "حَبَّةٌ فِي شَعِيْرَةٍ" (غلہ میں جو) جبکہ انھیں

① بخاری کتاب الاذان باب ۱۸، کتاب الادب ۲۷، کتاب الآحاد، سنن دارمی کتاب الصلوۃ باب ۴۲، مسند احمد ۵ / ۵۳

گیا تھا کہ: ﴿سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾ (البقرۃ:۵۸) (اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو۔ اور "حِطَّة" (ہمارے گناہ معاف کردے) کہتے ہوئے داخل ہو)

④ تفسیر بالرائے اور تفسیر بالماثور میں تعارض اور ان میں ترجیح کے لیے قابل اتباع طریقہ

جاننا چاہیے کہ تفسیر بالرائے مذموم یہاں مراد نہیں، اس لیے کہ یہ شروع میں ہی ساقط ہے لہٰذا اس میں تفسیر ماثور کا معارض بننے کی طاقت ہی نہ رہے گی۔

پھر یہ بھی جاننا چاہیے کہ تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرائے محمود کے درمیان تعارض کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان تناقض ہو بایں طور کہ ایک اثبات پر دلالت کرے اور دوسری نفی پر گویا کہ ان متنافیین میں سے ہر ایک راستے میں کھڑا ہو گیا اور اس نے دوسرے کو اس میں چلنے سے منع کر دیا۔

اور جب وہ آپس میں ایک دوسرے کے منافی نہ ہوں تو کوئی تعارض نہیں، اگرچہ تغایر ہو۔ جیسے ﴿الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ کی تفسیر قرآن، سنت طریق عبودیت یا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے ساتھ کرنا یہ معانی اگرچہ متغایر ہیں لیکن منافی نہیں ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس قول میں جو کہا گیا کہ:

﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ﴾ (فاطر:۳۲)

"ان میں سے بعض اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض میانہ رو ہیں اور بعض اللہ تعالیٰ کے حکم سے نیکیوں پر سبقت کرنے والے ہیں۔"

جو کچھ بھی کتب تفسیر میں کہا گیا وہ متنافی نہیں ہے لہٰذا متعارض نہ ہوگا اور نہ ہی متناقض ہوگا۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک قول یہ ہے کہ ظالم وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ کے حکم پر موقوف کر دیا گیا ہو۔ اور مقتصد وہ ہے جو نیک اور برے اعمال کو خلط ملط کرنے والا ہو اور خیرات میں سبقت کرنے والا وہ شخص ہے جو خیر کو خالص کرنے والا ہے۔ بعض نے کہا کہ "السابق، مخلص، المقتصد" ریاکار اور "ظالم" نعمتوں کو چھپانے والا انکار کرنے والا نہیں۔ بعض نے کہا کہ سابق جس کی نیکیاں راجح ہوں "مقتصد" جس کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں اور ظالم جس کی برائیاں راجح ہوں۔ بعض نے کہا کہ "سابق، عالم مقتصد" متعلم اور ظالم جاہل۔ بعض نے کہا کہ ظالم وہ ہے جو غفلت اور عادت کے طور پر اس کی عبادت کرتا ہو اور مقتصد وہ ہے جو کوشش کرتا ہو کہ صرف حلال حاصل کرے اور سابق جو دنیا سے منہ پھیرنے والا ہو۔ بعض نے کہا کہ ظالم دنیا کا طالب، مقتصد آخرت کا طالب اور سابق مولی کا طالب اور اس کی علاوہ بھی بہت سے اقوال ہیں۔

اور "دار الکتب مصر" میں ایک جلد ہے جو علی بن محمد بن عمر تونسی کی لکھی ہوئی ہے اس کا نام "تحفة الاحباب" فی تفسیر

"ثم اور ثنا الکتاب" ہے۔

جب یہ قرار پا گیا پھر تفسیر بالماثور جو نص قطعی سے ثابت ہو اس کا تعارض تفسیر بالرائے سے ممکن نہیں اس لیے کہ رائے یا تو ظنی ہوگی یا قطعی ہوگی جو کسی عقلی یا نقلی دلیل قطعی پر مستند ہوگی اگر قطعی ہو تو دو قطعی چیزوں کے درمیان تعارض نہیں ہو سکتا بلکہ ماثور میں تاویل کی جائے گی تا کہ قطعی پر مستند رائے کی طرف رجوع کیا جا سکے بشرطیکہ اس میں تاویل ممکن ہو، تا کہ دونوں دلیلوں کو جمع کیا جا سکے اور اگر تاویل ممکن نہ ہو تو لفظ کریم کو اس معنی پر محمول کیا جائے گا جس کا رائے اور اجتہاد تقاضا کرتے ہیں تا کہ ارجح مرجوح پر مقدم ہو جائے۔

اور اگر رائے ظنی ہو یعنی دلیل قطعی سے خالی اور صرف علامات اور ظاہری قرائن کی طرف مستند ہو تو ماثور قطعی کو رائے پر مقدم کیا جائے گا اس لیے کہ یہ بدیہی ہے کہ ضرورت یقین سے اقویٰ ہوتی ہے۔

یہ سب باتیں اس صورت میں ہیں جب ماثور قطعی ہو اور اگر ماثور اپنی دلالت میں قطعی نہ ہو بوجہ نص نہ ہونے کے یا متن میں قطعی نہ ہو بوجہ خبر آحاد ہونے کے پھر وہ تفسیر بالرائے کے معارض آ جائے تو بھی یا تو جس میں تعارض ہوا ہے اس میں رائے کی گنجائش نہ ہوگی اس صورت میں قابلِ اعتماد صرف ماثور ہوگا اور رائے کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

اور اگر اس میں رائے کی گنجائش ہو تو اگر انھیں جمع کرنا ممکن ہو تو فبہا ورنہ جو نبی کریم ﷺ یا صحابہ رضی اللہ عنہم سے ماثور ہے اسے مقدم کیا جائے گا اس لیے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے وحی کا مشاہدہ کیا تو ان پر بعید ہے کہ وہ قرآن میں محض خواہش کی بناء پر بات کریں۔

اور جو تابعین سے ماثور ہے اگر وہ اہل کتاب سے منقول ہو تو تفسیر بالرائے کو اس پر مقدم کیا جائے گا اور اگر ان سے منقول نہ ہو تو سماع کی طرف رجوع کریں گے جس کی سماع تائید کرے تو نظم قرآنی کو اس پر محمول کیا جائے گا اور اگر سماع وغیرہ سے کوئی ایک بھی راجح نہ ہو تو ہم کسی کے بارے میں قطعی فیصلہ نہیں کریں گے کہ یہی مراد ہے بلکہ نظم قرآنی کو مجمل قبل التفصیل کے مقام پر چھوڑ دیں گے یا مشتبہ یا مبہم کے مقام پر چھوڑ دیں گے جس کا بیان ابھی نہ آیا ہو۔

تفسیر بالرائے کی اہم کتابیں

اس سے قبل آپ جان چکے کہ تفسیر بالرائے میں سے ایک ممدوح اور جائز ہوتی ہے اور ایک مذموم اور نا جائز ہوتی ہے۔ اب قسم اوّل میں اہلِ سنت کی مشہور تالیفات اور ان کے مؤلفین کا بیان کیا جاتا ہے۔

① دو جلیل القدر امام جلال الدین محمد محلی رحمہ اللہ اور جلال الدین عبدالرحمٰن سیوطی رحمہ اللہ۔
ان دونوں نے مشہور و معروف تفسیر جلالین تالیف کی۔

② امام بیضاوی: "ناصر الدین بن سعید جو انوار التنزیل و اسرار التاویل" کے مؤلف ہیں۔

③ فخر الدین رازی: محمد بن علامہ ضیاء الدین عمر، جو خطیب الرای کے نام سے مشہور ہیں ان کی تفسیر کا نام "مفاتیح الغیب" ہے۔

④ ابو السعود محمد بن محمد مصطفی طحاوی، ان کی تفسیر کا نام "ارشاد العقل السلیم الی مزایا القران الکریم"

⑤ علامہ شہاب الدین آلوسی ان کی تفسیر کا نام "روح المعانی" ہے۔

⑥ نظام الدین الحسن محمد نیسا پوری ان کی تفسیر کا نام "غرائب القران و رغائب الفرقان" ہے۔

⑦ علامہ شیخ محمد شربینی خطیب، ان کی تفسیر کا نام "السراج المنیر فی الاعانة علی معرفة کلام ربنا الخبیر" ہے۔

⑧ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی، ان کی تفسیر کا نام "مدارك التنزيل وحقائق التاويل" ہے۔

⑨ علاؤالدین علی بن محمد بن ابراہیم بغدادی، ان کی تفسیر کا نام "تفسیر خازن" ہے۔

تفسیر جلالین ✿ تفسیر جلالین ایک قیمتی تفسیر ہے، کسی حد تک سہل المأخذ ہے اور اس کی عبارت بہت زیادہ مختصر ہے لیکن مفید اور شائع و ذائع ہونے کے اعتبار سے تقریباً سب سے بڑی تفسیر ہے، اگرچہ شرح اور حجم کے اعتبار سے چھوٹی ہے۔ اسے اہل علم میں سے مختلف طبقات ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں، اس کی طباعت کئی طریقے سے ہو چکی ہے ایک مرتبہ خالی طبع ہوئی پھر "مصحف شریف" کے حاشیے کے ساتھ اور تیسری مرتبہ حاشیہ صاوی کے ساتھ اور چوتھی مرتبہ حاشیہ الجمل کے ساتھ۔ اس کا سب سے وسیع حاشیہ حاشیۂ الجمل ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ بڑے بڑے علماء اسے تفسیر میں معروف اعلیٰ تعلیم کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اساسی مادہ کی طرح اس کے گرد گھومتے ہیں حتیٰ کہ تفسیر کے مشہور اسباق جو علامہ مرحوم شیخ عبدہ کی طرف منسوب ہیں ان کا ان دروس میں مضمون تفسیر جلالین تھا جیسا کہ آپ نے سن لیا۔

تفسیر البیضاوی ✿ یہ ایک جلیل القدر اور دقیق کتاب ہے، اس میں انھوں نے لغت عربیہ کے قوانین کے مطابق تفسیر اور تاویل کو جمع کر دیا اور اہل سنت کے اصول کے مطابق دلائل کو پختہ کیا اور اس کا التزام کیا کہ ہر سورت کو اس کی فضیلت میں روایت ہونے والی احادیث پر ختم کیا، لیکن انھوں نے ان میں صحیح کی چھان بین نہیں کی، اس کے متداول حواشی میں سے سب سے اچھا حاشیہ شہاب خفاجی رحمۃ اللہ علیہ کا حاشیہ ہے اور اس کے اور بھی کئی حواشی ہیں جن میں سے حاشیہ سعدی آفندی ہے حاشیہ روشنی ہے حاشیہ ششتری ہے حاشیہ شیروانی حاشیہ سمرقندی جو سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں ہے اور حاشیہ اسفرائینی ہے جو پارہ عم پر ہے اور حاشیہ ابن امیر خان ہے جو سورۃ الملک پر ہے۔

تفسیر فخر الدین رازی ✿ اس پر "تفاسیر اہل الکلام" کے عنوان کے تحت کلام آئے گا۔

تفسیر ابوالسعود ✿ یہ ایک خوشگوار اور ممتاز تفسیر ہے اس کا حسن تعبیر آپ کو سرگشتہ و حیران بنا دے گی اس کی پاکیزہ فکر آپ کو بھائے گی اور یہ حشو و زوائد سے خالی اور میانہ روی والی تفسیر ہے اس میں دو امور کے التزام کا اہتمام کیا گیا ہے ایک یہ کہ تفسیر کے مراحل میں سے ہر مرحلہ کے شروع میں قراءتوں اور وقف پر کلام کیا گیا ہے اور دوسرا یہ کہ ان مراحل میں سے آخری مرحلہ میں تاویل اشاری پر کلام کیا گیا ہے اور اس کی مشہور طباعت تفسیر ابن جریر کے حاشیہ پر ہے اور یہ فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کا اختصار اور اس کے ساتھ ایک بہت بڑی تہذیب بھی ہے۔

تفسیر آلوسی ✿ تفسیر اشاری کے موقع پر کلام آئے گا۔

تفسیر نسفی ✿ یہ ایک بہت بڑی کتاب ہے جو مشہور و متداول ہے، بہت آسان اور دقیق ہے۔ صاحب کشف الظنون نے اس کے بارے میں فرمایا کہ: یہ کتاب تاویلات میں مرکز وسطی ہے، اعراب اور قراءات کی وجوہ کو جامع ہے، علم بدیع اور اشارات کے دقائق کو متضمن ہے۔ اہل سنت والجماعت کے عقائد کو نمایاں کرتی ہے اہل بدعت اور اہل ضلالت کے اباطیل سے خالی ہے نہ تو اتنی لمبی ہے جو اکتاہٹ میں ڈال دے اور نہ ہی اتنی چھوٹی ہے کہ سمجھنے میں مخل ہو۔

تفسیر خطیب ○ یہ ایک عظیم کتاب ہے جو تین اشیاء پر مشتمل ہے ادلہ کی تقریر و توجیہ، سورتوں اور آیتوں کے درمیان مناسبت پر کلام اور بہت زیادہ قصوں اور روایات کا تسلسل۔

تفسیر خازن ○ یہ بھی ایک مشہور تفسیر ہے یعنی تفسیر بالماثور ہے لیکن اس میں سندیں مذکور نہیں، انھیں روایات اور قصص میں توسع کا بہت زیادہ شوق تھا۔ اس کے امتیازات میں سے یہ ہے کہ یہ قصہ کے بعد اس کی وضاحت کرتے اور اس میں کسی قسم کی کوئی باطل آمیزی نہیں ہوتی کہ کسی کو دھوکہ نہ لگ جائے اور جاہل اس سے فتنہ میں نہ پڑ جائے۔

فرق مختلفہ کی تفاسیر

جیسے تفسیر اشاری اور تفاسیر اہل کلام، اس میں مشہور ترین کتابیں۔

امت کے مقدر میں لکھا جا چکا کہ یہ ستر سے بھی زیادہ فرقوں میں بٹے گی اور اللہ تعالیٰ انھیں گروہ در گروہ کر دے گا اور ایک دوسرے کو لڑائی کا مزہ چکھائے گا اگرچہ اس امت کی ایک جماعت حق پر قائم رہے گی مخالفین سے انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آ جائے گا۔

ہر فرقہ نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو لیا اور اپنی مرضی سے اس کی تفسیر کرنے لگے خواہ اعتدال سے ہو یا حد سے زیادہ تجاوز سے چنانچہ تفاسیر کا مجموعہ صاف ستھرے آئینوں کی طرح ظاہر ہو گیا جن میں مفسرین کی صورتیں منقش ہوتی ہیں حالانکہ ان کے مشارب میں اختلاف تھا ان کی منازعت بالکل واضح تھی اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ہر برتن وہی ٹپکاتا ہے جو اس میں ہوتا ہے اور ہر شخص اپنی پسندیدہ چیز پر گنگناتا ہے۔

اسی بناء پر آپ کو اہل سنت کی تفسیریں ملیں گی تو ان میں اہل سنت کا عقیدہ ظاہر ہو گا اور معتزلہ کی تفسیر ملیں گی تو ان میں اعتزال کا عقیدہ ظاہر ہو رہا ہو گا اور شیعہ اپنی تفاسیر میں تشیع کا عقیدہ ظاہر کر رہے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

ہم سابقہ عنوان کے تحت اہل سنت کی تفاسیر کے نمونوں پر بات کر آئے ہیں اب ہمیں مختلف فرقوں کی تفاسیر کے نمونوں پر بات کرنی چاہیے۔

تفاسیر معتزلہ ہم زمخشری کی کتاب "الکشاف" سے ابتداء کرتے ہیں اس کے بعد قاضی عبدالجبار کی کتاب "تنزیہ القرآن عن المطاعن" ذکر کریں گے یہ دونوں معتزلہ میں سے اہل کلام کی تفاسیر کے نمونے ہیں۔

تفسیر الکشاف ○ تفسیر کشاف کے مؤلف محمود بن عمر بن محمد بن عمر نحوی لغوی معتزلی ہیں جن کا لقب جار اللہ ہے ۴۶۷ھ میں پیدائش اور ۵۳۸ھ میں وفات ہوئی انھوں نے لغت، ادب، نحو اور معرفت انساب العرب وغیرہ میں باکمال مہارت حاصل کی اور اپنے ہم عصروں پر فائق ہو گئے۔ اور اس کے بعد اعتزال کا اظہار کیا اور اس کی طرف دعوت دی۔ ان کی یہ کتاب سب سے اچھی کتاب ہے یا ان بہترین کتابوں میں سے ہے جن کی طرف بلاغت کے اعتبار سے تفسیر میں رجوع کیا جاتا ہے البتہ یہ خرابی ہے کہ وہ اس میں اعتزال کی جانب مائل ہیں ان کے بعد کی اکثر تفاسیر اسی سے لی گئی ہیں۔ اور ان کا دارو مدار اسی پر ہے۔

"الکشاف" مندرجہ ذیل امور میں ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔

- حشو وزوائد سے خالی ہے۔
- قصص اور اسرائیلیات سے محفوظ ہے۔
- اس میں معانی کو واضح کرنے میں لغت عرب اور ان کے اسالیب پر اعتماد کیا گیا ہے۔
- جن چیزوں کو واضح کرنا ہو ان میں اکثر سوال و جواب کا طریقہ اختیار کیا گیا اور سوال کو کلمہ "ان قلت" (اگر آپ کہیں) کے عنوان کے ساتھ اور جواب کو "قلتُ" (میں کہوں گا) کے عنوان کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

"الکشاف" کے بہت سے حواشی لکھے گئے ہیں جن میں سے ابن کمال پاشازاد کا حاشیہ، علاؤ الدین جو پہلوان کے نام سے مشہور تھے ان کا حاشیہ، شیخ حیدر کا حاشیہ اور رہاوی کا حاشیہ مشہور ہیں۔

آپ کی خدمت میں ان کی کتاب کے کچھ مقامات پیش خدمت ہیں جن میں وہ اعتزال کی طرف رخ کرتے ہیں اور المنزلہ بین المنزلتین والا قول اور یہ کہ بندوں کے افعال انھی کی مخلوق ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت آخرت میں محال ہے۔

① ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ (البقرۃ:۳) "جو لوگ غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔" اگر آپ کہیں کہ ایمان صحیح کیا ہے؟ تو میں کہوں گا کہ: "حق کا اعتقاد رکھے اور زبان سے اس کا اظہار کرے اور عمل سے اس کی تصدیق کرے اگر وہ اعتقاد میں کمی کرے تو چاہے (زبان سے) گواہی بھی دے اور عمل بھی کرے وہ منافق ہے۔ اور جو گواہی دینے میں کمی و کوتاہی کرے وہ کافر ہے اور جو عمل میں کوتاہی کرے وہ فاسق ہے۔"

آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ ایمان کی تفسیر اس طرح کر رہے ہیں جس سے منزلۃ بین المنزلتین ثابت ہوتا ہے اور وہ منزلہ فاسق ہے جو مومن اور کافر کے درمیان ہے۔ یعنی جو سلیم العقیدہ ہو وہ جب تک واجب عمل میں کوتاہی کرتا رہے گا اس سے ایمان منتفی رہے گا۔ اور یہ اہل سنت کی طرف سے مردود ہے کہ یہ تفسیر لغت اور شریعت کے موافق نہیں ہے لغت کے اعتبار سے تو اس طرح کہ ایمان کا معنی تصدیق کے علاوہ کچھ نہیں اور شرعاً اس لیے نہیں کہ عمل کا اس پر عطف کیا گیا ہے اور عطف تغایر کا تقاضا کرتا ہے۔

② ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ (البقرۃ:۳) "اور ہم نے انھیں جو دیا وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ: "اللہ تعالیٰ نے رزق کی اسناد اپنی طرف کی یہ بتلانے کے لیے کہ وہ حلال مطلق کو خرچ کرتے ہیں جو اس لائق ہے کہ اس کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے... الخ۔"

یہ ان کی طرف سے اشارہ اور رہنمائی ہے کہ رزق حلال اللہ کی طرف سے اور رزق حرام بندہ کی طرف سے ہے۔ اہلِ سنت والجماعت اس کی تردید میں یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ: ﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ (فاطر:۳) "کیا کوئی خالق ہے اللہ کے علاوہ جو تمھیں آسمان وزمین سے رزق دے۔" اللہ ہی خالق ہے اللہ ہی رازق ہے اس کے علاوہ کوئی نہیں خواہ رزق حرام ہو یا حلال۔

③ وہ اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (البقرۃ:۷) "اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔" کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: "اگر آپ کہیں کہ ختم کی اسناد اللہ کی طرف کیوں کی گئی؟ حالانکہ اس کی اسناد حق کو قبول کرنے سے مانع ہونے اور کسی بھی

طرح اس تک پہنچنے سے رکنے پر دلالت کرتی ہے اور یہ قبیح ہے اور اللہ تعالیٰ فعل قبیح سے منزہ ہے جس کی دلیل: ﴿وَ مَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ﴾ (ق:۲۹) "اور میں بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔" اور ﴿وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (زخرف:۷۶) "اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہی ظالم تھے۔" اور ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ﴾ (الاعراف:۲۸) "اللہ تعالیٰ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔"

پھر اللہ تعالیٰ کی طرف ختم کی اسناد کی تاویل یہ کی کہ کلام میں استعارہ یا مجاز ہے مطلب یہ ہے کہ خاتم یا تو شیطان ہے یا کافر ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف اسناد اس لیے کی گئی کہ اسی نے ان کو قدرت دی۔ اس مذہب میں اہلسنت کے نزدیک چند امور لازم آتے ہیں جو سب کے سب باطل ہیں۔

① اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر قائم دلیل عقلی کی مخالفت کہ کائنات میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جس میں قدرت کے آثار میں سے کوئی اثر نہ ہو۔

② دلیل نقلی کی مخالفت ﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ﴾ (الرعد:۱۶) "اللہ ہر چیز کا خالق ہے۔"

③ یہ قول کرنا کہ ان چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی مراد کے خلاف شیطان یا کافر کی مراد بھی نافذ ہوتی ہے اور یہ بدترین قول ہے۔

④ غائب کو شاہد پر قیاس کرنا اس لیے کہ انھوں نے قبول حق سے رک جانے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی قبیح بنا دیا ہے اور اسے ہماری طرف سے قبیح ہونے پر قیاس کیا ہے۔

⑤ ظلم کی حقیقت سے جہالت: ظلم کی حقیقت یہ ہے کہ "غیر کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا۔" اور "ملکیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ہے۔" ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (البقرۃ:۱۰۷) "آسمان وزمین کی بادشاہت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔" اور ﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾ (مریم:۹۳) "آسمان وزمین میں جتنے بھی لوگ ہیں وہ خدائے رحمٰن کے سامنے بندے بن کر حاضر ہوں گے۔" لہٰذا کسی بھی صورت میں اللہ تعالیٰ کے فعل میں ظلم لازم نہیں آتا۔

⑥ اگر یہ اعتقاد کریں کہ بندوں کے افعال اگر اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں تو وہ اس کی وجہ سے ان کی عیب گیری نہ کرتا اور ان کو سزا نہ دیتا اور آپ کے لیے ان پر کوئی حجت قائم نہ ہوتی۔

یہ سب چیزیں ان کے فاسد قاعدہ پر مبنی ہیں یعنی تحسین و تقبیح عقلی پر مبنی ہیں نیز ان کے غائب کو شاہد پر قیاس کرنے پر بھی مبنی ہیں جیسا کہ گزرا۔ اور یہ دونوں چیزیں انھیں بھی مسلم نہیں۔ پھر ان کی تردید کی مثل کے ساتھ کی جاتی ہے چنانچہ انھیں کہا جاتا ہے کہ جیسے شاہد سے یہ قبیح ہے کہ وہ اپنے غیر کو کسی کام کرنے پر قدرت دے اور پھر اس پر اس کی گرفت کرے تو اسی طرح غائب کے لیے بھی ہے جبکہ تم کہتے ہو کہ جس قدرت کے فعل کا خلق تمہارے خیال کے مطابق بندہ کی طرف سے یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خلق ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ عنقریب بندہ یہ کرے گا اور یہ بات ظاہر ہے کہ اسی طرح ہے کہ کوئی آدمی کسی ایسے شخص کو تلوار دے جو اس کے ذریعے لوگوں پر ظلم کرے۔ تو یہ شاید میں بھی قبیح ہے اور غائب میں بھی قبیح ہے اب اس کا جو جواب تم دو گے وہی ہمارا جواب بھی ہوگا۔

④ ﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ (آل عمران:۱۸۵) "جو دوزخ کی آگ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ کامیاب ہے۔" اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ: "اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور دائمی

عذاب سے بچ گیا اور اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا اور دائمی نعمتوں حاصل کر لیں۔" آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے انکار کی تعریض ہے کہ وہ تصریح کر رہے ہیں کہ نجات، رضوان اور نعمتوں سے بڑھ کر کوئی کامیابی نہیں ہے اور انھوں نے رویت کو ذکر نہیں کیا۔ اور سورۃ الانعام میں انھوں نے اس کے انکار کی صراحت کی ہے چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ﴾ (الانعام: ۱۰۳) "اسے آنکھیں پا نہیں سکتیں اور وہ آنکھوں کو پا سکتا ہے۔" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "البصر" یہ ایک جوہر لطیف ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نظر کے حاسہ میں رکھا ہے اسی کے ذریعے وہ دیکھتا ہے چنانچہ معنیٰ یہ ہوں گے کہ ابصار کا اس کے ساتھ تعلق نہیں ہے اور نہ ہی وہ اسے پا سکتی ہیں اس لیے کہ اپنی ذات میں دکھائی دیا جانے سے بلند و بالا ہے اس لیے کہ ابصار کا تعلق صرف ان چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے یا تبعاً کسی جہت میں ہوتے ہیں جیسے اجسام اور ہیئات۔

اہل سنت اس کی تردید کرتے ہیں۔

① جس ادراک کی نفی کی گئی ہے وہ احاطہ سے عبارت ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿حَتَّىٰ إِذَا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ﴾ (یونس: ۹۰) "یہاں تک کہ جب اسے غرق نے آ پکڑا۔" یعنی اس کا احاطہ کر لیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا واقعہ سناتے ہوئے فرمایا کہ: ﴿إِنَّا لَمُدْرَكُونَ﴾ (الشعراء: ۶۱) "ہم پکڑے گئے۔"

اس صورت میں جس ابصار سے کی نفی کی گئی ہے وہ ابصار کا اللہ تعالیٰ کا احاطہ کرنے کی نفی ہے۔ مجرد رؤیت کی نفی نہیں اور یہ بات معلوم ہے کہ افہام اللہ تعالیٰ کا احاطہ نہیں کر سکتے اور آپ جانتے ہیں کہ یہ منع نہیں ہے اور احاطہ جو عقل کے لیے منفی ہے تو وہ بصر کے بھی منفی ہے اور جو احاطہ سے نیچے ہیں یعنی عقل سے اس کی معرفت اور بصر سے رؤیت یہ ثابت ہیں ان کی نفی نہیں ہے۔

② زمخشری رحمہ اللہ نے رؤیت کے احاطہ پر نہ کوئی عقلی دلیل دی اور نہ ہی شبہ دلیل دی صرف اتنی دلیل دی کہ مرئی کا جہت میں نہ ہونا مستبعد ہے، اس کا معارضہ ہم اس کی مثل سے کریں گے چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ تمھیں لازم آتا ہے کہ موجود بغیر جہت کے مستبعد ہوتا ہے اس لیے کہ وہم کے پیچھے چلنا ان دونوں کو بعید کر دیتا ہے اور عقل کے پیچھے چلنا اس وہم کو باطل کر دیتا ہے اور ان دونوں کو جائز قرار دیتا ہے۔

ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے باقی اہل سنت اور معتزلہ کے درمیان بحث و تکرار کی رسی طویل ہے اور ان کے درمیان اخذ و رد کا میدان علم الکلام ہے اگر آپ کو مزید چاہت ہو تو وہاں رجوع کریں۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو پھسلنے سے بچائے اور ہمیں اعتقاد و عمل میں سیدھا چلنے کی توفیق عطا فرماتے۔

"تنزیہ القرآن عن المطاعن"

اس کے مؤلف عبدالجبار احمد بن خلیل ہیں اس کی کنیت ابوالحسن بغدادی ہے، علم کلام میں مہارت حاصل کی اور اپنے زمانے کے لوگوں سے فائق ہو گئے اور ایک جلیل القدر کتاب لکھ دی، معتزلہ کی ریاست اور سرداری انھی پر ختم ہوتی ہے لوگ ان کی رائے لینے لگے اور ان کی کتابوں پر اعتماد کرنے لگے حتیٰ کہ ۴۱۵ھ کو وفات پا گئے ان کی بہت زیادہ تصنیفات ہیں سب سے اہم "تنزیہ القرآن عن المطاعن" ہے۔

یہ کتاب کئی مسائل پر مرتب ہے اور ہر مسئلہ سوال و جواب کو متضمن ہے ان کو قرآن کی تفسیر کی فکر نہیں تھی بلکہ ان کی ساری فکر

اپنے مذہب کی تائید کی طرف متوجہ تھی اسی وجہ سے آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے پورے قرآن کی تفسیر نہیں کی بلکہ وہ سورۃ کی ایک ایسی آیت کو ذکر کرتے جس کو وہ اپنے عقیدے کے مطابق ڈھال سکتے تھے اور اس کے ذریعے معتزلہ کے مذہب کی تائید کر سکتے تھے جیسا کہ زمخشری نے کیا جس کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔ یہ کتاب بہت سے فوائد پر مشتمل ہے لیکن خرابی یہ ہے کہ وہ اس میں اپنے مذہب کا تعصب رکھتے تھے اور تفسیر کی طرف توجہ کم دیتے تھے جیسا کہ ہونی چاہیے۔

⑱ تفاسیر باطنیہ

باطنیہ ایک قوم ہے جس نے ظاہری قرآن کو پس پشت ڈال دیا اور کہا کہ قرآن پاک کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، مقصود باطن ہے ظاہر مقصود نہیں ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝ ﴾ (الحدید: ۱۳)

"ان کے درمیان دیوار حائل کردی جائے گی جس کے اندر کی جانب رحمت اور باہر کی جانب عذاب ہوگا۔"

سے استدلال کرتے ہیں۔

ان کے کئی فرقے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

① **قرامطہ** ✿ یہ حمدان قرمط کی طرف نسبت ہے جو واسط کی بستیوں میں سے ایک بستی ہے، یہی وہ شخص ہے جس نے ان کے مذہب کو روشناس کرایا۔

② **اسماعیلیہ** ✿ یہ اسماعیل کی طرف نسبت ہے جو جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا بیٹا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ ان میں امامت کا عقیدہ رکھتے تھے۔

بعض نے کہا کہ انھیں اسماعیلیہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ لوگ "محمد بن اسماعیل" کی طرف منسوب تھے۔

③ **سبعیہ** ✿ یہ سات کے عدد کی طرف نسبت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ہر سات میں ایک امام ہوتا ہے جس کی اقتداء کی جاتی ہے۔

④ **خرمیہ** ✿ یہ خرم کی طرف نسبت ہے اس لیے کہ یہ لوگ حرام کو جائز سمجھتے تھے۔

⑤ **بابکیہ** ✿ یہ ان کے سردار بابک خرمی کی طرف نسبت ہے جو آذربیجان میں نکلا۔

⑥ **محمرہ** ✿ یہ چونکہ سرخ لباس پہنتے تھے اس لیے ان کا یہ نام پڑ گیا۔

باطنیہ کا مذہب عمومی طور پر ایک وبا ہے جو مجوس سے تعدی کر کے ان کی طرف منتقل ہوئی ان کی قرآن میں تاویلات فاسدہ میں سے یہ بھی ہے کہ وہ لوگ وورث سلیمان (حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داود علیہ السلام کے وارث ہے) (سورۃ النمل) کی تفسیر میں کہتے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے علم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث بنے۔

اور کہتے ہیں کہ: جنابت کا معنیٰ یہ ہے کہ: "مستجیب استحقاق کا رتبہ پانے سے پہلے ہی جلدی سے اپنا راز فاش کر دے۔ اور غسل کا معنی ہے کہ: "جو ایسا کرے اس سے تجدید عہد کرایا جائے۔" اور طہارت کا معنیٰ ہر مذہب کے اعتقاد سے برأت کرنا سوائے امام کی متابعت کے اور تیمم کا معنیٰ "داعی امام کا مشاہدہ کرنے تک جائز چیز کو لینا۔" اور روزے کا معنیٰ "راز فاش کرنے سے رکنا۔"

وہ کہتے ہیں کہ کعبہ نبی ﷺ "باب" علی "صفا" نبی اور "مروہ" علی ہے اور "نار ابراہیم" نمرود کا ان پر غصہ کرنا ہے اور "عصا موسیٰ" ان کے ولائل ہیں۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خرافات ہیں جو اس سے بھی بڑھ کر ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کو ملنے والی تکالیف سے بھی بڑھ کر سخت اور زخمی کرنے والے ہیں۔ اس لیے کہ یہ شریعت کی عمارت کے ایک ایک پتھر کو توڑنے کا سبب ہیں اور اسلام کے پھندے سے نکلنے اور اس کے کڑے سے ایک ایک کڑے کر کے نکلنے کا سبب ہے۔

نیز اس لیے کہ یہ قرآن وسنت کو بے ضابطہ بنا دیتا ہے کہ قرآن وسنت میں جو بھی چاہے جو بھی کہہ دے گویا کہ قرآن وسنت کلام میں سے لغو ہے یا ایک ایسا گھاس ہے جو چوپائیوں اور جانوروں کے لیے حلال ہے اور آخر میں اسلام کی گرہ ہی ختم ہو جاتی ہے اور انھی بے کار قسم کے بڑے بڑے دینی ضابطوں اور بڑے بڑے ادبی اصولوں کے جاری ہونے کی وجہ سے ان کے مابین جنگیں ہوتی ہیں جب تک کوئی بھی شخص قرآن کو اپنی خواہش اور چاہت سے سمجھتا رہے گا اور شریعت کا دامن نہیں تھامے گا اور نہ ہی لغت کے قواعد کا التزام کرے گا تو وہ قرآن کو قرآن نہیں سمجھے گا بلکہ خواہش ہی سمجھے گا بس۔

اسی وجہ سے ہم نے تفسیر میں تفسیر کی شرائط مقرر کی ہیں اور ان شرائط کے شروع میں شرعی ضوابط اور لغت عربیہ کے قواعد کو مقرر کیا ہے شرعی قوانین کا التزام تو اس لیے کہ نصوص متناقض نہ ہوں اور تعلیمات میں تناقض نہ ہو۔ اور لغت کے قواعد کا التزام اس لیے کہ قرآن ایسی عربی زبان میں نازل ہوا ہے جو واضح کرنے والی ہے اللہ تعالیٰ جل شانہ فرماتا ہے:

﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ (یوسف: ۲)

"بے شک ہم نے قرآن پاک کو عربی میں نازل کیا تاکہ تم سمجھ سکو۔"

اس کے عربیت کا تقضیہ یہ ہے کہ اسے لغت عرب کے قوانین کے مطابق سمجھا جائے وہ اس کے سمجھنے کی امید نہ رکھی جائے اور نہ ہی ان علوم کی جو اس میں ہیں اور نہ ہی ان علوم کی جن پر یہ مشتمل ہے۔ ﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ کا یہی معنی ہے۔

⑲ شیعہ کی تفاسیر

شیعہ ایک بہت بڑی جماعت ہے جنھوں نے حضرت امام علی رضی اللہ عنہ کی محبت اور احترام میں مبالغہ کیا اور مبالغہ اور اسراف اس حد تک کیا کہ ان کے فضائل میں مبالغہ کرتے ہوئے انھیں رذائل بنا کر رکھ دیا۔

اسی وجہ سے علماء اخلاق کہتے ہیں کہ فضیلت دو رذائل (بری عادتوں) کے درمیان واسطہ ہوتی ہے اور علماء فرماتے ہیں کہ جب کوئی چیز اپنی حد سے نکل جائے تو وہ اپنی ضد کی طرف لوٹ آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو فرمایا کہ:

﴿قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۚ وَلَوْ كُنتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ ۚ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ (الاعراف: ۱۸۸)

"کہہ دو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا مگر جو خدا چاہے۔ اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو بہت سے فائدے جمع کر لیتا۔ اور مجھ کو کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔ میں تو مومنوں کو ڈر اور خوشخبری سنانے والا ہوں۔"

اور نبی کریم ﷺ اپنی امت کو فرماتے ہیں کہ:

”تم میری محبت میں آگے نہ بڑھ جانا جیسا کہ نصاریٰ ابن مریم علیہ السلام کی محبت میں آگے بڑھ گئے بلکہ یوں کہو کہ اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ﷺ۔

لیکن شیعوں نے حضرت امام رضی اللہ عنہ کی محبت اور احترام میں مبالغہ کیا۔

ان کے کئی فرقے ہیں بعض تو تشیع میں اتنے غرق ہوئے کہ کفر کر بیٹھے اور ان کی بنیاد عبداللہ بن سبا یہودی ہے جو اللہ کا دشمن تھا اس نے اسلام کا اظہار صرف مکروفریب اور اسلام میں فساد کی خاطر کیا اسی وجہ سے یہ فرقہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ اور لڑائی کے مقام پر کھڑا ہے یہاں تک وارد ہوا ہے کہ امام علی رضی اللہ عنہ نے خود ان پر حملہ کیا اور ان سے لڑائی کی اور ان کا تعاقب کیا۔

ان میں سے ایک قوم ایسی ہے جو معتدل ہے اور کفر کے گڑھے میں نہیں گری اگر چہ ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کو فضیلت دینے میں اور انھیں خلافت میں امام علی رضی اللہ عنہ سے مقدم مانتے ہیں اہلسنت والجماعت کی مخالفت کی۔ ان لوگوں کے مذاہب بھی ہیں اور معلومات بھی ہیں۔ ان کی کتابیں اور تفسیریں بھی ہیں اور دلائل وتاویلات بھی ہیں۔

شیعوں کی تفاسیر میں سے ایک کتاب کا نام ”مرأۃ الانوار ومشکوٰۃ الاسرار“ ہے۔

اس کے مؤلف کو مولی عبداللطیف کازلانی کہا جاتا ہے جو نجف سے ہے یہ تفسیر ایسی تاویلات پر مشتمل ہے جو گزشتہ بالا تاویلات باطنیہ کے مشابہ ہیں چنانچہ وہ ”الارض“ کی تفسیر دین کے ساتھ ائمہ علیہم اسلام کے ساتھ، شیعہ کے ساتھ اور ان قلوب کے ساتھ کرتا ہے جو علم کا محل اور قرار گاہ ہیں اور گزشتہ امتوں کی خبروں کے ساتھ.... الخ کرتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا﴾ (النساء: ۹۷)

”کیا اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع نہیں کہ تم اس میں ہجرت کرلو؟“

کی تفسیر میں کہتا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا دین اور اس کی کتاب ہے اور اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ﴾ (یوسف: ۱۰۹)

”کیا وہ زمین میں نہیں پھرے؟“

کے بارے میں کہتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ:

((اولم ینظروا فی القرآن)).

”کیا انھوں نے قرآن میں غور نہیں کیا؟“

اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس نے قرآن کے ان الفاظ کو جن سے کوئی بھی جاہل نہیں بغیر دلیل کے معانی غریبہ پر محمول کیا اسے اس پر محمول کرنے والی چیز صرف ہوا پرستی، تعصب اور اپنے مذہب میں اندھا پن ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک گمراہی ہے جو باطنیہ اور بہائیہ کی گمراہی سے کم نہیں ہے۔

﴿وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ﴾ (الرعد: ۳۳)

"اور اللہ تعالیٰ جسے گمراہ کرے اسے کوئی بھی ہدایت دینے والا نہیں۔"

تفسیر اشاری

یہ قرآن پاک کی تاویل ہے جو اس کے ظاہر کے علاوہ ہے جو کسی مخفی اشارہ کی وجہ سے اصحاب سلوک وتصوف کو ظاہر ہوتی ہے اور اس کے اور ظاہری تفسیر کی مراد کے درمیان جمع کرنا بھی ممکن ہوتا ہے۔

تفسیر مذکور کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے بعض نے اجازت دی ہے اور بعض نے منع کیا ہے آپ کی خدمت میں علماء کے کچھ اقوال پیش خدمت ہیں تا کہ آپ اس میں وجہ حق کو جان سکیں۔

زرکشی رحمۃ اللہ علیہ نے "البرھان" میں فرمایا کہ: "قرآن کی تفسیر میں صوفیا کا کلام: بعض نے کہا کہ یہ تفسیر نہیں ہے بلکہ یہ کچھ معانی اور وجدان ہیں۔ جنھیں وہ تلاوت کے وقت محسوس کرتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ ﴾ (التوبۃ: ۱۲۳)

"اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمہارے قریب ہیں۔"

کے بارے میں بعض فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نفس ہے۔ وہ مراد لیتے ہیں کہ آمر (حکم کرنے والے) کی ہمارے قریب والے کے ساتھ قتال کی علت "قرب" ہے اور انسان کے لیے سب سے قریبی چیز اس کا نفس ہے۔

ابن الصلاح نے اپنے فتاویٰ میں فرمایا کہ میں نے امام ابوالحسن واحدی مفسر کی ایک روایت پائی جس میں انھوں نے فرمایا کہ: "ابوعبدالرحمٰن سلمی نے تفسیر میں کچھ حقائق تصنیف کیے۔ اگر وہ ان کے تفسیر ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے تو تحقیق اس نے کفر کیا۔ ابن الصلاح نے فرمایا کہ ان میں سے جن پر اعتماد کیا جاتا ہے جب وہ اس قسم کی کوئی چیز کہیں تو ان کے بارے میں کہا جائے گا کہ انھوں نے اسے بطور تفسیر نہیں کہا اور نہ ہی کلمہ کی تشریح کی کیونکہ اگر ایسا ہوتو وہ باطنیہ کے مسلک پر چلیں گے۔ یہ تو صرف قرآن میں وارد ہونے والی چیز کی نظیر ہوتی ہے اور نظیر نظیر کے ساتھ ذکر کی جاسکتی ہے لیکن اس کے باوجود کاش وہ لوگ اس قسم کا تساہل نہ کرتے اس لیے کہ اس میں ابہام والتباس ہے۔

"النسفی رحمۃ اللہ علیہ" نے اپنی کتاب "العقائد" میں لکھا کہ "نصوص اپنے ظاہر پر ہوں گی ان سے ایسے معانی کی طرف عدول کرنا جن کا اہل باطل دعویٰ کرتے ہیں الحاد ہے۔" اس کی شرح میں تفتازانی فرماتے ہیں کہ ملاحدہ کو باطنیہ کہتے ہیں اس لیے کہ انھوں نے دعویٰ کیا کہ نصوص اپنے ظاہر پر نہیں ہیں بلکہ ان کے کچھ معانی ہیں انھیں صرف معلم ہی جان سکتا ہے اس سے ان کا مقصود شریعت کی بالکلیہ نفی کرنا ہے۔ فرمایا کہ بعض محققین کا مذہب یہ ہے کہ نصوص اپنے ظاہر پر ہیں لیکن اس کے باوجود اس میں کچھ مخفی اشارات ہیں جو اس کی باریکیوں کی طرف مشیر ہیں، یہ ارباب سلوک پر منکشف ہوتے ہیں ان کے اور ان کی ظاہری مراد کے درمیان تطبیق ممکن ہوتی ہے یہ کمال ایمان اور محض عرفان ہیں۔

اس مقام پر تفسیر صوفیہ جسے تفسیر اشاری کا نام دیا جاتا ہے اس کے درمیان اور تفسیر باطنیہ ملاحدہ کے درمیان فرق بھی معلوم ہو جاتا ہے صوفیاء ظاہری مراد کو منع نہیں کرتے بلکہ اس پر ابھارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اولاً یہ ضروری ہے اس لیے کہ جو شخص قرآن کے اسرار کا دعویٰ کرتا ہو اور اس کے ظاہر کو نہ پکڑتا ہو وہ ایسے ہے جیسے کسی نے گھر کی چھت پر چڑھنے کا دعویٰ کیا ہو اور دروازہ پار نہ کیا ہو۔

جبکہ باطنیہ کہتے ہیں کہ ظاہر بالکل بھی مرادنہیں مرادصرف باطن ہے اور اس سے ان کا مقصود شریعت کی نفی ہے۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "الاتقان" میں ابن عطاء اللہ سے نقل کیا کہ انھوں نے "لطائف المنن" میں فرمایا کہ "جاننا چاہیے کہ اس جماعت کی کلام اللہ اور کلام رسول کی تفسیر معانی غریبہ سے کرنا ظاہر کو اس کے ظاہر سے پھیرنا نہیں ہے۔ بلکہ ظاہری آیت سے وہ چیز سمجھی جاتی 31
ہے جس کے لیے آیت آئی ہے، اور عرف لسان بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس کے باطنی مفہوم بھی ہیں جو آیت اور حدیث سے ان لوگوں کو سمجھ میں آتے ہیں جن کا سینہ اللہ تعالیٰ نے کھول رکھا ہو۔ اور حدیث پاک میں ہے کہ "ہر آیت کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی" ان سے یہ معانی لینے میں آپ کو جھگڑالو اور معارض کا یہ کہنا نہ روکے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو بدلنا ہے۔ یہ احالہ نہیں ہے بلکہ احالہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں کہ اس آیت کا یہی معنیٰ ہے اس کے علاوہ کوئی معنیٰ نہیں حالانکہ وہ ایسا نہیں کہتے بلکہ وہ ظاہر کو اپنے ظاہر پر قائم رکھتے ہیں کہ ان سے مراد ان کے موضوعات ہی ہیں اور اللہ تعالیٰ سے وہ سمجھتے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں الہام کرتا ہے۔

تنبیہ ۞ شاید مناسب ہے کہ میں آپ کی خدمت میں امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت پیش کروں جو آیت کے ظاہری باطنی معنیٰ، حرف کی حد اور ہر حد کی بنیاد کے بیان میں ہے۔

فرمایا: "اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور فرمائے۔" اگر آپ کہیں کہ فریابی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "ہر آیت کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور ہر حرف کی حد اور ہر حد کی کوئی بنیاد ہوتی ہے۔" میں کہتا ہوں کہ اس کے ظاہر اور باطنی معنیٰ کی کئی وجوہ ہیں۔

① جب آپ اس کے باطن کی کرید کریں اور اس کے ظاہر پر قیاس کریں تو اس کا معنیٰ آپ کو معلوم ہو جائے گا۔

② کوئی بھی آیت ہو اس پر کسی نہ کسی قوم نے ضرور عمل کیا ہے اور ایک قوم ایسی بھی ہے جو عنقریب اس پر عمل کرے گی جیسا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

③ اس کا ظاہر اس کے الفاظ اور باطن ان کی تاویلات ہیں۔

④ ابوعبیدہ نے فرمایا کہ (اور یہی درستگی کے زیادہ قریب ہے) وہ قصے جن میں اللہ تعالیٰ نے امم ماضیہ کے واقعات اور ان پر ہونے والے عقاب کو بیان کیا ان کا ظہر "پہلے لوگوں کی ہلاکت کی خبر" ہے۔ اور ایک قوم کے بارے میں ہونے والی ایک بات ہے اور باطن یہ ہے کہ بعد والوں کو نصیحت کرنا اور ان کے فعل کی طرح کرنے سے ڈرانا ہے کہ جیسے ان کے ساتھ ہوا ان کے ساتھ بھی ایسے ہی ہوگا۔

⑤ اس کا ظہر وہ معانی ہیں جو اہل علم کو ان کے ظاہری معنیٰ سے ظاہر ہوتے ہیں اور باطن وہ اسرار ہیں جنھیں یہ متضمن ہیں جن پر ارباب حقائق مطلع ہوتے ہیں۔

"ولکل حرف حد": کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے جو معنیٰ مراد لیا ہے اس کی انتہا ہے اور بعض نے کہا کہ ہر حکم کے لیے ثواب یا عقاب کی ایک مقدار ہے۔

"ولکل حد مطلع" یعنی معانی اور احکام میں سے ہر ایک کا کوئی مطلع ہوتا ہے جس کے ذریعے اس کی معرفت تک پہنچا

جاتا ہے اور اس کی مراد پر آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ بعض نے کہا کہ: جو بھی ثواب وعقاب ہے جس کا وہ مستحق ہے آخرت میں بونت جزاء اس پر مطلع ہو جائے گا۔

بعض نے کہا کہ "ظاہر" تلاوت اور باطن فہم اور حد حلال وحرام کے احکام اور مطلع وعدوں اور وعیدوں پر آگاہ ہونا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کی تائید ابن ابی حاتم کی روایت کرتی ہے جو انھوں نے ضحاک کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کی کہ قرآن گھاٹیوں والا ہے، فنون والا ہے، ظہور وبطون والا ہے اس کے عجائب ختم نہیں ہوتے اس کی غایت کو پہنچا نہیں جا سکتا اب جو نرمی کے ساتھ اس میں گھس گیا اس نے نجات پالی اور جو اس میں سختی کے ساتھ داخل ہوا وہ اوپر سے نیچے جا گرا، یہ اخبار وامثال ہے، حلال وحرام ہے، ناسخ ومنسوخ ہے، محکم ومتشابہ ہے۔"

اور ظہر وبطن؟ اس کا ظاہر تو تلاوت ہے اور باطن تاویل ہے، لہٰذا اس کے لیے علماء کے پاس بیٹھو! اور سفہاء سے دور رہو۔

لیکن وجہ اول جو سیوطی رحمہ اللہ نے ظہر وبطن کے معنی میں ذکر کی ہے وہ واضح نہیں ہے جب ہم نے اس کے کچھ احتمالات کو تلاش کیا تو وہ بعد والے اقوال کے مشابہ ہوا یا ان کے ساتھ متحد ہوا اسی طرح پانچواں قول بھی تیسرے قول کے ساتھ متحد ہے یا اس کے قریب ہے۔ لہٰذا غور فرمالیں۔

تفسیر اشاری کو قبول کرنے کی شرائط

گزشتہ بالا سطور سے معلوم ہوا کہ تفسیر اشاری پانچ شرائط کے بغیر مقبول نہیں ہو سکتی۔

① نظم قرآنی کے ظاہری معانی کے منافی نہ ہو۔
② یہ دعویٰ نہ کیا جائے کہ مراد صرف یہی ہے ظاہر نہیں ہے۔
③ تاویل بعید اور نامعقول نہ ہو جیسے کسی نے اس آیت کی تاویل:

﴿وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (العنکبوت:۶۹)

"بے شک اللہ تعالیٰ محسنین کے ساتھ ہے۔"

یوں کی کہ ﴿لَمَعَ﴾ کو فعل ماضی بنا دیا اور محسنین کو اس کا مفعول بنا دیا۔

④ اس کا کوئی شرعی یا عقلی معارض نہ ہو۔
⑤ اس کی تائید کرنے والا کوئی شاہد شرعی بھی ہو۔

علماء نے اسی طرح شرائط کو مقرر کیا لیکن یہ شرائط ایک دوسرے میں داخل ہیں اس لیے اوّل کے ذریعے ثالث سے اور خامس کے ذریعے رابع سے استثناء ممکن ہے اور ان دونوں کے بدلے دو اور شرائط ہوں تو اچھا ہے۔

① الفاظ قرآنی جس معنی کے لیے وضع کیے گئے ہیں اس معنی کی وضاحت۔
② اس تفسیر اشاری کے بعد مفسر لہ، میں تشویش نہ ہو۔

عنقریب میری نصیحتوں اور امام غزالی رحمہ اللہ کے کلام میں ان دونوں شرطوں کی تائید ہوگی۔ پھر ان کے مقبول ہونے کی یہ شرائط صرف اس معنیٰ میں ہیں کہ انھیں چھوڑا نہیں جائے گا بس۔ یہ نہیں کہ ان شرائط کے پائے جانے کی صورت میں یہ واجب الاتباع

ہو جائیں اور انھیں لیا جائے (ایسا نہیں) اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ قرآن کے ظاہر کے منافی نہیں ہے پھر یہ بھی ہے کہ اس کے شرعی شاہد ہوں جو ان کی تائید کرتے ہوں اب جو بھی ایسی ہوں گی انھیں چھوڑا نہیں جائے گا۔ ان کو لینا واجب اس لیے نہیں کہ قرآن کریم کا نظم اس پر دلالت کرنے کے لیے وضع نہیں کیا گیا بلکہ یہ از قبیل الہامات ہے جو انھیں ظاہر ہوتے ہیں ان میں نہ لغت منضبط ہوتی ہے اور نہ ہی قوانین کے ساتھ مقید ہوتی ہیں۔

تفسیر اشاری کی اہم ترین کتابیں

تفسیر اشاری کی اہم ترین کتابیں چار ہیں۔ ① تفسیر نیسا پوری ② تفسیر آلوسی ③ تفسیر تستری ④ تفسیر محی الدین ابن عربی

① **تفسیر نیسا پوری** ● اس پر کلام گزر چکا باقی یہ بات رہ گئی کہ ہم آپ کو یہ بات بتلاتے ہیں کہ جب وہ کلام کو آیت یا آیات کے ظاہری معانی پر مکمل کر لیتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ: "قال اھل الاشارۃ" (اہل اشارہ نے کہا) یا فرماتے ہیں کہ "التاویل" پھر اس عنوان کے تحت اس آیت یا ان آیات کا معنیٰ اشاری بیان کرتے ہیں۔

مثال ● ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً﴾ (البقرۃ:۶۷)

"اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہا کہ بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم گائے ذبح کرو!"

اس کی ظاہری تفسیر کرنے کے بعد فرمایا کہ: "اس کی تاویل یہ ہے کہ گائے کا ذبح کرنا اپنے نفس بہیمیہ کو ذبح کرنے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس ذبح میں قلب روحانی کی زندگی اور یہ جہاد اکبر ہے (مرنے سے پہلے مرجاؤ)"

اقتلوانی یا ثقاتی ان فی قتلی حیاتی

اے مجھ پر اعتماد کرنے والو! مجھے قتل کر دو۔ میرے قتل میں ہی میری زندگی ہے۔"

وحیاتی فی مماتی ومماتی فی حیاتی

میری زندگی میرے مرنے میں ہے۔ اور میرا مرنا میرے زندہ رہنے میں ہے۔

ارادہ سے مرجا طبیعت سے زندہ ہو جائے گا کسی نے کہا کہ: طبیعت کے ساتھ مرجا حقیقت میں زندہ ہو جائے گا" وہ کیا ہے؟ وہ ایک گائے ہی تو ہے؟" نفس بھی صدق کی تلوار سے ذبح ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے "لَّا فَارِضٌ" (بوڑھی نہ ہو) یعنی بڑھاپے کی عمر میں نہ ہو کہ قوائے بدنیہ کے ضعف کی وجہ سے طریقت کے سلوک کے وظائف سے عاجز آجائے جیسا کہ کہا گیا کہ صوفی چالیس سال کی عمر کے بعد ٹھنڈا ہو جاتا ہے "ولا بکر" (جوان نہ ہو) جوانی کے آغاز میں نہ ہو کہ اس کا نشہ اس پر چھا جائے "عوان بین ذلک" (ان دونوں کے بیچ بیچ ہو) اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً﴾ (الاحقاف:۱۵)

"یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچ جائے اور چالیس سال کو پہنچ جائے۔"

"بقرۃ صفراء" (زرد رنگ کی گائے) یہ اصحاب ریاضات کے پیلے چہروں کی طرف اشارہ ہے "فَاقِعٌ لَّوْنُھَا" (اس کا رنگ گہرا ہو) اس سے مراد یہ ہے کہ پیلی خوبصورت ہو بدصورت پیلی نہ ہو کیونکہ یہ صالحین کی نشانی ہے "لا ذلول تثیر الارض"

(محنت کرنے والی نہ ہو زمین کو گاہتی نہ ہو) طمع کی ذلت نہ اٹھائے اور نہ ہی زمین کی سجاوٹ اور چاہتوں کی طلب کے لیے حرص کے آلہ کے ساتھ دنیا کی زمین میں ہل چلائے۔"ولا تسقی الحرث" (اور نہ ہی زمین کو سیراب کرتی ہو) اور نہ ہی اپنے آپ کو مخلوق کے سامنے ذلیل کر کے اور خالق کے سامنے اکڑ کر دنیا کو سیراب کرے کہ اس کا پانی (یعنی اس کی عزت، حیثیت، مرتبہ) خالق کے ہاں بھی ختم ہو جائے اور مخلوق کے ہاں بھی۔"مُسَلَّمَةٌ" اس کی صفات آفات سے سالم ہوں اس میں غیر اللہ کی طلب نہ ہو"وما کادوا یفعلون" (اور وہ کرنے والے نہیں تھے) یعنی اپنی طبیعت کے مقتضی سے اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی توفیق نہ ہوتی۔"واذ قتلتم نفسا" (اور جب تم نے ایک جان کو قتل کر دیا) یعنی دل کو"فادارأتم" (پھر تم آپس میں جھگڑنے لگے) پھر تم اختلاف کرنے لگے کہ یہ شیطان کی طرف سے تھا یا دنیا کی طرف سے تھا یا نفس امارہ کی طرف سے تھا۔"فقلنا اضربوه ببعضها" (ہم نے کہا کہ اس کے ٹکڑے کو اسے مارو) ذبح شدہ گائے کی زبان کی طرح صدق کی چھری دل کے قاتل کو مارو ذکر کی مداومت کرتے ہوئے اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ ہو جائے گا۔ اور فرمایا کہ:"ان النفس لامارة بالسوء" (بے شک نفس برائی ہی سکھلانے والا ہے۔)

﴿وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ﴾ (البقرۃ:۷۴)

"اور بہت سے پتھر ہیں کہ جن سے نہریں پھوٹ پڑتی ہیں۔"

دل کے سختی کے اعتبار سے کئی مرتبے ہیں۔ ایک وہ ہیں جن سے نہریں بہتی ہیں یہ وہ دل ہے جس پر لذات اور شہوات کے ترک کی وجہ سے روح کے انوار جوش مارتے ہیں جس کی وجہ سے کچھ ایسی چیزیں ظاہر ہونے لگتی ہیں جو خرق عادت کے مشابہ ہیں جیسا کہ بعض راہبین اور ہنود کے ساتھ ہوتا ہے اور جو پھٹ جاتی ہیں اور ان سے پانی نکلتا ہے وہ ہیں کہ بعض اوقات بشری پردے پھٹ جانے کے وقت ان پر روح کے انوارات ظاہر ہو جاتے ہیں اور وہ اسے بعض آیات اور معانی معقولہ دکھلا دیتے ہیں جیسا کہ بعض حکماء کے لیے ہوتا ہے اور جو اللہ کے ڈر سے گر جاتے ہیں یہ وہ ہیں جو بعض ادیان و ملل والوں کے لیے ہوتے ہیں کہ پردے کے پیچھے سے روح کے انوار کا عکس قبول کرتے ہیں جس سے ان میں خوف اور خشیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ مراتب مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مشترک ہیں فرق صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی نور ایمان کے ساتھ تائید کی گئی ہے جس سے وہ قرب، قلوب اور درجات میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور غیر مسلموں کی ایمان سے تائید نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے غرور، عجب، بعد اور استدراج میں بڑھے چلے جاتے ہیں اور مسلمان کرامات اور فراسات کے ساتھ مختص ہیں جو ان کے لیے انوار حق کی تجلی اور برہان کو دیکھنے سے ظاہر ہوتے ہیں۔

چنانچہ اراءت (یعنی نشانیاں دکھلانا) آیات خواص کے لیے ہوتا ہے۔

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ (فصلت:۵۳)

"عنقریب ہم انھیں اپنی نشانیاں اطراف عالم میں بھی دکھلا دیں گے اور خود ان کے اپنے اندر بھی۔"

لیکن اراءت برہان صرف اخص الخواص کے لیے ہوتا ہے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں آیا ہے کہ:

﴿لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ (یوسف:۲۴)

"اگر وہ اپنے رب کے برہان کو نہ دیکھ چکے ہوتے۔"

حضرت حسن بن منصور سے برہان کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ:

؟دل پر وارد ہونے والی چیزیں جو اسے اس کی تکذیب سے عاجز کر دے۔" واللہ اعلم۔

دوسری مثال ◎ نیساپوری رحمۃ اللہ علیہ نے:

﴿ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ ﴾ (البقرۃ: ۱۱۴)

"اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مساجد میں اس کے نام کے ذکر کو روکے۔"

کی تفسیر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "التاویل" اللہ کی مساجد جن میں اس کے نام کا ذکر ہوتا ہے وہ اہل نظر کے نزدیک، نفس، قلب، روح، سر اور خفی ہیں اور خفی سر کا بھی سر ہوتا ہے، اور ان میں سے ہر مسجد کا ذکر اس مسجد کے مناسب ہے۔ چنانچہ نفس کی مسجد کا ذکر طاعات وعبادات ہیں اور اس میں ذکر کا منع ہونا ترک حسنات اور ملازم سیئات ہے اور مسجد قلب کا ذکر توحید اور معرفت ہے اور اس میں ذکر سے منع کرنا تمسک بالشبہات اور تعلق بالشہوات ہے، کیونکہ جو قلوب شہوات کے ساتھ معلق ہوتے ہیں ان کی عقلیں مجھ سے مستور ہیں۔

اور روح کی مسجد کا ذکر شوق اور محبت ہے اور اس میں ذکر کا منع کرنا خواہشات اور سکون دینے والی چیزوں سے منع ہے اور سر کی مسجد کا ذکر مراقبہ اور حضور ہے اور اس میں ذکر سے منع کرنا کرامات پر بھروسہ کرنا ہے اور خفی جو کہ سر کا بھی سر ہے اس کی مسجد کا ذکر وجود کو قربان کرنا اور موجودات کو ترک کرنا ہے اس میں ذکر سے روکنا مشاہدات ومکاشفات کی طرف التفات کرنا ہے۔

② **تفسیر آلوسی** ◎ اس کا نام "روح المعانی" ہے اس کے مؤلف شہاب الدین سید محمد آلوسی بغدادی ہیں جو بغداد کے مفتی تھے ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی۔ یہ تفسیر سب سے زیادہ جلیل القدر سب سے زیادہ وسیع اور جامع ترین تفسیر ہے اس میں انھوں نے سلف کی روایات کے ساتھ ساتھ خلف کی روایات کو بھی پرو دیا ہے اور اس میں انھوں نے وہ چیزیں بھی تالیف کی ہیں جو بطریق عبارت مفہوم ہوتی ہیں اور وہ چیزیں بھی لکھی ہیں جو بطریق اشارہ مفہوم ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے اور درگزر فرمائے۔

اس میں انھوں نے جو تفسیر اشاری کے طور پر کہا ان میں سے ایک مثال یہ بھی ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿ وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ﴾ (البقرۃ: ۵۵)

"اور جب تم نے (موسیٰ سے) کہا کہ موسیٰ جب تک ہم خدا کو سامنے نہ دیکھ لیں گے تم پر ایمان نہیں لائیں گے تو تم کو بجلی نے آگھیرا اور تم دیکھ رہے تھے۔"

کے بارے میں فرمایا کہ۔

ان آیات میں اشارہ کے مقامات یہ ہیں کہ ﴿ وَ اِذْ قُلْتُمْ ﴾ اور جب تم نے کہا کہ اے دل کے موسیٰ ﴿ لَنْ نُّؤْمِنَ ﴾ ہم ہی بھی ایمان نہیں لائیں گے یعنی ایمان حقیقی یہاں تک مشاہد اور عیان کے مقام پر پہنچ جائیں ﴿ فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ ﴾ پھر تمھیں ت کی بجلی نے آ پکڑا جو کہ تجلی ذاتی میں فنا ہے ﴿ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ﴾ اور تم لوگ مراقبہ کر رہے تھے یا مشاہدہ کر رہے تھے ﴿ ثُمَّ

بَعۡثۡنٰكُمۡ ﴾ پھر ہم نے تمھیں زندہ کیا یعنی حقیقی زندگی کے ساتھ اور فنا کے بعد بقا دے کر ﴿ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴾ تا کہ تم توحید کی نعمت اور اللہ تعالیٰ کی بارہ گاہ میں سلوک کے ذریعے وصول کی نعمت پر شکر کرو ﴿ وَ ظَلَّلۡنَا عَلَيۡكُمُ الۡغَمَامَ ﴾ اور ہم نے صفات کی تجلی کے بادل کا سایہ کیا اس لیے کہ اسے ذات کے سورج نے چھپایا ہوا تھا۔... الخ

دوسری مثال ❁ اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿ وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ وَ رَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ الطُّوۡرَ ؕ خُذُوۡا مَاۤ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ وَّ اذۡكُرُوۡا مَا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴾ (البقرۃ: ۶۳)

"اور جب ہم نے تم سے عہد (کر) لیا اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کھڑا کیا (اور حکم دیا) کہ جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے اس کو زور سے پکڑے رہو اور جو اس میں (لکھا ہے) اسے یاد رکھو تا کہ (عذاب سے) محفوظ رہو۔"

کی تفسیر میں فرمایا کہ:

"اور جب ہم نے تم سے وعدہ لیا جو افعال وصفات کی توحید کے بارے میں دلائل عقلیہ سے ماخوذ تھا اور ہم نے تمھارے اوپر دماغ کا طور بلند کر دیا تا کہ تم معانی کے فہم اور انھیں قبول کرنے پر قادر ہو جاؤ یا اللہ تعالیٰ نے طور کے ذریعے قلب کے موسیٰ کی طرف اشارہ کیا اور اس کو بلند کرنے سے اشارہ کیا اس کے علو پر اور ارشاد وشرائع کی ہوا میں بلند ہونے پر تا کہ تم شرک، جہالت اور فسق سے بچ جاؤ پھر تم نے جہت سفلیہ کی طرف متوجہ ہو کر اس سے اعراض کیا اگر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے انھیں مہلت نہ دیتا اور انھیں چھوڑ دینے کا فیصلہ نہ کرتا تو تمھیں جلدی سزا مل جاتی اور تم پر بڑی مصیبت آ پڑتی۔

الی اللہ یدعیٰ بالبراھین من ابی فان لم یجب بادتہ بیض الصوارم

"اللہ کی طرف بلایا جاتا ہے براہین کے ساتھ اس شخص کو جس نے انکار کیا۔ پھر بھی وہ نہ مانے تو سفید چمکدار تلوار اس کا مقابلہ کرتی ہیں۔"

ان اشارات کو وجدان ومشاہدہ والے ہی پہچان سکتے ہیں اور ان حضرات کے لیے یہ چیزیں پکے ہوئے تیار باغوں کی طرح اور روشن انوارات کی طرح ہیں۔

③ **تفسیر تستری** ❁ یہ ابو محمد سہل بن عبد تستری ہیں جو ۲۷۳ھ میں فوت ہوئے۔ ان کی یہ تفسیر تمام آیات پر مشتمل نہیں ہے اگرچہ تمام سورتوں پر مشتمل ہے اس میں وہ صوفیاء کے طریقے پر چلے ہیں لیکن اس کے ساتھ اہل ظاہر کی موافقت بھی کی ہے آپ کی خدمت میں اس کا تھوڑا سا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ وہ "بسملہ" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

"الباء + بھاء اللہ عزوجل" (اللہ تعالیٰ کا جمال، خوبصورتی اور رونق) "سین + سناء اللہ عزوجل" (اللہ تعالیٰ کی رفعت) "میم + مجد اللہ عزوجل" (اللہ تعالیٰ کی بزرگی) اللہ + وہ اسم اعظم ہے جس نے تمام آسمانوں کو گھیرے ہوئے ہے اور اس کے الف اور لام کے درمیان ایک پوشیدہ حرف ہے جو ایک غیب سے دوسرے غیب تک ہے اور ایک راز ہے جو ایک راز سے دوسرے راز تک ہے اور ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک ہے اسے صرف وہ افہام پا سکتے ہیں جو گندگیوں سے پاک ہوتے ہیں صرف حلال حاصل کرتے ہیں اور ایمان کی ضرورت کو قائم رکھنے والے ہیں۔

الرحمٰن ۞ یہ ایک نام ہے اس میں الف اور لام کے درمیان پوشیدہ حرف کا خاصہ ہے۔
الرحیم ۞ وہ مہربان ہے اپنے بندوں پر کہ فرع میں رزق دیا اور اصل میں ابتداء کی ایسی رحمت کرتے ہوئے جو اس کے علم قدیم پر سابق ہے۔

ابوبکر نے کہا کہ: یعنی اللہ تعالیٰ اپنی روح کی ہوا سے اپنی ملکیت میں سے جو رحمت چاہتا ہے بنالیتا ہے۔ اس لیے کہ وہ رحیم ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابو طالب نے فرمایا کہ: "الرحمٰن الرحیم" دو نام ہیں جن میں رقت پائی جاتی ہے ان میں سے ایک رقت زیادہ پائی جاتی ہے ان دونوں اسماء کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں سے مایوسی کو دور کر دیتا ہے۔

ان کی تفسیر میں سے جو ظاہری معنی کے قریب ہے۔

"واذ قال ابراهيم رب ارني كيف تحيي الموتى" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ: "کیا وہ اپنے ایمان میں شک کرنے والے تھے؟ کہ انھوں نے اپنے رب سے سوال کیا کہ وہ انھیں معجزہ کے طور پر کوئی آیت (نشانی) دکھلائے۔ تاکہ اس کے ساتھ ان کا ایمان صحیح ہو جائے۔

سہل نے کہا کہ: "ان کا یہ سوال شک کی بناء پر نہیں تھا بلکہ وہ یقین پر اضافہ چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور وہ اپنی خلق کو کیسے قدرت دیتا ہے کیا آپ نہیں دیکھ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا کہ "اولم تؤمن" کیا آپ ایمان نہیں رکھتے؟ اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ "بلیٰ" (کیوں نہیں) اگر ان کو شک ہوتا تو "بلیٰ" کے ساتھ جواب نہ دیتے اور اگر اللہ تعالیٰ ان کی طرف سے شک کو جانتے ہوتے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام "بلیٰ" کے ساتھ خبر دیتے اور شک کو چھپاتے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور ظاہر کر دیتا اس لیے کہ اس طرح کی چیزیں مخفی نہیں رہتیں۔"

اس کتاب کا حجم چھوٹا ہے لیکن اپنے موضوع میں اس میں مادہ بہت زیادہ ہے یہ شبہات کے کثیر علاجات اور دفع شبہات پر مشتمل ہے تقریباً ۱۳۱۴ھ میں مصر میں طبع ہوئی۔

تفسیر ابن عربی ۞ یہ عبداللہ محمد بن علی بن محمد بن احمد بن عبداللہ محی الدین ابن عربی حاتمی، صوفی، فقیہ اور محدث ہیں ۵۶۰ھ کو مرسیہ میں پیدا ہوئے اور ۶۳۸ھ کو دمشق میں وفات پائی۔

ان کی تصنیفات میں سے کتاب "الجمع والتفصيل في ابداء معاني التنزيل" ہے۔ نیز "ایجاز البیان فی الترجمۃ عن القرآن" بھی ہے، ان کی تفسیر ۱۲۸۷ھ میں مطبعہ امیریہ سے دو جلدوں میں طبع ہوئی اس کے خطبہ میں انھوں نے فرمایا کہ:

مجھے ایک خبر یاد ہے جو میرے پاس پہنچی اور مجھے بڑی اچھی لگی جو مقاصد اور امیدوں سے بھی بڑھ کر ہے وہ نبی امی صادق علیہ افضل الصلوٰت کا ہر بولنے والے اور خاموش کو فرمانا کہ: "قرآن کی کوئی بھی آیت ہے اس کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور ہر حرف کی حد اور ہر حد کا مطلع ہے۔" اس سے میں سمجھا ہوں کہ ظاہر تفسیر ہے باطن تاویل ہے حد کلام کا وہ معنی جس تک مفہوم پہنچتا ہے اور مطلع وہ ہے کہ اس سے بلند ہو کر جس کی طرف وہ چڑھتا ہے اور ملک العلام کے شہود پر مطلع ہوتا ہے۔"

امام محقق سابق جعفر بن محمد صادق علیہ السلام سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ: "اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں اپنے بندوں کے لیے ظاہر ہوتا ہے لیکن وہ دیکھ نہیں سکتے۔ روایت ہے کہ آپ علیہ السلام نماز میں غشی کھا کر گر گئے جب ان سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ" میں

اس آیت کو بار بار لوٹا تا رہا حتیٰ کہ میں نے اس کے متکلم سے سنا۔"

فرمایا کہ میں نے سوچا کہ مجھے بعض اوقات باطنی حقائق کے جو اسرار اور شوارق کائنات کے جو انوارات ظاہر ہوئے ہیں ان کی وضاحت کروں، ان کی نہیں جن کا تعلق ظاہر اور حدود کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ ان کی حدود متعین ہیں اور تحقیق کہا گیا کہ جس نے "قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا اس نے کفر کیا۔" جبکہ تاویل کو نہ باقی رکھا جاتا ہے اور نہ چھوڑا جاتا ہے کیونکہ یہ سننے والے کے سلوک کے مراتب اور درجات کے تفاوت کے احوال اور اوقات کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے وہ جتنا بھی اپنے مقام میں ترقی کرتا ہے اس کے لیے فہم کا ایک نیا دروازہ کھلتا ہے اور اس کے ذریعے وہ ایک لطیف و پیچیدہ معنی پر مطلع ہوتا ہے... آگے فرماتے ہیں کہ: "جو بھی شخص میری تاویل کو قبول نہ کرے یا اسے ضرورت نہ ہو تو میں بالکل اسے پیش نہیں کرتا۔

ان کی تفسیر اشاری میں سے ایک یہ ہے کہ: "انھوں نے اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ﴾ (البقرۃ:۶۷) کی تفسیر میں فرمایا کہ (اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ تم گائے ذبح کرو) یہ گائے نفس حیوانیہ ہے اور اسے ذبح کرنا یہ ہے کہ اس کی خواہشات جو کہ اس (نفس حیوانیہ) کی زندگی ہیں انھیں دور کرنا اور اس کے سرچشمہ یعنی اس کے افعال خاصہ کو ریاضت کی چھری سے ذبح کر دینا" ہے۔ اور

﴿وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً ...... وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء:۸۱ تا ۸۴)

کی تفسیر میں فرماتے ہیں ﴿وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ﴾ "سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا" "یعنی ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لیے عقل عملی کو اور خواہشات کی اس ہوا کو مسخر کر دیا جو سینے میں نفس کے تخت پر قابو ہو کر بیٹھا ہے۔ ﴿عَاصِفَةً﴾ "تیز چلنے والی" جو بہت زیادہ تیز چلنے والی ہے۔ ﴿تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ﴾ "چلتی ہے اس کے حکم سے" یعنی اس کے تابع ہے۔ ﴿اِلَى الْاَرْضِ﴾ "اس زمین کی طرف" طاعت اور ادب کی مشق کرنے والے بدن کی زمین ﴿الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ﴾ "جس میں ہم نے برکت رکھی" یعنی اخلاق، ملکات فاضلہ اور اعمال صالحہ کی تمیز کے ساتھ ﴿وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ﴾ "اور ہم ہر چیز کو" کمال کے اسباب میں سے۔ ﴿عٰلِمِيْنَ ۝﴾ "جانتے تھے" ﴿وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ﴾ "اور شیطانوں میں سے" یعنی وہم و تخیل کے شیطانوں میں سے۔ ﴿مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ﴾ "جو غوطہ لگاتے ہیں" جسمانی ہیولیٰ میں اور معانی جزئیہ نکالتے ہیں ﴿وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ﴾ "اور وہ کرتے تھے اس کے علاوہ کام" یعنی ترکیب (جوڑنا)، تفصیل (توڑنا) اور مصنوعات (بنانا) اور مکسوبات کے اسباب تیار کرنا۔ ﴿وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۝﴾ "اور ہم ان کے محافظ تھے" یعنی بھٹکنے سے، خطا سے اور جھوٹ سچ کو مزین کرنے سے ﴿وَاَيُّوْبَ﴾ یعنی نفس مطمئنہ جس کا امتحان لیا جاتا ہے ریاضت کی کئی طرح کی آزمائشوں سے جو مجاہدہ میں کمال تزکیہ تک پہنچی ہیں۔ ﴿اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ﴾ "جب اپنے رب کو پکارا" کوشش کرنے طاقت خرچ کرنے اور ان تھک محنت کرنے میں آنے والی پریشانی کی شدت کے وقت ﴿اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ﴾ "مجھے پہنچی تکلیف" یعنی ضعف، انکساری اور عاجزی کی۔ ﴿وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝﴾ "اور تو ارحم الراحمین ہے" کشادگی اور بھلائی کرنے سے۔ ﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ﴾ "ہم نے اس کی دعا قبول کر لی" اعمال کی جفاکشی سے احوال کو راحت دے کر ﴿فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ﴾ "اور ہم نے اس تکلیف کو دور کر دیا جو انھیں تھی" اور ہم نے ریاضت کی تکلیف کو ہدایت کے نور سے۔ اور اس سے بے چینی کی ظلمت دور کر دی نزول قلب کی روشنی سے۔ ﴿وَاٰتَيْنٰهُ

اَهْلَهٗ﴾ "اور ہم نے انہیں ان کے گھر والے بھی دے دیے" قویٰ نفسیہ جنھیں ہم نے حاوی کر دیا تھا اور ریاضت سے مار دیا تھا وہ اس طرح کہ انہیں حیات حقیقیہ کے ساتھ زندہ کر دیا۔ ﴿وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ﴾ "اور ان کے ساتھ ان جیسے" یعنی قوائے روحانیہ اور صفات قلبیہ کے انوارات کو بڑھا کر اور ہم نے ان پر فضائل خلقیہ کے اسباب اور علوم نافعہ جزئیہ کے احوال کو زیادہ کر دیا۔ ﴿رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ﴾ "اپنی طرف سے بطور رحمت اور عبادت کرنے والوں کے لیے بطور نصیحت۔"

مخلصانہ نصیحت

لیکن یہ نصیحت جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ساری کی ساری اسی طرز پر ہے اس میں نصوص قرآنیہ کے معانی وضعیہ کی طرف توجہ نہیں دی گئی اور یہ سراسر خطرہ ہے کیونکہ اس کا مطالعہ کرنے والے کے بارے میں خوف ہے کہ کہیں وہ ان معانی اشاریہ کو یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ خالق کی اپنی مخلوق کو اسلام کی تعلیمات کی ہدایت اور ان کے لیے پسند کیے ہوئے دین کے حقائق کی طرف رہنمائی کرنے میں اس کی مراد یہی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ آپ بھی میری طرح ملاحظہ کرتے ہوں گے کہ کچھ لوگ ان اشارات اور خیالات کے پڑھنے سے فتنہ میں مبتلا ہو گئے اور ان کی عقل میں یہ بات داخل ہوگئی کہ کتاب وسنت بلکہ پورا اسلام اس طرح کی تاویلات اور توجیہات پر وارد ہونے والی اور ان سے حاصل ہونے والی چیزوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ حقیقت امر کیا ہے؟ صرف تخیلات ہیں اس کے علاوہ کچھ نہیں اور ان سے مطلوب صرف خیال کے ساتھ اقوال ہیں جہاں بھی اس طرح کے خیالی اقوال آتے ہیں وہ تکالیف شرعیہ کے ساتھ مقید نہیں ہوتے اور نہ ہی بلیغ ترین عربی نصوص یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے سمجھنے میں قوانین عربیہ کا احترام کرتے ہیں۔

اس سے بھی بڑھ کر مصیبت یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں اور لوگوں کو سمجھاتے ہیں کہ ہم اہل حقیقت ہیں جنھوں نے مقصود کو پا لیا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا تعلق بنا لیا کہ اس نے ہم سے تکلیف کو ساقط کر دیا اور ہمیں اسباب اختیار کرنے کی پست زمین سے بلند کر دیا جب تک ہم رب الارباب کے ساتھ اپنا یہ خیال قائم رکھیں گے۔

اور یہ اللہ کی قسم بہت بڑی مصیبت ہے جسے باطنیہ اور ان جیسے اعداء اسلام نے تیار کیا تا کہ وہ شریعت کو اس کے اصولوں سے اکھیڑ پھینکیں اور اس کی نئے سرے سے عمارت کھڑی کریں۔

﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (التوبۃ: ۳۲)

"یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں اور خدا اپنے نور کو پورا کیے بغیر رہنے کا نہیں اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔"

اس لیے اپنے مسلمان بھائیوں کو نصیحت کرنا واجب ہے جو ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم انھیں اس جال میں پڑنے سے ڈرائیں اور انھیں اشارہ کریں کہ وہ اپنے ہاتھوں کو اس طرح کی بل دار تفاسیر اشاریہ سے جھاڑ لیں اور اس طرح کی چیزوں پر بھروسہ نہ کریں جو صوفیاء کی کتابوں میں کسی قوم کے کلام میں وارد ہوئی ہیں، اس لیے کہ یہ ذوق و مواجید ہیں جو ضبط وتقیید کی حدود سے خارج

ہیں۔اس میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ خیال حقیقت کے ساتھ خلط ہو جاتا ہے اور حق باطل کے ساتھ۔اور جب یہ بھی نہ ہو تو بھی بہت کم ہوتا ہے کہ اس سے قائل کی مراد ظاہر ہو اور جب ظاہر ہوتی ہے تو کھلے کفریات میں سے ہوتی ہے جنھیں علماء،صوفیاء بلکہ عام سچے مسلمان سے صادر ہونے کو بھی ہم بعید سمجھتے ہیں اور جن میں ہم مکر وفریب اور گھڑ لینے کا طعن کرتے ہیں وہ ان سے اقرب ومحفوظ ہیں جن میں کفر وفسق کی نسبت کی گئی ہے۔

لہٰذا سمجھ دار اور عقل مند کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس طرح کی پھسلانے والی چیزوں سے دور رکھے اور اپنے دین کو اس طرح کے شبہات سے دور رکھے حالانکہ اس کے سامنے کتاب وسنت اور ان کی شروحات میں شریعت اور لغت کے قوانین کے مطابق باغات اور چمنستان ہیں۔

﴿ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ﴾ (البقرۃ:۶۱)

"کیا تم ادنیٰ چیز کو لینا چاہتے ہو اس چیز کے بدلے جو بہتر ہے؟"

آپ ﷺ نے فرمایا کہ:"جو شبہات سے بچ گیا اس نے اپنا دین اور عزت کو محفوظ کر لیا۔" ①

اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو چیز تمھیں شک میں ڈال دے اسے چھوڑ کر وہ چیز اختیار کرو جس میں شک شبہ نہ ہو۔" ②

اللہ تعالیٰ ہی سے اپنی توفیق مانگتا ہوں اور آپ کی بھی اور ہم اس ذات عزوجل سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اوہام کی اندھیریوں سے نکالے اور ہمیں دین کے حقائق اور اسلام کی تعلیمات میں پختگی نصیب فرمائے۔آمین۔

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے کلمات

میں اپنی یہ نصیحت کچھ قیمتی کلمات پر ختم کرتا ہوں جو ہمارے موضوع کے ساتھ پوری طرح تعلق رکھتی ہیں اور وہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کمالِ فوقیت کے ساتھ مزین ہیں جب انھوں نے اپنی کتاب "الاحیاء" میں ذکر وتذکیر کا تذکرہ کیا اور ان دونوں میں لوگوں نے جو کچھ داخل کر دیا ان کو ذکر کیا تو فرمایا "اللہ تعالیٰ ان کی مٹی کو تر فرمائے۔"

شطح سے ہماری مراد کلام کی دو صفتیں ہیں جنھیں بعض صوفیاء نے گھڑا ہے۔

شطح کی پہلی قسم ❂ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عشق کے لیے چوڑے دعوے اور ایسا وصال جو انھیں اعمال ظاہرہ سے مستغنی کر دیتا ہے حتیٰ کہ ایک قوم تو یہاں تک پہنچ گئی کہ انھوں نے اتحاد، (متحد ہونا یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ متحد ہو گئے) ارتفاع حجاب، (یعنی اللہ تعالیٰ کے پردے ان سے مرتفع ہو گئے) مشاہدہ بالرؤیہ (یعنی انھوں نے اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے دیکھ لیا) اور مشافہہ (آمنے سامنے بات کرنا) بالکلام کا دعویٰ کر دیا اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں یہ کہا گیا اور ہم نے یہ کہا اور وہ اس میں حسین بن منصور کی مشابہت اختیار کرتے ہیں جسے سولی چڑھا دیا گیا صرف اس وجہ سے کہ اس نے اس طرح کے کلمات کا اطلاق کیا تھا اور وہ لوگ اس کے بارے میں گواہی دیتے ہیں

---

① بخاری کتاب الایمان باب ۳۹،مسلم کتاب المساقاۃ حدیث ۱۰۷،ابوداؤد کتاب البیوع باب ۳،ابن ماجہ کتاب الفتن باب ۱۴،دارمی کتاب البیوع باب ۱

② نسائی کتاب الاشربہ باب الحث علی ترک الشبہات،ابوداؤد صفت القیامہ باب ۶۰ حدیث ۲۵۱۸ مسند امام احمد ۳/ ۱۵۳

کہ اس نے "انا الحق" (میں حق ہوں) کہا تھا اور اسی طرح ابو یزید بسطامی کے ساتھ مشابہت کرتے ہیں جس کے بارے میں منقول ہے کہ اس نے "سُبحانی، سُبحانی" کہا تھا یہ کلام کا ایک بہت بڑا فن ہے جس کا نقصان عوام کو پہنچتا ہے یہاں تک کہ کاشتکاروں کی ایک جماعت نے اپنی کاشتکاری کو چھوڑ دیا اور اس طرح کے دعوے ظاہر کر دیے اس لیے کہ اس کلام سے طبیعت کو لذت محسوس ہوتی ہے اس لیے کہ اس میں اعمال سے بے کار ہونا اور احوال و مقامات حاصل کر کے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے اور غبی قسم کے لوگ بھی اپنے لیے اس طرح کے دعوے کرنے سے عاجز نہیں آتے اور نہ ہی اس طرح کے ملمع سازی کیے ہوئے ٹیڑھے میڑھے دعویٰ کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے اور جب ان کی ان باتوں کا انکار کیا جاتا ہے تو یہ کہنے سے بھی نہیں ہچکچاتے کہ: "یہ انکار ہے اس کا ماخذ علم اور جدل ہے اور علم پردہ ہے اور جدل نفس کا عمل اور یہ بات حق کے نور کے مکاشفہ کی وجہ سے باطن سے ہی ظاہر ہوتی ہے۔"

یہ اور اس جیسی چیزیں ایسی ہیں کہ جن کی چنگاریاں علاقوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور عوام میں ان کا ضرر بہت زیادہ بڑھ گیا ہے یہاں تک کہ جب کوئی ایسی بات کہے تو اس کو قتل کر دینا اللہ کے دین میں دس آدمیوں کو زندہ کرنے سے افضل ہے۔

باقی رہی ابو یزید بسطامی رحمہ اللہ کی بات اس سے نقل کردہ بات صحیح نہیں اگر کسی نے ان سے سنا بھی ہو تو ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی کلام نقل کر رہے ہوں اور اسے اپنے جی میں دہرا رہے ہوں جیسا کہ کوئی شخص کسی کو ﴿اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ﴾ (طٰہٰ: ۱۴) "بے شک میں اللہ ہوں میرے علاوہ کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں میری عبادت کرو۔" پڑھتے ہوئے سنے۔ اس سے صرف یہی سمجھنا چاہیے کہ اس نے یہ علیٰ سبیل الحکایت پڑھا ہے۔

شطح کی دوسری قسم ❁ کلمات غیر مفہومہ ہیں جن کا ظاہر بڑا عمدہ ہوتا ہے اور ان میں ہولناک عبارتیں ہوتی ہیں جن کے پیچھے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ یا تو کہنے والے کے نزدیک ہی غیر مفہومہ ہوتے ہیں بلکہ اس کی عقل میں فتور کی وجہ سے صادر ہوتے ہیں یا اس کے خیالات میں گڑبڑ کی وجہ سے صادر ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس نے اپنے سنے ہوئے کلام کے معانی کا احاطہ کم کیا ہوتا ہے اکثر یہی صورت پیش آتی ہے اور بعض اوقات اسے خود تو سمجھ آ رہی ہوتی ہے لیکن وہ سمجھانے پر قادر نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسی عبارات پیش کر سکتا ہے جو اس کے مافی الضمیر کو واضح کر سکیں اس لیے کہ اس نے علم کی محنت کم کی ہوتی ہے اور خوش وضع الفاظ کے ذریعے معانی کو تعبیر کرنے کا طریقہ سیکھا نہیں ہوتا کلام کی اس جنس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ یہ قلوب میں تشویش پیدا کرتے ہیں اور عقول کو سرگرداں اور عقل کو حیران کر دیتے ہیں۔ یا اس سے معنی مرادی مفہوم ہو رہے ہوتے ہیں لیکن ایک کا فہم اس کی خواہش اور طبیعت کے مقتضی کے مطابق ہوتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "تم میں سے کوئی بھی شخص کسی ایسے آدمی کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کرے جسے وہ سمجھتے نہ ہوں ورنہ ان پر فتنہ بن جائے گی۔" ①

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "لوگوں سے ایسی بات کرو جسے وہ سمجھتے ہوں اور جسے وہ اوپری سمجھتے ہوں اسے چھوڑ دو۔" کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب ہو؟" ②

یہ حدیث ان کلمات کے بارے میں ہے جن کو ان کا بولنے والا تو سمجھتا ہے لیکن سننے والے کی عقل اس تک نہیں پہنچ سکتی تو

---

① صحیح مسلم فی مقدمة موقوفاً علی ابن مسعود، للعقیلی الضعفاء

② بخاری موقوفاً علی علی، مسند فردوس للدیلمی مرفوعاً من طریق الی نعیم

جس کو اس کا بولنے والا ہی نہ سمجھتا ہو اس کا کیا حال ہوگا؟ پس اگر بولنے والا سمجھتا ہو اور سننے والا نہ سمجھتا ہو تو اس کا ذکر جائز نہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ: "حکمت کو ان کے اہل کے علاوہ کے سامنے نہ رکھو ورنہ تم اس (یعنی حکمت) پر ظلم کرو گے اور نہ ہی اس کے اہل سے چھپاؤ ورنہ تم ان پر ظلم کرو گے ایک مہربان طبیب کی طرح ہو جاؤ جو دواء بیماری کی جگہ رکھتا ہے۔" بالفاظ دیگر "جس نے حکمت کو اس کے اہل کے علاوہ کے پاس رکھا اس نے جہالت کی اور جس نے اس کے اہل سے منع کیا تو اس نے ظلم کیا اس لیے کہ حکمت کا بھی حق ہے اور اس کے اہل بھی ہوتے ہیں لہٰذا ہر حق والے کو اس کا حق دو!"

طامات ✿ ان میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں جنھیں ہم نے "شطح" میں ذکر کیا اور ایک امر اور بھی ہے جو اس کے ساتھ خاص ہے وہ یہ کہ الفاظ شریعہ کو ان کے ظاہر مفہوم سے امور باطنہ کی طرف پھیرنا جن کی طرف فہم سبقت بھی نہ کرتا ہو جیسا کہ باطنیہ کا تاویلات کرنے میں طریقہ کار ہوتا ہے یہ بھی حرام ہوتا ہے اور اس کا ضرر بھی عظیم ہوتا ہے، کیونکہ الفاظ جب اپنے ظاہر کے مقتضی سے پھیر دیے جاتے ہیں اور ان میں شارع سے نقل کی حفاظت نہیں کی جاتی اور کوئی ایسی ضرورت یعنی کوئی عقلی دلیل بھی نہ ہو جو اس کا تقاضا کرتی ہو تو یہ الفاظ پر اعتماد کے بطلان کا تقاضا کرتے ہیں اور اس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی منفعت ساقط ہو جاتی ہے اس لیے کہ ان سے جو چیز مفہوم ہو رہی ہوتی ہے اس پر بھروسہ نہیں اور باطن کا ضبط نہیں ہوتا بلکہ وہ دلوں میں متعارض ہوتے ہیں اور انھیں کئی وجوہ پر اتارا جا سکتا ہے اور یہ بھی بدعت شائعہ میں سے ہے جس کا ضرر بہت بڑا ہوتا ہے، ایسا کرنے والے کا مقصود کلام میں انوکھا پن پیدا کرنا ہوتا ہے اس لیے کہ نفوس انوکھی چیز کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اس سے متلذذ ہوتے ہیں اور اس طریقے سے باطنیہ پوری شریعت کو اس کے ظاہر کی تاویل کر کے گرانے تک پہنچ جاتے ہیں اور اسے اپنی رائے کی جگہ پر اتارنے کا اقدام کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ان کے مذاہب کو کتاب "المستظهري المصنف في الرد على الباطنية" میں نقل کیا ہے۔

اہل طامات کی تاویل کی مثال:

﴿اِذْهَبَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝﴾ (طٰہٰ:۴۳)

"تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔"

کسی نے اس کی تاویل میں کہا کہ یہ اس کے دل کی طرف اشارہ ہے اور کہا کہ فرعون سے بھی یہی مراد ہے اس لیے کہ یہ ہر انسان پر سرکشی کرتا ہے۔ اور

﴿اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ﴾ (الاعراف:۱۱۷)

"اپنا عصا ڈال دے۔"

اس کی تاویل میں کہا کہ: "یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر وہ چیز جس پر وہ اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے اسے پھینک دینا چاہیے۔"

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان: "سحری کھاؤ کیونکہ سحری میں برکت ہے۔"[①] کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ سحری کے وقت استغفار کرو! اس طرح کی تاویلات کیں حتیٰ کہ انھوں نے قرآن پاک کو اول سے آخر تک اس کے ظاہر سے پھیر دیا

---

① بخاری و مسلم

اور اس کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر علماء سے منقول تفسیر سے بھی پھیر دیا ان تاویلات میں سے بعض ایسی ہیں کہ ان کا بطلان ہر ایک کو قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے، جیسے فرعون کی تاویل قلب کے ساتھ۔ کیونکہ فرعون ایک شخص محسوس ہے جس کے وجود کا منقول ہونا ہم تک تواتر کے ساتھ پہنچا ہے۔ نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اسے دعوت دینا ہم تک تواتر کے ساتھ پہنچا ہے جیسے ابوجہل اور ابولہب وغیرہ جیسے کفار کا ہونا ہم تک تواتر کے ساتھ پہنچا ہے اور جنات اور فرشتوں کی جنس میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے کہ جن کا حس سے ادراک نہ کیا جا سکتا ہو یہاں تک کہ ان کے الفاظ کی تاویل کی ضرورت پیش آ جائے اسی طرح سحری کو استغفار پر محمول کرنا بھی ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھانا کھاتے تھے اور فرماتے تھے "تسحروا" "سحری کھاؤ۔" ①

اور فرماتے تھے کہ: "چلیے آؤ غذاء مبارک کی طرف۔" ②

یہ امور ایسے ہے کہ تواتر اور حس سے ان کا بطلان معلوم ہو جاتا ہے اور بعض ظن غالب سے معلوم ہو جاتے ہیں اور یہ امور ایسے ہیں کہ احساس کا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ سب حرام گمراہی اور مخلوق کے لیے دین کو فاسد کرتا ہے اور ایسی کوئی بھی چیز صحابہ رضی اللہ عنہم یا تابعین رحمہم اللہ سے منقول ہوئی اور نہ حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہوئی۔ حالانکہ وہ لوگوں کو دعوت دینے اور انھیں وعظ ونصیحت کرنے میں منہمک تھے لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:

"جس نے اپنی رائے سے قرآن پاک کی تفسیر کی اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔" ③

بعض نے کہا کہ متواتر ہے اس کا معنی اسی طریقے پر ظاہر ہوگا اور وہ یہ کہ اس کی غرض اور رائے کسی امر کی تحقیق اور پختگی پر ہو اور وہ قرآن کی شہادت کو کھینچ کر اس طرف کو لے جائے اور اسے اس پر محمول کرے حالانکہ قرآن پاک کی اس پر نہ دلالت لفظیہ لغویہ کے ذریعے کوئی شہادت دے اور نہ ہی نقلیہ کے ذریعے۔

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ قرآن کی تفسیر استنباط اور فکر کے ساتھ نہ کرنا واجب ہے اس لیے کہ بعض آیات ایسی ہیں کہ جن کے بارے میں صحابہ اور مفسرین سے پانچ، چھ یا سات معنی منقول ہوتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہوا نہیں ہے۔ اور بعض اوقات یہ ایک دوسرے کے منافی ہوتے ہیں جو جمع نہیں ہو سکتے لہٰذا یہ حسن فہم اور طول فکر سے ہی یہ مستنبط ہوں گے اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے لیے فرمایا کہ: "اے اللہ! اسے دین کا تفقہ عطا فرما اور تاویل کا علم عطا فرما۔"

اہل طامات میں سے جو شخص اس طرح کی تاویلات کو جائز سمجھتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ الفاظ سے یہ مراد نہیں ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ اس سے مخلوق کو خالق کی طرف دعوت دینے کا ارادہ کرتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں گھڑنے اور بنانے کو جائز سمجھتا ہو اس لیے کہ وہ اپنی جان میں حق ہے لیکن اسے شریعت نے نہیں بتلایا جیسا کہ کوئی شخص ہر ایسے مسئلے میں جسے وہ حق سمجھتا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی حدیث گھڑے یہ ظلم اور گمراہی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ ذیل قول سے مفہوم ہونے والی وعید میں داخل ہے۔

---

① بخاری ② ابوداؤد، نسائی ابن حبان
③ بخاری، مسلم

((من كذب علی متعمدًا فليتبوأ مقعده من النار)).

"جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا اس کو چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔"

بلکہ ان الفاظ کی تاویل میں شر بہت زیادہ بڑا اور سنگین ہو جاتا ہے اس لیے کہ یہ الفاظ کے اعتماد کو باطل کر دیتا ہے اور قرآن سے فہم اور استفادہ کے راستے کو بالکلیہ طور پر ختم کر دیتا ہے۔

اب آپ کو معلوم ہو چکا کہ شیطان نے مخلوق کے داعیوں کو قوانین محمودہ سے مذمومہ کی طرف کیسے پھر دیا؟ یہ سب کچھ علماء سوء کی تلبیس ہے کہ انھوں نے نام بدل دیے ہیں اگر آپ مشہور نام پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی اتباع کرو گے اور اس طرف التفات نہیں کرو گے کہ عصر اوّل میں کیا معروف تھا تو آپ ایسے ہو جائیں گے کہ جیسے کوئی شخص حکمت کا شرف طلب کرتا ہے اور ایسے شخص کی اتباع کرتا ہے جس کو حکیم کا نام دیا گیا ہے کیونکہ حکیم کا اطلاق اس زمانے میں طبیب پر بھی کیا جانے لگا ہے اور شاعر پر بھی اور نجومی پر بھی اور یہ الفاظ کی تبدیلی کے بارے میں غفلت کی وجہ سے ہوا۔

پھر فرمایا کہ: "اللفظ الخامس" (پانچویں قسم کے الفاظ) یعنی وہ الفاظ جن میں تلبیس واقع ہوتی ہے (ان میں سے پانچواں لفظ) لفظ حکیم ہے کیونکہ حکیم کے نام کا اطلاق طبیب، شاعر اور نجومی پر کیا جاتا ہے حتیٰ کہ راستے میں عام لوگوں کی ہتھیلیوں پر کدو لڑھکانے والے کو بھی حکیم کہا جاتا ہے۔ جبکہ حکمت وہ ہے جس کی خوبی اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی کہ:

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ﴾ (البقرۃ:۲۶۹)

"اور جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دے دی گئی۔"

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

"حکمت کا ایک کلمہ جسے کوئی شخص سیکھ لیتا ہے وہ دنیا اور جو کچھ اس کے اندر ہے سب سے بہتر ہے۔"

اب آپ دیکھیں کہ حکمت کا معنی کیا ہے؟ اور کس طرف منتقل ہو گیا؟ اور باقی الفاظ کو بھی اس پر قیاس کیجیے اور علماء سوء کی تلبیسات کے دھوکے سے احتراز کیجیے کیونکہ ان کا شر دین میں شیاطین کے شر سے بھی بڑھ کر ہے اس لیے کہ شیطان ان کے واسطہ سے آہستہ آہستہ دین کو مخلوق کے قلب سے نکال دیتا ہے اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ سے مخلوق کے شرک بارے میں سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے انکار کیا اور فرمایا کہ "اے اللہ معاف فرما" حتیٰ کہ جب بار بار پوچھا گیا تو فرمایا کہ "علماء سوء۔"①

اب آپ نے علم محمود اور علم مذموم کو جان لیا اور ان کے التباس کا محور بھی جان لیا اب آپ کو اختیار ہے کہ اپنے لیے غور کریں اور اسلاف کی اقتداء کریں یا غرور کے پہاڑ پر لٹک کر بعد والوں کی مشابہت اختیار کریں اب اسلاف نے جس علم کو پسند کیا وہ ختم ہو چکا اور جس کی طرف لوگ اوندھے پڑے ہوئے ہیں اس میں سے اکثر نیا پن اور من گھڑت ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ:

"اسلام کی ابتداء بھی غربت کے ساتھ ہوئی اور عنقریب غربت کی طرف واپس لوٹے گا اس لیے مبارک بادی ہے غرباء کے

---

① مسند بزار سند ضعیف

لیے" کسی نے پوچھا کہ غرباء کون ہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "جو لوگ میری اس سنت کی اصلاح کرتے ہیں جس کو لوگوں نے برباد کر دیا اور وہ لوگ ہیں جو میری مردہ سنتوں کو زندہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔"①

ایک اور حدیث میں ہے کہ:

"وہ لوگ اس طریقے کو پکڑے ہوئے ہوں گے جس پر آج تم لوگ ہیں۔"②

ایک اور حدیث میں ہے کہ:

"غرباء بہت کم لوگ ہیں لیکن بہت زیادہ لوگوں کے درمیان نیک وصالح ہیں مخلوق میں ان سے بغض رکھنے والے ان لوگوں سے زیادہ ہیں جو ان سے محبت رکھنے والے ہیں۔"

اور یہ علوم غریب ہو گئے ہیں اس لیے کہ انھیں یاد کرنے کو مبغوض سمجھا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب آپ دیکھو کہ ایک عالم کے دوست بہت زیادہ ہیں تو سمجھ لو کہ یہ خلط ملط ہو گیا ہے اس لیے کہ اس نے حق کو اس سے بغض رکھنے والوں کے سامنے بولا۔

غزالی رحمہ اللہ کا کلام ختم ہو گیا اللہ تعالیٰ ان کو کئی گنا اجر عطا فرمائے اور اچھا ذخیرہ کرے اور ہمیں اپنے فضل و کرم سے سلامتی اور عافیت عطا فرمائے۔ آمین

اہل کلام کی تفاسیر

جو بھی انسان کوئی کتابت کرتا ہے تو اس کی کتابت میں اس کا جذبہ اور میلان غالب ہوتا ہے اور اس کی تالیف اور گفتگو میں اس کا عقیدہ ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے کہا۔

علماء کرام بھی جب کتاب اللہ کی تفسیر کرنے لگتے ہیں تو ان کا حال بھی اسی طرح ہوتا ہے چنانچہ سنّی کی تفسیر میں اہل سنت کے انوارات چمکتے ہیں اور معتزلی کے بیان سے اعتزال کی بو بھڑکتی ہے اور شیعوں کی تاویل میں تشیع کی ہوا چلتی ہے۔ اسی طرح باقی لوگوں کا بھی حال ہے لیکن ان کے درمیان بہت بڑا فرق ہے کہ کوئی تعصب کرتا ہے اور کوئی غیر جانبدارانہ اور منصفانہ طریقہ اختیار کرتا ہے اسی طرح کوئی مختصر کرتا ہے اور کوئی طویل کرتا ہے۔

پیچھے آپ نے معتزلیوں اور شیعوں کی تفاسیر میں مکالمہ دیکھ لیا اور آپ نے دیکھ لیا کہ زمخشری رحمہ اللہ کس طرح مخفی طور پر اپنے اعتزال کی سخن گوئی کرتا ہے اور قاضی عبدالجبار کو دیکھ لیا کہ وہ کیسے متعصب اور واضح ہوتا ہے اور مولیٰ عبداللطیف کیسے حد سے تجاوز کر کے تشیع کرتا ہے۔

اسی طرح آپ اہلسنت کو بھی پائیں گے کہ ان میں سے کوئی تو اپنی تفسیر کے ذریعے ایسے عقیدے کی تائید کا قصد کرتا ہے۔

---

① مسلم شریف مختصر، ترمذی

② قال الحافظ العراقی لم اراہ اصلاً

جیسا کہ وہ لوگ جن کی سوانح اور ان کی تفسیروں کے سوانح ہم نے اس سے پہلے ذکر کر دیے جب ہم نے رائے محمودہ کے ساتھ تفسیر کی مشہور ترین کتابوں پر کلام کرتے ہوئے ہم نے ان کی سوانح وغیرہ کو ذکر کیا۔

اہل سنت میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنی تفسیر میں اپنے عقیدے کے دفاع میں مرنے کٹنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں ان لوگوں کا رئیس امام فخر الدین رازی ہے جس نے ہر موقع پر عقیدہ میں گمراہ اور منحرف لوگوں کے خلاف ایک لمبی چوڑی لڑائی چھیڑ دی اور اپنی تفسیر "مفاتیح الغیب" جو کہ تفسیر فخر رازی کے نام سے مشہور ہے اس میں وہ حکماء کے طریقے پر چلے اور انھوں نے مباحث الٰہیات میں اپنے دلائل کو انھی کے استدلالات عقلیہ پر ڈھالا لیکن وہ اہلسنت کے اصوال کے موافق ہونے کی وجہ سے مہذب ہونے کے باوجود اکثر جگہوں پر ان کے شبہات کو توڑنے اور کمزور کرنے کے پیچھے لگے ہیں۔

اسی طرح وہ کونیات میں طبعیات والوں کے طریقے پر چلے اور انھوں نے افلاک اور ستاروں پر بات کی اور آسمان وزمین کے بارے میں اور حیوان ونباتات کے بارے میں اور انسان کے اجزاء کے بارے میں۔

علوم ادبیہ اور کونیہ وغیرہ کا تفسیر کے ساتھ امتزاج اور اس کا سبب واثر

قرآن پاک ہدایت اور اعجاز کی کتاب ہے اور مفسر اپنی تفسیر میں اپنی استعداد اور قدرت کے بقدر اس کی ہدایت اور اعجاز کا تصور اور شرح کرتا ہے اور اس قدر کرتا ہے جتنا کہ لوگوں کے ہاں علوم، معارف اور افکار ہیں۔

اور قرآن کریم کے نازل ہونے سے اب تک اس پر بہت سے عصور اور قرون، امتیں اور نسلیں گزری ہیں پھر بھی قرآن ایک کتاب ہے جو ہدایت کا نور پھیلاتی ہے اور اعجاز کا جھنڈا بلند کرتی ہے (جیسا کہ تھی اور رہے گی) اور جو لوگ پہلی مرتبہ اس کے بالمشافہہ مخاطب بنے وہ عرب تھے جن میں عربیت کے خصائل کامل تھے اس کے باوجود اگرچہ وہ امی تھے لکھنے پڑھنے کے ساتھ متصف نہیں تھے اور نہ ہی انھیں درسی علوم کے ساتھ کوئی سروکار تھا اور نہ پڑھی جانے والی کتابوں کے ساتھ انھیں کوئی واسطہ تھا انھیں وجوہات کی بناء پر اس کتاب کی ہدایت اور اعجاز کے لیے اور ان کا تفسیر و بیان کے ذریعے اس کی صورت پیش کرنا آسان ترین امور میں سے تھا جو فطرت اور بساطت پر جاری ہیں جن میں وہ کسی فنی اصطلاحات کے محتاج تھے اور نہ ہی علمی نظریات کے محتاج تھے۔

اس کا اعجاز تو انھیں محض سلیقہ عربیہ اور بلاغت کے دقیق ذوق ہی معروف تھا اور اس کی ہدایت کو بھی وہ اپنی صاف عقول تیز فہمی اور صاف ستھری لغت عربیہ جس میں قرآن نازل ہوا اس کے ذریعے سے سمجھ لیتے تھے۔

اور جب انھیں ضرورت پیش آئی تو انھوں نے کائنات میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں اور ان میں اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں اور ان کے اردگرد آسمان وزمین کے عجائبات میں غور کیا اور پھر رسول اللہ ﷺ کے بیان کو سنا۔

اسی طرح ایک عرصہ تک معاملہ چلتا رہا پھر اللہ تعالیٰ کی مدد اور فتح آئی اور زمین نے اپنے اطرف مسلمانوں کے لیے روند دیے اور اسلام کا جھنڈا ایسی قوموں اور قبیلوں پر سایہ کرنے لگا جو عربیت تو نہیں جانتے تھے لیکن علوم، فنون اور فلسفہ میں مضبوط تھے اب یہ امتیں جو فتح ہوئیں ان امتوں کے ساتھ خلط ملط ہوگئی جو فاتح تھیں زمانہ گزرنے کے ساتھ اس اتصال کے دو طرح کے نتائج

رونما ہوئے۔

① لغت عربیہ فاسد ہو گئی اور پوری کی پوری ایسے ضابطوں کی محتاج ہو گئی جو اسے ضبط کریں اور اس کی سلامتی کو متضمن ہوں اور لوگوں کو کتاب وسنت کے فہم میں خطا سے محفوظ رکھتے ہوں اس سبب کی بنا پر علوم ادبیہ یا علوم عربیہ وجود میں آئے۔

② یہ امتیں جو اسلام میں داخل ہوئیں ان کے علوم کا ترجمہ کیا گیا اور ان کی تہذیب وتنقیح کی گئی اور ان کی ثقافت مسلمانوں کے درمیان پھیل گئی اگرچہ ان کی اقوام مختلف تھیں۔ لہٰذا حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ ایک اعتبار سے ان کے اور قرآن کے درمیان توفیق ہٹائی جائے اور دوسرے اعتبار سے ان کی روشنی میں قرآن کو سمجھا جائے اور یہ حکمت کے مقتضیات میں سے تھا اس لیے کہ اسلام علم کا دشمن نہیں ہے جیسا کہ بعض بہتان تراشوں نے اس کا دعویٰ کیا ہے بلکہ یہ (یعنی اسلام) علم کا دوست اور ساتھی ہے۔

ان اسباب کی بنا پر یہ علوم ادبیہ اور علوم کونیہ قرآن پاک کی تفسیر میں داخل ہونے اور اس کے ساتھ گڈمڈ ہونے لگے اس اعتبار سے کہ اس کی ہدایت اور اعجاز کو کامل طور پر اور فہم صحیح کے ساتھ ان علوم ومعاف کے بغیر سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ علوم لغت وادب تو اس لیے کہ انھی علوم کے ذریعے کلمات کی بناء، ہیئات اور ان کے اواخر کا ضبط اور ان کے الفاظ کی انواع کے اختلاف کے مطابق ان کے مدلولات، تراکیب کا احاطہ اور اسلوب عالی یا نازل کی تمیز ہو پہچانا جا سکتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کے معانی کا ادارک، اس کی بلاغت اور اعجاز کا ذوق خالص عربی کے علاوہ کو صرف اسی طریقے آ سکتا ہے۔ جبکہ علوم کونیہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس بات کی طرف بہت زیادہ بلایا ہے کہ وہ اس کائنات میں غور کریں اور انہیں بڑی قوت کے ساتھ اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس وجود کا صحیفہ پڑھیں تا کہ کون سے اس کے "مکوّن" تک پہنچیں اور وجود سے اس کے موجد پر استدلال کریں اور ان قوائے عظیمہ کے ذریعے بھرپور انتفاع حاصل کریں جنھیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پیدا کیا اور انہیں ان کے نفع کے لیے مسخر کیا۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الجاثیہ میں فرمایا کہ:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ ﴾ (الجاثیہ: ۱۲-۱۳)

"اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا تا کہ اس کے حکم سے اس میں کشتی چلے اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکر کرو اور تمہارے لیے آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کو مسخر کیا بے شک اس میں یقیناً نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سوچ وفکر کرتے ہیں۔"

اب کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ لوگ قرآن کے ان الفاظ کونیہ کو اس طریقہ پر سمجھیں جس کی طرف ان کی رہنمائی کی علم نے اور اس ثقافت نے جس کے وہ لوگ علوم کونیہ میں ماہر ہوتے ہیں۔ اور یہ بات بدیہی ہے کہ مفسر اپنے لیے تفسیر نہیں کرتا بلکہ وہ لوگوں کے لیے تفسیر کرتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی افکار کے ہم آہنگ ہو اور قرآن پاک کی تشریح طبعی وعلمی ظواہر، اللہ تعالیٰ کی سنن کونیہ، قوانین اجتماعیہ وسیاسیہ، قواعد اقتصادیہ اور اخلاق اور تمام تفریعات شخصیہ، مدنیہ، جنائیہ (جن کا تعلق جنایات کے ساتھ ہو) اور حربیہ کی روشنی میں کریں۔

یہی وہ اسباب ہیں جنہوں نے تفسیر کو علوم ادبیہ اور کونیہ وغیرہ کے ساتھ ملا جلا دیا ہے اور علوم ادبیہ اور کونیہ کو تفسیر کی کتابوں میں اپنا مقام بنانے والا بنا دیا اگرچہ یہ امتزاج قوت وضعف، قلت وکثرت اور توفیق وخذلان (مدد سے ہاتھ کھینچ لینا، بے یارومددگار چھوڑ دینا) کے اعتبار سے مفسرین کے مواہب اور جمہور کے استعداد اور ان علوم میں تقدم و تاخر زمانی کے ساتھ اختلاف کے ساتھ مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ زجاج، ابوحیان وغیرہ کی تفسیریں مباحث نحویہ کے ساتھ بھری ہوئی ہیں اور زمخشری اور ابوالسعود وغیرہ کی تفسیریں مباحث بلاغیہ کے ساتھ بھری ہوئی ہیں اور تفسیر خازن اور ان کے متعلقین کی تفسیریں اخبار وقصص کے ساتھ بھری ہوئی ہیں اور علامہ مرحوم شیخ طنطاوی جوہری کی تفسیر الجواہر علوم کونیہ سے بھری ہوئی ہے (اس تفسیر والے کے کہنے کے مطابق) یہ تفسیر مکوّنات کی انوکھی اور عجیب چیزوں اور فائق وبرتر آیات کے غرائب پر مشتمل ہے یہ پچیس جلدوں میں مطبوع ہے اور ۱۳۵۲ھ کو مصر میں اس کی طباعت مکمل ہوئی اللہ تعالیٰ اس کے مؤلف پر رحم فرمائے اور اسے بہتر جزاء عطا فرمائے۔

اس امتزاج کے آثار

علوم ادبیہ کا تفسیر کے ساتھ امتزاج کا اثر کیا ہے؟ اس کا خلاصہ اس طرح ممکن ہے کہ:

① قرآن پاک کے معانی اور اس کی ہدایات کا بیان۔

② قرآن پاک کی فصاحت اور اس کی بلاغت کا اظہار۔

③ اعجاز قرآن کی قسم پر اسلوب وبیان کے اعتبار سے دلالت۔

علوم کونیہ کا تفسیر کے ساتھ امتزاج کے اثرات کیا ہیں؟ ان کا خلاصہ مندرجہ ذیل طریقہ سے ممکن ہے۔

① لوگوں کی افکار ومعارف کا ایک دوسرے کے ساتھ چلنا۔ اور ان کا قرآن پاک کی اس طرح تفسیر کرنا کہ وہ ان کی ثقافت کونیہ کی حاجت کو پورا کر دے۔

② قرآن پاک کے اعجاز کی جدید اقسام کا ادراک اس اعتبار سے کہ وہ ان پر بھی مشتمل ہے یا اس کی طرف علوم کونیہ واجتماعیہ اشارہ کر رہے ہیں۔

③ جو لوگ کہتے ہیں کہ علم اور دین میں عداوت ہے ان کے خیالات کو دور کرنا۔

④ اس علمی راستے سے غیر مسلموں کا اسلام کی طرف مائل ہونا کہ ان ایام میں یہ لوگ انہی کے سامنے جھکتے ہیں ان کے علاوہ کسی کی طرف نہیں جھکتے۔

⑤ علم کونیہ کی قوئی اور اس کے مواہب سے انتفاع حاصل کرنے پر اُبھارنا۔

⑥ جب آدمی اللہ تعالیٰ کے کلام کی تفسیر میں علوم کونیہ کے تصور کے مطابق اشیاء کے خواص اور مخلوقات کے حقائق پر مطلع ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرت پر ایمان کے اعتبار سے اس کا جی بھر جاتا ہے۔

اسے یاد رکھیں! اور علوم ادبیہ اور علوم کونیہ دونوں کا تفسیر کے ساتھ مل جانے کے کچھ اور آثار بھی ہیں جو ان دونوں کے درمیان مشترکہ ہیں ان کو اجمالی طور پر بیان کیا جاتا ہے۔

① قرآن، اس کی عروبت (یعنی فصاحت اور عربی الاصل ہونا) اس کے معارف اور اعجاز پر اعتماد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

② اس بات پر ایمان کہ یہ کتاب لبریز ہے سعادت کی ان تمام اقسام سے جن کا انسان محتاج ہوتا ہے۔

۴ اور یہ ایمان کہ یہ کتاب قیامت کی کتاب ہے اور قیامت کے دن تک لوگوں کے لیے دستور ہے ہر زمانے اور مکان کے لیے بہتر ہے اور اس کے خزانوں اور ذخیروں سے کوئی بھی انسان مستغنی نہیں ہو سکتا۔

شرائط ضروریہ

یہ آثار جلیلہ جو ہم نے آپ کے گوش گزار کیے ان کی جلالت صرف اس وقت ہی متحقق ہو سکتی ہے جب ان میں مندرجہ ذیل امور کی رعایت کی جائے۔

۱ یہ مباحث ایسے مقصود اصلی یعنی قرآن کی ہدایت و اعجاز سے باہر نہ نکلیں۔ اور اگر مفسر آگے بڑھ کر علوم ادبیہ کی تفریعات اور فنون کونیہ کے نظریات میں مشغول ہو جائے تو آیت کا اصل مفہوم بدل جائے گا اور تفسیر تفسیر نہیں رہے گی بلکہ کتب تفسیر کی بجائے کتب علوم و فنون کے مشابہ ہو جائے گی جیسا کہ کسی عقل مند عالم نے ایک تفسیر جو استطراد، تطویل اور متعدد قسم کے علوم کی اقسام میں مشہور تھی اس کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تفسیر ہر چیز کو جامع ہے سوائے تفسیر کے۔

۲ تفسیر کو ان علوم کے ساتھ خلط کرنے میں ایسی بات کا لحاظ رکھے جو زمانے کے بھی موافق ہو اور اعتدال کے بھی موافق ہو اس لیے کہ یہ ابحاث کونیہ اور ادبیہ کبھی ضروری اور مفید ہوتی ہیں خواہ کوئی بھی فائدہ ہو جب اس کے ساتھ قرآن پاک کی شرح کی جائے گی ثقافت کے کسی زمانے میں یا مادہ اور علوم کونیہ کے فریفتگان کے لیے یا اُدباء کی کسی ایسی جماعت کے لیے جو کسی قول میں بلاغت کے فنون میں شغف رکھتے ہوں۔

لیکن پھر بھی یہ ابحاث خود مصیبت اور فتنہ ہیں، جب ان کے ساتھ قرآن کی شرح کی جائے جہالت کے کسی زمانے میں یا لوگوں کی دیگر جماعتوں کے لیے۔

"کوئی بھی شخص کسی قوم سے کوئی ایسی بات کرے جس کے سمجھنے کی ان کے اندر عقل نہ ہو تو وہ ان پر فتنہ ہوگی۔"

۳ ان ابحاث کو ایسے طریقے پر ذکر کرے کہ یہ مسلمانوں کو کمربستگی پر آمادہ کرے اور انہیں قرآن پاک کی جلالت کی طرف متوجہ کرے اور انہیں ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی مسخر کردہ اس عظیم کائنات کے قویٰ سے انتفاع حاصل کرنے کی طرف متحرک کرے ایسا انتفاع جو امت اسلامیہ کے اندر اس کی کمربستگی و بزرگی کو لوٹا دے۔

آپ کی خدمت میں مثال کے طور پر ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے اگرچہ وہ اس راستے میں اتنا حد سے نکل چکا ہے کہ نفس تفسیر و تاویل کو ہی بھلا بیٹھا ہے۔

علامہ مرحوم شیخ طنطاوی جوہری نے اپنی کتاب "القرآن والعلوم العصریة" میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ۝﴾ (ابراہیم: ۳۲-۳۳)

"اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے تمہارے رزق کے

طور پر پھلوں کو نکالا اور تمہارے لیے کشتی کو مسخر کیا اپنے حکم سے اور تمہارے لیے اور دریاؤں کو مسخر کیا اور تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر کیا جو ایک دستور پر عمل پیرا ہیں۔ اور تمہارے لیے دن اور رات کو مسخر کیا۔"

اللہ تعالیٰ نے چھ مرتبہ کاف خطاب کے ساتھ تعبیر کیا اور پانی ہمارے لیے بنایا سورج اور چاند کو ہمارے لیے مسخر کیا دن اور رات کو ہمارے لیے مسخر کیا اور ہم نے اپنے جی میں جو کچھ بھی اس سے مانگا اور جس کی بھی ہمارے نفوس نے تمنا کی اس نے ہمیں عطا کیا۔

اب کیا مسلمان اس خطاب سے مستثنیٰ ہو گئے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو پھل پیدا کئے وہ غیر مسلموں کے ساتھ خاص ہیں؟ یا خطاب عام ہے؟ اور کیا کشتیاں جو ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے درمیان بحرِ ہند، بحر الکاہل بحر احمر، بحر ظلمات میں یورپ اور امریکہ کے درمیان پھرتی ہیں کیا یہ کشتیاں انگریزوں کے ساتھ خاص ہیں؟ کیسے مسلمان علوم تجاریہ سے ٹھنڈے پڑ گئے ہیں کہ یہ ان کے غیروں یعنی فرنگیوں اور اہل امریکہ کے ہاتھوں میں چلے گئے ہیں اور یہ لوگ دونوں ہاتھ خالی کر بیٹھے ہیں؟ وہ کشتیاں جو ہمارے کرۂ ارضیہ کے اطراف میں دریاؤں اور سمندروں کی موجوں کو چیرتی چلی جاتی ہیں وہ فرنگیوں کے ہاتھ میں ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو علم معادن، الیکٹریکل علوم، اسٹیم پاور کے علوم اور ٹیلی گرافی اور تار والی بجلی اور بغیر تار بجلی کے علوم پڑھتے ہیں تو کیا اے مسلمانو! تم پر کوئی عار ہے کہ تم ۵۰۰ ملین ہو کر بھی سمندروں میں تمہاری کشتیاں نہیں چلتیں جیسے تمہارے غیروں کی چلتی ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ خطاب کیا اور فرمایا:

﴿سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهٖ﴾

"اور اس نے تمہارے لیے کشتی کو مسخر کیا تاکہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلے۔"

یعنی مسخر کیا علمی قواعد پر جو اس کی بنیاد میں لوہاری کی صنعت کو پہچاننے، اس کی تکمیل میں لکڑی کی صنعت، اس کے چلانے میں بھاپ کی صنعت، اس میں پائی جانے والی باتوں کو جاننے کے لیے مقناطیس کی صنعت کو پہچاننے کے بعد حاصل ہوتے ہیں اور فلک کواکب وسیارہ کے علم کو پڑھنے کے بعد حاصل ہوتے ہیں جن کے ذریعے سمندروں کے راستوں کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اور سمندروں، ان کے راستوں اور خطوں اور ان میں پائی جانے والی نالیوں کے علوم پڑھنے کے بعد حاصل ہوتی ہیں تاکہ کشتیاں سیدھے راستے سے نہ بھٹکیں اور غرق نہ ہو جائیں اور ان میں جو لوگ یا سامان ہے وہ غرق نہ ہو جائے۔ نیز یہ قواعد علمیہ بادلوں، ہواؤں اور طوفانوں کے علوم پڑھنے کے بعد حاصل ہوتے ہیں حتیٰ کہ ہر حال میں وہ جہاز کے کپتانوں والا لباس پہنیں اور اس طریقے پر چلیں جو کشتی کو نجات دے دے۔

اس کے بعد فرمایا کہ ﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ﴾ یقینی بات ہے کہ نہریں کھیتوں کو سیراب کرتی ہیں اور ان کے جاری ہونے میں بھی ایک قوت اور توانائی ہے جس سے بجلی پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے پٹرول اور کوئلے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جبکہ مسلمان زمین کے گوشوں میں انہی نہروں سے غافل ہیں اور عنقریب یہ غیروں کے ہاتھ میں چلی جائیں گی۔

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ﴾

رات، سورج اور چاند ان کا باریک حساب ہے جن تک علم حساب، ہندسہ، الجبرا اور علم فلک کے بغیر رہنمائی نہیں ہو سکتی۔ نہ

سورج طلوع ہوتا ہے نہ غروب نہ ہی کوئی ستارہ چمکتا نہ غروب ہوتا اور نہ ہی کوئی سیارہ طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے مگر طے شدہ اوقات کے مطابق جو دوبارہ کم نہیں ہوتے بلکہ یہ سب اپنی مقدار کے مطابق چلتے ہیں اگر انسان کسی ایک دن بھی ان چیزوں سے غافل ہو جائے تو اس کی زندگی خلل پذیر ہو جائے گی۔ اب دیکھو کہ یہ سمندروں کی کشتیاں اور خشک قطرے ہیں یہ سب سورج اور ستاروں کے حساب سے چلتے ہیں اگر لوگ ان میں سے کسی چیز سے بھی غافل ہو جائیں تو ان کے مقررہ اوقات سب خلل پذیر ہو جائیں اور ان قطرات میں تصادم ہو جائیں اور ان میں سے اکثر مر جائیں یہ سب چیزیں وہ جانتا ہے جو اس زمانے میں کچھ نہ کچھ علم فلکیات کو جانتا ہو۔ انتہیٰ

آخری کلمات

یہ نہ سمجھنا کہ اس بحث میں ہم نے جو باتیں بیان کی ہیں انھوں نے قرآن پاک کی تفاسیر میں لکھی گئی تمام کتابوں کا احاطہ کر لیا ہے اور یہ بھی نہ سمجھ بیٹھنا کہ تفسیر میں لکھی ہوئی جتنی بھی کتابیں ہیں انھوں نے ان تمام چیزوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ودیعت رکھا ہوا ہے یعنی احکام، حکمتیں اور معارف و اسرار، بلکہ ہم نے یہاں جتنی بھی تفاسیر کا ذکر کیا ہے وہ زیادہ میں سے تھوڑا ہے۔ پھر یہ تفسیری مجموعے اپنی کثرت کے باوجود قرآن کی کوئی بھی حاصل نہیں کرتے سوائے اس کے کہ دھاگے کو سمندر میں ڈبویا جائے تو وہ کتنا پانی حاصل کرے گا۔ کسی بڑے عالم کا ایک قول مجھے بڑا اچھا لگتا ہے جب ان سے پوچھا گیا کہ قرآن کی سب سے اچھی تفسیر کون سی ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ زمانہ۔ یعنی علوم و معارف افکار و حوادث اور تجربات وغیرہ جو زمانے میں نئے پیش آتے ہیں یہ قرآن کی شرح میں اہم ترین عوامل ہیں ان لمبے زمانوں کے سلسلے کا کوئی بھی عرصہ آتا ہے تو وہ اس کے کچھ چھپے ہوئے اسرار کو ظاہر کرتا ہے جو اس سے پہلے معروف نہیں تھے۔

اگر آپ کو شک ہے تو دیکھو کتابوں اور عالم کے مکتبوں کو دیکھو وہ جتنے بھی ضائع ہو گئے ہوں یا مٹ گئے ہوں پھر بھی ان میں تفاسیر کے پہاڑوں کی طرح کی امواج کے ذخیرے ہیں جن کا احاطہ علیم وخبیر کے علاوہ کوئی بھی نہیں کرسکتا بلکہ ان کے ناموں کو شمار کرنا ہی آپ کو تھکا دے گا چہ جائیکہ ان کے مسمیات کا استقراء ہو اور آپ ان میں فنون وانواع اور احوال دیکھیں گے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے بیان میں علماء پر کھولا ہوگا۔ جن میں سے کچھ تفاسیر بالماثور ہیں اور کچھ تفاسیر بالرائے، بعض ظاہری عبارتوں کی تفسیریں ہیں اور بعض چھپے ہوئے اشاروں کی تفسیریں ہیں بعض میں صنعت کلام غالب ہے اور بعض میں صنعت بلاغت غالب ہے کسی پر نحو اور اعراب غالب ہیں، اور کسی پر احکام کی تفریعات غالب ہیں، کسی پر علوم کونیہ غالب ہیں وغیرہ وغیرہ اسی طرح بعض تفاسیر پورے قرآن کی تفاسیر ہیں اور بعض قرآن کے کسی حصے یا سورت یا آیت کی۔

میں کم مایہ اور ناقص العلم ہونے کے باوجود تفاسیر کی فہرستوں پر مطلع ہوا ہوں جو مندرجہ ذیل کے ساتھ خاص ہیں اور کبھی اس کے ساتھ تالیف کا تنوع ہوتا ہے یا ایک چیز میں مؤلفین کا تعدد ہوتا ہے۔

ان میں سے بعض عمّ پارے کی تفاسیر، بعض تبارک کی، بعض سورۃ فاتحہ کی، بعض سورۃ یوسف کی، بعض سورۃ الرعد کی۔ بعض سورۃ الکہف کی، بعض سورۃ النور کی، بعض سورۃ یٰسین کی، بعض سورۃ الحجرات کی، بعض سورۃ الحدید کی، بعض سورۃ القدر کی، بعض سورۃ الفیل کی، بعض سورۃ التکاثر کی، بعض سورۃ الکوثر کی، بعض اکیلی سورۃ الاخلاص کی اور بعض سورۃ الاخلاص اور اس کے ساتھ معوذتین کی بھی تفسیر ہیں۔ بعض بسملہ کی، بعض آیت الکرسی کی، بعض سورۃ الانبیاء کے شروع کی، بعض سورۃ الفتح کے شروع کی، بعض سورتوں کے شروع میں حروف معجم کی، بعض آیت ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ﴾ (الاحزاب: ۷۲) کی، بعض ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ﴾ (البقرہ: ۶) کی بعض ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ (لقمان: ۱۸) کی، کوئی ﴿اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (التوبہ: ۱۸) کی، کوئی ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی﴾ (البقرہ: ۱۶) کی، کوئی ﴿فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ

﴿يُقَاتِلُوكُمْ﴾ (النساء: ۹۰) کی، کوئی ﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا﴾ (الکہف: ۱۰۳) کی، کوئی ﴿لَابِثِينَ فِيهَا أَحْقَابًا﴾ (النبا: ۲۳) کی، کوئی ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ﴾ (الحدید: ۲۵) کی، کوئی ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ﴾ (التوبہ: ۱۲۸) کی، کوئی ﴿وَآيَةٌ لَّهُمُ اللَّيْلُ﴾ (یٰسین: ۳۸) کی، کوئی ﴿إِن تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ﴾ (التوبہ: ۸۰) کی، کوئی ﴿إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا﴾ (التوبہ: ۳۹) کی، کوئی ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ﴾ (الاحزاب: ۳۶) کی، کوئی ﴿مَّا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ﴾ (الاحزاب: ۳۸) کی، کوئی ﴿لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ﴾ (الانبیاء: ۲۳) کی تفسیر ہے۔ یہ تفسیریں پہلے مفسرین کے اقوال کے علاوہ ہیں اور یہ تفسیریں علامہ جلیل شیخ یوسف دجوی کی ہیں۔

اگر آپ کو تعجب ہے تو اس مقام پر ایک رسالہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا﴾ (الزمر: ۷۳)

میں حرف واؤ کے معنی یا اس کے وجہ ثبوت کے بارے میں ہے کیا آپ نے دیکھا بلکہ اس سے بھی کئی گنا، یہ قرآن کے نور کا ایک شعلہ ہے اور حقیقی اعتبار سے بہت بڑے سورج کی ایک شعاع ہے اور اللہ تعالیٰ کی اپنے کچھ لوگوں کو ہدایات دینے کی تجلیات میں سے ایک چمک ہے جبکہ پورا نور اور پوری ہدایت اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے اسرار میں سے ایک سرّ ہے اور اس کی الوہیت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے اور خالق اور مخلوق کے علم میں بڑا فرق ہے اور کہاں ایک مالک کا باکمال ہونا اور غلام کا ناقص و کم تر ہونا!

آخری بات

آخری بات یہ ہے کہ یہ قرآن کے اعجاز میں سے ایک نیا فن بھی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو اس کے معانی اور معارف میں آیات بینات بنا کر قائم کر دیا اسی طرح اس کے الفاظ اور مبانی کو بھی ان کے لیے آیات بینات بنا دیا۔

﴿قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ﴾ (الانعام:۱۴۹)

"آپ فرما دیجیے کہ پوری حجت تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔"

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ (الانعام:۱۱۵)

"اور تمہارے رب کا کلام سچائی اور انصاف میں کامل ہے اس کے کلمات کو کوئی بدل نہیں سکتا اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

اے اللہ ہم پر اپنی نعمت کو پورا کر اور ہمیں اپنی ہدایت سے محروم نہ کر اور ہمیں قرآن کے ساتھ پرو دے ہدایت دینے والے اور ہدایت یافتگان کی لڑی میں۔ اور اس کے ساتھ ہمیں اعلیٰ علیین تک بلند کر دے۔ آمین آمین

﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ (الاعراف:۴۳)

"تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے ہمیں اس کی طرف ہدایت دی اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم ہدایت نہ پا سکتے۔"

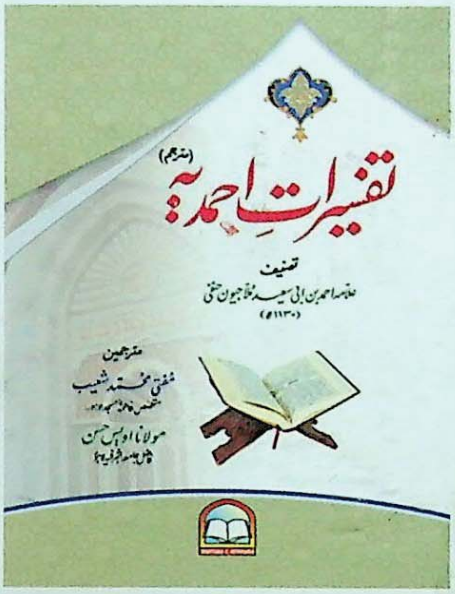

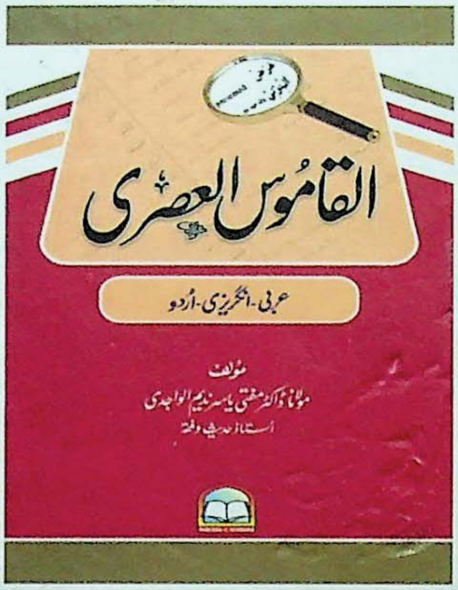

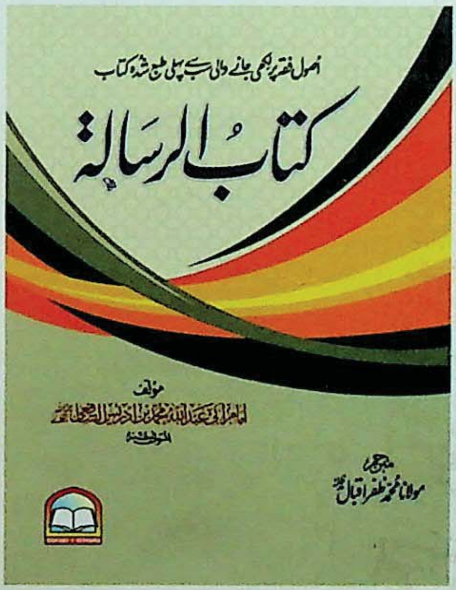

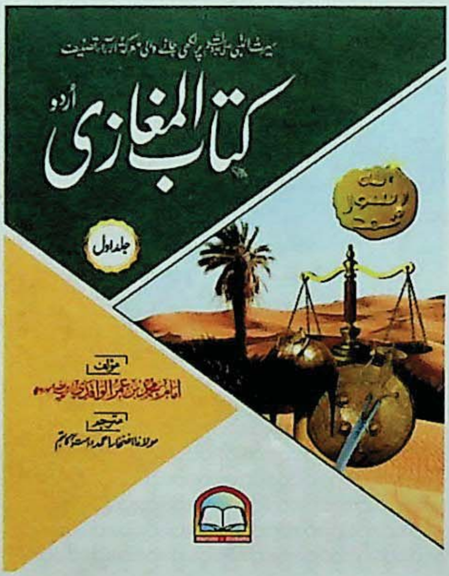

MAKTABA-E-REHMANIA
مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)
اِقرأ سنٹر غزنی سٹریٹ۔ اُردو بازار، لاہور
فون: 37355743-37224228-042